نگارشاتِ اکابر

بتذکرۂ جواہرِ معارف

حجۃ الاسلام الامام
محمد قاسم النانوتوی

ترتیب
محمد نعمان ارشدی

ناشر
حجۃ الاسلام اکیڈمی
دارالعلوم وقف دیوبند

نگارشاتِ اکابر

بتذکرۂ جواہرِ معارف

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے
علوم ومعارف، سیرت ومحاسن، اسرار وحکم اور تحسین آفریں قائدانہ اعمال
وکردار پر تأثراتِ اکابر کے تاریخ ساز نوادرات کا عظیم الشان دستاویزی مجموعہ

ترتیب:

محمد نعمان ارشدی

ناشر
حجۃ الاسلام اکیڈمی
دارالعلوم وقف دیوبند

نگارشاتِ اکابر

بتذکرۂ جواہرِ معارف

ترتیب: محمد نعمان ارشدی

طبع اولیٰ: ۱۴۳۹ھ ____ ۲۰۱۸ء

ISBN:978-93-84775-05-6

باھتمام: حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند، سہارنپور، یوپی، الہند

Composed by: Abdul Mannan Qasmi

Hujjat al-Islam Academy

Aljamia Al-Islamia Darululoom Waqf Deoband

Eidgah road, P.O. 247554, Deoband

Distt. Saharanpur U.P. INDIA

Tel: +91-1336-222352,Mob:+91-9897076726

Email: hujjatulislamacademy2013@gmail.com

hujjatulislamacademy@dud.edu.in

Website: http://www.dud.edu.in

Pritnted at: Mukhtar Press, Deoband

فہرستِ مقالات ومضامین

(نوٹ): فہرستِ مضامین میں اجمال اس لیے کیا گیا کہ اگر ذیلی عنوانات کی فہرست دی جاتی، تو تین سے چار جز صرف اسی کے نذر ہو جاتے؛ اس لیے صرف مقالات و مضامین کا مرکزی عنوان دیا گیا ہے۔ (مرتب)

کلماتِ تبریک

انتہائی خوشی، شادمانی اور فرحت وانبساط کی بات ہے کہ حجۃ اللہ فی الارض، حجۃ الاسلام، الامام محمد قاسم النانوتوی نوراللہ مرقدہ کی روشن ترین اور قابلِ تقلید زندگی کے گوشہ ہائے خفیہ، پوشیدہ خوبیاں اور خفتہ کمالات روز بہ روز کھل کر اور نکھر کر سامنے آرہے ہیں، جنہوں نے قدوہ واسوہ والی حیاتِ مستعار کے لحاتِ قیمہ اور لحظاتِ عزیزہ کو خارجی فتنوں سے دین کا دفاع، اور داخلی خرابیوں سے دین کی تہذیب و تنقیح، اور دین کو اپنی اصلی شکل وصورت میں برقرار رکھنے اور ہر طرح کی آلودگیوں اور آلائشوں سے پاک وصاف رکھنے کے لیے صرف کردیں، اور اپنے مشن اور تحریک کو دائمی بنانے کے لیے دارالعلوم دیوبند کی شکل میں ایک ایسے شجرۂ طیبہ کی داغ بیل ڈالی، جو ''أصلها ثابت وفرعها في السماء'' کا مصداق بن گیا، اور اس پر مستزاد یہ کہ تمام خوبیوں اور کمالاتِ بشری سے متصف ہونے کے باوجود زندگی بھر اپنے آپ کو مٹانے اور گوشۂ تاریک میں رکھنے کی کوشش فرماتے رہے۔ کبھی فرماتے کہ: ''علم نے قاسم کو بدنام کردیا؛ ورنہ اپنے آپ کو ایسا مٹاتا، کہ کوئی یہ بھی نہ جانتا کہ قاسم نامی کوئی شخص پیدا بھی ہوا تھا''؛ لیکن خداوندقدوس کی کرشمہ سازیوں کا کیا کہیے کہ جو جتنا چھپنا چاہتا ہے، اس کو اور ہی اجاگر کردیا جاتا ہے، جو شہرت ونام وری سے بھاگتا ہے، وہ اتنا ہی آفاقی شہرت کا مالک بن جاتا ہے۔

بہت دنوں سے دلی تمنا وخواہش تھی کہ حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی نوراللہ مرقدہ کی کوئی ایسی سوانح مرتب کی جائے، جس میں حضرت الامامؒ کی زندگی کے اُن گوشوں پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے، جن پر آج تک کما حقہ لکھا نہیں جاسکا ہے۔ اور اس کام کے لیے نہایت ہی موزوں، مناسب اور مستحق وہی لوگ تھے، جو اُن کے ہم عصر، یا کم از کم ان کے قریب العصر تھے۔ اگرچہ اُس زمانہ میں بھی مقالات ومضامین بے شمار لکھے گئے تھے؛ لیکن وہ دستیاب نہیں تھے، سب مختلف مجلّات وغیرہ میں چھپے تھے، اور منتشر ہی رہ گئے؛ لیکن محترم نعمان ارشدی صاحب سلمہ کو اللہ تعالی نے یہ توفیق دی کہ وہ اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کا ذریعہ بنیں، اور اس کے اسباب بھی مہیا ہوے، اور موصوف نہایت ہی عرق ریزی اور سعیٔ پیہم سے اُن قدیم مقالات ومضامین کو جمع کرنے میں کامیاب ہوے، اور پھر حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند کو اس کی اشاعت کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ اللہ تبارک وتعالی موصوف کو اپنی شایانِ شان اجر جزیل عطا فرمائے اور حجۃ الاسلام اکیڈمی کی کاوشوں کو عوام وخواص کی علمی سیرابی کا ذریعہ بنائے اور قبولیت تامہ عطا فرمائے۔

محمد سالم قاسمی
صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

تقریظ

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ کسی شخصیت کے تعلق سے کسی خاص دائرۂ کار میں رہتے ہوئے حدود و قیود کی پابندیوں کے ساتھ فرمائش پر لکھنا رقص پابہ زنجیر کے مترادف ہے اور اس پر مستزاد کہ شخصیت بھی اپنی علمی عظمت کے لحاظ سے ایسی رفیع الدرجات، بلند و بالا، عبقری اور ہمہ جہت صفات سے متصف کہ اک طویل ترین وقت تو محض یہ سوچنے اور فیصلے تک پہنچنے میں صرف ہوجائے کہ ایسی رفیع المرتبت اور عظمت کی حامل شخصیت کی کس جہت کو، کس صفت کو، کس عمل کو، کس گوشۂ حیات اور پہلو کو موضوع سخن قرار دیا جائے؟ ان کے علوم و معارف کی عظمت و آفاقیت کو موضوع تحریر بنایا جائے، یا ان کے فکر کی علیت اور تعمق علم پر بات کی جائے، دین مبین کے اسرار و حکم اور ان کی دلائل نقلی اور براہین عقلی سے مزین تشریحات پر مشتمل ان کی مبسوط تحریرات کا تذکرہ کیا جائے، یا ان کی مناظرانہ عظمت و فتوحات زیر تحریر لائی جائیں، ان کی وسعت فکر و نظر کو سخن ہائے گفتنی قرار دیا جائے یا صدیوں پر محیط و موثر ان کی ایمانی فراست کے زیر اثر دور رس فیصلوں کا ذکر کیا جائے، حریت وطن کی جدوجہد میں شامل ان کے مجاہدانہ کردار سے بات کا آغاز کیا جائے، غرض کہ ان جیسے اور کتنے ہی موضوعات ہیں، جو کہ اس عظیم شخصیت کی زندگی سے جزو لاینفک کے مثل بایں طور مربوط ہیں کہ ہر ایک موضوع اپنی جگہ پر مستقل ایک تصنیف کا عنوان ہے، بہت سے ذیلی عناوین کے ساتھ مستقل ایک محنت طلب ایک تالیفی کام اور تفصیل طلب باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

وسعت فکر و نظر رکھنے والے اہل علم حضرات کے بسیط مطالعہ سے یہ حقیقت مستور و نہاں نہیں ہے کہ اسلام کے صدر اول سے لے کر آج تک دستیاب ہمہ نوع اور ہمہ اقسام علمی، تاریخی اور تہذیبی تراث امت کا ایسا لائق صد افتخار سرمایہ ہے، جس سے کہ ہر دور کی دیگر اقوام و ملل ورطۂ حیرت میں ہیں، جو کہ تواتر اور تسلسل کے ساتھ نا قابل تردید شہاداتی اساس پر اسلام کی ایسی بدیہیات کا حصہ ہیں کہ متقدین سے لے کر متاخرین تک تمام علمی دوائر و اجتماعیات میں تسلیم شدہ مسلّمات کا حصہ سمجھی جاتی ہیں، ہر خطے میں یہ عظیم الشان علمی و عملی تراث جن عظیم ترین اور نابغۂ روزگار شخصیات کی مرہونِ منت ہیں، ان کا ایک کہکشانی سلسلہ ہے جو کہ ربع مسکون میں کم و بیش ہر صدی کے ہر عشرے کو محیط ہے، گویا کہ ’’اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ‘‘ کی مشاہداتی تفسیر ہے اور من حیث المجموع اگر تعارف کرایا جائے، تو اشتراک نصب العین کے نقطۂ نظر سے اس تفصیل کا مختصر الفاظ میں خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ حسن نیت، علم و عمل اور خالص ایمانیات کی بنیاد پر فکر و خیال کی عظمت میں ہی دراصل بنی نوع انسانی کے زمین پر منصب خلافت الٰہیہ کے استحقاق کے اسرار و حکم اور اس حقیقت سے وابستہ رموز ہائے فوز و فلاح مضمر ہیں۔ اس حقیقت کے علی الرغم یہ بھی ایک نا قابل تردید کلیہ ہے کہ تمام اجزائے علم و عمل کی تعمق فکر کے ساتھ اگر تحلیل کی جائے، تو کسی بھی جہت میں کاملیت کے کلیدی عناصر کے طور پر کردار کی عظمت، حسن نیت،

جذبۂ للّٰہیت، علم وعمل میں توازن وتطابق اور فکرونظر میں رفعت ووسعت، مزاج وخیال میں بلندنظری، طبیعت و عادات کا بایں طور لازمہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ جیسے کہ آیت کریمہ ''و من یؤت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیـــراً'' کی مشاہداتی تفسیر ہو۔ چناں چہ اس پس منظر میں تمام ادوار کے سنجیدہ فکر اہل علم حضرات کے نزدیک محض نظری ہی نہیں؛ بلکہ چودہ صدیوں پر محیط علی رؤوس الاشہاد یہ امر حقیقت واقعہ پر مبنی ہے، کہ تاریخ بنی نوع انسانی کے وسیع تر تناظر میں بہم رنگ ونوع اپنے گہرے نقوش اور مؤثر ترین بدیہیات کے لحاظ سے اسلام ہی دنیا کی واحد و اولین عالمی تحریک قرار پاتی ہے، جو ایک طرف اپنے جلو میں عقل وخرد کو زیر کردینے والے مؤثرات کے نفوذ کی صلاحیت رکھتی ہے، تو دوسری طرف اپنے اپنے ادوار سے ہم آہنگ مقتضیات کے مطابق گذشتہ چودہ صدیوں پر محیط علمی، فکری اور تحریکی انداز میں علمی کہکشانی سلسلے کے آفتاب وماہتاب کے علمی آثار و شواہد کا ایک غیر منقطع وبہمہ رنگ ونوع ایک ایسے تسلسل کی حامل ہے، جس میں ذات حق جل مجدہٗ کی حکمت بالغہ اورمشیت کے زیر اثر نہایت واضح ترین نقوش، علمی تراث کی صورت میں ہر صدی کے ہر عشرے پر محیط اسی کاملیت کی شانِ امتیاز کی حامل باعظمت شخصیات کی اور ان کے عظیم تر علمی آثار کی صورت میں بطور دلیل دعویٰ ظاہر و باہر ہیں، خوئے تجسس ہے تو بہر رنگ ونوع گوہر آبدار کی مشاہداتی گواہیاں جابجا موجود ہیں، جن کے ذریعہ حق تعالیٰ نے عظیم الشان، محیر العقول اور دنیا کی دیگر اقوام وملل کو ورطۂ حیرت واستعجاب میں ڈال دینے والی علمی وعملی اور تحریکی مہمات سر کرائی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں اسلام کے آفاقی پیغام علم وعمل کے اسرار بھی اسی نقطہ ہائے عمل کے تسلسل اور استمرار میں مضمر ہیں کہ مختلف ادوار کے تقاضوں سے میل کھاتی، مختلف علاقوں میں بسی مختلف اقوام عالم کے طرزِ فکر کے مطابق مختلف انداز میں مختلف طریقوں سے مجموعی طور پر تمام ربع مسکون میں سکونت پذیر امت مرحومہ کے دین وعقائد کی حفاظت کا ایک تکوینی نظام بزبان قرآن اس اعلان کے ساتھ قائم فرمادیا گیا: ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِي وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً''. ایک نقطۂ فکرونظر یہ بھی سامنے آتا ہے کہ بعض اربابِ بصیرت فکری جہت میں تھوڑے فرق کے ساتھ حکمت کی حقیقت کو سبب کے زمرے میں تسلیم کرتے ہیں، تاہم اگر حکمت کو محض سبب کے درجے میں بھی تسلیم کیا جائے، اگرچہ لفظ حکمت بذاتِ خود اپنے آپ میں معانی ومفاہیم کے نقطۂ نظر سے بڑی وسعت کا حامل لفظ ہے، تو بھی من جملہ دیگر اسباب کے اسی ایک سبب کی حیثیت بھی خود اپنی جگہ پر بنیاد واساس کی حیثیت کی حامل قرار پاتی ہے؛ کیوں کہ اسلام کے نظام عبادات ومعاملات سے لے کر اوامر ونواہی تک کوئی جز بھی ایسا نہیں ہے، جس کی بنیاد واساس میں کوئی حکمت بطور سبب کے ظاہر یا پوشیدہ نہ ہو؛ لہٰذا ہمہ جہت فکر اسلامی کی کوئی ایک جہت اور کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کو محض نظریات کے زمرے میں رکھتے ہوئے ٹھوس اور پختہ علمی بنیادوں پر قابل قبول حیثیت کے ساتھ اسی عظمت اور درجہ کی حامل کوئی دوسری دلیل برنگ حکمت بطور سبب کے ہی اس کے متبادل کے طور پر لائی جاسکے، جیسا کہ فلسفیانہ نظریات، جو کہ ہر نئے دور، ہر نئے تجربے کے بعد تبدیل ہوجاتے ہیں اور متاخرین کے تجربات ومشاہدات اور ان کے دلائل کے سامنے متقدمین کے نظریات دنیا کے لیے

نا قابلِ قبول ہوجاتے ہیں؛ کیوں کہ نظریات کا تعلق ظن وتخمین پر ہے اور امور اسلام کا تعلق امر تکوین سے ہے۔ چناں چہ نظام تکوین کے نقطۂ نظر سے اگر اسلام کی علمی تراث اور شخصیات کا جائزہ لیتے ہیں، تو یہ تسلسل بذات خود اسلام کی نا قابل رد خصوصیات کا ایک اہم ترین حصہ ہی شمار کیا جاتا ہے جو کہ صدر اول سے لے کر تا حال غیر منقطع تسلسل کے ساتھ حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے زیر اثر جاری ہے اور قیامت تک امت مسلمہ میں یہ تسلسل باقی رہے گا اور اضاعف مضاعف کے طور پر اس کی ایک لطیف اور نا قابل تردید حکمت یہ بھی ہے کہ اب حق تعالیٰ نہیں چاہتے کہ اس امت کی داستانِ عمل بھی پہلی امتوں کی طرح کسی اور امت کے سامنے پڑھی جائے۔

سلسلۂ علم وعمل میں اس کہکشاں کے نہ جانے کتنے آفتاب و ماہتاب اپنے علوم ومعارف کی تابانیاں بکھیر کر مدتوں سے تہہ خاک آسودہ ہیں؛ لیکن ان کے علم وعمل کی نورانیاں آج بھی اپنی مکمل آب وتاب کے ساتھ تشنگانِ علم کے قلوب کو منور کیے ہوئے ہیں، نہ جانے کتنوں نے یہاں علوم ومعانی اور معارف وفنون کی مبادیات سے کتنے ایسے چراغ روشن کیے ہیں، جس کی لازوال روشنی جویائے علم وعمل کو منزل مقصود تک پہنچانے کی صدیوں سے ضامن بنی ہوئی ہے۔ علیٰ سبیل المثال جس طرح زمین کی نباتات کا حسن بیج کی خوبی کا مرہونِ منت ہوتا ہے؛ لیکن بایں ہمہ زمین کی خصوصیات کو بھی اس نمو میں بڑا دخل ہوتا ہے اور ان دوطرفہ خصوصیات کا متوازن امتزاج ہی مفید اور ثمر آور ثابت ہوتا ہے، کچھ اسی طرح کی دوطرفہ خصوصیات وامتزاجات کا معاملہ میدان علم وعمل میں بھی ہے، جس کو ہم علم کے ارتقائی سفر میں تاریخی تسلسل کا عنوان دیتے ہیں اور اسی عنوان کے ذیل میں جب ہم علمی آثار وتراث کے تعلق سے یا شخصیات کے حوالے سے جائزہ لیتے ہیں، تو ایک دور سے دوسرے دور کی نسبت میں تکوینی تسلسل بایں طور مربوط نظر آتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا ہے، جیسے کہ ہر ایک شخصیت کو اپنے اپنے ادوار اور اپنے اپنے علاقوں میں امر تکوینی کے زیر اثر مصروف عمل رکھا گیا ہے اور ان کے وظائف علم وعمل متعین کر دیے گئے ہیں۔ چناں چہ تکوینی طور پر فکر وعمل کے اس غیر معمولی امتزاجات کے نتیجہ میں جہاں ایک طرف علمی آثار کے نہایت غیر معمولی اثاثوں سے امت مسلمہ کو مالا مال فرمایا گیا، وہیں ہر نسل میں روح عمل کو روبہ عمل رکھنے کے لیے حد درجہ بسیط الفکر وہمہ جہت شخصیات، ان کے احوال، ان کی جہود، ان کی محنتیں، نازک ترین احوال میں ان کی استقامت اور صبر ومصابرت جیسی صفات کے بارے میں بسیط مطالعہ بھی از بس کہ زندہ قوموں کے لیے مثل خوراک و پوشاک معنوی بقائے حیات کے لیے ضروری اور لازمی ہے، جس سے کہ ہر نئی نسل کو جہاں ایک طرف علوم ومعارف کے ارتقاء کی بنیادیں فراہم ہوتی ہیں، وہیں دوسری طرف ان شخصیات کے احوال ان کی جہود تحریک عمل کے لیے مہمیز ہوتے ہیں۔

اور بقول مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ ایک عہد اور اس عہد کی بنیاد نیز انسانی معاشرہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہوتا ہے، جس کی ہر موج دوسری موج سے مربوط ومتصل ہوتی ہے۔

بخوف طوالت اسباب وعوامل نیز واقعاتی شہادات سے صرف نظر کرتے ہوئے ان نازک ادوار کا سرسری جائزہ لیتے ہیں، جب کہ برصغیر میں عقائد اسلام، شعائر دین، اسلامی تہذیب ومعاشرت کو شدید ترین خطرات

درپیش ہوئے؛مگر"اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" کے دعویٰ حق جل مجدہٗ کے زیر اثر اسی نظام تکوین کے مطابق حق تعالیٰ نے اولوالعزم مردانِ آہن صفات کو درپیش خطرات سے نمٹنے کے لیے بایں طور کھڑا کردیا کہ نہ صرف اسی دور کے باطل عقائد کا قلع قمع ہوا؛ بلکہ دیر تک ان کے اثرات سے امت مسلمہ کو تقویت حاصل ہوتی رہی؛ بلکہ"لاَ تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ" کے عقیدہ کو پختگی حاصل ہوتی رہی۔

اکبری الحاد کا فتنہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی حمایت اور اس کے حلقہ نشین درباری علمائے سوء کی مفاد پرستانہ وخود غرضانہ تائیدات وتعاون سے اپنے اندر زبردست انقلاب انگیز قوت لیے ہوئے تھا؛ لیکن حق تعالیٰ امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے ذریعہ اس باطل تحریک کا ایسا قلع قمع فرماتے ہیں کہ نسلوں پر محیط لاکھوں لاکھ کی تعداد میں عامۃ المسلمین کے عقائد کے تحفظ کا ایک طویل عرصہ تک کے لیے بندوبست ہوجاتا ہے، بعد ازاں اسباب وعوامل کے فرق کے ساتھ سترہویں صدی میں یہ ہی باطل پرست قوتیں اسلام کی بیخ کنی جیسے مذموم مقاصد کے زیر اثر غدارانِ امت کی سازشانہ حمایت وتائید کے ساتھ برنگ دیگر کچھ زیر زمین کچھ بالائے زمین تخریبی تحریکات کی صورت میں پھر سر ابھارتی ہیں، تو حق تعالیٰ اس دور کے مطلوبہ تقاضوں سے ہم آہنگ ان باطل پرستانہ عزائم کی بیخ کنی اور اس کے دوررس مقاصد واثرات کو زائل کرنے کے لیے اپنی ایمانی فراست سے ادراک کرنے اور بروقت اس کا سدباب کردینے والی عظیم ترین اولی العزم شخصیت امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کی صورت میں پیدا فرماتے ہیں، بصیرت افروز حقیقت کی سچائی یہی ہے کہ ہر دور کے فرعون یا نظام فرعونیت کے مدمقابل ہر دور کے موسیٰ کی پیدائش حق تعالیٰ کے امر تکوین کی بدیہیات کی وہ روشن ترین جہت ہے کہ انسان کے لئے محض اپنی عقل کے بھروسے نہیں بلکہ وحی الٰہی کے ضیاء پاش حقائق کے تناظر میں ایمانیات کو سنبھالنے کے لیے یہی ایک کلید تاعمر کافی ہے۔

بہر حال! ایک عہد کا دوسرے عہد سے یہ ارتباط ہی ہے کہ عزائم اور مقاصد میں یکسانیت کے اعتبار سے ابھرنے والی تحریکات کے بالمقابل حق تعالیٰ افراد کار پیدا فرماتے رہتے ہیں، خواہ مجدد الف ثانیؒ کے دور کی تحریکات ہوں، یا محدث دہلویؒ کے عہد کی بات ہو، دور، افراد کار اور طریقۂ کار میں فرق کے علاوہ باطل پرستوں کی تحریکی سرگرمیوں میں مقاصد کے نقطۂ نظر سے کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ باطل پرستوں کا یہی تحریکی تسلسل ہے، جو کہ ۱۸۵۷ء کے حریت وطن کی جدوجہد یا باطل پرستوں کی زبان میں غدر کے نام سے موسوم ہوا، جو کہ اپنے جلو میں ہزار رنگ فتنوں کی سونامی لیے اسلامی تعلیمات، تہذیب وتمدن، اقدار وروایات، عقائد واحکام کو جڑ سے ختم کردینے جیسے مذموم ترین عزائم کے علی الرغم اپنی تمام تر قوت وطاقت اور نشۂ اقتدار کے ساتھ سرگرم عمل تھا۔ لہٰذا اس وقت کے طوفان بلاخیز اور خوں آشام احوال میں ذات حق جل مجدہٗ اپنی حکمت تکوینی سے حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ بانی دارالعلوم دیوبند کو مجدد الف ثانیؒ اور محدث دہلویؒ کے تحریکی تسلسل کی قیادت اور ان کے متوارث امین کے طور پر منتخب فرماتے ہیں، عہد بہ عہد ارتباط کے تناظر میں جن کی شخصیت کے لیے تمہید اًمذکورہ بالا سطور ضبط تحریر میں لائی گئیں ہیں۔

چناں چہ جس عہد وتحریک اور مصلح شخصیت کا تذکرہ اس تحریر کا موضوع ہے اس کو بہمہ طور جاننے اور سمجھنے کے لیے اس دور کے احوال اور پس منظر سے کسی نہ کسی درجہ میں واقفیت ضروری ہے۔

گذرا ہوا عہد ہو یا کہ دورِ رواں کی بات ہو، اس کے کیف وکم، رنج وراحت، اندیشہ وخدشات، عواقب و نتائج، فکر ونظر کو مالہٗ وماعلیہ سمیت من وعن انداز میں صاحبانِ حال کی طرح صاحب قال کے لیے محسوس کرنا مشکل ہی نہیں؛ بلکہ ناممکن ہوتا ہے؛ البتہ باندازِ دگر ان اصحابِ علم وآگہی کا معاملہ قدرے مختلف ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے ذوقِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ حساس طبیعت سمیت ادوار کے تکوینی ارتباط اور تسلسل کے ساتھ غیر محسوس انداز میں مرتب ہونے والے نتائج وعواقب کے ادراک کا شعور عطا فرمایا ہے، کہہ سکتے ہیں کہ ان کا درجہ حسّاسیت کے نقطۂ نظر سے صاحبانِ قال میں صاحبانِ حال سے قدرے قریب ہوتا ہے؛ کیوں کہ صاحبانِ حال کے اقوال وتحریرات ہی اپنے دور کی عکاس وغماز ہوتی ہیں اور بجز ان کے دوسرا کوئی پیمانہ بھی نہیں ہوتا ہے، اور ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' کے اصول کے تحت مابعد کے ثقہ اصحاب علوم ومعارف غیر واقعی روایات کی مدلل انداز میں نکیر کرتے ہوئے، قرار واقعی حقائق کی امانت کو اگلی نسلوں کی رہنمائی کے لیے محفوظ کرتے رہتے ہیں۔ چناں چہ حضرت نانوتویؒ کی تحریک کو جاننے اور سمجھنے کے لیے مختصر انداز میں ہی سہی، اس دور یعنی ۱۸۵۷ء، جس کی ہم بات کر رہے ہیں، اس کی اشد ترین اضطرابی کیفیات اور انتہائی نازک ترین احوال کو جاننا ضروری ہے۔

تاریخ وہ وقت کیسے فراموش کر سکتی ہے، جب کہ ہندوستان کے آخر مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے پابہ زنجیر رنگون میں منتقل کیا جارہا ہو، دہلی میں قتل عام، لوٹ مار کی کھلی اجازت ہو، لاکھوں ہندوستانی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے ہوں، اور بالخصوص اہل اسلام کی لاشوں سے دہلی اور اطراف کو پاٹ دیا گیا ہو، دہلی سے پشاور تک سڑک کے دورویہ درختوں میں شاید ہی کوئی درخت ہو، جس پر کوئی لاش نہ لٹکی ہوئی ہو۔ ایک روایت کے مطابق پچاس ہزار سے زائد علمائے کرام کو تہہ تیغ کر دیا گیا ہو، باقی ماندہ علمائے کرام کی ایک بڑی جماعت پر فرضی مقدمات قائم کر کے بغاوت کے الزامات عائد کر جزائر انڈومان بھیج دیا گیا ہو، جہاں بے شمار مقتدر علمائے کرام نہایت کسمپرسی اور بے بسی کی زندگی گذار کر آسودۂ خاک ہوگئے ہوں، اوقاف بحق سرکار ضبط ہو چکے ہوں، جن کی آمدنیوں سے دینی درسگاہیں اور مدارس قائم تھے، ان ہی خوں چکاں احوال کے بیچ یورپ سے پوپ کی ایما پر ہزار ہا ہزار کی تعداد میں پادریوں کا ایک جم غفیر حکومت کی فوجوں کے سائے میں علی الاعلان اسلامی تعلیمات، اسلامی عقائد، اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی روایات کو ہمیشہ کے لیے ہندوستان کی سرزمین میں دفن کر دینے اور تابوت میں آخری کیل ٹھوکنے کی ناکام ونامراد خواہش کو انجام دینے کے لیے بے چین ہو۔ ''يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ''.

اسی شورش بلاخیز اور ہلاکت خیز احوال کے سبب پیدا شدہ مایوسی کو باندازِ دگر بھی جانیے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمہ اللہ، جو کہ دارالعلوم دیوبند کے سب سے اولین صدر مدرس قرار پائے تھے اور مجذوبانہ طبیعت رکھتے تھے۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء کا پورا زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان کی ایک تحریر سے

یاس کی کیفیت جھلکتی ہے۔ مکتوبات یعقوبی میں ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

''مجموعۂ حال کے دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب دین کا خاتمہ ہے، نہ کوئی پڑھ سکے گا اور نہ کوئی پڑھا سکے گا، بڑے بڑے شہر (جیسے دہلی) جو مرکز اس دائرے کے تھے خراب ہو گئے ہیں، علماء پریشان، کتب مفقود، جمعیۃ ندارد، اگر کسی قلب میں شوق اور طلب علم کی ہمت ہو، تو کہاں جائے، کس سے سیکھے اور یوں نظر آتا تھا کہ بیس تیس سال میں جو علماء بقید حیات ہیں، جب اپنے وطن اصلی جنت کو سدھار جائیں گے، تب شاید کوئی اتنا بتانے والا بھی نہ رہے کہ وضو کے فرائض کتنے ہیں اور نماز میں کیا واجب ہے''۔

یہ وہ حالات ہیں جن کا تذکرہ کیے بغیر دارالعلوم دیوبند کی بنا، یا حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کی تحریک کو سمجھنا مشکل ہے، جس کا نصب العین ہندوستان میں آنے والی مسلمان نسلوں کے اسلامی عقائد و شعائر، روایات، تہذیب و تمدن کا تحفظ تھا، جس کا اثر و نفوذ بجز راہ تعلیم کوئی دوسرا نہیں تھا؛ کیوں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند کے اسلامی تشخص کو تباہ و برباد کرنے کے لیے جو سیلاب تعلیمی رنگ سے لارڈ میکالے کے روپ میں اٹھا اور اس میں مزید مذہبی تخریب کاری کے نقطۂ نظر سے پادریوں کی منظم تبلیغ کے ساتھ مستزاد آریہ سماج کے منظم پرچار کی صورت میں جو طوفان تھا، اس پر بندھ لگانے کا کام صرف اسی تعلیمی تحریک نے کیا، جو کہ بالہام حق جل مجدہٗ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

موضوع زیرِ نظر کے تعلق سے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند ''سوانح قاسمی'' جلد اوّل کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں کہ:

''دنیا میں مذہبی و قومی مقتداؤں کی سوانح نگاری کا معمول تو قدیم دور سے چلا آ رہا ہے اور خصوصیت کے ساتھ ایسی مقتدر و ممتاز شخصیات کی سیرت و سوانح کا تحفظ اور بھی زیادہ ضروری سمجھا گیا ہے، جو اپنے ذاتی اوصاف و کمالات کے سبب کوئی خاص نصب العین اور نظریہ لے کر اٹھی ہوں اور اپنی دعوت و رہنمائی اور کارہائے عظیم کے سبب کسی قوم کا مرکز و مدار قرار پا گئی ہوں، ایسی شخصیات کی زندگیوں کا دنیا کے سامنے پیش کیا جانا محض اس لیے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ زندہ رہیں؛ بلکہ اس لیے کہ ان کے حیات بخش نصب العین پر عامل قومیں اور جماعتیں صدیوں تک زندہ رہتی ہیں، یعنی ایک رہنمائے ملّت کو بعد از مرگ اس لیے زندہ نہیں رکھا جاتا ہے، کہ صرف اس کا نام باقی رہے؛ بلکہ اس لیے کہ اس کا کام باقی رہے، اور اس کے نصب العین کے تسلسل و استمرار سے اس کی قوم اور اس کی جماعت کامیاب ہو کر باقی رہے۔ اور پھر ایسی شخصیت جو کہ کسی قوم کے ناہموار اور بگڑے ہوئے حالات میں سامنے آئے اور اپنی قریب المرگ قوم کو سہارا دے کر سنبھال لے جائے، تو کوئی شبہ نہیں کہ ایسی شخصیت کو مدام باقی رکھنا درحقیقت اس کے اصلاحی نقوش کو باقی رکھنا ہے، تاکہ ان نقوش سے ان جیسی اپنے اپنے ادوار کے تقاضوں سے ہم آہنگ شخصیات آئندہ بھی بنتی رہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسی منفرد شخصیت کا اس کے اصول و نظریات کے پردہ میں قائم رکھنا حقیقتاً شخصیت سازی کی فیکٹری قائم کرنا ہے، جس سے ڈھل ڈھل کر شخصیات کے بنتے رہنے کا ایک غیر منقطع تسلسل قائم رہے۔

بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ بارہویں صدی ہجری مطابق اٹھارہویں صدی عیسوی کی ایسی ہی فردِ فرید، ممتاز ترین اورعبقری شخصیت ہیں، جو نہ صرف اپنے منتخب علم وعمل، ممتاز اخلاق وکردار اور مثالی کمالات وفضائل کے ساتھ سرزمین ہندوستان پر نمایاں ہوئے؛ بلکہ ساتھ ہی ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر وہمہ جہت نصب العین بھی لے کر اٹھے جس میں مردہ دلوں میں روح پھونک دینے اورقوم کے پژمردہ پیکر میں ازسرنو جان ڈال دینے کی اسپرٹ موجود تھی اور جس نے بالآخر عملی طور پر یہی تاثیر بھی دکھلائی اورقوم کا ایک یگانۂ روزگار بطل جلیل بنا کر پیش کیا گیا ہے''۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کا مرکزی نصب العین تعلیم اسلامی کا فروغ تھا، جس سے کہ علم الٰہی کی شعائیں ہند وبیرون ہند میں پڑیں، ان کے نقطۂ نظر کے مطابق اس دور میں ہندوستان کے خوں آشام احوال اور ملت اسلامیہ کے تیز رفتاری کے ساتھ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی زوال پذیر حالات کے مدنظر اصلاح احوال اور تحفظ عقائد ودین کے لیے بجز اسلامی تعلیم کے سادہ؛ مگر مضبوط نظام کے قیام کے علاوہ اور کوئی دوسری راہ بھی نہیں تھی اور وقت نے یہ ثابت بھی کردیا کہ حضرت نانوتویؒ کا یہ فیصلہ ان کی ایمانی فراست اور بالہام حق جل مجدہٗ دوررس نتائج کے ادراک کو محیط تھا۔ امت مسلمہ کے لیے تاریخ اسلامی کی وہ محسن ساعات تاریخ میں ایک انقلاب انگیز اورسنہرے باب کی حیثیت رکھتی ہیں، جب کہ ملک کے عمومی ظلمت آمیز اور جبر و استبداد سے بھرپور ماحول میں حضرت قاسم العلوم الامام النانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی بابرکت قیادت میں حق تعالیٰ کی جانب سے منتخب کردہ نفوس قدسیہ کی نہایت مبارک ومسعود معیت میں مورخہ ۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ھ- مطابق ۳۰ رمئی ۱۸۶۶ء کو دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ انگریزی دورحکومت میں یورپ سے آئے ہوئے طوفانی الحاد، دہریت وعیسائیت کے طوفان پر قدغن لگانے والا پہلا تعلیمی ادارہ یہی دارالعلوم دیوبند ہے، جس کی داغ بیل کے لیے جہاں ایک طرف مذکورہ نفوس قدسیہ کو بالہام خداوندی منتخب فرمایا گیا تھا، وہیں دوسری طرف پاک باز خلوتوں میں سید الطائفہ شیخ طریقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ کی الحاح وارازی، التجا اوردعائے نیم شبی نے کام کیا اور حق تعالیٰ نے ان برگزیدہ وخدارسیدہ علماء اور بزرگوں کی مستجاب دعواتِ صالحہ کو ایسی قبولیت سے سرفراز فرمایا اور اس اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مدرسہ کو ایسی ترقی عطا فرمائی، کہ مایوس کن اور ظلمت آمیز ماحول میں جو مدرسہ چھتہ مسجد کے ایک انار کے درخت کے نیچے ایک استاذ حضرت ملا محمود صاحبؒ اور ایک شاگرد حضرت مولانا محمود حسن صاحب المعروف بہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہما سے جاری ہوا تھا، اسے نہ صرف برصغیر؛ بلکہ عالمی علمی مرکز ومرجع بنادیا اور اس نے کتاب وسنت اسلام اور مسلمانوں کی ایسی محیر العقول اورعظیم الشان خدمات انجام دیں، جس سے دین اسلام کا چرچا عام ہوگیا اور نصب العین کے مطابق سوئی ہوئی امت مسلمہ میں دینی واسلامی شعور بیدار ہوگیا اور غیرملکی حکومت کا خوف وہراس ان کے دلوں سے نکل گیا؛ بلکہ اسی مدرسہ کے فارغین وفضلاء کی ہی جدوجہد سے ملک نے استبدادی قوتوں سے آزادی حاصل کی اور ملک کے طول وعرض میں حضرت بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی مخلصانہ جہود سے عوامی چندوں سے چلنے والے دوسرے ادارے اسی نہج اور

طرز پر قائم ہوئے، اور اس طرح سارے ملک میں دینی مدارس کے قیام کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی عام مسلمان ایمان وایقان کی دولت سے مالا مال ہوگئے۔ چناں چہ جہاں ایک طرف حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہٗ کی یہ تحریک مدارس انحائے عالم میں مسلک دیوبند یا دیوبندیت کے عنوان سے معروف ومتعارف ہوئی، وہیں دوسری جانب مرور وقت کے ساتھ اصحابِ علم وعمل سے لے کر عامۃ المسلمین تک اس مبنی برحقیقت تاریخی روایت کو تواتر کے ساتھ ذات حق جلّ مجدہٗ کی طرف سے یہ سند قبول بھی عطا ہوئی، کہ حضرت قاسم العلوم والخیرات نہ صرف دارالعلوم دیوبند کے ہی بانی ہیں؛ بلکہ برصغیر سے لے کر عالمی سطح تک تحریک مدارس کے بھی بانی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ڈیڑھ سو سالہ تاریخ اسی حقیقت واقعہ پر شاہد عدل ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی معتدل مسلک صحیح کے مطابق خواہ مدارس کی شکل میں، خواہ دعوت وتبلیغ کی صورت میں ہو، خواہ اجتماعی اور علمی دوائر کے پیرائے میں ہو، بہمہ نوع اشکال میں دین بین کی عظیم الشان اور رفیع المرتبت خدمات انجام دی جارہی ہیں، ان تمام فیض رسانیوں کے سلسلے اور سوت واسطہ یا بلاواسطہ بانی دارالعلوم دیوبند کی تحریک مدارس سے جڑتے ہیں؛ کیوں کہ دارالعلوم دیوبند کا قیام محض ایک مدرسہ اور ایک ادارے کا ہی قیام نہیں تھا؛ بلکہ بصورت مدرسہ صدیوں پر محیط عظیم نتائج برآمد کرنے والی رجال سازی کی تحریک اور علم وعمل کے کہکشانی سلسلے میں اجتماعیت کا شان آغاز تھا اور گذرتے وقت نے بانی دارالعلوم دیوبند کی ایمانی فراست کے زیر اثر دوررس نتائج کے حامل آفاقی فکر پر مہر تصدیق ثبت کردی کہ علم وعمل، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ، سیاست وصحافت، اجتماعیت وقیادت، تحریک حریت وطن جیسا کون سا میدان ایسا ہے، جس میں کثرت کے ساتھ اس رجال ساز فیکٹری میں عظیم الشان اور عبقری شخصیات ڈھل ڈھل کر اپنے اپنے ادوار کے مطلوبہ تقاضوں سے ہم آہنگ عظیم المرتبت افراد کار نے امت کی رہنمائی اور قیادت کے فرائض انجام نہ دیے ہوں۔ اس تحریک کے کہکشانی سلسلے کے جلو میں علم وعمل کے آفتاب و ماہتاب کے محض ناموں کو ہی شمار اگر کیا جائے، تو کارنامے تو بجائے خود صرف ناموں کی فہرست اور ان کا تعارف ہی ایک مستقبل کتاب کی صورت بن جائے۔ علیٰ سبیل المثال اس تحریک کے آسمان علم وعمل میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب، حضرت مولانا محمد احمد صاحب، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمہم اللہ علیہم اجمعین جیسے ہزاروں درخشاں وتابندہ شمس وقمر اپنے علم وعمل کی معنویت کے لحاظ سے آج بھی فیض رساں ہیں، یہ سلسلہ جاری ہے اور انشاءاللہ! جاری رہے گا۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ رقم طراز ہیں کہ: ''دارالعلوم دیوبند کے اس ہمہ گیر تعلیمی نظام نے جو مدارس کی ضرورت میں ہندوستان بھر میں پھیلا اور دہریت والحاد کے اس سیلاب پر بندھ لگایا، جو مغرب کی جانب سے ہوتا ہوا دیار ہند کے گھروں میں داخل ہوا چاہتا تھا، اگر لارڈ میکالے نے یہ کہہ کر اپنا نظام تعلیم ہندوستان میں پھیلایا تھا کہ: ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے، جو رنگ ونسل کے لحاظ سے

ہندوستانی اور روح وفکر کے لحاظ سے انگریز''، تو حضرت قاسم العلومؒ نے دار العلوم کی بنیاد ڈالتے ہوئے لسانِ حال سے یہ علمی صدا بلند کی: ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے، جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندی و سندھی، ایرانی و افغانی اور خراسانی و ترکستانی ہوں؛ لیکن روح وفکر کے لحاظ سے اسلامی وعربیت کی روح سے معمور ہوں''۔

جیسا کہ زیرِنظر تحریر کی ابتدا میں عرض کیا تھا کہ ایسی ہمہ جہت وہشت پہلو شخصیت پر محدود صفحات کی حدود و قیود کے ساتھ کسی ایک جہت پر ہی سہی مضمون تو بجائے خود ہے، تقریظ کے تعارف وتمہید کا بھی حق ادا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بس بالفاظِ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی تابندہ و پائندہ تاریخ کی ایک اعلیٰ و با مقصد زندگی اپنے تبحرِ علم وفہم، بصیرت وفراست، ذکاوت و ذہانت، عدیم المثال جد وجہد، حسن کردار وعمل اور اعلیٰ اخلاق و اخلاص سے صدیوں تک کے لیے اپنے مابعد لوگوں کو حیات آفریں مقصد وہدف سے متعارف وہم کنار کر کے آسودۂ رحمت ہوگئی ہے۔

دار العلوم وقف دیوبند میں عہد حاضر کے تقاضوں اور مطالبات سے ہم آہنگ شعبۂ بحث وتحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے قیام کے بنیادی واساسی مقاصد کا ایک اہم ترین حصہ بہ شمول طلبۂ عزیز کو عصر حاضر کے لازمی تقاضوں سے متعارف وروشناس کرانے اور مختلف ومتنوع عناوین پر مشتمل، شخصیتوں کے سیر حاصل محاضرات کے ذریعہ مفید مطلب معلومات فراہم کرانے؛ نیز آج کی رائج الوقت زبان انگریزی میں قدرتِ تحریر وبیان اور منظم تعلیم وتربیت کے ساتھ ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے جیسے اہم ترین مقاصد کے حامل ہیں، تاکہ اپنے اکابر واسلاف کے عظیم الشان کارناموں اور ان کی علمی تراث کی بایں طور حفاظت کی جا سکے، کہ بحث وتحقیق کے جدید اسالیب وضوابط کے زیرِاثر نئے سرے سے اس پہلو پر کام کرایا جائے؛ نیز عربی، انگریزی میں ان کے بلند پایہ تراجم کے ذریعہ عرب ویورپ اور دنیا کے دیگر علمی دوائر میں اپنے اکابر واسلاف کی تاریخ ساز اس عظیم ترین علمی تراث کو متعارف کرایا جائے۔

بارگاہِ ایزدی میں بہ ہزار سجدۂ شکر بطور تحدیث نعمت وتوفیق اس حقیقت کا اظہار برموقع وبرمحل ہوگا کہ: حجۃ الاسلام اکیڈمی عزیزم مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی سلمہ، ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی واستاذ دار العلوم وقف دیوبند کے زیرِانتظام ان کے مخلص رفقائے کار کی مخلصانہ جہود وکاوشوں کے ساتھ اپنے بنیادی واساسی مقاصد کی راہ پر گامزن ہے، اور یہ تاریخ ساز عظیم ترین علمی دستاویز: ''نگارشاتِ اکابر بتذکرۂ جواہر معارف'' بھی اکیڈمی کے علمی سفر کا سنگ میل ہے، جس کے لیے بجا طور تمام شرکائے کار تشجیع وتبریک کے مستحق ہیں۔

حق تعالیٰ ہم جملہ اخلاف کو اتباعِ رسول اللہ ﷺ پر استقامت کے ساتھ اپنے اکابر واسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق سے سرفراز فرماتے ہوئے اس تاریخ ساز دستاویز کی اشاعت میں شریک تمام افراد کار کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائیں۔ وباللہ التوفیق

محمد سفیان قاسمی
مہتمم دار العلوم وقف دیوبند
۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ – مطابق ۱۳ دسمبر ۲۰۱۷ء

عرض ناشر

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی نور اللہ مرقدہ، بانی دار العلوم دیوبند کی شخصیت کی مرکزیت سے کس کو اختلاف ہوسکتا ہے۔ ڈیڑھ صدی گزر جانے کے باوجود آج بھی ان کے نام لیواؤں اور عقیدت مندوں کی تعداد میں کمی نہیں آئی؛ بلکہ روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ان سے محبت کرنے والے، ان کے علوم وافکار سے وابستگی اور لگاؤ رکھنے والوں کی تعداد امکانی حدِّ احصاء وشمار سے متجاوز ہے۔ دنیا کا کون سا ایسا خطہ ہے، جہاں ان کے علوم وافکار سے فیض یافتگان کی قدم رنجائی نہ ہوئی ہو؛ لیکن اس کے باوجود ایک حرفِ شکوئی وشکایت ہر وقت زبانِ زدِ خاص وعام رہا ہے کہ اُس مرکزی ہستی کے علوم وافکار کی ترویج واشاعت اور ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی پر جس نوعیت کی توجہ مرکوز کی جانی چاہیے تھی، اُس کا عشر عشیر بھی معرضِ وجود میں نہیں آیا۔ اور ہر دور میں اس احساس کے باوجود کسی کی جانب سے بھی اس طرف کامل توجہ مبذول نہیں ہو پائی اور حرفِ شکوئی صرف زبان پر آکر ہی ختم ہوگیا؛ حالاں کہ جس شان کی شخصیت ہے، فکری زاویے سے دیکھا جائے، تو رازی وغزالی بھی ماند نظر آتے ہیں؛ کیوں کہ اُن کا زمانہ فکری انحطاط کا زمانہ ضرور تھا؛ لیکن حضرت الامام النانوتویؒ کا زمانہ فکری انحطاط کا نہیں؛ بلکہ فکری اماتت کا زمانہ تھا، جہاں فکرِ اسلامی کو ہی بیخ وبن سے اُکھاڑ پھینکنے کی سازش رچی گئی تھی اور حضرتِ حق جل مجدہ کی جانب سے حضرت الامام النانوتویؒ کو اُس سازش کو ناکام کرنے کا سبب اور ذریعہ بنایا گیا۔

اس تعلق سے مجلّہ ''یادگارِ اکابر کا حجۃ الاسلام نمبر'' ایک نہایت ہی جامع اور پُر از مواد مجلّہ ہے، جس میں حجۃ الاسلام الامام النانوتویؒ کی پوری زندگی: حیات وخدمات اور کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے، اور ایسے مقالات ومضامین بھی ہیں، جن سے ان کی زندگی کے نادر گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا موزوں ہوگا کہ یہ مجلّہ نوابغ کے نوادر کا مجموعہ ہے؛ کیوں کہ مقالات ومضامین بھی ایسی عظیم ہستیوں کے جمع کیے گئے ہیں، جو واقعی اپنے وقت کے نابغۂ روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ، انہوں نے حضرت الامامؒ کی زندگی کا بہ غور مطالعہ کیا تھا اور ان کے علوم وافکار سے عشق کی حد تک وابستگی تھی۔ بنابریں لائق التفات، قابل توجہ اور تحسین وآفرین کا مستحق ہے یہ مجلّہ اور مبارک باد کے مستحق ہیں مجلّہ کے ایڈیٹر اور جملہ متعلقین، جنہوں نے کافی محنت اور چھان پھٹک کر مقالات ومضامین کو یک جا جمع کر کے استفادہ کے قابل بنادیا۔ اور ہم شکر گزار

ہیں جناب نعمان امین صاحب مدظلہ کے، جنہوں نے جملہ حقوق کے ساتھ اس مجلّہ کی اشاعت کی اجازت حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند کو مرحمت فرمائی۔

بغرضِ اشاعت حجۃ الاسلام اکیڈمی نے اس کی پروف ریڈنگ کرائی، مزید برآں اس میں درج ذیل امور کی طرف خاصی توجہ مبذول کی گئی:

(۱) مقالات ومضامین میں کسی طرح کی کوئی لفظی، یا معنوی، یا تاریخی تسامح یا غلطی حتی المقدور باقی نہ رہ پائے، اس کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

(۲) حجۃ الاسلام اکیڈمی کے مقرر کردہ جدید اسلوبِ نگارش اور علاماتِ ترقیم کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

(۳) بعض اہم اور مفید مقالات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

(۴) انڈیکسنگ کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

اور چوں کہ حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند کے اساسی اغراض ومقاصد اور اولین ترجیحات میں حضرت الامام النانوتویؒ اور ان کے علوم وافکار کی ترویج واشاعت بھی شامل ہے؛ اس لیے اکیڈمی اس مجلّہ کو بہ نام: ''نگارشاتِ اکابر بتذکرۂ جواہر معارف'' شائع کرکے اپنے مقاصد کی تکمیل کی طرف پابہ رکاب ہے۔ امید ہے کہ تشنہ لبانِ علوم قاسمی اور مشتاقانِ معارفِ امام نانوتویؒ کے لیے باعثِ سیرابی ہوگی۔

میں اس موقع پر مفتی عبدالمنان صاحب قاسمی کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن کی جہد مسلسل سے یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر نذرِ قارئین ہونے جارہی ہے۔ موصوف نے نہ صرف دقتِ نظر کے ساتھ تصحیح اور پروف ریڈنگ کا کام کیا ہے؛ بلکہ اس کی تہذیب وتنقیح بھی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کے لیے اس کام کو دنیا وآخرت کی فلاح وکامرانی کا ذریعہ بنائے، اور ان کی اس کاوش کو قبول فرمائے۔ آمین

محمد شکیب قاسمی

استاذ دارالعلوم وقف دیوبند وڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی

۲؍جمادی الاولی ۱۴۳۹ھ ــــ ۲۰؍جنوری ۲۰۱۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اپنی بات

اللہ رب العزت کا بے انتہا شکر ہے کہ اکابر علمائے دیوبند کے نایاب مقالات کے لیے مخصوص سالانہ مجلّہ ''یادگار اکابر'' کے پہلے نقش کو جہاں عوام الناس نے پسند کیا، وہیں اہل علم و دانش نے بھی پسند فرمایا۔ اخبارات و رسائل میں مبصرین نے یہ تجویز بھی دی کہ اس مجلّے کے لیے ایک سال کا انتظار بہت کٹھن ہے؛ اس لیے کم از کم سہ ماہی مجلّہ بنا دیا جائے۔ تمام مبصرین کی آرا قابل احترام ہیں؛ لیکن ہم مجبور ہیں کہ اس مجلّے کو سالانہ سے نیچے نہیں لا سکتے۔ اللہ ربّ العزت اسے سال بہ سال پابندی سے جاری رکھے، تو یہ بھی ایک عاجزانہ خدمت ہے۔

ذیل میں، ہم صرف ان خطوط کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں، جو 'یادگار اکابر'' کے پہلے مجلّے کی اشاعت پر مدیر مجلّہ کو موصول ہوئے:

نامور مصنف اور عالم دین حضرت مولانا عبد القیوم حقانی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

''یادگار اکابر'' کا پہلا سال نامہ ملا، واقعی ایک علمی، ادبی شہ پارہ اور عظیم تاریخی یادگار ہے۔ آپ کا ہدف صحیح ہے، سمت درست ہے، رفتارِ کار فطرت کے مطابق ہے۔

''یادگار'' جوں ہی ملا، کھولا تو کھو گیا اور پڑھتا ہی چلا گیا۔ کل سے اب تک سارا پرچہ مکمل پڑھ لیا ہے، سیری نہیں ہوئی، اور اب دوبارہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ 'بازآ' اور بعض دیگر مفید مضامین 'یادگار' کے شکریہ کے ساتھ ''القاسم'' کے صفحات کی زینت بنیں گے، ان شاء اللہ!

''القاسم'' میں اشتہار بھی چھپے گا اور تعارف بھی!

اس قدر عظیم کارنامے پر آپ کو سونے سے تو لوں، تب بھی حقِ تشکر و امتنان ادا نہیں ہو سکتا؛ مگر میں تو اس سے بھی بڑھ کر؛ بلکہ کروڑ چند بڑھ کر ایک عظیم انعام آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ یہ ''شرح صحیح مسلم'' کی پانچ جلدیں ہیں۔ میں اسے حقیر نہیں کہتا، یہ عظیم تحفہ ہے۔ مجھے یقین ہے آپ کا آئندہ 'یادگار' بھی عظیم ہوگا۔ عظیم شخصیت کا انتخاب ہے۔ ترتیب و تالیف، انتخاب بھی عظیم تر ہونا چاہیے۔ مکرر مبارک باد قبول فرمائیے''۔ (۱۴/ذوالحجہ الحرام ۱۴۳۵ھ/۱۰/اکتوبر ۲۰۱۴ء)۔

ممتاز ادیب اور دانش ور محترم ڈاکٹر سفیر اختر صاحب زادمجدہٗ تحریر فرماتے ہیں:

'یادگارِ اکابر' کے دو نسخے موصول ہوئے۔ شکریہ قبول کیجیے۔

آپ نے بہت سے مضامین 'الرشید'، 'القاسم'، 'دارالعلوم' اور 'تذکرہ' وغیرہ کی مجلدات سے اخذ کر کے یک جا کر دیے ہیں۔ مضامین متنوع موضوعات پر ہیں، اور قارئین کو اپنے ذوق کی کوئی نہ کوئی چیز ان میں مل جائے گی؛ مگر آپ نے ''اپنی بات'' کے تحت قاری شریف احمدؒ کی جو تجویز نقل کی ہے، مجھے تو اس میں بہت وزن لگتا ہے۔ ہر مہینے اگر ایک شمارہ شائع نہ ہو سکے، تو ایک سال میں ایک جلد بہ طور reprint شائع کر دی جائے۔ آخر کتنے ہی رسائل کی (اردو زبان کے رسائل نہیں؛ بلکہ یورپی زبانوں کے رسائل مراد ہیں) پوری پوری فائلیں reprint ہو گئی ہیں۔ حیدر آباد دکن 'اسلامک کلچر' بھی ان میں شامل ہے۔

بہر حال! آپ نے جس طرح کام کرنا پسند کیا، اللہ تعالیٰ اس میں بہت ہی برکت دے، اور اگلا شمارہ اور پھر اس سے اگلا شمارہ شائع ہوتا رہے، اور ایک چراغ کے بعد دوسرا چراغ! (۱۸/ ذوالحجہ ۱۴۳۵ھ/۱۴/ اکتوبر ۲۰۱۴ء)۔

بزرگ عالم دین اور عامل کامل حضرت مولانا اعجاز احمد خاں سنگھانوی مدظلہٗ (صاحبِ آسان عملیات و تعویذات) تحریر فرماتے ہیں:

''آپ نے 'یادگارِ اکابر' شائع فرما کر امت مسلمہ کو اپنے اکابر سے قریب ترین کر دیا۔ گویا ان کی خدمت میں بیٹھے ان کے مواعظ، کلام تحریر سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ مجھے تو اس کتاب کو بار بار پڑھنے کا شوق ہوتا ہے، اور تھوڑی فرصت میں اس کو پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ ماشاءاللہ! آپ کا انتخاب لاجواب، لائق تحسین ہے۔ اللہ تعالیٰ اس عظیم خدمت کو قبول فرما کر اعلیٰ سے اعلیٰ بلند ترین قرب سے نوازے، اور ان بزرگانِ گرامیٔ قدر کے فیوضات سے پورا پورا نفع مند بنائے۔ آمین ثم آمین!

'یادگار اکابر' میں صفحہ ۲۷۴، سطر ۷، ۸ پر ''مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ'' کا ترجمہ غلط ہو گیا۔ ترجمہ میں: ''اور پیغمبروں میں نئی چیز نہیں'' ہونا چاہیے، اور شروع میں 'اور' بھی نہیں ہونا چاہیے۔ کتاب میں اس طرح چھپا ہے: ''اور تو پیغمبروں میں نئی چیز نہیں''؛ کیوں کہ شروع میں ''وَ'' ہوتا، تو ''اور'' کا ترجمہ ہوتا، جب کہ ''مَا كُنْتُ'' ہے۔ آئندہ سال نامہ جون ۲۰۱۵ء/ میں چھپے گا، تو اس میں تصحیح شائع فرمائیں۔

ایسا اچھا رسالہ شائع کرنے پر بہت بہت مبارک باد قبول فرمائیں''۔ (۲۷/ جنوری ۲۰۱۵ء)

معاونین کرام:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جن بزرگوں نے ''یادگار اکابر'' کا پہلا مجلّہ خرید فرما کر اس کی اشاعت میں حصہ لیا، ان کا تذکرہ ہو جائے:

(۱) حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی مدظلہم (مدیر ماہ نامہ القاسم-نوشہرہ، مہتمم جامعہ ابی ہریرہؓ-نوشہرہ) نے بیس مجلّے خرید کر اپنے احباب میں تقسیم فرمائے۔ ''ادارۂ یادگار اکابر'' مولانا کی حوصلہ افزائی کا ممنون ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی خدماتِ عالیہ کو قبول فرمائے۔ آمین!

(۲) حضرت مولانا مفتی محمد نعیم اسعدی مدظلہم (مہتمم مدرسہ ریاض الجنۃ- کراچی، روحِ رواں کاروانِ اسعدی) نے اپنے حلقۂ اثر میں اکابر دیوبند رحمہم اللہ کی فکر ونظر کی اشاعت کی غرض سے ایک سو نسخے خرید فرمائے۔ موصوف اکابر دیوبند کے خادم کی حیثیت سے ''مسلک دیوبند'' کے تحفظ میں پیش پیش ہیں۔ یہ ان پر محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور فدائے ملت مرشدی حضرت مولانا سید اسعد مدنی قدس سرہٗ (جو حضرت مفتی صاحب کے بھی مرشد ہیں) کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید قبول فرمائے۔ آمین!

(۳) ''یادگار اکابر'' کے سرپرست اور جامعہ یوسفیہ بنوریہ- کراچی کے بانی اور مہتمم، استاذ محترم حضرت مولانا حسن الرحمٰن صاحب یوسفی مدظلہم نے بھی مجلّے کے ایک سو نسخے خرید فرما کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔ حضرت الاستاذ مدظلہم کو اللہ تعالیٰ نے اکابر دیوبند کی نظر وفکر کی اشاعت کا ایک خاص جذبہ عطا فرمایا ہے۔ یہ جذبہ موجودہ علمائے دیوبند کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت محترم مدظلہم کو عافیت کے ساتھ خدمتِ دین کے لیے مزید قبول فرمائے۔ آمین!

ہماری علمائے کرام اور دیگر قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اس مجلّے کی اشاعت میں حصہ لے کر اپنے اکابر رحمہم اللہ سے تعلق کو مزید مضبوط بنائیں۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے خریدار اور ان کا چندہ مجلّے کے لیے وصول فرما کر ہمیں روانہ فرمائیں۔ جزاکم اللہ!

اب ہم آتے ہیں زیرِ نظر نمبر کی طرف، جو ''یادگار اکابر'' کا دوسرا نقش؛ لیکن بہ طور نمبر کے ہے۔ یعنی ''یادگار اکابر'' کا حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نمبر''۔

اپنی کم علمی، لکھنے کے ہنر سے ناواقفیت اور الفاظ کے چناؤ سے نابلد ہونے کے باوجود آج اس شخصیت کے لیے قلم اٹھایا ہے، جو تاریخِ اسلامی کا وہ بلند وبالا پہاڑ ہے، جس نے کم سے کم برصغیر پاک وہند میں اسلام کو اس کی اصل صورت میں قائم رکھا۔ جس طرح اللہ رب العزت نے پہاڑ اس لیے بنائے ہیں کہ وہ زمین کو تھامے رہیں، اسی طرح اللہ رب العزت نے حجۃ الاسلام، بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اسلام کو اس خطے میں جمانے کے لیے بھیجا تھا۔

اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کرنے سے پہلے ہی اللہ رب العزت نے حجۃ الاسلامؒ سے کتنے ہی اہم کام لیے، جن میں انگریز سامراج کے خلاف جہاد، اس کے علاوہ اسلام پر اعتراضات کرنے والے ہندو پنڈتوں اور عیسائی پادریوں سے مناظرے، دار العلوم دیوبند جیسی عظیم وعالی شان درس گاہ کا قیام، اس کے علاوہ حضرتؒ کی قیمتی تصانیف جو ردِ شیعیت، رد بدعات، ردِ غیر مقلدیت کے علاوہ قرآن وحدیث کے بے

شمار اسرار و رموز کو کھولنے والی تحریرات بھی ہیں، آپ ہی کی خدمات کا حصہ ہیں۔

اتنی کم عمر میں دین اسلام کی اتنی خدمات پر علامہ اقبال مرحوم کے یہ اشعار ذہن میں آ جاتے ہیں: ؎

یہ غازی، یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی خدمات اور ان کی بلند پایہ شخصیت کے بارے میں اپنے اور پرائے، جن علما و مشائخ نے جو کچھ کہا، جو میرے بہت ہی محدود مطالعے میں ہے، وہ ان سطور میں درج کر رہا ہوں کہ یہ خراجِ عقیدت ہے حجۃ الاسلام، قاسم العلوم والخیرات، الامام محمد قاسم النانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو۔

۱- شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے بھی شیخ ہیں، اپنے مرید حضرت حجۃ الاسلامؒ کے بارے میں اپنے متعلقین سے فرماتے ہیں:

"اور جو شخص اس فقیر سے محبت و عقیدت و ارادت رکھے، مولوی رشید احمد سلمہ گنگوہی اور مولوی محمد قاسم سلمہ نانوتوی کو کہ تمام کمالاتِ ظاہری و باطنی ان میں موجود ہیں، راقم (حضرت حاجی امداد اللہؒ) کی جگہ سمجھے؛ بلکہ مجھ سے فائق المدارج جانے۔ اگر چہ ظاہری معاملہ برعکس ہو گیا کہ میں ان کی جگہ اور وہ میری جگہ ہو گئے، اور ان کی صحبت کو غنیمت سمجھے کہ اس زمانے میں ایسے آدمی نایاب ہیں"[۱]۔

ایک شیخ کا اپنے مرید کے بارے میں یہ کہنا کہ انہیں میری جگہ ہونا چاہیے تھا۔ یعنی وہ میرے شیخ ہوتے، اور اس زمانے میں ایسے آدمی نایاب ہیں۔ یہ حضرت حجۃ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے مرتبہ اور مقام کو واضح کرتا ہے۔

۲- حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ فرمایا کرتے تھے کہ:

"اگر حق تعالیٰ مجھ سے دریافت کرے گا کہ: امداد اللہ! کیا لائے؟ تو میں قاسم اور رشید کو پیش کر دوں گا کہ یہ لے کر حاضر ہوا ہوں"[۲]۔

۳- حضرت حاجی صاحبؒ نے اپنے مرید حضرت حجۃ الاسلامؒ کے بارے میں فرمایا کہ:

"حق تعالیٰ اپنے بندوں کو جو اصطلاحی عالم نہیں ہوتے ایک لسان عطا فرماتے ہیں؛ چناں چہ حضرت شمس تبریزیؒ کو مولانا رومیؒ لسان عطا ہوئے تھے، جنہوں نے حضرت شمس تبریزیؒ کے علوم کو کھول کھول کر بیان فرما دیا۔ اسی طرح مجھے مولوی قاسم صاحب لسان عطا ہوئے ہیں"[۳]۔

---

(۱) ضیاء القلوب، ص:۱۰۲-۱۰۰۔ (۲) معارف الاکابر، ص:۲۳۵۔ (۳) قصص الاکابر، ص:۷۵؛ امداد المشتاق، ص:۱۶۔

۴-ایک بار حضرت حاجی صاحبؒ کی مجلس میں حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا تذکرہ ہو رہا تھا اور ان کے مناقب بیان ہو رہے تھے، حضرت حاجی صاحبؒ نے حضرت حجۃ الاسلامؒ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ:

''مولانا اسماعیلؒ تو تھے ہی، کوئی ہمارے اسماعیل کو بھی دیکھے''(۱)۔

۵-حضرت حاجی صاحبؒ نے حضرت حجۃ الاسلامؒ کے والد کے خط کے جواب میں جو جملہ لکھا تھا، وہ بھی پڑھنے والوں کی نظر میں ہونا چاہیے۔ فرماتے ہیں:

''اور شکر کریں کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں ایک ولیٔ کامل بیٹا عطا فرمایا ہے''(۲)۔

۶-حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ جب پہلی بار حج پر گئے تھے اور وہاں حضرت حاجی صاحبؒ سے ملاقات ہوئی تھی تو حضرت حاجی صاحبؒ نے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بارے میں فرمایا تھا:

''ایسے لوگ کبھی پہلے زمانے میں ہوا کرتے تھے''(۳)۔

ایک شیخ کا اپنے مرید کے بارے میں ایسے کلمات ادا کرنا، اس مرید کی قدر و منزلت کو واضح کرتا ہے۔

۷-حضرت مولانا مہتاب علی صاحبؒ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے استاذ تھے اور حضرتؒ کے پڑھنے کے زمانے میں ہی انہوں نے اپنے شاگرد کا نام ''علم کی بکری'' رکھ دیا تھا(۴)۔

۸-حضرت مفتی صدر الدین صاحبؒ کا شمار بھی حضرت کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ایک موقع پر مفتی صدر الدینؒ نے حضرت نانوتویؒ کے بارے میں فرمایا تھا:

''قاسم بہت ذہین آدمی ہے، اپنی ذہانت سے قابو میں نہیں آتا''(۵)۔

اساتذہ کا اپنے شاگرد کے بارے میں یہ بیان بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔

۹-مولانا محمد امین احسن گیلانیؒ غالباً حضرت کے ہم عصر علما میں سے تھے، اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے جدِّ امجد تھے، وہ حضرت حجۃ الاسلامؒ کی تقریر کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ:

''مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی زبانِ مبارک پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح القدس کی تقریر ہو رہی ہے''(۶)۔

۱۰-حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اپنے استاذ حجۃ الاسلامؒ کے درس سے متعلق فرماتے تھے کہ:

''جب استاذ رحمۃ اللہ علیہ (حضرت نانوتویؒ) سے کوئی بات پوچھی جاتی، تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس مسئلے کے تمام دلائل اک دم ہاتھ جوڑے ہوئے حضرت کے سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں''(۷)۔

یہ تو وہ چند باتیں تھیں، جو حضرت حجۃ الاسلامؒ کے متعلق اپنوں نے کہیں۔ پرائے حضرتؒ کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے؟ اس کا بھی یہاں تذکرہ ضروری ہے:

(۱) ارواحِ ثلاثہ، ص: ۲۰۴۔ (۲) انوارِ قاسمی، ص: ۲۰۱۔ (۳) ایضاً، ص: ۵۵۰۔ (۴) گیلانی، سید مناظر احسن، **سوانحِ قاسمی**، جلد ۱، ص: ۱۹۲۔ (۵) گیلانی، سید مناظر احسن، **سوانحِ قاسمی**، جلد ۱، ص: ۲۶۶۔ (۶) ایضاً، ج ۱، ص ۳۹۲۔ (۷) ایضاً، ج ۱، ص: ۳۴۳۔

۱۱-حکیم برکات احمد خیرآبادیؒ اپنے صاحب زادے حکیم محمود احمد برکاتی سے فرماتے ہیں:

''مجھے ان (حضرت اقدس نانوتویؒ) سے ملانے کے لیے (والد صاحب حکیم دائم علی خیر آبادیؒ) دیوبند لے گئے، جب ہم پہنچے تو (حضرت اقدس مولانا نانوتویؒ) چھتہ کی مسجد میں سو رہے تھے، مگر اس حالت میں بھی ان کا دل ذاکر تھا اور ذکر بھی بالجہر کررہا تھا''(۱)۔

۱۲-جب حضرت مولانا معین الدین اجمیریؒ سے حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ:

''یہ حضرات مسلمان اور مسلمانوں کے پیشوا ہیں''(۲)۔

جب مولوی احمد رضا خان صاحب بریلویؒ نے علمائے دیوبند خصوصاً مندرجہ بالا پانچ بزرگوں پر کفر کا فتوی لگایا، تو مولانا محمد عبدالرؤف خاں جگن پوریؒ نے ۱۹۳۱ء میں پورے ہندوستان میں علما اور مشائخ سے فتویٰ طلب کیا کہ: کیا حقیقتاً یہ پانچ بزرگ کافر ہیں، تو اس کے جواب میں علمائے دیوبند کے حق میں ایک سو چالیس فتاوے اور ان پر چھ سو سولہ علما اور مشائخ کی تصدیقات کے ساتھ ان تمام فتاواجات کو ۱۹۳۴ء میں ''بَـرَاءَةُ الْأَبْـرَارِ عَـنْ مَـكَائِـدِ الْأَشْـرَارِ''، ملقب بہ: ''قہر آسمانی بر فرقہ رضا خانی'' کے نام سے چھاپ دیا گیا تھا۔ یہ تمام فتاواجات ۲۰۱۲ء میں تحفظ نظریات دیوبند اکادمی-پاکستان دوبارہ عکسی چھاپ کر اس نایاب کتاب کو منظر عام پر لے آئی ہے۔

۱۳-حضرت مولانا خواجہ قمر الدین سیالویؒ فرماتے ہیں:

''میں نے تحذیر الناس کو دیکھا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو اعلیٰ درجے کا مسلمان سمجھتا ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میری حدیث کی سند میں ان (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) کا نام موجود ہے۔ خاتم النبیین کے معنی بیان کرتے ہوئے جہاں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا دماغ پہنچا ہے، وہاں تک معترضین کی سمجھ نہیں گئی۔ قضیۂ فرضیہ کو قضیۂ واقعیہ حقیقیہ سمجھ لیا گیا ہے''(۳)۔

۱۴-مولانا محمد سعید صاحبؒ مری والے بیان فرماتے ہیں کہ:

''میں حضرت پیر صاحب گولڑویؒ کی خدمت میں حاضر تھا، ایک شخص آیا اور اس نے دریافت کیا: آپ مولوی قاسم صاحب کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں؟ حضرت پیر صاحبؒ نے جواباً فرمایا: تم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق پوچھتے ہو؟ سائل نے عرض کیا: جی ہاں، ان ہی کے متعلق۔ حضرت پیر صاحبؒ نے فرمایا: وہ حق کی صفت علم کے مظہر اتم تھے''(۴)۔

---

(۱) حکیم محمود احمد برکاتی خیرآبادی، **سوانح حیات حکیم سید برکات احمد**، ص: ۱۸۵۔　(۲) براءۃ الابرار، ص: ۲۰۹۔
(۳) ڈھول کی آواز، ص: ۱۱۷۔　(۴) اسوۂ اکابر، ص: ۲۸-۲۷۔

۱۵- حافظ محمد حسین مراد آبادیؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ہم عصر تھے، اور آپ نے حضرت نانوتویؒ کو بہت قریب سے دیکھا ہے، وہ حضرت نانوتویؒ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''حضرت حاجی (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) خانۂ خدا اور زائر روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، قصبۂ نانوتہ کے اکابر صدیقی شیوخ سے ہیں۔ عالم، متقی وربانی وحقانی اور واقفِ اسرارِ شریعت وطریقت ہیں''(۱)۔

۱۶- حضرت مولانا سید عبدالحی رحمہ اللہ، والد ماجد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ حضرت نانوتویؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

''آپ (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) بہت ہی زیادہ زاہد اور عبادت گزار تھے، ذکر اور مراقبہ کا بھی بہت ہی کثرت سے اہتمام کرتے تھے، اور علما وفقہا کے علامتی لباس، یعنی عمامہ اور جبہ وغیرہ سے پرہیز کرتے، تاکہ آپ لوگوں پر مخفی رہیں۔ اس زمانے میں آپ نہ کوئی فتوی دیتے، نہ ہی کوئی وعظ کہتے؛ بلکہ صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ذکر اور مراقبے میں زیادہ سے زیادہ مشغول رہتے، یہاں تک کہ ان کی برکت سے آپ پر حقائق ومعارف کے دروازے کھل گئے''(۲)۔

۱۷- مولانا فقیر محمد جہلمیؒ نے ۱۸۸۰ء میں ''حَدَائِقُ الْحَنَفِیَّةِ'' نامی کتاب لکھی، جس میں انہوں نے حنفی علما اور فقہا کا تذکرہ کیا ہے۔ ان ہی علما کی فہرست میں آپ نے حضرت نانوتویؒ کا ذکر نہایت حقیقت پسندانہ کیا ہے۔ حضرت نانوتویؒ کا تذکرہ کرتے وقت یہ الفاظ بھی آپ کے مضمون کا حصہ تھے کہ:

''علامۂ عصر، فہامۂ دہر، فاضل متبحر، مناظر، مباحث، حسن التقریر، ذہین، معقولات کے گویا پتلے تھے۔ آپ لڑکپن ہی سے ذہین، طباع، بلند ہمت، تیز، وسیع حوصلہ، جفاکش، جری تھے''(۳)۔

۱۸- حافظ عبدالرحمٰن حیرتؒ اپنی کتاب ''سفینۂ رحمانی''، سن طباعت: ۱۸۸۴ء میں حضرت نانوتویؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

''بیشۂ فضل وکمال کے شیر، گل زارِ عشقِ الٰہی کی خوش بو، شبستانِ طریقت وشریعت کی شمع، آسمانِ حقیقت ومعرفت کے خورشید، عالم کامل اور جود وسخا میں رشکِ حاتم، جناب حضرت مولوی محمد قاسم صاحب (اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور فرمائے) قصبۂ نانوتہ کے برگزیدہ علما وفضلا میں سے تھے۔ طرح طرح کے علوم کی منزلیں اور قسم قسم فنون کے رموز اور ان کے نشیب وفراز انہوں نے اپنی خداداد ہمت واستعداد سے کامل طور پر طے کیے تھے۔ انہیں کانِ علوم اور مخزنِ فنون کہنا چاہیے۔ ان کی توصیف میں منشیٔ فکر وخیال جو بھی لکھے بجا ہے، اور ان کی تعریف جس قدر بھی کی جائے زیبا ہے''(۴)۔

---

(۱) انوار العارفین، ص: ۵۲۴۔ (۲) مولانا عبدالحی، نزھۃ الخواطر۔ (۳) حدائق الحنفیہ، ص: ۴۹۲۔ (۴) سفینۂ رحمانی، ص: ۱۱۹۔

۱۹-مرزا آفتاب بیگ دہلوی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''تحفۃ الابرار''، سن طباعت: ۱۹۵۷ء میں حضرت نانوتویؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

''آپ (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) روٗسائے شیوخ صدیقی قصبۂ نانوتہ کے ہیں۔آپ کو اجازت ہر چہار طریقۂ معروف کی حضرت حاجی محمد امداد اللہؒ سے تھی، اور سند حدیث کی حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے تھی۔محققانہ وعارفانہ کلام حقائق و معارف آپ کا تھا۔اثباتِ وجودی رطب اللسان تھے۔توحیدی شہودی سے بھی انکار نہیں رکھتے تھے''۔

۲۰-مولانا مشتاق احمد انبیٹھوی اپنی کتاب ''انوار العاشقین'' میں حضرت نانوتویؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

''مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اپنی تمام عمر میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے بوجہِ کسرِ نفسی اور کمال تواضع کے کسی کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا تھا۔ بیعت بھی حضرت قبلۂ عالم حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نیابتاً کرتے تھے۔حضرت حاجی صاحبؒ کے عشق اور محبت میں فنا تھے''(۱)۔

۲۱-مولانا حافظ شاہ محمد سراج الیقین، آپ اپنی کتاب ''شمس العارفین''، سن طباعت: ۱۳۳۳ھ میں حضرت نانوتویؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

''جس شخص نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تقریر سنی ہوگی، یا تحریر دیکھی ہوگی؛ وہ سمجھ سکتا ہے کہ کس معدن سے یہ علوم اور اسرار و حقائق آرہے ہیں۔آپ صاحبِ تصانیف عالیہ ہیں، اور آپ کے مناظروں کی تقریریں بھی چھپی ہیں، جن میں عجیب و غریب تحقیقاتِ علمیہ اور نکات عجیبہ اور مضامین رفیعہ پائے جاتے ہیں۔ درحقیقت ایسا فاضل متبحر اور عالم محقق اس زمانے میں کوئی نہیں گزرا؛ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس پایہ کے لوگ کہیں صدیوں کے بعد ہوتے ہیں۔ آپ نہایت پاکیزہ اخلاق اور منکسر المزاج تھے، اور لباس نہایت سادہ اور معمولی موٹا استعمال فرماتے تھے، اور صفتِ قناعت بھی بہ درجۂ کمال آپ میں موجود تھی۔ ہمیشہ معمولی تنخواہ پر بسر فرمائی اور بڑی بڑی تنخواہوں کی نوکریوں کو پسند نہیں فرمایا۔ مدرسۂ عالیہ دیوبند میں عرصے تک آپ کا درس و تدریس اور بے انتہا فیض جاری رہا۔اکابر علما آپ کے شاگرد ہیں''(۲)۔

۲۲-حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی وفات پر سرسید احمد خاں نے ایک طویل تعزیتی مضمون لکھا، جس میں یہ الفاظ بھی شامل تھے:

''اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں، اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، تسلیم کرتے ہوں گے کہ: مولوی محمد قاسمؒ اس دنیا میں بے مثل شخص تھے۔ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلوماتِ علمی میں شاہ عبدالعزیزؒ سے کچھ کم ہو؛ اِلّا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی اسحاق صاحبؒ سے بڑھ کر نہ تھا، تو کم بھی نہ تھا۔درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے، اور ایسے شخص کے وجود سے زمانے کا خالی ہوجانا ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں، نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے''(۳)۔

(۱) انوار العاشقین، ص: ۸۸۔ (۲) شمس العارفین، ص: ۷-۴۶۔ (۳) علی گڑھ گزٹ، ۲۴ راپریل ۱۸۸۰ء۔

۲۳-علامہ شبلی نعمانیؒ نے ندوۃ العلماء کے ایک سالانہ جلسے میں کہا تھا:

''عربی کے بیسیوں مدرسے کانپور میں قائم ہیں، وہ کس نے قائم کئے ہیں؟ سوداگروں نے، دنیاداروں نے...... کسی عالم نے نہیں قائم کیے، سوائے مدرسہ دیوبند کے، جس پر ہم فخر کرتے ہیں، جس کو مولانا قاسم مرحوم نے قائم کیا تھا۔ علاوہ اس کے مدرسہ کسی عالم نے قائم نہیں کیا''(۱)۔

۲۴-مولانا غلام رسول مہر صاحب رحمہ اللہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

''بزرگانِ دیوبند میں سے جن مقدس ہستیوں کو اولین درجہ احترام واعزاز حاصل ہے، وہ حضرت حاجی امداداللہ تھانوی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں، رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم۔ ان کے اسمائے گرامی اس سرزمین کے آسمانوں پر ان درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہیں، جو تاریکی کے وقت صحراؤں میں مسافروں، اور سمندر میں ملاحوں کو راستہ بتاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگیوں میں علم وہدایت کے مشعل بردار تھے، جب اس دنیا سے رخصت ہوئے، تو اپنے پیچھے پاکیزہ عملی نمونے چھوڑ گئے۔ خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد کی تو ایک یادگار دارالعلوم دیوبند ایسی ہے، جو تقریباً ایک صدی سے اس وسیع سرزمین میں دینی علوم کے قیام وبقا کا ایک بہت بڑا سرچشمہ رہی ہے۔ اس کی آغوش میں سینکڑوں ایسی مقدس ہستیوں نے تربیت پائی، جن کے کارنامے دین وسیاست دونوں کے دوائر میں قابل فخر ہیں''(۲)۔

۲۵-مولوی رحمٰن علیؒ اپنی کتاب ''تذکرہ علمائے ہند''، جو انہوں نے ۱۸۹۱ء/ میں لکھی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مولوی محمد قاسم نانوتویؒ، ابن شیخ اسد علی، ابن غلام شاہ، ابن محمد بخش، ابن علاء الدین، ابن محمد فتح، ابن محمد مفتی، ابن عبدالسمیع، ابن مولوی محمد ہاشم نانوتوی، ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء/ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تاریخی نام ''خورشید حسین'' ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جدتِ طبع اور جودتِ ذہن (۳) فطری طور سے ودیعت (۴) فرمایا تھا''۔

۲۶-علامہ شاہ محمد جمیل الرحمٰن حنفی قادری چشتی نظامیؒ اپنی کتاب ''تذکرہ وصال الجمیل''، جو آپ نے ۱۳۴۳ھ/ میں تالیف فرمائی، اس میں حضرت نانوتویؒ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

---

(۱) رپوٹ سالانہ ندوۃ العلماء، ۱۹۱۲ء/ص:۱۰۹/۱۱۰۔
(۲) ۱۸۵۷ء/ کے مجاہد، ص:۱۶۳، سن اشاعت ۱۹۵۷۔
(۳) جودت: ذکاوت، ذہانت، لیاقت۔ (۴) ودیعت: سپرد کرنا، حوالے کرنا۔

''مولانائے موصوف، عالم، فاضل اور مشہور مناظر ہونے کے علاوہ نہایت عابد، زاہد، قانع، متوکل، نہایت خلیق واقع ہوئے تھے۔ عربی، فارسی نظم ونثر بے تکان لکھتے بولتے تھے۔ سیدھے سادے اتنے تھے کہ آپ کی وضع طرح پر علمیت کا گمان بھی نہ ہوتا تھا''۔

۲۷-مولانا محمد امیر باز خاںؒ ''شہادات امیریہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''خبر حسرت اثر مولانا واستاذنا مولوی محمد قاسم نانوتویؒ صاحب کی آئی، تو حضرت (شاہ عبدالرحیم سہارن پوریؒ) نے آب دیدہ ہوکر فرمایا کہ: آج میری پشت دوصدموں سے ٹوٹی ہے: ایک مرگ مولوی محمد قاسمؒ کی ہے، دوم رحلت مولوی احمد علی صاحبؒ (سہارن پوری) سے۔ یہ دونوں بزرگوار بے ریا، متبع شریعت، مفیض اکمل تھے، مجھ کو ان کے باعث بڑی تقویت تھی۔ اب میں تنہا رہ گیا''[۱]۔

۲۸- حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے خلیفہ مولانا شاہ تجمل حسین بہاریؒ اپنی تالیف ''کمالاتِ رحمانی'' میں لکھتے ہیں:

''اب بیعت کا جو عزم ہوا، مجھ (مولانا شاہ تجمل حسین بہاریؒ) کو عقیدت اور غلامی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ سے تھی۔ آپ (حضرت گنج مرادآبادیؒ) کو کشف سے معلوم ہوا، آپ نے حضرت مولانا کی تعریف کی کہ اس کم سنی میں ان کو ولایت حاصل ہوگئی''۔

۲۹-مولانا محبوب الرسول صاحبؒ (الہ شریف ضلع جہلم) فرماتے ہیں:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو میں اولیا سے سمجھتا ہوں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی آیت تھے۔ اسلام اور علم کی جوان سے اللہ تعالیٰ نے خدمت لی ہے، وہ ان ہی کا حصہ ہے''[۲]۔

۳۰-مولانا مشتاق احمد چشتی انبیٹھویؒ مؤلف ''انوار العاشقین'' فرماتے ہیں:

''حضرت عارف باللہ شیخی توکل شاہ صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ نے عاجز سے فرمایا تھا کہ: میں نے ایک دفعہ خواب دیکھا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جارہے ہیں، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تو جہاں پائے مبارک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑتا ہے، وہاں دیکھ کر پاؤں رکھتے ہیں، میں بے اختیار بھاگا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچوں؛ چناں چہ میں آگے ہوگیا''[۳]۔

۳۱-مولوی احمد رضا خان بریلوی جو حضرت نانوتویؒ سے بغض، نفرت، حسد، عداوت، کینہ رکھنے میں سب سے اوّل ہیں، جنہوں نے دھوکہ، فریب اور مکاری سے علمائے عرب سے حضرتؒ کے خلاف کفر کا فتویٰ لیا اور اس کی تشہیر کی، ان ہی کے والد مولوی نقی علی صاحب لکھتے ہیں:

---

(۱) شہادات امیریہ علی مکشوفات رحیمیہ، ص:۱۴۔

(۲) ڈھول کی آواز، ص:۱۱۷۔

(۳) انوار العاشقین، ص:۸۸۔

''مولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہیؒ اور مولوی محمد قاسم صاحب نانوتویؒ علمائے دین اور مؤمنین صادقین میں سے ہیں''(۱)۔

۳۲-بریلوی مکتبۂ فکر کے نہایت معتدل عالم دین علامہ پیر محمد کرم شاہ الازہری مرحوم فرماتے ہیں:

''حضرت قاسم العلومؒ کی تصنیف لطیف مسمی بہ ''تحذیر الناس'' کو متعدد بار غور و تامل سے پڑھا اور ہر بار نیا لطف اور سرور حاصل ہوا۔ علمائے حق کے نزدیک حقیقت محمدیہ (عَلٰی صَاحِبِهَا أَلْفُ أَلْفِ تَحِيَّةٍ وَّسَلَامٍ) متشابہات میں سے ہے، اور اس کی صحیح معرفت انسانی حیطۂ امکان سے خارج ہے؛ لیکن جہاں تک فکر انسانی کا تعلق ہے، حضرت مولانا قدس سرہٗ کی یہ نادر تحقیق کئی شپرہ چشموں کے لیے سرمۂ بصیرت کا کام دے سکتی ہے۔ رہے فریفتہ گانِ حسن مصطفوی، تو ان بے قرار دلوں اور بے تاب نگاہوں کی وارفتگیوں میں اضافے کا ہزار سامان اس ''تحذیر الناس'' میں موجود ہے۔ آپ نے اپنے علمی دقیق اور محققانہ انداز میں یہ واضح کرنے کی سعی فرمائی ہے کہ ہر قسم کا کمال، علمی ہو یا عملی، حسی ہو یا معنوی، ظاہری ہو یا باطنی؛ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی کمال ہے''(۲)۔

۳۳-مولوی دیدار علی شاہ صاحب حضرت نانوتویؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

''مولانا و استاذنا رئیس المحدثین مولانا محمد قاسم صاحب مغفور، حضرت مولانا احمد علی صاحب مرحوم و مغفور محدث سہارن پوری کے فتویٰ: ''اجوبۂ سوالاتِ خمسہ'' کی نقل زمانِ طالب علمی میں کی ہوئی احقر کے پاس موجود ہے''(۳)۔

یہ چند باتیں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کے ہم عصر اور بعد کے علما اور مشائخ کی ہیں، جن میں ان حضرات کے بھی نام شامل ہیں، جن کے عقیدت مند آج حضرت نانوتویؒ کے خلاف زہر اگلتے نہیں تھکتے۔

آخر میں اپنی بات ایک حدیث قدسی پر ختم کرنا چاہوں گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے، تو پکارتا ہے جبرئیل علیہ السلام کو، اور یہ فرماتا ہے کہ: بے شک! اللہ نے فلاں کو دوست رکھا ہے، سو تو بھی اس کو دوست رکھ، تو جبرائیل علیہ السلام اس سے محبت رکھتے ہیں۔ پھر جبرئیل علیہ السلام آسمانوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ فلاں بندے

(۱) ملخصاً تحفۃ المقلدین، ص: ۱۵، مطبوعہ صبح صادق پریس، سیتاپور۔
(۲) ڈھول کی آواز، ص: ۳۰-۲۳۸۔
(۳) رسالہ تحقیق المسائل، ص: ۳۱۔

سے محبت کرتا ہے، سوتم بھی اس سے محبت کرو، تو آسمان والے اس شخص سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر اس محبوب بندے کی قبولیت زمین پر اتاری جاتی ہے۔یعنی زمین کے نیک لوگ اس کو مقبول جانتے ہیں اور اس سے محبت رکھتے ہیں، اور جب اللہ کسی سے ناراض ہوتا ہے، تو بھی اس طرح کرتا ہے۔یعنی اس کا الٹ''(۱)۔

اپنے بہت ہی محدود مطالعے سے چند حوالے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے محبت کرنے والے اور مقبول جاننے والے علما و مشائخ کے؛ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے چاہنے والوں کی تعداد بلا مبالغہ لاکھوں میں ہے۔ان ہی چاہنے والوں کے سکونِ قلب کے لیے اور اپنے طور پر حجۃ الاسلامؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ''یادگار اکابر'' کا ''حجۃ الاسلام نمبر'' پیش خدمت ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ مجلّہ اور اس کی پوری ٹیم کی اس کوشش کو اپنے دربار میں شرف قبولیت عطا فرمائے، اور ہماری اس چھوٹی سی کوشش کو ہماری نجات کا ذریعہ بنائے کہ اپنے محبوب بندے کے چاہنے والوں میں ہمارا شمار کر کے ہماری بخشش کا پروانہ جاری کر دے۔آمین!

محمد نعمان ارشدی

معتمد المدیر ''یادگار اکابر''

۲۸/ جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ/ ۲۰/ مارچ ۲۰۱۵ء

(۱) مؤطا امام مالک، ج۱، حدیث نمبر: ۱۶۴۱۔

حالات وسوانح سوانح عمری

استاذ العلماء حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ ❁

عنوانات وحواشی:

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی مدظلہٗ

> زیرنظر مضمون پر ذیلی عنوانات اور حواشی نامور محقق مولانا سید نور الحسن راشد کاندھلوی مدظلہٗ نے تحریر فرمائے ہیں؛ لیکن زیرنظر اشاعت میں عنوانات میں بعض جگہ معمولی سی ترامیم کر دی گئیں ہیں۔ اس کے علاوہ حواشی میں سے وہ جو صاحبِ کتاب کے متعلق تھے، یا مضمون کو سمجھنے کے لیے ضروری تھے؛ وہ رکھے گئے ہیں، باقی حذف کردیے گئے۔ اس کے علاوہ ''آویں، جاویں'' وغیرہ کو ''آئیں، جائیں'' کردیا گیا ہے۔ (نعمان)

خطبہ:

الٰہی تیری کیا قدرت کا ظہور ہے، یہ تماشے دکھلاتا ہے، پھر ان کو پردۂ اختفا میں چھپاتا ہے۔ کیا کیا آفتاب طلوع ہوئے اور چمک دمک دکھلا کر پھر غروب ہو گئے۔ سب صفت وثنا تیری ہی ہے، جن کی تعریف ہے اور سب وصف کمال آپ کا ہی ہے، جس کی توصیف ہے۔ تو ہر عیب سے پاک وبری، اور سب تیرے قبضے میں؛ خشکی ہو یا تری۔ آسمان ایک بلبلہ ہے، اور زمین ایک مشت خاک، اور تو سب میں جلوہ گر، اور سب سے برتر اور پاک۔ کس زبان سے تیری ثنا ہو سکے، جب فخر الاوّلین والآخرین سید المرسلین رحمۃ للعالمین حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہوں:

''لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَى نَفْسِكَ''.

لاکھوں؛ بلکہ لا انتہا رحمت وسلام وصلوۃ وثنا روحِ پاک اور تمام آل واصحاب پر؛ بلکہ تمام ارواحِ طیبین وطاہرین، علما وزہاد، فقراء وعباد پر۔ آمین!

❁ صدر المدرسین اوّل دار العلوم دیوبند۔

تمہید:

بعد حمد وصلوۃ: بندۂ احقر، ذرّۂ کم تر ''محمد یعقوب'' نانوتوی، ابن مقدام العلماء جناب مولوی ''مملوک العلی'' مرحوم نانوتویؒ، عرض رساں خدمت احباب ہے کہ: آپ صاحبوں نے احقر سے فرمایا تھا کہ جو کچھ حال وسوانحِ عمری حضرت مخدوم ومکرم جناب مولوی ''محمد قاسم'' صاحبؒ مرحوم (کی) یاد آئے؛ مناسب ہے کہ بہ ذیل تحریر جمع ہو جائیں، (تا کہ) ہم لوگوں کو تذکرہ اور آئندہ کے لیے یادگار رہے۔ آپ لوگوں کے امر کی اجابت واجب سمجھ کر باوجود قلتِ فرصت مختصر مختصر جو جو یاد آتا ہے، لکھتا ہوں۔

تاریخ ولادت:

مولانا- احقر سے چند ماہ بڑے تھے۔ ان کی پیدائش شعبان، یا رمضان، سن ۱۲۴۸ھ/ ہے[۱]، اور نام تاریخی ''خورشید حسین''، اور بندہ کی پیدائش صفر کی تیرھویں، سن ۱۲۴۹ھ/ ہے، اور نامِ تاریخی ''منظور احمد''[۲]، اور احقر کے اور مولوی صاحبؒ کے علاوہ قربِ نسب بہت سے روابطِ اتحاد تھے[۳]۔

---

(۱) **حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی تاریخ ولادت:** مولانا یعقوبؒ نے یہاں حضرت مولانا کی تاریخ ولادت شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ/ (جنوری، فروری ۱۸۳۳ء) لکھی ہے، مگر مولانا یعقوبؒ کی بیاض میں حضرت مولانا کی ولادت شوال ۱۲۴۸ھ/ (مارچ ۱۸۳۳ء) لکھی ہوئی ہے۔ (بیاض یعقوبی: ص ۱۵۲، طبع اول تھانہ بھون: ۱۹۲۹ء)۔ اگر چہ بیاض کا یہ اندراج مولانا محمد یعقوبؒ کے قلم سے نہیں ہے، بہ خط دیگر ہے، مگر بیاض میں اس اندراج سے پہلے اور بعد کی اطلاعات خود مولانا کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہیں، اور ظاہر ہے یہ اطلاع بھی مولانا کی ہدایت وصراحت؛ بلکہ املا کے مطابق لکھی گئی ہوگی، اور اصولاً بعد کی تحقیق واطلاع زیادہ معتبر اور صحیح ہونی چاہیے۔ نیز مولانا کی بیاض کا یہ اندراج مولانا یعقوب صاحبؒ کی زندگی کے آخر دنوں (تقریباً ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء) کا ہے؛ اس لیے حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی تاریخ ولادت کی یہی متاخر اطلاع زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ (نور)

(۲) بیاض یعقوبی میں مولانا محمد یعقوبؒ نے اپنے دو تاریخی نام اور لکھے ہیں: ''غلام حسنین'' اور ''شمس الضحیٰ''۔ (بیاض یعقوبی: ص ۱۵۱، طبع اوّل، تھانہ بھون ۱۹۲۹ء)۔ (نور)

(۳) دونوں کے اجداد ایک ہیں۔ تفصیل مولانا محمد یعقوبؒ نے لکھ دی ہے، جس کو شجرۂ ذیل سے سمجھا جا سکتا ہے:

مولوی ہاشم		
شیخ محمد مفتی		
شیخ ابوالفتح		
حکیم عبداللہ		شیخ علاؤالدین
حکیم غلام شرف		شیخ محمد بخش
مولوی احمد علی	حافظ لطف علی	شیخ غلام شاہ
حضرت مولانا مملوک العلی		شیخ اسد علی
مولانا محمد یعقوب	مولانا محمد مظہر/ مولانا محمد احسن	حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی

(مستفاد از مقدمہ مکتوبات مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مرتبہ حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی، مؤلفہ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء، مطبع احمدی، علی گڑھ)۔

ایک مکتب میں پڑھا۔ ایک وطن۔ ایک نسب [۱]۔ ہم زلف ہوئے [۲]۔ ایک استاد سے ایک وقت میں علم حاصل کیا [۳]۔ اور بعض کتابیں میں نے مولانا سے (پڑھیں)۔ ایک پیر کے مرید ہوئے [۴]۔ ہم سفر دوسفر حج کے رہے [۵]۔ اور ایک زمانۂ دراز تلک ساتھ رہے؛ مگر ان کے کمالات کا اثر ہمارے قصورِ استعداد سے ہم میں ظاہر نہ ہوا۔

---

(۱) حضرت مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا محمد یعقوبؒ دونوں کا شیخ کرامت حسین دیوبندی کی بیٹیوں سے نکاح ہوا تھا۔ مولانا محمد یعقوبؒ کا شعبان ۱۲۶۶ھ/ (جون ۱۸۵۰ء) میں شیخ کرامت حسینؒ کی چھوٹی دختر ''عمدۃ النساء'' سے نکاح ہوا تھا، جن سے مولانا کی متعدد اولادیں: معین الدین، قطب الدین، علاء الدین، جلال الدین، فاطمہ اور خدیجہ وغیرہ تولد ہوئیں۔ ۱۴/رمضان ۱۲۹۴ھ/ (۲۲/ستمبر ۱۸۷۷ء) کو جمعہ کی شب میں دیوبند میں وفات ہوئی۔ (بیاض یعقوبی: ص ۱۵۱، طبع اوّل تھانہ بھون، ۱۹۲۹ء)۔

شیخ کرامت حسینؒ کی دوسری دختر جو غالباً عمدۃ النساء سے بڑی تھیں، حضرت مولانا محمد قاسمؒ سے منسوب تھیں، اس طرح دونوں اصحاب ہم زلف تھے۔ (نور)

(۲) مولانا محمد یعقوبؒ اور حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے تین استاد مشترک تھے: حضرت مولانا مملوک العلی، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی، مہاجر مدنی - رحمہم اللہ تعالیٰ! (نور)

(۳) جب مولانا محمد قاسمؒ تعلیم کے لیے دہلی گئے تھے، مولانا محمد یعقوبؒ اسی وقت سے مولانا کے شاگردوں میں شامل ہوگئے تھے؛ بلکہ مولانا محمد قاسمؒ کے سب سے پہلے شاگرد مولانا محمد یعقوب تھے۔ مولانا محمد قاسمؒ سے مولانا محمد یعقوبؒ کا تلمذ اور تعلیم کا سلسلہ دیر تک رہا۔ مولانا محمد یعقوبؒ نے تین موقعوں پر اس کا ذکر کیا ہے:

الف: مولانا محمد قاسمؒ نے دہلی پہنچ کر کافیہ شروع کی تھی اور مولانا محمد یعقوبؒ میزان اور گلستان وغیرہ پڑھتے تھے۔ مولانا مملوک العلیؒ نے جو دونوں کے مربی اور استاد تھے، مولانا محمد یعقوبؒ سے ابواب اور تعلیلات سننا مولانا محمد قاسمؒ کے سپرد کیا تھا۔ (تذکرہ مولانا محمد قاسمؒ، مرتبہ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ: ص ۷)

ب: جب حضرت مولاناؒ - منشی ممتاز علیؒ کے مطبع مجتبائی میرٹھ میں ملازم تھے، اس زمانے میں مولانا محمد یعقوبؒ نے مولانا محمد قاسمؒ سے صحیح مسلم پڑھی تھی۔ (ص ۲۲)

ج: ۱۸۵۷ء کے بعد جب حضرت مولانا دیوبند اور نانوتہ میں فروکش تھے، اس وقت مولانا محمد یعقوبؒ نے حضرت مولانا سے بخاری شریف کا کچھ حصہ پڑھا تھا۔ (ص ۲۲، حالات مولانا محمد قاسمؒ، طبع اوّل) (نور)

(۴) حضرت مولانا اور مولانا محمد یعقوبؒ دونوں حضرت حاجی امداد اللہؒ سے بیعت ہوئے، تربیت سلوک پائی اور حاجی صاحب کے ممتاز ترین خلفا میں سرفہرست رہے۔ (نور)

(۵) مولانا محمد یعقوبؒ کو زیارت حرمین کی دو مرتبہ سعادت حاصل ہوئی، ۷۸-۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) میں اور ۹۵-۱۲۹۴ھ/ (۷۸-۱۸۷۷ء) میں۔ دونوں موقعوں پر حضرت مولانا محمد قاسمؒ بھی مولانا کے ساتھ تھے۔ مولانا محمد یعقوبؒ نے زیرنظر تالیف (تذکرہ مولانا محمد قاسمؒ) کے علاوہ ''بیاض یعقوبی'' میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ (ص ۱۳۸، ۱۴۲، نیز ۱۵۰، ۱۵۱، بیاض یعقوبی، طبع اوّل ۱۹۲۹ء) (نور)

مولانا کے والد ماجد:

مولوی صاحبؒ کے والد شیخ اسد علی صاحبؒ[۱] ہر چند جناب والد مرحوم کے ساتھ دہلی گئے تھے، اور شاہ نامہ وغیرہ (تک) کتابیں پڑھی تھیں، اور اپنے پڑھنے کے زمانے کے ہمارے سامنے حکایات بیان فرمایا کرتے تھے؛ مگر حال ایسا تھا کہ گویا علم سے کچھ مناسبت نہیں۔ تمام عمر کھیتی کی اور ویسے ہی عادات موٹے (اہل) قصبات کے سے تھے؛ مگر نہایت محبت اور اخلاق (والے) اور کنبہ پرور، مہمان نواز، نمازی، پرہیزگار تھے۔

مولانا کے دادا کی خواب کی تعبیر میں مہارت:

ان کے والد شیخ غلام شاہؒ (تھے)، احقر نے ان کی زیارت کی (ہے)۔ قلیل پڑھے ہوئے تھے؛ مگر خادم درویشوں کے، ذاکر وشاغل تھے۔ تعبیر خواب میں مشہور تھے۔

---

(۱) شیخ اسد علی (خلف غلام شاہ ابن محمد بخش): حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے والد ماجد بھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی گئے تھے۔ فارسی درسیات مکمل کر لی تھیں اور مولانا محمد یعقوبؒ کی صراحت کے مطابق ''شاہ نامہ فردوسی'' بھی پڑھا تھا؛ مگر اس کے بعد مزید تعلیم کا موقع نہیں ہوا۔ وطن میں پوری زندگی گزاری۔ نیک طینت سادہ مزاج شخص تھے۔

شروع میں حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے استغنا، ترک دنیا اور مال و جاہ سے بے تعلقی کی وجہ سے مولانا سے ناخوش رہتے تھے،؛ مگر حضرت حاجی امداد اللہؒ کی بار بار ہدایت اور مولانا کے مقام ومرتبے سے آشنا ہو کر یہ کیفیت ختم ہوگئی تھی، اور آخر میں حضرت مولانا سے نہایت خوش تھے۔

شیخ اسد علیؒ کی اسہال کے مرض میں مبتلا ہو کر ۷/ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ/دوشنبہ (پیر) (۲۱/ مارچ ۱۸۷۵ء) کو دیوبند میں وفات ہوئی، تکیہ دیوان لطف اللہ میں دفن کیے گئے۔ یہ وہ جگہ ہے جو دار العلوم کی نئی مسجد جامع رشیدؒ صدر دروازے کے سامنے واقع ہے۔ اس کے صحن کے مائل بہ جنوب مشرقی گوشے میں شیخ اسد علیؒ کا مدفن ہے۔ چند سال پہلے تک اس قبر پر کتبہ نصب تھا، جس کو راقم سطور نے بھی بارہا دیکھا ہے، اور نامور مؤرخ پروفیسر محمد اسلم صاحب نے بھی اپنے مضامین اور ''سفر نامہ ہند'' میں اس کا ذکر کیا ہے، اور اس کتبے کی عبارت بھی نقل کی ہے، جو یہ تھی:

''مزار اقدس:
حضرت شیخ اسد علی رحمۃ اللہ علیہ
والد ماجد حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ
المتوفی ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء''

(سفر نامہ ہند: ص ۳۰۰، لاہور، ۱۹۹۵ء)

مگر کتبے پر سن وفات کندہ کرنے میں سہو ہوا، صحیح تاریخ وہ ہے، جو اوپر گزری۔ یہ تاریخ حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے خطوط میں درج ہے؛ اس لیے یہی صحیح اور درست ہے۔ (نور)

جناب مولوی صاحبؒ نے خواب میں دیکھا تھا ایامِ طفلی میں کہ: ''گویا میں اللہ جل شانہ کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں''۔ ان کے دادا نے یہ تعبیر فرمائی کہ: ''تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا اور نہایت بڑے عالم ہو گے، اور نہایت شہرت ہو گی''۔

یہ تعبیر ان کی نہایت درست پڑی۔

اور میری بہن نے خواب میں دیکھا کہ: ''ایک ترازو چھوٹی (جس سے) لڑکے کھیلا کرتے ہیں، آسمان سے گری ہے، اور اس پر ابابیل جانور سیاہ رنگ بہت لپٹے ہوئے ہیں، اگر چھڑاتے ہیں، چھوٹتے نہیں''۔ سن کر یوں فرمایا: ''قحط ہوگا''۔ چناں چہ وہ قحط جس میں باندیاں بک (گئیں)؛ واقع ہوا، غالبًا ''پانچا کال'' اس کو کہتے ہیں۔

حضرت مولانا اور مولانا محمد یعقوبؒ کا مشترک نسب:

میرا نسب اور مولانا کا شیخ غلام شاہؒ کے پردادا میں ملتا ہے۔ اس طرح: ''محمد قاسم، ابن اسد علی، ابن غلام شاہ، ابن محمد بخش، ابن علاء الدین، ابن محمد فتح، ابن محمد مفتی، ابن عبد السمیع، ابن مولوی محمد ہاشم''۔

اور ''محمد یعقوب، ابن مملوک العلی، ابن احمد علی، ابن غلام شرف، ابن عبد اللہ، ابن محمد فتح، ابن محمد مفتی، ابن عبد السمیع، ابن مولوی محمد ہاشم''۔

اور میاں شیخ محمد بخشؒ کے بھائی شیخ خواجہ بخشؒ میرے والد اور شیخ کرامت حسین دیوبندیؒ کے؛ نانا ہوتے تھے۔ جوانی میں دکن گئے، وہاں نکاح کیا تھا، وہاں ایک بیٹا مولوی محمد ہاشم نام تھا۔ یہاں اولاد پسری تھی۔ اس سبب سے میرے والد کے نانا ان کے چچا ہوتے ہیں، اور اَور انواع رشتے، جیسے برادرداری میں ہوا کرتے ہیں، باہم مرتبط ہیں[1]۔

---

(۱) مولانا محمد یعقوبؒ نے جو رشتے اور تفصیل لکھی ہے، وہ درج ذیل شجرے سے آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی:

		محمد فتح		
	علاءالدین		عبداللہ	عبدالرحیم عرف جمیل (خاں خورد)
	محمد بخش	شیخ خواجہ بخش		غلام جیلانی
	غلام شاہ	دختر	غلام شرف	کریم بخش
	شیخ اسد علی	(زوجہ احمد علی نانوتوی)	مولوی احمد علی	مولوی وجیہ الدین
دختر	حضرت مولانا محمد قاسم	مولانا مملوک العلی		دختر (زوجہ شیخ اسد علی)
	مولانا حافظ احمد	مولانا محمد یعقوب		حضرت مولانا محمد قاسم

مولانا کے نانا:

مولوی صاحبؒ کے نانا مولوی وجیہہ الدین صاحب نانوتویؒ[۱] فارسی بہت عمدہ، اردو کے شاعر، کچھ عربی سے آگاہ، بڑے تجربے کار، پرانے آدمی، ہنگام آمدنی حکومت انگریزی سہارن پور میں وکیل کمپنی ہوئے، اور نہایت عزت واحترام اور تمول سے گزران کی۔ نہایت طباع اور خوش فہم تھے، اور چند پشت اوپر مولوی محمد ہاشم صاحب مرحوم میں ہمارے نسب جا ملتے ہیں، اور آگے نسب حضرت قاسم ابن محمد ابن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہم میں جا پہونچتا ہے۔

مولوی محمد ہاشم جدِّ اعلیٰ:

یہ مولوی محمد ہاشمؒ زمانِ شاہ جہاں میں مقرب بادشاہی ہوئے، اور نانوتہ میں مکان بنائے، اور چند دیہات جاگیر تھے، جو تبدل حکومت کے سبب ان کی اولاد کے پاس نہ رہے۔

مولانا کے بھائی، بہن اور اوپر کا سلسلہ:

مولوی صاحبؒ کے اور کوئی بھائی نہ تھا۔ ایک بہن دیوبند میں اب زندہ موجود ہیں، اور ان کے والد اور دادا صاحب کے بھی کوئی بھائی نہ تھا، بھائی پیدا ہوئے؛ مگر لڑکپن میں مر گئے، اور چچا جوانی میں مر گئے، اور دادا کے بھائی تھے، وہ کسی لڑائی میں جوان عمر شہید ہوئے، اور اوپر جو بھائی تھے، ان کی اولاد پسری یہاں کوئی نہیں (رہی)۔ دکن میں ان کے اولاد ہوئی، بہ قاعدہ معروف وہ بھی گویا ایک ہی تھے۔ غرض چار پشت تلک مولانا منفرد ہوئے۔

مولانا کی فطری اور اعلیٰ صلاحیتیں:

جناب مولوی صاحبؒ لڑکپن سے ذہین، طباع، بلند ہمت، تیز، وسیع حوصلہ، جفاکش، جری، چست وچالاک تھے۔ مکتب میں اپنے ساتھیوں سے مدام اول رہتے تھے۔ قرآن شریف بہت جلد ختم کرلیا۔ خط اس وقت سب سے اچھا تھا۔ نظم کا شوق اور حوصلہ تھا۔ اپنے کھیل اور بعضے قصے نظم فرماتے اور لکھ لیتے۔ چھوٹے چھوٹے رسالے اکثر نقل کیے۔

---

(۱) مولوی وجیہ الدین، ابن کریم بخش، ابن غلام جیلانی، ابن عبدالرحیم عرف جمیل خاں خورد۔ مولانا محمد یعقوبؒ نے ان کا جو سن وفات لکھا ہے، وہ متعلقہ سنین کی روشنی میں صحیح معلوم نہیں ہوتا، تفصیل (آیندہ حاشیے میں) آ رہی ہے۔ (نور)

جناب مخدوم العالم حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے جو ربط نسب کا تھا، حضرت مخدوم (کی) نانہال ہمار(ے) خاندان میں تھی، اور بہن ان کی یہاں بیاہی تھی، اکثر نانوتہ تشریف لاتے تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نہایت محبت واخلاص فرماتے۔ جلد بندی کتاب[1] کی حضرتؒ سے ہم دونوں نے سیکھی اور اپنی لکھی ہوئی کتابوں کی جلدیں باندھیں۔

خاندان کے ایک قضیہ کی وجہ سے دیوبند کا سفر:

ہمارے وطن میں ایک قضیہ پیش آیا، شیخ تفضّل حسین شیعہ مذہب ہو گئے تھے، اور ہماری جائے داد کے شریک تھے، ان سے اور مولوی صاحبؒ کے دادا شیخ غلام شاہ سے دنگا ہوا، اور شیخ تفضّل حسین مولوی صاحبؒ کے ماموں میاں فصیح الدین کے ہاتھ سے زخمی ہو کر مر گئے۔ ہر چند کہ اس مقدمہ میں خیریت رہی، اور حاکم کی طرف سے کسی کو کچھ سزا نہ ہوئی؛ مگر بنا دشمنی کی کچھ پہلے سے تھی، کچھ اب زیادہ ہو(گئی)، تب یہ خوف ہوا کہ مبادا کوئی صدمہ مخالفوں کے ہاتھ سے ان کو پہونچے؛ اس لیے (مولانا محمد قاسمؒ کو) دیوبند بھیج دیا۔

مولوی مہتاب علی دیوبندیؒ کے مکتب میں ابتدائی تعلیم:

یہاں مولوی مہتاب علی صاحبؒ کا مکتب تھا، شیخ کرامت حسین مرحوم کے گھر پر شیخ نہال احمد پڑھتے تھے، مولوی صاحبؒ کو انھوں نے عربی شروع کرائی، پھر سہارن پور اپنے نانا کے پاس رہے، وہاں مولوی محمد نواز صاحب سہارن پوریؒ سے کچھ پڑھا، فارسی اور عربی کی کتابیں اوّل کی کچھ حاصل کیں۔ اس زمانے میں والد مرحوم احقر کے حج کو تشریف لے گئے۔ احقر ایک برس کامل وطن رہا۔ حفظ قرآن شریف پورا ہو گیا تھا؛ مگر صاف نہ تھا، صاف کرتا تھا۔

مولانا کے نانا کی وفات:

مولوی صاحبؒ سہارن پور سے وطن آئے، اور ان کے نانا کا انتقال اس سال کے وبائی بخار میں مع بہت سے لوگوں کے ہو گیا تھا[2]۔ اس زمانے میں مولوی صاحبؒ کا ساتھ رہا۔ مولوی صاحبؒ جیسے پڑھنے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے، ہر کھیل میں خواہ ہوشیاری کا ہو، یا محنت کا؛ سب سے اوّل اور غالب رہتے تھے۔

---

(۱) جلد بندی میں صفحات کی جو سلائی سوئی سے ایک ایک ورق کر کے ہوتی ہے اسے ''جزبندی'' کہا جاتا ہے۔ (نعمان)
(۲) مولانا یعقوبؒ کی تحریر سے محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مولانا قاسمؒ کے نانا شیخ وجیہہ الدینؒ کی وفات ۱۲۵۷ھ میں ہوئی تھی۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اس خیال کو مدلل کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس سن کی ۱۸۴۲ء سے مطابقت بھی کی ہے۔ (سوانح قاسمی: ج۱، ص۲۰۵، دیوبند، ۱۳۷۳ھ)؛ مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ مولوی وجیہہ الدینؒ کی وفات تقریباً محرم ۱۲۶۰ھ (جنوری، فروری ۱۸۴۴ء) میں ہوئی ہوگی۔ تفصیلات مولانا کے والد ماجد اور ماموں پر راقم سطور کی تحریر میں ملاحظہ ہوں۔ (نور)

کھیلوں میں مہارت اور بے خوفی:

خوب یاد رہے کہ اس زمانے میں ایک کھیل ''جوڑتوڑ'' نام ہم کھیلتے تھے، اور بہت پرانے مشاق لوگ اس کو عمدہ کھیلتے تھے، اور ہم نئے کھیلنے والے مات کھا جاتے تھے۔ مولوی صاحبؒ نے جب اس کا قاعدہ معلوم کرلیا، پھر یاد نہیں کسی سے مات کھائی ہو۔ بہت ہوا تو برابر رہے؛ بلکہ ہر کھیل میں جو رتبہ کمال کا ہوتا تھا، وہاں تلک اس کو پہونچا کر چھوڑتے۔ دروازہ مکان کا ایک دراز کوچہ تھا اور وحشت ناک جگہ تھی، اور وہاں آسیب بھی مشہور تھا؛ مگر راتوں کو بہت بہت دیر سے گھر جاتے اور بے تکلف اور کچھ خوف نہ کرتے۔

تعلیم کے لیے پہلا سفر:

جب والد مرحوم حج سے تشریف لائے اور وطن آئے، تب مولوی صاحبؒ سے کہا کہ: میں تم کو ساتھ لے جاؤں گا، بعد اجازت والدہ کے دہلی روانہ ہوئے۔ ذی الحجہ سن ۱۲۵۹ھ کے آخر میں وطن سے چلے، اور دوسری محرم سن ۱۲۶۰ھ کو دہلی پہونچے۔ چوتھی کو سبق شروع ہوئے۔ مولوی صاحبؒ نے کافیہ شروع کیا اور احقر نے میزان اور گلستان۔ والد مرحوم نے میرے ابواب کا سننا اور تعلیلات کا پوچھنا ان کے سپرد کیا تھا، اور ہر جمعہ کی رات کو چھٹی ہوتی تھی، صیغوں اور ترکیبوں کا پوچھنا معمول تھا، یاد ہے کہ مولوی صاحبؒ سب میں عمدہ رہتے تھے۔

ہم عمر طلبہ سے علمی مباحثوں میں امتیاز اور تعلیم میں تیز رفتار ترقی:

اسی زمانے میں ہمارے مکان سے قریب مولوی نوازش علی صاحبؒ کی مسجد میں مجمع طالب علموں کا تھا، ان سے پوچھ پاچھ اور بحث شروع ہوئی۔ مولوی صاحبؒ کی جب باری آئی سب پر غالب آئے، اور جب گفتگو ہوتی، اس میں مولوی صاحب کو غلبہ ہوتا؛ بلکہ ہم میں سے جو کوئی مغلوب معلوم ہوتا، مولوی صاحبؒ سے مدد چاہتا، یا مولوی صاحبؒ خود اس کو مدد دیتے۔ پھر تو مولوی صاحبؒ ایسا چلے کہ کسی کو ساتھ ہونے کی گنجائش نہ رہی۔ یہ معقول (کی) مشکل کتابیں: زواہد، قاضی، صدرا، شمس بازغہ ایسا پڑھا کرتے تھے۔ جیسے حافظ منزل سناتا ہے، کہیں کہیں کوئی لفظ فرماتے جاتے اور ترجمہ تلک نہ کرتے۔ والد مرحوم کے بعض شاگردوں نے کہا بھی کہ: حضرت! یہ تو کچھ سمجھتے نہیں معلوم ہوتے۔ جناب والد مرحوم نے فرمایا کہ: میرے سامنے طالب علم بے سمجھے چل نہیں سکتا، اور واقعی ان کے سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا۔ وہ طرز عبارت سے سمجھ لیتے تھے کہ یہ مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں، اور یہی حال جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ کا تھا۔ مولوی صاحبؒ سے اسی زمانے سے دوستی اور ہم سبقی رہی۔

شاہ عبدالغنیؒ سے حدیث کا درس اور حضرت حاجی صاحبؒ سے بیعت:

آخر حدیث خدمت میں جناب شاہ عبدالغنی صاحب مرحوم کے پڑھی، اور اسی زمانے میں دونوں

صاحبوں نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا۔

مدرسۂ عربی سرکاری (دلی کالج) میں داخلہ:

والد مرحوم نے مولوی صاحبؒ کو مدرسۂ عربی سرکاری میں داخل کیا اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ: ان کے حال سے تعرض نہ ہوجیو، میں ان کو پڑھالوں گا، اور فرمایا کہ: تم اقلیدس خود دیکھ لو، اور قواعد حساب کی مشق کرلو۔ چند روز میں چرچا ہوا کہ مولوی صاحب سب معمولی مقالے دیکھ چکے اور حساب پورا کرلیا۔ ازبس کہ یہ واقعہ نہایت تعجب انگیز تھا، طلبا نے پوچھ پاچھ شروع کی، یہ کب عاری تھے، ہر بات کا جواب باصواب تھا، آخر منشی ذکاء اللہ چند سوال نئے کسی ماسٹر کے بھیجے ہوئے لائے اور وہ نہایت مشکل سوال تھے، ان کے حل کر لینے پر مولانا کی نہایت شہرت ہوئی، اور حساب میں کچھ ایسا ہی حال تھا۔ جب امتحان سالانہ کے دن ہوئے مولوی صاحب امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا۔ سب اہل مدرسہ کو علی الخصوص ٹیلر صاحب کو کہ اس وقت میں مدرس اوّل انگریزی تھے، نہایت افسوس ہوا۔

مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی ملازمت:

مولوی صاحبؒ نے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی کچھ مزدوری کرلی، اور کتابیں معمول تمام کر چکے تھے۔ حدیث خدمت میں شاہ عبدالغنی صاحبؒ (کے) پوری کی۔

مولانا مملوک العلیؒ کی مرض وفات میں خدمت اور وفات کے بعد ان کے مکان پر قیام:

اس عرصے میں والد مرحوم کا گیارھویں ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو بہ مرض یرقان قبل السابع انتقال ہوگیا[۱]۔ ایام مرض والد مرحوم کے ممتد نہ تھے۔ گیارہ روز کل مرض رہا؛ مگر چار پانچ روز بہت غفلت اور کرب رہا۔ لخلخہ سنگھا(نا)[۲]، پنکھا کرنا ہر وقت تھا، ہم سو جاتے تھے اور مولوی صاحبؒ برابر بیٹھے رہتے تھے۔

---

(۱) ۱۱/ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ/مطابق ۸/اکتوبر ۱۸۵۱ء/قبل السابع، ساتویں گھڑی سے پہلے۔ رات کا تقریباً درمیانی وقت۔ (نور)

(۲) لخلخہ: وہ دوا جو تقویت دماغ کے واسطے ترکیب دے کر بنائی جاتی ہے۔ کئی خوش بوؤں کا مجموعہ جسے ملاکر سونگھتے ہیں۔ مولوی سید احمد دہلویؒ نے اس کے استعمال کی مثال میں یہ شعر لکھے ہیں:

نالے مجھ بلبل کے سن کر غش ہوا تھا باغ میں
نکہتِ گل نے سنگھایا لخلخہ صیاد کو
(نواب بیگم)

کرتی ہے صبا آگے کبھی غالیہ بیزی
کرتی نسیم آگے کبھی لخلخہ سائی
(ذوق)

(فرہنگ آصفیہ: ج ۴، ص ۱۸۴، دہلی: ۱۹۷۴ء) (نور)

بعد انتقال مولانا-والد مرحوم کے احقر اپنے مکان مملوک میں جو چیلوں کے کوچے(۱) میں تھا جارہا۔ مولوی صاحبؒ بھی میرے پاس آرہے۔

مزاج کی سادگی:

کوٹھے پر ایک جھلنگا(۲) پڑا ہوا تھا، اس پر پڑے رہتے تھے۔ روٹی کبھی پکوا لیتے تھے اور کئی کئی وقت تلک اسے ہی کھا لیتے تھے۔ میرے پاس آدمی روٹی پکانے والا نوکر تھا، اس کو یہ کہہ رکھا تھا کہ: جب مولوی صاحب کھانا کھائیں، سالن دے دیا کرو؛ مگر بہ دقت کبھی اس کے اصرار پر لے لیتے تھے؛ ورنہ وہی روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑے رہتے تھے۔

ایک برس دن کے قریب بعد انتقال والد مرحوم احقر دہلی رہا، پھر نوکری اجمیر کے سبب دہلی چھوٹی اور مولوی صاحبؒ سے جدائی پیش آئی۔

مدرسۂ دار البقاء اور مطبع احمدی میں قیام اور حاشیۂ بخاری کی تکمیل:

مولوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ چند روز اسی مکان میں تنہا رہے، پھر چھاپہ خانے میں جا رہے، پھر دار البقاء(۳) میں چند روز رہے۔ اس زمانے میں جناب مولوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولوی احمد علی صاحب سہارن پوری (نور اللہ مرقدہ وبرد مضجعہ) نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کے کہ پانچ چھ سپارے، آخر کے

---

(۱) کوچہ چیلان پرانی دہلی کا بہت بڑا محلّہ اور مشہور علاقہ ہے۔ (نور)

(۲) ٹوٹی پھوٹی ایسی چارپائی جس کے بان ٹوٹ کر لٹک گئے ہوں۔ دیکھیے: فرہنگ آصفیہ ج۲،ص:۳۷، (دہلی ۱۹۷۹ء)

(۳) مدرسۂ دار البقاء جامع مسجد کے جنوبی سمت میں تعمیر پرانا مدرسہ تھا، جو شاہ جہاں نے جامع مسجد کے ساتھ بنوایا تھا، جو آخر عہد مغلیہ میں بے توجہی کی وجہ سے کھنڈر ہو گیا تھا، مولانا مفتی صدر الدین آزردہؒ نے اس کی تجدید مرمت کرائی، دوبارہ مدرسے کو زندہ کیا۔ تعلیم کے لیے مدرس رکھے اور مدرسے میں مقیم طلبا کے اخراجات اور کھانے پینے کی ذمے داری لی۔ مدرسۂ دار البقاء ۱۸۵۷ء تک مفتی صاحبؒ کی سرپرستی میں کامیابی سے چلتا رہا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب پوری دہلی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی، مدرسۂ دار البقاء کہاں بچتا؟ مدرسۂ دار البقاء ویران ہی نہیں ہوا؛ بلکہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزوں نے دہلی کو صاف ستھرا کرنے کی مہم چلائی اس وقت مدرسۂ دار البقاء کو منہدم کر کے زمین کے برابر کر دیا تھا۔ یہ مدرسہ جامع مسجد کے آخری جنوبی مغربی کونے سے ملا ہوا تھا۔ اس مدرسے کا کنواں جس کا حضرت مولانا گنگوہیؒ نے اپنے فتاوے میں ذکر کیا ہے، تقریباً ۱۹۷۷ء تک موجود تھا۔ راقم سطور نے دیکھا ہے۔ اب یہاں سے چاوڑی بازار سے آنے والی سڑک گزرتی ہے اور کچھ حصے پر پارک ہے، وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا.

مدرسۂ دار البقاء کے تعارف کے لیے دیکھیے: آثار الصنادید، سر سید احمد، باب سوم: ص۲۳، نول کشور لکھنؤ ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء) (نور)

باقی تھے، مولوی صاحبؒ کے سپرد کیا[1]، مولوی صاحبؒ نے اس کو ایسا لکھا ہے کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے۔

اس زمانے میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحبؒ کے کمال سے آگاہ نہ تھے، جناب مولوی احمد علی صاحبؒ کو بہ طور اعتراض کہا تھا کہ: ''آپ نے کیا کام کیا کہ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کردیا؟'' اس پر مولوی احمد علی صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ: ''میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدون (بلا) سمجھے بوجھے ایسا کروں!''، اور پھر مولوی صاحبؒ کا تحشیہ ان کو دکھلایا، جب لوگوں نے جانا، اور وہ جگہ بخاری میں سب

---

(۱) **تکملہ حاشیہ صحیح بخاری:** حضرت مولانا احمد علی محدثؒ نے صحیح بخاری کی دقت نظر سے تصحیح فرمائی تھی اور اس پر مختصر؛ لیکن نہایت جامع اور اعلیٰ درجے کا حاشیہ لکھا تھا، جو عمدہ محققانہ شرح کے قائم مقام ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے عالی مقام استاد حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کی ہدایت اور وصیت کے مطابق بخاری شریف کی تصحیح اور حواشی کا کام سفر حجاز سے واپس آتے ہی شروع فرمادیا تھا، کام بہت بڑا تھا جو وسیع عالمانہ ژرف نگاہی اور محنت وتحقیق کے علاوہ اکابر محدثین کے علمی اصولوں کی پاس داری چاہتا تھا، مولانا احمد علیؒ نے اس کا پورا پورا حق ادا کیا اور قدم بہ قدم ان کی پیروی فرمائی۔

جب بخاری شریف کا غالبًا خاصا حصہ تصحیح وحواشی کے بعد لائق اشاعت ہوگیا، تو اس کی اشاعت پر توجہ فرمائی۔ بخاری شریف کے متن اور حواشی کی کتابت بھی نہایت دیر طلب اور صبر آزما خدمت تھی۔ یہ سلسلہ بھی ساتھ ہی ساتھ شروع ہوگیا تھا۔ ان مراحل کے بعد حضرت مولانا کے ذاتی چھاپہ خانہ ''مطبع احمدی'' دہلی میں ۱۲۶۴ھ/ (۱۸۴۸ء) میں بخاری شریف کے اس مبارک ومسعود نسخے کی طباعت شروع ہوئی، اور ۱۲۷۰ھ/ (۱۸۵۴ء) میں اس نسخے کی طباعت مکمل ہوگئی تھی۔ تصحیح متن اور حاشیے کی ترتیب آہستہ آہستہ بڑھتی رہی، چوں کہ حضرت مولانا احمد علیؒ اس عرصے میں حدیث شریف کی کئی اور بنیادی کتابوں کی تصحیح کا کام شروع کرچکے تھے؛ اس لیے (اور غالبًا بخاری شریف کا کام جلد پورا کرنے کے خیال سے) بخاری شریف کا حاشیہ لکھنے کی خدمت میں حضرت مولانا محمد قاسمؒ کو بھی شامل فرمایا۔ آخری حصے کا حاشیہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے تحریر کیا۔

حضرت مولانا محمد قاسمؒ کا لکھا ہوا حاشیہ کس قدر ہے؟ اس کی تحقیق نہیں۔ مولانا محمد یعقوبؒ نے پانچ چھ سپارے کا حاشیہ ذکر کیا ہے، مگر مولانا محمد یعقوبؒ اس زمانے میں اجمیر قیام فرما تھے؛ اس لیے یہ اطلاع مولانا کا مشاہدہ اور تحقیق نہیں ہے؛ اس لیے اس میں مزید غور وفکر کی خاصی گنجائش ہے۔

برصغیر کے نام ور محدث حضرت الاستاذ مولانا محمد یونس صاحب مدظلہم ودامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: پانچ چھ سپاروں کے حاشیے کی بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ حواشی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر کے تین سپاروں کا حاشیہ ہے۔ یہ حاشیہ پہلے حاشیے سے کئی طرح سے مختلف ہے۔ کتاب المحاربین پارہ نمبر ۲۸، بخاری شریف: ص ۱۰۰۵ (نور محمد اصح المطابع، دہلی) سے آخر کتاب تک اسلوب تحریر اور منہج تحقیق بدلا ہوا ہے؛ اس لیے صرف یہی حاشیہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ کا لکھا ہوا ہے، اور یہ تین سپارے ہیں۔ مزید تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں۔ راقم نے اس کا کسی قدر وضاحت سے علاحدہ مضمون میں ذکر کیا ہے۔ یہاں یہ عرض کردینا چاہیے کہ حضرت الاستاذ مولانا محمد یونس صاحب مدظلہم درس حدیث میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے جانشین ہیں اور بتیس سال سے مدرسۂ مظاہر العلوم سہارن پور میں بخاری شریف پڑھا رہے ہیں۔ حضرت مولانا کی حدیث شریف میں غیر معمولی مہارت اور بصیرت ونظر اور حضرت کا درس بخاری شہرۂ آفاق ہے۔ (نور)

جا (جگہوں) سے مشکل ہے، علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا جو اوّل سے التزام ہے، اور اس جا (جگہ) پر امام بخاریؒ نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کیے ہیں، اور ان کے جواب لکھنے معلوم ہے کہ کتنے مشکل ہیں۔ اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھ لے اور سمجھ لے کہ کیسا حاشیہ لکھا ہے، اور اس حاشیے میں یہ بھی التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے محض اپنے فہم سے نہ لکھی جائے۔

جفاکشی اور تنہائی پسندی:

اس وقت کی اکثر حکایات سنی سنائی عرض کرتا ہوں؛ کیوں کہ پانچ برس تلک پھر ملاقات مولوی صاحبؒ سے نہیں ہوئی۔ جب احقر اجمیر گیا، مولوی صاحبؒ اسی مکان میں رہتے تھے، اور بعض ایک دو آدمی اور تھے، پھر اتفاق سے سب متفرق ہو گئے اور مولوی صاحبؒ تنہا رہ گئے۔ مکان مقفل رہتا تھا، رات کو مولوی صاحبؒ کواڑ اتار کر اندر جاتے تھے، اور پھر کواڑ کو درست کر دیتے تھے، اور صبح کو کواڑ اتار کر باہر ہو جاتے تھے، اور پھر کواڑ درست کر دیتے تھے۔ چند ماہ اسی ہو کے[1] مکان میں گزر گئے۔

جذب اور خود فراموشی کی ایک کیفیت:

جس زمانے میں مولوی صاحبؒ میرے پاس رہتے تھے، مولوی صاحبؒ کی صورت پر جذب کی حالت برستی تھی۔ بال سر کے بڑھ گئے تھے، نہ دھونا، نہ (کنگھی)، نہ تیل، نہ کترے، نہ درست کیے، عجب صورت تھی۔ مولوی صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہیبت عنایت کی تھی، ان کے سامنے بولنے کا ہر کسی کو حوصلہ نہ تھا۔ باوجود یہ کہ نہایت خوش مزاج اور عمدہ اخلاق تھے؛ اس لیے میں تو کہہ نہ سکا، ایک اور دوست سے کہلایا، تب بہ مشکل بال کتروا کر درست کیے اور دھلوائے۔ جوئیں بہت ہو (گئی) تھیں، ان سے نجات ہو (ئی)۔

صبر وضبط اور کم گوئی:

مزاج تنہائی پسند تھا؛ اس لیے کچھ عرض نہ ہو سکتا تھا۔ مولوی صاحبؒ کو اوّل عمر سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات عنایت فرمائی تھی، اکثر ساکت رہتے اور ہر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا، اور باوجود خوش مزاجی اور ظرافت کے ترش رو اور مغموم جیسی صورت (رہتے)، اور ان کے حال سے بھلا ہو یا برا، نہ کسی کو اطلاع ہوتی، نہ آپ کہتے۔ یہاں تلک کہ بیمار بھی اگر ہوتے، تب بھی شدت کے وقت کبھی کسی نے جان لیا، تو جان لیا؛ ورنہ خبر نہ ہوئی، اور دوا کرنا تو کہاں؟

---

(۱) ہُو کا مکان: سنسان جگہ، جہاں آدمی کو دہشت معلوم دے۔ فرہنگ آصفیہ: ج ۴ ص: ۷۴۰، دہلی، ۱۹۷۴ء۔ (نور)

تواضع:

بعضے احباب کی زبانی سنا ہے کہ چھاپہ خانے میں جناب مولوی احمد علی صاحبؒ کے جب مولوی صاحبؒ کام کیا کرتے تھے، مدتوں یہ لطیفہ رہا کہ لوگ مولوی کہہ کر پکارتے ہیں اور آپ بولتے نہیں۔ کوئی نام لے کر پکارتا، خوش ہوتے۔ تعظیم سے نہایت گھبراتے۔ بے تکلف ہر کسی سے رہتے۔ اب تلک جو شاگرد یا مرید تھے، ان سے یارانہ کے طور پر رہتے، اور کچھ اپنے لیے صورت تعظیم کی نہ رکھتے۔

معمولی لباس اور خود کو چھپانے کا اہتمام:

علما کے وضع عمامہ یا کرتا کچھ نہ رکھتے۔ ایک دن آپ فرماتے تھے کہ: ''اس علم نے خراب کیا؛ ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا''۔ میں کہتا ہوں اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا؟ جو کمالات تھے، وہ کس قدر تھے؟ کیا اس میں سے ظاہر ہوئے؟ اور آخر سب کو خاک میں ہی ملا دیا، اپنا کہنا کر دکھایا۔

مسئلہ کبھی نہ بتلاتے، حوالے کسی پر فرماتے، فتوے پر نام لکھنا اور مہر کرنا تو درکنار، اوّل امامت سے بھی گھبراتے، آخر کو اتنا ہوا کہ وطن میں نماز پڑھا دیتے تھے۔ سب سے پہلا وعظ مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ کے ارشاد پر کیا۔ وعظ بھی نہ کہتے تھے۔ جناب مولوی مظفر حسین صاحب مرحوم کاندھلویؒ نے اوّل وعظ کہلوایا اور خود بھی بیٹھ کر سنا اور بہت خوش ہوئے۔

مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ کا تقویٰ اور اتباع سنت میں بلند مقام:

جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلویؒ اس آخری زمانے میں قدما کے نمونے تھے۔ تقویٰ؟ اللہ اکبر! ایسا تھا اور اس سے وہ نسبت پیدا تھی کہ مشتبہ چیز اگر معدے میں پہنچ گئی، تو اسی وقت قے ہو جاتی تھی، اور اتباع سنت نہ ایسا دیکھا اور نہ ایسا سنا، سبحان اللہ!

بیواؤں کے نکاح کی بنا ان اطراف میں اوّل میں ان سے ہوئی، اور والد مرحوم نے اس کو نہایت خوب صورتی سے اجرا فرمایا، اور ان دونوں بزرگ واروں کے قدم قدم حضرت مولانا نے اس کو پورا شائع کیا۔ یہ اجر ان صاحبوں کے نامۂ اعمال میں تا بہ قیامت رہے گا، اور ایک یہ کیا، ہزاروں دین کی باتیں ایسی ہی کیں۔

مولانا مظفر حسینؒ سے زمانۂ طالب علمی سے نیازمندی اور عقیدت:

جناب مولوی مظفر حسین صاحبؒ کی خدمت میں اس زمانہ سے نیاز تھا، جب کہ حضرت مولوی صاحبؒ دہلی تشریف لاتے، تو والد مرحوم کے پاس ہمارے مکان میں فروکش ہوتے، اور والد مرحوم جب وطن

جاتے، کاندھلہ ہوکر جاتے۔ جب وطن سے ہٹتے[۱] کاندھلہ ٹھہر کر دہلی روانہ ہوتے۔

حضرت حاجی امداداللہؒ سے تعارف:

اور یہی حال جناب حاجی امداداللہ صاحبؒ سے تھا۔ تھانہ بھون میں آتے جاتے ملاقات کرکرآتے، یا وہاں مقام ہی ہوتا۔ سبحان اللہ! کیا جلسہ تھا۔ پیر محمد والی مسجد[۲] میں وہ گل زار تھا کہ شب وروز سوائے ذکر اور قال اللہ وقال الرسول کچھ اور دھندا نہ تھا۔ آخر شب میں ذکر جہر کا یہ رنگ ہوتا کہ غافل بھی جاگ اٹھتے اور توفیق ذکراللہ کی پاتے۔ غرض کہ یہ آنا جانا اور ملاقاتیں ان صاحبوں کی خدمت میں نیاز (کے) سبب ظاہر ہوئی؛ ورنہ جولکھا ہوا تھا، وہ ہرطرح ہوتا تھا۔

نکاح،توکل اورسخاوت:

مولوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نکاح نہ کرتے تھے اور جناب بھائی اسدعلی صاحب رحمہ اللہ حضرت کے والد کو ادھر تو ترک نوکری اور اختیار درویشی کا رنج تھا، اُدھر یہ فکر ہوا (کہ) دیوبند رشتہ کیا تھا۔ آخر جناب حاجی امداداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عرض کیا، حضرتؒ کے فرمانے سے نکاح پر راضی ہوگئے؛ مگر یہ شرط کی کہ: ''تمام عمر زوجہ کے نفقہ اور اولاد کی پرورش کے لیے کچھ کمالانے کے مجھ سے متقاضی نہ ہوں''۔ بے چاروں نے ناچار یہ شرط قبول کی، نکاح ہوگیا[۳]، اب نوکری آپ نے اگر کی تو کیا کی، کسی

(۱) ہٹتے: یعنی واپس لوٹتے۔

(۲) مسجد شاہ پیر محمد والی: تھانہ بھون کی پرانی تاریخی روحانی مسجد ہے۔ یہ مسجد شیخ احمدؒ نے اورنگ زیب عالم گیرؒ کے عہد ۱۱۱۴ھ/ (۱۷۰۲ء) میں تعمیر کرائی تھی، (جوشاہ ولی اللہؒ کا سنہ ولادت ہے)۔ قطعۂ تاریخ کا کتبہ نصب ہے:

بہ عہد شاہ عالم گیر احمد شیخ مسجد ساخت
اگر پرسند تار یخش بہ گو عاکف کہ احمد ساخت

یہ مسجد تھانہ بھون کے نام ور علما اور مشائخ کرام کا مسکن و مدفن رہی ہے۔ سب سے پہلے یہاں شیخ صادق گنگوہیؒ (وفات: ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء) کے خلیفہ شیخ پیر محمد تھانویؒ نے قیام کیا تھا۔ ان کے نام کی نسبت سے ''مسجد پیر محمد والی'' کہی جاتی ہے۔ حضرت علامہ قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ مؤلف ''کشاف اصطلاحات الفنون'' کا مدفن اس مسجد سے ملحق قبرستان میں تھا، جواب مسجد کے احاطے میں ہے۔ حضرت حاجی امداداللہ، حافظ محمد ضامن شہید، حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سب نے اللہ اللہ کے لیے اسی مسجد کو پسند کیا اور یہیں قیام فرمایا تھا۔ اب یہ ''مسجد خانقاہ امدادیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ (نور)

(۳) اہلیہ مولانا محمد قاسمؒ جو شیخ کرامت حسین دیوبندیؒ کی بڑی صاحب زادی تھیں، چھوٹی دختر عمدۃ النساء کا مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ سے نکاح ہوا تھا۔ بڑی بہن ام رحم صاحبہ مولانا محمد قاسمؒ سے منسوب تھیں؛ مگر ان کا نکاح غالباً بہت دیر سے ۱۲۷۰ھ/(۱۸۵۴ء) کے قریب منعقد ہوا۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی ان سے دس اولادیں ہوئیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: سوانح قاسمی: ج۱ص:۵۰۴۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی اہلیہ نے طویل عمر پائی۔ حضرت مولانا کی وفات کے تقریباً انتالیس سال بعد ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ/(ستمبر ۱۹۱۸ء) میں دیوبند میں وفات ہوئی۔ دیکھیے: ماہ نامہ القاسم دیوبند، محرم ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸ء: ص۶۔ (نور)

چھاپہ خانے [1] میں چار پانچ روپے کی تصحیح کی خدمت قبول کی، اور پھر مزاج میں مہمان نوازی اور سخاوت بھی، بھلا کیا بچتا کہ گھر دیتے۔

اہلیہ کی مہمان نوازی اور فیاضی:

بلکہ جب وطن آتے اور یہاں مہمان آتے، والدین کو دشواری ہوتی، تب یہ کیا کہ بی بی کا زیور اس کی اجازت سے بیچ کر صرف کردیا۔ وہ ایسی تابع دار تھیں کہ والدین کی خدمت میں جو مشقت اٹھائی، مولوی صاحبؒ کی مزاج داری ان کو علاوہ برآن ہوئی، اور والدین کی رضا کے لیے جب ناخوش ہوتے، تو ان کو ہی کچھ کہہ لیتے، آخر میں ان کے بڑے شکر گزار رہے، اور اللہ جل شانہ نے بہت کچھ عنایت فرمایا، جو کچھ فتوح ہوتی، ان کے حوالے کردیتے۔ وہ اللہ کی بندی (خدا سلامت رکھے) ایسی سخی اور دست کشادہ ہے کہ جناب مولوی صاحب کی مہمان داری کو اسی کے باعث رونق تھی۔ کبھی یاد نہیں کہ کسی وقت کوئی آ گیا ہو، اور گھر میں کھانا نہ ملا ہو؛ بلکہ خود فرماتے کہ: ہماری سخاوت احمد کی والدہ کی بہ دولت ہے، جو میں قصد کرتا ہوں، وہ مہمان نوازی میں اس سے بڑھ کر کرتی ہے۔

مہمانوں کے لیے چاولوں اور گھی کی فراوانی:

چاول نانوتہ میں بہت پیدا ہوتے ہیں، مہمانوں سے فرماتے کہ: ہم نے تمہارے لیے چاول پکانے میں تکلف نہیں کیا؛ بلکہ ہمارے گھر آمدنی اراضی کے یہی چاول ہوتے ہیں، وہی تمہارے آگے پکا کر رکھ دیتے ہیں۔ اور مہمانوں کے کھلانے میں مولوی صاحبؒ کو کچھ دریغ نہ ہوتا تھا۔ ایک بار دسترخوان پر کھچڑی کے ساتھ بہت سا گھی آیا، دس پندرہ آدمی تھے، جناب مولوی رشید احمد صاحبؒ نے فرمایا کہ: اتنا گھی! یہ فضول ہے، اس میں سے آدھا رکھ لیا، اور آدھا گھر بھیج دیا۔ ایک بار مہمانوں کی کسی سواری کے لیے دانے کی ضرورت تھی، چنے نہ ملے کہ دانہ دَل کردیں، گھر میں کابلی چنے رکھے ہوئے تھے، وہی دَلوا کر دانہ دے دیا۔ مہمان نوازی مولوی صاحبؒ پر ختم ہے۔

---

(۱) حضرت مولانا نے تین مطابع میں کتابوں کی تصحیح اور حاشیہ وغیرہ لکھنے کی ملازمت کی۔ سب سے پہلے مطبع احمدی میں، جو مولانا احمد علی محدثؒ کا پریس تھا۔ دوسرے مطبع مجتبائی میں، جس کے مالک منشی ممتاز علی صاحبؒ "نزہت رقم" حضرت مولانا کے خاص نیازمند اور معتقد تھے۔ تیسرا شیخ ہاشم علی میرٹھیؒ کا مطبع ہاشمی تھا۔ حضرت مولانا تینوں مطابع سے مصحح کی حیثیت سے وابستہ رہے، اور حضرت مولانا کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۹۲-۱۲۹۱ھ (۷۵-۱۸۷۴ء) میں بھی دہلی میں ایک مطبع کے کام کی وجہ سے رہنا ہوا تھا۔ یہ کون سا مطبع تھا، منشی ممتاز علیؒ کا مجتبائی یا کوئی اور مطبع تھا؟ صراحت نہیں ملی۔ (نور)

بچپن کا ایک خواب اور اس کی تعبیر:

مجھے یاد ہے کہ مولوی صاحبؒ نے لڑکپن میں ایک خواب دیکھا تھا، اس کی تعبیر یہی تھی۔ یوں دیکھا تھا کہ: ''میں مرگیا ہوں اور لوگ مجھے دفن کرآئے، تب قبر میں حضرت جبرئیل (علیہ السلام) تشریف لائے، اور کچھ نگین سامنے رکھے اور کہا: یہ اعمال تمہارے ہیں۔ ان میں سے ایک نگین بہت خوش نما اور کلاں ہے، اس کوفرمایا کہ یہ عمل حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ السلام) کا ہے''۔

ایام طالب علمی میں مولوی صاحبؒ نے اور ایک خواب دیکھا تھا کہ: میں خانۂ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں، اور مجھ میں سے نکل کر ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں۔ جناب والد مرحوم سے ذکر کیا، انہوں نے فرمایا کہ: تم سے علم دین کا فیض بہ کثرت جاری ہوگا۔

شیخ اسد علیؒ کو مولانا کے توکل اور استغنا سے فکر اور دعا کی خواہش:

جس زمانہ میں نکاح ہوا، اور والد کو یہ خیال تھا کہ ابنائے زمانہ کی طرح جب فکر ہوگا، آپ نوکری کر ہی لیں گے، اور بعد گزرنے کتنی مدت کے کچھ نہ کیا، تب مایوس ہوگئے، اور ان کو اس امر کا بہت رنج تھا کہ اور بھائی پڑھ کر نوکر ہوگئے، کوئی پچاس [کا]، کوئی سو کا، کوئی کم، کوئی زیادہ، [سب] خوش وخرم ہیں، اور ان کا حال ویسا ہی ہے، اور آمدنی آراضی کی مکتفی [1] خرچ کو نہ ہوتی تھی، جناب حاجی امداد اللہ صاحب مدظلہ سے شکایت کی کہ: ''بھائی! میرے تو یہی ایک بیٹا تھا، اور مجھے کیا کچھ امیدیں تھیں، کچھ کماتا، تو ہمارا یہ افلاس دور ہوجاتا، تم نے اسے خدا جانے کیا کردیا کہ یہ نہ کچھ کمائے، نہ نوکری کرے''۔ حضرت اس وقت تو ہنس کر چپ ہو رہے، پھر کہلا بھیجا کہ یہ شخص ایسا ہونے والا ہے کہ وہ سو پچاس والے سب اس کی خادمی کریں گے، اور ایسی شہرت ہوگی کہ اسی کا نام ہر طرف پکارا جائے گا، اور تم تنگی کی شکایت کرتے ہو؟ خدا تعالیٰ بے نوکری ہی اتنا کچھ دے گا کہ ان نوکروں سے یہ اچھا رہے گا۔

جناب بھائی اسد علی صاحبؒ کی ہی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے وسعت دی اور مولوی صاحبؒ سے بہت خوش انہوں نے انتقال کیا، اور تصدیق اس پیش گوئی کی اپنی آنکھ دیکھ گئے۔ قدر مریدوں کی پیر پہچانے اور جو ایسی نظر رکھے وہی جانے۔

---

(۱) یعنی زمین کی آمدنی سے گھر کا خرچ اور ضرورتیں پوری نہیں ہوتی تھیں۔ آمدنی کم تھی اور خرچ بہت زیادہ ہوتا تھا۔ ایسے حالات میں شیخ اسد علیؒ کا یہ خیال کرنا کچھ بے جا بھی نہیں تھا، لیکن قدرت کے راز پنہاں وہی جانے۔ (نور)

حضرت حاجی امداد اللہ کی نگاہ میں مولانا کی قدر ومنزلت:

حضرتؒ نے آخر میں ''ضیاء القلوب'' کی چند سطر ان دونوں صاحبوں کی تعریف میں (لکھی) ہیں، نہایت درست ہیں[1]۔ یوں حضرتؒ نے اپنی کسرِ نفسی کو کام فرمایا ہے؛ مگر اظہار مرتبہ ان دونوں صاحبوں کا اس سے منظور ہے، اور خود احقر سے ارشاد فرمایا تھا، اوّل حج میں جب حاضر خدمت ہوا تھا کہ: ''مولوی رشید احمد صاحب میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں، لوگوں کو یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور مولوی محمد قاسم صاحبؒ کو فرمایا تھا کہ: ایسے لوگ پہلے زمانہ میں ہوا کرتے تھے، اب مدتوں سے نہیں ہوتے''۔

تحریر وتقریر محفوظ رکھنے کی حضرت حاجی صاحبؒ کی ہدایت:

اور اللہ تعالیٰ نے اس کمال پر یہ ضبط عنایت فرمایا تھا کہ کبھی کوئی کلمہ خودستائی کا، یا کسی طرح کوئی صورت رعونت، یا خود بینی کی خلوت وجلوت، تنہائی مجمع، اپنے بے گانوں میں کبھی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ اب اس سفر میں حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ: ''مولوی صاحب کی تحریر وتقریر کو محفوظ رکھا کرو اور غنیمت جانو''۔

ہائے افسوس! یہ خبر نہ تھی کہ اس کے یہ معنی ہیں، اور یہ واقعہ یوں اچانک آجائے گا۔ چند بار شدت مرض ہو کر اللہ تعالیٰ نے شفا دی تھی، اب کی بار بھی وہی خیال باندھ رکھا تھا۔ کیا کیجیے جو باتیں رہ گئیں، رہ گئیں، اب سوائے افسوس کے کیا ہوسکتا ہے؟ جو تحریریں ناتمام رہ گئیں، اب بھلا کون ان کو تمام کرسکتا ہے؟ اور جن میں کچھ نقصان ہو گیا، ان کی تکمیل کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

اولاد نہ ہونے سے والد کا تکدر اور اولاد کی تفصیل:

بعد نکاح والد اکثر مکدر رہتے تھے، اور آرزو کرتے تھے کہ کوئی پوتا ہوتا، تو اس سے امید نسل جاری ہونے کی بندھتی۔ اوّل کئی لڑکیاں ہوئیں، جن میں سے دو زندہ اب ہیں۔ ایک بزرگ نے کہا کہ: تم یہ آرزو کرتے ہو، اور مولوی صاحب کو ناخوش رکھتے ہو، ان کو مکدر نہ کرو، اللہ تعالیٰ تم کو بھی خوش کرے گا۔ تب سے مولوی صاحب کی اکثر مزاج داری کرتے، اور مہمانوں کی خدمت اور تواضع سے کسی طرح نہ گھبراتے۔

---

(۱) ضیاء القلوب میں حضرت حاجی امداد اللہؒ نے حضرت مولانا رشید احمدؒ اور مولانا محمد قاسمؒ کا ذکر کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:
''نیز جو شخص کہ اس فقیر (حاجی امداد اللہؒ) سے محبت وعقیدت رکھتا ہے مولوی رشید احمد کو اور مولوی محمد قاسم کو جو تمام ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع ہیں، مجھ فقیر راقم اوراق (حاجی امداد اللہؒ) کی جگہ بلکہ بعد مجھ سے بدرجہا بلند سمجھیں۔ اگرچہ دیکھنے میں معاملہ اس کا الٹا ہو گیا کہ وہ لوگ میری جگہ اور میں ان کی جگہ ہوں۔ ان صاحبان کی صحبت اور ملاقات کو غنیمت سمجھیں، کیوں کہ اس طرح کے اشخاص اس زمانے میں نایاب ہیں''۔ (ص۶۰)

تب اللہ تعالیٰ نے میاں ''احمد'' کو عنایت کیا۔ آج بحمد اللہ تعالیٰ میاں احمد جوان ہیں، اٹھارہ برس کی عمر ہے [1]، اللہ تعالیٰ اپنے والد کی مثل کر (ے)۔ آمین!

اور میاں ہاشم پیدا ہوئے۔ آج ان کی عمر آٹھ برس کی ہے [2]۔ یہ نام مولوی صاحب کے والد کا رکھا ہوا ہے۔ اس عرصے میں کئی لڑکے لڑکیاں پیدا ہو (ئیں)، اور چھوٹی عمر میں انتقال ہوگیا، اب ایک لڑکی تین چار برس کی آخری اولاد ہے [3]۔ اللہ ان سب کو عمر وسعادت وخوبی نصیب کرے، اور مولوی صاحبؒ کا نام ان کی نسل سے قائم رکھے۔

والد صاحب کی اطاعت اور حقہ بھرنے کی خدمت:

ہمارے بھائی اسد علی صاحبؒ بڑے سیدھے آدمی تھے۔ حقہ بہت پیتے تھے، مولوی صاحبؒ کو حقے سے نفرت۔ ایک بار حقہ بھرنے کو کہا، مولوی صاحبؒ باپ (کے) تابع دار، حقہ بھر کر سامنے لا رکھا۔ جب لوگوں نے سنا، بہت ملامت کی۔ کہا میں کہہ کر خود نادم ہوا، پھر کبھی مولوی صاحبؒ سے نہ کہا۔

مسجد میں رہنے کا ذوق اور سخت مجاہدہ:

والد سے اوّل اس بات پر اکثر تکدرر ہتا تھا، مولوی صاحب مسجد میں رہتے، رات کو مسجد میں سو رہتے، کھانا مسجد میں کھاتے، پیر بھائی دو تین تھے، ان کو کہا تھا کہ: سب کھانا لایا کرو، اور مل کر کھالیا کریں گے۔

---

(۱) حافظ احمدؒ خلف حضرت مولانا محمد قاسمؒ - ۱۲۷۹ھ/(۱۸۶۱ء) میں نونوتہ میں تولد ہوئے۔ تعلیم کے لیے مولانا عبداللہ انصاریؒ کے پاس مدرسۂ منبع العلوم گلاؤٹھی بھیج دیے گئے۔ گلاوٹھی سے مرادآباد گئے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے بھی پڑھا۔ حدیث شریف حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے حلقۂ درس میں حاصل کی۔ مدرسۂ اسلامیہ تھانہ بھون سے تدریسی زندگی کا آغاز ہوا۔ ۱۳۰۲ھ/(۱۸۸۵ء) میں دار العلوم میں مدرس ہوئے۔ ۱۳۱۳ھ/(۱۸۹۵ء) میں حضرت گنگوہیؒ نے مہتمم دار العلوم مقرر کیا۔ مولانا کے طویل دورِ اہتمام میں دار العلوم نے ہر پہلو سے ترقی کی۔ مولانا محمد احمدؒ ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۲ء) میں ریاست حیدرآباد میں صدر مفتی مقرر کیے گئے تھے، چار سال تک اس عہدے پر فائز رہے، نظام حیدرآباد کو دار العلوم کا دورہ کرنے کی دعوت دینے کے لیے حیدرآباد گئے تھے، حیدرآباد میں بیمار ہوئے، واپسی میں ۳/جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ/ (۱۸/اکتوبر ۱۹۲۸ء) کو ریل میں وفات ہوگئی۔ حیدرآباد لے جا کر دفن کیا گیا۔ (تاریخ دار العلوم، مرتبہ سید محبوب احمد رضویؒ/ ماہ نامہ الرشید- ساہی وال، اشاعت خاص: ص: ۴۸-۲۴۷، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء)۔

(۲) میاں ہاشم تقریباً ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء میں تولد ہوئے۔ ذہین وفطین اور علم کے شوقین تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے متوسلین ان میں حضرت مولانا کی جھلک دیکھتے تھے۔ دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ دار العلوم کی روداد سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خاصے باصلاحیت تھ؛ مگر تعلیم مکمل نہ ہوئی تھی کہ اوائل جوانی میں (مولانا قاری محمد طیب صاحب کی اطلاع کے مطابق) مکۂ مکرمہ میں فوت ہوگئے۔ (حاشیہ سوانح قاسمی، مولانا گیلانیؒ، ج۱ص۵۰۳)۔ (نور)

(۳) یہ لڑکی جس کا مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے یہاں ذکر کیا ہے ''عائشہ'' تھیں، طویل عمر پائی۔ لاولد فوت ہوئیں۔ (نور)

پا پیادہ چلتے، جفا کشی کرتے، ان کو رنج ہوتا۔ مولوی صاحب ایسے جفا کش تھے، اوّل میں جب ضرورت نہانے کی ہوتی تھی، مسجد میں پانی گرم ہوتا تھا اور تہجد کے وقت نہاتے؛ مگر شرم کے سبب تالاب میں جا کر نہا لیتے۔ یہ کڑ کڑ اٹ کا جاڑا، اور پالا پڑے، اور مولوی صاحبؒ تالاب میں نہائیں۔

ریاضتوں کی کثرت:

مولوی صاحبؒ نے ریاضتیں ایسی کیں ہیں کہ کیا کوئی کرے گا۔ اشغال دشوار جیسے حبس [دم] اور سہ پایہ مدت تلک کیے ہیں، اور بارہ تسبیح اور ذکر ارّہ کا دوام تھا ہی، سر کے بال شدت حرارت کے سبب اڑ گئے تھے۔ حرارت مزاج میں ایسی آ گئی تھی کہ کسی صورت سے فرو نہ ہوتی تھی؛ کیوں کہ یہ حرارت قلب کی تھی اور اس کے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوئی، یہی آخر مرض کا باعث ہوئی اور اسی میں آخر انتقال کیا۔

علوم ومعانی کی آمد اور ضبط نسبت میں کمال:

آمد معانی اور مضامین کی ایسی تھی، یوں فرماتے تھے کہ: بعضے بار حیران ہو جاتا ہوں کہ کیا کیا بیان کروں، اور اکثر تقریر طویل کے سبب کہیں سے کہیں نکل جاتے۔ باقی احوال اللہ جانے۔ باوجود یہ کہ کشف تمام تھا؛ مگر کبھی زبان سے کچھ نہ فرماتے۔ ادنا ادنا اہل نسبت کے پاس بیٹھنے سے اثر ہوتا ہے، مولانا کو یہ ضبط تھا کہ کبھی کچھ اثر ظاہر نہ ہوتا تھا۔

ایک صاحبِ باطن کی مولانا پر توجہ ڈالنے کی کوشش اور اس پر ندامت:

ایک بار مولوی صاحبؒ نے میرٹھ میں مثنوی مولانا رومؒ پڑھانا شروع کیا۔ دو چار شعر ہوتے اور عجیب وغریب مضمون بیان ہوتے۔ ایک صاحب کہ کچھ رنگ باطنی رکھتے تھے، سن کر یوں سمجھے کہ یہ اثر تبحر علمی کا ہے، اور چاہا کہ کچھ مولانا کو فیض باطنی دیں، درخواست کی کہ کبھی تنہا ملیے۔ آپ نے فرمایا: مجھے کام چھاپہ خانے کا اور پڑھانا طلبہ کا رہتا ہے، تنہائی کہاں؟ آپ جب چاہیں، تشریف لائیں۔ وہ صاحب ایک روز تشریف لائے اور کہا کہ آپ ذرا میری جانب متوجہ ہوں اور خود آنکھ بند کر کے مراقب ہوئے۔ مولانا سبق پڑھا رہے تھے؛ البتہ موقوف کر دیا؛ مگر کبھی آنکھ (کھلی) اور کبھی قدرے بند، ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کا یہ حال ہوتا تھا کہ کبھی قریب گرنے کے ہو جاتے تھے اور پھر سنبھل بیٹھتے تھے۔ کچھ دیر یہ معاملہ رہا، پھر وہ اٹھ کر نیچی نگاہ کیے چلے گئے، پھر بہت معذرت کی۔ مولانا کی کسرنفسی نے ان کے کمال کو ہرگز ظاہر نہ ہونے دیا، اور جو کچھ ظاہر ہوا، میرے گمان میں بامر اللہ تھا، ہرگز (اپنی) طرف سے اظہار کسی امر کا نہ فرماتے تھے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچی۔

مولانا یعقوب نانوتویؒ سے ملاقات کے لیے روڑکی کا پیدل سفر:

جب احقر بنارس سے وطن کی طرف پہنچا، اتفاق نانوتہ جانے کا نہ ہوا، دیوبند میں اہل وعیال چھوڑ کر روڑکی چلا گیا، وہاں کام نوکری کا کرنے لگا، اتفاق گھر جانے کا نہ ہوا۔ مولوی صاحبؒ گھر تھے، میں نے عرض کر بھیجا کہ جی ملنے کو چاہتا ہے اور مجھے فرصت نہیں۔ خود پیادہ پا دومنزلہ [سفر] کر کے (۱) احقر کے ملنے کو تشریف لائے، اور ہمیشہ جب تلک قوت تھی، کبھی بھی سواری کی طرف رخ نہ تھا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ہمت وجرأت:

اسی عرصے میں غدر ہوگیا۔ بعد رمضان احقر کو سہارن پور لینے کو تشریف لائے، چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے، اس وقت راہ چلنا بدون (بلا) ہتھیار اور سامان کے دشوار تھا۔ جب احقر وطن پہنچا، تو چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے، جس میں مولانا کی کمال جرأت وہمت ظاہر ہوئی۔

اسی زمانے میں ہمارے بھائی ہم عمر اکثر مشق بندوق اور گولی لگانے کی کرتے رہتے تھے، ایک دن آپ مسجد میں سے آئے کہ ہم گولیاں لگارہے تھے اور نشانہ کی جائے (جگہ) پر ایک نیم کا پتہ رکھا تھا، اور اس کے گرد ایک دائرہ کھینچا تھا، قریب سے بندوق لگاتے تھے، گولیاں مٹی کی (تھیں)۔ مولوی صاحبؒ نے فرمایا کہ بندوق کیوں کر لگاتے ہیں؟ مجھے بھی دکھلاؤ۔ کسی نے ایک فائر کی اور قاعدہ نشانہ کا ذکر کیا، تب بندوق ہاتھ میں لے کر فائر کی، صاف گولی نشانے پر لگی، اور وہ سب مشّاق کتنی دیر سے لگارہے تھے، دائرہ میں لگ جانے کو نشانے پر پہنچنا جانتے تھے، اور یہ بات اتفاقی نہ تھی، اپنی فہم سے حقیقت نشانہ بازی کی سمجھ کر بدن ایسی وضع پر سادھ لیا، جو فرق ہوجانے کی وجہ تھی نہ ہوئی۔ تیراندازوں کو دیکھا ہے کہ سر سے پا تلک ایک خط مستقیم ہوجاتے ہیں۔

سکون واطمینان اور جرأت اور حوصلہ:

حاصل یہ کہ اس طوفان بے تمیزی میں جب لوگ گھبراتے تھے، ہم نے کبھی مولانا کو گھبراتے نہ دیکھا۔

(۱) یعنی مولانا محمد یعقوبؒ کے اس خط کی وجہ سے، حال آں کہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ مولانا محمد یعقوبؒ سے عمر میں بڑے تھے، اور یقیناً حضرت مولانا کی مصروفیتیں مولانا یعقوبؒ کی مصروفیات سے بہت بڑھ کر اور دینی علمی لحاظ سے زیادہ قیمتی بھی تھیں؛ مگر حضرت مولانا نے ان باتوں کا کچھ خیال نہیں فرمایا، اسی وقت دیوبند یا نانوتہ سے پیدل چل کر روڑکی آگئے۔ سچ ہے: جن کے رتبے ہیں، ان کے سوا مشکل ہے۔ (نور)

خبروں کا اس وقت میں چرچا تھا؛ جھوٹی، سچی ہزاروں گپ شپ اڑا کرتی تھی؛ مگر مولوی صاحبؒ اپنے معمولی کام بہ دستور انجام فرماتے تھے۔

چند بار مفسدوں سے نوبت مقابلے کی آ گئی، اللہ رے! مولوی صاحبؒ ایسے ثابت قدم، تلوار ہاتھ میں اور بندقچیوں کا مقابلہ[۱]، ایک بار گولی چل رہی تھی، یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، جس نے دیکھا، جانا گولی لگی۔ ایک بھائی دوڑے، پوچھا کیا ہوا؟ فرمایا: سر میں گولی لگی، عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا، کہیں گولی کا نشان تلک نہ ملا، اور تعجب یہ ہے کہ خون تمام کپڑوں پر گرا ہوا تھا۔

دشمنوں سے مقابلے میں بندوق کی گولی کا اثر:

انہیں روزوں ایک روز منہ در منہ ایک نے بندوق ماری، جس کے سنبہ[۲] سے ایک مونچھ اور کچھ داڑھی جل گئی، اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا، اور خدا جانے گولی کہاں گئی، اور اگر گولی نہ تھی، اتنے پاس سے سنبہ بھی بس تھا؛ مگر حفاظت الٰہی بر سر تھی، کچھ اثر نہ ہوا۔ اس زخم کی خبر اجمالی بعض دشمنوں نے جو سنی، تو سرکار میں مخبری کی کہ تھانہ بھون کے فساد میں شریک تھے۔ حال آں کہ مولانا فسادوں سے کوسوں دور (تھے)۔ ملک ومال کے جھگڑے اگر سر رکھتے، تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی؟ کہیں کے ڈپٹی یا صدر الصدور ہوتے؛ اس لیے حاجت روپوشی کی ہوئی۔ حضرت حاجی صاحب بھی (اسی) باعث سے روپوش ہو گئے تھے۔

۱۸۵۷ء کے معرکہ کے بعد روپوشی، تلاشی اور اسی وجہ سے مختلف مقامات کے سفر:

ایام روپوشی میں ایک روز دیو بند تھے، زنانہ مکان کے کوٹھے پر مردوں میں سے کوئی تھا نہیں، زینے میں آ کر فرمایا: پردہ کرلو، میں باہر جاتا ہوں۔ عورتوں سے رک نہ سکے، باہر چلے گئے۔ بعضے مرد بازار میں تھے، ان کو اطلاع کی، وہ اتنے مکان پر پہنچے، دوڑ[۳] سرکاری آدمیوں کی پہنچ لی تھی، انہوں نے آ کر تلاشی لی، ہر چند بہ ظاہر مولوی صاحبؒ کی تلاش نہ تھی؛ مگر پھر خوف کی جگہ تھی، اس کے بعد سے مسجد میں رہتے، اور پھر کسی نے تعرض نہ کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے چند بار بچادیا۔

---

(۱) غالباً معرکۂ شاملی کی طرف اشارہ ہے، جس میں ان بے سروسامان اصحاب وعلمانے انگریزی فوج کے دستوں کا اس قدر پامردی اور بہادری سے مقابلہ کیا کہ انگریز فوج کو ہتھیاروں کی کثرت اور شجاعت کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود شکست کھا کر اور سخت نقصان اٹھا کر بھاگنا پڑا تھا۔ (نور)

(۲) سنبہ- توپ میں بارود کی تھیلی، یا گولہ ڈال کر اوپر سے ٹھوکنے کا گز۔ (فرہنگ آصفیہ: ج ۳ ص ۱۰۱، مولوی سید احمد دہلوی، دہلی، ۱۹۷۴ء)

(۳) دوڑ- دَوِش، حملہ، دھاوا- چڑھائی، دشمنوں یا مجرموں کی گرفتاری کے لیے تیز رفتار سے اچانک حملہ۔ (فرہنگ آصفیہ: ج ۲، ص ۲۸۳، دہلی، ۱۹۷۴ء) (نور)

اس زمانے کی کیفیات عجیب وغریب گزری ہیں، لکھنا ان کا طول ہے۔ اسی وقت میں دیوبند اور املیا وغیرہ مختلف جائے پر متفرق اوقات میں رہے، بوڑیہ، گمتھلہ، لاڈوہ، پنج لاسہ، جمنا پار کئی دفعہ گئے آئے۔

آخر حضرت حاجی صاحبؒ عرب کو روانہ ہو گئے۔ احقر کو بعد ان کے یہی سوجھی کہ تو بھی چل۔ مولانا کی روپوشی محض عزیز واقارب کے کہنے سے تھی؛ ورنہ ان کو اپنی جان کا کچھ خیال نہ تھا، مولانا نے بھی ارادہ کیا، اس روپوشی کی بلا کے سبب والدین نے بہ خوشی اجازت دے دی۔ احقر بے سامان تھا، قلیل سازادِ راہ بہم پہنچایا تھا؛ مگر مولوی صاحبؒ کی بہ دولت توکل سب راہ بہ خیر خوبی پورا ہوا، اور سب کام انجام ہو گئے۔

کشتیوں کی راہ (سے) پنجاب ہو کر سندھ کی طرف کو گئے، کراچی سے جہاز میں بیٹھے، جمادی الثانی سن ۱۲۷۷ھ/ (جنوری ۱۸۶۱ء) میں روانہ ہوئے، اور آخر ذی قعدہ (جون) میں مکۂ معظّمہ پہنچے۔ بعد حج مدینہ شریف روانہ ہوئے۔ اوّل صفر مراجعت کی۔ اسی مہینے کے آخر میں جہاز میں بیٹھے، ربیع الاوّل کے آخر میں بمبئی آئے، جمادی الثانی تلک وطن پہنچے[1]۔

سفر حج اور راستے میں قرآن حفظ کرنا اور تراویح میں سنانا:

جاتے بار میں کراچی سے جہاز بادبانی میں سوار ہوئے تھے، رمضان کا چاند[2] دیکھ کر مولوی صاحبؒ نے قرآن شریف یاد کیا تھا۔ اوّل وہاں سنایا اور جہاز میں کیا (میسر) تھا، بعد عید مکہ پہنچ کر حلوے مسقط خرید فرما کر شیرینی ختم دوستوں کو تقسیم فرمائی۔

مولوی صاحبؒ کا اس سے پہلے قرآن یاد کرنا کسی کو ظاہر نہ ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ پڑھتے اور یاد کر لیتے، اور حافظوں کے نزدیک ٹھہرا ہوا ہے کہ بلند آواز سے یاد ہوتا ہے۔ بعد ختم فرماتے تھے کہ دو سال میں رمضان رمضان میں فقط یاد کیا ہے، اور جب یاد کیا، پاؤ سپارہ (کے) قدر، یا کچھ اس سے زاید کر لیا، اور جب سنایا، ایسا صاف سنایا، جیسے اچھے پرانے حافظ۔ پھر تو اکثر بہت بہت پڑھتے۔ ستائیس سپارے ایک بار یاد ہے،

(۱) مولانا محمد یعقوبؒ نے اس سفر کا روزنامچہ لکھا تھا، جو بیاض یعقوبی میں شامل ہے۔ (ص ۱۲۸ تا ص ۱۵۰، طبع اول، تھانہ بھون، ۱۹۲۹ء)۔

۱۵ر جمادی الاولی ۱۲۷۷ھ/ ۲ر نومبر ۱۸۶۰ء کو نانوتہ سے روانہ ہوئے تھے۔ چھ مہینے کا طویل سفر ۲۱ر ذی قعدہ ۱۲۷۷ھ/ (یکم جون ۱۸۶۱ھ) میں مکۂ معظّمہ پہنچ کر پورا ہوا۔ (بیاض یعقوبی: ص ۱۴۲) شروع صفر ۱۲۷۸ھ/ (اگست ۱۸۶۱ء) میں واپس روانہ ہوئے۔ جدہ سے جہاز سے چل کر ربیع الاوّل ۱۲۷۸ھ/ (اکتوبر ۱۸۶۱ء) کے آخر میں بمبئی پہنچے، اور جمادی الثانی ۱۲۷۸ھ/ (دسمبر ۱۸۶۱ء) میں ایک سال بعد وطن واپس آ گئے۔ جس کی مولانا محمد یعقوبؒ نے یہاں صراحت فرمائی ہے۔

مولانا محمد یعقوبؒ کے الفاظ: ''اس روپوشی کی بلا کے سبب والدین نے بہ خوشی اجات دے دی'' سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں شرکت کی وجہ سے مولانا محمد قاسمؒ نے تقریباً پانچ سال روپوشی میں گزارے تھے۔ (نور)

(۲) رمضان المبارک ۱۲۷۷ھ/ مطابق مارچ ۱۸۶۱ء۔

ایک رکعت میں پڑھتے۔ اگر کوئی اقتدا کرتا رکعت (مختصر) کر (کے) اس کو منع فرمادیتے، اور تمام شب تنہا پڑھتے رہتے۔ بعد زیارت حرمین شریفین ایک برس کچھ زیادہ میں وطن آئے۔ مراجعت بہ راہ بمبئی اور ناسک ہوئی، ریل ناسک تلک تھی، وہاں سے گاڑیوں میں آئے۔

انگریزی حکومت کے عام معافی کے اعلان کے بعد گھر پر قیام، مطبع مجتبائی میں ملازمت:

پیچھے بعد تحقیقات سرکار نے مطالبۂ عام اٹھادیا تھا، چند خاص شخصوں کی نسبت جن پر سرکار کا شبہ قوی تھا، اشتہار جاری رہا، پھر گھر اپنے رہے۔

غدر[1] میں دہلی کا تو سب کارخانہ درہم برہم ہوگیا تھا۔ مولوی احمد علی صاحبؒ کا مطبع گیا گزرا تھا۔ اس زمانے میں سوائے وطن اور کوئی جگہ جانے کی نہ تھی، کبھی وطن، کبھی دیوبند رہتے تھے۔ اسی وقت میں احقر نے حضرتؒ سے بخاری قدرے پڑھی، پھر منشی ممتاز علی صاحبؒ نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا[2]، مولوی صاحبؒ کو پرانی دوستی کے سبب بلالیا، وہی تصحیح کی خدمت تھی۔ یہ کام برائے نام تھا، مقصود ان کا مولوی صاحبؒ کو اپنے پاس رکھنا تھا۔

---

(۱) ۱۸۵۷ء/ (۷۴-۱۲۷۳ھ) کی پر جوش اور طاقت ور تحریک جو ہندوستان پر انگریز کے تسلط کے خلاف برپا ہوئی تھی، اور جس کو انگریز نے اپنی روایتی عیاری اور ہوشیاری کو کام میں لاکر غدر (RIOT) کا نام دے دیا تھا۔ حکومت برطانیہ کے قہر و دبدبے کے دور (تقریباً ۱۹۲۰ء) تک اس کو سب خاص و عام، علما اور اہل قلم غدر ہی کہتے اور لکھتے تھے۔ جنگ آزادی کیسے کہتے یا لکھتے؟ اس سے وہ خود غداروں کی فہرست میں گن لیے جاتے اور قابلِ گردن زدنی شمار ہوتے۔

مولانا محمد یعقوبؒ نے تحریک آزادی کے جس دور کا ذکر کیا ہے، وہ تھانہ بھون، شاملی، نواحی علاقوں اور ضمناً سہارن پور، مظفر نگر سے متعلق تھا۔ اگرچہ یہ چنگاری اور علاقوں میں مئی میں بھڑک اٹھی تھی، اور اگست تک شعلۂ جوالہ بن کر شمالی ہند کے بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ سہارن پور، مظفر نگر اور اس نواح کے قصبات میں بھی اس کے گہرے اثرات تھے۔ یہاں بھی جگہ جگہ انگریز فوج سے معرکہ آرائی اور فتح و شکست چل رہی تھی، آخر میں ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء/ (۲۴ محرم ۱۲۷۴ھ) کو شاملی میں ایک بڑا معرکہ برپا ہوا، جس میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے خواجہ تاش حضرت حافظ محمد ضامن شہید ہوئے، اور بھی کئی سو اصحاب جس میں نامور علما اور اہل کمال بھی تھے، جاں بحق ہوئے۔ اس کے بعد انگریز فوج کے ہاتھوں تھانہ بھون تباہ و برباد ہوا۔

یہ ایک مفصل تاریخ ہے؛ مگر افسوس ہے کہ ہماری غفلت اور ہمارے بعض ذمے داروں کی تاریخ سے ناواقفیت (بلکہ نفرت) کی وجہ سے اس معرکے کی صحیح تفصیلات اور مستند واقعات ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئے ہیں۔ اور بات یہاں تک آ پہنچی ہے کہ متعدد اصحاب نے اس کا صاف انکار ہی کردیا اور لکھ دیا کہ اس قسم کا نہ کوئی واقعہ ہوا تھا، نہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور ان کی جماعت کا اس سے کچھ تعلق تھا؛ مگر یہ انکار معلومات کی کمی اور ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ معلومات موجود ہیں، کسی وقت مرتب کر کے پیش کی جائیں گی، جس سے اس معرکہ کی واضح تصویر اور اکثر تفصیلات ان شاء اللہ! سامنے آجائیں گی۔ (نور) یہ تمام تفصیلات محترم ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے ''بزرگان دیوبند اور جہاد شاملی'' میں جمع کردی ہیں۔ (نعمان)

(۲) منشی ممتاز علی خلف منشی امجد علی دہلوی، میرٹھ، نزہت رقم، جو خطاطی میں بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے، کا چھاپہ خانہ مطبع مجتبائی میرٹھ تھا۔ اس مطبع نے حضرت مولانا کی کتابوں کی اشاعت میں بہت دل چسپی لی، بعد میں مطبع مجتبائی میرٹھ سے دہلی منتقل ہوگیا تھا، وہاں بھی اس کی سرگرمی اور حضرت مولانا کی تصانیف سے وابستگی برقرار رہی۔ حضرت مولانا کے مکتوبات کا سب سے پہلا مجموعہ ''قاسم العلوم''، منشی ممتاز علیؒ نے سب سے پہلے مطبع مجتبائی دہلی سے چھاپا تھا۔ (بقیہ اگلے صفحے پر):

مدرسۂ دیوبند کی ابتدا اس میں شرکت اور سرپرستی:

احقر اس زمانہ میں بریلی اور لکھنؤ ہوکر میرٹھ میں اسی چھاپہ خانے میں نوکر ہوگیا، اور منشی جی حج کو گئے تھے، اس وقت میں ایک جماعت نے مسلم پڑھی، احقر بھی اس میں شریک رہا۔

وہی زمانہ تھا کہ بنامدرسۂ دیوبند کی پڑی، مولوی فضل الرحمٰن اور مولوی ذوالفقار علی صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں۔ مدرس کے لیے تنخواہ پندرہ روپے تجویز ہوئے، اور چندہ شروع ہوا، چند ہی روز گزرے کہ چندے کو افزونی ہوئی اور مدرس بڑھائے گئے، اور مکتب فارسی اور حافظ قرآن مقرر ہو(ئے)، اور کتب خانہ جمع ہوا۔ مولوی محمد قاسم صاحبؒ شروع مدرسہ میں دیوبند آئے، اور پھر ہر طرح اس مدرسے کے سرپرست ہوئے۔ مدرسے کے احوال لکھنا یہاں طول طائل ہے، سالانہ کیفیتوں [1] سے یہ سب امر واضح ہوجاتے ہیں۔

(پچھلے صفحے کا بقیہ): مطبع مجتبائی کی اور مطبوعات بھی قابل توجہ ہیں۔ مطبع مجتبائی اور ہاشمی دونوں مطابع نے قرآن شریف کے عمدہ عمدہ نسخے تصحیح اور مفید حواشی و تراجم کے ساتھ بار بار شائع کیے۔ منشی ممتاز علیؒ نے ایک قرآن شریف اور حمائل حضرت مولانا سے تصحیح کراکر چھاپی تھی، جس کو بہت شہرت اور احترام نصیب ہوا۔ یہ دونوں قرآن شریف صحت کے لحاظ سے آج بھی سند ہیں۔ مطبع مجتبائی میرٹھ کے ابتدائی دور کی مطبوعات کا معیار بہت اچھا ہے، اور کتابوں کے علاوہ غالب کی ''عود ہندی'' بھی سب سے پہلے منشی ممتاز علیؒ نے چھاپی تھی۔
منشی ممتاز علیؒ کی حیات میں ان کے فرزند نے مطبع کا کام سنبھال لیا تھا، اور حاجی صاحبؒ ۱۸۸۶ء/(۴-۱۳۰۳ھ) میں ہندوستان سے ہجرت کر گئے تھے۔
منشی ممتاز علیؒ کا مطبع پانچ سو روپے میں مولوی عبدالاحدؒ نے خرید لیا تھا؛ مگر مولوی عبدالاحدؒ نے مطبع کا نام اور مطبع کی مشینیں اور سامان وغیرہ خریدا ہوگا۔ اسی لیے اس کے لیے خاصی بڑی رقم پانچ سو روپے ادا کیے گئے؛ لیکن منشی ممتاز علیؒ نے اپنے مطبع کی کم سے کم ایک مشین اپنے ساتھ مکۂ مکرمہ لے گئے تھے، اور مکۂ مکرمہ میں بھی مطبع مجتبائی کے نام سے طباعت واشاعت کا کام شروع کر دیا تھا۔ امداد صابریؒ نے حضرت حاجی امداد اللہؒ کی ''جہادِ اکبر'' اور ''تحفۃ العشاق'' کے ان نسخوں کا ذکر کیا ہے، جو منشی ممتاز علیؒ نے مکۂ مکرمہ میں اپنے مطبع مجتبائی سے چھاپے تھے۔ (حجاز مقدس کے اردو شاعر: ص ۱-۷۰ دہلی، ۱۹۷۰ء) مولوی عبدالاحدؒ کی سرپرستی میں مطبع مجتبائی نے غیر معمولی ترقی کی، اور ہندوستان کے ممتاز ترین مطابع میں شمار کیا گیا۔
منشی ممتاز علیؒ نے خاصی طویل عمر پائی۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ کی وفات ۱۳۱۷ھ/(۱۸۹۹ء) کے بعد تک حیات تھے۔ ہندوستان کے متعدد نامور خطاط، مثلاً: محبوب رقم منشی جی کے شاگرد تھے۔ (تاریخ دار العلوم دیوبند، سید محبوب رضوی، رسالہ الرشید، ساہی وال، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء: ص ۵۱-۴۷)۔ نیز سوانح قاسمی، گیلانی، حاشیہ: ج ۱ ص ۴۱۷، ۵۳۲، ۵۳۴۔ نیز مضمون ''خطاطان قرآنی'' از جناب سید شاہ نفیس الحسینی نفیس رقم مدظلہ، سیارہ اردو ڈائجسٹ، لاہور، قرآن نمبر ج ۲، ص ۸۱۶) (نور)

(۱) سالانہ کیفیتوں یعنی مدرسۂ اسلامیہ عربیہ (دار العلوم) دیوبند کے آمد وخرچ، تعلیم نیز طلبا کے امتحانات اور ان کے نتیجوں کا گوشوارہ اور تفصیل، جو ہر سال کے ختم پر پابندی سے چھپتی تھی، اور تقریباً ۱۴۰۰ھ/(۱۹۸۰ء) تک اسی طرح چھپتی رہی۔ (نور)

دوسرا حج اور واپسی کے بعد دہلی میں قیام:

۱۲۸۵ھ[1] میں مولانا کو حج کی پھر سوجھی تھی۔ چند رفقا کو ساتھ لے کر حج کر آئے، اور منشی ممتاز علی صاحبؒ بھی اسی سال بہ قصد قیام عرب کو گئے؛ مگر ایک سال بعد واپس آ گئے، پھر مولوی صاحبؒ دہلی گئے، منشی جی کا چھاپہ خانہ دہلی میں ہوا، منشی جی کے پیچھے میرٹھ میں مولوی محمد ہاشم صاحب کے مطبع میں کام کیا، اس زمانے میں پڑھانا اکثر تھا، سب کتابیں بے تکلف پڑھاتے تھے، اور اس طرح کے مضامین بیان فرماتے تھے کہ نہ کسی نے سنے، نہ سمجھے، اور عجائب غرائب تحقیقات ہر فن میں بیان فرماتے، جس سے تطبیق اختلاف اور تحقیق ہر مسئلے کی بیخ و بن تلک ہو جاتی تھی۔ آج ان کے فیض تعلیم کا اثر موجود ہے۔ ہر چند ذرّہ آفتاب کا کیا نمونہ؛ مگر پھر اسی جمال کا آئینہ ہے، اور وہی اس کے حوصلہ (کے) موجب اس میں جلوہ گر ہے، جو چاہیں دیکھ لیں، اور ان کی تحریرات وتقریرات کو سن لیں۔

حضرت مولانا کی تصانیف کا ذخیرہ اور شاگرد:

مولوی صاحب نے اس عرصے میں چند تحریرات کے بعضے جواب کسی سوال کے، بعض فرمائش کسی دوست کی، بعض اتفاقیہ، اگرچہ مجموعہ ان کا کثیر[2] ہے؛ مگر ایسے پریشان ہیں کہ اجتماع ان کا مشکل ہے۔ زیادہ تر فیض رسانی کی طرف اسی زمانے میں توجہ ہوئی۔ مولوی صاحبؒ سے پڑھنا نہایت ہی دشوار تھا، جو شخص طباع ہو، اور پہلے سے اصل کتاب سمجھا ہوا ہو، تب تو مولوی صاحبؒ کی بات سمجھ سکتا تھا۔ ہر چند مولوی صاحبؒ نہایت ہندی کی چندی کر کر بیان فرماتے؛ مگر پھر مشکل بات مشکل ہی ہوتی ہے۔

---

(۱) مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے لکھا ہے: ”۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) میں مولانا کو حج کی پھر سوجھی“ تعجب ہے کہ مطبع قاسمی کی اشاعت (۱۳۳۳ھ) میں بھی اس کی تصحیح نہیں کی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس اطلاع میں سہو ہوا، غالباً سہو کتابت ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ کا دوسرا سفر حج ۱۲۸۶ھ/ (جنوری ۱۸۷۰ء) میں ہوا تھا۔ اس کا حضرت مولانا نے ”آبِ حیات“ کی تمہید میں (خلاف معمول مگر ضمناً) ذکر فرمایا ہے۔ سفر حج کا (غالباً) پہلے سے خیال نہیں تھا، رمضان المبارک میں اچانک ارادہ ہو گیا۔ ۸/شوال ۱۲۸۶ھ (۲۲/جنوری ۱۸۶۹ء) کو نانوتہ سے روانگی ہوئی، بمبئی میں تقریباً بیس دن جہاز کے انتظار میں ٹھہرے رہے، اسی قیام کے دوران آخری دنوں (اواخر شوال میں) ”آب حیات“ کا اکثر حصہ لکھا گیا۔ ۲۳/ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ (۲۶/مارچ ۱۸۷۰ء) کو مکۂ مکرمہ میں جب حضرت مولانا کے مدینۂ منورہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) کے لیے حاضری کے سفر میں صرف دو دن باقی تھے، اس کا مسودہ مکمل ہوا۔ ملاحظہ ہو: آب حیات: ص ۳ اور ۶، طبع اوّل، مطبع مجتبائی میرٹھ، ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء)، نیز سوانح قاسمی از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ ج ۳ ص ۴ اور ۴، دیوبند، طبع اول، بلا سنہ۔ (نور)

(۲) حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی باقاعدہ تصانیف تو تین سے زائد نہیں؛ لیکن حضرت مولانا کے افادات، تقریریں، مکتوبات اور افادات ان میں سے ہر ایک مستقل تالیف؛ بلکہ تالیفات ومصنفات سے بڑھ بڑھ کر ہے۔ (ان سب کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، اگر جمع ہو، اور مرتب کر کے شائع کیا جائے، تو غالباً دس بارہ جلدیں ہوں گی)، اور ان میں عموماً وہ مباحث اور علوم و نکات ہیں، جو اور کتابوں میں کم یاب؛ بلکہ معدوم ہیں؛ اس لیے ان مصنفات وافادات کی خاص علمی اہمیت ہے؛ مگر اس غفلت کو کیا کہیے کہ حضرت کے افادات و مؤلفات ومتعلقات کا کوئی جامع اشاریہ بھی آج تک مرتب نہیں کیا گیا۔ راقم سطور نے ایک ناتمام سا اشاریہ مرتب کیا ہے، جو شائع کیا جا رہا ہے۔ (”قاسم العلوم والخیرات“ صحیفۂ نور کے نمبر میں شامل ہے)۔ (نور)

دہلی میں جگہ جگہ پادریوں کے جلسےاور مولانا کااپنے شاگردوں کے ساتھ ان سے بحث ومناظرہ:

اسی زمانے کے درمیان میں دہلی میں پادریوں کے وعظ کا چرچا تھا، اور مسلمانوں میں سے بعضے بے چارے اپنی ہمت سے ان سے مقابلہ کرتے تھے۔ کوئی اہل علم جن کا یہ کام تھا، اس طرف توجہ نہ کرتا تھا۔ مولوی صاحبؒ نے اپنے شاگردوں کوفرمایا کہ: تم بھی کھڑے ہوکر بازار میں کچھ بیان کیا کرو، اور جہاں وہ لوگ بہ مقابلہ نصاریٰ بیان کرتے ہیں، ان کی امداد کیا کرو۔ آخر مباحثے کی ٹھہری اور مولوی صاحبؒ بے کسی (کی) صورت وشکل بنائے اور اپنا نام چھپا جاموجود ہوئے۔ پادری تاراچند نام تھا، اس سے گفتگو ہوئی، آخر وہ بند ہوا، اور گفتگو سے بھاگا۔ اسی زمانے سے مولوی منصور علی صاحب دہلویؒ سے، جوفن مناظرہ اہل کتاب میں یکتا ہیں؛ ملاقات ہوئی۔ مولوی منصور علی صاحب بائبل کے گویا حافظ ہیں، اور ان کا طرز مناظرہ بھی جداگانہ ہے، اب ان ہی کے شاگرد بہ مقابلہ پادریوں کے دہلی میں وعظ کہا کرتے ہیں۔

میلۂ خداشناسی چاندا پور میں شرکت اور تقریر دل پذیر:

اتفاقات تقدیر سے ۱۲۹۳ھ میں چاندپور[۱] ضلع شاہ جہاں پور میں کوئی تعلقہ دار ہے، پیارے لال، اصل ہندو کبیر پنتھی[۲] ہے، اس کوشاید میل نصرانیت کی طرف ہوا، اس نے ہندو پنڈت اور پادریٔ نصاریٰ اور عالم مسلمانوں کوجمع کرنا چاہا کہ باہم ایک گفتگو ہو، اور تحقیق مذہبی کا ایک میلہ قائم کیا، اور ''میلہ خداشناسی''[۳] اس کا نام رکھا۔ بریلی اور وہاں کے اطراف کے لوگوں نے مولوی صاحبؒ کو اطلاع کی،

---

(۱) مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور متعدد اصحاب نے یہ نام ''چاند پور'' لکھا ہے۔ حضرت مولانا کی بعض کتابوں میں بھی چاند پور چھپا ہوا ہے، جوصحیح نہیں ،صحیح ''چانداپور'' ہے (CHANDA, PUR)، جوضلع شاہ جہاں پور میں ہے۔ (نور)

(۲) کبیر پنتھی- ہندوؤں کا وہ فرقہ جورسومات اور طور طریقوں میں کبیر (پیدائش ۱۴۶۸ء/موت ۱۵۱۸ء) مدفن مگہر، ضلع بستی کو اپنا گرو مانتا ہے۔ کبیر اور اس کے ماننے والوں کا مرزا قتیل نے ''ہفت تماشا''، اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد عمر، ص:۵۹، ۶۲/دہلی، ۱۹۶۸ء/ میں ذکر کیا ہے۔ سوامی دیانند سرسوتی نے بھی کبیر پر تبصرہ کیا ہے: (ستیارتھ پرکاش اردو ترجمہ: ص۴۴-۳۴۳/ چودھواں ایڈیشن، آریہ پرتی ندھی سبھا، پنجاب ۱۹۶۱ء۔ نیز دیکھیے سہ روزہ دعوت نئی دہلی کا ہندوستان مذاہب نمبر، مضمون: ہندومت اور ان کے فرقے، از: محمد احمد صاحب: ص۱۵۲، دہلی، ۱۹۹۳ء)

(۳) میلہ خداشناسی یا جلسۂ تحقیق مذاہب کا سلسلہ غالباً عیسائی مشنری کے منصوبوں کا ایک حصہ تھا۔ وقفے وقفے سے اس قسم کے کئی جلسے علاحدہ علاحدہ مقامات پر منعقد کیے گئے تھے؛ مگر یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم وفضل رہا کہ تمام جلسوں میں علمائے اسلام سر بلند وممتاز رہے، (فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَھُمُ الْجَزَاءُ)۔

یہ جلسہ ضلع شاہ جہاں پور کے گاؤں، سربانگ پور میں جو چانداپور کے قریب ہے، دریا کے کنارے منشی پیارے لال اور پادری نولس کے مشورے اور اشتراک سے ہوا۔ پہلا جلسہ ۷/مئی ۱۸۷۶ء/ (۱۲/ربیع الثانی ۱۲۹۳ھ) سے شروع ہوا۔ اس جلسہ میں شرکت کے لیے حضرت مولانا کے رفقا: مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (شیخ الہند)، مولانا حکیم رحیم اللہ بجنویؒ، دیوبند اور بجنور سے اور امام فن مناظرہ، مولانا سید ابوالمنصورؒ اور مولانا سید احمد علیؒ وغیرہ دہلی سے روانہ ہوکر سہارن پور آئے۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ اور حضرت کے خادم سب ساتھ تھے۔ ۶/مئی کی صبح شاہ جہاں پور پہنچے تھے۔ سفر کی کچھ تفصیل ''گفتگوئے مذہبی'' یا ''واقعۂ میلہ خداشناسی'' کے شروع میں درج ہے (مطبع ضیائی، میرٹھ، ۱۲۹۳ھ)۔ (نور)

مولوی صاحبؒ نے سامان سفر درست کیا اور روانہ ہوئے۔ اور دہلی سے مولوی منصور علی صاحب کو بلوایا، اور یہاں سے بعضے اور لوگ ساتھ روانہ ہوئے۔ شاہ جہاں پور پہنچے، اور وہاں سے اس گاؤں میں پہنچے۔ اوّل گفتگو کے باب میں اور اس کے وقت مقرر کرنے میں ایک بحث رہی، پھر آخر گفتگو ہوئی۔ طرز گفتگو (کا) نہ تھا؛ بلکہ ہر شخص اپنی باری پر کچھ بیان کرتا تھا۔ ہر چند وقت متعین تھا؛ مگر مولوی صاحبؒ نے ابطالِ تثلیث وشرک اور اثباتِ توحید ایسا بیان کیا کہ حاضرین جلسہ مخالف وموافق مان گئے[(۱)]۔ کیفیت اس جلسے کی چھپی ہوئی ہے، جو کوئی چاہے دیکھے، مولانا کی تقریر اس میں مندرج ہے۔ آخر میں حسب عادت پادریوں نے بحث تقدیر پیش کی۔ پادری جب عاجز آتے ہیں، یہی مسئلہ پیش کیا کرتے ہیں۔ مولانا نے اس مشکل مسئلے کو ایسا بیان فرمایا کہ عام وخاص کو بہ خوبی سمجھ میں آ گیا۔

چاندا پور شاہ جہاں پور کا دوسرا سفر اور مباحثہ:

اگلے سال یعنی ۱۲۹۴ھ/ میں پھر اس جلسے کی خبر ہوئی[(۲)]، پھر مولانا تشریف لے گئے۔ اس سال میں مجمع ہنود میں ایک بہت بڑے پنڈت دیانند سرسوتی نام آئے تھے[(۳)]۔ ہر چند نو ایجاد مذہب ان کا توحید اور

---

(۱) حضرت مولانا کی یہ تقریر غیر معمولی تھی، اور ہر جگہ کچھ ایسے اصحاب ضرور موجود ہوتے ہیں، جو جلسے میں تقریروں کے وزن کو جانچ سکتے ہیں، اور ان کے متعلق دیانت دارانہ صاف رائے دے سکتے ہیں۔ میلہ خدا شناسی میں حضرت مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے، اس کی سب انصاف پسند شرکا نے تحسین کی۔ ''گفتگوئے مذہبی'' کے آخر میں کئی ہندو پنڈتوں کے کلمات تحسین درج ہیں۔ ملاحظہ ہو: ص: ۴۲،۳۸۔ (نور)

(۲) ۱۲۹۲ھ/ (مئی ۱۸۷۶ء) کے جلسے میں حضرت مولانا کی تقریر کا اس قدر چرچا اور سامعین کو اس قدر متاثر کیا کہ اس قسم کا ایک اور جلسہ کرنے کا مشورہ اور اصرار ہوا۔ دوسرے جلسے کے لیے ۱۹، ۲۰/ مارچ ۱۸۷۷ء/ (۳، ۴/ ربیع الاوّل ۱۲۹۴ھ) تاریخیں مقرر ہوئیں۔ اس سال پادریوں کے ہندوؤں کے مذہبی رہنماؤں، بڑے پنڈتوں کو بھی آنے کی دعوت دی گئی۔ سب پہنچے اور حسب پروگرام ۱۹/ مارچ ۱۸۷۷ء/ (۳/ ربیع الاوّل ۱۲۹۴ھ) کی صبح جلسہ گاہ میں آ گئے۔ نام ور علما میں حضرت مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا عبدالمجید صاحبان، پادریوں میں پادری نولس اور پادری واکر صاحبان اور ہندو رہنماؤں میں سے پنڈت دیانند سرسوتی اور منشی اندرمن اپنے اپنے مذہب کے نمائندے اور مناظر طے کیے گئے۔ اس جلسے میں بھی خاصی ہوشیاری برتی گئی تھی؛ مگر یہاں بھی فضل الٰہی کا خاص ظہور رہا، اور حضرت مولانا کی تقریر اور جوابات سب مذاہب کے لوگوں میں اوّل رہے۔ اس مناظرہ میں حضرت مولانا کی تقریر اور مباحثے کی روداد ''مباحثۂ شاہ جہاں پور'' کے نام سے بار بار چھپی ہے۔ (نور)

(۳) سوامی دیانند سرسوتی ہندوستان کے مشہور ہندو مذہبی مفکر، ستیارتھ پرکاش، رگویداڈی بھاشیہ بھومکا کے مصنف اور ہندوؤں میں ایک طاقت ور، پرجوش تحریک ''آریہ سماج'' کے بانی۔ سوامی دیانند کے کئی مسلمان علما سے مباحثے اور مناظرے ہوئے، جس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی شامل ہیں۔

مول شنکر پسر امباشنکر موردی نزد احمد آباد، گجرات وطن تھا، بعد میں سوامی دیانند کے نام سے شہرت ہوئی۔ ۱۸۲۴ء/ (۱۲۳۹ھ) میں پیدا ہوئے۔ ایک واقعے کی وجہ سے مورتی پوجا سے نفرت ہوئی۔ ایک پنڈت (سوامی ڈرجانند) سے وید وغیرہ پڑھی ہے، ہندو مذہب کی تبلیغ کے لیے پورے ملک کا سفر کیا۔ ۱۸۷۴ء (۹۱-۱۲۹۰ھ) میں آریہ سماج قائم کی اور باقی زندگی اس کو ترقی دینے میں گزار دی۔ ۳۰/ اکتوبر ۱۸۸۳ء (ذی الحجہ ۱۳۰۰ھ) کو دنیا سے گزر گئے۔ (بقیہ اگلے صفحے پر):

انکارِ بت پرستی میں اور عام ہنود کی نسبت جدا گانہ ہے[1]؛ مگر وید کے ایمان اور بعضے اور مسائل، جیسے آواگون وغیرہ میں برابر ہیں۔ تقریر اس شخص کی اکثر الفاظ سنسکرت کے ساتھ ملی ہوئی تھی؛ اس لیے دشواری ہوئی؛ مگر مولوی محمد علی صاحب جو بہ مقابلہ مذہب ہنود مشہور ہیں، انہوں نے کچھ اس کا جواب کہا، پھر مولانا نے بحث وجود اور توحید کا ذکر کیا، اور ایسا بیان کیا کہ حاضرین کو سوائے سکوت اس کے استماع کے اور کام نہ تھا۔ پھر کچھ گفتگو تحریف کی ہوئی، یہ بھی بحمد اللہ تعالیٰ! الزام تحریف کا ان کے اقرار سے ثابت ہوا؛ حتیٰ کہ پادری لوگ عین جلسے میں سے ایسے بے سروپا بھاگے کہ ٹھکانا نہ معلوم ہوا۔ اپنی بعض کتابیں بھی بھول گئے[2]۔

اس جلسے سے جناب کامیاب واپس آئے، اور نصرتِ دین اسلام کہ تا بہ قیامت منصور رہے گا، ان کی ذات سے پوری ظاہر ہوئی، اور ان دو سال کے جلسوں میں عام مخلوق نے جان لیا کہ یہ شخص کس پائے کا ہے، اور فضل الٰہی کی کیا صورت ہوا کرتی ہے: ''جز بہ تائید آسمانی نیست'' کا نقشہ ظاہر ہو گیا؛ حتیٰ کہ پادری بھی بول اٹھے کہ: ''اگر تقریر پر ایمان لایا جاتا، تو یہ تقریر خوش خوش، ایسی لطیف اور دل میں اثر کرنے والی ہے کہ اس پر ایمان لائیے''[3]؛ مگر ایمان جس کے نصیب میں ہے، وہی اس سے مشرف ہوتا ہے؛ ورنہ حق واضح ہے۔

(پچھلے صفحے کا بقیہ): تفصیلات کے لیے: مکمل جیون چرتر سوامی دیانند، مرتبہ لکشمن، مطبوعہ: یونین اسٹیم پریس، لاہور (جو پنڈت لیکھ رام، آریہ مسافر کے مسودات سے مرتب کی گئی) پہلی اشاعت پیش نظر ہے، بلا سنہ۔
یہاں یہ وضاحت کردینے میں کوئی ہرج نہیں کہ ستیارتھ کا چودھواں باب جو اسلام پر اعتراضات پر مشتمل ہے، سوامی دیانند کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ یہ باب سوامی دیانند کی موت کے بعد ستیارتھ پرکاش میں اضافہ کیا گیا۔ سوامی دیانند کی زندگی میں ستیارتھ پرکاش صرف ایک مرتبہ ۱۸۷۵ء میں سنسکرت میں چھپی تھی، (یہ نسخہ بھی محفوظ ہے، اور راقم سطور نے دیکھا ہے)۔ موجودہ نسخوں میں جو ترمیمات واضافات ہوئے ہیں، ان کی لالہ لاج پت رائے نے مدلل نشان دہی کی ہے، اور اس پر ناپسندیدگی بھی ظاہر کی ہے۔ دیکھیے: مہارشی سوامی دیانند اور نا کام کام، لالہ لاج پت رائے، حصہ دوم، باب سوامی دیانند کی تصنیفات از ص ۴۹۶ تا آخر، طبع اوّل، لاہور، ۱۸۹۸ء۔ (نور)

(۱) سوامی دیانند سرسوتی اور آریہ سماج اصولاً بت پرستی میں یقین نہیں رکھتے؛ مگر خود پنڈت دیانند سرسوتی نے ستیارتھ پرکاش میں تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ ہندو مذہب کے اصولوں اور آواگون وغیرہ کو مانتے تھے۔ (جیسا کہ مولانا محمد یعقوبؒ نے ذکر کیا ہے۔) نیز دیکھیے، سوامی دیانند کا جیون چرتر...... وغیرہ۔

(۲) مباحثہ شاہ جہاں پور کے مرتب نے بھی یہی لکھا ہے۔ تحریر ہے: ''مولوی صاحب اور موتی میاں صاحب اور نیز اہل اسلام نے ہر چند اصرار کیا کہ زیادہ نہیں، دو چار منٹ جو چار بجنے میں باقی ہیں، انہیں میں ہم کچھ کہہ لیں گے؛ مگر پادری صاحبوں نے ایک نہ سنی۔ اہل اسلام کا غلبہ یوں تو تقریرات گزشتہ سے ثابت ہی تھا، پر یہ انکار واصرار ان کے غلبے اور عیسائیوں کی شکست کے لیے ایسا ہو گیا۔ جیسا غنیم کا میدان سے بھاگ جانا ہوا کرتا ہے۔ پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ اس سراسیمگی اور پریشانی میں جو رنج پنہائی کے باعث پادریوں کو لاحق تھی، پادری لوگ اپنی بعض کتابیں بھی وہیں چھوڑ گئے، ان کو اٹھانے کی بھی ہوش نہ رہی''۔ (مباحثہ شاہ جہان پور: ص ۸۶، مطبع قاسمی دیوبند، ۱۳۴۳ھ)

(۳) مولوی عبدالوہاب صاحب بریلوی نے خود حضرت مولانا محمد قاسمؒ سے کہا کہ ایک پادری سے میری ملاقات ہے۔ غالباً یہ وہی پادری فرینک (ہے جو) مولانا (محمد قاسم) سے مباحثہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ مولانا کی تقریر کے بعد کہتا تھا: ''یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ حق کہتے تھے، پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے''۔ (میلہ خدا شناسی: ص ۴۱، مطبع ضیائی میرٹھ، ۱۲۹۳ھ۔ (نور)

کیفیت اس میلے کی وہاں سے آ کر مرتب ہوگئی تھی؛ مگر اتفاق طبع کا نہ ہوسکا۔ اب کہ مرض اور وقت آخر تھا، طبع اس کا شروع ہوا۔ اب امید ہے کہ ختم ہو کر مشتہر ہو، اور سب صاحب اس سے مستفید ہوں[۱]۔ اس وقت میں سنا تھا کہ غالباً حاجت کسی تحریر کی پیش کرنے کی بھی ہوگی، اس پر مولوی صاحبؒ نے وہیں بیٹھ کر کچھ تحریر کیا تھا، اور اس کا نام ''حجۃ الاسلام'' رکھا ہے، وہ کتاب طبع ہوئی ہے[۲]۔

آخری سفرِ حج:

پھر اسی سال ارادہ جناب مولانا رشید احمد صاحب کا حج کو جانے کا تھا[۳]، احقر بھی تیار ہوا، اور چلتے میں مولانا کو بھی ساتھ لے ہی لیا، اور مولوی صاحبؒ کے ساتھ اور کچھ کتنے ہی معتقد وخادم آپ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ شوال ۱۲۹۴ھ/ میں روانہ ہوئے، اور ربیع الاوّل ۱۲۹۵ھ/[۴] کے اول میں پھر اپنے وطن واپس آئے۔

---

(۱) اس روداد کا نام ''مباحثہ شاہ جہاں پور'' ہے، جو مولانا فخر الحسنؒ نے مرتب کی تھی؛ مگر یہاں وضاحت؛ بلکہ انکشاف ضروری ہے کہ اس کی اصل تقریر خود حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے لکھی تھی، وہی اس مجموعے میں شامل ہے۔
''مباحثہ شاہ جہاں پور'' مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبند کی تصحیح اور اہتمام سے مطبع احمدی (دہلی) میں مولانا احمد حسن خاںؒ کی نگرانی میں پہلی بار چھپی تھی۔ یہ نسخہ ۱۲۹۹ھ/ میں چھپنا شروع ہوا تھا، اور ۲۶/ربیع الاوّل ۱۳۰۰ھ/ (۵/فروری ۱۸۸۳ء) کو اس کی ترتیب اور (غالباً ساتھ ہی) طباعت بھی مکمل ہوئی۔ (نور)
(۲) ''حجۃ الاسلام'' پہلی مرتبہ مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ کی حسن توجہ سے مطبع فاروقی دہلی سے چھپی۔ اس نسخے پر سن طباعت درج نہیں؛ مگر یہ نسخہ ناقص ونا تمام تھا۔ ''حجۃ الاسلام'' کے آخری صفحات کا کچھ حصہ بعد میں ملا، اس کو مولوی عبد الاحد نے اپنے مطبع مجتبائی دہلی سے اگست ۱۸۹۵ء/ (صفر ۱۳۱۳ھ) میں ''تتمہ حجۃ الاسلام'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ ضمیمہ صرف بارہ صفحات پر مشتمل ہے؛ مگر یہ بھی نا تمام ہے۔ مولوی عبد الاحد نے لکھا ہے: ''افسوس ایک حصہ تقریر کا اب بھی باقی رہ گیا اور ہاتھ نہ لگا، ناچار جہاں تک فقرہ ختم ہوتا تھا، ختم کر دیا گیا، ناظرین معاف فرمائیں''۔ ص ۱۲، تتمہ
یہی عبارت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ کی چھاپی ہوئی ''حجۃ الاسلام'' کے آخر میں بھی درج ہے۔ (مطبع بلالی، ساڈھورہ، بلا سنہ)
راقم سطور کی معلومات میں ''حجۃ الاسلام'' کا سب سے عمدہ نسخہ وہ ہے، جو شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے اضافے کیے ہوئے عنوانات (اور تصحیح کے بعد) پہلی مرتبہ مطبع احمد علی گڑھ سے ۱۳۰۰ھ/ میں چھپا تھا۔ یہی نسخہ دوبارہ مطبع قاسمی دیوبند سے مولانا قاری محمد طیبؒ اور قاری محمد طاہرؒ کے اہتمام سے ۱۳۴۶ھ/ میں شائع ہوا، بعد میں اور اداروں نے بھی شائع کیا۔ (نور)
(۳) یہ سفر حضرت مولانا گنگوہیؒ، حضرت مولانا نانوتویؒ اور ان کے رفقا بلکہ معاونین کا بہت اہم؛ بلکہ غیر معمولی سفر تھا، جو اس وقت روس اور خلافت عثمانیہ ترکی میں جاری جنگ کی وجہ سے خلافت عثمانیہ کی حمایت؛ بلکہ عملی جدوجہد (جہاد) میں شرکت کے خیال سے ہوا تھا؛ مگر مکۂ معظّمہ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پلونا (PLONA) پر روس کا قبضہ ہوگیا، اس خبر سے سب کو سخت صدمہ ہوا، اور وہ ارادہ مجبوراً؛ مگر افسوس کے ساتھ ختم ہوگیا۔ (نور)
(۴) اس سفر کا آغاز جیسا کہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے لکھا ہے، ۱۰/شوال ۱۲۹۴ھ (پنج شنبہ ۱۸/اکتوبر ۱۸۷۷ء) کو وطن سے روانگی کے ساتھ ہوا۔ یہ بڑا قافلہ تھا، جس کی سرپرستی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرما رہے تھے۔ ممتاز شرکا میں مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا محمد یعقوبؒ کے علاوہ مولانا محمد مظہرؒ، مولانا رفیع الدینؒ، مولانا سخاوت علی انبیہٹویؒ، مولانا محمد اسماعیلؒ (غالباً کاندھلوی جھنجھانوی) سوانح قاسمی: ج ۳، ص ۳۲)، یا گنگوہی؟ بھی شریک تھے۔ اٹاوہ ہوتے ہوئے بمبئی پہنچے، بمبئی سے یکم ذی قعدہ (۷/نومبر) کو جہاز سے روانہ ہو کر ۱۴/ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ (۲۱/نومبر ۱۸۷۷ء) کو جدہ کے ساحل پر اترے۔ مکتوب مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ بہ نام منشی محمد قاسم نیاں گریؒ (نیاں گر جس کو اب بیادر کہتے ہیں)۔ مکتوب ۲۸ محررہ ۹/شوال، بیاض یعقوبی: ص ۷، نیز بیاض یعقوبی: ص ۱۵۱-۱۵۰۔ (بقیہ اگلے صفحے پر):

اس سفر میں تمام قافلہ علما کا تھا۔ اٹھارہ بیس مولوی فاضل ساتھ تھے، اور عجب لطف کا مجمع تھا۔ حضرتؒ کی زیارت سے اور ان متبرک مکانوں کی زیارت سے مشرف ہو کر جب واپس ہوئے، جدہ پہنچ کر مولانا کو بخار ہو گیا۔ یہ خیال ہوا کہ جدائی ایسے بزرگ اور بزرگ مقاموں کے اور پیادہ زیادہ چلے اور کچھ پہلے حج سے بھی طبیعت ناساز تھی (یہ بیماری اس کا اثر ہے)۔

سفر حج سے واپسی میں جہاز کی مشقت اور بیماری کی ابتدا:

جدہ پہنچتے ہی جہاز پر سوار ہو گئے، اس جہاز کا لنگر اٹھنے والا تھا، اور جہاز کی خبر عشرہ؛ بلکہ در ہفتہ تلک گمان تھا؛ اس لیے یہ خیال کیا کہ پندرہ روز میں بمبئی جا پہنچیں گے، اور اتنی تکلیف اٹھالیں گے۔ واقعی اس جہاز میں اتنی ہی تکلیف ہوئی، جتنی جاتے بار کے جہاز میں آسائش وراحت پائی تھی۔ دو روز جہاز پر چڑھے ہوئے تھے کہ مولانا کو دورۂ صفرا معمولی ہوا اور بخار بھی۔ وہاں نہ جگہ راحت کی، نہ دوا، نہ کچھ تدبیر، مرض کی شدت ہوئی۔ ایک دن یہ نوبت ہوئی کہ ہم سب مایوس ہو گئے[1]، اور جہاز میں وبا تھی، ہر روز ایک دو آدمی انتقال کرتے تھے۔

عدن میں قرنطینہ اور مکلی میں قیام اور صحت کی بگڑتی کیفیت:

عدن پہنچے، وہاں قرنطینہ[2] ہو گیا، یعنی بہ سبب مرض نہ جہاز کے آدمی کنارہ پر اتر سکے، اور نہ شہر کے

(پچھلے صفحے کا بقیہ): جدہ سے اونٹوں کے ذریعہ سے دو دن میں مکۂ مکرمہ پہنچے۔ اونٹ پر مولانا محمد منیر نانوتویؒ حضرت مولانا کے ردیف ورفیق تھے۔ مکۂ معظّمہ سے غالباً ۲۵ر ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ (۳۱ر دسمبر ۱۸۷۷ء) کو مدینہ پاک حاضری کے لیے رخصت ہوئے، پچیس دن مدینۂ طیبہ میں حاضر رہے۔ مدینہ پاک سے مکۂ معظّمہ واپس آئے اور چند دنوں کے بعد ہندوستان کے لیے روانہ ہو گئے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے تذکرۃ الرشید: ج ا ص: ۲۲۹ر تا: ۲۴۱، طبع اوّل، ۱۹۲۶ء ر میں اس سفر کا مفصل ذکر کیا ہے۔ (نور)

(۱) حضرت مولانا کی جہاز میں سخت بیماری اور مایوسی کی حالت کا مولانا محمد یعقوبؒ نے اپنے ایک خط میں بھی ذکر کیا ہے، جو اس سفر سے واپسی کے پچیس دن بعد محمد قاسم نیاں گری کو لکھا تھا۔ تحریر ہے:

''اثنائے راہ میں جہاز میں طبیعت جناب مولانا محمد قاسم صاحب مدظلہ کی بہت بیمار ہو گئی تھی، ایسا کہ ایک روز نوبت یاس پہنچ گئی تھی، مگر فضل الٰہی نے دستگیری فرمائی اور مرض رفع ہوا، مگر ضعف ایسا ہو گیا ہے کہ اب تلک طاقت نے بہ حالت اصلی عود نہیں کیا، اب بھی ادنا تکان سے حرارت ہو جاتی ہے''۔ (مکتوب نمبر ۴۶ر بیاض یعقوبی: ص ۹۶)

(۵۵) قرنطینہ وہ جگہ یا مرکز جہاں کسی وبا اور عام مرض کے اثرات دور کرنے کا انتظار کیا جاتا ہو۔ پچھلے زمانے میں وبائی بیماریوں کی کثرت تھی؛ اس لیے ہندوستان سے جو لوگ حج کو جاتے تھے، یا دوسرے ملکوں کا سفر کرتے تھے، ان کے لیے مختلف بندرگاہوں اور دریائی راستوں پر عارضی قیام گاہیں اور اسپتال بنے ہوئے ہوتے تھے، وہاں پر ایک جہاز یا کشتی کے تمام مسافروں اور ان کے سامان کو اتار کر بھپارہ دیا جاتا تھا۔ وبا یا بیماری کے متوقع جراثیم دور کیے جاتے، اور وہاں تین دن سے بیس پچیس دن تک ٹھہرنے اور اطمینان کے بعد اگلے سفر کے لیے اجازت اور سامان ملتا تھا۔ (نور)

(۲) اس موقع پر اپنی بیماری اور سخت کھانسی کا خود حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے بھی سوامی دیانند سرسوتی کے نام ایک خط میں ان الفاظ میں ذکر و اظہار فرمایا ہے: ''کم ترین ہیچ مدان محمد قاسم ایک عرصے سے کھانسی میں مبتلا تھا، کھانسی کی یہ شدت تھی کہ بعض اوقات بات کرنی دشوار تھی''۔ مکتوب محررہ: ۱۰ر اگست ۱۸۷۸ء (۱۰ر شعبان ۱۲۹۵ھ) (رڑکی مشمولہ جیون چرتر سوامی دیانند سرسوتی: ص: ۵۲۱، طبع اول لاہور، غالباً ۱۸۹۸ء)۔ (بقیہ اگلے صفحے پر):

آدمی جہاز پر آسکے۔ بعد پھر مکلہ میں قدرے قیام کیا، وہاں سے البتہ نیبو بکنے آئے وہ لیے۔ تربوز اور گلاب اور بعض ادویہ جہاز میں مل گئی تھی۔ جہاز کے ڈاکٹر نے کونین دی اور مرغ کا شوربا غذا کو کہا، وہاں مرغ کہاں میسر ہوتا؟ آخر مرغ بھی اپنے پاس سے دیا۔ مولانا کو دورے میں غذا سے نفرت مطلق ہوجاتی تھی۔ اب کچھ رغبت شروع ہوئی۔ بمبئی ایسے پہنچے کہ بیٹھنے کی طاقت دشواری سے تھی۔ دو تین روز ٹھہر کر وطن کو روانہ ہوئے۔ ہر چند موسم سرما تھا؛ مگر جبل پور کے میدانوں میں دو پہر کو لو چلنے لگی، اور مولانا کی طبیعت بگڑی، خیر الحمد اللہ! اس وقت نارنگی، نیبو یہ چیزیں پاس (تھیں)، کھلایا، پانی پلایا، وطن پہنچنے کے بعد مرض رفع ہوا، گو نہ طاقت آئی؛ مگر کھانسی ٹھہر گئی (۵۲)، اور کبھی کبھی دورہ سانس ہوتا، زیادہ دیر تلک کچھ فرمانا مشکل ہوگیا، پھر اس میں بھی کسی قدر تخفیف ہوئی۔

پنڈت دیانند سرسوتی کے اعتراضات کے جوابات اور مناظرہ کے لیے رڑکی کا سفر:

اسی سال شعبان میں رڑکی سے خبر ملی کہ پنڈت دیانند تشریف لائے ہوئے ہیں، اور مسلمانوں کے مذہب پر اعتراض مشتہر کیے ہیں (۱)۔ اہل روڑکی مولانا کو بہ جبر ہوئے کہ آپ تشریف لائیں، مولانا باوجود ضعف اور مرض تشریف لے گئے، اور بہت سے خادم ساتھ ہوئے (۲)، اور اطراف و جوانب سے بہت سی

(پچھلے صفحے کا بقیہ): اور مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ نے بھی ''انتصار الاسلام'' کی تمہید میں اس کی وضاحت کی ہے: ''کہ پنڈت جی نے سمجھا کہ اب تو معتقدین میں اپنی ہوا بندھ گئی ہے، کوئی شرط لگاؤ کہ گفتگو کی نوبت نہ آئے، اور چوں کہ مولانا مرحوم بیمار ہیں؛ اس لیے نہ وہ آئیں گے، نہ گفتگو ہوگی، نہ اپنی ہوا بگڑے گی۔ الغرض چوں کہ جناب مولانا کو بخار آتا تھا اور خشک کھانسی کی یہ شدت تھی کہ بات بھی پوری کرنی مشکل ہوتی تھی، اور ضعف کی وہ نوبت تھی کہ پچاس سو قدم چلنے سے سانس اکھڑ جاتی تھی، اور یہ مرض وضعف بقیہ اس مرض سخت کا تھا، جو اسی سال میں مکۂ معظّمہ سے آتے وقت جہاز میں پیش آیا تھا''۔ (انتصار الاسلام: ص:۳، مطبع اکمل المطابع دہلی، ۱۲۹۸ھ)۔

(۱) سوامی دیانند سرسوتی ۲۹/ جولائی ۱۸۷۸ء (۲۸/ رجب ۱۲۹۵ھ) کو رڑکی پہنچے تھے، اور اسی دن سے اپنی تقریروں (ویاکھیان) کا کام شروع کردیا تھا۔ چوتھے دن کی تقریر میں سوامی کے سوانح نگار کے بہ قول ''قوی سے قوی اعتراض جو مذہب اسلام پر ہوسکتے ہیں کیے''۔ (جیون چرتر سوامی دیانند: ص۵۱۵)۔ (نور)

(۲) حضرت مولانا نے حالات کا جائزہ لینے اور معلومات کے لیے مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، مولانا محمود حسنؒ (شیخ الہند) مولانا عبد العدل پھلتیؒ کو پہلے بھیج دیا تھا، بعد میں جب حضرت مولانا رڑکی رونق افروز ہوئے، تو حاجی عابد حسین دیوبندیؒ اور حکیم مشتاق احمد دیوبندیؒ مولانا کے ہم راہ تھے۔ (تمہید انتصار الاسلام، مرتبہ مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ طبع اوّل، اکمل المطابع دہلی، ۱۲۹۸ھ)۔ ارواح ثلاثہ میں ہے کہ منشی نہال احمد دیوبندیؒ اور شاہ جی عاشق علی دیوبندیؒ (وفات ذی الحجہ ۱۳۰۹ھ، جولائی ۱۸۹۲ء) بھی اس سفر میں ساتھ تھے (ارواح ثلاثہ: ص ۲۳۶)۔ یقیناً اور بھی کئی خادم اور علما ساتھ ہوں گے؛ مگر ان کا ذکر راقم سطور کو نہیں ملا۔ (نور)

مخلوق مولانا کی تقریر کے اشتیاق میں جمع ہو(گئی)؛ مگر وہ بندہ اللہ کا گفتگو پکا نہ ہوا(۱)۔ اینڈی بینڈی شرطیں کرتا تھا، جس سے عاقلاں خودمی دانند، اس کی نیت سمجھ میں آتی تھی۔ آخرغرض وہ چل دیا، اور مولانا نے وہاں ایک وعظ کہا، اوراس کے اعتراضوں کے جواب ذکرفرمائے(۲)۔

روڑکی سے واپسی کے بعد قبلہ نما کی تالیف:

پھرواپس دیوبند تشریف لاکر رمضان وطن میں کیا(۳)، اوراس عرصے میں تحریر اس تقریر کی شروع کی، جواس کے جواب میں فرمائی تھی۔ اصل اعتراض اس کا ''استقبال قبلہ'' پر تھا کہ یہ بت پرستی ہے۔ اس رسالے کا نام ''قبلہ نما'' ہے۔ بہت بڑے حجم کا رسالہ ہے(۴)۔

پنڈت دیانند کا میرٹھ کا سفر اور مولانا کی میرٹھ روانگی:

پھر پنڈت دیانند کہیں پھرا کر میرٹھ پہنچے(۵)، اور وہاں وہی اس کے دعوے تھے۔ واقعی جس کو شرم

---

(۱) حضرت مولانا نے اپنے سفر کی اور پنڈت جی سے مناظرہ کے ارادے، نیز پنڈت کے گریز وفرار کی روداد یوں قلم بند فرمائی ہے: ''آخر رجب (۱۲۹۵ھ) میں پنڈت دیانند صاحب نے رڑکی میں آکر سر بازار مجمع عام میں مذہب اسلام پر چند اعتراض کیے۔ حسب طلب بعض احباب اور نیز بہ تقاضائے غیرت اسلام، بہ ننگ اہل اسلام بھی شروع شعبان میں وہاں جا پہنچا اور آرزوئے مناظرہ سولہ سترہ روز وہاں ٹھہرا رہا۔ ہر چند چاہا کہ مجمع عام میں پنڈت جی سے اعتراض، مسنون اور بالمشافہ بہ عنایت خداوندی اسی وقت ان کے جواب عرض کروں؛ مگر پنڈت جی ایسے کاہے کو تھے، جو میدان مناظرہ میں آتے؟ جان چھڑانے کے لیے وہ وہ داؤ کھیلے کہ کاہے کو کسی کو سوجھتے ہیں۔ (تمہید قبلہ نما:ص۱، نیز تمہید انتصار الاسلام اور سوامی کا جیون چرتر، جس میں حضرت مولانا کی سوامی جی سے خط وکتابت بھی درج ہے،ص:۵۲۰ر تا:۵۵۵) (نور)

(۲) حضرت مولانا نانوتویؒ کی ان تقریروں کا خلاصہ مولانا عبدالعلی میرٹھیؒ نے جواب ترکی بہ ترکی کے نام سے مرتب کردیا ہے، جس میں سوامی دیانند اور آریوں کے اعتراضات کے جوابات ہیں، اس رسالے کا تعارف آئندہ حاشیوں میں آرہا ہے۔ (نور)

(۳) حضرت مولانا رڑکی میں سترہ دن ٹھہرنے کے بعد ۲۳ر شعبان کی رات میں رڑکی سے واپس ہوئے، دیوبند منگلور قیام فرماتے ہوئے ۲۷ر شعبان ۱۲۹۵ھ (۲۷ر اگست ۱۸۷۸ء) کو نانوتہ پہنچ گئے تھے۔ (نور)

(۴) ''قبلہ نما'' مولانا فخرالحسن گنگوہی کی توجہ اور نگرانی میں مطبع اکمل المطابع دہلی سے رجب ۱۲۹۸ھ میں شائع ہوا۔ ''انتصار الاسلام'' اور ''قبلہ نما'' دونوں سوامی جی کے اعتراضات کے جواب میں حضرت مولانا نانوتویؒ نے تصنیف فرمائی تھیں۔ (نور)

(۵) سوامی دیانند سرسوتی ۳ر مئی ۱۸۷۹ء (۱۰ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۶ھ) کو میرٹھ آئے تھے، چند روز کے بعد حضرت مولانا محمد قاسمؒ کو بھی مسلمانانِ میرٹھ نے میرٹھ آنے کی زحمت دی۔ مولانا ۱۰ر مئی کو میرٹھ تشریف فرما ہوئے، ۱۰ر تاریخ سے شرائطِ مناظرہ کی بات شروع ہوگئی تھی؛ مگر سوامی جی یہاں بھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، مباحثے پر تیار نہیں ہوئے۔ تفصیلات کے لیے جیون چرتر سوامی دیانند:ص۶۵۶، ۶۶۴۔ (نور)

نہ ہو، جو چاہے کرے۔ اتفاقاً جناب مولوی صاحبؒ بھی ان روز میرٹھ کا ارادہ فرمارہے تھے کہ وہاں سے (بعضے) صاحبوں نے بلانے کے باب میں تحریک کی، غرض مولانا میں ہرچند مرض کی بقیہ اور ضعف کے سبب قوت نہ تھی؛ مگر وہی ہمت۔ آخر وہی بہانہ حیلہ کر کر وہاں سے بھی وہ کافور ہو گیا۔ اعتراضات کے جوابات میں وہاں بھی اس کا جواب ویسے ہی مولانا نے کچھ بیان فرمایا[1]، اور پھر کچھ تحریر شروع کی، جس کو مولوی عبدالعلی صاحب[2] نے بہ طرز جواب لکھا اور نام ''جواب ترکی بہ ترکی'' رکھا۔ پنڈت کے بعضے معتقدوں نے کچھ تحریر بہ جواب مولانا بے سروپا لکھی تھی، اور کچھ اوٹ پٹانگ مسلمانوں کے مذہب پر اعتراض کیے تھے، یہ رسالہ اس کے جواب میں ہے۔

مرض کا پھر حملہ اور مستقل بیماری جو مرض وفات بنی:

اور اس عرصے میں چند بار جلد جلد وہی دورہ ہوا، کئی بار صورت سانس کی سی ہوئی، پھر اللہ جل شانہ نے تخفیف فرمادی۔ یوں خیال تھا کہ اب یہ مرض ٹھہر گیا۔ خیر دورہ ہے، ہرچند صحت اور نجات کی امید پوری نہ تھی؛ کیوں کہ علاج ہر قسم کے ہوتے، صورت آرام کی نہ ہوتی۔ یونانی طبیبوں نے ہر قسم کا علاج کیا، ڈاکٹروں نے ہر طرح سے تدبیر کی، ہندی ادویہ کشتے رس وغیرہ برتے؛ مگر مرض رفع نہ ہوا۔ دو برس اسی کیفیت پر گزر گئے کہ گاہ کچھ صورت تخفیف کی ہو کر قدرے طاقت آئی، اور پھر دورہ سانس کا ہوا، اور صورت ضعف کی ہوئی۔ ایک روز کے مرض میں کبھی کبھی کی طاقت سلب ہو جاتی تھی، اور مولانا نے برخلاف عادت

---

(۱) مولانا عبدالعلیؒ خلف شیخ نصیب علی فریدی، میرٹھ کے قصبہ عبداللہ پور کے رہنے والے تھے۔ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ، مولانا فیض الحسن سہارن پوریؒ اور حضرت مولانا محمد قاسمؒ وغیرہ سے تعلیم حاصل کی۔ حضرت مولانا کے ممتاز شاگردوں میں مستفیدین میں شمار ہے۔ مدرسۂ عربی دیوبند (دارالعلوم) میں مدرس چہارم کی خدمت سے عملی تدریسی زندگی کا آغاز ہوا۔ دارالعلوم کے بعد مظاہر العلوم سہارن پور میں مدرس دوم کے عہدے پر تقرر ہوا۔ مولانا محمد مظہرؒ کی وفات (۱۳۰۲ھ) کے بعد قائم مقام صدر مدرس ہو گئے تھے۔ ۱۳۰۶ھ/میں مدرسۂ شاہی میں مدرس اعلیٰ نام زد کیے گئے۔ ۱۳۱۴ھ/میں دارالعلوم دیوبند میں دوبارہ تقرر ہوا۔ ۱۳۱۷ھ/میں دیوبند سے مدرسۂ حسین بخش دہلی منتقل ہوئے، اور غالباً ۱۳۲۰ھ/میں مدرسۂ عبدالرب دہلی میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے، اور تاحیات اسی منصب پر فائز اور خدمت حدیث میں مشغول رہے۔ ۱۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو وفات ہوئی، قبرستان مہندیان دہلی میں دفن کیے گئے، رحمہم اللہ تعالیٰ۔ بے شمار علما مولانا کے شاگردوں میں تھے۔ ''جواب ترکی بہ ترکی'' مولانا کی قلمی یادگار ہے۔ مزید معلومات کے لیے ماہ نامہ ندائے شاہی مرادآباد ''مدرسہ شاہی نمبر'': ص: ۳۰۴/تا: ۳۱۶/ اور مقام خیر، مولانا زید ابوالحسن فاروقی: ص: ۳۵۷/تا ۴۳۷/ دہلی، ۱۳۹۵ھ (نور)

(۲) میرٹھ میں سوامی دیانند اور آریہ سماجیوں کی طرف سے جو اعتراضات ہوئے تھے، مولانا عبدالعلیؒ میرٹھی نے جو حضرت مولانا کے شاگرد تھے، حضرت مولانا کے افادات مرتب کر کے ''جواب ترکی بہ ترکی'' کے نام سے شائع کیے۔ (طبع اوّل، مطبع ہاشمی میرٹھ محرم ۱۲۹۷ھ) (نور)

اس مرض میں جو علاج ہوا، اس کو قبول کیا، جو دوا کھلائی کھالی، جو تدبیر کسی نے کی، اس کو کرلیا؛ البتہ مزاج لطیف ونفیس تھا، ویسی ہی دوا کو پسند فرماتے اور بعد عرض کرنے خدام کے جو دوا ہوتی استعمال فرما لیتے۔ کئی بار مسہل بھی ہوا، سر دست تخفیف ہو جاتی تھی؛ مگر جڑ مرض کی نہیں جاتی تھی۔ حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی آخر تلک مصروف رہے، اور ڈاکٹر حافظ عبدالرحمٰن صاحب مظفرنگری نے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا؛ مگر تقدیر سے چارہ نہیں، اور موت کا کچھ علاج نہیں، اور وقت مقدر ٹلتا نہیں۔ اگر دوا اور تدبیر پر کام ہوتا، تو بے شک مولانا کو صحت ہوتی۔ وہ دوائیں مولانا کے لیے میسر ہوئیں کہ جو امراء کو بھی شاید بہ دشواری میسر آئیں، اور ویسا علاج ہوا کہ جو بادشاہوں کو بھی شاید ہی نصیب ہو۔ کہاں طمع اور خوف کی بات اور کہاں عقیدتِ قلبی۔

آخری بیماری:

آخر کی صورت مرض کی یہ ہوئی کہ جناب مولوی احمد علی صاحبؒ کو فالج ہو گیا تھا، اس میں سہارن پور تشریف لے گئے، اور حافظ عبدالرحمٰن صاحب کو مظفرنگر سے بلایا، اسی روز گئے اور پھر شام کو واپس ریل میں آئے۔ تکان کے سبب طبیعت علیل ہو گئی؛ مگر چند روز کے بعد صحت ہو گئی۔ جب کچھ قوت آئی علاء الدین بندہ زادہ کی استدعا پر کچھ پڑھانا بھی شروع کیا۔ بعد عصر کچھ ترمذی کی ایک دو حدیث ہوتی، جب تلک کھانسی نہ اٹھتی بیان فرماتے رہتے، اور جب کھانسی کم ہوتی، تب بھی ذرا ٹھہر کر بیان فرماتے، اور جب شدت ہو جاتی، موقوف فرما دیتے۔

آخری سفر، مرض وفات اور رحلت:

پھر اسی عرصے میں سہارن پور کا قصد کیا اور جناب مولوی احمد علی صاحبؒ کو تخفیف اصل مرض میں ہو گئی تھی؛ مگر بخار اور ضعف شدید تھا۔ مولوی صاحبؒ ٹھہرنے کے باعث ہوئے۔ دو ہفتے وہاں قیام فرمایا اور اتنا قیام خلاف عادت تھا، وہاں دورہ ہوا، اور ساتھ ہی اس کے ذات الجنب (۱) بھی ہوا۔ یہاں دوسرے دن خبر ہوئی، اسی روز حافظ انوار الحق صاحب روانہ ہوئے، اور صبح کو مولوی صاحبؒ کو ریل میں لے آئے؛ مگر آئے کیا سانس نہ آتا تھا۔ ناچار فصد لی، درد موقوف ہوا، پھر کچھ درد کا اثر معلوم ہوا، اس کے لیے جونک لگائی، دو تین دن طبیعت صاف رہی، اس عرصے میں دہلی سے کچھ دوائیں مقوی آئی تھیں، ان کا استعمال ہوا۔

---

(۱) ذات الجنب: درد پہلو (PLERESY) ڈاکٹر غلام جیلانی خاں نے اس کے تعارف میں لکھا ہے: ''ابتدا میں پہلو کے کسی مقام پر عموماً پستان کے نیچے جکڑن اور چبھن معلوم ہوتی ہے، رفتہ رفتہ درد بڑھتا جاتا اور سانس کے ساتھ محسوس ہوتا ہے، سانس جلد جلد اور درد کو شدت ہوتی ہے، آخر کار مریض مارے درد کے سینے کو حرکت نہیں دیتا؛ بلکہ صرف پیٹ سے سانس لیتا ہے''۔ (مخزن حکمت: ص۷۸۸، لاہور، ۱۹۰۷ء) (نور)

ضعف نہایت تھا، بات کرنی دشوار تھی، اس میں حرارت کوشدت ہوگئی، اوراب کچھ غفلت ہوجاتی تھی، اوّل ایک ملین دیا تھا، رائے ہوئی کہ پھرملین دیا جائے، ملین دیا، دو دست ہوکر غفلت کوشدت ہوئی، ظہر کے وقت تلک جواب دیتے تھے؛ مگر ہوش نہ تھی، یہاں تک کہ نماز کے لیے کہا، تو سوائے اچھا کے اور کچھ نہ کرسکے، نہ تیمم کی طرف توجہ ہوئی، نہ نماز کی طرف، تب ایک صورت یاس کی ہوئی۔ یہ منگل کا دن تھا، اخیر روز میں وہ جواب بھی موقوف ہوگیا، اور ایک تشنج کی آمد شروع ہوئی، اس کونزاع سمجھا اور یوں جانا کہ اب وقت آخر ہے؛ مگر وہ رات اوردن اوراگلی رات اوردوپہر جمعرات کے اسی کیفیت پر گزرے۔

اس وقت پر سب احباب امروہہ، مرادآباد، میرٹھ، سہارن پور، گنگوہ، نانوتہ، وغیرہ سے جمع ہوگئے تھے۔ چوتھی جمادی الاولیٰ سن ۱۲۹۷ھ/جمعرات [1] کوبعدنماز اچانک دم آخر ہوگیا۔ ایک قیامت قائم ہوگئی۔ گھر میں وسعت نہ تھی، مدرسے میں لاکر جنازہ رکھا، اور بعد غسل وکفن بیرون شہر ایک قطعۂ زمین کا حکیم مشتاق احمد صاحب نے خاص قبرستان کے لیے اسی وقت وقف کردیا، وہاں اوّل مولانا کودفن کیا۔ مغرب سے پہلے نماز ہوئی، باہرشہر کے میدان میں نماز ہوئی، اتنا مجمع ان بستیوں میں کبھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ بعدمغرب دفن کیا، اوراس ''خزانۂ خوبی'' [2] کوسپردزمین کردیا، اور ہاتھ جھاڑ کر چلے آئے۔

مولانا کی وفات کا حد سے زیادہ غم:

مولوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کا سا غم والم کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک ماتم عام تھا۔ ہر چند شور غوغا اورسر پیٹنا اورکپڑے پھاڑنا نہ تھا؛ کیوں کہ بہ برکت وصحبت مولانا جتنے لوگ تھے، حدودشرعی سے باہر نہ ہوتے تھے؛ مگر ایسا غم عام ہم نے دیکھا نہ سنا۔ اللہ تعالیٰ درجات عالی جنت میں نصیب فرمائے، اور جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

حضرت گنگوہیؒ کا آنا، رنج والم کی کیفیت اورواپسی:

جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی سلمہ کومنگل کے روز خبر کی، دوپہر سے پہلے مولوی صاحبؒ تشریف لائے، جمعہ کے روز سہارن پورتشریف لے گئے۔ مولوی صاحبؒ کویہ ایسا صدمہ ہوا ہے کہ اس سے زیادہ کیا متصور ہو؟ ایسے ضابط؛ مگر سکوت اورنمازیں اکثر گزرتی رہی۔ مولوی صاحبؒ کی طبیعت پہلے سے بھی ناساز تھی۔ اب یہ صدمہ ہوا۔

(۱) حضرت مولانا کی یہی تاریخ وفات ۴ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ/پنج شنبہ (۱۵/اپریل ۱۸۸۰ء) صحیح ہے۔ بعض معتبر تذکرہ نگاروں کے یہاں اورقریبی ذرائع میں اورتاریخیں بھی درج ہیں؛ مگروہ فروگزاشت ہے، اس پراعتماد درست نہیں۔ (نور)

(۲) یہ فقرہ سنہ وفات ہے؛ مگر یہاں صحیح نقل نہیں ہوا' ہائے خزانۂ خوبی' مکمل فقرۂ تاریخ ہے، جس کے اعداد ۱۲۹۷ھ ہوتے ہیں۔ (نور)

وفات حضرت مولانا احمد علی محدثؒ:

سہارن پور پہنچ کر شنبہ کے روز جناب مولوی احمد علی صاحبؒ کا انتقال ہوگیا۔ یہ آفت اور مصیبت پر مصیبت ہوگئی؛ مگر مولوی صاحبؒ صدمے کے جذب اور مقابلے میں یہ صدمہ بہت ہی کم ہوگیا؛ ورنہ خدا جانے اس کا کتنا صدمہ ہوتا۔

مولانا کے بیٹے اور وفات کے وقت ان کی عمریں:

جناب مولوی صاحبؒ نے دو صاحب زادے چھوڑے: ایک میاں احمد، جن کی عمر اٹھارہ برس کی ہے۔ شادی ہوگئی، طالب علمی میں مصروف ہیں۔ بحمد اللہ! ذہن عمدہ، طبیعت تیز، مزاج سنجیدہ ہے۔ مولانا کے قدم بہ قدم خداوند تعالیٰ کرے، اور ویسی شہرت اور عزت نصیب کرے، اور صلاح وتقویٰ اور نشر علم خیر ان کی ذات سے فرمائے۔ چھوٹے صاحب زادے میاں محمد ہاشم، آٹھ برس کی عمر، بہت ذی ہوش، مستقیم مزاج ہیں۔ قرآن شریف حفظ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کمالات ظاہری اور باطنی نصیب فرمائے۔

حضرت کی بیٹیاں اور ان کے شوہر:

اور تین صاحب زادیاں ہیں؛ ایک بی بی ''اکرامن''(۶۹)، یہ سب سے، میاں احمد سے بھی بڑی ہیں۔ مولوی صاحبؒ کی اوّل اولاد یہی ہیں۔ نکاح ان کا جناب مولوی صاحبؒ نے میاں پیر جیو مولوی ''عبداللہ'' صاحب(۷۰) سے کیا ہے۔ یہ احقر کے ہم شیر زادہ ہیں(۷۱)، اور اولاد میں شاہ ابوالمعالی انبیٹھویؒ کے بیٹے مولوی

---

(۶۹) ''اکرام النساء'' دختر حضرت مولانا محمد قاسمؒ۔ مولانا محمد یعقوبؒ کی اطلاع کی روشنی میں تقریباً ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) سن ولادت معلوم ہوتا ہے۔ مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھویؒ سے نکاح ہوا، کئی اولادیں ہوئیں۔ بعض معلومات کے لیے سوانح قاسمی، حاشیے میں، ازمولانا قاری محمد طیب صاحبؒ: ج۱ص ۵۰۵۔ (نور)

(۷۰) مولانا عبداللہ انصاری خلف مولانا انصار علی انبیٹھویؒ۔ مولانا محمد یعقوبؒ نے اپنے ایک خط (مرقومہ ۸؍جمادی الاولیٰ ۱۲۸۸ھ مکتوب ۱۹) میں مولانا عبداللہ کی عمر بیس اکیس سال لکھی ہے۔ اگر یہ اندازہ صحیح ہے، تو مولانا عبداللہ کی تقریباً ۶۸۔۱۲۶۷ھ میں ولادت ہوئی ہوگی۔ اپنے والد ماجد، مولانا محمد یعقوبؒ اور مولانا محمد قاسمؒ سے تعلیم حاصل کی، ۱۲۸۷ھ میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے۔ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ سے اجازت حدیث حاصل کی۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ سے بیعت ہوئے، مثنوی شریف پڑھی اور خلافت سے نوازے گئے۔ گلاؤٹھی اور تھانہ بھون میں مدرس رہے۔ علی گڑھ، ایم۔اے۔او کالج کے شعبۂ دینیات کے ناظم مقرر ہوئے، اور تا حیات اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔ مولانا عبداللہ انصاریؒ کی متعدد تالیفات ہیں۔ حضرت نانوتویؒ کی تالیف ''اجوبۂ اربعین'' میں نصف حصہ مولانا انصاریؒ کی نگارشات کا ہے۔ مولانا نانوتویؒ کے مولانا انصاریؒ کے نام خطوط بھی دست یاب ہیں۔
مولانا انصاریؒ کے بیٹوں میں سے مولانا محمد میاں عرف منصور انصاریؒ (وفات: ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۶ء) معروف ہیں۔ مفصل معلومات کے لیے رجوع فرمایئے، راقم سطور نور الحسن راشد کاندھلوی کا مضمون: ''ایم۔اے۔او کالج کے سب سے پہلے ناظم دینیات مولانا عبداللہ انبہٹوی'' مشمولہ ''ناموران علی گڑھ''، دوسرا شمارہ، ۱۹۸۶ء: ص: ۳۹۹ تا: ۴۱۶۔ (نور)

(۷۱) مولانا محمد یعقوبؒ کی بڑی بہن نجیب النساء (دختر مولانا مملوک العلی نانوتوی) مولانا عبداللہ انصاری کی والدہ اور مولانا انصار علیؒ کی زوجہ تھیں۔ نجیب النساء کے تین بیٹے تھے: احمد حسین، عبدالرحمٰن اور عبداللہ انصاری۔ (نور)

انصار علی صاحب مرحوم کے، اور احقر سے اکثر کتابیں پڑھیں اور جناب مولوی صاحبؒ سے پڑھا ہے، نہایت عمدہ آدمی ہیں۔ ان کے تین لڑکیاں اس وقت اولاد ہے [۱]، اللہ تعالیٰ ان کی نسل میں برکت کرے۔ مولوی صاحبؒ کی سب اولاد میں صلاح وخوبی عام ہے۔ اخلاق عمدہ، مہمان نوازی عادت مستمرہ ہے۔

دختر دوم ''رقیہ'': ان سے چھوٹی بی بی رقیہ [۲] ہیں، ان کا نکاح مولوی پیر جیو محمد صدیق سے کیا ہے [۳]، یہ مولوی صاحبؒ کے ماموں مولوی امین الدین صاحب مرحوم کے نواسے ہیں، اور اولاد میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں۔ نہایت نیک اور سنجیدہ مزاج ہیں۔ ان کے ایک لڑکا ہے۔ جناب مولوی صاحبؒ نے دونوں لڑکیوں کا نکاح بالکل سنت کے موافق کیا ہے۔ بدون (بلا) اطلاع کسی کے، جمعہ کے روز بعد جمعہ نکاح کر دیا۔ البتہ جناب مولوی رشید احمد صاحبؒ کو بلوایا تھا، اور ان کو غالباً اطلاع فرمادی تھی، اور کسی کو خبر نہ تھی، اور نہ کچھ جہیز وغیرہ کا فکر کیا؛ مگر بہ عنایت خداوندی دونوں کے پاس زیور کپڑا، جیسے ہماری برادری میں ہوا کرتا ہے، موجود ہے۔ نہایت خوش وخرم گزران ہے، اللہ کا شکر اور احسان ہے۔

دختر سوم ''عائشہ'': چھوٹی صاحب زادی بی بی عائشہ، ان کی عمر چار برس کی ہے [۴]۔ مولوی صاحبؒ کو ان سے بہت محبت تھی۔ بہ خلاف اور اولاد کے مولوی صاحبؒ ان کو پاس بٹھلا لیتے، اور ان سے باتیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ عمر وصلاح نصیب فرمائے۔ یہ اس عمر پر بہت ہوشیار اور خوش مزاج ہیں، اللہ تعالیٰ مزید فرمائے۔

حضرت مولانا کے چند خاص عمدہ ترین شاگرد:

جناب مولوی صاحبؒ سے بہت سے لوگوں کی نسبت شاگردی ہے؛ مگر عمدہ ان میں سے ایک مولوی ''محمود حسن'' صاحب، فرزند کلاں مولوی ذوالفقار علی صاحب- دیوبند ہیں۔ اکثر کتابیں مدرسۂ دیوبند میں پڑھیں، اور حدیث مولانا کی خدمت میں حاصل کی، اور تکمیل وہاں ہوئی۔ دیوبند مدرسے کی طرف سے ان کو دستار فضیلت اوّل بار بندھی۔

---

(۱) ان لڑکیوں کے نام: امۃ السلام، امۃ الحنان، کلثوم تھے۔ (سوانح قاسمی، حاشیہ: ج۱ ص۵۰۵)

(۲) رقیہ دختر حضرت مولانا کی بیٹی ۱۳۱۴ھ میں وفات ہوئی۔ (مکتوبات سید العلماء (مولانا احمد حسن امروہویؒ): ص: ۱۸۷، مرتبہ مولانا نسیم احمد فریدیؒ، امروہہ، ۱۴۱۰ھ) (نور)

(۳) پیر جی صدیق کون تھے؟ راقم سطور کو ان کی صراحت نہیں ملی۔ غالباً اس سے مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھویؒ مراد ہوں گے؟ جو حضرت مولانا گنگوہیؒ اور حضرت مولانا کے شاگرد، دار العلوم کے فیض یافتہ طالب علم، بلند پایہ عالم، محدث اور حضرت گنگوہیؒ کے ممتاز ترین خلیفہ تھے۔ وفات ۲۳ر صفر ۱۳۴۴ھ/ (۱۸ر ستمبر ۱۹۲۵ء)۔ مختصر حالات کے لیے: تذکرۃ الخلیل: ص۲۱۸ تا ۲۲۷۔ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی اولاد کے متعلق کچھ معلومات سوانح قاسمی کے حاشیے میں درج فرمائی ہیں؛ مگر خود مہتمم صاحبؒ نے لکھ دیا ہے کہ: تمام معلومات مجھے بھی نہیں ملیں۔ حاشیہ سوانح قاسمی: ج۱ ص۷۰-۵۰۵) (نور)

(۴) عائشہ کی ولادت مولانا یعقوب صاحبؒ کی اطلاع کی روشنی میں تقریباً ۱۲۹۳ھ/ میں ہوئی ہوگی۔ مولانا قاری محمد طیبؒ نے ان کے شوہر کا نام نہیں لکھا؛ مگر لکھا ہے کہ عائشہ زندہ ہیں؛ مگر لاولد ہیں۔ (حاشیہ سوانح قاسمی: ج۱، ص۵۰۴)۔ یعنی محترمہ عائشہ صاحبہ ۱۳۷۳ھ/ تک حیات تھیں، ان کی عمر اسّی سے متجاوز ہوئی۔ (نور)

دوسرے مولوی ''فخر الحسن'' صاحب گنگوہی ہیں۔ وارستگی مزاج میں مولانا کے قدم بہ قدم؛ بلکہ کچھ بڑھ کر ہیں۔ عمدہ استعداد ہے۔ انہوں نے بھی مدرسۂ دیوبند میں تحصیل کی، اوّل جناب مولوی رشید احمد صاحب سے تحصیل کی تھی۔ تیسرے مولوی ''احمد حسن'' امروہوی، ان سے مولانا کو کمال محبت تھی۔ نہایت عمدہ ذہن وذکا اور اعلیٰ درجے کی استعداد ہے، اور جناب مولانا سے کمال مناسبت ہے، اور ان صاحبوں کے علاوہ اور بہت سے شاگرد ہیں۔

مولانا کے متوسلین:

مولانا باوجود اجازت حضرت حاجی صاحب مخدوم ومکرم قبلہ ایک زمانے تلک کسی کو بیعت نہ کرتے تھے، پھر آخر بہت تاکید کے بعد چند لوگ بیعت ہوئے، اور بہت سے لوگ ان میں محنتی، صاحبِ حال ہیں؛ مگر مولوی صاحبؒ نے کسی کو اجازت نہیں فرمائی، اور اب آخر میں بیعت سے انکار فرمادیتے تھے۔ اگر کوئی طالب علم ہوا، کچھ وظیفہ بتلادیتے۔ جیسے مولانا کے شاگرد اور مرید خدااور جاں نثار خادم ہیں۔ ایسے کہاں ہوتے ہیں؟ حال آں کہ مولانا سب کے ساتھ دوستانہ اور برابری کا سابرتاؤ رکھتے تھے؛ بلکہ تعظیم وتکریم سے گھبراتے تھے۔ فقط!

تاریخ وفات پر کہے گئے چند فقرات تاریخ:

بعد انتقال جناب مولوی صاحبؒ کی بہت سی تاریخیں اکثر صاحبوں نے نکالیں۔ سب کا یہاں ذکر کرنا طول ہے۔ ان میں دو مادے پسند احقر ہوئے، ان کو ذکر کرتا ہوں۔ ایک خود احقر نے نکالا ہے: ''کیا چراغ گل ہوا''، اور اس کو نظم بھی کیا ہے کئی طور پر۔ اور دوسرا مادہ نہایت عمدہ بہ غایت پسندیدہ، مولوی فضل الرحمٰن صاحب دیوبندی نے نکالا ہے: ''وفات سرور عالم کا نمونہ ہے''۔ مولوی صاحب نے ایک قطعۂ نظم بھی فرمایا ہے (۱)، جس کا یہ ایک مصرعہ ہے۔

(۱) مکمل قطعۂ تاریخ یہ ہے:

وہ غم ہے قاسم بزم ہدا کی رحلت کا	کہ جرعۂ نوش الم جس سے ہر درونہ ہے
یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزم عرفاں کا	مثال خم، فلک جام و اثر گونہ ہے
کچھ اک زمیں ہی نہیں، زرد رنگ اس غم سے	لباس چرخ بھی ماتم میں نیلگونہ ہے
ہے حامیان شریعت کو گر غم بے حد	تو سالکان طریقت کو اس سے دونہ ہے
کہاں ہے مدرسہ دیں کا حامی برحق	کہ ملک علم وعمل اس بغیر سونہ ہے
نہ پوچھ حال دل راز تشنگان علوم	کہ ان کی زیست ترے ہجر میں چگونہ ہے
کیا ہے شعلۂ ہجراں نے گر جگر کو کباب	تو آتش غم فرقت نے دل کو بھونا ہے
مگر مزار مقدس سے تیرے اے خوش خو!	ترے فدائیوں کو صبر، ایک گونہ ہے

سر الم سے لکھی فضلی نے سنِ وفات
وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے

۱۲۹۷ھ (۲)

(۲) سوانح قاسمی: ج، ص ۱۵۳، دیوبند، ۱۳۷۶ھ) (بقیہ اگلے صفحے پر):

دونوں بزرگوں کی وفات کی تاریخ عبدالرحمٰن خاں صاحب، مالک مطبع نظامی کان پور نے نہایت عمدہ نکالی ہے، یہ ہے:
''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا دَائِم''[1]۔ اوراحقر نے یہ مادہ اس کے لیے پایا ہے: ''مصیبت آئی مصیبت'' فقط۔

اختتام:

اب دعا پر ختم کلام کرتا ہوں ''یا اللہ! یا رب!! یا کریم!!!! اپنے فضل عمیم وعنایت عام وتفضّل تام سے ان حضرات کو اعلیٰ علیین میں مقام کرامت فرما، اور ہم پس ماندوں کو ان کے طریق مستقیم ہدایت پر استقامت۔ اسی پر زندہ رہیں اور اسی پر مریں اور اسی پر حشر ہو۔ آمین ثم آمین!

تمام شد رسالہ ہذا، ۷ر شوال المکرّم ۱۲۹۷ھ/ (۱۲ر دسمبر ۱۸۸۰ء)۔

خاتمۃ الطبع:

بفضلہٖ تعالیٰ رسالہ سوانح عمری متضمن حالات فیض انتساب، کرامت مآب جناب حاجی مولوی ''محمد قاسم'' صاحب نانوتویؒ، مؤلفہ جناب مولوی محمد یعقوب صاحبؒ۔

بہ ساعت مسعود بہ تاریخ ۷ر شوال ۱۲۹۷ھ/ ہجری المقدس مطبع صادق الانوار بہاول پور میں بہ اہتمام حافظ عبدالقدوس، سپرنٹنڈنٹ وایڈیٹر کے مطبوع ہوکر مثل صبح صادق اپنی انوار فیض آثار سے آفاق کو منور کیا۔ فقط! (۲)۔

(پچھلے صفحے کا بقیہ): یہ قطعۂ تاریخ خوب صورت کتابت کیا ہوا چند سال پہلے تک دارالعلوم دیوبند کے دفتر اہتمام میں لٹکا ہوا تھا، اب غالباً محافظ خانے میں رکھوا دیا گیا ہے۔ (نور)

(۱) عبدالرحمٰن خاں صاحب شاکر نے حضرت مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا احمد علی محدثؒ کی وفات پر ایک قطعۂ تاریخ کہا تھا، مولانا محمد یعقوبؒ کا نقل کیا ہوا فقرہ تاریخ ''رضی اللہ عنہما دائم'' اسی کا ایک مصرعہ ہے۔ مکمل قطعۂ تاریخ درج ذیل ہے:

آہ قاسم علی فقیہ زماں　　عاشق حضرت شفیع امم
پنج شنبہ جمادی الاولیٰ　　بہ چہارم روانہ شد بہ ارم
باز احمد علی وحید العصر　　حامی شرع سید عالم
در ہمیں ماہ وروز شنبہ بود　　بہ ششم در جناں نہاد قدم
ایں در علامۂ زماں بودند　　حاجی وفقہ داں فرشتہ شیم
در غم ایں دو مہر شرع رسول　　شد بہ روئے زمیں بہ پا ماتم
رضی اللہ عنہما دائم　　کلک شاکر نوشت ایں تاریخ

۱۲۹۵ھ

ملاحظہ ہو: مثنوی فروغ: ص ۴۷۔ مولانا عبدالکریم فروغ دیوبندی، بہ حواشی سید محبوب رضوی، طبع دوم، دیوبند، ۱۳۹۸ھ)

(۲) (ماخوذ از): مجلّہ صحیفۂ نور- کاندھلہ، ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء، ص: ۱۶۶-۲۳۲)۔

دارالعلوم کے بانی کی کہانی کچھ ان ہی کی زبانی

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

تدوین

محترم ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری ✿

حضرت گیلانیؒ کا یہ مضمون نایاب اور یادگار ہے۔ اس کے بعد اگر چہ موصوف نے ''سوانح قاسمی'' بہت تفصیل سے لکھی ہے؛ لیکن اس یادگار کو بھی اس نمبر میں محفوظ کیا جارہا ہے۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے، جو حواشی لکھے تھے، وہ بھی اپنی جگہ محفوظ ہو گئے۔ (نعمان)

دیباچہ

تصویر میں فائدہ کیا ہے؟

دستور ہے: ''جاہلیت اخریٰ'' کے اس دور کا دستور ہے کہ جب کسی خاص شخصیت کے انتساب کے ساتھ کوئی رسالہ یا مجلّہ نکالا جاتا ہے، تو التزاماً صاحب انتساب کی تصویر سے اس رسالہ کو مزین کرتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ تصویر خواہ کسی شکل میں ہو۔ ملت محمد یہ (علی صاحبہا التحیہ) میں قطعی طور پر حرام پاچکی ہے۔ یوں ہی میری سمجھ میں تصویر کے افادے کا کوئی پہلو اب تک نہیں آیا۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ تصویر میں ضرر کیا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ ضرر سے پہلے یہ بتایا جائے کہ کسی کی تصویر سے آخر دیکھنے والے، یا دکھانے والوں کا فائدہ کیا ہے؟ بڑی شخصیتوں یا اعاظم رجال میں قدرت جن غیر معمولی نوامیس وملکات کو پنہاں کرتی ہے، کیا ان نادیدہ غیر محسوس ملکات وعواطف کی کوئی تصویر کھینچ سکتا ہے؟ بہ قول حکیم مومن خاں مومنؒ:

شمیم گل کی نقاشو! ذرا تصویر تو کھینچو

✿ جنرل سیکریٹری مجلس یادگار شیخ الاسلامؒ- پاکستان، کراچی۔

جس چیز کی تصویر اتاری جاتی ہے، یا اتاری جاسکتی ہے، یعنی جسدی خط وخال، پوری شکل وصورت، کیا ان کے لحاظ سے ایک بڑے آدمی اور چھوٹے آدمی میں کوئی فرق ہوتا ہے؟ تصویروں میں کیا دکھا سکتے ہو؟ دو آنکھوں، دو ٹانگوں، دو ہاتھ، از یں قبیل وہی ظاہری اعضا و جوارح۔ پھر ان چیزوں کو کیا بڑے آدمیوں سے کوئی خصوصیت ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ ان امور میں تو حیوان بھی آدمی کے شریک ہیں۔ آج ہندوستان میں ایک بڑے طبقے کے سامنے گاندھی جی کی شخصیت بڑی سمجھی جاتی ہے؛ لیکن ان کی بڑائیوں کا کوئی حصہ ان کی شکل وشمائل، پیکر وہیکل کو بھی کچھ ملا ہے؟ ان میں اور ہندوستان کے کسی ادنا ترین بوڑھے دہقانی میں اس لحاظ سے کیا فرق ہے؟ ایسی چیز جس کا کوئی فائدہ نہ ہو، یوں ہی عبث ہے، اور عبث اور بے نتیجہ افعال کے ارتکاب پر اصرار مجانین کے سوا اور کون کرسکتا ہے؟؛ لیکن غور کرنے والوں کو عدم افادہ اور عبث کاری کے اس پہلو کے سوا تصویروں کے اندر مضرتوں کی جو دوزخ پوشیدہ نظر آتی ہے، ان کی تو داستان طویل ہے۔

توحید کی محکم عمارت پر جوز دیں تصویر کی راہوں سے شرک کی پڑی ہیں، اور جنت کے وارثوں کی جتنی بڑی تعداد جہنم کے گڑھوں میں اس راہ سے تاریخ کے نامعلوم زمانے سے گرتی چلی گئی ہے؛ بلکہ اس وقت تک گر رہی ہے، ان کو کون گن سکتا ہے؟ جب کہ بائیس کروڑ تعداد تو صرف ہندوستان ہی کے زندہ انسانوں میں آج بھی پائی جارہی ہے:

"رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ"(۱)۔

"میرے پروردگار! ان مورتیوں نے بھتیرے آدمیوں کی راہیں ماری ہیں"۔

چار ہزار برس کا پرانا قدیم ابراہیمی تجربہ ہے، اور آنے والی دوزخ کے متعلق تو نبوت کی تکذیبی قوتوں کو کچھ شک بھی ہو؛ لیکن کیا وہ اس دیکھی بھالی جہنم کا بھی انکار کرسکتے ہیں، جس میں تصویر اور صرف تصویر کی وجہ سے آج آدم کی نسل کا عظیم ترین طبقہ ہر ملک اور ہر قوم میں سینماؤں، عریاں پکچروں اور فحش البموں کی راہ سے مسلسل گرتا چلا جارہا ہے؟ شباب کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو اور بھڑکا کر ہر ملک کے نوجوانوں کو اخلاقی تباہیوں میں سینمائی تصویریں اور فلمی مرقع جو مبتلا کررہے ہیں، کیا اس میں اب کسی کو شبہ باقی ہے؟ بے دار ہونے سے پہلے نوخیزاؤں اور دوشیزاؤں کے جنسی رجحانات کو بیدار کرکے آئندہ نسلوں کے امینوں میں جو خیانتیں اور غلط کاریاں پیدا کی جارہی ہیں، کیا مشاہدے کی تصدیق کے بعد بھی اس کا انکار کیا جاسکتا ہے؟ اور یہ نتیجہ ہے: "رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَى النَّاسِ جَمِيْعًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" کی ہزارہا تعلیمات میں سے صرف ایک معمولی تعلیم (حرمت تصویر) سے لاپروائی کا۔

(۱) سورۂ ابراہیم: ۳۶۔

یہی وجہ ہے کہ جس وقت ''دارالعلوم دیو بند'' کے بنیادی مجلّہ ''دارالعلوم'' کے نکلنے کی مجھے بشارت سنائی گئی [۱]، تو بے ساختہ جی چاہا کہ بجائے صورت (تصویر) کے اگر شمارے میں بانیٔ دارالعلوم کی سیرت کا کوئی حصہ شائع کیا جاتا، تو مناسب تھا؛ لیکن حضرت قاسم العلوم والخیرات قدس اللہ سرہ العزیز کی سیرت کی ترتیب کا کام تو ایک مستقل کام ہے، جو نصف صدی سے منتسبین ومستفیدین دارالعلوم دیو بند کے ذمے قرض ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس قرض سے سبک دوشی فرزندان دارالعلوم کی کس بلند اختر ہستی کے لیے مقدر ہے؟ القاسم والرشید [۲] کے گزرے ہوئے دنوں میں کب یہ خیال سامنے نہیں رہا؟ ؛لیکن خیال سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خدا کرے مجلّہ ''دارالعلوم'' کا پرجوش ادارہ اپنی اس ذمے داری کو محسوس کرے، اور جس کام کو بہت پہلے ہونا چاہیے تھا، اسے اب بھی پورا کردے۔ وَمَا ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ!

اس وقت میں جو کچھ چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف کتابوں اور رسالوں میں اتفاقی طور پر خود آپ کے قلم سے اس سلسلے میں متفرق طور پر جو چند چیزیں نکل پڑی ہیں، ان ہی کو جوڑ کر آپ کی سیرت کا ایک مرقع تیار کروں، جو ظاہر ہے کہ کامل تو خیر! آپ کی سیرت کی ناقص تصویر بھی نہ ہوگی۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ خاک سار نے آج سے چند مہینے پیش تر اسی ارادے سے حضرتؒ کی بعض تالیفات کا مطالعہ کیا تھا، اس وقت بہت سی چیزیں ہاتھ آئی تھیں ؛لیکن دماغ سے ان کا اکثر حصہ نکل گیا۔ اپنی پرانی یاد داشت پر بھروسا کر کے پھر جستہ جستہ مقامات سے ان کو نقل کر کے مرتب کرتا ہوں۔ شاید کسی اہل بصیرت کو اس سے زیادہ موقع میسر آئے اور میرے ناقص مرقع کو وہ مکمل کرسکیں۔ اپنے التزام سے میں نے مندرجہ ذیل مقالے میں بہت کم تجاوز کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ''میلہ خدا شناسی'' کی رپورٹ کی بعض چیزیں ضمناً آ گئی ہیں۔ میرے خیال میں یہ رپورٹ بھی قریب قریب ذاتی بیان ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔

مناظر احسن گیلانی

---

(۱) ماہ نامہ ''دارالعلوم'' حضرت گیلانی رحمہ اللہ کے مشورے سے ۱۳۶۰ھ/(۱۹۴۱ء) میں جاری ہوا؛ لیکن چند سال بعد بعض مجبوریوں کی وجہ سے بند ہوگیا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں جاری ہوا، اور تا حال جاری ہے۔ (نعمان)

(۲) ''القاسم''، ''الرشید'' دارالعلوم دیو بند کے ابتدائی ماہ نامے، جس کی ادارت کی ذمہ داری حضرت گیلانی رحمہ اللہ نے بھی انجام دی؛ بلکہ حضرت گیلانی کی زندگی کا سب سے پہلا مضمون بھی القاسم میں شائع ہوا۔ (نعمان)

پہلا باب:
سوانح حیات پر ایک سرسری نظر

اسم گرامی:

یوں تو عام رسالوں اور کتابوں میں حضرت اپنا تعارف مشہور نام ہی سے فرماتے ہیں، مثلاً:

''بندۂ ہیچ مداں، گم نام ''محمد قاسم نام''(۱)۔

کسی جگہ: ''بندۂ ہیچ مداں، سراپا گناہ ''محمد قاسم''(۲)۔

کسی مقام میں:

''بندہ ہیچ مداں، کم ترین خلائق ''محمد قاسم''، عفی عنہ وعن والدیہ وعن جمیع المسلمین''(۳)۔

تخلص:

یوں آپ کے جاننے والوں کو یہ تو معلوم ہے کہ حضرتؒ کبھی کبھی فکر شعر بھی فرماتے تھے۔ خصوصاً سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کی شان میں حضرتؒ نے اردو، فارسی اور عربی؛ تینوں زبانوں میں قصائد لکھے ہیں؛ لیکن غالباً بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ حضرت والاؒ کا کوئی تخلص بھی تھا، اور کسی کتاب میں تو نہیں؛ لیکن ''ہدیۃ الشیعہ'' میں اپنا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

''گم نام ''محمد قاسم'' نام، تخلص بہ ''خاک پا''(۴)۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی خاص شکستہ واز خود رفتہ فطرت کے اعتبار سے اپنے لیے آپ نے اپنا تخلص بھی عجیب تجویز فرمایا تھا۔ اس کا پتہ نہ چلا کہ اس تخلص کا استعمال بھی آپ کے مطبوعہ کلام میں ہوا ہے، یا نہیں؟ بہ ظاہر یہی خیال گزرتا ہے کہ ایام جوانی میں غالباً شعروشاعری کا کچھ مشغلہ رہا ہوگا اور یہ تخلص اسی زمانے کی یادگار ہے(۵)۔

(۱) ہدیۃ الشیعہ، ص:۲۔ (۲) قبلہ نما، ص:۲۔ (۳) آب حیات۔ (۴) ہدیۃ الشیعہ، ص:۲۔

(۵) میں نے حضرت حاجی امیر شاہ خاں صاحبؒ اور بعض اپنے دوسرے بزرگوں سے سنا کہ حضرتؒ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: بعض وقت میں اپنے اندر قدرت محسوس کرتا ہوں کہ پورا وعظ نظم میں کہہ جاؤں؛ لیکن خلاف سنت ہونے کی وجہ سے اس سے احتراز کرتا ہوں۔ (طیب)

تاریخی نام:

یوں تو ''میلۂ خداشناسی'' کے ترتیب دینے والے نے بھی لکھا ہے[1] کہ: پادریوں اور پنڈتوں کے مقابلے میں پانچ مسلمان مولویوں کا نام جب پیش کیا گیا، تو اس وقت حضرتؒ نے کسی مصلحت سے (غالبًا اسی لیے کہ اصل نام سے لوگ پہچان جائیں گے) بجائے مولوی محمد قاسم صاحب ''حافظ خورشید حسین'' صاحب لکھوایا[2]۔

جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۹۲ھ/(۱۸۷۵ء) جس میں ہندوستان کے اس مشہور مذہبی میدان کو آپ نے جیتا تھا، اس وقت تک آپ حفظ کی دولت سے سرفراز ہو چکے تھے۔ بہر حال یہ تو ''میلۂ خدا شناسی'' کے مدون کا بیان ہے؛ لیکن حضرت والاؒ کی جب ملاقات پادری نولس سے ہوئی، تو اس وقت راوی کا بیان ہے کہ اس پادری سے بھی اپنا نام ''خورشید حسین'' بتلایا[3]۔

گویا اس بیان کی حیثیت ملفوظ کی ہے، اگر پہلے بیان کی حیثیت مکتوب کی ہے، اور اس سے بھی معلوم ہوا کہ یہ آپ کا تاریخی نام تھا۔

اس سلسلے میں اس سے بھی زیادہ دل چسپ چیز وہ ہے، جو خود اپنے قلم سے آپ نے ارقام فرمائی ہے۔ رام پور منہیاران کے مشہور بزرگ حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کے نام حضرتؒ کا ایک مکتوب گرامی ہے، جس میں لکھنو کے ایک شیعہ عالم حامد حسین نامی کے پاس ایک عام آدمی کی حیثیت سے پہنچے ہیں، جس کا قصہ آئندہ آئے گا۔ حکیم صاحبؒ کو اس ملاقات کی تفصیل لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: اپنے نام کے متعلق:

''پس از استفسار ''خورشید حسین'' گفتم''[4]۔

وطن مبارک:

''میلۂ خداشناسی'' ہی میں ہے کہ پادر نولس کو خورشید حسین نام بتا کر یہ بھی فرمایا کہ:

''میں ضلع سہارن پور کا رہنے والا ہوں''[5]۔

اس ملفوظ میں تو صرف وطن مبارک کے ضلع کا ذکر فرمایا گیا ہے؛ لیکن ''قبلہ نما'' کے دیباچے میں خود ارقام فرماتے ہیں:

---

(۱) جناب محمد ہاشم صاحب (مہتمم مطبع ہاشمی) و جناب محمد حیات صاحب (مطبع مجتبائی میرٹھ) نے قلم بند وشائع کرایا تھا۔

(۲) میلۂ خداشناسی، ص:۲۳۔ (۳) میلۂ خداشناسی، ص:۴۱۔

(۴) فیوض قاسمیہ، ص:۵۔ (۵) میلۂ خداشناسی، ص:۴۱۔

''بست وسوم ماہ شعبان کو رڑکی سے روانہ ہوا، اور ایک دن منگلور، دو تین دن دیوبند ٹھہر کر ستائیس ویں کو اس قصبۂ ویرانہ میں پہنچا، جس کو'' نانوتہ'' کہتے ہیں، اور اس خاک سار کا وطن بھی یہی ہے''(۱)۔

نانوتہ شریف کی ویرانگی کی طرف اپنے ایک مکتوب میں بلیغ فقرے کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں، کسی صاحب نے چادر گلیم کی فرمائش کی تھی، جواباً ارقام فرماتے ہیں کہ:

''چادر گلیم ایں جا حکم بیضۂ ثور وشتر دارد، آرے در مظفرنگر می سازند''(۲)۔

ترجمہ از فارسی: ''کمل کی حالت یہاں (نانوتہ) میں بیل اور اونٹ کے انڈے کی سی ہے۔ (یعنی جیسے ان جانوروں کے لیے انڈے کا وجود ناممکن ہے۔ اسی طرح نانوتہ جیسے قصبے میں کمل کا وجود ہے)، ہاں مظفرنگر میں بنایا جاتا ہے''۔

جس سے معلوم ہوا کہ ''گلیم بافی'' میں مظفرنگر کی اس زمانے میں بھی شہرت تھی، جیسی کہ اب ہے۔

اطراف نانوتہ کی ایک اور خصوصیت:

مولوی حامد حسین شیعی عالم سے ملاقات کے سلسلے میں ارشاد فرمایا گیا تھا کہ:

''بہ نواحی کہ زاد بوم احقر ست شیعان وسنیان چناں مخلوط اند کہ رشتہ ورابطۂ قرابت طرفین را بہ طرفین محکم ومستحکم است''(۳)۔

ترجمہ از فارسی: ''اس احقر کی پیدائش کی جگہ جس علاقے میں ہے وہاں سنی اور شیعہ اس طرح مخلوط ہو کر رہتے ہیں کہ دونوں فرقوں میں رشتہ اور قرابت کے تعلقات استوار اور مضبوط ہیں''۔

بہ ظاہر جس زمانے کی یہ حالت ہے، اس علاقے کے شیعوں اور سنیوں کے درمیان غالباً اسی قسم کے تعلقات تھے؛ لیکن بہ ایں ہمہ ویرانگی اور تسنن وتشیع کے باہمی اخلاط کے نانوتہ سے آپ کو جو قلبی ربط تھا، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حکیم عبدالصمد صاحب کے نام جو مکتوب سامی ہے، جس میں انہوں نے حضرتؒ کی تشریف آوری کی تمنا ظاہر کی ہے، اس میں جواباً ارقام فرماتے ہیں:

''کہیں آنے جانے میں اگر طبعی دشواری نہ ہوتی، تب بھی اس حال (نقاہت وضعف) میں دشوار تھا''۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طبعاً وفطرتاً نانوتہ شریف کا چھوڑنا مزاج اقدس پر گراں تھا۔ آگے اسی مکتوب میں اضافہ فرماتے ہیں:

(۱) قبلہ نما، ص:۳۰۔ (۲) فیوض قاسمیہ، ص:۳۷۔ (۳) فیوض قاسمیہ، ص:۵۔

''احباب دہلی متقاضی ہیں اور اپنا شوق بھی ادھر کو کھینچتا ہے؛ اس لیے یہ ارادہ تھا کہ دیوبند پہنچا، تو ادھر سے ادھر دہلی بھی ہو آؤں گا؛ مگر تواترِ امراض کے باعث ارادہ ملتوی رہا''۔

وطن کی طبعی کشش یہاں سے نکلنے میں کس طرح مانع آتی تھی؟ اس کے بعد صاف لفظوں میں اس کا بھی اظہار فرماتے ہیں:

''اب گو اچھا ہوں؛ مگر کاہلی کے لیے یہ خفیف سی نقاہت کافی ہے''۔

گویا جب تک کوئی شدید مجبوری ہی آپ کو مجبور نہ کر دیتی تھی، نانوتہ کے ویرانے کو چھوڑنا بہ ظاہر آپ کے لیے مشکل تھا۔ اس مکتوب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند تک اس قانون سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اگر چہ دیوبند کی حیثیت دلی وغیرہ کے مقابلے میں کچھ زیادہ ممتاز تھی، جیسا کہ فرماتے ہیں کہ اگر:

''دیوبند پہنچا، تو ادھر سے اُدھر دہلی بھی آ ؤں گا''۔

یعنی دہلی میں قدم رنجہ فرمائی اگر ہو سکتی ہے، تو وہ دیوبند کے طفیل میں۔

وضع وقطع، شکل وہیئت:

یوں تو ''میلۂ خدا شناسی'' کے رپورٹر نے حضرتؒ کی اس شان خاص کی تعبیر کسی پادری ''اینک'' نامی کی زبانی یوں ادا کی ہے:

''ایک پتلا دبلا آدمی، میلے سے کپڑے، یوں بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ عالم ہیں''(۱)۔

اسی رپورٹ میں ان میلے کپڑوں کے بعض جز کا رنگ بھی بتایا گیا ہے، بیان ہے کہ:

''ہندو بھی بہت خوش تھے، آپس میں کہتے تھے کہ: نیلی لنگی والے مولوی نے پادریوں کو خوب مات دی''۔

ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیلی لنگی۔لنگی کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھی، اور جیسا کہ اسی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

''کھتریوں میں کچھ آدمی شاہ جہان پور سے آئے ہیں، کیفیت مباحثہ کچھ اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ: مسلمانوں کی طرف سے ایک پتلا سا آدمی میلے کپڑے، نیلی لنگی بغل میں دبی ہوئی''(۲)۔

گویا مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی پوری ہیئت کذائی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا جسم کے اعتبار سے بھاری بھر کم نہیں؛ بلکہ چھریرے اور اکہرے بدن کے تھے؛ لیکن ظاہر ہے کہ یہ دوسروں کا بیان ہے، خود اپنی وضع قطع کے متعلق حضرتؒ کی بھی ایک شہادت مجھے اتفاق سے مل گئی۔

(۱) میلۂ خدا شناسی، ص:۴۴۔

(۲) میلۂ خدا شناسی، ص:۴۴۔

اسی شیعہ مولوی حامد حسین لکھنوی، جس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے، حکیم ضیاء الدین مرحوم کے خط میں اس کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''روزے بے عمامہ ورومال و چادر در چناں کہ عادت من ست''[1]۔

ترجمہ از فارسی: ''ایک دن عمامہ، رومال، چادر کے بغیر جیسا کہ میری عادت ہے۔''

''چناں کہ عادت من ست'' سے یہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ صرف اسی دن عمامہ و چادر ورومال سے بے نیاز ہو کر تشریف لے گئے تھے؛ بلکہ ''مولویانہ لوازم'' کے ان ساز وسامان سے عادتاً حضرت رحمۃ اللہ علیہ مستغنی رہے، اور وہی نیلی لنگی در بغل اور نیلی لنگی در بر بہ ظاہر میں آپ کا عام لباس تھا۔

حمل اسفار سے بے اعتنائی:

مطلب یہ ہے کہ جس طرح لباس، وضع قطع میں حضرتؒ نے اپنے کو مولویوں کی عام جماعت سے جدا کر رکھا تھا، تقریباً یہی حال آپ کا مولویت کے دوسرے ٹھاٹھ کے ساتھ تھا۔ یعنی پشتار ہائے کتب سے آپ کا گھر بے نیاز تھا[2]۔ ایک جگہ نہیں، تقریباً اپنی اکثر تصنیفوں میں اس خصوصیت کا آپ نے اظہار فرمایا ہے، پھر محمد صادق کے موسومہ خط میں ایک بلیغ فقرہ کتابی بے سروسامانی کے متعلق قلم مبارک سے خوب نکل گیا ہے، فرماتے ہیں:

''می دانی و ہمہ می دانند کہ نہ سفینہ بہ گنجینہ آوردہ ام، و نہ مکتوبات سفینہ را بہ سینہ سپردہ''۔

ترجمہ از فارسی: ''تم بھی جانتے ہو، اور سب ہی جانتے ہیں کہ نہ میں نے سفینوں (کتابوں) کا خزانہ جمع کیا ہے، اور نہ کتابوں کی باتیں سینے ہی میں محفوظ کی ہیں''[3]۔

''ہمہ می دانند'' (سب جانتے ہیں) سے تو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں عوام وخواص سب کو آپ کی اس بے کتابی کا حال معلوم تھا۔ یہ بیان تو ایک فارسی مکتوب میں ہے۔ نصر اللہ خاں نامی کے نام اردو کے ایک رقیمہ میں اسی مضمون کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

---

(۱) فیوض قاسمیہ، ص:۴۰۔

(۲) غالباً حضرت حافظ احمد رحمۃ اللہ علیہ، ہم لوگوں کے بڑے مہتمم صاحب کی زبانی یہ روایت میری سنی ہوئی ہے کہ: وفات کے بعد حضرتؒ کے متروکات میں کل تین کتابیں: ''القرآن الحکیم''، ''صحیح البخاری''، ''فصوص الحکم'' نکلی تھیں۔ غالب کا شعر بے ساختہ اس وقت یاد آیا تھا:

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط — بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

(۳) فیوض قاسمیہ، ص:۲۴۔

''مجھ کوتو کبھی فتوی لکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا، اور نہ میرے پاس اس کا سامان، نہ کتابیں نہ متقدمین ومتاخرین کی بیاضیں، جو میں اس کام کو سنبھالوں''(۱)۔

کتابوں سے حضرتؒ کا یہ استغنا آپ کے کس احساس اور جذبے پر مبنی تھا؟ اس کا اظہار بھی ایک سے زاید مقامات پر فرمایا ہے۔ اپنے نیاز مندوں کے سامنے بے جھجک یہ الفاظ قلم مبارک سے نکلتے چلے جاتے ہیں:

آپ جانتے ہیں کہ میں خود ذی علم نہیں، اور یہاں (نانوتہ) میں کوئی ایسا ذی علم نہیں''(۲)۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''چہ کنم مفتی نیم، نہ سامان افتادر بر''۔

ترجمہ از فارسی: ''کروں کیا، نہ میں مفتی ہوں اور نہ فتوی دینے کا میرے پاس سامان''(۳)۔

اور یہ تو صرف مفتی ہونے کا انکار ہے۔ ایک دوسرے خط میں جو میر صادق ہی کے نام ہے، لکھتے ہیں (گویا پورا مصرعہ ہی ہے):

''نہ قاضیم، نہ فقیہ ام، نہ مفتی ام، نہ امام''۔

ترجمہ از فارسی: ''نہ قاضی ہوں، نہ مفتی ہوں، نہ فقیہ ہوں نہ امام''(۴)۔

کبھی فرماتے ہیں اور علانیہ اپنے ایک معتقد کے سامنے اقرار کرتے ہیں کہ:

''کسے کہ از علم ہم جز نام بہ دست نیاوردہ کارش جز بے کاری نہ باشد''۔

ترجمہ از فارسی: ''ایسا آدمی جس نے علم کے نام کے سوا اور کچھ حاصل نہ کیا ہو، اس کا کام بے کاری کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟''(۵)۔

مگر باوجود اس کے کتابوں سے بے اعتنائی یہ اپنا ذاتی مذاق قرار دیتے ہیں؛ ورنہ پیشۂ مولویت کے لیے کتابوں کی کس حد تک ضرورت ہے؟ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ:

''ہم چو سپاہی کہ آلۂ ضرب بہ دست نہ دارد، وعالمے کہ کتابے در بغل اش نہ بود، بہ کارے ناید''۔

ترجمہ از فارسی: ''ایسا سپاہی جو مار کاٹ کے سامان واوزار نہ رکھتا ہو، اور ایسا عالم جس کے بغل میں کتاب نہ ہو، (دونوں) کسی کام کے نہیں''(۶)۔

مالی بار سے سبک دوشی:

اور جو نسبت حضرت والا کو کتابوں سے تھی، تقریباً یہی سلوک ''مال'' سے بھی تھا۔ ''آب حیات'' میں اپنے کتابی افلاس کا ذکر فرماتے ہوئے خود بھی اس دوسری تنگ دستی کا تذکرہ فرماتے ہیں، لکھتے ہیں:

(۱) فیوض قاسمیہ، ص:۳۱۔　(۲) ایضاً، ص:۶۔　(۳) ایضاً۔
(۴) ایضاً، ص:۲۹۔　(۵) ایضاً، ص:۴۹۔　(۶) ایضاً، ص:۴۲۔

''نہ گھر میں کوئی کتاب، جو یہ بات ہو کہ جب جی چاہا اٹھایا، دیکھ لیا، نہ روپے پیسے کا ایسا حساب کہ حسب دل خواہ ضروریات تحصیل میں صرف کیا''(۱)۔

مالی لاپروائیوں کے سلسلے میں آپ کی زندگی کے جومحیر العقول ومدہش وقائع ہیں، ان کی تفصیل کی ذمہ داری تو ان پر عائد ہوتی ہے، جوحضرتؒ کی سوانح نگاری کی سعادت حاصل کریں گے(۲)۔

لیکن خود آپ کے بیان میں اس ''ایسا حساب'' کی جوشرح ملتی ہے۔ اس کا اندازہ محض اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ ایک صاحب نے حضرتؒ کی تالیفات کے ساتھ ''آب حیات'' کا بھی مطالعہ کیا تھا، جواب میں ارقام فرماتے ہیں کہ:

''تحذیر الناس بہ دست آمد، انتباہ المؤمنین از دیوبند طلبیدہ ام، باقی ماندہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہنوز در حد تسوید ست، وآن ہم نزد منشی محمد حیات صاحب نوبت طبعش نہ رسیدو نہ بہ ظاہر طبعش قریب الوقوع ست''۔

ترجمہ از فارسی: ''تحذیر الناس (حضرت والا کی مشہور کتاب کا نام ہے) وہ تو ہاتھ لگ گئی ہے۔ انتباہ المومنین (یہ بھی ایک رسالہ ہے) اس کو دیوبند سے منگوایا ہے، باقی حیات النبی (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ یعنی ''آب حیات'' تو ابھی مسودے کی شکل میں ہے، وہ بھی منشی محمد حیات کے پاس ہے۔ اس کے چھپنے کی نوبت ہی نہیں آئی، اور بہ ظاہر اس کی چھپائی کی ابھی امید بھی نہیں ہے''(۳)۔

اس گرامی نامے میں ''نہ طبعش قریب الوقوع ست'' کی جوخبر دی گئی ہے، آج یہ کون باور کرسکتا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے ''کتب قیمہ'' اور ''لاہوتی علوم'' جومجلدات ضخیمہ کی شکل میں نہیں؛ بلکہ چند گنے گنائے اوراق میں ختم ہوجاتے ہیں، ایک وہ وقت بھی تھا کہ محض مالی تہی دستی ان کی طباعت واشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ ''جواب ترکی بہ ترکی'' کے ثقہ مؤلف نے - اگرچہ اس میں بھی شک ہے کہ اس جواب کا حقیقی مؤلف کون ہے؟ لیکن بہر حال اگر مولانا عبدالعلی صاحبؒ ہی کے قلم کا وہ نتیجہ ہے، جوحضرت مولاناؒ کے چہیتے اور ثقاتِ تلامذہ میں ہیں، وہ ارشاد فرماتے ہیں، اور کس کتاب کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں؟ ''قبلہ نما'' کے متعلق، جوکم از کم میرے مذاق کے مطابق حضرتؒ کی تالیفات میں واسطۃ العقد کا درجہ رکھتی ہے:

---

(۱) آب حیات، ص:۵۔

(۲) یہ سعادت قدرت نے حضرت گیلانی ہی کے حصے میں لکھی تھی۔ ''سوانح قاسمی'' لکھ کر حق ادا کردیا۔ (نعمان)

(۳) فیوض قاسمیہ، ص:۳۷۔

''رڑکی میں جو کچھ اعتراض قبل رونق افروزی جناب مولوی محمد قاسم صاحب مجمع عام میں پنڈت جی (دیانند سرسوتی) نے کیے تھے، اوران کے جواب بعد فرار پنڈت صاحب وانقطاع امید مباحثہ جومولوی صاحب ممدوح نے مجمع میں سنائے تھے، وہ سب لکھے لکھائے (بہ صورت قبلہ نما) مدت سے رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں تو بہ وجہ تہی دستی نہ چھپ سکے، نہ چھپنے کی امید''(۱)۔

معاشی حال کی یہ کیفیت کیا اضطراری تھی یا اختیاری؟ سوال بھی ہوتا ہے اور لوگ اس کے جواب سے بھی واقف ہیں؛ لیکن حضرتؒ ہی کی تحریروں سے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو اپنی ایک چھوٹی سی کتاب ''قبلہ نما'' کے چھاپنے سے معذور ہو؛ بلکہ اس کے چھپنے سے ناامید ہو چکا ہو، وہی بغیر کسی تذبذب، سوچ بچار کے ان دعوتوں کو رد کر دیتا ہے۔

ریاست ٹونک سے طلبی اور حضرتؒ کا انکار:

حکیم عبدالصمد جن کا پہلے بھی ذکر آ چکا ہے، ان ہی کے موسومہ خط میں کچھ اپنے امراض سابقہ وغیرہ کا ذکر فرمانے کے بعد باوجود اس اقرار کے کہ ''اب اچھا ہوں'' انتہائی بے پروائی سے اخیر میں لکھتے ہیں:

''غرض ٹونک تک اپنی رسائی کی توقع نہیں۔ آپ بھی اس خیال کو جانے دیجیے''(۲)۔

آخری فقرہ کہ ''آپ بھی اس خیال کو جانے دیجیے'' قابل غور ہے۔ خود بھی نہیں جانا چاہتے، اور ریاست کا ایک عہدے دار آپ کو بلاتا ہے، اس پر قدغن ہے کہ تم بھی اس خیال کو دل سے نکال دو۔ حال آں کہ ریاست ٹونک(۳) کے جس عہد کا یہ واقعہ ہے، جہاں تک میری معلومات ہیں، علم ودین کے اصحاب کے لیے اس ریاست کا اس زمانے میں خزانہ کھلا ہوا تھا؛ لیکن جس کی نگاہ ''خَزَائِنُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ'' کے مالک پر جم گئی ہو، اب اس کے سامنے ٹونک اور رام پور کے خزانوں کی کیا وقعت باقی رہ سکتی ہے؟

اس سلسلے کا ایک اور خط حکیم ضیاء الدین صاحب کے نام ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست بھوپال کے مدار المہام منشی جمال الدین کے پوتے مولوی ابوالقاسم صاحب حضرتؒ کے پاس چند سوالات بھیجتے ہیں؛ مگر پہلے تو بڑی ریاست کے مدار المہام سے تقرب کا جو غنیمت موقع میسر آتا ہے، اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے:

---

(۱) جواب ترکی بہ ترکی، ص:۳۷۔

(۲) فیوض قاسمیہ، ص:۴۸۔

(۳) ریاست ٹونک سے حضرت گیلانی رحمہ اللہ کو خاص تعلق خاطر تھا۔ حضرتؒ نے ابتدائی تعلیم اس کے مدرسۂ خلیلیہ میں مولانا برکات احمد ٹونکیؒ (۱۸۶۴ء-۱۹۲۷ء) سے حاصل کی تھی۔ (ابن ش)

''طبع سست کارمن کاہلی ورنہاد نہادہ انداز تحریر جواب جملہ تقاعدمی کرد''

ترجمہ از فارسی: ''میری سست کار طبیعت میں کاہلی فطرتاً بھری گئی ہے؛ اس لیے جواب کے لکھنے پر آمادہ نہ ہو رہا تھا''۔

بعد کو میرے نزدیک تو ایک دینی فرض خیال کر کے؛ لیکن حضرتؒ کا بیان ہے کہ:

''درتحریر جواب سوال اول چنداں ضرورت کتب نیست''۔

ترجمہ از فارسی: ''اس سوال کے جواب کے لیے چنداں کتابوں کی ضرورت بھی نہ تھی''۔

اس لیے جواب کے قلم بند کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں؛ لیکن اس جواب کو سائل کے پاس بھیجنے کا جو طریقہ اختیار فرماتے ہیں، وہی آپ کی اصلی ادا ہے۔ حکیم صاحب کو لکھتے ہیں کہ:

''آں چہ بہ ذہن نارسائے من می رسد، درایں اوراق رقم زدہ بہ خدمت می رسانم، باز آں مخدوم رااختیار ست بہ خدمت مولوی ابوالقاسم صاحب تنہا ایں جواب روانہ کنند یا نہ کنند؟''۔

ترجمہ از فارسی: ''میرے نارسا ذہن میں جو بات آئی ہے، ان اوراق میں انہیں لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں، پھر آں مخدوم کو اختیار ہے: چاہے مولوی ابوالقاسم کے پاس تنہا اس جواب کو بھیجئے یا نہ بھیجئے''[۲]۔

پہلے تو بجائے خود بھیجنے کے، جو یقیناً تعارف اور تقریب کا اچھا ذریعہ بن سکتا تھا، حکیم صاحب کو واسطہ بناتے ہیں، اور ایسا واسطہ کہ خواہ ''روانہ کنند یا نہ کنند؟'' اللہ رے شانِ استغنا!

اور یہ مولویت و مولوییت کے ساز وسامان جبہ ودستار سے بے زاری، یہ کتابوں سے استغناء دنیا، اور دنیاوی فراغ بالی کے ذرائع سے بے اعتنائی، یہ سب کچھ کس لیے تھا؟ ظاہر ہے کہ بحث کرنے والوں کے لیے بحث وبیان کا یہ بہت بڑا میدان ہے؛ لیکن باوجود شدت کتمان اور غایت ستر کے ''آب حیات'' میں غالباً غیر شعوری طور پر ایک جملہ قلم سے نکل گیا ہے، میرے خیال میں اس فقرے پر غور کرنے کے بعد حضرت والاؒ کی پوری زندگی کے مختلف حلقوں میں خود بہ خود تسلسل پیدا ہو جاتا ہے۔ ''ہوشیاران بے ہوش'' کی زندگیاں جس مضبوط چٹان پر تعمیر ہوئی ہیں، اس کا راز سامنے آ جاتا ہے۔ ہر مقصود سے کنارہ کش ہو کر کسی مقصود میں غرق ہو جانے والی ہستیوں کے اندر جو روشنی کام کرتی ہے، وہ بے نقاب ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

''پریشانی کی کیفیت پوچھیے، تو کچھ نہ پوچھیے، ایک دل اور ہزار مقصود، پھر ہر مقصود کے لیے ہزار غم موجود۔ ایک بات ہو، تو کچھ بات بھی ہے، پھر کس کس کو حاصل کیجیے، جو دل کو قرار ہو، اور دل کی پریشانی جائے؟''[۳]۔

---

(۱) فیوض قاسمیہ، ص: ۴۹۔ (۲) ایضا، ص: ۴۹۔ (۳) ایضاً، ص: ۵۔

''ایک دل اور ہزار مقصود، پھر ہر مقصود کے لیے ہزار غم موجود''۔ جنہوں نے اپنے دل کو بے لگام کر کے اس ابتلائی زندگی میں تگ ٹٹ، سر پٹ ہانک دیا ہے، وہی ان طلائی الفاظ کی تجربی داد دے سکتے ہیں۔ آگے پھر خود ہی سوال اٹھاتے ہیں کہ تمناؤں میں جو الجھایا گیا ہے، اس کے قرار وسکون کی آخر راہ کیا ہے؟ یہ معمولی سوال نہیں ہے۔ بے قراروں میں آج کتنے ہیں، جن کے سامنے قطعی فیصلہ شدہ شکل میں یہ سوال آتا ہو؟ یہاں تو حال یہ ہے کہ مقاصد پر مقاصد ہیں، ہر مقصد کے جلو میں غم واندوہ فوج درفوج کی شکل میں رواں دواں ہے۔ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟ کسی کے دل میں یہ سوالات آتے ہیں؟ پھر جواب تک نہ رسائی معلوم۔ بہرحال! حضرت والاؒ اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں اور کتنی پختہ حکیمانہ حقیقت کا اظہار کرتے ہیں:

''ساری تمنائیں برآئیں تو ہم میں اور خدا میں کیا فرق رہ جائے؟''(۱)۔

کاش! بے فیصلہ کیے زندگی گزارنے والوں کے دل میں بھی خیال آجاتا کہ جس ''کن فیکونی'' مقام کی تلاش میں وہ اس زندگیٔ ناتمام میں سرگرداں ہیں، دراصل یہ اپنی خدائی کی تلاش ہے۔ بندوں کو اگر معلوم ہو جائے کہ ان کی ساری جدوجہد جس کے لیے وہ ہانپے ہانپے پھرتے ہیں اور آسمان کے قلابے زمین سے اور زمین کے قلابے آسمانوں سے ملانے میں سراسیمہ ہو رہے ہیں، اسی لیے روپے جمع کرتے ہیں، تاکہ جس وقت جو ارادہ ہو، حکم کے ساتھ پورا ہو جائے، اسی لیے جائدادیں خریدتے ہیں، اس لیے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ الغرض جو کچھ کررہے ہیں، اسی لیے کررہے ہیں کہ ''ساری تمنائیں برآئیں'' حال آں کہ بہ قول حضرت مولانا مرحوم: ''تو ہم میں اور خدا میں کیا فرق رہ جائے؟''۔

اگر ابتدا ہی میں سوچنے والے یہ سوچ لیا کریں کہ جس راہ پر وہ جارہے ہیں، یہ خدا بننے کے ارادے کی راہ ہے، تو میں نہیں خیال کرتا کہ جو بندہ ہے، وہ شاید ایک لمحے کے لیے بھی خدا بننے کے ارادے کو برداشت کرسکتا ہے؛ لیکن کیا کیجیے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ خدا ہی بننے کے لیے کررہے ہیں؛ لیکن ان کو اس کا کبھی اطمینان سے یہ طے کرنے کا موقع نہ ملا کہ آخر وہ جو کچھ کررہے ہیں، کس کے لیے کررہے ہیں؟ اسی ابہام عدم قطعیت کا یہ نتیجہ ہے کہ ساری زندگی گزر جاتی ہے؛ لیکن خدا بننا تو انہیں نصیب نہیں ہوتا، اور جو بندہ ہے، وہ خدا کیسے بن سکتا ہے؟؛ مگر افسوس کہ بندہ بننے میں جو سرور وامن، عافیت وسکون ہے، اس سے بھی یہ بے چارے محروم رہ جاتے ہیں:

---

(۱) فیوض قاسمیہ، ص:۵۔

"خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ"(۱).

"دنیااورآخرت دونوں کھوبیٹھا، یہی کھلانقصان (کہلاتا) ہے"۔

بہ قول مولاناؒ: "ہرمقصود کے بعد ایک مقصود، اور ہرمقصود کے لیے ہزارغم موجود"۔ اس لیے پوری زندگی غم کا افسانہ بن کر رہ جاتی ہے۔

اس کے بعد مولاناؒ نے جو بات ارقام فرمائی ہے، گواس کا انتساب اپنی ذات کی طرف نہیں فرمایا؛ لیکن میں کیسے مان لوں کہ جس نے عبوری زندگی کے اس راز کو پالیا تھا، جس کا ذکر اوپر ہوا، وہ قدرتی طور پر اسی کے اختیار کرنے پر مجبور نہ ہوگا؟ جس کا ذکر حضرتؒ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

"اورسب آرزوؤں سے دست بردار ہوجیے اور خدا کے ہور ہیے، تو ایسی عقل اور ایسی ہمت کہاں سے آئے کہ بہ جز نام خدا اور کچھ نہ بھائے؟"۔

اب میں کیسے عرض کروں کہ ایسی عقل و ہمت اگر اس ہستی میں نہ آئی، جس نے باوجود مولانا محمد قاسم ہونے کے عمامہ چھوڑا، چادر چھوڑی، بجائے صاف کپڑوں کے خداشناسی کے میلے میں بھی میلے کپڑوں سے اس کے دل پر میل نہ آیا۔ باوجود مولوی ہونے کے اور یہ جاننے کے کہ یہی مولوی کے ہتھیار ہیں، اس نے اپنے گھر میں علم کی کوئی کتاب نہ رکھی۔ حکومتوں نے دعوت دی؛ لیکن وہ اسی حال میں مست رہا کہ "قبلہ نما" جیسی کتاب کے مضامین:

"لکھے لکھائے مدت سے رکھے ہیں، یہاں تو بہ وجہ تہی دستی نہ چھپ سکے، نہ چھپنے کی امید"۔

اسی کا اظہار اپنے ایک کافر مدمقابل سے کرتا ہے، اور خوش ہے کہ اس کو میں نے کتنا اچھا جواب دیا۔ بہرحال اس کا فیصلہ ناظرین پر چھوڑتا ہوں کہ جو خدا بننے کے ارادے سے باز آچکا تھا، وہ دنیا میں جب تک جیتا رہا اور ان ہی انسانوں کے درمیان جیتا رہا، جن کی ہرصبح اسی خیال میں گزرتی تھی کہ آنے والی شام کو ان کے گھر خدائی آنے والی ہے۔ پھر شام بھی اسی امید میں گزار دی گئی کہ کل جو صبح ہوگی، اس میں خدائی کا یہ مقام، یعنی ساری تمناؤں کے برآنے کا مقام حاصل ہوجائے گا، اور یوں ہی پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ سال سے اپنی صبح کو شام، شام کو صبح کر رہے تھے، اور وہ ان ہی میں زندہ رہا، چلتا رہا، پھرتا رہا؛ لیکن ہر وہ آرزو، جسے اس کے ہم زاد اور ہم عصر اپنی آرزو بنا کر جی رہے تھے، سب سے دست بردار ہوچکا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ ایک مولوی ہر شے سے ہاتھ اٹھا سکتا ہے؛ لیکن "میں عالم نہیں ہوں" اس خیال کو اپنے اندر تو کیا کسی دوسرے سے بھی سننے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا؛ لیکن آپ دیکھ چکے، سن چکے کہ اس کی زندگی اسی ڈھنڈورے کے پیٹنے میں گزری کہ:

(۱) سورۂ حج: ۱۱۔

''نہ قاصیم، نہ فقیہم، نہ مفقیم، نہ امام''(۱)۔

حضرت والاؒ نے اس کے بعد ''آبِ حیات'' کے ان آبِ حیاتی فقروں کو اس جملے پر ختم فرمایا ہے کہ:

> ''یہ (یعنی سب آرزؤوں سے دست بردار ہو کر خدا کے ہو رہیے، اور ایسی عقل وہمت کہاں سے آئے کہ بہ جز نامِ خدا کچھ نہ بھائے) نصیب ہو، تو کیا بات''۔

فرماتے ہیں، اور کتنے تجاہلِ عارفانہ کی اداؤں کے ساتھ اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

> ''نعمتِ ولایت ہم سے نابکاروں کو ہاتھ آجائے''۔

جو ولی نہیں ہے، بھلا وہ کسی ولی کے پہچاننے کا کیسے دعویٰ کر سکتا ہے؟؛ لیکن شاید ''ولی را ولی می شناسد'' یہ حکم ملتا ہے؛ ورنہ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ درخت کو پھل سے بھی پہچانا گیا ہے۔ میں کیا، دنیا نے اس شخص کو پہچانا، اور ابھی تو اس کے پہچاننے والے تھوڑے ہیں، زمانہ جیسے جیسے آگے بڑھے گا، جس نے خدا کے لیے ہر چیز کو چھوڑا تھا، خدا ان شاء اللہ تعالیٰ! اسی سے ہر ایک کو جوڑے گا۔

حضرتؒ کے وہبی علوم اور کسرِ نفسی:

مگر باوجود ان تمام اعترافاتِ ہیچ مدانی کے، جو میرے نزدیک رسمی تصنع اور ''ہضمِ نفس'' کے مصنوعی ورواجی اقرار سے قطعاً پاک ہیں، اوروں کو یقین پر مجبور نہیں کرتا؛ لیکن حضرت والاؒ کی اس صراحت کا میں کیسے انکار کروں؟ خود فرماتے ہیں:

> ''اسی لیے یہ ہیچ مداں، بدترین گناہ گار زبان ودل سے اس بات کا معترف ہے کہ میرے کلامِ پریشان میں اگر کوئی سخن دل نشین اہلِ دل اور کوئی تحقیق لائق تصدیق اہلِ حق ہے، تو وہ حضرت مرشد برحق ادام اللہ فیوضہ کے انتساب وتوسل کا پھل ہے''(۳)۔

اور اسی کے بعد ''زبانِ ودل'' دونوں کی ہم آہنگی کے ساتھ خود گواہی دیتے ہیں کہ:

> ''اگر اختلاط اغلاط اور آمیزشِ خرافات ہو، تو یہ تیرہ دروں خود قائل ہے کہ اپنی عقل نارسا ہے، اور اپنے دماغ میں خلل ہے''(۴)۔

بہر حال! یہ تو ''جہولیت'' کی وہ صحیح یافت تھی، جس سے ہر کس وناکس کو سرفرازی میسر نہ آتی؛ لیکن کہیں کہیں بہ طور اظہارِ واقعہ کہ اس ''خداداد دولت'' اور ''خدائے بخشندہ کی سعادت بخشندہ'' کے متعلق ایسے اعترافات بھی پائے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

(۱) فیوضِ قاسمیہ، ص:۲۹۔　　(۲) ایضاً، ص:۵۔
(۳) آبِ حیات، ص:۵۔　　(۴) ایضاً۔

''صاحبو! دیوانہ ہوں؛ لیکن بات کہتا ہوں ٹھکانے کی''۔

ایک دوسرے مقام میں اپنی تحریروں اور اپنی تعبیروں کی خصوصیت کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

''طرز اثباتِ مطالب گو جدید ست، مگر مطالب ہما اند کہ پیشینیاں گفتہ اند''۔

ترجمہ از فارسی: ''مطالب کے ثابت کرنے کا ڈھنگ اگرچہ کچھ نیا ہے؛ لیکن مطالب وہی ہیں، جو پہلے بزرگوں نے ارشاد فرمائے ہیں''(۲)۔

یہ اگرچہ چند مختصر الفاظ ہیں؛ لیکن ہر زمانے کے اہلِ علم، خصوصاً دین کے خدام کے لیے اساسی دستور اور کلی ضابطے کی نوعیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف جدت کا وہ زور کہ قرآنی آیات ہوں، یا آثار وسنن؛ ہر ایک کے متعلق بڑا کام یہی سمجھا جاتا ہے کہ کوئی نئی بات (۱) پیدا کرنی چاہیے۔ ایسی بات جو نہ صحابہؓ کی سمجھ میں آئی ہو، نہ ائمہ مجتہدینؒ کے، نہ اکابرِ سلف کے۔ دوسری طرف وہ جمود ہے کہ یار کی زبان ترکی بن چکی ہے؛ لیکن ایک گروہ کو اصرار ہے کہ ہم تو وہی بولیں گے اور وہی لکھیں گے، جسے ترکی جاننے والے نہ سمجھ سکتے ہوں، اور سمجھیں، تو اس سے بجائے اللہ ورسول کی تصدیق کے تکذیب کی جرأت ان میں زیادہ بڑھ جائے۔ حضرتؒ نے لفظوں میں جس چیز کی ضرورت ہے، اظہار فرمادیا، یعنی بات وہی ہو، جو آج سے تیرہ سو سال پہلے کہی گئی ہو؛ لیکن ان ہی مطالب کے اثبات اور تعبیر کا طریقہ وہ ہونا چاہیے، جس کا زمانہ مطالبہ کررہا ہو؛ ورنہ:

''یَتَکَلَّمُ کَکَلَامِ الْجِنِّي''.

''یہ تو جنوں کی زبان بول رہا ہے''۔

اس لطیفے کو محض قدامت پرستی کے زور میں بلاوجہ برداشت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

اسی سلسلے میں کبھی کبھی حضرت گرامی پر ''شکر'' کا جذبہ بھی غالب آتا ہے، اور واہب العطایا جل مجدہ کی نعمتوں کی تحدیث فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

''اب میں شکر خداوندی دل وجان سے ادا کرتا ہوں کہ مجھ سے روسیاہ، سراپا گناہ، نابکار، بد اطوار پر خداوند عالم نے یہ فضل فرمایا کہ میری عقل نارسا ان مضامین بلند تک پہنچی''(۳)۔

اور صرف اپنے ایک ہی کریم کے کرم کا گن گا کر نہیں رہ جاتے ہیں، اسی کے بعد دوسرے کریم کی سرفرازیوں کا اعتراف یوں کرتے ہیں کہ ان علوم تک رسائی:

''بہ طفیل حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہے؛ ورنہ میں کہاں اور یہ باتیں کہاں؟''(۴)۔

---

(۱) ہدیۃ الشیعہ، ص:۳۰۔　　(۲) فیوض قاسمیہ، ص:۴۰۔
(۳) قبلہ نما، ص:۱۱۶۔　　(۴) ایضاً، ص:۱۱۶۔

اوراسی پر بس نہیں فرماتے، آج مشکل ہے کہ کوئی بڑوں کی بڑائی اوراحسان مندی کے نیچے اپنے کواس درجے دبا ہوا محسوس کرے؛ لیکن جو اپنی بڑائی کھو چکا تھا، اگر اس کا سینہ اپنے بڑوں کے احترام سے معمور تھا، تو اس پر تعجب کیوں کیجیے؟

حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ:

پیرومرشد حضرت حاجی امداداللہ رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مکی، جن کے متعلق دنیا جانتی ہے کہ علوم اصطلاحی اور درسی فنون سے بہت کم تعلق رکھتے تھے؛ لیکن دیوبند کے دارالعلوم کے بانی، سرخیل علمائے ہند؛ بلکہ بیرون ہند کے الفاظ سنتے ہو، حضرت حاجی صاحبؒ کے متعلق کیا ہیں؟ یوں تو ان کے ذکر کا ایک ذخیرہ مولانا کی کتابوں سے اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔ تمثیلاً یہاں چند چیزیں درج کرتا ہوں۔ ''آب حیات'' میں فرماتے ہیں، پہلے ان القاب کونقل کرتا ہوں، جو اپنے پیرومرشد کے متعلق حضرتؒ نے ارقام فرمائے ہیں۔ یہ لکھ کر کہ ''حضرت پیرومرشد دام اللہ فیوضہ کی قدم بوسی سے رتبہ عالی پایا'' فرماتے ہیں:

> ''اعنی بہ زیارتِ مطلعِ انوارسبحانی، منبع اسرارصمدانی، موردافضال ذی الجلال والاکرام، مخدوم ومطاع خاص وعام، سرحلقۂ مخلصاں، سراپا اخلاص، سرلشکر صدیقان با اختصاص، رونق شریعت، زیب طریقت، ذریعۂ نجات، وسیلۂ سعادات، دستاویز مغفرت، نیازمنداں، بہانۂ واگزاشت مستنداں، ہادی گم راہاں، مقتدائے دین پناہاں، زبدۂ زماں، عمدۂ دوراں، سیدنا ومرشدنا مولانا الحاج امداداللہ، لَازَالَ کَاِسْمِہٖ اِمْدَاداً مِّنَ اللّٰہِ لِلْمُسْلِمِیْنَ وَ اَھْلِ اللّٰہِ''۔

''وہابیت'' کے اتہام کا ٹیکہ علم ودین کے جن خادموں کی پیشانیوں پر برکندو باد آنکھوں کو نظر آیا وہ سن رہے ہیں؟ پڑھ رہے ہیں؟ وہی لوگ اپنے مرشد وپیر کے متعلق کن احساسات وجذبات سے معمور سینے رکھتے ہیں، اوراسی کے ساتھ حال کے چھوٹوں کو ماضی کے بڑوں میں کیا کوئی عمدہ نمونہ اور حسنہ اسوہ نظر آرہا ہے۔ اکابر کی توقیر جن اصاغر کو یاد نہ رہی، کیا وہ امید کرتے ہیں کہ جب ان کی بڑائی کا زمانہ آئے گا، تو اپنے چھوٹوں سے وہی نہیں پائیں گے، جو انہوں نے اپنے بڑوں کو دیا تھا؟ اگر ایسے چھوٹوں اور ایسے بڑوں کو پیغمبر (صلوات اللہ علیہ وسلامہ) نے اپنی امت یا اپنی جماعت، یا اپنی راہ سے دور ہوجانے کی دھمکی دی ہے، تو کیا یہ صرف دھمکی ہے؟ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃٌ[1]!

---

(۱) اشارہ جامع ترمذی، سنن ابی داؤد کی اس حدیث کی طرف ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جو آدمی ہمارے چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ نہ کرے اور بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔ (معارف الحدیث: ج ۶ ص ۱۲۴، مولانا محمد منظور نعمانی، الفرقان بک ڈپو لکھنو) (ابن ش)

حضرتؒ کی سوانح عمری کا خلاصہ:

یوں تو حضرت قبلہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات سے عموماً لوگ واقف ہی ہیں؛ لیکن یہ ان کی سیرت کے متعلق اہم ترین وثیقہ ہے، جو خود مولاناؒ نے خدا جانے کیوں اسی کے بعد ان الفاظ میں قلم بند فرما دیا ہے:

''جو (یعنی حاجی صاحب) ہنگامۂ رست و خیز، غدر ہندوستان کے بعد وطن قدیمی تھانہ بھون، ضلع سہارن پور و مظفر نگر کو چھوڑ کر بہ حکم اشارات باطنی بلد اللہ الامین مکۂ معظّمہ، ''زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفاً وَّعِزَّةً'' میں مقیم ہیں''۔

کہنے کو تو یہ چند سطریں؛ بلکہ چند گنے چنے الفاظ ہیں؛ لیکن اس متن متین میں کیا چیز نہیں آ گئی؟ حضرت حاجی صاحبؒ قبلہ کا وطن، وطن کا ضلع، **ستاون کی مشہور جنگ آزادی، جو بعد کو ''غدر'' کے نام سے موسوم ہوئی۔ معلوم نہیں کس نے مشہور کیا؟** انگریزوں نے؛ لیکن وہ غدر کے عربی لفظ سے کیا واقف تھے؟ ہندوستانیوں کی اسی جنگ آزادی کے بعد حکومت مسلطہ نے اس سارے معاہدوں اور مواعید کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا، جو ہندوستان کے بادشاہِ اسلام سے مختلف زمانوں میں باضابطہ شکل میں کیے گئے تھے۔ قضا کا محکمہ ختم کر دیا گیا، دفتر کی زبان بدل دی گئی، تعلیم کا رخ پھیر دیا گیا اور جو کچھ ہوا، اس کی تفصیل کا نہ موقع، نہ ضرورت؛ البتہ مولانا مرحوم کا بھی اسی تعبیر کو باقی رکھنا شق ثانی کی موید ہے، اور اسی لیے ان چند الفاظ کے اضافے کی ضرورت ہوئی۔

بہر حال! اسی ضمن میں حضرت حاجی صاحبؒ کی شرکت کا اقتضاءً ذکر اور ہجرت الی الکعبہ کے متعلق ان کے خلیفۂ خاص کی یہ شہادت کہ ''بہ اشارات باطنی'' کا نتیجہ تھا، نہ کہ فرار و گریز کی پناہ گاہ۔ ایک خاص لطیفہ اس بیان میں یہ ہے کہ ''تھانہ بھون'' کو حضرتؒ نے سہارن پور اور مظفر نگر دونوں ضلعوں کا مشترک قصبہ قرار دیا۔ خدا جانے اس زمانے میں کیا واقعہ تھا؟ کیوں کہ جہاں تک میرا علم ہے، اب تو تھانہ بھون مظفر نگر ہی کی غالبًا کوئی تحصیل یا تھانہ ہے۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا: اپنی علمی نعمتوں کا انتساب جس طرح منعم حقیقی کی طرف فرما کر فریضۂ شکر سے حضرت سبک دوش ہوئے، اور اس کے بعد جس کے طفیل میں یہ سب کچھ پایا تھا، ان کے ذکر سے تر زبان ہوئے۔ اب اپنے ان دو کریموں کے ذکر کرم کے بعد اعتراف کرتے ہیں، اور بے محابا فخر کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں:

''کوئی سمجھے تو اور متعجب ہو، قاسم نادان کی تحقیق اور تنقیح، اور ایسی مستحسن و صحیح، زبان گنگ و چنیں نغمۂ خوش آئندہ''۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

''میں کہاں اور یہ مضامین عالی کہاں؟ یہ سب اسی شمس العارفین (حاجی صاحب) کی نور افشانی ہے۔ یہاں میں بھی مثل زبان ودست وقلم واسطۂ ظہور مضامین مکنونہ دل عرش منزل ہوں......اپنا حال معلوم ہے۔اس سامان پر یہ نعمت؟ ہاں حضرت مسطور الصفات کی عنایت کے نام جو کچھ لگائیں، بجا ہے، اوران کی توجہات کی نسبت جو کچھ بتائیں زیبا ہے''[۱]۔

صرافانِ جوہر ناشناس کا ذکر:

اسی کے ساتھ حضرت والاؒ کو اس کا بھی علم تھا کہ: ''اَلْـمُـعَـاصَـرَةُ أَصْـلُ الْـمُـنَـافَـرَةِ''، ''درز مانۂ تست[۲]'' کے جرم میں کتنے غیر مجرموں کو ارباب زمانہ نے مجرم بنایا ہے، اور کتنے سچوں کے لوگ منکر ہوئے ہیں۔حضرت والاؒ ان کی رایوں سے بھی واقف تھے۔کبھی کبھی زبان وقلم پر ان رایوں کا ذکر بھی آجاتا تھا۔میر محمد صادق کے موسومہ خط میں فرماتے ہیں کہ:

''ذخیرہ ام ہمیں خیالات پراگندہ من اند کہ یکے را اگر بدل می نشیند، دیگراں آں را از جملہ مضامین شعریہ می بینند''

ترجمہ از فارسی: ''میرا سارا ذخیرہ بس یہی میرے پراگندہ خیالات ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ کسی کے دل کو اگر لگتے ہیں، تو ایسے لوگ بھی ہیں، جو میری باتوں کو شاعرانہ خیالات تصور کرتے ہیں۔افسوس کہ دارالعلومی سلسلے کے بعض لوگوں میں یہ بدگمانی پیدا ہوئی اور خدا نے ایک بڑے علم سے ان کو محروم کیا''[۳]۔

خیر یہ تو کوئی نئی بات نہیں، ارباب زمانہ نے کس کو کلی طور پر مانا ہے؛ لیکن اصل چیز جو غور کرنے کی ہے، وہ منکرین کے ساتھ حضرتؒ کا طرز عمل تھا۔آج اگر کسی مولوی کی زبان سے کوئی چیز نکلی، اور دوسرے نے اس پر اعتراض کیا، اعتراض سچا ہی کیوں نہ ہو؛ لیکن ''مولویت'' کو خدا جانے کیوں ''معصومیت'' کا مرادف قرار دیا گیا ہے؟ جو نکل چکی، بس نکل چکی۔نہ اس کی تصحیح ممکن، نہ ترجیح؛ بلکہ کلام الٰہی تک متحمل نسخ ہے؛ لیکن اس پر خود غلطی کا کوئی ٹھکانہ ہے کہ اپنے کسی صادر شدہ قول کو ان تمام امور سے منزہ ومقدس فرض کیا جاتا ہے؛ مگر اس کے مقابلے میں جو طرز عمل ہمارے حضرت والاؒ نے اختیار کیا تھا، کاش! لوگوں کی اس پر نظر ہوتی، ایک جگہ نہیں، متعدد مقامات میں فرماتے ہیں:

---

(۱) آب حیات، ص:۵۔ (۲) مباش منکر غالب کہ درز مانۂ تست (غالب)۔

(۳) فیوض قاسمیہ، ص:۲۴۔

''نہ قاضیم، نہ فقیہم، نہ مفتی ام، نہ امام کہ اجتہاد کنم وخلق قول من بہ شنوند''۔

ترجمہ از فارسی: ''نہ میں قاضی ہوں، نہ میں مفتی ہوں، نہ امام ہوں، جو خود اجتہاد کرتا ہوں اور لوگ میری باتیں مانتے ہیں''(۱)۔

واقعہ یہ ہے کہ اہلِ علم اگر اس واقعہ کو اپنے حافظے سے گم نہ کریں کہ اگر اور کچھ نہیں، تو امام ومجتہد ہونے کا مقام تو ان کو حاصل نہیں ہے۔ پھر خلق اللہ کو اپنے قول کے ماننے پر مجبور کرنا، لوگ نہ مانیں، تو اس پر خود پیچیدہ ہو کر خود کو کوفت اور خواہ مخواہ کے دکھ میں مبتلا کرنا، آخر اس کی بنیاد کیا ہے؟ شکوے کی ساری بنیاد توقع پر ہے۔ حضرتؒ نے اس کی بنیاد ہی اکھاڑ دی، اور جس نے یہ کیا، یا جو یہ کرسکتا ہے، اگر اس کے بعد وہ یہ لکھے کہ:

''دیگراں اگر ہم صفیر من شوند فبہا؛ ورنہ کالائے زبوں بریش خاونداں دفتر بے معنے را بر سر من زنند و ہر چہ مناسب وقت دانند وموافق اشارات علمائے ربانی کہ از اتباع قرآن وحدیث و دور نہ افگند اختیار فرمایند، وایں نیاز مند را ہم اطلاع فرمایند، تا بہ پیروی جم غفیر من ہم سروہم، و در پے تفرق کلمہ نشوم''۔

ترجمہ از فارسی: ''اگر دوسرے بھی میرا ساتھ دیں، تو اچھی بات ہے؛ ورنہ میرے خراب سودے کو ریش خاوند کے حوالے کریں، اور اس بے معنی دفتر کو میرے سر پر دے ماریں، پھر جو بات وقت کے مناسب ہو، اور ایسے ربانی علما جو لوگوں کو قرآن وحدیث کی پیروی سے دور نہ کرتے ہوں، ان کے اشاروں کو قبول کریں، نیز اس سے نیاز مند کو بھی مطلع فرمائیں، تا کہ اکثریت (جم غفیر) کی پیروی کی راہ میں بھی اختیار کروں، اور مسلمانوں کی بات میں گڑ بڑ ڈالنے کی وجہ نہ بنوں''(۲)۔

کاش! علما کا گروہ اپنے اندر اس وسعت قلب کو پیدا کر لیتا، تو آج امت مرحومہ پر کفر والحاد کی خندہ زنیاں ہیں، ان کی نوعیت یہ نہ ہوتی۔

جہاں تک حضرت والاؒ کے مذاق طبعی کے اندازہ کرنے کا مجھے موقع دست یاب ہوا ہے، میں خیال کرتا ہوں کہ ایسے مسائل جن سے ''تفرق کلمہ'' اور مسلمانوں میں افتراق وانشقاق ہو، حضرتؒ ان سے طبعاً نفور تھے۔ فیوض قاسمیہ میں جو پہلا نامۂ مبارک ہے، اس کے آخر میں فرماتے ہیں:

''مبادا بہ تہمت مخالفت اکابر اہل سنت بندہ را بے وجہ بنائے روز گار مجرم قرار دادہ غوغا کنند وقیامت برسرم بپا کنندا''۔

(۱) فیوض قاسمیہ، ص:۲۹۔ (۲) ایضاً، ص:۲۹۔

ترجمہ از فارسی: ''ایسا نہ ہو کہ اس زمانے کے لوگ بندہ پر یہ تہمت جڑیں اور اہل سنت کے اکابر اور بڑوں کی مخالفت کا مجرم ٹھہرا کر ہنگامہ مچائیں اور میرے سر پر قیامت توڑیں''(۱)۔

خط نمبر ۱۳ رموسومہ مولوی عبد اللطیف صاحب کی تمہید میں حضرتؒ نے جو الفاظ ارقام فرمائے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ فروعی اختلافات میں الجھ کر اور مسلمانوں کو الجھا کر علما کے ایک گروہ نے دین کو جو ''حیات طیبہ'' کا دستور العمل اور ماعند اللہ تک پہنچنے کا ہوطی زندگی کے اس تیرہ خاک دان میں واحد ذریعہ ہے، صرف لفظی جنگ وجدال، قیل وقال کا ذریعہ محض ''لِیُقَالَ: اِنَّکَ عَالِمٌ'' کے لیے بنا رکھا ہے، اس سے طبیعت میں سخت گرانی تھی۔ فرماتے ہیں:

''عنایت نامہ رسید اما باعث ملال گردید، ایں زمانہ چہ پرشور امت کہ بجائے محبت اخوت اسلامی عداوتہا برخاستند دراں مسائل کے متفق علیہا بودند اختلاف پدید آمد و جاہلاں را در معرکہ مناظرہ نوبت قدم نہی رسید''۔

ترجمہ از فارسی: ''عنایت نامہ پہنچا؛ لیکن اس سے ملال ہوا۔ یہ کیسا پرشور زمانہ ہے کہ اسلامی اخوت کی محبت کی جگہ کینے اور دشمنیاں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ ایسے مسئلوں میں جن پر ہمیشہ سے اتفاق تھا، ان میں بھی اختلاف پیدا ہو رہا ہے، اور مناظرے کے میدان میں جاہلوں کو بھی قدم رکھنے کا موقع مل گیا ہے''(۲)۔

کاش! علما اب بھی ان زریں تجربات اور سیمیں نصائح کو حرزِ جاں بناتے۔ کم از کم دار العلوم دیوبند کے منتسبین اور خریجوں کے لیے تو اس سے زیادہ روشن وتابناک مشورہ دوسرا نہیں ہوسکتا ہے، جن قلوب میں حضرت والاؒ کے فضل وکمال کا وزن ہے، ان شاء اللہ! ان کے لیے یہ چند فقرے دستور العمل کا کام دے سکتے ہیں۔

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے آخر میں آپ کے تالیفی وتصنیفی کاروبار کی چند خصوصیتوں کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔

---

(۱) فیوض قاسمیہ، ص: ۴۰۔

(۲) ایضاً، ص: ۴۶۔

دوسرا باب:

تالیفات وتصنیفات

طریقۂ تحریر وخصائص پر ایک نظر:

اپنی تصنیف کے طریقے کا ذکر ایک موقع پر فرماتے ہیں:

''یہ سمجھ کر کہ جو اس مضمون کو چھوڑا تو حسب تجربۂ سابق یہاں بھی اپنے خیال سے زیادہ طول ہو گیا، اور اپنے اندازے سے بڑھ کر مضمون مذکور کے شاخ وبرگ پھیلے ہوئے نظر آئے''(۱)۔

اور جس طرز کے مصنفوں میں حضرت والاؒ کا شمار ہے، ان کے ساتھ عموماً یہی واقعہ پیش آتا ہے۔ خود بھی تو فرماتے ہیں کہ ''حسب تجربۂ سابق''، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خیالات کا طوفان جب امنڈتا تھا، تو پھر روکے اس کا رکنا مشکل ہوتا تھا، اور آپ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ایک عادت شریفہ تو بہ ظاہر یہی معلوم ہوتی ہے۔ دوسری عادت اسی ذیل کی وہ ہے، جس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرماتے ہیں:

''اِدھر کثرت مشاغل باعث رنج وتعب، اُدھر دل کاہل آرام طلب، اس وجہ سے کبھی لکھا، کبھی نہ لکھا۔ اس میں رمضان شریف کا آجانا نہ لکھنے کا بہانہ ہو گیا''(۲)۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس قسم کے ابتدائی نظریات پیدا کرنے والی ہستیوں سے مسلسل یہ پابندئ اوقات کسی کام کی کم توقع کی جاسکتی ہے؟ جی میں آیا تو لکھنے بیٹھے اور جز کے جز کو جواہر ریزوں سے بھر دیا۔ طبیعت اکھڑی، تو پھر مہینوں خبر بھی نہ ہوئی۔ ایک اور عادت کا ذکر اسی تصنیف وتالیف کے متعلق اپنی یہ بھی بتاتے ہیں کہ:

''بندہ را نقل از تحریر دشوار تر ست ودیگرے نیست کہ کار فرمائی او باشم''۔

ترجمہ از فارسی: ''لکھنے سے زیادہ بندے کے لیے مضمون کا نقل کر دینا دشوار ہے، اور کوئی ایسا بھی نہیں ہے، جسے کام کرنے کا حکم دوں''(۳)۔

---

(۱) آب حیات: ص۳۔

(۲) ایضاً، ص:۳۔

(۳) آب حیات، ص:۴۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام مصنفوں کا جو عام قاعدہ ہے کہ ایک ایک مسودے کو متعدد بار لکھتے اور صاف کرتے ہیں، مدتوں کاٹتے پیٹتے رہتے ہیں، اور آخر میں مکمل کر کے اسے صاف کرتے، یا صاف کراتے ہیں، حضرت والاؒ کے لیے اتنی جگر کاوی مشکل تھی، جو کچھ لکھنا ہوتا عموماً قلم برداشتہ لکھتے اور اسی حال میں اس کو روانہ کر دیتے۔ آپ کی عام کتابیں جہاں تک میرا خیال ہے، اسی نہج پر لکھی گئی ہیں۔

ضمناً اسی فقرے سے ایک اور بات بھی معلوم ہوئی کہ باوجود اس عظمت وجلالت کے اپنے مسودات کا کسی سے صاف کرانا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ حال آں کہ عموماً آپ کے ساتھ تلامذہ کا ایک گروہ رہتا تھا، چاہتے تو کم از کم دوسروں سے نہیں، تو شاگردوں سے تبییض کا کام لیتے؛ لیکن کس کا ''کارفرما'' ہونا، اس شخص نے شاید زندگی کے آخری لمحوں تک پسند نہیں کیا۔ جس نے ''بندگی'' کے سوا اپنے اندر ''خواجگی'' کا کوئی جرثومۂ زندگی باقی نہ چھوڑا تھا، اور اسی کا شاید یہ نتیجہ ہے کہ جس کام کا آغاز کر کے وہ دنیا سے تشریف لے گئے، آج تقریباً پون صدی(۱) سے زیادہ زمانے میں قدرت اس کام کو چلانے کے لیے غیب سے خادموں کی جماعت فراہم کر رہی ہے، اور ان شاء اللہ! فراہم کرتی رہے گی۔ اِلَی مَا شَاءَ اللّٰہُ، ''جَزَاءً وِّفَاقاً'' کی یہی کتابی نہیں، قدرتی تفسیریں ہیں۔

ایک خاص تصنیف کا ذکر:

یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت مولاناؒ کا شمار ان مصنفین میں نہیں ہے، جو تصنیف ہی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا کر اسی پیشے میں زندگی گزار دیتے ہیں، جہاں وہ تمام آرزوؤں سے دست بردار ہوئے تھے۔ بھلا اس سلسلے میں تصنیف کی آرزو بے چاری کے لیے کیا گنجائش تھی؟ اسی لیے انہوں نے جو کچھ بھی لکھا اور جب کبھی لکھا، کسی ضرورت سے مجبور ہو کر لکھا، اور عموماً اسی وقت لکھا، جب مجبور کرنے والوں سے دامن چھڑانے کی کوئی صورت باقی نہ رہتی تھی۔ گویا اس لحاظ سے مولانا مرحوم کا سارا تصنیفی سرمایہ ایک جبری سرمایہ ہے، جسے بہرحال! قوت سے فعل کے دائرہ میں قدرت لانا ہی چاہتی تھی۔ اسی لیے میرے نزدیک مولانا کا شمار ان مصنفین میں ہے جنہوں نے صرف لکھنے کے لیے نہیں لکھا؛ بلکہ لکھنے کے سوا کسی اور بلند مقصد کے لیے قدرت نے ان سے کچھ لکھوا دیا۔ چوں کہ لکھنا آتا ہے، اس لیے لکھو۔ بھلا اس کام کو اس عمل سے کیا نسبت، جس میں مطالبہ کیا جاتا ہے کہ لکھنا نہ بھی آتا ہو، جب بھی لکھو۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس باب میں ہر ہر

(۱) حضرت گیلانیؒ نے جب یہ مضمون لکھا تھا، اس وقت حضرت نانوتویؒ کے وصال کو پون صدی ہوگئی تھی۔ زیرِ نظر نمبر کی اشاعت کے وقت حضرتؒ کے وصال کو ایک سو اڑتالیس سال ہوگئے۔ (نعمان ۱۴۳۶ھ/ ۲۰۱۵ء)

کتاب کی وجۂ تصنیف کا بیان کرنا میرا کام نہیں ہے؛ لیکن مضمون کے اس حصے کو ختم کرتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ حضرت کی خاص کتاب ''آب حیات'' کی تصنیف کے جو واقعات ہیں، ان کا اجمالی ذکر کرہی دوں، جو مولانا ہی کے بیان سے ماخوذ ہیں اور بہت اہم نتائج کے حامل ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ''آب حیات'' سے تقریباً تین چار سال پہلے کسی شیعہ مولوی عمار علی نامی نے ریاست الور کے قصبہ ''کرتھل'' کے باشندے میر نادر علی کے نام شیعوں کے اعتراضات کا ایک مجموعہ لکھ کر بھیجا تھا، اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ نے اعتراضات کے اس مجموعے کو اپنے ایک خط کے ساتھ حضرت نانوتویؒ کے پاس اس تحریک کے ساتھ ارسال فرمایا کہ ان اعتراضات کے متعلق آپ ہی کو کچھ لکھنا پڑے گا۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ[1] کا ذکر جن الفاظ میں فرمایا کرتے تھے، (جن کا تذکرہ اپنے مقام پر آئے گا)، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ انہوں نے:

> ''ایک خط متضمن بعضے خرافات شیعہ، جو مولوی عمار علی صاحب کی طرف سے بہ نام میر نادر علی صاحب، ساکن کرتھل، نواح الور تھا، اس ہیچ مداں کے پاس بہ ایں غرض بھیجا کہ ان خرافات کے جوابات لکھ کر روانہ خدمت مولانا ممدوح (مولانا گنگوہیؒ) کروں''۔

حکم اور وہ بھی مولانا گنگوہی کا نادر شاہی حکم، ٹالنے کی کیا شکل تھی؟ بہ ظاہر حسب عادت جز بز تو بہت ہوئے۔ پہلے تو یہی ایک حیلہ غالباً پیش کیا گیا کہ اس وقت اس سے زیادہ اہم دینی خدمت میں مشغول ہوں۔ چند سطروں کے اسی تمہید میں ارقام فرماتے ہیں:

> ''ان ایام میں حسب ایمائے بعض احباب کہ ان سے اشتراک نسبی بھی حاصل ہے، اوقات فرصت میں اثبات توحید و رسالت بہ دلائل عقلیہ اوراق سیاہ کرتا تھا''۔

غالباً ''تقریر دل پذیر'' کی طرف اشارہ ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ اہم دینی کام بھی بہ ایمائے بعض احباب انجام پا رہا تھا۔ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں: یہ بعض احباب جن سے اشتراک نسبی بھی حاصل ہے، یہ مولوی منیر الدین صاحب ہیں، جن کے متعلق ''میلۂ خداشناسی'' کے مرتب نے دیباچے میں لکھا ہے:

---

(۱) حضرت موصوف نے دہلی میں تعلیم پوری کی اور سید الطایفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کے دست حق پرست پر بیعت فرمائی۔ بدعات ومحدثات کے خلاف جہد مسلسل میں صلابت کا یہ عالم تھا کہ اپنے مرشد کامل کے بعض افکار سے متصادم رہے۔ چشتی سلوک کے امام اور اہل اللہ کے حلقوں میں قطب و عالم ربانی کے القاب سے شہرت رکھتے ہیں۔ بدعات ومحدثات کی بیخ کنی میں تن تنہا وہ کام کر دکھایا جو علمائے حق کی ایک مجلس اور انجمن کر سکتی ہے۔ (انظر شاہ مسعودی، **نقش دوام**، (مکتبہ بنوریہ، کراچی)، ص:۲۸۔)
حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ سے آپ کی غیر معمولی دوستی و بے تکلفی مشہور ہے۔ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل دونوں نے ایک ہی استاد و شیخ سے کی۔ ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۹ء) میں بہ مقام گنگوہ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) میں وفات پائی۔ (ابن ش)

''ان کے (مولانا نانوتویؒ) کے بھائی مولوی محمد منیر صاحب، مدرس مدرسۂ سرکاری بریلی''۔

الغرض ''اثبات توحید ورسالت بہ دلائل عقلیہ'' ایک مشغلہ موجود ہی تھا، اس کو وجہ قرار دیتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

''تو اس وجہ سے (یعنی اثبات توحید و رسالت بہ دلایل عقلیہ کی مسودہ نگاری کی وجہ سے) اور کچھ بہ وجہ کاہلیٔ طبع زاد اس کے (مولوی عمار علی کے اعتراضات کے) جوابات کا لکھنا سخت دشوار معلوم ہوا''۔

اس پر بس نہیں فرماتے ہیں، اور اضافہ کرتے ہیں:

''اور پھر بہ وجہ ہیچ مدانی اور بے سروسامانی اور کثرت مشاغل روزمرہ اس خیال (ارقام جوابات) سے اور بھی دل تنگ ہوتا تھا''۔

اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آج امت کو حضرتؒ کے طفیل میں مواہب لاہوتیہ کے دار غرر کی جو دولت ارزانی ہوئی ہے، وہ کتنی دشواری سے ہاتھ آئی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے: مولوی عمار علی بے چارے کے اعتراضات لاجواب ہی ہو کر رہ جاتے، اگر حضرت نانوتویؒ اس حکم سے مجبور نہ ہو جاتے، جس کا ٹالنا ان کے بس میں نہ تھا۔ خود ہی فرماتے ہیں:

''القصہ بہرطور یہ کار دشوار تھا؛ مگر مولانا ممدوح (مولانا گنگوہیؒ) کے ارشاد سے ناچار تھا''۔

اور اسی بے چارگی ولاچاری نے خدا جانے کتنے بے چاروں کے لیے چارہ پیدا کیا۔ کتاب ''ہدیۃ الشیعہ'' لکھ کر تیار ہوگئی؛ مگر اس میں بھی وہی خصوصیت ملحوظ رہی کہ:

''ایک دفعہ تو بن نہ پڑا، پر اوقات فرصت میں لکھ لکھ کر پانزدہم صفر ۱۲۸۴ھ/(۱۸۶۷ء) میں تمام کیا''۔

اور آخر رجب ۱۲۸۳ھ/ (نومبر ۱۸۶۶ء) میں حضرت گنگوہیؒ کا فرمان نافذ ہوا تھا، اور ۱۲۸۴ھ/ (۱۸۶۷ء) کے ماہ صفر میں فرمان کی تعمیل کردی گئی۔ حضرت نانوتویؒ کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اتنی مدت کو بھی وہ بڑی مدت قرار دیتے ہیں؛ لیکن کل سات مہینے کی مدت، جس میں ایک کامل مہینہ رمضان کا، یعنی وہ مہینہ بھی ہے، جس کے متعلق حضرتؒ کا عام طرزِ عمل یہ تھا:

''اس میں رمضان شریف کا آجانا نہ لکھنے کا اور بہانہ ہوگیا''[1]۔

گویا سچ پوچھیے تو یہ کتاب چھ مہینوں ہی میں پوری ہوئی۔ حال آں کہ اس کی مجموعی ضخامت تین سو ساٹھ صفحات

(۱) آب حیات۔

مشتمل ہے، اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ حضرتؒ کے تالیفات رائقہ میں اس سے زیادہ مبسوط کوئی دوسری کتاب نہیں۔ اگر کتاب کی گنجان سطروں اور سطر کے درو بست پر نظر ڈالی جائے، تو اپنی ضخامت میں غالبًا حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے ''تحفہ''(۱) سے یہ ''ہدیہ'' کسی طرح کم نہیں قرار پاسکتا؛ مگر باوجودے کہ خاتمۂ کتاب میں یہ ارقام فرمایا جاچکا تھا کہ:

''اب لازم ہے کہ بس کیجیے، کیوں کہ کوئی بات مولوی صاحب (مولوی عمار علی) کی خرافات میں باقی نہ رہی، جس کا جواب شافی بفضلہٖ تعالیٰ اس رسالے میں درج نہیں ہوا''۔

لیکن جن کا علم کتابی نہیں؛ بلکہ عرش جنابی اور لا حسابی ہوتا ہے، بہ ظاہر ''کوئی بات طاق نہ رہی''، پھر یہی ''دریا ہم چناں باقی'' کا معاملہ سامنے آجاتا ہے۔ جب لکھنے پر پھر ان کی توجہ مبذول ہوجائے۔ حضرت والاؒ ارشاد فرماتے ہیں:

''چند سال گزرے کہ حسب ایمائے بعض بزرگانِ واجب الاطاعت (مولانا گنگوہیؒ) شیعوں کے جواب لکھتا تھا، (یعنی ہدیۃ الشیعہ لکھ رہے تھے)، اثنائے تحریر جواب میں طعن فدک میں من جانب اللہ یوں خیال میں گزرا کہ اگر حکم میراث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عام حدیث 'لانورث' کو موضوع اور غلط کہا جائے، تو یہ دعویٰ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو زبان زد عام اہل اسلام ہے، خود بہ خود باطل ہوجائے گا، اور اس دعوے کا منقوض ہونا منکروں کو کام آئے گا۔ الغرض آپ کی حیات حدیث مذکور کی مصدق اور حدیث مذکور دعوائے حیات کی مؤید نظر آئی''(۲)۔

بھلا جس خیال کے من جانب اللہ ہونے کے باوجود شدت ستر وکتمان کے خود تصریح فرماتے ہوں، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی تفصیلات پر جب نظر پہنچی ہوگی، تو حضرتؒ کا اس وقت کیا حال ہوا ہوگا؟ ''ہدیۃ الشیعہ'' لکھتے وقت تو اجمال ہی سے کام لیا گیا۔ خود فرماتے ہیں:

''بہ وقت تحریر مذکور (ہدیۃ الشیعہ) اتنا ہی لکھنے کا اتفاق ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنوز قبر میں زندہ ہیں، اور مثل گوشہ نشینوں وعزلت گزینوں کا مال قابل اجرائے حکم میراث نہیں ہوتا۔ ایسے ہی آپ (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کا مال بھی محل توریث نہیں''۔

مگر جس علم کا ایک کنارہ علم محیط حق سے ملا ہوا ہو، اس کی وسعت دامانی کے لیے کیا یہ چند سطریں کافی

(۱) ''تحفہ'' سے مراد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی ''تحفہ اثنائے عشریہ''۔ (ابن ش)
(۲) آب حیات، ص:۶۔

ہوسکتی تھیں؟ بہ ظاہر خیالات کے تلاطم سے حضرتؒ بے چین ضرور ہوتے تھے، لیکن جب تک بس چلا حسب عادت ان کو تحریر کی شکل عطا کرنے سے پرہیز ہی کرتے تھے، لیکن جو قدرت جن خیالات کو بقائے دوام کی سعادت سے سرفراز فرما چکی تھی وہ نہاں خانۂ دل و دماغ میں کب تک پوشیدہ رہتے؟

''رحمت حق بہانہ می جوید''

ایک بہانہ پیش آ گیا۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ:

''چند سال تحریر مذکور (ہدیۃ الشیعہ) ویسی ہی پڑی رہی، نظر ثانی کا اتفاق نہ ہوا؛ مگر اس سال ۱۲۸۶ھ/ (۱۸۶۹ء) قبل رمضان شریف سراپا کرم وعنایات مہتمم مطبع ضیائی، واقع میرٹھ، منشی ''محمد حیات'' نے تحریر مذکور مسمی بہ ''ہدیۃ الشیعہ'' کو چھاپنے کا ارادہ کیا، اور اس کی تصحیح میرے ذمے ڈالی''۔

جہاں تک بزرگوں سے معلوم ہوا ہے یہی مطبع ضیائی اور بعض دیگر مطابع کی تصحیح کا کام حضرتؒ کی گزر بسر کا ذریعہ تھا۔ بیان کرنے والوں نے بیان کیا ہے کہ دس پندرہ روپے مہینہ تصحیح کے کام سے مل جاتے تھے اور اس میں اپنی اور اہل خاندان کی اوقات بسری ہوتی تھی۔ خیر یہ بحث میرے موضوع سے بالفعل خارج ہے اور یہ مستقل مضمون ہے۔ بصائر وعبر کے خزانے جس میں پوشیدہ ہیں۔ آگے حضرتؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''چار و ناچار اس کاہل کو اصل تحریر کی نظر ثانی ضرور ہوئی''۔

اور یہی ''چار و ناچار'' والی نظر ثانی بہانہ بن گئی کہ جملہ راز کے خیالات منصۂ شہود پر آ جائیں۔ خود فرماتے ہیں:

''چوں کہ نظر ثانی بہ غرض تہذیب وتالیف ہوا کرتی ہے، تو اس نظر مکرر میں بہ مقتضائے وقت مجھے کمی وبیشی، ازالۂ حشو وجبر نقصان کا اتفاق ہوا، جب نظر ثانی کی نوبت مقام مذکور تک پہنچی، تو بہ غرض دفع بعضے اوہام متخیلہ یوں مناسب معلوم ہوا کہ اول تو اس دعوائے (حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم) کو موجہ کیا جائے۔ دوسرے اعتراض تعارض آیت کریمہ: ''اِنَّکَ مَیِّتٌ'' [1] اور علی ہذا القیاس اعتراض تعارض بعض احادیث کا جواب دیا جائے''۔

اور یہی ارادہ بنیاد بن گیا ایک مستقل تصنیف کا۔ کیسی مستقل تصنیف؟ کہ ''ہدیۃ الشیعہ'' کے صفحات اگر ۳۶۰ رہتے، تو اسی کتاب کے ایک مسئلے کی بحث وتوجیہ ۲۶۰ رصفحات تک پھیل گئی۔ گویا اصل کتاب کے دو ثلث کی مساوی۔ اسی کا نام ''آب حیات'' رکھا گیا۔

---

(۱) سورۂ زمر کی آیت نمبر ۳۰۔ ''اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ'' کی طرف اشارہ ہے۔ اس کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے یہ کیا ہے: ''بے شک تجھ کو مرنا ہے اور مقرر یہ سب مرنے والے ہیں جلد''۔ پھر جب کہ سب کو مرنا ہے، دوسرے کی صورت کا دیکھنا نادانی ہے۔ (گیلانی)

سفر حج وزیارت:

لیکن ابھی اس کتاب کی خصوصیتیں جنہیں میں بیان کرنا چاہتا تھا، ختم نہیں ہوئی ہیں۔ قصہ یہ ہوا کہ جب یہ طے ہی کرلیا گیا کہ اس خاص مسئلے پر الگ کتاب لکھی جائے اور لکھنے کا کام اس طریقے سے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، شروع ہو گیا، تو اچانک ایک لطیفۂ غیبی کا ظہور ہوا، جس کا حال حضرت والاؒ ہی کی زبان مبارک سے سننے میں مزا آ سکتا ہے، فرماتے ہیں کہ:

''ہنوز اس تقریر کے اتمام کی نوبت نہ آئی تھی کہ سامان غیبی باعث عزم سفر حج ہوا''(۱)۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ''سفر حج'' کے اس واقعہ سے جو واقف ہیں، وہ بجز ''سامان غیبی'' کے اس کی اور کیا توجیہ کر سکتے ہیں؟

خاک یسار نے اپنے محسن کریم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن قدس اللہ العزیز سے بہ راہِ راست اس کے کچھ تفصیلات خود سنے ہیں؛ مگر یہاں اپنے التزام کی وجہ سے ذکر کا موقع نہیں۔ اس وقت مجھے صرف اتنا اشارہ کرنا ہے، جن سامانوں کو راویوں نے غیبی قرار دیا ہے، خود صاحب روایت کی بھی تصریح موجود ہے کہ وہ ''غیبی'' تھے۔ بہر حال! اسی غیبی سامان کا نتیجہ یہ ہوا، جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

''آٹھویں شوال کو وطن سے رخصت ہو کر گردافشانی بیت اللہ اختیار کی''۔

گردافشانی کے اس سلسلے میں راہ میں ''میرٹھ'' بھی آیا۔ فرماتے ہیں:

''میرٹھ پہنچ کر تقریر مذکور کے رہ جانے کا ذکر آیا، تو منشی صاحب موصوف (یعنی منشی محمد حیات) بہ تاکید تمام باعث انجام ہوئے''۔

باعث انجام کیسے ہوئے؟ کام لینے والے حضرت والاؒ سے کس طرح کام لیتے تھے؟ چوں کہ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے۔ حضرتؒ ہی کے الفاظ میں بجنسہٖ نقل کرتا ہوں:

''(منشی محمد حیات نے) یہ فرمایا کہ غالباً بمبئی پہنچ کر بہ انتظار روانگی سفینۂ جہاز چند روز کا توقف ہو، پھر وہاں کچھ اور کام بھی نہ ہوگا، اگر اس عرصے میں تمام کر کے میرٹھ روانہ کیا جائے، تو پھر یہ ارمان کہ ''ہدیۃ الشیعہ'' چھاپا تو کیا چھاپا، طعن میراث فدک کے جوابوں میں جو کہ جواب تھا، وہ ہی نہ چھاپا''۔

رگِ حمیت وغیرت پر یوں مذاق شناسان حضرت قاسمی نشتر زنی کرتے تھے۔ منشی جی کا نشتر کامیاب ہوا، ارقام فرماتے ہیں:

---

(۱) آب حیات، ص:۳۔

''ان کے اصرار پر مجھ سے انکار نہ ہوسکا''۔

آخر مسودہ ساتھ بمبئی روانہ ہوا؛ مگر جو اپنے کو مٹا چکا تھا، قدرت ہر کہ ومہ کے دماغ میں اس کو اس کی عظمت کو جما چکی تھی۔ جہاز کے انتظار میں یہ واقعہ ہے کہ حجاج کو بمبئی میں بسا اوقات ہفتوں مفت گزارنے پڑتے ہیں، اور عام لوگوں کو اجنبی شہر میں تنہائی کی سخت پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ اگر حضرتؒ کا شمار بھی عوام میں ہوتا، تو منشی محمد حیات کا خیال کہ وہاں کچھ اور کام بھی نہ ہوگا، پورا ہوتا؛ مگر جہاں تک میرا خیال ہے: بمبئی میں ملنے جلنے والوں سے فرصت حاصل کرنا حضرتؒ جیسی ہستی کے لیے آسان نہ تھا؛ کیوں کہ کچھ بھی ہو، بمبئی کا یہ سفر ظاہر ہے، جیسا کہ گزر چکا ۱۲۸۶ھ/(۱۸۶۹ء) میں ہوا۔ حضرت والاؒ کی عمر اس وقت چالیس کے لگ بھگ تھی، اور اس عمر میں ہندوستان کا ایسا پڑھا لکھا مسلمان کہاں رہتا تھا، جو آپ سے واقف نہ تھا۔ مشکل سے اس کے بعد آپ کو دس سال اور دارِ فانی میں رہنے کا موقع ملا۔ پس وہ جو کچھ ہوئے، میرا خیال ہے کہ اس وقت تک وہ سب کچھ ہو چکے تھے۔ آخر عمر میں حج کا گویا یہ سفر درپیش تھا؛ مگر بہرحال حضرتؒ نے بجائے اس کے ارقام فرمایا کہ:

''کچھ دن بہ وجہ کاہلی امروز فردا میں گزرے (میرے خیال میں یہی ملنے جلنے کا زمانہ ہے)، اور کچھ دن بیماری کے بہانے میں رائیگاں گئے''۔

مجھے اس کا پتہ نہ چل سکا کہ رائیگاں جانے والے دنوں کی مدت کیا تھی، تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیام نے ذرا طول پکڑا، اور آخر میں آپ کو کچھ فرصت بمبئی میں میسر آئی۔ خود فرماتے ہیں:

''آخر ایام قیام میں طبیعت پر بوجھ ڈال کر بیٹھا، جوں توں بن پڑا پانچ یا چار دن میں تمام کیا''۔

خدا ہی جانتا ہے کہ ۲۶۰ رصفحات کا کتنا حصہ ان چار پانچ دنوں میں لکھا گیا؛ مگر غالب قرینہ ہے کہ ''آبِ حیات'' کا بڑا حصہ بمبئی میں مکمل ہوا۔ طے تو یہ ہوا تھا کہ مکمل کر کے مسودہ منشی صاحب کو بھیج دیا جائے گا؛ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؒ کو اپنا یہ کام خود پسند آیا، اور بجائے میرٹھ بھیجنے کے اور ہی خیال سامنے آ گیا۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب ''فتوحاتِ مکیہ'' کے متعلق لکھا ہے کہ: لکھنے کے بعد اس کے اوراق بامِ کعبہ پر پھیلا آتا تھا، اور دعا کرتا تھا کہ جہاں جہاں غلطیاں ہوں، انہیں مٹا دیا جائے۔

حضرت والاؒ بھی مکۂ معظمہ ہی تشریف لے جا رہے تھے، اور اتفاق سے بجائے ایک قبلہ کے جیسا کہ خود لکھا ہے، ان کے سامنے دو قبلے تھے۔ ان کے ہی الفاظ ہیں کہ:

''مکۂ معظمہ پہنچ کر دونوں قبلوں کی زیارت سے مشرف ہوا''(۱)۔

(۱) آبِ حیات، ص:۴۔

مطلب یہ ہے کہ مکۂ معظّمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ حضرت والاؒ کے پیر ومرشد بھی جلوہ فرمائے مسند ارشاد تھے، اور ''کعبۂ مطہرہ'' کے سوا دوسرے قبلے سے اشارہ ان ہی کی ذات گرامی کی طرف ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''(پہلا قبلہ): بیت اللہ، (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفاً وَّعِزَّةً اِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ) کا طواف میسر آیا۔ (دوسرا قبلہ): حضرت پیر ومرشد ادام اللہ فیوضہ کی قدم بوسی سے رتبۂ عالی پایا''(۱)۔

خیر جب بجائے ایک قبلے کے دو دو قبلے ان کے مکۂ معظّمہ میں موجود تھے، خصوصاً موخر الذکر قبلہ حضرت پیر ومرشد تو ایک جیتے جاگتے زندہ قبلہ تھے، خیال آیا، جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

''بہ امید ہائے چند در چند ایک بار حضرت پیر ومرشد ادام اللہ فیوضہ کے گوش گزار کر دینا یا ملاحظۂ اقدس سے کر لینا ضروری سمجھا''۔

اور یہ ہی ضرورت تھی، جس کی تکمیل کے لیے فرماتے ہیں کہ:

''اوراق مسودہ کا پشتارہ باندھ کر جہاز پر چڑھا''۔

اس کے بعد خامۂ نیاز شمامہ سے جو الفاظ بے ساختہ نکل پڑے ہیں، پچھلوں کے لیے پہلوں کے ان نقوش میں اگر چاہیں، تو بڑے اسباق پوشیدہ ہیں۔ فرماتے ہیں اور کتنی شکستہ دلی سے فرماتے ہیں:

''جہاز پر چڑھا تھا اور محض بہ امداد خداوندی باوجود گم راہی اور نامہ سیاہی کے جس کی وجہ سے اپنی رسائی تو در کنار، ہم راہیوں کی گم گشتگی کا بھی اندیشہ تھا، دریا پار ہو کر جدہ پہنچا اور وہاں سے سواری شتر دو روز میں دونوں قبلوں کی زیارت سے مشرف ہوا''(۲)۔

کتاب کے متعلق آگے کیا ہوا؟ اس کا قصہ تو رہ جا رہا ہے؛ لیکن اس سلسلہ میں اپنے موضوع بحث کے اعتبار سے مجھے تو ایک مفصل چیز مل گئی، یعنی اسی ''آب حیات'' کی وجہ سے تصنیف کے ذیل میں حضرتؒ کے حج وزیارت کے سفر نامے کے بعض اہم اجزا ہاتھ آ گئے۔

۸/ شوال ۱۲۸۶ھ/ (۱۱/ جنوری ۱۸۷۰ء) کو نانوتہ سے روانہ ہونا، میرٹھ پہنچنا، میرٹھ سے بمبئی، بمبئی میں کچھ دن کے لیے بیمار ہو جانا، بالآخر بہ سواری جہاز جدہ پہنچنا، اور جدہ سے اونٹ پر دو دن میں مکۂ معظّمہ پہنچنا، یہ سارے اجزا اسی قصے کے ذیل میں ہم راست ہو گئے۔ آئندہ حضرتؒ کے مستقل سیرت نگار کے لیے مواد کا کام دے سکتا ہے۔

---

(۱) آب حیات، ص:۴۔

(۲) ایضاً، ص:۴۔

خیر میں تو ''آب حیات'' کی تصنیف کا ذکر کر رہا تھا۔ مکۂ معظّمہ پہنچنے کے بعد حضرت والاؒ نے اس مسودے کو اپنے پیر ومرشد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش فرمایا۔ لکھتے ہیں:

''بہ وجہ تہی دستی دین و دنیا اور کچھ پیش کش نہ کر سکا، اوراق سیاہ مسودہ مذکورہ کو پیش کر کے رسم پیش کش بجالایا''۔

مرشد العجم والعرب کے دربار میں کن کن لوگوں کی طرف سے کیا کیا چیزیں پیش ہوتی ہوں گی؟ اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے؛ لیکن جس کے پاس کچھ نہیں تھا، وہ اپنے اسی مسودہ در بغل کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔ دوسروں کی نظروں میں اوراق پریشاں سے زیادہ جس مسودے کی حیثیت نہ تھی، وہ ہدیہ قبول ہوا، اور اس شان سے قبول ہوا کہ حضرت والاؒ خود فرماتے ہیں:

''شکر عنایات کس زبان سے کیجیے کہ اس ہدیۂ مختصرہ کو قبول فرما کر صلہ اور انعام میں دعائیں دیں''۔

مادی منافع اور مرئی ومحسوس مفادات ہی کو غشاوہ بنا کر قدرت نے جن آنکھوں پر چڑھا دیا ہو، ظاہر ہے کہ ان کی نگاہوں میں نہ اس پیش کش ہی کی کوئی قیمت ٹھہر سکتی ہے، اور نہ اس صلے وانعام کی؛ لیکن پیش کرنے والا بھی دیدہ ور تھا، اور جس کے سامنے پیش کیا گیا تھا، وہ بھی صاحبِ نظر تھا۔ اور اس عجیب وغریب مبادلہ سے دونوں راضی تھے۔ ایسے راضی کہ شاید رضا ومسرت کی جو کیفیت طرفین کو اس میں دین کے سلسلے میں حاصل ہوئی، شاید ہی کسی اور معاملے میں میسر آئی ہو، اور ''پیر کی دعاؤں کو صلہ وانعام'' قرار دینا، تو ہو سکتا ہے کہ جوش عقیدت کا نتیجہ ہو؛ لیکن اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ امام العلماء دار العلوم دیوبند کے ہزار ہا فاضلوں میں آج جو ہستی گرامی ''سرحلقہ'' کا مقام حاصل کیے ہوئے ہے، اور جس کے متعلق یہ دعویٰ قطعاً اغراق وغلو کے شائبہ سے پاک ہے کہ علمی نظریات اور اجتہادی تفردات کی بنا پر صرف ہند ہی کی تاریخ نہیں؛ بلکہ اسلام کی پوری علمی تاریخ مشکل ہی سے اس کی چند مثالوں اور نظریوں کی پیش کر سکتی ہے۔ سنتے ہو! وہی اپنی سب سے آخری تحقیقاتی واجتہادی کتاب کے متعلق بغیر کسی تصنع اور سخن سازی کے اقرار کرتا ہے کہ اکتسابی علم کی پرواز جس کی مشکوۃ وجلالین سے آگے نہ تھی، محض اس کی توثیق وتصحیح کے بعد اپنی اس کتاب کے مضامین سے طمانیت پذیر ہوا۔ حضرت والاؒ کے الفاظ طیبہ یہ ہیں:

''علاوہ بریں (یعنی دعاؤں کے صلے وانعام کے علاوہ) 'تصحیح وجدانی' اور 'تحسین زبانی' سے اس ہیچ مداں کی اطمینان فرمائی، اپنی کم مائیگی اور ہیچ مدانی کے سبب جو تحریر مذکور کی صحت میں تردد تھا، رفع ہو گیا۔

جو جانتا تھا، وہ نہ جاننے والے سے مطمئن ہوا۔ نادانستگی نے دانست پر مہر توثیق ثبت کی۔ گو سننے میں

یہ عجیب ہے؛ لیکن جب واقعہ بھی پیش آیا اور خود صاحب واقعہ کی شہادت کی بنیاد پر پیش آیا، تو اس کے ماننے میں کسی کو کیوں تردد ہو؟ اور سچ تو یہ ہے کہ ''تصحیح وجدانی'' کے ساتھ انسانی فطرت اگر اپنی فطرت پر باقی ہو، جتنا مطمئن ہوسکتی ہے، ''تصحیح دماغی'' پر اتنا اعتماد مشکل ہے۔ آخر بنیا کے مقابلے میں دنیا کے کتنے فلاسفہ کو کامیابی حاصل ہوئی؟ حضرتؒ نے ''تصحیح وجدانی'' کے ایک لفظ سے ان تمام دغدغوں کو مٹا دیا، جو بہ ظاہر عام دماغوں میں اس واقعہ کے سننے کے بعد پیدا ہوسکتے تھے۔

علوم نبوت اور علوم حکمت کے درمیان جو فرق عظیم ہے، صرف ایک کلمہ نے اس کو بے نقاب کر دیا۔ ''دماغی تصحیح'' کے ذرائع تو ہر جگہ ہر زمانے میں ارزاں ترین داموں پر خریدے جاسکتے ہیں؛ لیکن ''وجدانی تصحیح'' کی روشنی تو صرف ان ہی کا حصہ ہے، جو ازل سے طالع بلند لے کر اس دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ ہند سے چل کر سرزمین عرب میں حضرتؒ کو تصحیح کا یہ قدرتی ذریعہ مل گیا۔ نشاط و مسرت کی جو لہریں اس یافت نے آپ کے دل میں پیدا کیں، ان کا اندازہ ان چند الفاظ سے ہوسکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

''پھر یہ کوئی سمجھے تو (یعنی وجدانی تصحیح کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ تو کرے) اور متعجب ہو کہ قاسم نادان کی تحقیق اور ایسی مستحسن وصحیح؟''

طائر خامہ اس کے بعد جوش میں آ گیا ہے، اور بے ساختہ: ؎

زبانِ گنگ وچنیں نغمہ خوش آیندہ

کی زمزمہ سنجیوں میں مصروف ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؒ پر ایک حال طاری ہے۔ اس مصرعہ کو ارقام فرمانے کے بعد لکھتے ہیں، اور کتنی سرمستی و وارفتگی کے ساتھ لکھتے ہیں:

''میں کہاں اور یہ مضامین عالی کہاں؟ یہ سب اس شمس العارفین (صاحب تصحیح وجدانی) کی نور افشانی ہے''۔

اسی سلسلے میں ''وجدانی تصحیح'' کے راز سے پردہ بھی اشاروں ہی اشاروں میں ہٹاتے چلے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''یہاں میں بھی مثل زبان و دست وقلم، واسطہ ظہور مضامین مکنونہ دل عرش منزل ہوں''۔

ہر چیز سے ٹوٹ کر وجدانی راہوں کی مصححہ چیزوں میں انسانیت کیوں ڈوب جاتی ہے؟ صرف ''دل عرش منزل'' کے چند الفاظ میں اس کا جواب مستور ہے۔ یہ دل بھی اگرچہ رہتا ہے بشری قالب ہی میں؛ لیکن سب سے بھاگ کر جو عرش والے ''الرحمٰن'' ہی کے سائے میں سکون حاصل کر لیتا ہے، اور وہی اس کا مسکن بن جاتا ہے۔ اگر ''الرحمٰن'' بھی اس دل پر مستوی ہو کر براجمان ہو جائے، تو بتایا جائے کہ اس کے سوا

کیا دوسری صورت بھی ممکن ہے؟ پھر جس دل پر ''الرحمٰن'' مستوی ہو، اگر وہ ''الرحمٰن'' کا عرش نہیں ہے، تو اور کیا ہے؟ اور جس زبان کا تعلق رحمٰن کے اس عرش سے ہو، بھلا اس کی تصحیح کا دنیا کی کوئی دوسری تصحیح مقابلہ کر سکتی ہے؟

کتنے کتب خانے جلائے گئے اور کتنی کتابیں دھو دی گئیں؟ جب آدم کی اولاد کو ان ''عرش منزل'' والے قلوب سے زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے کا سنہرا موقع ہاتھ آیا ہے۔ یہی انسان کی فطرت ہے، اور انسانیت کی پوری تاریخ اس کی شاہد ہے۔

خیر! میں کیا کہنے لگا، بات یہ ہو رہی تھی کہ حضرت والا کو سب سے بڑی خوشی اس کی تھی کہ اپنی دماغی کاوشوں کی تصحیح کا ایک ''وجدانی'' ذریعہ ان کو مل گیا، اور:

''تحریر مذکور کی صحت میں جو تردد تھا، رفع ہو گیا''۔

تسمیۂ کتاب:

بہ ظاہر شروع میں یہ مسودہ اس لیے لکھا گیا تھا کہ ''ہدیۃ الشیعہ'' کا جز بن کر شائع ہوگا؛ لیکن جب اس کے ساتھ یہ اتفاقی واقعات پیش آئے، نیز ضخامت بھی کافی بڑھ گئی۔ یعنی اصل کتاب کے دو مثلث کے قریب؛ اس لیے:

''حسب ایما ہدایت انتباہ حضرت مخدوم عالم پیر و مرشد برحق اس طرف مشیر ہوا کہ تقریر اثبات حیات سید الموجودات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو 'ہدیۃ الشیعہ' سے جدا کر کے جدا نام رکھ دیجیے''(۱)۔

اور یوں اس تقریر نے ایک مستقل کتاب کی شکل اختیار کر لی۔ نام کیا رکھا جائے؟ تسمیہ کے وجوہ کی خود تفصیل فرماتے ہیں:

''سو بہ ایں نظر کہ یہ تقریر اولاً مثبت حیات خلاصۂ موجودات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوات والتسلیمات ہے''۔ دوسرے اس اثبات سے اس مردہ دل کو امید زندگانی جاودانی ہے، مع ہذا منشی محمد حیات صاحب موصوف گونہ اس بابت میں متقاضی ہوئے، یوں مناسب معلوم ہوا کہ اس رسالے کا نام 'آب حیات' رکھا جائے''۔

تسمیہ و نام رکھنے کے ان وجوہ ثلاثہ میں میرے نزدیک بڑی بصیرت ہے۔ ان کے لیے جو بہت کم پانے

---

(۱) آب حیات، ص: ۵۔

کے بعد ہی اپنے سامنے پھر کسی کو پانا نہیں چاہتے؛ لیکن جس کو ایک ''آب حیات'' ہی کیا، خدا جانے علوم و معارف کے اور کتنے چشمہ ہائے حیوان ملے؟ اگر ایک طرف اپنی کتاب کے نام رکھنے میں اس کی نگاہ اس بلندی پر ہے کہ امکان و جود کا اس کے اوپر کوئی مرتبہ نہیں؛ لیکن ٹھیک عین اسی عروجی حال میں اس کی نظر اپنے ان نیازمندوں سے بھی نہیں چوکتی، جن کا شمار عام مولویوں میں بھی نہیں؛ بلکہ منشیوں میں تھا، جن کے یہی معنی ہیں کہ وہ عربی زبان سے تقریباً نابلند تھے۔ جیسا کہ اس زمانے کی اصطلاح کا تقاضا ہے کہ بغیر عربی جانے کے لفظ مولوی کا اطلاق کسی پر نہیں ہوسکتا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں تو جو فارسی بھی نہیں جانتے؛ بلکہ بہ قول بعض جو نماز کی التحیات اور سجود و رکوع کے تسبیحات سے بھی ناواقف ہیں، وہ مولانا کے خطاب سے مخاطب ہیں۔ بہر حال! حضرت والاؒ کی یہ خاص شان تھی کہ ''عرش منزل'' والوں کی محفل میں بھی زمین والوں کا خیال دماغ سے نہیں نکلتا تھا، جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ کتاب کا انتساب ''خلاصہ موجودات علیہ وعلی آلہ الصلوات والتسلیمات'' کی طرف فرماتے ہوئے ہمارے منشی محمد حیات کو بھی نہیں فراموش فرمایا گیا، جو:

''گونہ اس باب میں متقاضی ہوئے''۔

اور ''برزخ کبریٰ'' کے اتباع صادق کے یہی صحیح نتائج ہیں کہ متبع کی زندگی کے ہر شعبے میں متبوع (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت کی جھلک نظر آئے۔ وجہ تسمیہ میں بلندی و پستی کے ان دو لفظوں کے سوا ایک اپنی غرض بھی پوشیدہ فرمادی گئی۔ کتنی شکستگی کے ساتھ اس کا اظہار فرمایا گیا ہے:

''اس اثبات سے اس مردہ دل کو امید زندگانی جاودانی ہے''۔

علما کی دوات کی روشنائی شہدا کے خون سے تولی جائے گی، اگر یہ روایت صحیح ہے، اور لفظاً کچھ شبہ بھی ہو، تو معناً اس کے امکان کا کون انکار کرسکتا ہے؟ آخر یہاں بھی تو اسی ''اسلام''، اسی ''کلمۃ اللہ'' کی بلندی کے لیے روئے زمین پر نہیں، روئے اوراق پر خون، بدن پر نہ سہی، بہانے والے کیا خون جگر نہیں بہاتے؟ پس ''آب حیات'' سے زندگانی جاودانی کی جس نے امید لگائی تھی اگر اسے:

''بَلْ أَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ''(۱)۔

''بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے مقرب ہیں، ان کو رزق ملتا ہے''۔

کی زندگی میسر آتی ہو، تو اس پر تعجب کیوں کیجیے؟ جن کی آنکھیں ہیں، انہوں نے دیکھا ہے، اور جن کے کان ہیں، انہوں نے سنا ہے، پھر اندھوں اور بہروں سے میں کیوں پوچھوں؟ اور یوں ''آب حیات'' کی تصنیف کی وہ داستان جس کا میں ذکر کرنا چاہتا تھا ختم ہوگئی۔

---

(۱) سورۂ آل عمران: ۱۶۹۔

ہاں! ابھی ایک چیز اس سلسلے کی اور باقی ہے۔ حضرتؒ کے گزشتہ بالا بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ''مسودہ'' بمبئی میں اتمام کو پہنچا تھا، وہی ان قصوں کے بعد ''آب حیات'' کے نام سے موسوم ہوا؛ لیکن آگے جو عبارت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسودے کے نفس مضامین اور دعاوی کی ''وجدانی تصحیح'' سے آپ مطمئن ہو گئے، تو خیال یہ گزرا کہ ان ہی مضامین اور خیالات کو پھر دوسری دفعہ ذرا زیادہ واضح الفاظ میں لکھا جائے، اور جہاں تک میرا خیال ہے ''آب حیات'' کی موجودہ شکل ان مضامین مصححہ کی دوسری تعبیر ہے، اور اس ''جدید تعبیر'' کے ساتھ کتاب کا آغاز بجائے نانوتہ کے اور اختتام بجائے بمبئی کے، جیسا کہ خود ارقام فرماتے ہیں:

''دل میں یہ ٹھان کر (یعنی جدید تعبیر کے ساتھ دوبارہ تالیف کے ارادے کو طے کر کے) قلم اٹھایا، اور ٹھہرائی کہ شروع تو خدا کے گھر سے کیجیے، اور بن پڑے تو بوسہ گاہِ عالم درسرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اختتام کو پہنچا دیجیے، تا کہ ابتدا اور انتہا دونوں مبارک ہوں''(۱)۔

مضامین کی صحت کا وثوقہ تو ''وجدانی تصحیح'' کی راہ ہی سے مل چکا تھا، لیکن ابھی ایک اور راہ باقی تھی، عقلی تصحیح پر بھروسا کرنے والوں کے لیے یہی طریقہ عجیب تھا، اب اس پر مزید اضافہ یہ ہوتا ہے کہ ''خدا کے گھر'' اور ''درسرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم'' جو حضرتؒ کے الفاظ میں ہے، بہ ظاہر ان جمادی حقایق ''بوسہ گاہ عالم'' کے ماحول میں بھی ان کو صحت کی شعاعیں نظر آتی تھیں۔ حسن اتفاق سے اس ''جمادی تصحیح'' کا موقع بھی میسر آ گیا تھا۔ فرماتے ہیں کہ اگر پوری کتاب ان دنوں مقامات میں ختم نہ ہو سکتی تو:

''جس قدر بن پڑے غنیمت ہے؛ کیوں کہ اس وسیلہ سے اس ظلوم جہول کو امید صحت اور ظن قبول ہے''۔

وجدانی تصحیح سے تو گویا:

''تحریر مذکور میں جو تردد تھا، رفع ہو گیا''۔

لیکن ان ''جمادی مصححوں'' سے علاوہ صحت کے ایک اور توقع کا اضافہ ہو گیا۔ یعنی یہ امید بھی وابستہ ہوئی کہ ان مقامات متبرکہ کے صدقے میں ہو سکتا ہے کہ کتاب ''حسن قبول'' کی دولت سے سرفراز ہو۔ آج اینٹ اور پتھر کے ان مجموعوں سے کون آس لگا سکتا ہے؟ لیکن جن کی نگاہیں ''گھر'' کے ساتھ ''گھر والے'' پر بھی ہوں، اور ''در'' کے ساتھ صاحب در'' پر بھی، آپ انہیں کیوں مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی ان ہی ناامیدیوں میں مبتلا رہیں، جن میں ہرنہ دیکھنے والا قدرتاً مبتلا ہو سکتا ہے؟

(۱) آب حیات، ص:۶۔

تکمیل کتاب:

الغرض مذکورہ بالا مصالح کو پیش نظر رکھ کر حضرتؒ نے مسودے کی ''توتعبیر جدید'' کا کام شروع کر دیا۔ حج کا کاروبار تو ایام تشریق تک پورا ہو چکا ہوگا۔ اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالحجہ کی ۲۵؍تاریخ تک آپ کا قیام مکۂ معظّمہ ہی میں رہا، اور اسی عرصے میں آغاز کے کام میں ہاتھ لگایا گیا۔ خود ہی ارقام فرماتے ہیں:

''سو خیر! تادم تحریر سطور تو یہ کم ترین آستانۂ خداوندی پر جبہ رسا ہے، اور پرسوں پچیس ذوالحجہ سنا ہے کہ مشتاقانِ زیارت کا مدینۂ منورہ کا ارادہ ہے''۔

''مشتاقانِ زیارت کا'' تو خیر وہ ارادہ ہی تھا؛ لیکن حضرتؒ بھی اس اشتیاق میں شریک تھے؟ کس خوبی سے اس پر پردہ ڈال جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا فقرے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

''مشتاقانِ زیارت کی رکاب تھامے ایک 'ننگ امت' اپنے ننگ امت ہونے کے احساس کے ساتھ امت کے پیشوا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گاہ کی طرف جا رہا ہے۔ اس کیفیت کو پیش نظر رکھیے اور دلوں میں ایمان کا اگر ذوق ہو، تو اس کے مزے لیجیے، اپنے دلوں کو توڑ کر ٹوٹے ہوئے دلوں میں بسنے والے[1] کو بسانے والے یوں ہی بساتے ہیں:

خدا رحمت کند بر عاشقان پاک طینت را

افسوس کہ اس کے بعد یہ قصہ ختم ہو گیا، اور یہ ارقام فرما کر کہ: ''اب لازم ہے کہ مطلب کی بات کیجیے''۔

حضرتؒ نے اپنا مطلب شروع کیا اور میرا مطلب ختم ہو گیا۔ خیر اور کچھ نہیں تو جہاں ''سفر حج'' کے کچھ اجزا پہلے فقروں سے ہاتھ آئے، اس آخری فقرے سے ''سفر زیارت'' کے متعلق اتنا تو معلوم ہوا کہ مکۂ معظّمہ سے آپ کا قافلہ زیارت روضۂ مطہرہ کے اشتیاق میں پچیس ویں ذوالحجہ کو روانہ ہونے والا تھا، اور حضرتؒ بھی اسی قافلے میں وہاں پہنچنے کے لیے تیار ہو گئے تھے، جہاں پہنچنا اس ناسوتی زندگی کا ہر مؤمن عشق باز کے لیے آخری مقصد ہو سکتا ہے۔ میرے دائرۂ بحث سے بات باہر ہو جائے گی، اگر اس سلسلے میں اپنی معلومات یا دوسرے ذرائع سے کچھ اور اضافہ کروں؛ کیوں کہ مجھے تو خود کچھ کہنا نہیں ہے۔ اپنے متعلق حضرتؒ نے جو کچھ مختلف مقامات میں جستہ جستہ طور پر کہا ہے صرف اس کا نقل کرنا مقصود ہے، اور اس بحث کو اب اسی پر ختم کر کے دوسرے پہلوؤں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

تصنیفات کے ذیل میں ''آب حیات'' ہی کے متعلق میں کچھ کہنا چاہتا تھا، اس سے فارغ ہو چکا۔ اب میں آپ کی زندگی کے ایک اور خاص پہلو کے متعلق خود آپ ہی کی کچھ تصریحات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

---

(۱) مشہور حدیث قدسی کی طرف اشارہ ہے، جس میں: ''أَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ''، ''میں ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس رہتا ہوں'' کے الفاظ میں غیب مغیب میں رہنے والے نے ڈھونڈنے والوں کو اپنا نشان اور پتہ دیا ہے۔ ''فَهَلْ مِنْ مُتَجَسِّسٍ''؟ (گیلانی)

تیسرا باب:

سیرت جلیلہ کا ایک زریں ورق: رڑکی کا میدانِ مناظرہ

حضرت مولاناؒ اور پنڈت دیانند سرسوتی:

اتنا تو تقریباً ہر شخص کو معلوم ہے کہ دیانندی فتنے کی ''موسائیت'' کے لیے قدرت نے حضرت والاؒ ہی کا انتخاب کیا تھا؛ لیکن دونوں کے دل چسپ تعلقات کا ذکر بجائے دوسروں کے اگر خود حضرتؒ ہی کی زبانِ مبارک سے سنا جائے، تو غالباً وہ زیادہ مؤثر ہوسکتا ہے۔ ''قبلہ نما'' کے شروع میں اس کے بعض اجزا کا ذکر آ گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''بارہ سو پچانوے آخر رجب (۳۰ر جولائی ۱۸۷۸ء) میں پنڈت دیانند صاحب نے رڑکی میں آ کر سر بازار مجمع عام میں مذہب اسلام پر چند اعتراض کیے''۔

اور یہ شہادت ہے اس بات کی کہ ایک مجہول الوطن (۱)، مجہول القبیلہ شخص کا اچانک خاص کر کے ہندوستان کے ایسے علاقے میں، جو پرجوش مسلمانوں کا خصوصی مرکز تھا۔ یعنی ''روہیل کھنڈ'' میں پہنچ کر ''بر سر بازار مجمع عام'' میں اس علاقے کے باشندوں کے عام مذہب پر اعتراض کرنا، آخر اپنے پس پشت کس قسم کے عوامل رکھتا تھا؟ یہاں اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ دیانندی اعتراضوں کا یہ بازاری طریقہ عموماً ان ہی شہروں میں اختیار کیا جاتا تھا، جہاں فوجی چھاؤنیاں ہوتی تھیں۔ بہار کے صوبے میں حال آں کہ بے شمار شہر اور قصبات ہیں؛ لیکن پنڈت جی اس صوبے میں بر سر بازار عام مجمع میں جب مسلمانوں کے مذہب پر اعتراض کرنے کے لیے تشریف لاتے تھے، تو وہ نہ پٹنہ ہوتا تھا، نہ مونگیر، نہ ہزاری باغ، نہ گیا؛ بلکہ جب کبھی آپ کو اس حیثیت سے اس صوبے میں پایا گیا، تو اسی شہر میں جو سارے صوبے کا واحد کنٹونمنٹ، یا فوجی مستقر ہے، یعنی ''داناپور''۔ کون کہہ سکتا ہے کہ رڑکی کے بازار کا جو انتخاب مسلمانوں کے مذہب پر اعتراض کرنے کے لیے کیا گیا تھا، اس میں اس قصبے کی فوجی مرکزیت کو دخل نہ تھا؟

---

(۱) یہ عجیب بات ہے کہ پنڈت کی شخصیت جتنی معروف تھی آخر وقت تک بلکہ اس وقت تک ان کا وطن اور ان کا خاندان مجہول ہے۔ ان کے سوانح نگاروں نے بہت جستجو اور تلاش سے اب کچھ پتہ چلایا ہے، لیکن یقینی بات اب بھی نامعلوم۔ (گیلانی)

بہر حال! حضرتؒ کا بیان ہے کہ رڑکی میں پنڈت جی نے اپنے اعتراضات کا سلسلہ شروع کیا، مسلمان پریشان ہوئے، اور پنڈت جی کے مقابلے کے لیے انہوں نے حضرت والا کو دعوت دی۔ باوجود ان تمام خصوصیتوں کے جن کی تعبیر حضرتؒ اپنے الفاظ میں ''فطری کاہلی'' وغیرہ کے الفاظ میں فرماتے ہیں، بلانے کے ساتھ تشریف لائے۔ خود ارقام فرماتے ہیں کہ:

''حسب الطلب بعض احباب اور نیز بہ تقاضائے غیرت اسلام بہ ننگ اسلام بھی شروع شعبان میں وہاں پہنچا''۔

غیرت اسلامی:

گویا اواخر رجب میں پنڈت جی کا حملہ ہوا تھا، اور ابتدائی شعبان میں ان کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے مولانا مرحوم رڑکی میں موجود تھے۔ ظاہر ہے کہ اس عجلت میں محض احباب کے طلب کو دخل نہ تھا۔ جب بڑی بڑی ریاستوں کا طلب احباب نذر تغافل ہو چکا تھا، تو بچاری رڑکی کس گنتی میں تھی؟ لیکن اس عجلت کا اصل محرک سچ پوچھیے، تو حضرتؒ کا وہی بے پناہ جذبہ ''تقاضائے غیرت اسلام'' تھا؛ ورنہ یہ ہے کہ زندگی بھر جس جذبے نے ان کو کبھی نچلے نہ بیٹھنے دیا، گولیاں کھائیں، حکومت کے مجرم قرار پائے، مدتوں روپوش رہے، بالآخر وہی جذبہ دیوبند میں دار العلوم کی شکل میں بہہ نکلا۔ وہ یہی ''غیرت اسلام'' کا جذبہ تھا۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتے تھے؛ لیکن اسلام اور مسلمانوں کی ذلت و پستی ان کے لیے قابل برداشت نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک معمولی تحریک پر؛ بلکہ شاید خبر پانے کے ساتھ ہی وہ پنڈت جی کے سامنے آستین چڑھائے کھڑے نظر آئے؛ مگر افسوس! مولاناؒ کا یہ خیال کہ واقعی پنڈت جی تلاش حق اور تحقیق صداقت میں اسلام پر تنقید کر رہے ہیں، صحیح ثابت نہ ہوا، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اگر ابراہیم ادہمؒ کا اونٹ مکان کے بالا خانے پر نہیں ڈھونڈھا جا سکتا، تو ''حق کو بھی مجمع عام اور برسر بازار'' کوئی تلاش نہیں کرتا؛ مگر کیا کیجیے کہ پنڈت جی عمر بھر سچائی کو بازاروں اور عوام کی بھیڑوں میں تلاش فرماتے رہے۔ بڑے الم اور دکھ کے ساتھ حضرتؒ ارقام فرماتے ہیں کہ:

''آرزوئے مناظرہ میں سولہ سترہ روز وہاں ٹھہرا''۔

مناظرہ سے پنڈت جی کا گریز:

صرف ''غیرت اسلام'' کے احساس ہی کا دباؤ تھا جو رڑکی جیسے چھوٹے سے قصبے میں آپ کو نصف ماہ سے زیادہ دنوں تک رکا رہنا پڑا؛ ورنہ ٹونک کی ریاست کے لیے بھی معمولی کم زوری نانوتہ نہ چھوڑنے کا بہانہ

جس کے لیے بن جاتی تھی، خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہی بےضرورت رڑکی میں اپنا اتنا وقت کیا گزار سکتا تھا؟ خلاف دستور جو اپنے علم وفہم کے چھپانے پر عمر بھر مصر رہا، رڑکی پہنچ کر یہ دستور بالکلیہ ٹوٹ گیا۔ خود فرماتے ہیں:

''ہر چند چاہا کہ مجمع عام میں پنڈت جی سے اعتراض سنوں، اور بالمشافہہ بہ عنایت خداوندی اسی وقت ان کے جواب عرض کروں''۔

جو بڑے بڑوں کی بات پر کان لگانے کو اضاعت وقت خیال کرتا تھا، اور اسی کے ساتھ جو مجمع خواص میں بھی اپنے علم کی بھنک دوسروں تک پہنچانے میں شرماتا تھا، ''غیرت اسلام'' کی تڑپ نے ہر چیز سے دست بردار کر کے اسی کو بر سر بازار لاکر کھڑا کیا ہے، اور بازاریوں ہی کے سامنے وہ سب کچھ سننے کو اور اس سے بھی زیادہ اپنی سب کچھ کہنے کو تیار رہے؛ لیکن یہاں سننا اور سنانا مقصود بھی ہوتا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں:

''مگر پنڈت جی ایسے کاہے کو تھے، جو میدانِ مناظرہ میں آتے؟''

پنڈت جی کے اس طرز عمل سے حضرتؒ کو اتنی تکلیف پہنچی کہ اپنی طبیعت کے خلاف، یعنی ''با دشمناں مدارا'' کے اصول کو بھی ایک حد تک بالائے طاق رکھ دیا، حال آں کہ ابھی آپ دیکھ چکے کہ پنڈت جی کا نام انہوں نے اسی طرح لیا، جس طرح ایک شائستہ آدمی کو لینا چاہیے، یعنی ''پنڈت دیانند صاحب''۔ حال آں کہ اسی زمانے میں مولوی نور الدین (خلیفہ مرزائے قادیان) پنڈت جی کا ذکر بدترین الفاظ والقاب کے ساتھ کیا کرتے تھے، جس کی نہار کے لیے ان کی کتاب ''نور الدین'' کا مطالعہ کافی ہے۔ پھر اس کے جواب میں پنڈت جی سے بھی جو بن پڑتا تھا کمی نہ کرتے تھے؛ کیوں کہ ان کا تو یہی خاص میدان تھا۔ گاندھی جی ان کی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' کو دیکھ کر اسی بنیاد پر یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ ''اتنے کریہہ، فحش لہجے والی کتاب غالباً دنیا میں دوسری نہ ہوگی''(۱)۔

بہر حال! مولاناؒ کو انتظار کی تکلیف نے اتنا ستایا کہ اس سلسلے میں اتنا تو آپ کے قلم سے بھی نکل پڑا:

''(انہوں نے) جان چرانے کے لیے وہ وہ داؤ کھیلے کہ کاہے کو کسی کو سوجھتے تھے؟''

اور اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہندوستان کے اندر مختلف قسم کے فتنوں نے جو سر اٹھایا تھا، کہیں مسلمانوں میں ''اسلام'' کی ترمیم وتنسیخ کرنے والے حضرات، کہیں مسلمانوں کو مہدویانہ نبوت اور مسیحیانہ پیغمبری کی دعوت، کہیں ہندوؤں کے اندر شاستر اور پرانوں کا انکار، وید کی عجیب وغریب تفسیر، اور اسی سلسلے میں مسلمانوں پر بھی حملہ۔ الغرض یہ ساری باتیں یوں ہی کسی بخت واتفاق کے نتائج نہ تھے۔

(۱) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مخالف کیسا ہی ہو، اس کا نام ڈھنگ سے لینا چاہیے۔ بعض لوگ اس معاملے میں بڑے بے ڈھنگے ثابت ہوئے ہیں۔ ہمارے نئے آنے والے اہل قلم واہل علم بھی اس کا خاص خیال رکھیں۔ (نعمان)

یقیناً پردہ زنگاری کے پیچھے معشوقوں کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ مقصود ہی فساد ہو، بگاڑ سے بناؤ نہیں؛ بلکہ بگاڑ ہی مقصود ہو، تو اس کے سوا پنڈت جی کے لیے اور چارہ کیا تھا کہ ''داؤ پر داؤ کھیلتے چلے جائیں''۔ اور یہ قاعدہ بھی ہے کہ ہمیشہ اس قسم کے کاروبار کے لیے ان ہی لوگوں کا انتخاب ہوتا ہے، جو داؤ پر داؤ کھیل سکتے ہوں۔

پنڈت جی کی بعض شرائط:

مولاناؒ نے اس کے بعد پنڈت جی کے بعض داوؤں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اعتراض تو مجمع عام میں کیا، پر مناظرہ میں اپنی قلعی کھلنے کا وقت آیا، تو پچاس آدمیوں سے زیادہ راضی نہ تھے''۔

یعنی حضرتؒ کی خواہش تو یہ تھی کہ اسلام کی اہانت جس طرح برسر بازار روا رکھی گئی ہے۔ اسی طرح اس کے اعزاز کا نظارہ بھی برسر بازار ہونا چاہیے۔ غیرت اسلام کا احساس ان کو اسی پر مجبور کر رہا تھا؛ لیکن صرف حیلہ جوئی کے طور پر برسر بازار مناظرہ سے پنڈت جی نے انکار کر دیا، اور یہ فرمائش کی کہ بازار والے اعتراض کا جواب ہم زیادہ سے زیادہ پچاس آدمیوں کو مجمع میں سن سکتے ہیں۔ مولاناؒ نے لکھا ہے کہ میں نے اس پچاس کی قید کی وجہ پوچھی ''تو اندیشۂ فساد زیب زبان تھا''۔ یعنی عوام کے سامنے پنڈت جی کو اپنے پٹ جانے کا اندیشہ تھا، حال آں کہ یہ اندیشہ تو اس وقت زیادہ ہونا چاہیے تھا، جب بے چارے عامی مسلمانوں کے دلوں کو صرف مجروح کرنے کے لیے بازار میں انہوں نے یہ تماشا کھڑا کیا تھا۔ ماسوا اس کے اوروں سے تو پنڈت جی متعدد بار بھرے، مجمع میں مناظرے کر چکے تھے۔ مولاناؒ نے کہلا بھیجا کہ جب ان مناظروں میں حکومت کے انتظام پر بھروسا کر کے آپ میدان میں آئے، تو یہاں بھی تو وہی حکومت، وہی پولیس ہے؛ مگر پنڈت جی اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکے۔ خود فرماتے ہیں:

''کہ نہ پہلے مناظروں کی نظیروں کا کچھ جواب، نہ حسن انتظام سرکاری پر کچھ اعتراض، ٹلانے کے لیے دعویٰ بلا دلیل سے مطلب تھا''۔

پنڈت جی کے داؤ کس قسم کے ہوتے تھے؟ کچھ تو اندازہ مذکورہ بالا امور سے ہو سکتا ہے۔ سب سے دلچسپ بات اس سلسلہ کی یہ ہے کہ یہ شعبان کا مہینہ تھا، سترہ اٹھارہ روز یوں ہی گو مگو میں گزر گئے۔ پنڈت جی کو معلوم تھا کہ شعبان کے بعد مسلمانوں کے گھر وہ مہینہ آتا ہے، جس میں عام مسلمان عموماً اور حضرت مولاناؒ خصوصاً ہر قسم کے مشاغل سے دست کش ہو جاتے ہیں۔ یوں تو رمضان مسلمانوں کے لیے رحمت کا مہینہ ہے؛ لیکن اس وقت پنڈت جی کے لیے بھی وہ رحمت ہی بن گیا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں:

''رمضان کی آمد آمد ان کو بھی معلوم تھی، اور اسی وجہ سے امید تھی کہ کچھ دن ٹلیں، تو یہ لوگ آپ ٹل جائیں گے''۔

مگر مولانا پر''اہانت اسلام'' کے اس واقعہ سے کچھ ایسی چوٹ پڑی تھی کہ دل کسی طرح اس پر آمادہ نہ ہوتا کہ یوں ہی واپس چلے جاتے، اور جس کام کو انہوں نے شاید اب تک کسی کے ساتھ روانہ کیا تھا، اس راہ میں اسے بھی گوارا فرمالیا، فرماتے ہیں:

''اس لیے (یعنی تا کہ رمضان نہ آجائے اور پنڈت جی کو بہانہ مل جائے) منتیں کیں''۔

اللہ اللہ! جس نے دنیا کے لیے باوجود ہر قسم کے شدائد اور سختیوں کے کسی مخلوق کی آج تک خوشامد نہ کی تھی، آج دین کی غیرت کے نیچے دبا ہوا ہے، اور کسی مسلمانی میں، مسلمانوں کے دشمن اور اللہ ورسول کے باغی کی خوشامد پر مجبور ہوا ہے۔ گویا: ؎

میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

کبھی کبھی آدمی کو یہ بھی کرنا پڑتا ہے، اور مولاناؒ نے کیا؛ مگر پنڈت جی کا دل نہ پسیجا۔ جب منتوں کا جادو بے کار ثابت ہوا، تب دوسرے طریقے اختیار کیے۔ شاید کچھ اپنے اوپر قیاس کیا۔ فرماتے ہیں:

''غیرتیں دلائیں''۔

مگر غیرت کی کتیا مردوں کے سامنے کب آتی ہے؟ خواص کیا، عوام بھی جانتے ہیں کہ ؎

شرم چہ کتی ست کہ پیش مرداں بہ آمد

جب اس میں بھی ناکامی ہوئی، تب فرماتے ہیں کہ:

''حجتیں کیں، منتیں کرائیں''۔

یعنی دلائل کے زور سے چاہا کہ ان کو میدان میں اترنے پر مجبور کریں۔ اس سے بھی تھکے، تو مولاناؒ نے یہ حد کر دی کہ''مناظرہ'' کرنے کے لیے''سفارشیں بہم پہنچائیں۔ افسوس ان حجتوں اور سفارشوں کا علم نہ ہوسکا؛ ورنہ دل چسپ چیزیں ہوتیں؛ مگر سارا جھاڑ پھونک رائیگاں ثابت ہوا، اور چکنے گھڑے پر کوئی قطرہ نہ جم سکا۔ خود ہی بڑی مایوسی سے لکھتے ہیں:

''مگر (پنڈت جی) کے وہاں وہی نہیں کی نہیں رہی''۔

شاید''نہیں'' کی ضد کو توڑنے کے لیے منت، غیرت، حجت، سعی وسفارش کی جو منزلیں طے کی گئی تھیں، ان ہی منزلوں میں سے کسی منزل پر پنڈت جی کچھ ڈھیلے ہوئے تھے؛ لیکن یہ ڈھیلا پن بھی کیا تھا، مجمع عام جس میں انہوں نے اسلام کی تحقیر کی تھی، اس میں تو مقابلے سے گریز ہی رہا؛ البتہ پچاس آدمیوں کے

خلوت خانے میں کچھ تھوڑی سی توسیع منظور فرمائی گئی۔ مولانا کا بیان ہے کہ:

''عام مجمع کی جا، بدشواری دوسوتک آئے''۔

مگر یہ سوال اٹھا کہ یہ دوسو کا مجمع کہاں اکٹھا ہو؟ پنڈت جی جس مکان میں فروکش تھے، وہ تنگ تھا، اسی لیے خواہش کی گئی کہ بجائے اس مکان کے کسی دوسری جگہ ان دوسو آدمیوں کو جمع ہونے کا موقع دیا جائے، اور پھر وہیں عام کا مجمع نہ سہی، دوسو کی ہی محفل قدرت حق کا تماشا دیکھے؛ مگر پندت جی اپنے گھر سے پاؤں باہر نکالنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ حضرتؒ کے الفاظ ہیں:

''مگر اپنے مکان تنگ کے سوا اور کہیں راضی نہ ہوئے''۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ''مکان تنگ'' کو بھی تنگ آ کر حضرتؒ نے قبول فرمالیا؛ مگر مکان کے بعد سوال زمان، یعنی وقت کا اٹھا۔ ظاہر ہے کہ معاملہ کتنا اہم تھا، سچائی کی تلاش کا قصہ ہوتا، تو اس کے لیے ایک دن کیا، پنڈت جی کو ایک سال دینا چاہیے تھا۔ اسی ہندوستان میں مشہور ہے کہ مہاتما بدھ کی تلاش میں بیس سال تک جنگلوں جنگلوں مارے پھرے؛ لیکن جب غرض صرف ٹالنا ہو، تو بھلا وقت کے مسئلے میں بھی پیچیدگی کیوں نہ پیدا کی جاتی؟ معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؒ نے خواہش ظاہر فرمائی کہ ہم مسلمانوں کے لیے اطمینان کا وقت صبح کا ہوتا ہے کہ زوال کے بعد ہر چند گھنٹے کے بعد نمازوں کا قصہ چھڑ جاتا ہے؛ لیکن اطمینان کا وقت ہونا بھی تو پنڈت جی کے حق میں مضر تھا، اڑ گئے کہ صبح کا وقت کسی طرح نہیں دیا جا سکتا۔ اچھا پھر پچھلے پہر ہی دیتے؛ لیکن کچھ تو گنجائش دیتے۔ پنڈت جی کا یہ انتہائی ظلم تھا کہ حضرت والاؒ جیسے مقرر کے لیے ٹھیک وہ وقت آپ نے تجویز فرمایا، جس کے تھوڑی دیر بعد آفتاب غروب ہو جاتا ہے۔ یعنی چھ بجے شام، اور یہ تو معلوم ہی تھا کہ مغرب کی نماز مولاناؒ کو مخلوق کے سامنے سے ہٹا کر بہرحال خالق کے قدموں پر لے جا کر گرادے گی، اور یوں پنڈت جی کو رہائی مل جائے گی۔ حضرتؒ نے بڑے افسوس کے ساتھ اس ہٹ دھرمی کا ذکر فرمایا ہے۔ کہتے ہیں:

''وقت صبح کے بدلے چھ بجے شام کی ٹھہرائی''۔

بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھ بجے شروع ہونے والا جلسہ مغرب کی نماز پر ختم کر دیا گیا تھا؛ مگر مولانا نے اصرار کیا، تنگیٔ وقت کی شکایت کی، تب جیسا کہ خود ارقام فرماتے ہیں:

''کمی وقت کی شکایت کی تو نو بجے تک کی اجازت آئی''۔

مگر اس نو بجے میں جو گر چھپا ہوا تھا، اس کا قصہ حضرتؒ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''مطلب یہ تھا کہ ہماری فرودگاہ؛ بلکہ شہر سے ان (پنڈت جی) کا مکان ڈیڑھ میل پر تھا''۔

پنڈت جی کا کمال اور اس کی حقیقت:

حضرت شیخ الہند (مولانا محمود حسن) رحمۃ اللہ علیہ سے خاک سار نے سنا تھا کہ یہ مکان کسی ہندو کے باغ میں تھا۔ حضرتؒ نے بطور لطیفہ کے یہ بھی فرمایا تھا کہ: ہم لوگ تو ان دنوں نو جوان تھے، خیال آیا کہ ذرا پنڈت جی کو چل کر دیکھنا چاہیے، چند ساتھیوں کے ساتھ رڑکی سے روانہ ہوئے، ہندو کے باغ میں پہنچے، اتفاق سے اس وقت پنڈت جی کی رسوئی کا وقت تھا، چوں کہ پر جمے ہوئے تھے، حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ: پتے پر زمین سے اوپر تک پوریوں کی اتنی بڑی تھاک جمی ہوئی تھی کہ ہم لوگ تو دیکھ کر دنگ ہو گئے کہ اخر یہ کُل پوریاں تنہا یہ شخص اپنے اندر کیسے اتار لے گا؟ لیکن چشم زدن میں دیکھتا ہوں کہ پتوں کے سوا پنڈت جی کے سامنے اور کچھ بھی رکھا نہ تھا۔

ہم لوگ اس تماشے کو دیکھ کر جب شہر واپس ہوئے حضرت الاستاذؒ (یہ عام لفظ حضرت نانوتویؒ کے متعلق شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک پر جاری تھا) سے آ کر عرض کیا کہ: حضرت! اور تمام باتوں میں پنڈت جی سے ممکن ہے، آپ بازی لے جائیں؛ لیکن آج ان کے جس کمال کو ہم لوگ دیکھ کر آئے ہیں، اس میں مقابلہ مشکل ہی نہیں، آپ کے لیے ناممکن ہے۔

ارشاد فرمایا کہ: ایسا کون سا کمال ہے؟ ہم لوگوں نے پوریوں کا حال عرض کیا، متبسم ہو کر فرمایا: اور اس وقت بھی باوجودے کہ مذاق کی بات تھی، حکمت کے پھول برسانے لگے۔ ارشاد ہوا کہ:

> ’’میاں! ہم کمال میں مقابلہ کرنے آئے ہیں، اور پُرشکمی یا بسیار خوری؛ یہ کمال نہیں؛ بلکہ نقص ہے۔ کمال تو اس کو کہتے ہیں، جس سے صاحب کمال میں بے نیازی اور استغنا پیدا ہو، اور بسیار خوری تو آدمی کو کھانے کا اور زیادہ محتاج بنا دیتی ہے۔ پھر یہ کمال ہے یا بے کمالی؟ میرا مقابلہ کمال میں ہے، بے کمالی میں نہیں‘‘۔

رجوع الی المقصود:

خیر یہ جملہ معترضہ تھا، اپنے التزام سے گویا باہر ہو گیا ہوں؛ لیکن باوجود دبانے کے اس واقعہ کے ذکر کو دبا نہ سکا، ناظرین سے معافی کا خواست گار ہوں۔

آمدم بر سر مطلب! تو پنڈت کی فرودگاہ حضرتؒ کی جگہ (یعنی شہر) سے چوں کہ ڈیڑھ میل تھی، وہ موٹروں کا بھی زمانہ نہ تھا، جلسہ اگر نو بجے ختم ہوتا، تو جیسا کہ حضرتؒ ہی ارقام فرماتے ہیں:

> ’’نو بجے فارغ ہو کر دس بجے (شہر) پہنچے، ایک گھنٹے میں نماز سے فارغ ہوئے‘‘۔

یعنی گیارہ بج جائیں گے۔ظاہر ہے کہ گیارہ بجے کا وقت شب کا تقریباً آدھی رات کا وقت ہوتا ہے، اور حضرتؒ اپنی طبیعت کی فطری نہاد کے مطابق جن لوگوں میں ٹھہرے ہوئے تھے، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ آپ کی عام عادت تھی کہ بجائے رئیسوں اور بڑے لوگوں کے غربا ہی کے پاس ٹھہرنے کو ترجیح دیا کرتے تھے۔اگر ایسا نہ ہوتا،تو اس کے بعد جو یہ ارقام فرماتے ہیں کہ گیارہ بجے کے بعد:

''نہ بازار کھلا ہوا کہ کھانا مول لیجیے، نہ خود پکانے کی ہمت، جو یوں انتظام کیجیے''۔

اور غالباًاس میں اپنی ذات سے زیادہ ان رفقا کی فکر ہوگی، جو مجلس مناظرہ میں شرکت کے لیے حضرتؒ کے ساتھ پنڈت جی کے باغ میں جانے والے تھے۔آخر دوسو کی تعداد کی جب اجازت تھی، تو یقیناً مسلمانوں کا بھی اچھا خاصا مجمع علاوہ تلامذہ کے آپ کے ساتھ ضرور جاتا۔ظاہر ہے ان بے چاروں کے لیے گیارہ بجے واپس ہونے کے بعد کھانے کا مسئلہ دشوار ہو جاتا۔ضمناً اسی سلسلے میں حضرتؒ کا فقرہ:

''ایک گھنٹے میں نماز سے فارغ ہوئے''۔

اس کا بھی ایک اندازہ مل جاتا ہے کہ فرائض کی نمازیں حضرتؒ کتنی دیر میں ادا فرماتے تھے۔ظاہر ہے کہ کامل ایک گھنٹہ صرف فرض کے لیے نہ ہوگا؛ بلکہ حاجات ضرور یہ وضو، سنن، نوافل، اور پھر عشا کا چوں کہ وقت تھا؛ اس لیے وتر بھی اس میں داخل ہے، اور پنڈت جی کی نگاہ صرف ان ہی حقائق پر نہ تھی، جو نو بجے تک کشادہ دلی سے انہوں نے چھ بجے کے وقت کی توسیع دے دی تھی؛ بلکہ جیسا کہ خود حضرتؒ کا بیان ہے:

''علاوہ برایں برسات کا موسم مینہ برس گیا،تو اور بھی اللہ کی رحمت ہوگئی''۔

اور پھر اتفاقی باتیں نہ تھیں۔حضرتؒ خوب جانتے تھے کہ دشواریوں کو پیش نظر رکھ کر پنڈت جی نے اتنی دریا دلی سے کام لیا ہے۔لکھتے ہیں:

''ان (پنڈت جی) کی غرض یہ تھی کہ لوگ تنگ ہو کر چلے جائیں''۔

یعنی ان حالات کو دیکھ کر اوّلاً تو کم ہی لوگوں کو پنڈت جی کے باغ جانے کی ہمت ہوگی، اور چند کو ہوئی بھی تو رات کی تاریکی، برسات کا موسم، فاصلے کی درازی، کھانے پینے کی دشواری وغیرہ کا لحاظ کر کے لوگ اٹھ اٹھ کر ایک دو ہو جائیں گے، اور وہ مقصد کی رسوائی بھی ہو،تو بر سر بازار نہ ہو؛ بلکہ تنہائی میں ہو، رات کی تاریکی میں ہو، پورا ہو جائے گا۔بہ قول حضرت والاؒ: پنڈت جی سوچ رہے تھے:

''کہ ہم بیٹھے (اسی صورت میں) بغلیں بجائیں''۔

مناظرہ کی ممانعت:

مگر باوجود ان تمام داؤ پیچ کے حضرت کو بہر حال مقابلہ پر اصرار تھا۔تمام مواقع سے قطع نظر کر کے پھر

بھی پنڈت جی کے پاس اسی حال میں جانے پر تیار ہو گئے۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

''غرض کچھ تو بہ وجہ نماز مغرب وقت میں گنجائش کم تھی، رہی سہی اس تدبیر سے گئی گزری؛ مگر جب بہ نام خدا ان سب باتوں کو سر رکھا''۔

تو اچانک وہی غیبی ہاتھ برآمد ہوا، جس کی آنکھوں پر وہ ساری کٹ پتلیاں رقص کر رہی تھیں، جنھیں فتنوں کے اس عہد میں مختلف باتوں سے مختلف مقامات پر ہم ناچتی ہوئی پاتے ہیں۔ حضرتؒ ہی کا بیان ہے:

''جب بہ نام خدا ان باتوں کو سر رکھا، تو من جملہ اور شرائط کے ان کے مکان پر مناظرہ ہونے کو سرکار نے اڑا دیا''۔

ظاہر ہے کہ یہ شرط پنڈت جی ہی کی لگائی ہوئی تھی، عین وقت پر حکومت نے اسی شرط کی آڑ لے کر جلسے کو ملتوی کرا دیا؛ مگر کتنے خوب صورت پیرائے میں۔ بہ ظاہر سوال ہو سکتا تھا کہ ایک مذہبی مناظرہ کے جلسہ سے حکومت کو کیا سروکار؟ خصوصاً ہر مذہب کے لوگ ہر جگہ آئے دن اس زمانے میں مناظروں میں مصروف ہی رہتے تھے؛ بلکہ یہ طریقہ پادریوں ہی کا ہندوستان میں پھیلایا ہوا تھا۔ ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' کے مصنف (سید طفیل احمد منگلوری) نے لکھا ہے کہ شروع شروع میں جب مسیحی واعظوں نے کوچہ و بازار میں مواعظ کا سلسلہ اس طور پر شروع کیا، جن میں دوسرے مذہب کے اصول اور اس کے پیش واؤں، بزرگوں پر علانیہ حملے کیے جاتے تھے، تو حکومت کی جانب سے ہر پادری کے ساتھ پولیس کے دو مسلح جوان اس کی حفاظت کرتے اور پہرہ دیتے رہتے تھے؛ لیکن آج بھی وہی مذہبی گفتگو ہے۔ سیاست سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مسلمان بے چاروں کا دل بلا وجہ ایک ہندو پنڈت نے دکھایا تھا۔ محض ان کے ہی دکھے ہوئے دل کی تسلی اس گفتگو سے مقصود تھی، اور کوئی چیز تو ایسی نظر نہ آئی، صرف یہ بتا کر کہ جہاں مناظرہ ہوگا، چوں کہ یہ مقام چھاؤنی میں ہے، اور چھاؤنی کے حلقے میں حکومت کسی جلسے ولسے کی اجازت نہیں دے سکتی، جلسہ روک دیا گیا۔ خود حضرت والاؒ ہی کی شہادت ہے:

''حکام وقت نے قطعاً ممانعت کر دی کہ سرحد چھاؤنی اور رڑکی میں مناظرہ نہ ہونے پائے''۔

یہ حکم حکومت نے خود نکالا تھا، یا کسی کی التجائے نیم شبی پر نکالا گیا تھا؟ آج اس کا سراغ کون لگا سکتا ہے؟ مناظرہ کے ان ہی شرائط وقیود کا ذکر کرتے ہوئے درمیان میں حضرتؒ کے قلم سے یہ جو فقرہ نکال گیا ہے:

''پھر اس پر تحریر وتقریر کی شاخ اور اوپر لگی ہوئی''۔

خدا ہی جانتا ہے کہ اس ''اوپر'' کا کیا مطلب ہے؟ اور اس ترکیب سے باغ کی حد تک تو جلسہ کے ملتوی کرانے میں پنڈت جی کام یاب ہو گئے؛ مگر حضرتؒ نے بھی ''تا بہ خانہ باید رسانید'' کی شاید ٹھان ہی لی

تھی، چوں کہ ممانعت کا حکم صرف چھاؤنی اوررڑکی کے حدود تک محدود تھا، اور:

''اس سے خارج ہو،تو کچھ ممانعت نہیں۔اس پر (ممانعت کے بعد) ہم نے میدان عیدگاہ وغیرہ میں پنڈت جی سے التماس قدم رنجہ فرمائی کی''۔

اب تک تو پنڈت جی ہراس روشنی پر جو حضرتؒ کی طرف سے پیش کی جاتی تھی، اپنے کید کی سیاہی پھیلا دیتے تھے، اور سیاہی کی ان ہی راتوں میں پناہ لے کر بہ قول حضرت والاؒ: بغل بجانے میں مشغول ہوجاتے تھے؛ مگر یہ آخری روشنی ایسی تھی کہ حکومت بھی اس کوتاریکی سے اپنے اعلان کی بنیاد پر بدل نہیں سکتی تھی؛ کیوں کہ صریح الفاظ میں حکومت نے اعلان کیا تھا کہ:

''اس سے خارج ہو،تو کچھ ممانعت نہیں''۔

جگہ حدودمقررہ کے خارج قطعہ میں مقرر کی گئی تھی۔کرتے تو کیا کرتے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر تاریکی پھیلانے کے لیے پنڈت جی نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے؛ لیکن پیش نہ گئی، وہ رات پیدا کرنا چاہتے تھے؛ لیکن بہ قول حضرت والا کہ:

''پنڈت جی کو اپنے دن نظر آئے''۔

ان کے ''یوم الفصل'' کی گویا گھڑی سر پر آ کر سوار ہوگئی۔اس کے سوا کوئی چارہ بن نہ پڑا کہ حیلوں اور بہانوں کی نقاب پھاڑ کر غیر مشروط انکار کو اختیار کرلیں کہ آخر شکست کی ذلت سے انکار کی ذلت بہر حال ''اھون'' اور آسان تھی۔آدمی عقل مند تھے، دو بلاؤں میں جو بلا نسبتاً ہلکی تھی، اسی کو اپنے لیے انہوں نے چن لیا۔حضرتؒ کا بیان ہے کہ اس کے بعد:

''سوائے انکار (مطلق) کے اور کچھ نظر نہ آیا''۔

خیر یہ تو پنڈت جی نے کیا؛ مگر ہمارے لیے یہاں غور کرنے کا مقام ہے، وہی جو اپنی تحریروں اور تقریروں میں خطوط اور مکالموں میں مسلسل اپنی ''فطری کاہلی'' اور ''سستی'' کا اعلان کرتے تھے، آج ان کی چُستی اور چالا کی کس حد کو پہنچی ہوئی ہے۔اپنا تو یہی خیال ہے کہ حضرتؒ نے جہاں کہیں اپنی کاہلی ونیستی پن وغیرہ کا تذکرہ فرمایا ہے، وہاں ان کی نظر ''کاہلی'' کے اس معنی پر نہ ہوتی تھی، جو عام طور پر اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے، یا بہ طور کسر نفسی کے لوگ باوجود چست و چالاک ہونے کے اپنے کو کاہل بے حاصل قرار دیتے ہیں۔حضرتؒ کے سامنے یہ دونوں باتیں نہ تھیں؛ بلکہ ٹھیک جس طرح اپنی جہولیت وظلومیت کا اعتراف اس نقطۂ نظر سے کیا جاتا تھا کہ امکانی ہستیوں کا حقیقی سرمایہ یہی ہے، ان کی اصل حقیقت عدم اور نیستی ہے، اور جس کی ذات ہی نیستی ہو بھلا وہ وجودی صفات کا مرجع کیسے بن سکتی ہے؟ حضرتؒ کی اصطلاح

میں ''ممکن'' کے تمام کمالات وصفات ان کا خانہ زاد نہیں ہے؛ بلکہ سارے صفات وکمالات خدا زاد ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے باوجود عالم ہونے کے اپنے کو''جہول''، باوجود عادل ہونے کے اپنے کو''ظلوم'' قرار دیتے تھے۔ یقین کرنا چاہیے کہ باوجود سب کچھ کرنے کے ہمیشہ اپنے کو نہ کرنے والوں میں گنتے رہے (۱)، تو اس کا منشا بھی یہی تھا کہ فعالیت اسی کی خانہ زاد صفت ہے، اور ہوسکتی ہے، جو ''فَـعَّـالٌ لِّـمَـا یُـرِیْـدُ''(۲)، ہو، اس کے وجود مطلق کے سوا''ہست نمانیستوں'' کی طرف اس کا انتساب حقیقت نہیں؛ بلکہ صرف مجاز ہے؛ مگر کیا ہی عجیب بات ہے کہ جو حقیقت کا اظہار کرتا تھا، لوگوں نے اسی کی گفتگو کو مجاز قرار دیا، اور جو مجازی کلام کے عادی ہیں، سمجھا جاتا ہے کہ وہی حقیقت کا اظہار کررہے ہیں۔

مناظرہ کے لیے حضرتؒ کی آخری سعی:

آخر میں پوچھتا ہوں کہ ابتدائے شعبان سے ایک شخص کا گھر بار چھوڑ کر رڑکی آجانا، اور گریز کی انتہائی کوششوں کے باوجود حریف کے پیچھے ہاتھ دھو کر اس طرح پڑ جانا کہ بے چارے کے لیے نہ آسمان پر جگہ باقی رہی، نہ زمین پر، حد یہ ہے کہ اس غریب نے آخری ذلت کا تو بیڑا اپنے چہرے پر کس لیا، اور صاف صاف لفظوں میں مناظرہ سے انکار کردیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اب مولاناؒ کے لیے دعوت مناظرہ کی گنجائش ہی کیا باقی رہ گئی تھی؟ مگر جو عمر بھر اپنے کو کاہل کہتا رہا، اس کی چستی اور چالاکی کو دیکھتے ہو کہ وہ اب بھی نہیں تھکتا ہے۔ ہر وہ سوراخ جس میں لومڑی نے چھپنے کا ارادہ کیا، شیر نے آگے بڑھ کر اس کا منہ بند کردیا، تا ایں کہ جب ہر طرف سے عاجز آکر گھٹنے ٹیک کر وہ بیٹھ گئی، یعنی مقابلے سے صاف انکار کردیا، تو اب ستم ظریفی کی یہ آخری حد ہے کہ حضرتؒ پھر بھی باز نہ آئے۔ خود ہی ارقام فرماتے ہیں:

''لاچار ہوکر ہم نے چاہا کہ اپنے اعتراض ہی بھیج دو''۔

مطلب یہ ہے کہ اگر سامنے آنے کے لیے تیار نہیں ہو، تو پنڈت جی کو لکھا گیا کہ پیٹھ پیچھے تو آپ سب کچھ کہنے کے عادی ہیں، جہاں ''ستیارتھ پرکاش'' میں ساری دنیا کے مذاہب کے پیشواؤں کی کھنڈت چپ چاپ

---

(۱) اس زمانے میں بعض مصلحت اندیش بزرگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ اکابر اسلام کا یہ مسلک مسلمانوں کی بے عملی کا بہت کچھ ذمے دار ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ اپنے کو نیست قرار دینے والوں سے وجودی افعال کا صدور کیسے ہوسکتا ہے؟ قطع نظر اس سے کہ کسی واقعے کا انکار محض اپنے مزعومہ مصالح کی بنیاد پر بجائے خود کہاں تک درست ہوسکتا ہے؟ اس لیے ملائکہ کا انکار کیا جائے کہ ان ہی کو دیوتا مان کر مشرکوں نے شرک کی بنیاد ڈالی، کیا صحیح ہوسکتا ہے؟ حال آں کہ بجائے اس کے اسلام نے ایمان بالملائکہ کو ایمانیات کا جز ٹھہرایا ہے۔ علاوہ اس کے اس مسلک کو ماننے والے بزرگوں کے حالات موجود ہیں، کیا ان کی یہی سرگرمیاں ان کی بے عملی ہے؟ (گیلانی)

(۲) سورۂ بروج: ۱۶۔

اپنے آشرم میں بیٹھ کر آپ فرماتے رہے ہیں، براہِ مہربانی ان اعتراضوں کے متعلق بھی یہی کیجیے کہ سامنے نہ آیئے، اپنے درخت ہی پر بیٹھے بیٹھے کوؤں کو ہیجڑے قرار دیجیے۔ آپ کو بھی اجازت ہے کہ گھر بیٹھے اپنے اعتراضات کو قلم بند فرمایئے۔ ایسی حالت میں تو اوسان درست رہیں گے؟ لکھ لکھا کر خود بھی میرے حوالے نہ کیجیے، کسی دوسرے کے ذریعے بھیج دیجیے۔ حضرتؒ ارقام فرماتے ہیں کہ میری غرض یہ تھی کہ:

''ہم ہی مجمع عام میں ان (پنڈت جی) کے اعتراضات کے جواب سنا دیں''۔

یعنی بہ طورِ وکالت کے ہم ہی تمہارے اعتراضات مسلمانوں کو سنا دیں گے، پھر اپنی طرف سے ان کے جواب عرض کر دیں گے۔ سوچا جا سکتا ہے کہ اس سے زیادہ فریق مقابل کو اور کیا سہولت دی جا سکتی تھی کہ اپنا کام تو اپنا کام ہی تھا، ان کے کام کو بھی حضرتؒ نے اپنے ذمے لیا؟

ایک اور کوشش اور پنڈت جی کا فرار:

اس سلسلے میں آخر میں یہ بھی کہلا بھیجا تھا کہ یہ بھی نہ سہی:

''تو آؤ مناظرۂ تحریری ہی سہی''۔

تم پردے ہی میں بیٹھ کر لکھو، اور بجائے اس کے کہ آپ کے لکھے ہوئے کو مجمع عام میں سنا جائے، میں چپ چاپ خود ہی دیکھ لوں گا، اور ان کے جوابات آپ کو لکھ کر بھیج دوں گا۔ نفع و بہی خواہی کی یہ آخری شکل ہو سکتی تھی، جو پنڈت جی کے سامنے مولاناؒ کی طرف سے پیش کی گئی؛ مگر شائستگی و تہذیب کا یہ کتنا اچھا نمونہ تھا کہ ایک بڑے گروہ کی پیش وائی کا؛ بلکہ امامت کا؛ بلکہ سچ پوچھو! تو اپنے خیال میں نبوت کا جس کو دعویٰ تھا، اس نے حضرتؒ ہی کے الفاظ میں:

''جواب تو درکنار پنڈت جی نے راہ لی، شکرم میں بیٹھ یہ جاوہ جا''۔

اور یہ تھا کیرکٹر اس شخص کا، جس کے متعلق اب مرنے کے بعد خدا جانے کیا کچھ نہیں کہا جا رہا ہے۔ بھارت ماتا پر ایک دم مصائب کا سیاہ بادل چھایا ہوا ہے۔ اس کے اندر سے فرشتۂ رحمت کی صورت میں ''پنڈت جی'' برآمد کیے جاتے ہیں، کبھی یہ دکھایا جاتا ہے کہ ہندوستان کی بلند ترین چوٹی پر ایک منادی اور نا جی کی شکل میں چار ابروں کے صفایا کے ساتھ ایک آدمی کو کھڑا کر کے بتایا جاتا ہے کہ یہ ملک کے نجات دینے والے، سوتوں کو جگانے والے ''مہرشی پنڈت دیانند سرسوتی جی'' ہیں۔ کیلنڈروں میں اس قسم کی تصویروں کی بھر مار ہے؛ لیکن خدا کے ان بندوں کو کون جا کر یہ تماشہ دکھائے کہ وہی ''مہرشی پنڈت دیانند جی سرسوتی'':

''شکرم میں بیٹھ یہ جاوہ جا۔''

کے حال میں آج مبتلا ہیں، تصویر بھی اگر اس وقت کی کھینچی جاتی، تو جو لطف حضرتؒ کے ان الفاظ نے پیدا کیا ہے، اور جانے والے پنڈت جی کی ہیئت کذائی کا جو نقشہ دماغ کے سامنے آتا ہے، شاید تصویر اس کیفیت کو پیدا نہیں کرسکتی تھی۔ خصوصاً جب ہم اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھتے ہیں کہ کسی اخبار کے ایڈیٹر یا نیوز ایجنسی کی ''خبر'' نہیں ہے؛ بلکہ اس قلم کی عکاسی ہے، جس سے حقیقت یا جو کچھ ہوا تھا، اس پر سرمو اضافہ ناممکن ہے۔ اور یہ تھا آخری انجام اس معرکے کا جو حضرت والاؒ اور پنڈت دیانند جی کے درمیان ہونے والا تھا؛ لیکن افسوس کہ نہ ہوسکا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بجائے ''شکرم پر بیٹھ کر یہ جا وہ جا'' کے پنڈت جی مولاناؒ کے سامنے اگر آجاتے، تو جدھر وہ تشریف لے گئے، کیا تعجب ہے کہ ادھر سے پلٹ کر اس راستے پر لگ جاتے، جس پر چلنے کے بعد آدم کی اولاد کو اپنے باپ کی کھوئی ہوئی جائداد پھر واپس مل جاتی ہے۔ کاش! یہ ہوجاتا، تو کتنے فتنے جو اٹھے، اور اس وقت اٹھ رہے ہیں، یا آئندہ اس ملک میں اٹھنے والے ہیں، شاید نہ اٹھتے؛ لیکن: ''مَا قَدَرَ اللہ فَسَوْفَ یَکُوْنُ''، بھیجنے والے نے جس جگہ ''نَبْتَلِیْہِ'' (تاکہ ہم اس کو آزمائیں) کے لیے ''الانسان'' کو بھیجا ہے، وہاں سے بھی ''امتحان وابتلا'' کے ''پاس'' اور ''فیل''، ''فاز'' یا ''خاب'' کے اعلان کا کیوں کانوں کو انتظار رہتا ہے؟ شارح حقیقت کے اس قطعی فیصلے کو کون توڑ سکتا ہے؟ ؎

جنت بنا سکے گا ہرگز نہ کوئی اس کو
اکبر یوں ہی چلی ہے، دنیا یوں ہی چلے گی

''وَ اِنَّ الآخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ''[1]۔

''اور اس پہلے کے بعد جو پچھلا (دورحیات) ہے، ٹھہراؤ کا مقام تو وہی ہے''۔

واقعہ اپنی ان تفصیلات کے ساتھ جو براہِ راست حضرت والاؒ کے بیان سے ماخوذ ہے، ختم ہوگیا۔

(۱) سورۂ مؤمن: ۳۹۔

چوتھا باب:

حضرت قاسم العلومؒ کی فطرت سلیمہ

بعض خصائصِ سیرت پر ایک نظر

اگر چہ بیچ بیچ میں ان کے بعض نتائج پر ضمناً میں تنبیہ بھی کرتا چلا آیا ہوں؛ لیکن جی نہیں چاہتا کہ ''دیانند معرکہ'' کے جن بعض پہلوؤں کی طرف بے اختیار میرا خیال جو منتقل ہو رہا ہے، انہیں صرف اپنی حد تک محدود نہ رکھوں۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ حضرت والاؒ کی فطرت کے ایک خاص پہلو پر اس سے روشنی پڑتی ہے۔ یعنی آپ کی زندگی کے دوسرے واقعات کا کچھ ذکر میں نے بھی کیا ہے۔ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی عام چیزوں کے متعلق آپ کی گرفت میں چنداں سختی نہ تھی؛ اس لیے جو مل گیا، پہن لیا، جو سامنے آ گیا، کھالیا، جہاں سونے کو جگہ مل گئی، سو رہے۔

شاہ جہاں پور کا سفر:

شاہ جہاں پور کے عظیم الشان میلے میں تشریف لے جاتے ہیں۔ شہر نیازمندوں اور معتقدوں سے بھرا ہوا ہے؛ لیکن میلے کی رپورٹ میں ہے کہ ریل سے آپ کے ساتھ علما کی ایک جماعت اتری، ہر ایک نے کسی نہ کسی رئیس کی کوٹھی کی راہ لی؛ لیکن حضرت والاؒ نے چاہا کہ میری وجہ سے رات کے وقت لوگوں کو کیوں تکلیف ہو؟ اور بجائے رئیسانہ بنگلوں کے شاگرد کو ساتھ لیے کسی معمولی سرائے میں فروکش ہو گئے۔ رپورٹر کے الفاظ یہ ہیں:

> ''غرض مولوی صاحب (حضرت والاؒ) سب ساتھیوں (علما) کو چھوڑ کر مولوی محمود حسن (سیدنا حضرت شیخ الہندؒ) کو اپنے ہم راہ لے کر چپکے سے شہر ہو لیے۔ قصہ مختصر! رات کو ایک سرائے میں قیام فرمایا''۔

مگر سرائے کا مسافر واقع میں سرائے کا مسافر کب تھا، جو چپکے سے اس کو وہاں آرام کا موقع ملتا؟ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی کہ بعض لوگوں تک یہ خبر کسی نہ کسی نے پہنچا ہی دی، اسی وقت ہانپتے کانپتے

یہ بے چارے سرائے پہنچے:

’’دو بجے رات کے سرائے میں جا کر مولوی صاحب کو جا گھیرا، پس از اصرار ناچار مولوی صاحب ان کے مکان پر تشریف لے گئے‘‘[۱]۔

اور حضرت والاؒ کی زندگی کا یہ کوئی نادر واقعہ نہیں ہے۔ رات کو تو آپ نے یہ کیا، صبح کو میلے کا مقام جس کا نام چاندا پور تھا، اور شہر شاہ جہان پور سے پانچ چھ میل دور تھا، اور علما کے لیے تو سواریوں کا نظم تھا؛ لیکن جس نے دنیا کے کسی قاعدے کو سختی (۲) کے ساتھ نہ پکڑنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا، قبل اس کے کہ لوگ سواری لے کر حاضر ہوں، صبح کی نماز کے بعد ہی اندھیرے منہ اپنے اس شاگرد کو ساتھ لیے پیادہ پا چاندا پور روانہ ہو گئے۔ لوگوں نے نماز کے بعد ڈھونڈا ہو گا؛ مگر اسلام کا آفتاب تو چاندا پور کے افق پر چمک رہا تھا۔ رپورٹر کے الفاظ یہ ہیں:

بالجملہ مولوی صاحب (حضرت والاؒ) صبح کو نماز پڑھ کر پیادہ پا ہی چاندا پور میں جا چکے تھے[۳]۔

خلاصہ یہ ہے کہ تقریباً پوری زندگی یوں ہی طلائی رنگ میں حضرتؒ نے گزار دی، جس کے واقعات کی تفصیل کا فرض اصل سیرت نگار کے ذمے عائد ہوتا ہے۔ بہ طور مثال کے میں نے ان چند مشہور باتوں کا ذکر کیا؛ لیکن واقعہ میں جس شخص کو زندگی کے ان عام واقعات میں اتنا نرم پایا گیا تھا، وہ ہر معاملے میں نرم تھا؟

---

(۱) میلہ خدا شناسی، ص:۳۰۔

(۲) **قاسمی عمل**: آج ہندوستان میں دینی علوم کی نمائندگی جو طبقہ کر رہا ہے۔ یعنی دار العلوم دیو بند کے فارغ التحصیل علما، کاش! دار العلوم کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے طریقۂ عمل کو پیش نظر رکھتے۔ ان حالات کے راویٔ خصوصی ’’امیر شاہ خاں‘‘ مرحوم مولانا کے جو واقعات بیان کرتے تھے، ان ہی میں ایک قصہ یہ بھی ہے، جس کا ذکر ’’امیر الروایات‘‘ کے مؤلف صاحب نے بھی کیا ہے، اس کتاب پر مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ نے بعض حواشی بھی لکھے ہیں، اور ان کی توثیق کے بعد کتاب شائع ہوئی ہے۔ بہر حال اسی کتاب میں لکھا ہے کہ: مولانا محمد قاسم صاحبؒ جن دنوں منشی ممتاز علی مرحوم کے مطبع میں تصحیح کا کام کرتے تھے، تو اسی مطبع میں ایک صاحب بھی ملازم تھے۔ امیر شاہ خاںؒ کے الفاظ ان صاحب کے متعلق یہ ہیں کہ: ’’وہ بالکل آزاد تھے۔ رندانہ وضع تھی۔ چوڑی دار پاجامہ پہنتے۔ داڑھی چڑھاتے تھے‘‘، اور سب سے آخری بات یہ ہے کہ ’’نماز کبھی نہیں پڑھتے تھے‘‘۔ امیر شاہ خاں فرماتے ہیں کہ: یہی صاحب جو نماز کبھی نہیں پڑھتے تھے، اور رندانہ وضع رکھتے تھے، ان ہی سے مولانا کی ’’بہت گہری دوستی تھی‘‘۔ یہاں تک بے تکلفی تھی کہ مولانا کو وہی بے نمازی، جو کبھی نماز نہیں پڑھتا تھا، نہلاتے اور کمر ملتے تھے، اور مولانا ان کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے۔ آگے جو واقعہ پیش آیا اس کو سنیے! کیوں کہ گناہ گار بندوں کے ساتھ دار العلوم دیو بند کے بانی کا یہ حال اس دار العلوم سے استفادہ کرنے والوں کے لیے شمع راہ کا کام کیا دے سکتا ہے؟ امیر شاہ خاں صاحب مرحوم اس کے بعد بیان کرتے تھے کہ آخر مولاناؒ کے بھی بے نمازی دوست نمازی بن گئے؛ مگر میں کہتا ہوں کہ اس قاسمی عمل کا تجربہ کر کے دیکھا جائے، ان شاء اللہ! ہمیشہ نہیں، تو زیادہ تر اس کا نتیجہ ہر تجربہ کرنے والے کے سامنے پیش آ سکتا ہے۔ (علامہ سید مناظر احسن گیلانی، **مقالات احسانی**، (ادارہ مجلس علمی کراچی ۱۳۹۹ھ)، ص:۲۳۶۔

(۳) میلہ خدا شناسی، ص:۴۰۔

یقیناً زندگی کے تقریباً اکثر شعبے جن میں دنیا والے عموماً سخت ہیں، اس میں خدا نے ان کو نرم بنا کر پیدا کیا تھا، اور اس حد تک نرم کہ دنیا والوں کو ممکن ہے ان کے متعلق ایسے آدمی ہونے کا مغالطہ ہو سکتا تھا، جسے عموماً لاابالی وارستہ مزاج وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

مگر لاابالیت کا یہ سارا قصہ اگر سچ پوچھیے تو ان ہی معاملات تک محدود تھا؛ ورنہ ایک یہی دیانند جی کے مقابلے کا معاملہ ہے، دیکھتے ہو! یہاں آپ کی پکڑ اور گرفت کی سختی کی کوئی انتہا ہے؟ عام مجمع میں نہ سہی، خاص میں، ہمارے گھر میں نہ سہی، اپنے گھر میں، دن کو نہ سہی، رات کو، چھاؤنی کے حدود میں نہ سہی، عیدگاہ کے میدان میں، تقریراً نہ سہی، تحریراً تحریر بھی اگر تم سے نہ پڑھی جائے، تمہاری طرف سے میں ہی پڑھ دوں گا، کوئی شق، کوئی پہلو ایسا باقی چھوڑا گیا ہے، جہاں پہنچنا یا جہاں تک پہنچانا ناممکن تھا؟ وہاں پہنچنے یا پہنچانے سے دریغ کیا گیا ہو؟ وَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ!

وہی جو تمہارے کپڑوں لتوں، کھانے پینے، رہنے سہنے میں اتنا آزاد مزاج واقع ہوا تھا کہ بھرے مجمعوں میں میلے کپڑوں کے ساتھ ہم چشموں اور ہم عصروں کے درمیان چلے جانے سے اس کے دل پر کوئی خطرہ بھی نہ گزرتا تھا، آج اس کی گرفت کا تماشہ کتنی قوت سے کیا جا رہا ہے۔

پس سچی بات یہی ہے کہ جن معاملات میں ان کو نرم سمجھا جاتا ہے، ان میں بھی وہ دراصل سخت ہی تھے۔ جب یہی طے ہو چکا تھا کہ جن مقصدوں تک پہنچنے کے لیے ایک سودا کے ساتھ ساتھ ہزار غم پالنے پڑیں گے۔ ان کی حد تک تو انہوں نے غم کے اڈوں ہی کے اڑا دینے کا عزم کر لیا تھا، اور آخر وقت تک اس عزم میں غیر متزلزل رہے، گویا علمی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ ان میں ''لا بشرط شئی'' کے مقام ہی کا عزم تھا؛ لیکن جن امور کی تکمیل ''بشرط شئی'' کے مقام کی مقتضی تھی، وہاں ''اس شئے'' کے کسی پہلو سے لاپروائی برتنا قطعاً روا نہ رکھتے تھے۔ جیسا کہ دیانند جی کے معاملے میں کسی پہلو کو سر مہر رہنے پر راضی نہ ہوئے۔

صاحب عزیمت:

اور اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ وہ سراسر عزم اور صرف ارادے تھے۔ یہ جو لوگوں کو اپنے رکھ رکھاؤ میں خاص خاص پابندیوں کا پابند دیکھا جاتا ہے، اور انہیں داد دی جاتی ہے کہ وضع کے وہ بڑے پکے ہیں، شیروانی کے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے، پلنگ اور گدے کے بغیر سو نہیں سکتے، یہ نہیں کر سکتے، وہ نہیں کر سکتے، ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ارادے کے پکے ہوں؛ لیکن اس ارادے کی پختگی کا مقابلہ کیا وہ ارادہ کر سکتا ہے، جس میں ان تمام پابندیوں کو ٹھکرانے کا عزم بالجزم کر لیا گیا ہو؟ لیکن غلطی سے لوگ ایسوں کو غیر پابند قرار دیتے

ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ جن چیزوں کو تمہارا نفس چاہتا ہے، اگر ان کے مہیا کرنے کے آپ پابند ہیں، تو جدھر ہوا کا رخ ہو، اس طرف چل رہے ہیں، گاڑی کو جس طرف انجن لیے جا رہا ہے، آپ نے بھی اگر گاڑی کو اسی طرف دھکیل دیا، تو یہ آپ کا کمال ہے، یا انجن کا؟ لیکن ہوا جس طرف بہ رہی تھی، اور انجن جس سمت گاڑی کو لیے جا رہا تھا، اگر چند انچ بھی اس کی مخالف سمت چلنے یا چلانے میں کام یاب ہوئے، تو یہی اصل آپ کی کام یابی ہے، اور قوت ارادی کا سچا ثبوت یہی ہے۔

سرسید اور ان کا کارنامہ:

تعجب ہوتا ہے کہ لوگ دیکھتے ہیں اور نہیں دیکھتے۔ سنتے ہیں اور نہیں سنتے۔ ہندوستان کی ہر تاریخ کا وہ حصہ جو غدر کے بعد لکھا گیا، اس میں ذکر کیا جاتا ہے، التزاماً وحتماً ذکر کیا جاتا ہے، بڑے زور وشور اور بلند آہنگی کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے کہ چند جھونپڑیوں کو مسلم یونی ورسٹی کی راہ پر لگانے والا بڑا آدمی تھا۔ اتنا بڑا آدمی کہ اگر مادر گیتی نہیں، تو مادر ہند (بھارت ماتا) گزشتہ صدی میں ایسا بچہ نہ جن سکی۔ حال آں کہ میرے خیال میں بجائے راہ کے لگنے کے اسی زمانے میں ان جھونپڑیوں کا یونی ورسٹی کا نہ بن جانا محل حیرت ہے؟ یقیناً یہ گاڑی اسی لائن پر چھوڑی گئی تھی، جس پر زمانے کا انجن حکومت وقت کی اسٹیم سے بھاگنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اسی کا وقت تھا، اسی کا زمانہ تھا، اسی کی مانگ تھی، اسی کا مطالبا، امرا بھی اسی کے لیے تھے اور غربا بھی، چھوٹے بھی اس کے لیے اور بڑے بھی، بڑی بڑی ریاستوں کا خزانہ کھلا ہوا تھا۔ خطابوں اور سرفرازیوں کی ساری پونجی اسی میں پوشیدہ تھی۔

دارالعلوم کا شجرۂ طیبہ:

لیکن اندھا بنانے والوں نے لوگوں کو کتنا اندھا بنایا کہ جب ٹھیک آندھی کی پوری مخالف سمت، انجن جدھر گاڑی کو اپنی پوری قوت سے آخر قوت سے کھینچ کر لے جانا چاہتا تھا، اللہ کے ایک اور بندے نے انار کے ایک درخت کے نیچے سے کش مکش شروع کی۔ بہر حال اسی مخالف سمت پر گاڑی جائے گی۔ ارادے کے زور اور عزم کی پختگی کا کیسا عجیب وغریب معجزانہ نظارہ تھا کہ سب کے سامنے دن کی روشنی میں آخر اس کی مخالفانہ کش مکش کام یاب ہوئی، اور آج شجر انار کے نیچے والی زمین بڑھ کر خدا ہی جانتا ہے کہ اس جیسی کتنی زمینوں کی شکل اختیار کر چکی ہے، اور خیر یہ تو خشت وگل کے مجموعے کا نظارہ ہے، اس پون صدی کے قلیل زمانے میں علم کی تقسیم جس وسیع پیمانے پر صرف ہند ہی نہیں؛ بلکہ بیرون ہند میں بھی ہوئی، بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اتنے وسیع پیمانے پر ان ہی علوم کی تقسیم اس وقت بھی نہ ہوئی، جب اس ملک میں ان ہی کی تقسیم کا موسم

تھا، ان ہی کے مطابق ہوا تھی اور ساری قوتیں اسی تقسیم سے وابستہ ہوسکتی تھیں؛ لیکن تاریخی دیانت کا ڈنکا بجانے والو! شرم کہاں ہے، جواب تک تمہاری آنکھوں میں پہنچ کر گردنوں کو تمہاری گریبانوں میں نہیں ڈالتی؟ ہزاروں کتابیں لکھی گئیں، سیکڑوں ریڈریں تیار ہوئیں، تحقیقات وریسرچ کے دریا بہادیے گئے؛ لیکن اللہ کے بندو! تمہیں سب کچھ نظر آیا؛ لیکن اس سلسلے میں جس واقعہ سے آنکھ چوک گئی، وہ یہی واقعہ تھا:

کھل　پڑا　پَر　وہی　کبوتر　کا
جس　میں　نامہ　بندھا　تھا　دل　بر　کا

میں کہاں بہک گیا اور بہکا جارہا ہوں، ذکر حضرت والاؒ کی ارادی قوت اور عزم کی پختگی کا تھا۔ دیانندی معرکہ میں اس کا ظہور چوں کہ آنکھوں کے سامنے ہوا تھا؛ اس لیے اس پر تنبیہ ضروری معلوم ہوئی، تا کہ سمجھا جائے کہ دیوبند کا ''مدرسۂ عربی'' آج جو ''دارالعلوم'' کے نام سے سربلند ہے، اس کی تہہ میں کس کا عزم کام کررہا تھا؟

حضرت والاؒ کی عام زندگی پر سطحی نظر رکھنے والوں کو جو مغالطہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ وارستہ مزاج فطرت کے تھے، اس مغالطہ کا ازالہ ہوجائے۔ ان ہی کے متعلق جو ایک عام غلط فہمی اب اچھے اچھوں میں پھیلتی جارہی ہے، ہوسکتا ہے کہ حضرت والا کی زندگی کا یہ نمونہ ان کے لیے موجب بصیرت ہو؟

دوسری بات اسی دیانندی قصہ میں مجھے جو نظر آئی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک ایسے عہد اور زمانہ میں جب مولویت کے دائرے میں ''وجود رابطی'' اور ''مثناۃ بالتکریر'' جیسے مباحث کو اہمیت اور کیسی اہمیت دی جارہی تھی، وہ مولوی مولوی ہی نہیں قرار پاسکتا تھا، جس کے پاس ان مسائل اور ان کے مماثل مسائل کے متعلق خاص نکات کا ذخیرہ نہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ دین کے مسائل کا کچھ چرچا اگر شروع بھی ہوا تھا، تو ان کا زیادہ تر تعلق اسلام کے فروعی مباحث سے تھا۔ کچھ غیر مقلدیت کی تحریک سے آمین، رفع الیدین، قرأۃ فاتحہ وغیرہ کی بحثوں میں گرمی پیدا ہوگئی تھی۔ کہیں کہیں عیسائیت کے خلاف بھی کام ہوتا تھا۔ ضرورت نے مسلمانوں میں ایسے نفوس بھی پیدا کردیے تھے، جو اس فتنے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بعض لوگ ایسے بھی پیدا ہوگئے تھے، جن کی نظر اس زیغ پر پڑ چکی تھی، جو مغربی تمدن کی بہ دولت باہر ہی کو نہیں؛ بلکہ مسلمانوں کے ''اندر'' کو بھی بدل رہا، ''نیچریت'' کے نام سے یہ زیغ موسوم تھا، اور مخلصین کا ایک طبقہ ان کے خطرناک نتائج پر متنبہ ہوچکا تھا۔

لیکن ان سارے قصوں میں ''ہندو مسلمان'' کا مسئلہ خصوصاً مذہبی لحاظ سے کسی طرح درخور اعتنا نہ تھا۔ حاکم مسلمانوں نے ایک لمحے کے لیے اس سوال کو اپنے سامنے لانے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ کبھی ان بت

پرستوں، گائے بکری پوجنے والوں کی طرف سے بھی مسلمانوں پرنہیں اسلام پر حملہ ہوگا؟ جب تک اسلامی حکومت کا چراغ جلتا رہا، واقعہ یہ ہے کہ اس سوال کی کچھ حیثیت بھی قریب قریب یہی تھی؛ لیکن اس چراغ کے گل ہونے کے ساتھ ہی اگر چہ کہیں کہیں سے کچھ آوازیں اٹھنے لگیں؛ مگر جہاں تک میں غور کرتا ہوں عام علمائے اسلام نے ادھر کبھی توجہ نہیں کی۔ خدا جانے کس صدی میں "سمینہ" نام ایک ہندوستانی مکتب خیال کا یہ نظریہ مدرسوں میں کس طرح پہنچ گیا تھا کہ وہ وحی ونبوت کے منکر ہیں۔ اس کے سوا مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اسلامی علما کی دینی کتابوں میں ہندوؤں کے خیالات وآرا کا ذکر کیا گیا ہو۔

ظاہر ہے کہ حضرت والاؒ بھی علما کی اسی جماعت کے ایک فرد تھے، اور عام مذاق کے مطابق اس زمانے کی جو علمی دل چسپیاں تھیں، ان میں گو اس حد تک جس حد تک فطرتاً حصہ لے سکتے تھے، آپ نے حصہ لیا۔ قرأۃ خلف الامام پر کتاب لکھی، تراویح کی بحث کو چکایا، اور بھی کام کرتے رہے۔

لیکن جو مسئلہ اس زمانے میں سب سے نیچے دبا ہوا تھا؛ مگر بعد کو سارے فتنوں کے دب دبا جانے کے بعد آخری سوال اس ملک کا صرف یہی ایک مسئلہ بننے والا تھا، سمجھ میں نہیں آتا کہ علما کے دستور کے خلاف حضرت والاؒ کی نگاہِ دوررس نے اس کی اہمیت کا اندازہ کیسے کرلیا تھا؟ آج تو شاید اس میں کچھ اعجوبہ نہ ہو کہ ایک مسلمان عالم کسی پنڈت سے برسر بازار مناظرے کا چیلنج دے رہا ہے؛ لیکن جن دنوں کی یہ بات ہے، اس وقت کے لحاظ سے یقیناً یہ عجیب بات تھی۔ آج بھی کوئی اگر تصور کرے کہ شاہ عبدالعزیز، یا شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہما؛ حتی کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے چار ابرو کا صفایا کیے ہوئے ننگ دھڑنگ اپنی دھوتی میں کسا ہوا کوئی پنڈت ان کے سامنے کھڑا ہے، اور علم کے دعوے کے ساتھ کھڑا ہے، اور مذکورہ بالا حضرات بھی اپنے جبہ ودستار، عصا وتسبیح کے ساتھ اس کے مقابلے میں علمی سوال وجواب کے لیے ڈٹے ہوئے ہیں، اب بھی یقیناً اس کے تصور سے تعجب کی مسکراہٹ اضطراراً پیدا ہوتی ہے۔

آپ پڑھ چکے، اور سب جانتے ہیں کہ ان ہی علما کے جانشینوں اور ہم عصروں میں، جس کا مقام صرف علم ہی نہیں، عرفان میں بھی، گفتار ہی میں نہیں، رفتار میں بھی نمایاں اور بہت نمایاں تھا، آخر ایسی کون سی مجبوری پیش آئی کہ اس کو: ؎

گرچہ بد نامی ست نزد عاقلاں
ما نمی خواہیم ننگ ونام را

کہتے ہوئے اس میدان میں بے تاب ہوکر کود پڑا، اور کتنی بے تابی؟ پنڈت جی کا تعاقب جس شان سے فرمایا گیا ہے، خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس بے تابی نے آپ کو کس حد تک نیچے اترنے پر مجبور کیا تھا۔

ایک طرف وہ حال تھا اور تھا کیا؟ میرا خیال تو ہے کہ حضرتؒ جس وقت دیانند جی کے مقابلے میں آستینیں چڑھا کر اترے ہیں، اگر چہ اس پر تقریباً تریسٹھ سال گزر چکے، گویا نصف صدی سے زیادہ زمانہ گزرا[1]، اور اس عرصے میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچی؛ لیکن میں نہیں جانتا کہ علمائے اسلام کے ثقات اکابر میں اب بھی دیانند۔ جیسے لوگوں کا ذکر کم از کم تصانیف کی حد تک جائز قرار دیا گیا ہو؟ انتہا یہ ہے کہ ایسے مصنفین اسلام، جن کی کتابیں نیم مذہبی کتابیں سمجھی جاتی ہیں، مثلاً: مولوی شبلیؒ وغیرہ[2]، ان کی کتابوں میں بھی اراء ونحل وغیرہ کے ذکر کے سلسلے میں ابھی تک دیانند جی کو اس قابل نہیں سمجھا گیا ہے کہ اوروں کے ساتھ ان کا بھی ذکر کیا جائے۔ مولوی شبلی صاحبؒ نے زیادہ دن نہیں ہوئے کلام میں مشہور کتاب ''الکلام'' لکھی تھی، اور قدیم خیالات سے زیادہ جدید اعتراضوں ہی پر ان کا زور صرف ہوا ہے؛ لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں، باوجود ضرورت کے کسی ایک جگہ بھی دیانند کے ذکر پر وہ راضی نہیں ہوئے ہیں۔ حال آں کہ مادہ وروح وغیرہ کے مباحث میں ضمنی طور پر دیانند جی کے شکوک بھی ان کے پیش نظر معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن اسی لیے کہ صراحتاً کسی علمی کتاب میں دیانند جی کا نام اس زمانے تک لینا چوں کہ علمی ثقاہت کے خلاف قرار دیا جاتا تھا۔ میرا غالب گمان ہے کہ قصداً ان کے ذکر سے اعراض کیا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بازاری مناظرہ کرنے والے پیشہ وروں کا یہ کام تھا کہ پنڈت جی جیسے لوگوں کا پیچھا کریں۔ ظاہر ہے کہ حضرت والاؒ دیانند جی کے ان سارے علمی رتبوں سے واقف تھے، اور وہ واقف نہ ہوتے، تو کون ہوتا؟ مگر ساری باتوں سے قطع نظر کر کے بند کمرہ میں نہیں ٹھیک بازار میں برسر مجمع عام ان سے پنجہ آزمائی کے لیے تیار ہو گئے۔

یہی سوال ہوتا ہے کہ حضرتؒ کا یہ طرز عمل کیا کوئی اتفاقی فعل تھا، یا اس کے پیچھے کوئی غیر معمولی اہم مؤثرات پوشیدہ تھے؟ لوگ کچھ ہی خیال کریں؛ لیکن میرا خیال تو ثانی الذکر پہلو کی طرف مائل ہے۔ تفصیل کا تو موقع نہیں ہے؛ لیکن اتنا تو پھر بھی کہہ سکتا ہوں کہ اسی قسم کے عمل کے پیچھے عموماً دو ہی قوتیں کام کرتی ہیں: ''عقل مصلحت اندیش''، یا ''عشق مصلحت سوز''۔ عموماً یہ دونوں باتیں کسی ایک شخصیت میں مساوی حصے کے

---

(۱) شاہ جہان پور کا میلۂ خدا شناسی ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) کا واقعہ ہے۔ اب اس کو ایک سو چالیس برس گزر چکے ہیں۔ (نعمان- ۱۴۳۶ھ/۲۰۱۵ء)

(۲) مولوی شبلی مرحوم کی کتابوں کو نیم مذہبی کتابیں اس لیے قرار دیتا ہوں کہ اگر چہ ''الفاروقؓ''، ''سیرۃ النعمانؒ'' وغیرہ کتابیں انہوں نے مورخ کی حیثیت سے لکھیں؛ لیکن بالفرض ''الفاروق'' شیعوں کا رد ہے، ''سیرۃ النعمان'' غیر مقلدوں کا؛ حتی کہ ''المامون'' سے ان مغرب زدہ نادانوں کی مذہبی اصلاح ہو سکتی ہے، جو شاہی شان وشوکت، حکومت کے طمطراق ہی کو کسی مذہب کی صداقت کی دلیل سمجھتے ہیں۔ (گیلانی)

ساتھ کم جمع ہوتی ہیں؛ لیکن مصیبت اس بے چارے کے لیے ہوتی ہے، جوان دونوں بیماریوں میں ایک ہی وقت میں ایک ہی مقدار اور درجے کے حساب سے مبتلا کر دیا گیا ہو۔ واقعے کا علم تو خدا ہی کو ہے؛ لیکن جہاں تک درخت کی شناخت پھلوں سے کی جاسکتی ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ حضرت والاؒ کی ذات اقدس دونوں کی جامع تھی۔ جس وقت دیانند جی بازار میں آئے تھے، اس وقت ہر شخص کا کام یہ نہیں تھا کہ بازاری تقریروں کے شعلوں میں آئندہ ہندوستان کے امن وامان کے سارے سرمائے کو جلتا ہوا آج دیکھا لیتا۔ زیادہ سے زیادہ علما کے عام طبقے نے یہی خیال کیا کہ ایک شخصی سیلاب ہے، آیا ہے نکل جائے گا؛ لیکن جس کی نگاہ آج سے زیادہ کل کے واقعات پر پڑ رہی تھی، وہ دیکھ رہا تھا کہ سارا قصہ وقتی نگاہوں کا ختم ہو جائے؛ لیکن اس ملک میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے آخری خونیں خطرہ باقی رہ جائے گا، وہ ان ہی تقریریوں سے پیدا ہوگا، جس کی ابتدا آج دیانند جی نے فرمائی ہے۔

پانچواں باب:

شاہ جہاں پور کا میلۂ خدا شناسی

مسلمان اس ملک میں انگریزوں کی طرح نہ اپنا کوئی مستقل ''ہوم'' (وطن) قائم کر کے رہتے تھے، اور نہ انہوں نے التزاماً ہر آبادی میں اپنے کو یہاں کے مقامی باشندوں سے الگ تھلگ کر کے سول لائن میں آباد کیا تھا؛ بلکہ غایت سادگی میں جس کا سینگ جہاں سمایا، وہیں رہ پڑا۔ نہ اس نے شہر کو دیکھا، نہ دیہات کو۔ نہ اس کو دیکھا کہ ان کی اکثریت کہاں ہے اور اقلیت کہاں؟ جہاں جگہ ملی اور سہولت میسر آئی، اسی کو وطن بنا کر بال بچوں سمیت اتر پڑا، اور ہمیشہ کے لیے وہیں کا ہو کر رہ گیا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں، قطعاً شبہ نہیں کہ دیانند تحریک سے پہلے گو ہندو مسلمانوں میں سیاسی لڑائیاں بھی ہوتی رہیں، مرہٹہ تحریک بھی اٹھی اور سکھوں کی تحریک بھی؛ لیکن جہاں سے اٹھتی تھی، جہاں تک تاریخ کی شہادت ہے، ان ہی مقاموں تک محدود رہتی تھی اور ملک کے دوسرے علاقوں تک اس کا زہر نہیں پھیلتا تھا؛ بلکہ عموماً دیکھا جاتا تھا کہ مرہٹوں کی برگی اگر لوٹنے پر آئی، تو اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی لوٹے جاتے تھے، گاؤں میں دیدبان جو بنتے تھے، ان سے مسلمانوں کی بھی حفاظت ہوتی تھی، اور ہندوؤں کی بھی؛ بلکہ غدر کہیے یا جنگ آزادی، اس میں بھی ہندوستانی اور غیر ہندوستانی یا ولایتی ہی کا سوال ہر اس شخص کے سامنے تھا، جو اس میں شریک تھا۔

میلے کا بانی:

غدر کو تو جانے دیجیے، خود حضرت والاؒ کے ساتھ ابھی چند سال پہلے ''میلۂ خدا شناسی'' میں جو صورت پیش آئی، وہ خود اس کی دلیل ہے۔ اس سے ابھی بحث نہیں کہ خود ''میلہ'' کن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر قائم کیا گیا تھا؟ یہ بات کہ چاندا پور کا کبیر پنتھی رئیس، یعنی منشی ''پیارے لال'' بانیٔ میلہ واقعی مذاہب کا کوئی بڑا محقق یا بہ ذات خود کوئی عالی دماغ مفکر تھا، اور اسی بنیاد پر اس وقت کے تمام مذہبی نمائندوں کو مدعو کر کے وہ کسی صحیح نتیجے تک پہنچنا چاہتا تھا؟ اس کا اندازہ محض اس واقعے سے ہوسکتا ہے، جس کا ذکر اس میلے کے رپورٹر صاحب نے اس طرح کیا ہے کہ سب سے پہلے جلسے میں منشی پیارے لال ہی اٹھے؛ لیکن اٹھ کر جو فرمایا، وہ رپورٹر صاحب کی روایت کی بنیاد پر یہ تھا کہ:

''میاں کبیر نے پھول میں جنم لیا، اوران کے پنتھ میں سوتے جاگتے سانسا چلتا رہتا ہے''۔

ظاہر ہے کہ اپنے مذہب کی تائید ونصرت میں جو پھول سے کبیر میاں کو نکالے اور سوتے جاگتے سانسا چلتا رہنے کو اپنے مذہب کی صداقت کی دلیل قرار دے، اس کے متعلق بہ جز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

''مذہب معلوم ونصرت مذہب معلوم''۔

جس کام کے لیے، یعنی اپنے پنتھ کی صداقت پیش کرنے کے لیے جس بے چارے نے ہزاروں صرف کیے تھے؛ کیوں کہ رپورٹر صاحب ہی کا بیان ہے کہ:

''سب کو کھانا اور خیمے وغیرہ ان ہی (پیارے لال) کی طرف سے ملے تھے''۔

سمجھا جا سکتا ہے کہ اتنے بڑے ہمہ گیر میلے کا قیام وطعام کے ساتھ انتظام چند روپوں سے ممکن نہیں۔ یہی تو سوال ہے کہ یہ میلہ منشی جی نے خود لگایا تھا، یا میلہ لگانے کا کسی طرف سے حکم دیا گیا تھا؟

بہر حال! اس میلے کے پیچھے کسی کا بھی ہاتھ ہو، سر دست مجھے یہاں اس سے بحث نہیں؛ بلکہ کہنا یہ ہے کہ اس میلے کو باوجود یہ کہ ''ہندو، مسلمان، عیسائی'' تین حصوں میں بانٹ کر پیش کیا گیا تھا، اگر چہ عیسائی لفظ اس وقت تک صحیح نہیں تھا؛ کیوں کہ عیسائیوں کی تعداد اس وقت تک ملک میں بہت تھوڑی تھی، اتنی تھوڑی کہ قابل لحاظ نہ تھی، اور اس لیے میرے خیال میں بجائے عیسائی کے ''ہندو، مسلمان، یورپین''، ان تین پارٹیوں کی یہ میلہ نمائندگی کرتا تھا۔ میلے کے رپورٹر صاحب نے بھی یہی لکھا ہے کہ منشی پیارے لال کے ساتھ دعوت کی چٹھی تقسیم کرنے والوں میں پہلا نام پادری نولس صاحب انگلستانی کا تھا، اور گو چند دیسی بازاری عیسائی مناظرہ کرنے والے بھی اس جلسے میں شریک تھے؛ لیکن عیسائیت کا پھریرا ان ''پادری نولس صاحب انگلستانی'' ہی کے ہاتھ میں تھا، اور اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہندو مسلمان کے سوا تیسری پارٹی صحیح معنوں میں عیسائیوں کی نہیں؛ بلکہ یورپ والوں کی تھی۔

پادری کی شکست اور ہندوؤں کی خوشی:

بہر کیف! مجھے کہنا یہ ہے کہ ابتدا تو میلے کی ان تین پارٹیوں کی نمائندگی سے ہوئی؛ لیکن اس وقت عام ہندوستانیوں کی جو ذہنیت تھی، اس نے زیادہ تر اس تثلیث کو باقی نہ رکھا، اور تھوڑی ہی دیر کے بعد میلے کی حالت یہ ہوگئی کہ ایک طرف ہندو اور مسلمان دونوں تھے، اور دوسری طرف یورپیوں کی صف۔ میلے کی رپورٹ میں ہے کہ جب حضرت والا تقریر سے فارغ ہوکر بیٹھے تو:

''مولوی محمد قاسم صاحب کے گرد ایک ہجوم تھا، ہندو مسلمان سب گھیرے کھڑے تھے''(۱)۔

(۱) میلہ خدا شناسی، ص:۵۴۔

اور کیا یہ گھیرنا صرف تماشے کا گھیرنا تھا؟ آگے کے الفاظ سنیے۔ لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کی جو کیفیت تھی، سو تھی؛ مگر ہنود بھی بہت خوش تھے۔ آپس میں کہتے تھے کہ نیلی لنگی والے مولوی نے پادریوں کو خوب مات دی''(۱)۔

نیلی لنگی والے مولوی کی مات دینے سے اگر مسلمانوں کو خوشی تھی، تو ان کے خوش ہونے کی بات ہی تھی؛ لیکن انگلستانی پادری کی مات سے ہندوؤں بے چاروں کی خوشی؟ دیکھنے کی یہی چیز ہے۔

۱۲۹۲ھ/(۱۸۷۵ء) پر کئی صدیاں نہیں گزری ہیں، کل ایک نسل کی مدت ہے، مگر دوسرے قرن میں آج اسی ملک کا کیا حال ہے؟ اور تثلیث کو توڑ کر دو جماعتوں میں تقسیم ہو جانا، یعنی ہندوستانی و غیر ہندوستانی، اس کا قصہ میلے ہی تک محدود نہ رہا۔ اسی رپورٹ میں ہے کہ:

''سب اہل اسلام جب روانہ ہوئے، تو میلے کے ہندو وغیرہ مناظران اہل اسلام کی طرف اشارہ کر کے بتاتے تھے کہ یہ ہیں (یعنی حضرت مولانا محمد قاسمؒ یہ ہیں)''(۲)۔

جوگی کی خوشی اور حضرتؒ سے اظہارِ عقیدت:

بات اسی پر ختم نہیں ہوئی، جس وقت دوسروں کے ساتھ گاڑیوں کی قطار میں حضرت والاؒ کی بھی گاڑی جا رہی تھی، (غالباً واپسی میں لوگوں نے سوار ہونے پر مجبور کیا)، تو اس وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ خود رپورٹر صاحب کے الفاظ میں اس کا سننا غالباً زیادہ اثر انداز ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں:

''گاڑیوں کی قطار سے بیس قدم پر ایک جوگی جا رہا تھا، پاؤں میں کھڑاؤں، سر پر لمبے لمبے بال، برہنہ سر، ہاتھ دست پناہ، دو چار معتقد اس کے ساتھ، مولوی قاسم صاحب کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: 'جے مولبی ہے' (یعنی یہ مولوی ہے)۔ اتفاقاً مولوی محمد قاسم صاحب کی نظر اُدھر کو پلٹی، تو اس نے سلام کیا، مولوی محمد قاسم صاحب نے التفات سے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ اس نے جو دیکھا کہ مولوی صاحب التفات سے جواب دیتا ہے، تو وہاں سے دوڑا اور گاڑی کا ڈنڈا پکڑ کا گاڑی بان سے کہا: 'تھام دے'۔ اس نے اوروں کو آواز دے کر کہا تھم جاؤ۔ القصہ گاڑیاں تھم گئیں۔ جوگی صاحب بولے: 'تم نے بڑا کام کیا'۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے کہا کہ: میں نے کیا کیا؟ 'پرمیشر' نے کیا۔ اُس نے کہا: سچ کہتے ہو، پھر جوگی مذکور نے ہاتھ اٹھا کر چار انگشت سے اشارہ کر کے کہا: 'جب تم نے بولی ماری، تو ہم نے دیکھا کہ: اس کا (یعنی پادری کا) اتنا شریر (بدن) سوکھ گیا تھا، یا یوں کہا: گھٹ گیا تھا۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے فرمایا کہ:

---

(۱) میلہ خداشناسی، ص:۱۴۔ (۲) ایضاً، ص:۵۷۔

تم کہاں تھے، خیمے کے باہر تھے؟ جوگی نے کہا کہ ہم بھی خیمے کے اندر تھے۔ پھر مولوی صاحب ممدوح نے فرمایا: آپ کا نام کیا ہے؟ اس نے کہا 'جانکی داس'۔ مولوی صاحب موصوف نے فرمایا: آپ نے بڑی مہربانی کی جو آپ آئے۔ اس نے کہا کہ ہم تو تمہارے 'بیٹا بیٹی' ہیں۔ یہ کہا اور سلام کر کے چل دیا''(۱)۔

ہندو مسلم روابط کی ایک جھلک:

میرے خیال میں ''میلۂ خداشناسی'' کا یہ حصہ اس وقت جس وقت یہ لکھا گیا تھا، محض ایک معمولی واقعہ کی حیثیت سے لکھا گیا تھا؛ لیکن اس کی ہر ہر سطر ان گزرے ہوئے دنوں کی دردناک داستان ہے، جن کو کھو کر خدا ہی جانتا ہے اب یہ ملک کس انجام کو پہنچتا ہے؟ فتح ہوئی تھی مسلمانوں کی، اور ''تم نے بڑا کام کیا'' کا اعتراف کر رہا تھا ہندوؤں کا ایک پیشوا۔ ادھر ایک ہندو جوگی کے یہ جذبات ہیں، دوسری طرف اسلام کے ایک برگزیدہ ثقہ عالم کو مخاطب کی خاطر کا اتنا پاس ہے کہ اپنے ''اللہ'' کو بغیر کسی جھجک اور محابا کے ''پرمیشر'' قرار دینے میں کوئی تنگی محسوس نہیں فرمائی گئی۔ مسلمانوں کا عالم ہندو پیشوا کی توجہ کا شکریہ ادا کرتا ہے، اور ہندو پیشوا اپنے معتقدوں کے جھرمٹ میں کھلے بندوں اعلان کرتا ہے کہ:

''ہم تو تمہارے بیٹا بیٹی ہیں''۔

بہ ظاہر جوگی کا یہ فقرہ کچھ مضحکہ سا ہے۔ ایک ہی شخص بیٹا بیٹی دونوں کیسے ہوسکتا ہے؟ لیکن وہ ''ہم'' کہہ رہا تھا، ''میں'' نہیں بولا تھا۔ اس کی مراد اپنی قوم سے تھی۔ وہ اپنی قوم کے ذکور و اناث کا اسلامی عالم سے فرزندی کا رشتہ سمجھتا تھا۔ نہ صرف ایک اپنا؛ بلکہ اس ملک کے سارے باشندوں کا ایسی برگزیدہ ہستیوں کو وہ اپنا ''باپ'' سمجھتا تھا۔ یہ فقرہ اس نے جس بے تکلفی اور آمد کے رنگ میں کہا ہے، مجھے تو رسمی اور رواجی تصنع وتکلف سے بالکل پاک معلوم ہوتا ہے۔ اس نے صرف کہا نہیں تھا؛ بلکہ آپ لوگوں کو کیسے باور کراؤں کہ وہ اور اس کی قوم کے اکثر افراد کا یہی قلبی احساس تھا، اور اسی لیے میں ان چند سطروں کو ہندوستانی تاریخ کے ان ہزار ہا اوراق مختلفہ سے قیمتی قرار دیتا ہوں، جن کے ہر ہر لفظ میں قصداً ایساز ہر بھر گیا کہ بالکل یہ احساس مردہ ہو کر لاش کی صورت میں ہمارے سامنے پڑا ہوا ہے۔ اسی لیے یہ ایک اہم تاریخی ریکارڈ ہے۔ پڑھنا چاہیے اور ملک کی موجودہ حالت پر خون کے آنسو رونا چاہیے (۳)۔

---

(۱) میلہ خداشناسی ص:۵۸-۵۷۔

(۲) ایضاً ص:۵۸۔

(۳) اشارہ اس مضمون کے زمانۂ تحریر یعنی ۴۲-۱۹۴۱ء کی طرف ہے۔ (ابن ش)

اور یہاں تک تو صرف باپ اور ''بیٹا بیٹی'' کے تعلقات کے اعلان کیا گیا ہے، اس سے بھی آگے بڑھ کر اسی رپورٹ کا وہ حصہ ہے، جس میں بریلی کے رمضان خاں کی یہ شہادت درج کی گئی ہے کہ:

''کھتریوں کے کچھ آدمی شاہ جہان پور سے آئے ہیں۔ (یعنی بریلی آئے ہیں)، کیفیت مباحثہ کچھ اس طور سے بیان کرتے ہیں''۔

آگے حضرت والاؒ کی وضع قطع وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد رمضان خاں صاحب نے آخر میں بیان کیا کہ یہ کھتری سب کچھ کہنے کے بعد آخر میں حضرت والاؒ کے متعلق بولے:

''کوئی اوتار ہوں تو ہوں''(۱)۔

سر پیٹنے والے اس فقرے کو پڑھ کر آج اگر اپنے سر پیٹ لیں، تو آخر بتایا جائے کہ وہ کیا کریں؟ ایک مسلمان عالم جس نے شاہ جہان پور کے میلے میں اسلام کے سوا دنیا کے تمام ادیان مروجہ کو باطل قرار دیا، سب سے زیادہ زور جس کی تقریر میں شرک ہی کے رد پر دیا گیا تھا، اتنا زور اور اتنی قوت کہ انگلستانی پادری نولس بے قرار ہو کر چیخ اٹھا:

''واقعی مسلمانوں میں تو توحید بہت عمدہ ہے''(۲)۔

لیکن اس توحید کے منادی کے ساتھ موحدوں کا طبقہ نہیں مشرکوں کا طبقہ: ''اوتار ہوں تو ہوں''۔ کا عقیدہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اوتار کا لفظ ہندو ادبیات میں انسانیت کی جس بلندی تعبیر سے متعلق ہے، جو اس سے واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوؤں کا یہ گروہ حضرت والا کو کیا قرار دینا چاہتا تھا۔

۱۲۹۲ھ/ (۱۸۷۵ء) تک ہندو اور مسلمانوں کے ان ہی تعلقات کا تجربہ صرف شاہ جہان پور ہی میں نہیں؛ بلکہ تقریباً ہر اس مقام میں کیا جا سکتا ہے، جہاں موحدوں کی جماعت ان ہی مشرکوں کے ساتھ آباد تھی، اور ہر خوف سے بے خطر ہو کر آباد تھی؛ لیکن اسی کے دو ڈھائی سال بعد ۱۲۹۵ھ/ (۱۸۷۸ء) میں جس واقعہ کا تماشا روڑکی میں کیا جا رہا ہے، کیا واقعی وہ کوئی صرف تماشا تھا؟ تفصیل کا تو موقع نہیں ہے؛ لیکن اتنا تو اب بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس زمانے میں ایک ہی ملک، ایک ہی سرزمین کے باشندوں میں سے ایک طبقے کو للکارا جا رہا تھا کہ آگے بڑھو، بڑھتے چلے جاؤ، اتنا آگے بڑھ جاؤ کہ پیچھے کی کسی چیز سے تمہارا تعلق باقی نہ رہے، اور اسی کی اجمالی تعبیر ترقی کے سامعہ نواز افسونی لفظ سے کی جاتی تھی، اور دوسری طرف اسی ملک کی ایک اور بھیڑ تھی، پیچھے ہٹو، ہٹتے چلے جاؤ، تا ایں کہ اس عہد میں پہنچ جاؤ، جو آریہ ورت کا پراچین عہد ہے ''تمیش نے لیٹی''، یا ''قومیت'' کا لفظ اس کا معبر تھا۔

---

(۱) خدا شناسی، ص: ۴۴۔ (۲) میلہ خدا شناسی، ص: ۲۸۔

حضرت قاسم العلوم کی مومنانہ فراست:

جس راہ سے یہ دو متناقض معکوس نظریے اس ملک کے دو طبقوں میں جاری وساری کیے جارہے تھے، ان کے آئندہ نتائج تک ممکن ہے کہ سب کی نگاہیں نہ پہنچ سکتی ہوں؛ لیکن جس بے چین روح کو ایک طرف اگر ہم اس حال میں پارہے تھے کہ جنہیں آگے بڑھایا جارہا تھا، ان کی کمر تھامے پکار رہا تھا کہ پچھلوں کی چیزوں کو چھوڑ کر آگے بڑھنے والو! کچھ نہیں تو ان کا متروکہ ایمان اور عمل صالح کے ذخیرے کو تو ساتھ لیے جاؤ؛ ورنہ آئندہ اپنی طاقت کو تم کہاں ڈھونڈو گے؟(۱) جس کی ''عقل دور اندیش'' اس پکار پر اس کو مجبور کر رہی تھی، دیکھتے ہو اس کے ''عشق مصلحت سوز'' کے صرف پکار کر کہہ دینے اور فرض سے سبک دوش ہو جانے پر کیا اس کو مطمئن ہونے دیا؟ کچھ نہیں تھا اس کے پاس؛ لیکن صرف اس لیے کہ آج آگے بڑھنے کے نشے میں مست ہو کر سب کچھ چھوڑنے والے اگر ''کل'' اپنے مورثوں کے ''ایمان'' اور ان کے ''عمل صالح'' کو تلاش کریں گے، اور جو صورت حال ہے، اس کی تلاش پر بہر حال وہ مجبور ہو کر رہیں گے، تو ان تک بزرگوں کے اس ترکے کو پہچانے والے تو موجود رہیں، بے سروسامانی کے اس حال میں وہ کود پڑا، اور جس طرح اس سے جو کچھ بن پڑا اس کا سامان کر کے رہا، ''عقل مصلحت کوش'' اور ''عشق مصلحت سوز'' ان ہی دونوں کے مجموعی مطالبے کا وہ جواب ہے، جو آپ کے اور ہمارے سامنے دار العلوم دیو بند کی صورت میں کھڑا ہوا ہے، جو آج تقریباً پون صدی سے اس ذخیرے پر بہر حال پہرہ دے رہا ہے، جس کی تلاش اس ملک کے مسلمانوں کو اگر آج نہیں تو کل ضرور ہوگی، بہ شرطے کہ مسلمان ہو کر اس ملک میں رہنے کا ارادہ ہو۔ جن پر آگے بڑھنے کا جادو کیا گیا تھا، ان کے سامنے آئندہ پیش آنے والے نتائج تک اس کی نگاہ پیش آنے سے پہلے اگر پہنچ گئی تھی، تو پھر جن کو ''غیبی چابکوں'' سے مار مار کر پیچھے کی طرف ہٹایا جارہا تھا، اڑتے اور پیچھے ہٹتے ہوئے وہ جہاں تک پہنچنے والے تھے، اگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کی عقابی نگاہوں نے اس منزل کو بھی دیکھ لیا تھا، تو کیا یہ فقط میرا حسن ظن ہی حسن ظن ہے؟ ممکن ہے کہ لوگوں کو مجھ سے اتفاق نہ ہو؛ لیکن بڑے سے بڑے محرکات بھی جسے گھر سے باہر نکلنے پر آمادہ نہ کر سکے تھے، آج اسی کورڑکی کی گلیوں میں اپنے جبہ و دستار، قبح و مصلی والے ہم چشموں، ہم پیشوں کے سامنے: ؎

آوارہ و مجنونے رسوا سر بازارے

---

(۱) مطلب یہ ہے کہ ایمانی قوت اور عمل صالح کی طاقت کو کھو بیٹھنے کے بعد ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا اس ملک میں غیر مسلموں سے مقابلہ مادی قوت کا مادی قوت سے مقابلہ بن کر رہ جاتا ہے، اور مادی قوت میں ہمیشہ فیصلہ ''عِدّہ وعُدّہ'' یعنی سازوسامان، مال ودولت اور عددی قوت کی کمی وزیادتی پر مبنی ہوتا ہے، جس میں مسلمانوں کے لیے شکست کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔ (گیلانی)

کی حالت میں جو ہم پار رہے ہیں، اس کی کیا توجیہہ ہوسکتی ہے؟ اگر یہ نہ سمجھا جائے کہ جس طرح آگے بڑھائے جانے والوں کی ایک طرف اگر وہ کمر تھامے چلا رہا تھا، تو ٹھیک اسی طرح وہ پیچھے کی طرف بھگائے جانے والوں کو بھی وہ روکنا چاہتا تھا۔ ان نتائج سے روکنا چاہتا، جن پر بالآخر ابڑیوں پر ان کی یہ واپسی ان کو پہنچانے والی تھی۔ ''آج'' کے آئینے میں ''کل'' کے نقوش کا اس کی عقل مطالبہ کرتی تھی۔ یہ تو اس کا علم تھا، اور ''آج'' کے اعمال سے کل جو نتائج پیدا ہونے والے ہیں، ان کے سامنے سینہ سپر ہو جانے کے لیے اس کا ''عشق'' آمادہ کرتا تھا۔ اسی لیے اس کے علم میں بلا کی دوبینی تھی؛ لیکن اس کا ''عمل'' عزت ووقار، رسم ورواج کے تمام قیود سے آزاد تھا، اور یہی انجام ہوتا ہے ہر اس ہستی کا، جس کی فطرت کے قوام میں ''عقل'' کے ساتھ ''عشق'' کو بھی گھول دیا گیا ہو۔

ملک کی افسوس ناک حالت:

کاش! ''پراچین آریہ ورت'' کی دعوت دینے والے پنڈت جی خلوت ذکر اور ''حلقۂ درس'' کو چھوڑ کر بازار میں پھرنے والے اور مجمع عام میں تقریر ہی نہیں؛ بلکہ مناظرے تک پر آمادہ ہونے والے اس مخلص نفس کو پہچان لیتے، یعنی ''تو اپنی شکرم پر بیٹھ کر یہ جا وہ جا'' کا نظارہ پیش کرتے ہوئے آج ملک کو اس حال میں مبتلا کر کے نہ مرتے، جس میں آہ! کہ وہ سسکیاں لے رہا ہے۔

۱۲۹۲ھ/(۱۸۷۵ء) میں یا تو وہ حال تھا کہ شرک کی تردید سننے کے بعد بھی ''انگلستانی'' کے مقابلے میں ''ہندوستانی'' ایک تھا۔ جیت مسلمان موحدوں کو ہوتی تھی؛ لیکن خوش بت پرست مشرک ہندو تھے، اور ۱۳۶۰ھ/(۱۹۴۱ء) میں اسی ملک کا یہ حال ہے، آریہ ورت کے قدیم عہد کے خواب دیکھنے والوں پر اب وہ الفاظ بھی بار ہیں، جو مسلمان بولتے ہیں۔ وہ حروف بچھو بن کر ان کو لپٹتے ہیں، جن کو قرآنی حروف سے کامل نہیں، گونہ مناسبت ہے۔ ''دورے'' کے اس حملے سے نہ وہ بچا ہوا ہے، جو ان میں سب سے زیادہ نیک نیت اور فراغ سینہ سمجھا جاتا ہے، اور نہ وہ محفوظ ہے، جو ان میں ''بدنیت'' اور تنگ دل خیال کیا جاتا ہے۔

آج ملک کے ان حالات کی توجیہ جن اسباب ومؤثرات کے تحت کی جائے، بنانے کا میدان یقیناً فراخ ہے؛ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ بائیس کروڑ انسانوں کو بجائے انسانوں کے بارود کی میگزینوں کی شکل میں بدلنے کا کام ان ہی واقعات سے شروع ہوا، جن میں سے ایک واقعہ وہ بھی تھا، جس کا تماشا روڑکی میں کرایا گیا تھا، اور لوگ کچھ ہی کہیں؛ لیکن میرے نزدیک تو ''ستیارتھ پرکاش'' میں جو چنگاریاں کل بھری گئی تھیں، ''آج'' کی آگ ان ہی سے پیدا ہوئی ہے۔ خواہ وہ ڈھاکہ کی آگ ہو، یا احمد آباد کی، کانپور

کی ہو یا حیدر آباد کی، بمبئی کی ہو یا بہار کی، پنجاب کی ہو یا سندھ کی۔

شاید اس کے بعد رڑکی کی عجیب وغریب ''بے چینیوں'' کی کوئی توجیہہ نگاہوں کے سامنے آ سکتی ہے؟'' وَفِي ذَالِکَ لَعِبْرَةٌ!(۱)

(۱)(مضمون ماخوذ از): مجلّہ دارالعلوم، دیوبند، رجب ۱۳۶۰ھ/ اگست ۱۹۴۱ء، تا محرم ۱۳۶۱ھ/ فروری ۱۹۴۲ء)۔

الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی شخصیت کے امتیازی پہلو

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مدظلہ العالی٭

ایک عبقری شخصیت کے امتیازات کی ترکیز وتحدید ناممکن:

حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ کی شخصیت ایک عہد آفریں اور تاریخ ساز عبقری شخصیت ہے، جن کے امتیازات کو قلمی تحدیدات میں محدود کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے؛ اس لیے کہ جسے قدرت فیاض کی جانب سے دعاویٔ منقولہ پر نا قابلِ شکست منقول براہین آفرینی سے منور وہ عقلِ عظیم عطا فرمائی گئی ہو، کہ جس نے اسلام پر عقلی ہتھیاروں سے مسلح حملہ آروں کو بار بار المناک شکست وپسپائی پر مجبور کر دیا ہو، اور جسے ایمانِ کامل سے پرنور وہ سراپا خشوع وخضوع قلب سلیم بخشا گیا ہو، کہ جس نے طالبانِ راہِ ہدایت کو حسب صلاحیت بہ نگاہِ معنوی ''أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ؛ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ؛ فَإِنَّهُ يَرَاكَ'' کے مقامات تک رسائی عطا فرمادی ہو، اور جسے حکمتِ قرآن کی ترجمان، وہ فیاض زبان مرحمت فرمائی گئی ہو، جس نے دین کے بارے میں شکوک وشبہات اور اعتراضات وتلبیسات کی دلدلوں میں پھنسنے والے محروم یقین طبقات کو دولتِ ایمان ویقین سے مالا مال فرمادیا ہو۔

فہرستِ امتیازات برسبیلِ اجمال:

غرض! فہرستِ امتیازات برسبیلِ اجمال یوں پیش کی جاسکتی ہے کہ: جس کی ذاتِ گرامی علمِ کتاب وسنت میں بے مثال، عالمگیر فکرِ اسلامی میں بے تمثال، ترتیبِ روحانی میں با کمال، زندگی کے ہر جز وکل میں متبعِ سنت، معلّمیت میں منفرد، طاعت وعبادت میں شب زندہ دار، اصلاحِ باطن میں ماحیٔ ذوقِ معصیت، علم وقیع میں مرادِ حق شناس، تصنیف وتالیف میں اطمینان آفریں نکتہ سنج، انفرادیت میں متین، اور اجتماعیت میں متدین، رہنمائے عظیم جیسے بے شمار بنیادی امتیازاتِ عظیمہ کی حامل ہو، اور ان کا اعتراف اپنوں ہی نہیں؛ بلکہ مخالفین واعدائے اسلام نے بھی زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہو، اُس سراپا عظمت وامتیاز کی ذات گرامی پر ''سیمینار'' کے صاحبِ فکر ونظر، اربابِ بست وکشاد نے راقمِ بے بضاعت کو اس کے ''ذکرِ امتیازات''

٭ صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند۔

پر مامور فرمایا ہے؛ اس لیے سوچنا پڑتا ہے کہ اس تیرھویں صدی کے اس مجددِ اعظم کے امتیازات پر قلم حرکت میں آئے، تو کیسے آئے؟ کیوں کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی ذاتِ مقدسہ کے علاوہ کسی میں عہد آفریں شخصیت کے تمام نقوشِ حیات وخدمات کو اس طرح سمیٹنا کہ کوئی گوشہ اظہار وانکشاف سے رہ نہ جائے، نہ صرف ناممکن ہی ہے؛ بلکہ امت کے آفتابوں اور ماہتابوں کی تابناک تاریخِ حیات کے نہاخانوں سے اس کی کوئی مثال بھی بظاہر پیش نہیں کی جاسکتی؛ اس لیے اس نکتۂ فکر کے تحت کسی تاریخ ساز شخصیت کے امتیازات کا تذکرہ مزید غیر معمولی اور مشکل ترین اہمیت کا حامل بن جاتا ہے:

(۱) اتباعِ سنت:

حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ کا وہ اولین اور بنیادی امتیاز کہ جو تمام دیگر مہتم بالشان امتیازات کا مورث ہے، وہ ''اتباعِ سنت'' کا فطری ذوق تھا، کہ جس کو حق تعالیٰ نے چھ سال کی عمر میں ایک ''رویائے صادقہ'' کے ذریعہ اس معصوم بچے کی عظیم المرتبت اور تاریخ ساز شخصیت بننے کی امید کو توقع سے آگے بڑھا کر اہلِ علم وبصیرت بزرگوں کے لیے یقین میں تبدیل کردیا تھا۔

چھ سال کی عمر میں حضرت الامام النانوتویؒ کا دیکھا ہوا ایک خواب:

جس کا اجمال یہ ہے کہ: حضرت الامام نے چھ سال کی عمر میں خواب دیکھا کہ: ''میں بیت اللہ شریف کی چھت پر کھڑا ہوں، اور میرے ہاتھوں اور پاؤں کی تمام انگلیاں پانی کا چشمہ بنی ہوئی ہیں، اور ان سے صاف وشفاف پانی نکل کر چاردانگ عالم میں پھیل رہا ہے''۔

اس خواب کی تعبیر:

حضرت الامامؒ کے خاندانی عالم وبزرگ، استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خواب سن کر تعبیراً فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ محمد قاسم کے ذریعہ دینی تعلیم کا فیضان عالم گیر پیمانے پر جاری فرمائے گا''۔

اس سچے خواب کی سچی تعبیر حضرت الامامؒ کے تاسیس فرمودہ اس دار العلوم دیوبند کی صورت میں دنیا کے سامنے موجود ہے کہ جس کے عالم گیر فیضان پر کسی توضیحی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) جامعیتِ علوم اکابرِ عظامؒ اور ان کی ترجمانی:

اس اساسی امتیاز کے ذکر کے بعد، تعمیلاً للحکم، آغازِ کلام کے لیے یہ عرض کرنا ان شاء اللہ! بے محل نہ ہوگا

کہ: تیرہ صدیوں پر مشتمل اسلام کی مسلّمہ عظیم علمی اور دینی شخصیاتِ عظیمہ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد ان کے بے شمار صاحبِ فضل وکمال منتسبین وتلامذہ میں سے عام طور پر کسی ایک ہی کو قدرتِ فیاض نے ان کے علومِ دقیقہ اور معارفِ عمیقہ کی تشریح وتحقیق کی توفیق سے نوازا ہے۔ جیسے حضرت شمس تبریزؒ عالم رنگ وبو سے پردہ کناں ہوئے، تو ان کے کثیر التعداد تلامذہ میں سے حق تعالیٰ نے حضرت شیخ جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے القائی علوم کی ترجمانی کی توفیق سے مشرف فرمایا۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے علوم کے بحرِ زخار سے ہزاروں سیراب ہوے؛ لیکن ترجمانی کی فضیلت ابن قیم رحمہ اللہ کا مقدر بنی۔ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ مقبور ہوے، تو ان کے لاتعداد تلامذہ خدمتِ حدیث کے لیے موَفق ہوے؛ لیکن ترجمانیِ علومِ ابن حجرؒ کا عز وشرف علامہ سخاوی رحمہ اللہ کے حصے میں آیا۔

صاحبِ فتح القدیر ابن ہمام رحمہ اللہ کے بعد ان کے متنوع علوم کو ترجمانی کے ذریعہ آفاقی شہرت عطا کرنے کا اعزاز قاسم ابن قطلو بغا رحمہ اللہ کو نصیب ہوا۔

محسنِ ملت، مسند ہند، محدث جلیل حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب وسنت میں بے مثال استنباطی حکمت سے بے شمار فیضیاب ہوے؛ لیکن اس مشکل ترین حکمت آفریں علم کی ترجمانی کا شرفِ کبیر رب العزت نے اُن کے عظیم المرتبت صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ عطا فرمایا۔

اور سرتاجِ مشائخ کرام حضرت اقدس الحاج حضرت شاہ امداد اللہ صاحب تھانوی قدس سرہ کو لدنی علوم اور مربیانہ معارف سے حق تعالیٰ نے بہرہ یاب فرمایا تھا۔ ان کی ذاتِ گرامی سے یہ عرفان اور فیضان بے شمار طالبینِ حق کو پہونچا؛ لیکن فہم وفراست کی معقول ترین امتیازی بنیادوں پر امداد الٰہی علوم کی اخری گہرائیوں تک رسائی، اور ان سے دُررِ نایاب وعجیب کی دریافت وترجمانی کا اعزاز عظیم حق تعالیٰ نے حضرت الامام مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ العزیز، بانیِ دار العلوم دیوبند کو عطا فرما کر نہ صرف اس بحرِ زخار کے بڑے بڑے شناوروں کو ہی صفِ مستفیدین میں شامل فرمادیا؛ بلکہ یہ عرض کرنا قطعاً مبالغہ سے مبرا ہے کہ: سرزمینِ نانوتہ کے اس عظیم الافادہ ”شمس تبریزؒ“، علوم ربیانیہ کے ”حافظ ابن تیمیہؒ“، آفاقی عظمت ووسعتِ فکر کے ”ابن حجر عسقلانیؒ“، اور ”امداد الٰہی علوم لدنیہ“ کے ترجمان کو امت کے لاتعداد عظمائے علم کی رمز شناسی، زعمائے فکر کی دقت شناسی، اور اپنی ذاتی عرفان تابی کے شرف وامتیاز نے جس باعظمت مقامِ اختصاص پر فائز فرمادیا تھا، اس نے ہمہ جہت ایمانی بزرگی اور مسلّم عرفانی برگزیدگی کے ساتھ آپ کی حیرتناک علمی اور استدلالی ندرت وقدرت کے اعتراف میں انصاف وعرفان ناشناسوں کو چھوڑ کر آج تک ہر

دور کے منصف اہل علم وایمان، رطب اللسان بنے ہوے ہیں۔

(۳) علومِ نانوتویؒ کی ترجمانی کا شرف:

حضرت الامامؒ کا یہ تیسرا امتیاز بھی قابلِ ذکر تاریخی اہمیت کا حامل ہے، کہ جس طرح قدرتِ فیاض نے انہیں اپنے منفرد علوم عظیمہ کے ساتھ بیشتر مشاہیر اسلاف کرام کے علوم کا حامل بنایا تھا، اسی طرح ان کے بعد ان کے بے نہایت نادرالوجود علوم عمیقہ کی ترجمانی وتوضیح بھی طرزِ مذکور کے مطابق کسی ایک فرد کے نہیں؛ بلکہ راسخین فی العلم کی ایک پوری جماعت کے حصے میں آئی۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں صرف ان مخلص ترین عرفائے کاملین کے اسمائے گرامی سپرد قلم کردوں کہ جنہوں نے حضرت الامامؒ کے فیضانِ علم ومعرفت کے بعد کی نسلوں کو مستفید ہونے کی راہ ہموار فرمائی ہے، اور حق تعالیٰ کے فضل وکرم سے راقم الحروف کو ان کی زیارت اور ان کی مبارک زبانوں سے دیگر اکابر رحمہم اللہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً حضرت الامامؒ کے ایمان آفریں کلمات وواقعات سننے کا شرف بھی حاصل ہوا، جو درج ذیل ہے:

ترجمانانِ علومِ نانوتویؒ کا اجمالی تذکرہ:

(۱) محقق جلیل، حکیم الامت حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی، قدس سرہ، سابق سرپرست دار العلوم دیوبند۔

(۲) امینِ علومِ قاسمیہ، جامع المعقول والمنقول، استاذ الاساتذہ، حضرت العلامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی، رحمہ اللہ، سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند۔

(۳) متکلم اسلام، محدث جلیل، دانائے رموزِ قاسمیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، رحمہ اللہ، سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند۔

(۴) عارف جلیل، نمونۂ اسلاف حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائپوری، رحمۃ اللہ علیہ۔

(۵) غواصِ بحر معارف، واقفِ اسرارِ حِکَمِ قاسمیہ، خطیبِ اعظم، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، رحمہ اللہ، سابق مہتمم دار العلوم دیوبند۔

(۶) مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، رحمہ اللہ، سابق مفتی دار العلوم دیوبند، وبانی دار العلوم کراچی۔

(۷) عالمِ ربانی، فقیہِ عظیم حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری، رحمہ اللہ، بانی جامعہ اشرفیہ لاہور۔
(۸) مربی کامل، مثیلِ شیخ تھانوی حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب، رحمہ اللہ، کراچی، پاکستان۔
(۹) مرشدِ کبیر حضرت مولانا شاہ مسیح اللہ خاں صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، جلال آباد، (مظفر نگر)۔
(۱۰) نمونۂ شیخ تھانوی حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب، رحمہ اللہ، الہ آباد۔
(۱۱) مستفیدِ باکمال حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری، رحمہ اللہ، سابق مہتمم مدرسہ بیت العلوم، سرائے میر، اعظم گڑھ۔
(۱۲) عارف کامل حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری، بانی وسابق مہتمم مدرسہ خیر المدارس، ملتان (پاکستان)۔
(۱۳) منیبِ باکی حضرت مولانا فقیر محمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، پشاور، (پاکستان)۔
(۱۴) عارف عرفانِ شیخ تھانویؒ، حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، رحمہ اللہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔
(۱۵) خطاطِ کبیر حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب، رحمہ اللہ، سابق صدر شعبۂ کتابت دارالعلوم، دیوبند۔

(۴) اے دشمنِ جاں! تجھ سے تو تیرا خیال اچھا ہے:

حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ کے علم وقیع اور عالم گیر اسلامی فکر وسیع کے امتیاز کا جس طرح اعتراف وقت کے بلند پایہ علمائے اسلام نے فرمایا، ٹھیک اسی طرح دیگر مذاہب کے اختصاص علمی میں ممتاز شمار کیے جانے والے غیر مسلم اہلِ علم کو بھی آپ کی قوتِ استدلال اور ہر دعویٰ کو ثابت کرنے والے ناقابلِ شکست دلائل و براہین قائم کرنے کی بے مثال صلاحیت پر خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اس ذیل میں حضرت الامامؒ کی جانب سے معاندینِ اسلام کے حملوں کے ان دندان شکن جوابات کو بلاخوف وتردد پیش کیا جاسکتا ہے، کہ جنھوں نے اعدائے اسلام کی زبانوں کو نہ صرف گنگ کر دیا تھا؛ بلکہ عقلِ انسانی کو براہِ راست اپیل کرنے والے اُن جوابات کو سن کر بدترین دشمنانِ اسلام نے اپنی لاجوابی کا اعتراف اس انداز میں کیا کہ:

> ''اگر کسی کی تقریر پر ایمان لایا جاسکتا، تو مولانا محمد قاسم صاحب کی تقریر پر ہم ایمان ضرور لے آتے''۔

جس کے معنی اس کے سوا کیا ہوسکتے ہیں کہ: حق کے ناقابلِ تردید مدلل ثبوت کے بعد ان کے دینِ حق کو قبول نہ کرنے کی توجیہہ اپنے دنیوی اعزاز ومنافع سے محرومی کے خطرے کے سوا کچھ نہیں کی جاسکتی۔

(۵) فروغِ تعلیم، یا اتباعِ کتاب وسنت کے انمٹ نقوش:

حضرت الامامؒ کی یہ عظیم سیاسی رہنمائی، تاریخی اہمیت کے حامل ہونے کے باوجود عام طور پر نگاہوں سے اوجھل رہی ہے کہ فرنگی حکومتِ غاصبہ سے نبرد آزمائی میں ناکامی اور اس کے پرفریب امنِ عام کے اعلان کے بعد حضرت الامامؒ نے بھی بلا تاخیر اپنی فراستِ ایمانی سے شمشیر وسنان کے بجائے جنگ کا رخ ملت میں علمی اور ایمانی استقامت اور جذبۂ حریتِ وطن کی برقراری کے لیے نہ صرف تعلیم دین ہی کی جانب موڑ دیا؛ بلکہ وہ دور چوں کہ ملت اسلامیہ پر اقتدار سے محرومی کے بعد غالب وظالم انگریزوں کے بے تحاشا مظالم سے پیدا شدہ شکست خوردگی اور عجز ومایوسی کا دور تھا، جس میں ملّی زندگی کا دائرۂ فکر وعمل پست فکری سے دوچار ہو چکا تھا؛ اس لیے ایسے شدید اور نازک وقت میں عام سیاسی قائدین کا محورِ فکر ملت کو اس فکری پستی وناامیدی کی ذلت ناکیوں سے نکالنے کے سوا دوسرا نہیں ہوتا، جو بادیٔ النظر میں وقیع اور صحیح بھی معلوم ہوتا ہے اور ضروری بھی۔

لیکن حضرت الامامؒ نے اپنی فراستِ ایمانی آمیز سیاستِ اسلامی سے اس کو ملت کے مرض کی صحیح تشخیص نہ قرار دے کر اپنا محورِ فکر، ملت کی ان فطری صلاحیتوں کو بنایا، کہ جو عہد مغلوبیت میں مستور تو ہو سکتی ہیں؛ لیکن معدوم نہیں ہوتیں، اور قیادتِ سلیمہ پر بھر پور اعتماد کے ساتھ یہ صلاحیتیں بروئے عمل آنے کے بعد شکست خوردگی کے بجائے ''ہمت آفریں شعور''، ذلت ومغلوبیت کے بجائے ''مددِ خداوندی پر یقین''، شدید وقبیح حوادث سے ہمت شکنی کے بجائے ''حوصلہ مندانہ عزم''، رفعت پسندانہ اقدامات کے نتائج کے بارے میں شکوک وشبہات کے بجائے ''کامیابی کا یقین''، اور بااقتدار معاند قوتوں کے سامنے خود سپردگی کے بجائے ''غیرت مندانہ موقف استقامت'' قومی زندگی کے دھارے میں انقلاب برپا کرنے والا ایسا مؤثر ذریعہ بنتے ہیں کہ جس کا ادنیٰ تصور بھی مغلوب ومفتوح ملت کو محض پست فکری اور یاس وناامیدی سے نکالنے کے طرز قیادت سے متصور نہیں ہو سکتا۔

بہ نظر غائر اگر جائزہ لیا جائے، تو فطری قیادت کے یہ اصول خود ساختہ نہیں؛ بلکہ کتاب اللہ سے ماخوذ ومستفاد ہیں، جن کو فرائضِ نبوت میں گنواتے ہوئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ، يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمِ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ"(۱).

---

(۱) سورۃ آل عمران: ۱۶۴۔

(الف) ''تلاوتِ آیات'' کے ذریعہ مخاطب ملت کو مقصدِ قیادت پر مطلع کرنے کی راہنمائی کے ساتھ اس پر مکمل اعتماد۔

(ب) ''تزکیہ'' کے وسیع تر مفہوم سے شکست خوردگی، اور اس کے لوازم سے قلب ودماغ کو فراغ بخشنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

(ج) ''تعلیم کتاب'' سے قائدانہ احکام کی صحت وافادیت پر ایسا یقین محکم پیدا کرنا کہ اس کے بر خلاف کوئی بھی اور کسی کا بھی حکم مخاطبین کے لیے ادنیٰ درجے میں لائقِ التفات نہ رہے۔

(د) ''حکمت'' سے مقصدِ حیات کی یاددہانی کے ساتھ دنیوی زندگی کے علمی، عملی منافع عامہ کو حاصل کرنے کے لیے ''اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ'' کے تحت کامیابی کے تمام ضروری وسائل کو استعمال کرنے پر یہ کثیر الجہات کلمۂ حکمت مشیر ہے۔

پس حضرت الامامؒ نے ان ہی قرآنی نقاطِ طیبہ پر اپنی قیادت کی بنا قائم فرما کر اپنے ذوقِ اتباعِ کتاب وسنت پر انمٹ نقوش قائم فرمادی۔

(۲) تحریکِ بنائے مدارس:

حضرت الامامؒ کی یہ قیادتِ اسلامیہ جس کی صحت پر وقت کی نزاکت من جانب اللہ مہر تصدیق ثبت کرچکی تھی، اس کی عملی تشکیل میں بے سروسامانی کے علاوہ سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ انگریزوں نے برِّ صغیر کی حکومت چوں کہ مسلمانوں سے چھینی تھی؛ اس لیے اپنے غاصبانہ اقتدار کی تاراجی کے بارے میں انگریز اگر خائف تھا، تو صرف مسلمانوں ہی سے تھا، اسی خطرہ وخوف کے تحت اس نے ۱۸۵۷ء میں مکمل تسلط کے بعد مسلمانوں کے برخلاف قتل وغارت گری، لوٹ مار، اور جائدادوں اور جاگیروں کی ضبطی کو اپنے ظالمانہ اقتدار کی برقراری کا واحد ذریعہ قرار دے کر ان کو دانہ دانہ کا محتاج بنادیا؛ لیکن دین وایمان پر اپنا سب کچھ قربان کرنے والے، اور حریت طلبی کو قومی، ملکی اور سیاسی ضرورت سے آگے بڑھ کر مذہبی اور دینی فریضہ باور کرنے والے، قائلینِ ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ'' کو بے تحاشا ظلم وستم کی گرم بازاری، آزادیٔ وطن کے لیے جرأت مندانہ اقدامات سے روکنے میں حکومتِ وقت کو ذلت ناک ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ جس کا انگریز نے ایک دانا دشمن کی حیثیت سے گہرا جائزہ لے کر اس حقیقت کو پالیا کہ مسلمانوں کے آزادیٔ وطن کے جذبۂ صادق کو ناقابلِ شکست قوت وطاقت دینے والے صرف یہ مدارس ہیں، جن کا ناقابلِ شمار تعداد میں ملک بھر میں جال پھیلا ہوا ہے۔

شاطر انگریز کی عیارانہ پالیسی:

مسلمانوں میں ان دینی تعلیمی سرچشموں سے اسلامی غیرت وحمیت اور جذبۂ حریت طلبی کی آبیاری کے رازکو پالینے کے بعد شاطر دشمن انگریز نے قتل وغارت گری کی پالیسی کو ناکام دیکھ کر اپنی عیارانہ سیاست کے امن عام کا اعلان کردیا؛ لیکن اس سے زیادہ مسلم کش؛ بلکہ اسلام کش دوسری نئی پالیسی کے تحت مدارس اسلامیہ کو محورِ انتقام بنایا، اور ملک بھر کے ان تمام اوقاف کو بحق سرکار ضبط کرلیا کہ جو اس دور میں مدارس دینیہ کی بقا کا واحد ذریعہ تھے، اور دوسری جانب مسلمان اپنی اقتصادی بدحالی کے باعث ان دینی مراکز کو سنبھالنے کے قابل رہے نہیں تھے؛ اس لیے اس خطرناک صورت حال کے نتیجے میں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ لاتعداد مدارس دینیہ میں تالے پڑ گئے۔

ہندوستان کے تین بڑے مکاتب فکر اور ان کی تاراجی:

پھر یہ ہی نہیں؛ بلکہ اس سے بڑا المیہ یہ تھا کہ ملک کے درج ذیل تین اسلامی مکاتبِ فکر کہ جو پورے ملک کے مدارس دینیہ کے دینی اور علمی محتسب کا وقیع کردار ادا کررہے تھے، وہ بھی وقت کی اس قہرمانی دستبرد سے محفوظ نہ رہ کر ختم ہوگئے۔

(۱) مکتب فکر ولی اللہی (مرکز علم حدیث):

ان میں اولین ''مکتب فکر ولی اللّٰہی'' دہلی میں تھا، جس نے دین کے مصدرِ ثانی ''علم حدیث'' کو شرحِ کتاب اللہ کی حیثیت سے پیش کرنے کا اس دور میں اہم فریضہ اس وقت ادا کیا، کہ جب حتمی اور قطعی اور یقینی مراداتِ ربانی کو واضح کرنے والی حدیث رسول اللہ سے کتاب اللہ کو علمائے سوء نے یکسر منقطع کرکے اور کتاب اللہ کو اپنی زرطلبی اور جاہ طلبی کی حقیر وذلیل اغراض فاسدہ کے لیے ایسا قوی وسیلہ بنا رکھا تھا کہ اس کے برخلاف آواز اٹھانا دعوتِ مبارزت کے مترادف بنا ہوا تھا۔

لیکن یہ ہی مکتب فکر ولی اللّٰہی تھا کہ جس نے ایسے شدید ترین صبر آزما احوال وحوادث سے دوچار ہونے کے باوجود حدیث رسول اللہ کو معتبر شرح قرآن کی حیثیت سے پیش کیا، اور صحیح مراداتِ ربانی کی مدلل توضیحات سے ملت کو آشنا بنانے کا زبردست فریضہ انجام دیا، جس کے نتیجے میں علم دین کے معتبر ومستند ہونے کے لیے ''فن حدیث'' کی لازمی ضرورت سے واقفیت عام ہوئی، اور مکتب فکر ولی اللہی سے اس مصدر ثانی، یعنی حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض عظیم حاصل کرنا فضلائے مدارس کا ذوق عام بن گیا۔

(۲) مرکزعلم فقہ واصول فقہ:

دوسری جانب لکھنؤ ''فقہ اور اصول فقہ'' کا ملک گیر مکتب فکر تھا؛ اس لیے فقہی ذوق رکھنے والے فضلاء لکھنؤ سے مستفید ہوتے تھے۔

(۳) مرکزعلم منطق وفلسفہ:

اور تیسرا منطق وفلسفہ کا معقول مکتب فکر ''خیر آباد'' تھا؛ اس لیے معقولات سے مناسبت رکھنے والے خیر آباد کا رخ کرتے تھے۔

ان تینوں مکاتب فکر کے ختم ہوجانے کے بعد اس نازک اور خوفناک صورت حال نے دردمندانِ دینِ متین کو عمومی طور پر بے چین بنا رکھ دیا تھا؛ لیکن حضرت الامام النانوتویؒ قلب وذہن مبارک پیش آمدہ صورت حال کی وحشت ناکی کے احساس کے ساتھ اس کی امکانی تلافی پر مرکوز تھا، جو ایک نئے مرکز علم ودین کی تاسیس کے بغیر ممکن نہیں تھی؛ لیکن جس وقت دشمن اسلام ومسلمین انگریز حکومت کی پوری معاندانہ سیاسی قوتیں مستقل پالیسی کے تحت مدارس اسلامیہ کو تاراج کرنے پر لگی ہوئی ہوں، ایسے وقت میں کسی نئے مرکز علم ودین کی تاسیس کا تصور جس درجہ خطرناک ہوسکتا تھا، وہ کسی وضاحت کا طالب نہیں۔

حضرت الامام النانوتویؒ اور تشخیص مرض بہ شکلِ تاسیس دارالعلوم:

لیکن حضرت الامامؒ کا یہ عزم الہام خداوندی سے مؤید تھا؛ اس لیے آپ اپنے اس عزم صمیم کو اپنی فراست ایمانی سے اس طرح معرض وجود میں لائے کہ ''دیوبند'' جیسی چھوٹی سی بستی میں ایک چھوٹی سی مسجد جو ''مسجد چھتہ'' کے نام سے معروف ہے، اس میں ایک انار کے درخت کے نیچے صرف ایک استاذ محمود اور ایک شاگرد محمود کے ذریعہ اس عالم گیر مرکز علم ودین کی تاسیس فرمائی۔

حضرت الامامؒ کا یہ تاسیسی عمل ایک طرف آپ کی سیاستِ اسلامی اور فراستِ ایمانی کا بایں معنی مظہر اتم تھا کہ اس مدرسہ کو ظاہری طور پر ایک معمولی مکتب کی متواضعانہ صورت دے کر دشمنِ مدارس حکومت وقت کی نظر میں ناقابل التفات بنائے رکھا، اور دوسری جانب من جانب اللہ بلا تشہیر برِّصغیر کے بیشتر علمی اور دینی حلقوں نے حضرت الامامؒ کی کتاب وسنت پر مبنی عالم گیر علمی عظمت، فکری وسعت اور کلامی ندرت کی معروف صفات کی بدولت اس دارالعلوم کو ضبطی اوقاف سے پیدا شدہ نقصانِ عظیم کی تلافی کا ذریعہ تسلیم کیا۔ چناں چہ پہلے ہی سال میں اس مرکز علم ودین میں ملک کے دور دراز مقامات سے علماء وطلبہ کی آمد ورفت کا سلسلہ

شروع ہو گیا۔

پس حضرت الامامؒ کے بے شمار امتیازات میں یہ امتیاز سب سے فائق تر قرار دیے جانے کے مستحق ہے کہ آپ نے اپنے قائم فرمودہ بلند معیار ''حدیثی مکتب فکر دار العلوم دیوبند'' میں ملک کے اہم ترین منتشر ومندرس مکاتب کو سرزمین دیوبند پر جمع فرما کر حسب تقاضائے وقت ایک جامع ترین علمی اور دینی مجموعہ مکاتب فکر ملت اسلامیہ کو عطا فرما دیا، اور اس طرح آپ نے نہ صرف عظیم نقصان کی عظیم ترین تلافی ہی فرما دی؛ بلکہ ہندوستان میں اسلام کا نام تک ختم کر دینے کے انگریزی ناپاک عزائم کو بھی ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا دیا۔

دارلعلوم دیوبند کی یہ ہی وہ علمی فکری اور قاسمی جامعیت ہے کہ جو طرۂ امتیاز کی حیثیت سے دار العلوم کو چار دانگ عالم میں بلا استثنا تمام صحیح العقیدہ دینی مدارس ومعاہد کی مرکزیت کا حامل بناتی ہے۔

(۷) دار العلوم دیوبند علم وعشق کا گہوارہ اور عالم گیر مرکز:

اس عالم گیر مرکز علم ودین کا کتاب وسنت سے ماخوذ درج ذیل تاسیسی فکر بھی حضرت الامامؒ کے عظیم امتیازات میں ایک ایسا بیش قرار اضافہ ہے کہ جو مقبولیت عند اللہ کی بدولت نہ صرف ایشیا؛ بلکہ پوری دنیا میں تاسیسِ مدارس کے لیے آج اسوۂ عمل بن چکا ہے، اور وہ یہ ہے کہ حسب روایت حدیث: حق تعالیٰ نے پشتِ آدم علیہ السلام سے کل اولادِ آدم کو نکالا اور تمام حجابات اٹھا کر اپنی ذات سراپا جمال وکمال کی جلوہ نمائی کے ساتھ ''أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ'' کا سوال فرمانا، اور اس پر سراپا عمل حکمت کے ذریعہ حق تعالیٰ نے انسان کے بھوکے قلب کو اپنے جمال کے ذریعہ ''سوزِ عشق'' کیف علم کے تحفۂ غذا عنایت فرما کر آسودہ فرما دیا، اور سوال کے ذریعہ بھوکے دماغ کو ''کیف علم'' کے تحفۂ غذا سے سیری مرحمت فرمائی۔

یہ دو ازلی خدائی تحفے اس طرف مشیر ہیں کہ انسانیت ارتقائے مطلوب کی منزلِ مراد تک صرف اسی نظام کے ذریعہ باریاب ہو سکتی ہے کہ جو بے کراں وسعتیں رکھنے والے انسانی دماغ کو علوم بے نہایت عطا کرے، اور عروج الی اللہ کے دانائے راز قلب انسانی کو سوز عشق سے راہِ عروج کی رہنمائی بخش سکتا ہو۔

اور اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ انسانی نظامِ حیات میں علم وعشق کی یہ باہم آمیزی عقل انسانی نہیں، صرف خالقِ انسان کی قدرت بے نہایت ہی کر سکتی ہے، اور بواسطۂ انبیاء علیہم السلام اللہ رب العزت کی جانب سے دین اسلام جیسے علم وعشق سے مرکب نظام کامل ومکمل پر انسان کو عمل کا مخاطب بنایا جانا، اس اعلان کو کسی مزید توضیح کا محتاج نہیں بننے دیتا کہ انسان کو اشرف المخلوقات تسلیم کرنے کے باوجود یہ دین

فطرت انسان کومقنن تسلیم نہیں کرتا۔

علم بے عشق اور عشق بے علم ''شرک وبدعت'' کے وجود کا مرکز:

نیز اسی سے یہ نا قابل انکار انکشاف بھی برملا سامنے آجاتا ہے کہ نہ تنہا ''علم'' مسائلِ انسانیت کا حل ہے، اور نہ تنہا ''عشق''؛ کیوں کہ یہ امر مشاہد اہل علم کے لیے مسلم حقیقت ہے کہ شرک وکبر نے جب بھی جنم لیا، تو وہ ''علم بے عشق'' ہی کے بطن سے جنم لیا ہے، اور بدعت جب بھی معرضِ وجود میں آئی ہے، تو ہمیشہ اس کا ذریعۂ تخلیق ''عشق بے علم'' ہی بنا ہے۔

لہٰذا علم وعشق کی باہم آمیزی کے معنی یہ ہیں کہ: ''عشق'' علم کوتواضع آمیز کر کے صحت وپرتاثیری عطا کرتا ہے، اور ''علم'' اتباعِ سنت کی رہنمائی کے ذریعہ عشق کو وسیلۂ قرب ومعرفت بناتا ہے۔ اور ماضی کی طرح آج بھی ملت اسلامیہ میں علم بے عشق جو فتنے جگا رہا ہے، اور ایسے عشق بے علم کی کوکھ سے جن نو ایجادات بدعات کی روز بروز تولید ہو رہی ہیں، وہ اظہر من الشّمس ہے۔

بانی دار العلوم اور اساتذہ وطلبہ کے لیے دو جامع اصول:

پس بانی دار العلوم حضرت الامام النانوتویؒ نے اپنے رفیع القدر اتباعِ سنت پر مبنی ذوق کے تحت اس مرکز کے نظام میں علم وعشق کو اس طرح باہم آمیز فرمایا کہ درس گاہوں میں طلبہ کو دورانِ درس اساتذہ سے علمی تحقیق پر مبنی ہر قسم کے سوالات کی اصولاً آزادی عطا فرما کر اور اساتذۂ کرام کو اطمینان بخش جواب دہی کا مکلّف بنا کر طلبہ کے دماغوں کو زیادہ سے زیادہ غذائے علم سے آسودگی کا موقع مہیا فرمایا۔ اور طلبہ پر درس گاہ سے باہر ''ماحولِ مدرسہ'' میں احترام کامل کے ساتھ اساتذہ کی بلا چوں چرا ایسی اطاعت وفرمانبرداری پر مامور فرمایا، جیسی خانقاہوں میں مرید اپنے شیخ کی اطاعت کرتا ہے۔ اور اس ذریعہ سے سوزِ عشق سے حصہ یابی کی طرح ڈال کر حضرت الامامؒ نے خانقاہی مقصد سے بھی طلبہ کو مانوس کرنے کی معقول ومؤثر تدبیر فرمادی۔

بالفاظِ دیگر علم وعشق کی باہم آمیزی کی ضرورت وعظمت پر مشتمل معروف دانائی آمیز مقولے ''ہر طالب علمے کہ چوں وچرا نہ کند، وہر طالبے کہ چوں وچرا کند؛ ہر دو را در چراگاہ باید رسانید'' کو حضرت الامامؒ نے اصولی حیثیت دے کر شاملِ نظامِ تعلیم فرمادیا۔

پھر علم وعشق چوں کہ اپنی فطرت کے لحاظ سے ظہور وبروز کے طالب ہیں۔ پس مذکورہ پرداز تعلیم وتربیت پر تاریخ شاہد ہے کہ اس مرکز علم ودین کے وابستگان کے ذوقِ علم کو عشق آمیز تواضع نے شرک وکبر سے نہ صرف دور؛ بلکہ نفور بنادیا ہے، اور داعیۂ عشق کو علم کی رہنمائی کتاب وسنت نے تمام نو ایجاد بدعتوں

سے پورے طور پر تحفظ عطا کر دیا ہے۔ اور آج الحمد للہ! ملک و بیرونِ ملک میں لاتعداد مدارس اسلامیہ حضرت الامامؒ کے جاری فرمودہ اسی علم وعشق آمیز نظام پر نہایت کامیابی کے ساتھ مصروف خدمت ہیں۔

(۸) فکرِ قاسمی کا نقطۂ امتیاز:

اسی جامع ترین اسلامی فکر قاسمی کا وہ بنیادی نقطۂ امتیاز جس کو ہر دور میں وارثینِ فکر قاسمی کے اکابر واصاغر نے بقوت سنبھالا ہے، وہ ملت اسلامیہ میں ناصواب مکاتب فکر کی تولید پر چراغ پا نہ ہو کر ان کی اصلاح کی جد جہد کرنا ہے۔

جس کی قرین عقل وجہ اس کے سوا دوسری نہیں ہے کہ جس امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کو ظاہر وباطن میں سراپا علم وحکمت کتاب قرآن عظیم کی صورت میں مرحمت فرمائی گئی۔ اور ''أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ'' کے ذریعہ عالم گیر اعلان ختم نبوت، اور ''أُوْتِيْتُ عِلْمَ الْأَوَّلِيْنَ وَالْآخِرِيْنَ'' کے عالم گیر اعلان اور علم عظیم وکثیر کا منفرد دعویٰ لے کر آنے والی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی پیکر علم وعرفان ذات مقدسہ عطا فرمائی گئی ہو، اس بے حساب کثرتِ علم کے بعد یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں رہتی، کہ مکاتب فکر کی کثرت وہیں ہوسکتی ہے، جہاں علم کی کثرت ہو، پس بلا امتیاز حق وباطل اور بلا فرق خطا وصواب مکاتب فکر کی بکثرت تولید صرف اسی امت میں ہو بھی سکتی تھی، اور اسی امت میں ہوئی بھی ہے، دیگر تمام مدعیانِ علم امم واقوام میں چوں کہ یہ کثرت علم نہیں ہے؛ اس لیے نتیجتاً کثرت مکاتب فکر بھی نہیں ہے۔

یہودیت وعیسائیت میں تقلیلِ مکاتب فکر کی وجہ قلتِ علم:

چناں چہ دعوئ علم کے باوجود یہودیت میں اسلام سے بہت قدیم ہونے کے باوجود کوئی بھی دینی اور مذہبی مکتب فکر معروف ومعلوم نہیں ہے۔ ایسے ہی دنیائے عیسائیت ''پروٹیسٹنٹ'' اور ''کیتھولک'' کے ناموں سے موسوم صرف دو بنیادی مکاتب فکر پر منقسم ہے، جو بذات خود اس کی دلیل ہے کہ یہودیت وعیسائیت میں مذہبی اساس پر تقلیل مکاتب فکر کی وجہ قلت علم کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

(۹) امت مسلمہ میں کثرتِ مکاتبِ فکر، ان کا عدمِ توازن اور فکرِ قاسمی کا اعتدال:

اس کے برخلاف کتابِ اسلام ''قرآن کریم'' اور ''نبئ اسلام'' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سرمنشائے علوم بے نہایت ہیں؛ اس لیے عہد نبوت ہی سے علمی بنیادوں پر خطا وصواب کے جزوی اختلافات پر مبنی مکاتب فکر کی تولید کا آغاز ہو گیا تھا۔ پھر علمی ارتقا کے ساتھ کتاب وسنت میں مکنون ومستور

بے نہایت علوم ومعارف کی تخریج نے مخالفینِ اسلام کی رگ حمیت و جاہلیت کو جھنجھوڑا، اور ان باطل پسندوں نے کتاب اللہ کی سنت رسول اللہ سے مؤید متبادر مرادات و مدلولات میں تاویلات باطلہ کر کے اپنے زیغِ قلبی کے تحت تعلیمات اسلام سے یکسر منحرف باطل مکاتب فکر کی انبار لگا دیے؛ لیکن مسلمانوں کے لیے اس لحاظ سے یہ کوئی نئی چیز نہیں تھا کہ اس کی پیشین گوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہت پہلے اس طرح فرما چکے تھے کہ:

''یہود ونصاریٰ تو بہتر فرقوں میں بٹے تھے، اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹے گی، جن میں میرے اور میرے صحابہؓ کے طریقے پر چلنے والے طبقہ کے سوا باقی سب جہنمی ہوں گے''۔

بہتر کا عدد مطلقاً کثرت کی جانب مشیر ہوتا ہے۔ پس یہ روایت اس حقیقت کو واشگاف کرنے لیے کافی ہے کہ اس امت میں ایک حق کے بالمقابل باطل مکاتب فکر بھی بڑی تعداد میں پیدا ہوتے رہیں گے؛ کیوں کہ یہ سب باطل فرقے قطعی طور پر ثابت شدہ حقائق کے منکر ہونے میں شریک ہوں گے؛ البتہ ان کی تاویلات باطلہ کے پرداز میں فرق ہوگا؛ اس لیے ان سب کے مقابلے میں بلا تامل اول مرحلہ میں ایک حق صریح کو مدلل پیش کر دینے کے بعد دفاع عن الاسلام کا حق ادا ہو جاتا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔

لیکن دوسری جانب صواب کے بالمقابل وہ خاطی مکاتب فکر ہوں گے، کہ جو اسلام کے امور کلیہ کے اقرار میں تو شریک ہوں گے؛ لیکن امور جزئیہ میں تاویلات غیر صحیحہ کی وجہ سے افہام وتفہیم کے مستحق ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ خاطی مکاتب فکر، باطل مکاتب فکر کے مقابلہ پر بدرجہا تعداد میں ہمیشہ زیادہ ہوں گے، اور طلب حق کی مخلصانہ جدوجہد کی وجہ سے ''اَلْمُجْتَهِدُ يُخْطِي وَيُصِيبُ'' کے تحت ماجور ہوں گے۔

لیکن اس کے برخلاف کتاب وسنت کے علم صحیح سے مستفید وترجمان علمائے کرام کا یہ ایک دائمی اہم فریضہ ہوگا کہ وہ ہر زمانہ میں باطل مکاتب فکر کے بالمقابل متصلب ہوں، اور خاطی مکاتب فکر کو برداشت کرنے میں بہت زیادہ متحمل اور وسیع الحوصلہ ہوں؛ کیوں کہ یہ مکاتب فکر ضروریات دین سے منحرف نہیں ہیں؛ لیکن ان کی جزئیات، غلط تاویلات قابل تصحیح واصلاح ہونے کے باوجود ان کے دین پر قائم رہنے کے جذبہ کی یقین دہانی کے لیے کافی ہیں۔

اس لیے خاطی مکاتب فکر کے بارے میں اس تحمل پسندی اور وسعت حوصلہ کو دارالعلوم دیوبند کا اجتماعی دینی مزاج بنا دیا۔ حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ کا افراط وتفریط کے مابین اسلامی اعتدال کا وہ بیش قرار نمونہ ہے کہ جس کو حضرت الامامؒ کا ممتاز ترین امتیاز قرار دینا عینِ انصاف ہوگا۔

اسی معتدل مزاجی کا خوش آئند نتیجہ ہے کہ بعض طبقات نے علمائے دیوبند کو اپنی قلت علم اور حق ناشناسی کی بنا پر ہدفِ تکفیر بنایا؛ لیکن اسی اعتدالی جماعتی مزاج سازی کے تحت اکابر وعلمائے دیوبند مکفّرین کی ضروریات دین کے مقر ہونے کی بنا پر ان کے اس سراسر غیر اسلامی ایذا رساں حملے کو برداشت کر کے انہیں درس خیر خواہی سے نوازتے رہے، اور صحیح تعلیمات اسلام کے تحت ان کی تکفیر سے ہمیشہ ممکن احتراز فرماتے رہے۔

(۱۰) اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے ذوقِ جہاد:

حضرت الامام محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے امتیازات میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے جہاد بالسیف کا امتیاز بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ذوقِ عظیم وسلیم سے بھی حق تعالیٰ نے آپ کو وہ حصۂ وافر عطا فرمایا تھا کہ جو اس دور میں بھی عوام میں تو آج کل کی طرح مضمحل ہو ہی چکا تھا، خواص میں بھی صرف اخص الخواص ہی ذوقِ جہاد سے آشنا تھے۔

اسلام میں جہاد کی غیر معمولی عظمت اسی سے ظاہر ہے کہ اسلام نے اعلاءِ کلمۃ الحق کے لیے ہونے والے جہاد پر اجر وثواب کا وعدہ فرما کر اس کو مہتم بالشان عباداتی حیثیت واہمیت عطا فرمائی ہے۔

کسی مذہب کی دعوت، یا کسی مخصوص نظریۂ حیات کی پیشکش کی صورت میں مخاطب کو اس کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے مکمل اختیار کر نے کا دیا جانا ایک ایسا مسلّم اور ناقابل اختلاف متین ضابطہ ہے، کہ تمام معقولیت پسند انسانی طبقات میں کبھی یہ ضابطہ دورائیوں میں دوچار نہیں ہوا۔ اس ضابطۂ مسلّمہ کو جذباتیت یا غیظ وغضب، یا جہالت کے تحت نہ کرنا، وہیں سر ابھارتا ہے کہ جہاں مدعی کا فکر وذہن اپنے دعاوی پر، یا دلائل قویہ سے خالی ہو، یا طریق اثبات کی قوی اور مسکت صلاحیت سے عاری ہو۔

حضرت الامام النانوتویؒ کے فکر وذہن کو حق تعالیٰ نے کمال علم وحلم کے ساتھ اپنے دعاوی پر مسکت دلائل قویہ قائم کرنے کی ایسی منفرد صلاحیت عظیم سے نوازا تھا، کہ احباب واغیار ہی نہیں؛ بلکہ اعداء بھی ان کی استدلالی قوت پر بصد اعتراف سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔

''مباحثۂ شاہ جہاں پور'' حضرت الامام النانوتویؒ کی امتیازی قوت استدلال پر ایسی ناقابل انکار شہادت ہے، کہ جس سے مؤرخ صرفِ نظر کر کے اپنے اوپر تنگ نظری اور حقائق ناشناسی کا الزام لینے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوگا۔

(۱۱) اصابتِ رائے، عالمانہ وعارفانہ ذہانت اور توکل علی اللہ:

میدانِ شاملی میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے جنگ کی تیاری کے دوران جماعت میں ایک افتراق انگیز

اختلاف پیدا ہوا، جس کے سد باب میں حضرت الامامؒ کی عالمانہ و عارفانہ ذہانت کی یہ امتیازی کارفرمائی بھی تاریخ کا ایک اہم باب بنی کہ انگریزوں کے بر خلاف جنگ کے منصوبے پر علمائے وقت کے بھرپور اتفاق کے باوجود جماعت کے ایک مسلّم بزرگ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی رحمہ اللہ اپنی رائے کی وجہ سے ہمنوا نہیں تھے کہ مسلمان جنگ کی قرار واقعی تیاری سے بے سروسامان ہیں، اس بے سروسامانی میں جنگ ہلاکت وتباہی کے سوا کسی دوسرے نتیجے تک نہیں پہونچ سکتی۔ حضرت موصوف کی اس رائے کی وجہ سے ان کے وابستگان کی معتد بہ تعداد کے عدم اتفاق کا خطرہ یقینی تھا۔ اس کے پیش نظر مؤثر وممتاز علماء متفرقاً اور مجتمعاً معتد بہ تعداد میں حاضر ہوکر عرض ومعروض کرتے رہے؛ لیکن ان کی رائے نہ بدلوا سکے۔

اور وقت کے تمام بزرگ یہ خطرۂ اختلاف حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ کی تائید کو ضروری سمجھنے کی وجہ سے مشوّش تھے، جب کوشش کے باوجود ان کی ہمنوائی سے مایوسی ہوگئی، تو جماعت کے حضرات کی آخری کوشش کے طور پر ''حضرت الامامؒ'' نے بہ موجودگی حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ وغیرہ حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ سے ملاقات فرمائی، اور آغازِ گفتگو اسی پرداز سے فرمایا، جس پر اب تک بیشتر علمائے کرام فرما چکے تھے، اور ان کا جواب بھی وہی تھا، کہ جو دوسروں کو دے چکے تھے۔ اس پر حضرت الامامؒ نے سوال فرمایا کہ:

''حضرت! کیا ہم اصحابِ بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان ہیں''؟

یہ سن کر سب سے پہلے حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے فرمایا کہ: ''بس! اب الحمدللہ! شرحِ صدر ہوگیا''۔

اسی پر اختلاف ختم ہوگیا، اور جنگ کی تیاری شروع ہوگئی۔ پس جس خطرۂ اختلاف کو بزرگانِ جماعت محسوس کرکے غیر معمولی خدشہ محسوس فرمارہے تھے، وہ حق تعالیٰ نے حضرت الامامؒ کے صرف ایک توکل علی اللہ پر مبنی سراپا دانش سوال کے ذریعہ ختم فرماکر جماعت کو اختلاف سے محفوظ فرمادیا۔

(۱۲) سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت:

حضرت الامامؒ کی علمی وسعت پر درج ذیل ایک مزاحی جملہ کا عرفانی تجزیہ بھی شاہد ہے کہ ۱۸۷۸ء میں پنڈت دیانند سرسوتی کے چیلنج پر تاریخِ مناظرہ طے کرنے کے لیے حضرت الامام النانوتویؒ کی جانب سے دو تلامیذ خصوصی: مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ، مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ، اور ایک شیخ نہال احمد صاحبؒ اس وقت روڑکی پہونچے کہ جب پنڈت جی کے لیے کھانے کا انتظام کیا جارہا تھا، ملاقات کے کمرہ کے باہر ان حضرات کی موجودگی میں پنڈت جی لیے کھانا اتنی بڑی مقدار میں تھا کہ جو بہت سے لوگوں کے لیے کافی ہوتا؛ لیکن گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ تنہا ہی پنڈت جی کھانا کھایا ہے۔ واپسی میں شیخ نہال احمد

صاحبؒ نے اپنے رفقاء سے مزاحاً کہا کہ: علم میں مناظرہ ہوگا، تو پنڈت جی ایک منٹ بھی ہمارے حضرت کے سامنے ٹھہر نہیں سکیں گے؛ لیکن اگر کہیں کھانے میں مناظرہ ہوگیا، تو کیا ہوگا؛ کیوں کہ حضرت الا مامؒ اتنے کم خوراک تھے کہ اکثر اوقات تو نصف روٹی پر ہی بس فرما دیتے تھے۔

دیوبند واپس آنے کے بعد شیخ نہال صاحبؒ کا یہ مزاحی جملہ حضرت الامامؒ کو پہونچا، تو آپ نے شیخ نہال صاحبؒ کو بلایا، وہ بہت گھبرائے؛ لیکن جواب دینے کے لیے ان کی زبان سے حضرت الامامؒ نے فرمایا کہ: اس ک ایک جواب الزامی تو یہ ہے کہ: کیا ہر مناظرہ کے لیے میں ہی رہ گیا ہوں، کھانے میں مناظرہ ہوا، تو تم مناظرہ کروگے۔ پھر فرمایا: تمہارے ذہن میں کھانے پر مناظرہ کا سوال کیوں پیدا ہوا؟ نہ کھانے پر مناظرہ کا سوال کیوں نہ پیدا ہوا؟ کیوں کہ کھانا بہیمیت کی علامت ہے، جس کا تعلق بے کمال سے ہے، اس میں مناظرہ کے لیے ہم بیل، بھینس اور ہاتھی کو پیش کریں گے کہ کھانے میں ان کا مقابلہ کرو۔ اور نہ کھانا ملکیت کی خصوصیات میں سے ہے، جو کمال سے تعلق رکھتا ہے۔ فرمایا کہ: ہمیں اور پنڈت جی کو کھانا کھلا کر الگ الگ دو کمروں میں بند کر کے تالا لگادو، اور چھ مہینے بعد نکالو، جو زندہ نکلے، اسے برحق قرار دیا جائے۔ اورتحدیثِ نعمت کے طور پر یہ بھی فرمایا کہ: ''الحمدللہ! اب مجھے زندہ رہنے کے لیے کھانے کی ضرورت نہیں ہے، صرف اتباعِ سنت اوراظہارِ عبدیت کے لیے کھاتا ہوں''۔

حضرت الامامؒ کے کمالِ اتباعِ سنت کے نتیجے میں اس صفت ملکیت سے ہر حصہ یابی کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ: آپ ''سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت'' کا مصداق تھے۔

(۱۳) عظیم عرفانی ارتقا اور اس کی واضح مثال:

حضرت الامامؒ کے روحانی ومعنوی امتیاز پر یہ ایک واقعاتی شہادت ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اولین صدر المدرسین دار العلوم دیوبند علم حدیث میں باامتیاز اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے، جو حضرت الامامؒ اور حضرت گنگوہیؒ سے عمر میں کم تھے، اور دونوں کے استاذ زادے بھی تھے؛ اس لیے دونوں حضرات نہایت ادب واحترام کا معاملہ کرتے تھے۔ حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ کے قلب میں اپنی جلالِ شان کے ساتھ ایک سوال یہ پیدا ہوا تھا کہ ان ہی دونوں بزرگوں نے مجھے یہاں دار العلوم میں طلبہ کے ساتھ تعلیم میں مشغول کردیا، جس کی وجہ سے میں ریاضت ومجاہدات کے ذریعہ روحانی ترقیات سے محروم ہو رہا ہوں۔

اسی فکر کے نتیجے پر حضرت والا نے فرمایا کہ: یہ آپ کی روحانی ترقی بمشیت اللہ اس تعلیم دین ہی میں

مضمر ہے۔ اسے سن کر سکوت تو فرمایا؛ لیکن اور روحانی ترقی کے جذبۂ صادق کے تحت حسب عادت اچانک حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ کچھ روز غائب رہے۔

کچھ روز کے بعد واپس تشریف لائے، تو معلوم ہوا کہ اجمیر شریف گئے تھے، اور وہاں حضرت خواجہ غریب نوازؒ سے ان دونوں بزرگوں کا یہی شکوہ کیا کہ خود مجاہدات سے روحانی ترقی کر رہے ہیں، اور مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ: تیری ترقی تعلیم دین ہی ذریعہ ہوگی۔ اس پر حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی بارگاہ سے القائی جواب یہ ہی ملا کہ: وہ دونوں صحیح کہتے ہیں، آپ کی ترقیٔ روحانی عند اللہ اسی تعلیم میں مضمر ہے۔

دیو بند واپسی کے بعد یہ تفصیل کسی کو نہیں بتائی، اس کے باوجود بوقتِ ملاقات حضرت الامامؒ نے فرمایا کہ: وہی بات جب بڑی سرکار سے بھی سامنے آئی، تو اب تو یقین ہو گیا ہوگا کہ ہم خدام جو کچھ عرض کرتے تھے، وہ سراپا اخلاص وخیر خواہی پر مبنی تھا۔

حضرت الامامؒ کے اس جملہ پر جہاں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا چہرہ اعتراف کا اظہار کر رہا تھا، وہیں یہ جملہ حضرت الامامؒ کے عرفانی ارتقائے عظیم پر شاہد عدل بھی بن رہا تھا۔

(۱۴) بحر معرفت کے حقیقی غواص:

حضرت الامامؒ کی مقدس زندگی کے آخری لمحات میں یہ ہی امتیاز بھی آپ کی ولایت کاملہ کا مکمل مصداق بن کر سامنے آیا، کہ عالم نزع میں متوسلین ومحبین نے تلقین شروع کی؛ لیکن حضرت الامامؒ انقباض کے ساتھ کبھی چہرہ داہنی جانب پھیر لیتے اور کبھی بائیں جانب، جس سے تقلین کنندگان تشویش وحیرت کے ملے جلے جذبات سے دوچار تھے، اور حضرت الامامؒ کے اس انقباض کی کوئی توجیہ نہیں کر پا رہے تھے، کہ اس وقت حضرت الامامؒ کے بحر معرفت کے شناور، رفیق لبیب، فقیہ الاسلام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تشریف لے آئے، اور تلقین بند کرا کے خود حضرت الامامؒ کی جانب متوجہ ہو کر بیٹھ گئے، چند لمحے بعد وقت موعود آپہونچا، اور حضرت الامامؒ رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

اس کے بعد متوسلین نے بوقتِ تلقین حضرت الامامؒ کے انقباض کے بارے میں استفسار کیا، تو حضرت فقیہ الاسلامؒ نے فرمایا کہ: میرے بھائی اپنی قوتِ معنوی سے مسمی، یعنی ذات بابرکاتِ حق تک تک واصل ہو چکے تھے، اور آپ لوگ تلقین کے ذریعہ اسم کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے، تو یہ عروج سے نزول ہی طرف لانا ہے۔

ظاہر ہے کہ اسے موجبِ انقباض ہونا ہی چاہیے تھا، وہی ہوا۔ تلقین بند کرنے کے بعد انقباض ختم

ہو گیا، اوران شاءاللہ! وہ مقبولیت کے ساتھ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

(۱۵) زعفران زار تھی فضالحد سے تیری:

اختتامِ کلام پر وفات کے بعد کے اس عظیم قرینۂ مقبولیت پر ایک خاص واقعہ کا ذکر اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالبًا اس کا بھی اس وقت کوئی جاننے والا موجود نہیں ہے۔ یہ واقعہ میرے نانا خسر جناب شیخ حامد حسن صاحبؒ مرحوم نے غالبًا ۱۹۵۴ء میں بطور خاص مجھے بلا کر بالمشافہ سناتے ہوئے فرمایا کہ: اس وقت حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو دیکھنے والوں میں شاید میرے سوا کوئی زندہ نہیں ہے، اور حضرت الامامؒ کی وفات کے وقت میری عمر چودہ سال کی تھی، وفات کی اطلاع پر پورے شہر کے ہر مسلمان گھرانے میں ماتم کی کیفیت تھی۔ میں نماز جنازہ اور تدفین میں بھی حاضر رہا۔ قبرستانِ قاسمی کی زمین پر سب سے پہلی قبر بھی حضرت الامامؒ ہی کی بنی تھی۔ جنازہ جب قبرستان میں پہونچا، تو قبر ایک عجیب وغریب دل لبھانے والی حیرتناک نہایت تیز خوش بو پورے قبرستان میں پھیلی ہوئی تھی، جس کے بارے میں تمام لوگوں کی زبانوں پر یہ ہی الفاظ تھے کہ: قبر کی یہ حیرتناک اور دل کش خوش بو حضرت الامامؒ کی عنداللہ مقبولیت کی واضح دلیل ہے۔

اس غیر معمولی خوش بو کی وجہ سے لوگوں نے قبر سے نکلی ہوئی مٹی مٹھیاں بھر کر لے لیں، تو میں بھی مٹھی میں وہ مٹی لے کر گھر واپس آیا، اور اپنی والدہ سے سارا واقعہ سنایا، تو انہوں نے کہا کہ: تو بھی مٹی لایا ہے، یا نہیں؟ میں نے کہا کہ: لایا ہوں۔ وہ مٹی میں نے دی، تو انہوں نے اسے اپنے دوپٹے کا پلّا پھیلا کر بڑے احترام سے لیا، اور فوراً اس کو اندر لے جا کر صندوق میں محفوظ کر دیا۔ میرا بچپن تھا؛ البتہ کانوں میں پڑی یہ بات یاد پڑتی ہے کہ والدہ نے اس مٹی کو اپنے ساتھ دفن کرنے کی وصیت کسی کو کی تھی۔

احقر کے لیے ایک زائرِ حضرت الامام النانوتوی قدس سرہ سے ملاقات ایک سعادتِ کبریٰ ہے، جس پر اس کے سوا اور کیا عرض کیا جاسکتا ہے کہ:

حرف از زبانِ یار شنیدن چہ خوش بود
یا از زبانِ آں کہ شنیدن از زبانِ دوست

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم

پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم صاحب قلم بزرگ تھے۔ بہت سی علمی کتابوں کے تراجم آپ کے قلم سے یادگار ہیں۔ آپ کو بزرگانِ دیوبند سے گہرا تعلق تھا، اور بہت سے بزرگوں پر آپ نے قلم بھی اٹھایا۔ ذیل میں موصوف کا یادگار مضمون پیش ہے۔ (نعمان)

ابتدائی حالات:

قصبۂ نانوتہ کے اکابر میں مولانا محمد قاسمؒ نے جس قدر شہرت پائی، اتنی کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس کا سبب اُن کا وہ عظیم کارنامہ ہے، جو آج بھی ''دارالعلوم دیوبند'' کی شکل میں موجود ہے، اور علوم اسلامی کی گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی، ابن شیخ اسد علی، ابن غلام شاہ، شعبان ۱۲۴۰ھ/ (۱۸۲۴ء) میں قصبۂ نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تاریخی نام خورشید حسین (۱) ہے۔ ان کے والد شیخ اسد علیؒ مولانا مملوک العلی نانوتویؒ کے ہم عمر تھے، اور ان کے ہم راہ تحصیل علم کی غرض سے دہلی گئے تھے؛ لیکن علم سے مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے فارسی کی چند کتابوں سے آگے نہ بڑھ سکے اور وطن واپس آ گئے، اپنے کاشت کاری کے کاموں میں لگ گئے۔ اُن کے عادات واطوار بھی قصباتی لوگوں کی طرح تھے۔ ایک موقع پر مولانا محمد قاسمؒ کے نہایت بے تکلف دوست مولانا فیض الحسن سہارن پوریؒ (وفات: ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء) نے اسی وجہ سے ان پر ''پورروستائی'' کی پھبتی کسی تھی (۲)۔ ایسے باپ کو اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد قاسمؒ جیسا گوہر شب چراغ عطا فرمایا کہ جس کی ضیا باریوں سے ایک عالم مستنیر (روشنی طلب کرنے والا) ہوا۔

تعلیم:

مولانا محمد قاسم کی تعلیم کا آغاز نانوتہ ہی میں ہوا، وہیں انہوں نے قرآن کریم اور ابتدائی تعلیم ختم کی۔

(۱) سوانح عمری مولانا محمد قاسمؒ، از مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ: ص ۲۔
(۲) ارواح ثلاثہ، ص: ۲۴۰۔

اتفاق سے اسی زمانے میں ان کے دادا غلام شاہؒ اور تفضّل حسین سے جھگڑا ہوا، جس میں مولانا محمد قاسمؒ کے ماموں فصیح الدین ابن وجیہ الدین کے ہاتھ سے تفضّل حسین مارے گئے۔ مولانا محمد قاسمؒ کو دیوبند بھیج دیا گیا۔ یہاں انہوں نے کچھ دنوں مولوی مہتاب علیؒ کے مکتب میں اور شیخ نہال احمدؒ سے پڑھا۔ پھر اپنے نانا کے پاس سہارن پور چلے گئے، جو وہاں وکیل تھے۔ سہارن پور میں انہوں نے مولوی محمد نوازؒ سے عربی کے ابتدائی رسالے پڑھے۔ ۱۲۵۹ھ/(۱۸۴۳ء) میں مولوی صاحب کے نانا کا انتقال ہوگیا۔ مولانا محمد قاسمؒ نے دیوبند اور سہارن پور میں رہ کر فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھ لیں۔ ۲/محرم ۱۲۶۰ھ/(۲۳/جنوری ۱۸۴۴ء) کو مولانا مملوک العلیؒ ان کو اور اپنے صاحب زادے مولانا محمد یعقوبؒ کو تعلیم کی غرض سے دہلی لے گئے۔ ۴/محرم ۱۲۶۰ھ/(۲۵/جنوری ۱۸۴۴ء) کو مولانا نے کافیہ شروع کیا(۱)، پھر مولانا محمد قاسمؒ کو دہلی کالج میں داخل کرادیا؛ مگر مولانا محمد قاسمؒ امتحان میں شریک نہ ہوئے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی لکھتے ہیں(۲):

> ''والد مرحوم (مولانا مملوک العلیؒ) نے مولوی (محمد قاسم) صاحبؒ کو مدرسۂ عربی سرکاری میں داخل کیا...... جب امتحان سالانہ کے دن ہوئے مولوی صاحبؒ امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا۔ سب اہل مدرسہ کو علی الخصوص ہیڈ ماسٹر صاحب کو کہ اس وقت میں مدرس اوّل انگریزی تھے، نہایت افسوس ہوا''(۳)۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے حساب اور اقلیدس کا نصاب قلیل مدت میں ختم کرلیا کہ طلبا اور اساتذہ دونوں کو حیرت ہوئی؛ بلکہ ماسٹر رام چندر نے تو مولوی ذکاء اللہ کے ذریعے چند سوال بھیج کر بالواسطہ امتحان بھی لیا اور مولانا اس میں کام یاب ہوئے۔ مولانا محمد قاسمؒ نے علوم متداولہ کی تکمیل مولانا مملوک العلیؒ اور مفتی صدرالدین آزردہؒ سے کی، اور علم حدیث مولانا احمد علی سہارن پوریؒ اور شاہ عبدالغنی مجددیؒ سے حاصل کیا۔

مطبع احمد کی ملازمت:

مولانا نانوتویؒ کے تلمیذ حکیم منصور علی خاں مرادآبادی نے بہ صراحت بتایا ہے کہ صحیحین اور سنن ثلثہ شاہ عبدالغنی مجددیؒ سے پڑھیں، اور سنن ابی داود مولانا احمد علی سہارن پوریؒ سے پڑھی(۴)۔

(۱) یہ تمام واقعات ''سوانح عمری مولانا محمد قاسم''، ص۴، ۵ سے ماخوذ ہیں۔ (قادری)

(۲) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے دہلی کالج کے طالب ہونے کے متعلق تفصیل سے بحث ہم نے مولانا محمد احسن نانوتویؒ کے ''تعلیم'' کے عنوان میں کی ہے۔ (قادری)

(۳) سوانح عمری مولانا محمد قاسمؒ، ص:۵، ۶۔

(۴) مذہب منصور: ج۲، ص۸۲-۱۸۱۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے طالب علمی کے زمانے ہی میں مولانا احمد علی سہارن پوریؒ کے مطبع احمدی (دہلی) میں تصحیح وغیرہ کے سلسلے میں ملازمت کا تعلق پیدا کرلیا تھا[۱]، اور پھر ان ہی تعلقات کی بنا پر مولانا نانوتویؒ نے مولانا سہارن پوریؒ سے سنن ابو داود پڑھی ہوگی۔ مولانا نانوتویؒ کے خاص ہم درس اور رفیق مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تھے۔ مولانا گنگوہیؒ کے متعلق یقینی طور سے معلوم ہے کہ یہ سلسلۂ تعلیم ان کا دہلی میں قیام چار سال رہا اور ۱۲۶۵ھ/(۱۸۴۹ء) میں وہ فارغ ہو کر وطن چلے گئے[۲]۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ اسی زمانے میں مولانا نانوتویؒ بھی فارغ التحصیل ہو چکے ہوں گے؛ اس لیے کہ ۱۲۷۶ھ/(۱۸۵۶ء) میں صحیح بخاری کا محشی نسخہ مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوا[۳]، اور اس میں مولانا نانوتویؒ نے تصحیح وتحشیہ کے فرائض انجام دیے تھے۔ لہٰذا مولانا نانوتویؒ کا ۱۲۶۷ھ/(۱۸۵۱ء) سے قبل فارغ التحصیل ہونا ضروری ہے۔ خیال یہ ہے کہ ۱۲۶۵ھ/(۱۸۴۹ء) ہی میں مولانا نانوتویؒ بھی فارغ ہوئے ہوں گے، اس کے بعد ان کا تعلق بہ صیغۂ تدریس مفتی صدرالدین آزردہؒ کی درس گاہ مدرسۂ دارالبقاء سے ہوگیا، جس کو مؤلف ''تذکرہ علمائے ہند'' نے غلطی سے مدرسۂ انگریزی واقع دہلی لکھ دیا ہے[۴]۔ ممکن ہے مفتی صدر الدین آزردہؒ کے سرکاری تعلقات کی بنا پر یہ بات لکھی گئی ہو؟ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے مدرسۂ دار البقاء کے تعلق کا ذکر مبہم الفاظ میں کیا ہے[۵]۔ غرض مولانا نانوتویؒ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دہلی میں ہی تدریس وتصحیح کتب کے کام میں لگ گئے تھے۔

تحشیۂ بخاری:

مولانا احمد علی سہارن پوریؒ نے ۱۲۶۲ھ/(۱۸۴۶ء) میں حجاز سے واپس آجانے کے بعد دہلی میں ایک پریس ''مطبع احمدی'' کے نام سے قائم کیا تھا، اور اس مطبع سے بالخصوص کتب حدیث کی اشاعت کا خوب کام ہوا۔ مطبع احمدی سے ۱۲۶۵ھ/(۱۸۴۹ء) میں جامع ترمذی، ۱۲۶۷ھ/(۱۸۵۱ء) میں صحیح بخاری[۶] اور ۱۲۷۱ھ/(۱۸۵۵ء) میں مشکوٰۃ المصابیح نہایت اہتمام سے شائع ہوئیں۔

(۱) سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ص:۶۔
(۲) تذکرۂ رشید، ج:۱، ص:۳۵۔
(۳) حیات شبلی، ص:۸۵۔
(۴) مولوی رحمان علی، **تذکرہ علمائے ہند**، فارسی، (الہند: نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۴ء)، ص:۲۱۰۔
(۵) سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ص:۶۔
(۶) حیات شبلی، صفحہ:۸۵۔

صحیح بخاری کی تصحیح وتحشیہ میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی شریک رہے اور اس کام کو انہوں نے بہ احسن وجوہ انجام دیا، جس سے حدیث میں ان کی ژرف نگاہی، درک اور ممارست کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں جناب مولوی احمد علی صاحب سہارن پوری نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کی کہ پانچ چھ سیپارے آخر کے باقی تھے، مولوی صاحب (محمد قاسم نانوتوی) کے سپرد کیا۔ مولوی صاحب نے اس کو ایسا لکھا ہے کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس زمانے میں بعض لوگوں نے جو مولوی صاحبؒ کے کمال سے آگاہ نہ تھے، جناب مولوی احمد علی صاحب کو بہ طور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کام کیا کہ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کیا؟ اس پر مولوی احمد علی صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدوں سمجھے بوجھے ایسا کروں اور پھر مولوی صاحب کا تحشیہ ان کو دکھلایا۔ جب لوگوں نے جانا وہ جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے۔ علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا جو اول سے التزام ہے اور اس جگہ پر امام بخاریؒ نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کیے ہیں، اور ان کے جواب لکھنے معلوم ہے کہ کتنے مشکل ہیں۔ اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھ اور سمجھ لے کہ کیسا حاشیہ لکھا ہے، اور اس حاشیے میں یہ بھی التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے محض اپنے فہم سے نہ لکھی جائے''(۱)۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا تعلق مطبع احمدی سے کب تک رہا؟ اس کے متعلق کوئی یقینی معلومات نہیں ملتیں؛ مگر مطبع احمدی دہلی میں انقلاب ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء تک قائم رہا۔ اس انقلاب میں یہ مطبع ختم ہوگیا۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ جب تک مطبع رہا، اسی وقت تک اس مطبع سے مولانا محمد قاسمؒ کا تعلق رہا ہوگا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء اور حج بیت اللہ:

مولانا محمد قاسمؒ نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا، اور اس کے شدائد ومصائب بھی بھگتے۔ بوڑیہ، گمتھلہ، لاڈوہ، پنج لاسہ، جمنا پار کے مواضع میں روپوش رہے۔ اسی روپوشی کے سلسلے میں ۱۵/ جمادی الاولی ۱۲۷۷ھ/ ۲۹/ نومبر ۱۸۶۰ء میں نانوتہ سے حج کے لیے روانہ ہوئے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ خاص طور سے رفیق سفر رہے۔ مولانا نانوتویؒ کا یہ سفر نانوتہ سے فیروز پور تک خشکی سے اور فیروز پور سے گھوڑ اباری (کراچی) تک کشتیوں کے ذریعے ہوا۔

۱۲۸۵ھ/ (۱۸۶۹ء) میں منشی ممتاز علی صاحبؒ ہجرت کے ارادے سے حجاز گئے تھے؛ مگر دوسرے سال

(۱) سوانح عمری مولانا محمد قاسمؒ، ص: ۶/ ۷۔

ہندوستان واپس آ گئے، اور اس مرتبہ انہوں نے اپنا پریس ''مطبع مجتبائی'' کے نام سے دہلی میں قائم کیا، اور مولانا محمد قاسم کو مطبع میں تصحیح وغیرہ کا کام کرنے کے لیے دہلی بلالیا۔ چناں چہ مولانا نانوتویؒ نے تصحیح وتدریس کا کام انجام دیا۔ مطبع مجتبائی سے ۱۲۸۶ھ (۱۸۷۰ء) میں ایک حمائل شریف شائع ہوئی، جس کی تصحیح مولانا نانوتویؒ نے فرمائی ہے۔ مولوی عبدالاحد مرحوم لکھتے ہیں:

''خداوندا! آپ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ حمائل شریف اب تیسری دفعہ اس مطبع مجتبائی دہلی میں چھپی۔ ایک دفعہ تو منشی محمد ممتاز علی نزہت رقم مہاجر مکیؒ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے لکھی، اور قاسم الخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی مدرسۂ دیوبند نے اس کی تصحیح فرمائی''[۱]۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے اس حمائل کی طباعت کے سلسلے میں دو قطعات تاریخ لکھے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(۱)

حمائل کز شرف دارد شرف بر حاصل کانہا
کہ ایں جا اسے وبر جاں است صد گونہ بلا زانہا
نوشت وطبع زد نزہت رقم ممتاز علی، قاسم
صحیح کرد زاں گردید تعویذ دل وجانہا

(۲)

چھاپی وہ حمائل کہ اگر جان کے لب ہوں
بے ساختہ بول اٹھے کہ مرغوب چھپی ہے
میں نے بھی کہا مدح میں اور کیوں کر نہ کہیے؟
کہتے ہیں بہ تکرار عدد خوب چھپی ہے
ایک راحت دل راحت دل پر ہے مضاعف
کیا لکھی کیا عمدہ خوش اسلوب چھپی ہے
کیا کہنے حمائل کے بہت خوب ہی چھپی ہے
کیا کہنے ہیں پاکیزہ بہت خوب چھپی ہے[۲]

(۱) خاتمۃ الطبع، حمائل شریف، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۳۰ھ، ص: ۲۹۷۔
(۲) خاتمۃ الطبع، ص: ۱۳۷۔

مطبع مجتبائی میرٹھ سے تعلق:

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں سفرِ حج سے واپس آئے۔ اب حالات کچھ ساز گار ہو گئے تھے، اور معافی کا اعلان عام ہو چکا تھا۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مطبع مجتبائی میرٹھ میں تصحیح وغیرہ کے سلسلے میں ملازم ہو گئے۔ اس مطبع کے مالک منشی ممتاز علی ابن شیخ امجد علی تھے، جو اپنے زمانے کے مشہور خطاط تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ فن خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے، اور ''نزہت رقم'' ان کا لقب تھا[۱]۔ مولانا محمد قاسمؒ سے ان کے پہلے سے تعلقات تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ منشی ممتاز علیؒ نزہت رقم، مولانا احمد علی سہارن پوریؒ کے مطبع دہلی میں ملازم ہوں گے، اور وہیں ان کے تعلقات مولانا نانوتویؒ سے ہوئے ہوں گے۔ مولانا نانوتویؒ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) تک اس مطبع سے وابستہ رہے۔ اسی سال مولانا نانوتویؒ اور منشی ممتاز علیؒ مالک مطبع حج بیت کو تشریف لے گئے۔ منشی ممتاز علیؒ ہجرت کے ارادے سے گئے تھے؛ اس لیے وہ مطبع میرٹھ ختم کر کے گئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ حج بیت اللہ سے واپس آ کر مطبع ہاشمی میرٹھ میں کام کرنے لگے۔ میرٹھ کے قیام کے زمانے میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا عبدالجلیل علی گڑھیؒ (شہادت: ۱۸۵۷ء) کے فرزند مولوی محمد اسماعیلؒ (وفات: شوال ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء) کو بخاری پڑھانے کی غرض سے علی گڑھ گئے، نو مہینے مولانا نانوتویؒ کا قیام علی گڑھ میں رہا[۲]۔

دار العلوم کا قیام:

۱۸۵۷ء میں سقوط دہلی کے بعد اسلامی درس گاہوں اور مدارس کو سخت نقصان پہنچا۔ بہت سے علما ختم ہو گئے، کچھ حجاز وغیرہ چلے گئے؛ مگر شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے سلسلے کے بعض علما کو ایک درس گاہ قائم کرنے کا خیال ہوا۔ مولوی فضل الرحمٰنؒ، مولوی ذوالفقار علیؒ اور حاجی محمد عابد حسین صاحبؒ (وفات: ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء) نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں[۳]۔ چناں چہ ۱۵ر محرم ۱۲۸۳ھ / مطابق ۳۰ر مئی ۱۸۶۷ء کو دیوبند کی مشہور ''چھتہ والی مسجد'' میں ''انار'' کے درخت کے نیچے کھلے صحن میں اس مدرسے کا آغاز ہوا، جس کی سرپرستی اور راہ نمائی مولانا محمد قاسمؒ نے کی۔

(۱) مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، **سوانح قاسمی**، ج: ۱، ص: ۵۳۳۔

(۲) ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی، **تراجم علمائے اہل حدیث**، ص: ۳۲۳-۳۲۵، (دہلی ۱۹۳۸ء)۔

(۳) سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ص: ۱۴۔ یہ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کا بیان ہے۔ مولانا محمد میاں دیوبندی نے بانیان میں حاجی عابد حسینؒ کے علاوہ مولوی مہتاب علیؒ اور شیخ نہال احمدؒ کا نام لیا ہے۔ ملاحظہ ہو علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ج: ۱، ص: ۶۷-۹، دہلی ۱۹۴۷ء (قادری)۔

اس درس گاہ کے سب سے پہلے طالب علم محمود (شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ) اور پہلے استاد ملا محمودؒ تھے۔ چندے کے لیے سب سے پہلے جس نے رومال پھیلایا اور جس نے سب سے پہلے چندہ دیا، وہ حاجی عابد حسینؒ تھے۔ تھوڑی دیر میں تقریباً چار سو روپے جمع ہو گئے۔ ۱۹ر محرم کو ایک اشتہار کے ذریعے قیام مدرسے کا اعلان کیا گیا۔ پہلے سال کے اختتام تک طلبہ کی تعداد اٹھتر ہو گئی، جس میں بیرون ہند کے طلبہ بھی شامل تھے۔ طلبہ کے اضافے کے ساتھ مدرسین کا بھی اضافہ ہوا، اور چار مدرس اور بڑھائے گئے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کو صدر مدرس مقرر کیا گیا۔ چند ہی سال میں چھتہ کی مسجد ناکافی ثابت ہوئی، تو ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۲ء میں مدرسہ جامع مسجد (دیوبند) میں منتقل ہو گیا؛ مگر جلد ہی یہ جگہ بھی ناکافی ثابت ہوئی، تو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم کے لیے آبادی سے باہر ایک کشادہ اور وسیع عمارت کی تجویز پیش کی، اور قطعۂ اراضی خریدنے کے بعد ۲ر ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ/ ۳۰ر دسمبر ۱۸۷۵ء کو جمعہ کے دن موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ مولانا احمد علی سہارن پوریؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حاجی عابد حسینؒ اور مولانا محمد مظہر کاندھلویؒ نے علی الترتیب ایک ایک اینٹ رکھی (۱)۔ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے مادہ تاریخ تعمیر ''اشرف عمارات'' سے نکالا، جس سے ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء برآمد ہوتے ہیں۔ چوں کہ تعمیر کا سال آئندہ سال ہی شروع ہوا؛ اس لیے ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء کو آغاز تعمیر قرار دیا گیا (۲)۔

اس مدرسے نے یوماً فیوماً ترقی کی۔ ۳۱ر جنوری ۱۸۷۵ء بہ روز یک شنبہ لیفٹیننٹ گورنر کے ایک خفیہ معتمد انگریز مسمی پامر نے اس مدرسے کو دیکھا، تو اس نے نہایت اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے معائنہ کی چند سطور درج ذیل ہیں (۳):

> ''جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپیہ کے صرف سے ہوتا ہے، وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔ جو کام پرنسپل ہزاروں روپیہ ماہانہ تنخواہ لے کر کرتا ہے، وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپیہ ماہانہ پر کر رہا ہے۔ یہ مدرسہ خلاف سرکار نہیں؛ بلکہ موافق سرکار، ممد و معاون سرکار ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ ایسے آزاد اور نیک چلن (سلیم الطبع) ہیں کہ ایک کو دوسرے سے کچھ واسطہ نہیں۔ کوئی فن ضروری ایسا نہیں، جو یہاں تعلیم نہ ہوتا ہو۔ صرف مسلمانوں کے لیے تو اس سے

---

(۱) یا تو یہ مولانا محمد مظہر نانوتویؒ ہوں گے؛ ورنہ مولانا مظفر حسین کاندھلوی ہوں گے۔ (قادری)

(۲) تاریخ دیوبند: ص ۸۲؛ مگر مولانا محمد میاں نے حاجی عابد حسینؒ، مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کے علاوہ چوتھا نام میاں جی منے شاہ صاحبؒ کا لکھا ہے۔ (علمائے حق......: ج ۱ ص ۸۰)

(۳) اس سلسلے میں راقم کا ایک مقالہ ''تحریک دیوبند'' مجریہ روزنامہ ''انجام'' کراچی ۲۴ر مارچ ۱۹۶۴ء ملاحظہ ہو۔ (قادری)

بہتر کوئی تعلیم اور تعلیم گاہ نہیں ہو سکتی، اور میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ غیر مسلمان بھی یہاں تعلیم پائے، تو خالی نفع سے نہیں۔ اے صاحب! سنا کرتے تھے کہ ولایت انگلستان میں اندھوں کا مدرسہ ہے، یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ دو اندھے تحریر اقلیدس کی شکلیں کف دست پر ایسی ثابت کرتے ہیں کہ باید وشاید''۔

دار العلوم دیوبند آج برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کی سب سے بڑی دینی درس گاہ ہے، اور بین الاقوامی شہرت وعظمت کا مالک ہے۔

۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) میں مولانا محمد قاسمؒ دوبارہ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ بعض رفقا مولانا نانوتویؒ کے ہم راہ تھے [۱]۔

پادری تاراچند سے مناظرہ:

برصغیر پاک وہند میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ہم دوش مذہب عیسوی نے بھی فروغ حاصل کیا، اور ہر ممکن صورت سے اس مغلوب ملک کو مذہبی حیثیت سے بھی فتح کرنے کی کوشش کی گئی، اور کمپنی کی تائید واعانت سے ملک کے طول وعرض میں مسیحی تبلیغ وتنظیم کے آثار قائم کیے گئے، اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد تو اس سلسلے کو بہت وسعت ہوئی۔ پادری بازاروں، میلوں اور عام مجمعوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام پر اعتراضات کرنے لگے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دہلی کے قیام کے زمانے میں جب یہ صورت حال دیکھی، تو انہوں نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ: وہ اسی طرح کھڑے ہو کر بازار میں وعظ کہا کریں، اور پادریوں کا رد کریں، اور ایک روز خود بھی بغیر تعارف اور اظہار نام مجمع میں پہنچے، اور ایک پادری تاراچند سے مناظرہ کیا، اور اس کو برسر بازار شکست دی۔ اس کے بعد ان کا تعارف مشہور مناظر اسلام ابو المنصور ناصر الدین علی دہلوی (وفات: ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) سے ہوا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ ربیع الاوّل ۱۲۹۲ھ تا جمادی الثانیہ ۱۲۹۲ھ (اپریل تا اگست ۱۸۷۵ء) کے درمیان کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ منشی ممتاز علیؒ کے مطبع مجتبائی دہلی میں مقیم تھے۔

میلۂ خدا شناسی:

انگریزی حکومت نے ایک خطرناک سازش یہ کی کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔

(۱) سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ص: ۲۔ تعجب ہے مؤلف ''تذکرۂ مشائخ دیوبند'' نے اس حج کا ذکر نہیں کیا۔ (تذکرہ مشائخ دیوبند، ص: ۱۴۸)۔

ہندوستان میں مسلمانوں کو سیاسی اہمیت حاصل رہی تھی۔ انگریزوں نے اپنی پالیسی کے تحت ہندوؤں کو بڑھایا اور مسلمانوں کو گھٹایا۔ جب معاشی وسیاسی میدان میں ہندوآگے بڑھ گئے، تو ان کو مذہبی برتری کی راہ سمجھائی، اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں مناظرے کے لیے تیار کیا، اور اس کے مواقع بھی بہم پہنچائے گئے کہ ہندو، مسلمانوں سے کھلے عام مناظرے کریں۔

شاہ جہاں پور (یو. پی) کے قریب چاندا پور گاؤں میں یہاں کے زمین دار پیارے لال کبیر پنتھی، پادری نولس کی سربراہی اور رابرٹ جارج گبری کلکٹر شاہ جہان پور کی تائید واجازت سے ۷، ۸/مئی ۱۸۷۶ء/کو ایک ''میلۂ خداشناسی'' منعقد ہوا، جس میں عیسائی، ہندو اور مسلمان تینوں مذہب کے نمائندوں کو بہ ذریعۂ اشتہارات دعوت دی گئی کہ وہ اپنے اپنے مذاہب کی حقانیت کو ثابت کریں۔ مولانا محمد منیر نانوتویؒ اور مولوی الٰہی بخش رنگین بریلویؒ کی تحریک پر مولانا محمود حسن، مولوی رحیم اللہ بجنوریؒ اور مولانا فخر الحسن صاحبؒ کے ہم راہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس میلے میں پہنچے۔ مولانا نانوتویؒ کے علاوہ مولانا ابو المنصور دہلویؒ، مرزا موحد جالندھریؒ، مولوی احمد علی دہلویؒ، میر حیدر علی دہلویؒ، مولوی نعمان ابن لقمانؒ اور مولوی رنگین بریلویؒ بھی شریک ہوئے، اور ان تمام علما نے اس میلے میں تقاریر کیں، اور ان کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ''ابطال تثلیث وشرک اور اثبات توحید پر ایسا بیان کیا کہ حاضرین جلسہ مخالف وموافق مان گئے۔ ایک اخبار لکھتا ہے:

> ''۸/مئی سنہ حال (۱۸۷۶ء) کے جلسے میں مولانا قاسم صاحب نے درس دیا اور فضائل اسلام بیان کیے۔ پادری صاحب نے تثلیث کا بیان عجیب طور سے ادا کیا کہ ایک خط میں تین اوصاف پائے جاتے ہیں، طول، عرض، عمق، سو تثلیث ہر طرح ثابت ہے۔ مولوی موصوف نے اس کا رد اسی وقت کر دیا۔ پھر پادری صاحب اور مولوی صاحب تقدیر کے معاملے میں بحث کرتے رہے، اس میں جلسہ برخاست ہو گیا۔ تمام قرب وجوار اور چاروں طرف شور وغل مچ گیا کہ مسلمان جیت گئے۔ جہاں ایک عالم اسلام کا کھڑا ہوتا، اس کے اردگرد ہزاروں آدمی جمع ہو جاتے تھے۔ اول روز کے جلسے میں جو اعتراضات اہل اسلام کے تھے، ان کا جواب عیسائیوں نے کچھ نہ دیا۔ مسلمانوں نے عیسائیوں کے جوابات حرف بہ حرف دیے اور فتح یاب ہوئے''[1]۔

دوسرے سال مارچ ۱۸۷۷ء/میں یہ میلہ پھر منعقد ہوا، اب کی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو اسٹیشن سے مولوی حفیظ اللہ خاںؒ وغیرہ لے گئے، اور مولوی عبد الغفورؒ کے مہمان ہوئے۔ اس مرتبہ منشی اندرمن مرادآبادی

(۱) خیر خواہ عالم، دہلی، ۱۹/مئی ۱۸۰۰ء، بہ حوالہ تاریخ صحافت: ج۲ کا حصۂ اوّل، ص۴۲۱-۴۴۲۔

اور آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند جی (وفات: ۱۸۸۳ء) بھی شریک ہوئے۔ دیانند جی نے سنسکرت آمیز ہندی میں تقریر بھی کی۔ پادری نولس نے ایک دوسرے پادری اسکاٹ کو بھی بلایا تھا۔ مولانا محمد قاسمؒ کے ہم راہ مولوی محمد علی بچھرایونی بھی تھے۔ مولانا محمد قاسمؒ کی تقاریر بحث وجود اور توحید اور تحریف پر ہوئیں اور نہایت کام یاب رہیں۔

اس مرتبہ علمائے اسلام کے طعام وقیام کے فرائض محمد طاہر موتی میاں [(۱)] نے انجام دیے۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ''میلہ خداشناسی'' میں دونوں سال شریک ہو کر عیسائیوں اور ہندوؤں کی سازش کو ناکام بنادیا۔ ایک بات یہاں خاص طور سے غور طلب ہے کہ ''میلۂ خداشناسی'' شاہ جہان پور اعلان واشتہار کے ساتھ دو سال منعقد ہوا، اور اس میں ایک طرح سے مذہب اسلام کو چیلنج کیا گیا تھا۔ شاہ جہان پور سے بریلی اور بدایوں بالکل قریب اور متصل اضلاع ہیں؛ مگر اس میلے میں علمائے بدایوں اور بریلی کی کسی دل چسپی کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

مناظرۂ رڑکی:

شوال ۱۲۹۴ھ/ (اکتوبر ۱۸۷۷ء) میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ علمائے کرام کی ایک جماعت کے ساتھ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ ربیع الاوّل ۱۲۹۵ھ (مارچ ۱۸۷۸ء) میں واپس ہوئے۔ واپسی میں جدہ سے مولانا نانوتویؒ کی طبیعت خراب ہوگئی۔ وطن آکر طبیعت کسی قدر سنبھل گئی؛ مگر مرض دفع نہ ہوا۔ اسی سال شعبان ۱۲۹۵ھ (اگست ۱۸۷۸ء) میں رڑکی سے اطلاع ملی کہ پنڈت دیانند جی یہاں پہنچے ہیں، اور مذہب اسلام پر اعتراض کرتے ہیں۔ مولانا نانوتویؒ باوجود کم زوری اور بیماری کے رڑکی پہنچے۔ ہر چند چاہا کہ مجمع عام میں پنڈت جی سے گفتگو ہوجائے؛ مگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے اور رڑکی سے چل دیے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ایما پر مولانا فخر الحسنؒ اور مولانا محمود حسنؒ نے عام جلسوں میں تقریریں کیں اور پنڈت جی کو چیلنج دیا۔ مولانا نانوتویؒ نے پبلک جلسے میں ان کے اعتراضات کے جواب دیے، اور استقبال قبلہ کے جواب میں ایک رسالہ لکھا [(۲)]۔

---

(۱) محمد طاہر عرف موتی میاں کو مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے شاہ مدن شاہ آبادیؒ (وفات: ۱۱۸۸ھ/۴-۱۷۷۴ء) کی اولاد لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ موتی میاں مولوی مدن (مجد الدین) (وفات: ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء) کے پڑپوتے تھے۔ موتی میاں ابن مولوی عبداللہ ابن مولوی نظام الدین ابن مولوی مجد الدین عرف مدن۔ ان مولوی مدن نے شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سے علوم معقول پر مباحثہ کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو تاریخ شاہ جہان پور، از میاں صبیح الدین: ص ۱۴۷-۱۵۷، لکھنؤ، ۱۹۳۲ء) (قادری)

(۲) ملاحظہ ہو: انتصار الاسلام، ص: ۲/۷، دیوبند، ۱۹۵۲ء۔

اس کے بعد پنڈت دیانند جی میرٹھ پہنچے، انہوں نے وہاں بھی وہی انداز اختیار کیا۔ مسلمانانِ میرٹھ کی درخواست پر مولانا نانوتویؒ میرٹھ پہنچے۔ پنڈت جی نے وہاں بھی گفتگو نہ کی اور چلتے بنے۔ مولانا نانوتویؒ نے میرٹھ میں جلسۂ عام میں تقریر کی اور اعتراضات کے جواب دیے۔

انتقال:

حج سے واپس آنے کے بعد مولانا نانوتویؒ کی بیماری کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ درمیان میں علاج اور دواؤں سے کچھ افاقہ ہوگیا؛ مگر مرض گیا نہیں، اور سانس کا دورہ شروع ہوگیا۔ ۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ (۱۴؍ اپریل ۱۸۸۰ء) بہ روز پنج شنبہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا وصال ہوا۔ بعد مغرب اس ''خزانۂ خوبی''(۱) کو سپردِ زمین کردیا گیا۔ اِنَّـا لِـلّٰـهِ وَاِنَّـا اِلَـيْـهِ رَاجِـعُـوْنَ!

مولانا نانوتوی نے دو صاحب زادے ''محمد ہاشمؒ''، اور شمس العلماء حافظ ''احمدؒ'' (وفات: ۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ/ ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۲۸ء) اور دو صاحب زادیاں ''اکرامن''، اور ''رقیہ'' یادگار چھوڑیں۔ محمد ہاشم کا جوانی میں مکۂ معظّمہ میں انتقال ہوا۔ حافظ احمد صاحب کے دو صاحب زادے مولوی محمد طاہر اور مولانا طیب ہوئے۔ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند موجود ہیں۔

اکرامن کی شادی مولوی عبداللہ انبیٹھویؒ سے ہوئی، جو صدر شعبۂ دینیات ایم.اے.او کالج (علی گڑھ) تھے۔ رقیہ کی شادی مولوی محمد صدیق گنگوہیؒ سے ہوئی، جن کے صاحب زادے مولوی محمد عمر (ناظم متفرقات دارالعلوم دیوبند) ہیں(۲)۔

تصانیف:

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تصانیف کثیرہ کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانے کے ان مسائل پر قلم اٹھایا ہے، جو اس زمانے میں زیرِ بحث تھے؛ بلکہ مولانا نانوتویؒ کی تمام تر تصانیف کسی نہ کسی کے استفسار کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔ مولانا نانوتویؒ کے مضامین اور بیان نہایت ادق اور مشکل ہیں۔ مولوی منصور علی خاں مرادآبادیؒ لکھتے ہیں:

''میں نے جناب مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی کو خوب دیکھا ہے، اور ان کی تقریر بھی سنی ہے،

(۱) ''خزانۂ خوبی'' سے ۱۲۹۷ھ سن نکلتا ہے۔ (نعمان)

(۲) مولانا محمد طیب صاحبؒ نے سوانح قاسمیؒ، ج ۱، ص: ۵۰۴ تا ۵۰۷ کے ایک طویل حاشیے میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی اولاد کی تفصیل درج کی ہے۔ (قادری)

اور ان کے خیالات اور اوصاف پر غور کیا ہے۔ ان کا ذہن مصنفین فلسفہ کے ذہن سے بھی عالی تھا۔ وہ ہر مسئلۂ شرعی کو دلائل عقلیہ سے ثابت کرنے پر اور مسئلۂ فلسفی مخالف شرع کو دلائل عقلیہ سے رد کرنے پر ایسے قادر تھے کہ دوسرے کسی عالم کو میں نے ایسی قوت علمیہ اور بیانیہ والا نہیں دیکھا''۔

چناں چہ اسی قوت علمیہ اور قوت بیانیہ کی پوری پوری جھلک مولانا نانوتویؒ کی تصانیف میں ملتی ہے۔ منشی ممتاز علیؒ مالک مطبع مجتبائی دہلی نے ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں مولانا نانوتویؒ کی تمام تر تصانیف کا ایک پروگرام بنایا، اور'' قاسم العلوم'' کے سلسلے کے تحت ان کو شائع کرنا شروع بھی کیا؛ مگر افسوس کہ یہ سلسلہ پورا نہ ہو سکا۔ قاسم العلوم کے صرف چار حصے شائع ہو سکے۔ اس میں گیارہ مکتوب (رسالے) شائع ہو سکے۔ ان کا پہلا حصہ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ (اپریل ۱۸۷۵ء)، اور چوتھا حصہ جمادی الثانیہ ۱۲۹۲ھ (جولائی ۱۸۷۵ء) میں طبع ہوا۔ ان رسالوں کی تصحیح خود مولانا نانوتویؒ نے کی ہے، اور اس زمانے میں مولانا نانوتویؒ کا قیام دہلی ہی میں رہا۔ ہمارا خیال ہے کہ پادری تاراچند کا واقعہ بھی اسی زمانے ہوا ہوگا[1]۔

---

(۱) (مضمون ماخوذ از): ماہ نامہ الرحیم-حیدرآباد، دسمبر ۱۹۶۵ء، ص: ۴۰۵ تا ۴۱۶۔

حضرت مولانا نانوتویؒ کی سیرت ایک نظر میں

حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری مہاجر مدنیؒ ٭

دارالعلوم اور مدرسۂ شاہی کی تاسیس:

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب، اعلی اللہ درجاتہ، ان مبارک ہستیوں میں سے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے علوم کثیرہ، وافرہ، نافعہ اور اعمالِ صالحہ، اور اخلاق حسنہ سے بھرپور طریقے پر نوازا تھا۔ آپ کی زیادہ شہرت ''بانیٔ دارالعلوم دیوبند'' کی وجہ سے ہوئی، اور آپ کے علوم کا کچھ حصہ آپ کی کتابوں سے اُمت تک پہنچا۔ آپ کی کتابوں کا سمجھنا چوں کہ بہت مشکل تھا، علما تک مشکل سے سمجھ پاتے تھے؛ اس لیے آپ کی تالیفات زیادہ معروف ومشہور نہ ہوئیں(۱)۔ مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''آبِ حیات'' (حضرت مولانا نانوتویؒ کی تصنیف) وغیرہ میں نے حضرتؒ سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے۔ ''آبِ حیات'' کے کچھ اوراق حضرتؒ نے خود نکال دیے تھے کہ انہیں کوئی نہیں سمجھے گا۔

آپؒ نے خواب میں دیکھا کہ میں کعبۂ شریف کی چھت پر ہوں، اور میرے پاؤں کے نیچے سے نہر جاری ہے، جو کوفہ کی طرف سے آرہی ہے۔ اس خواب کی تعبیر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس سے ظاہر ہوئی۔ کوفہ کی طرف سے نہر آنے میں حنفی مذہب کی تائید کی طرف اشارہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا فیض پورے عالم میں پہنچ رہا ہے۔ مدرسۂ مذکورہ سے ہزاروں علما، خطبا، مدرسین ومبلغین نکل کر پورے عالم میں پھیلے، اور جہالت کی اندھیری کو دور کر کے علوم اسلامیہ اور اعمال صالحہ کی شمع روشن کی۔ نہ صرف محدثین اور فقہا اور مفتی کثیر تعداد میں مادرِ علمی دارالعلوم کی گود سے نکلے اور پلے اور بڑھے؛ بلکہ بڑی وافر تعداد میں مصنفین بھی پورے عالم میں پھیلے۔ ان مصنفین میں مفسرین بھی ہیں اور شراحِ حدیث بھی، کتبِ فقہ کے شارحین بھی، ادب عربی کے فضلا بھی اور معقولات کے مؤلفین بھی۔ ان حضرات کی تالیفات کو شمار کیا جائے، تو اندازہ ہے کہ ہزاروں تک پہنچے گی۔

٭ صاحبِ تفسیر ''انوارالبیان''

(۱) صاحبِ تحریر کی یہ بات کہ حضرت نانوتویؒ کی کتابیں اس لیے مشہور نہیں ہوئیں کہ وہ مشکل ہیں، ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ حضرتؒ کی تصانیف مشہور تو ہوئیں؛ لیکن استفادہ مشکل ضرور معلوم ہوا۔ (نعمان)

تنہا حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کی تالیفات ومطبوعات اور مواعظ کو جمع کیا جائے، تو ایک ہزار کی لگ بھگ انہیں کی تعداد ہو جائے گی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے چن لیا اور مفتاح الخیر بنادیا۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے:

''طُوْبٰی لِمَنْ کَانَ مِفْتَاحاً لِلْخَیْرِ وَمِغْلَاقاً لِلشَّرِ''۔

دار العلوم کے فضلا سے پورے عالم میں خیر بھی پھیلی اور پھیل رہی ہے۔ جہالت ڈوبی، شرک مٹا، بدعات بھی کافور ہوئیں۔

۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں دار العلوم دیوبند کی تاسیس ہوئی، پھر چھ ماہ بعد مدرسۂ مظاہر العلوم سہارن پور قائم کیا گیا، اس کے بانی مولانا سعادت علی سہارن پوریؒ فقیہ تھے۔ مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر (جو حضرت حجۃ الاسلامؒ کے استاذ بھی تھے) اس کا تاریخی نام سن تاسیس کے دس سال بعد ''مظاہر علوم'' تجویز کیا گیا۔ یہ نام تاریخی بھی ہے، جس سے ۱۲۹۲ھ/ر کے عدد ظاہر ہوتے ہیں، اور مولانا محمد مظہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اس کے بعد جامعہ قاسمیہ مرادآباد عرف مدرسۂ شاہی کی بنیاد پڑی۔

۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں حضرت مولانا عالم علی محدث کے انتقال کے بعد مرادآباد کے باخبر حساس قلوب میں ضرورتِ مدرسہ کا احساس پیدا ہوا۔ حضرت نانوتوی قدس سرہ مرادآباد تشریف لائے ہوئے تھے۔ سب نے مل کر حضرت مولانا کی خدمت میں عرض داشت پیش کی کہ مرادآباد کی سرزمین دولت علمی سے خالی ہو چکی ہے، اگر چندے یہی حالت رہی تو دینی جذبات ختم ہو جائیں گے۔ حضرت دعا فرمادیں کہ خداوند کریم اہل مرادآباد کو دوبارہ علمی فیوض و برکات سے متمتع فرمائے۔ حضرتؒ نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ ہاتھ اٹھانے کی دیر تھی کہ اجابت درحق کے سامنے آئی اور کام بن گیا۔ حضرتؒ نے حاضرین سے فرمایا کہ: بہ طرز دیوبند غریبوں سے تھوڑا تھوڑا چندہ مقرر کرالیا جائے، اور اصحاب ثروت بھی اس کارِ خیر میں حصہ لینا چاہیں، تو ان کو بھی شامل رکھا جائے۔ چناں چہ چندے کی اپیل کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے جس نے چندہ پیش کیا، وہ ایک بہشتی تھا، جس نے ایک پیسہ دیا، جو نہایت خوشی کے ساتھ قبول کیا گیا۔ (یہ بہشتی ایک پیسے میں کسی کے گھر پانی کی مشک ڈال کر آیا تھا)(۱)۔

(۱) مولانا سید محمود احمد صاحبؒ (جو محلّہ اصالہ پورہ مرادآباد کے رہنے والے تھے، اور مدرسۂ شاہی میں اٹھارہ سال تک مہتمم رہے تھے) نے کلکتہ کے زمانۂ قیام میں احقر کو بتایا تھا کہ بہشتی نے جو ایک پیسہ دیا تھا، وہ آج تک مدرسۂ شاہی کے خزانے میں محفوظ ہے۔ (عاشق)

چند ہی روز میں تیس پینتیس روپے ماہ وار کا انتظام ہوگیا، اور حسبِ ہدایت حضرت اقدسؒ حضرتؒ کے تلمیذِ رشید جامع محاسن صوری ومعنوی حضرت مولانا سید احمد حسن امروہوی، قدس سرہٗ کا یہ مشاہرہ پینتیس روپیہ تقرر عمل میں آیا۔ یہ جامعۂ قاسمیہ مراد آباد کی ابتدائی روداد ہے، جو مدرسۂ شاہی کے نام سے مشہور ہے۔

شانِ تواضع:

حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ تواضع سے نوازا تھا۔ اپنی ذات کو مٹا کر رکھتے تھے۔ لباس میں کوئی ایسی شان ظاہر نہیں ہوتی تھی کہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ شخص عالم ہوگا۔ کھدر کے کپڑے، دھوتر کا لباس، سردی میں سر پر کن ٹوپ، چال ڈھال میں سادگی، اور ساتھ ہی مجلس میں سب ساتھیوں کے ساتھ ایک عام شخص کی طرح بیٹھنا، مجلس میں کوئی امتیازی شان ظاہر نہ ہونے دینا، یہ تواضع کی خاص شان تھی۔ ایک موقع پر فرمایا کہ: میں جس طرح صوفیوں میں بدنام ہوں، اسی طرح مولویت کا دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے؛ اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ اگر یہ مولویت کی قید نہ ہوتی، تو قاسم کی خاک تک کا پتہ نہ چلتا۔ جانوروں کے گھونسلا بھی ہوتا ہے، میرے یہ بھی نہ ہوتا، اور کوئی میری ہوا تک نہ پاتا۔ وَلَنِعْمَ مَا قِيْلَ:

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوس ناکے نہ داند جام وسنداں باختن

انگریزوں نے ۱۲۹۲ھ/اور ۱۲۹۳ھ/ (۷۶-۱۸۷۵ء) میں ”میلۂ خدا شناسی“ کے عنوان سے ایک مجلس منعقد کرائی تھی، جس میں تمام مذاہب کے قائدین کو بلایا تھا۔ یہ مجلس شاہ جہاں پور میں منعقد ہوئی تھی۔ اس مجلس کی شرکت کے لیے آپ شاہ جہاں پور میں تشریف لے جارہے تھے، کوئی خادم ساتھ نہ تھا، استقبال سے بچنے کے لیے ایک اسٹیشن پہلے اتر گئے اور پیدل چل کر شاہ جہاں پور پہنچے۔ راستے میں ندی پڑتی تھی، اسے پار کیا، تو پاجامہ بھیگ گیا، جو گاڑھے کا تھا، اس کی جگہ چادر باندھ لی اور پاجامہ کو لاٹھی پر ڈال کر کاندھے پر لٹکا کر چلتے رہے، تاکہ سوکھ جائے۔ شاہ جہاں پور پہنچے، تو ایک سرائے میں جا کر مقیم ہوگئے۔ وہاں اپنا نام ”خورشید حسن“، لکھوادیا، جو آپ کا تاریخی نام تھا۔ اِدھر تو یہ ہوا، اور اُدھر استقبال کرنے والے اسٹیشن پر پہنچے، پوری ریل چھان ماری، کسی ڈبے میں پتہ نہ چلا۔ افسوس کرتے ہوئے واپس لوٹے اور آپس میں کہنے لگے کہ ہر فرقے کے مناظر آگئے، ہمارا مناظر نہیں آیا۔ حیران ہو رہے تھے کہ مقابلے کے وقت کیا ہوگا؟ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک شخص نے کہا: ذرا سرائے میں چل کر تو دیکھیں، وہاں پہنچے، تو رجسٹر لکھنے والے سے پوچھا کہ

محمد قاسم نام کا کوئی آیا ہے؟اس نے کہا کہ اس نام کا تو کوئی شخص نہیں آیا۔ جولوگ تلاش میں نکلے تھے، ان میں سے ایک شخص نے کہا: ذرا مجھے رجسٹر تو دکھاؤ۔ جب مندرجہ نام دیکھنے لگے،تو ان میں ایک نام خورشید حسن لکھا تھا۔ حاضرین میں سے بعض افراد جانتے تھے کہ یہ آپ کا تاریخی نام ہے۔ کمرہ نمبر معلوم ہونے پر جا کر دیکھا،تو حضرت تشریف رکھتے تھے۔ سب کی جان میں جان آگئی اور خوشی کی لہر دوڑ گئی (۱)۔

مولانا احمد علی محدث سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی میں مطبعِ احمدی کے نام سے ایک پریس قائم کیا تھا۔ اس زمانے میں صرف لیتھو پریس (۲) کا رواج تھا،(اب تو کمپیوٹر نے سب طریقے بھلا دیے) مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود ہی کتابوں کے حواشی لکھتے تھے،اور خود ہی شائع فرماتے تھے۔ جلالین شریف،ترمذی شریف،مشکوۃ شریف کے جوحواشی رائج ہیں،اندازہ کیا جاتا کہ ان ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ مسلم شریف کا حاشیہ لکھنے کے بجائے انہوں نے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کی شرح ہر صفحے کے ذیل میں چھاپ دی۔ ہندو پاک میں مسلم شریف آج تک اسی طرح چھپ رہی ہے۔ بخاری شریف کا حاشیہ بھی ان ہی کا لکھا ہوا ہے۔ پچیس پاروں تک تو انہوں نے لکھا ہے، اور پانچ پاروں کے حواشی قاسم العلوم والخیرات حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سے لکھوائے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہیں اپنا نام نہیں لکھا۔ مخلصین کی بھی کیا شان ہے،(دور حاضر کے محشی حضرات کو دیکھ لیجیے، ہر ہر صفحے میں کئی کئی دفعہ نام اور علمیت جتانے کا پروگرام سامنے رہتا ہے)۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع سے اور حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع سے بھر پور حصہ ملا۔

زہد وقناعت اور استغنا:

حضرت حجۃ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ میں شانِ تواضع تو نمایاں تھی ہی، زہد اور استغنا بھی بہت تھا۔ جب دار العلوم دیو بند قائم کیا، اس وقت میرٹھ کے ایک پریس میں تصحیح کا کام کرتے تھے۔ دس روپے تنخواہ تھی۔ مدرسہ قائم کر کے اس کی سر پرستی تو فرمائی؛ لیکن نہ تنخواہ دار مدرس بنے، نہ مجلس شوریٰ کے رکن ہوئے، نہ صدر بنے۔ اسی زمانے میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے علم حاصل کیا۔

---

(۱) اس کے ہم معنی ''ارواحِ ثلاثہ'' میں ایک اور حکایت بھی ہے۔ دیکھیے: حکایت نمبر ۲۸۴- (عاشق)

(۲) لیتھو کی کتابت پیلے رنگ کے کاغذ پر ہوتی تھی، اور اسی سے پلیٹیں بنا کر کتاب چھاپی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ کتاب چھپنے کے بعد وہ کتاب اپنا اثر کھو دیتی تھی۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے وقت پھر کتابت اسی طرح ہوتی تھی۔ (نعمان)

میرٹھ کے ایک رئیس رومال میں بہت سے روپے باندھ کر حاضر ہوئے، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ حجامت بنوار ہے تھے، اوّل تو حضرتؒ نے ان کی طرف سے تغافل برتا، پھر کچھ دیر کے بعد فرمایا: آہا شیخ صاحب ہیں؟ مزاج اچھا ہے؟ انہوں نے سلام عرض کیا اور رومال میں جو روپے بندھے ہوئے تھے، حضرتؒ کے قدموں میں ڈال دیے۔ اس زمانے میں روپیہ چاندی کا ہوتا تھا۔ حضرتؒ نے وہ روپیہ اپنے قدموں سے ہٹا دیا۔ وہ بڑی منت سے قبول کرنے کی درخواست کرتے رہے؛ لیکن حضرتؒ نے قبول نہ فرمایا۔ وہ آپ کی جوتیوں میں ڈال کر چلے گئے۔ حضرتؒ جب اٹھے، تو نہایت استغنا کے ساتھ جوتے جھاڑے اور روپیہ سب زمین پر گر گیا، حضرتؒ نے جوتے پہن لیے اور حافظ انوار الحق صاحب سے ہنس کر فرمایا کہ: حافظ جی! ہم بھی دنیا کماتے ہیں اور اہلِ دنیا بھی دنیا کماتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہم دنیا کو ٹھکراتے ہیں اور وہ قدموں میں پڑتی ہے، اور دنیا دار اس کے قدموں میں گرتے ہیں، اور وہ انہیں ٹھکراتی ہے، اور یہ فرما کر روپیہ وہیں تقسیم فرما دیا(۱)۔

جس زمانے میں میرٹھ کے مطبع سے دس روپے تنخواہ ملتی تھی، ان ہی دنوں نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ رئیس بھوپال کی طرف سے پانچ سو روپے ماہانہ کی پیش کش کی گئی۔ آپ نے جانے سے انکار کر دیا۔ ایک بے تکلف ساتھی نے کہا کہ تم کیوں نہیں چلے جاتے؟ جواب میں فرمایا کہ وہ مجھے باکمال سمجھ کر بلاتے ہیں، اور مجھ میں کوئی کمال نہیں ہے، تو کیسے جاؤں؟

ان کے سبق کے ساتھی اور دوست اور ہم وطن مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے (جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے) کسی نے کہا کہ آپ چلے جائیے۔ فرمایا: بابا مجھے دس روپے تنخواہ ملتی ہے، پانچ روپے میرے گھر کا خرچ ہے، پانچ روپے طالب علموں کو دے دیتا ہوں، اللہ ان کا بھلا کرے کہ سامنے پڑ جاتے ہیں، ڈھونڈنا نہیں پڑتا، اتنی بڑی رقم کے بارے میں سوچنا کہ اس کا کیا کروں؟ یہ دھندہ میرے بس کا نہیں: ۔

أُولَـئِكَ آبَـائِـي فَـجِـئْـنِـي بِـمِـثْـلِـهِـمْ
إِذَا جَـمَـعَـتْـنَـا يَـا جَـرِيْـرُ الْـمَـجَـامِـعُ

ایک مرتبہ حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ: جو شخص ہم کو محتاج سمجھ کر دیتا ہے، اس کا ہدیہ تو لینے کو جی نہیں چاہتا، اور جو اس غرض سے دیتا ہے کہ ہمارے (یعنی دینے والے کے) گھر میں برکت ہو، اور ہمارے لینے کو ہمارا احسان سمجھے، اس کا ہدیہ لے لینے کو جی چاہتا ہے، اگر چہ وہ چند پیسے ہی ہوں (۲)۔

(۱) ارواحِ ثلاثہ، حکایت نمبر: ۲۶۶۔　　(۲) ایضاً، حکایت نمبر: ۲۲۵۔

مناظرے:

انگریزوں نے جب ہندوستان میں نامبارک قدم رکھے، تو ان کے برے عزائم میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو عیسائی بنالیا جائے۔ چوں کہ انہوں نے مسلمانوں ہی سے ملک لیا تھا؛ اس لیے مسلمانوں ہی سے خطرہ تھا۔ عیسائیت پھیلانے کے لیے انہوں نے مشن قائم کیے، اور اپنے پادریوں کو مناظرے کے لیے تیار کیا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ سے اکبرآباد (آگرہ) میں پادری فنڈر کا مناظرہ ہوا۔ تین دن تک مناظرہ ہونا طے پایا تھا؛ لیکن وہ تیسرے دن نہ آیا۔ اس نے ہندوستان سے راہِ فرار اختیار کی، اور ترکی میں جاکر یہ پروپیگنڈہ کیا کہ ہندوستان کے مسلمان عیسائی ہوگئے، اور مسجدیں گرجاؤں میں تبدیل ہوگئیں۔ اس وقت ترکی کی حکومت حرمین شریفین میں بھی تھی، انگریزوں نے مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کی جائداد ضبط کرلی اور وہ کسی طرح چھپتے چھپاتے یمن سے گزرتے ہوئے مکۂ معظّمہ پہنچ گئے۔ یہاں شیخ الحرم احمد زینی دہلانؒ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے ان کا درس شروع کرادیا۔ جب فنڈر نے ترکی میں یہ جھوٹا پروپیگنڈہ کیا کہ ہندوستانی مسلمان (العیاذ باللہ) نصرانی ہوگئے، سلطان ابن عبدالعزیز نے ترکی کے شیخ کے پاس قاصد بھیجا کہ اس بات کی تحقیق کرے۔ شیخ نے جواب دیا کہ یہ خبر جھوٹ ہے، جس بزرگ نے عیسائی مناظر کو شکست دی تھی، وہ ہمارے پاس مکۂ معظّمہ میں موجود ہے۔ مولانا رحمت اللہ صاحبؒ مکہ میں مقیم رہے، پہلے ''محلّہ شامیہ'' میں کرائے کا کمرہ لے کر مدرسے کا افتتاح کیا، اس کے بعد ''صولت النساء بیگمؒ'' بنگال کی جن نے مدرسے کے لیے ''حارۃ الباب'' میں جگہ خرید کردے دی، لہٰذا محلّہ شامیہ سے مدرسہ وہیں منتقل ہوگیا اور آج تک وہیں ہے[1]۔ پہلے مدرسے کا نام ''مدرسۃ الشیخ رحمت اللہ'' تھا، مذکورہ جن کی مالی سخاوت کے بعد ''مدرسۂ صولتیہ'' کے نام سے مشہور ہوگیا۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی مناظرے کرنے پڑے۔ عیسائیوں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں نے بھی پاؤں نکالے، اور انہوں نے بھی مناظروں کا سلسلہ چلایا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ جہاں پور میں تمام مذاہب کے عوام اور خواص کے سامنے زبردست تقریر کی۔ سب سے اسلام کا لوہا منوالیا۔ کسی کو مجال نہ تھی کہ اُف بھی کرے اور کچھ بول سکے۔ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی زبردست تقریر فرمائی کہ سب دم بہ خود رہ گئے۔ نصاریٰ کے پادری بھی لاجواب اور آریوں کے پنڈت بھی عاجز۔ یہ مجلس ''میلۂ خداشناسی'' کے نام سے قائم کی گئی تھی۔

---

(۱) ۲۰۱۰ء میں حرمِ مکہ کی توسیع کے وقت یہ مدرسہ بھی اس جگہ سے ختم ہوگیا، اب یہ مدرسہ حرم سے پانچ کلومیٹر دور کعکیہ کے علاقے میں خدمات انجام دے رہا ہے۔ (نعمان)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر سے حق واضح ہوکررہا، اور ''لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ'' کا خوب مظاہرہ ہوا؛ لیکن نہ عیسائیوں نے اسلام قبول کیا، اور نہ ہندوؤں نے، اور اس دنیا میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، حق کو جانتے ہوئے نہ ماننا نسلی اور مذہبی تعصب کی وجہ سے باطل پر جمے رہنا ضد اور عناد والوں کی پرانی عادت ہے۔

یہودیوں کا حال تو معلوم ہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے کئی سو سال پہلے مدینۂ منورہ میں آپ کی آمد کے انتظار میں آکر بس گئے تھے، اور انصار کے قبیلوں سے کہتے تھے کہ نبیٔ آخر الزماں آئیں گے، ہم ان سے مل کر تمہارا ناس کھودیں گے؛ لیکن جب آپ مدینۂ منورہ تشریف لے آئے، تو انصار کے دو قبیلے ''اوس اور خزرج'' مسلمان ہو گئے؛ لیکن یہودی مسلمان نہ ہوئے۔ سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا؛ فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ، فَلَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ''(۱).

''اور آپ کی آمد سے پہلے آپ کی تشریف آوری کی خبر دے کر کافروں کے مقابلے میں آپ کے ذریعے فتح یابی کی خبر دیا کرتے تھے، سو جب آپ تشریف لے آئے، تو آپ کے منکر ہو گئے۔ سو اللہ کی لعنت ہے کافروں پر''۔

نصاریٰ نجران آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، مباہلے کی بات طے ہوگئی، پھر ان کے پادری نے کہا کہ: دیکھو کہ اگر تمہیں ہلاک ہونا ہے، تو مباہلہ کرلو؛ ورنہ چلے چلو؛ چناں چہ وہ لوگ فرار ہولیے، سامنے نہ آئے۔ کافروں کی عادت رہی ہے کہ حق واضح ہونے پر بھی حق قبول نہیں کرتے۔ دشمنانِ اسلام کی دشمنی کے باوجود بھی اسلام پھلا پھولا اور پھیلا اور الحمد للہ پھیل رہا ہے۔ یہود و نصاریٰ کی طرح روافض اور قادیانیوں کا بھی یہی طریقہ رہا ہے۔ بار بار مناظروں میں ہارتے ہیں؛ لیکن اسلام قبول نہیں کرتے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں شیعوں نے بھی سر اٹھا رکھا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے اعتراضات کے بھی مسکت اور دندان شکن جوابات دیے، اور ان کی ہدایت اور خیر خواہی کے لیے ''ہدیۃ الشیعہ'' تحریر فرمائی۔ شیعہ ہمیشہ سے تقریری اور تحریری مباحثات میں لا جواب ہوتے رہے ہیں۔ انہیں بھی ضد اور عناد نے بے راہ کر رکھا ہے۔ نہ صرف یہ کہ باطل کے پیرو ہیں؛ بلکہ اہل حق کو طرح طرح کی جسمانی اور روحانی اذیتیں پہنچانے کے حق میں رہے ہیں۔ کم لوگ ایسے گزرے ہیں، جنہوں نے حق کو جاننے کے بعد حق کو قبول کیا اور تائب ہوئے۔

(۱) سورۂ بقرہ، آیت: ۸۹۔

ایک زندہ، مردہ ہوگیا:

ایک مرتبہ شیعوں کو کیا سوجھی کہ آپ کے ساتھ تمسخر اور استہزا کرنے کے لیے کہنے لگے کہ: آپ ہمارے جنازے کی نماز پڑھادیں۔ ان لوگوں نے ایک نوجوان کو کپڑا اڑھا کر لٹا دیا تھا، اور اسے یہ سبق پڑھایا تھا کہ حضرتؒ جب دو تکبیریں کہہ لیں، تو اٹھ کر بھاگ جانا۔ اوّل تو حضرتؒ نے نماز پڑھانے سے انکار کردیا، اور فرمایا کہ: میرے پڑھانے سے تمہاری نماز جنازہ کیسے ادا ہوگی؟ جب وہ لوگ اصرار ہی کرتے رہے، تو آپ آگے بڑھے، اور نماز شروع کردی۔ دو تکبیریں کہنے پر جب طے شدہ پروگرام کے مطابق جنازے میں حرکت نہ ہوئی، تو پیچھے سے کسی نے ''ہونہہ'' کے ساتھ صاحبِ جنازہ کو اٹھ کھڑے ہونے کی سسکاری دی؛ مگر وہ نہ اٹھا۔ حضرتؒ نے تکبیرات اربعہ پوری کر کے غصے کے لہجے میں فرمایا کہ: ''اب یہ قیامت کی صبح سے پہلے نہیں اٹھ سکتا''۔ دیکھا گیا، تو وہ مردہ تھا۔

شیعوں میں رونا پیٹنا پڑ گیا، اور بجائے حضرت والاؒ کی سبکی کے سب کی سبکی ہوگئی۔ اس کرامت کو دیکھ کر شیعوں میں سے بہت سے تائب ہو کر سنی ہو گئے (۱)۔

جہاد ۱۸۵۷ء میں حصہ:

۱۸۵۷ء/ مطابق ۱۲۷۲ھ/ میں انگریزوں سے جہاد ہوا۔ حاجی صاحبؒ کی جماعت بھی حرکت میں آگئی۔ حضرت حاجی صاحبؒ کے رفقائے کار میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ(۲)، مولانا شیخ محمد تھانویؒ اور حافظ محمد ضامن شہیدؒ شامل تھے۔ جہاد کے سلسلے میں تبادلۂ خیال ہوا، تو مولانا شیخ محمد تھانویؒ نے بے سروسامانی کا ذکر کر کے جہادِ آزادی میں حصہ لینے سے گریز کرنے کی تجویز پیش کی۔ مولانا نانوتویؒ نے اس تجویز کی مخالفت کی، اور کہا کہ: کیا ہم اصحاب بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان ہیں؟ حضرت حاجی صاحبؒ نے یہ فقرہ سنا، تو تڑپ اٹھے، اور فرمایا کہ: اب ''الحمد للہ انشراح ہوگیا''، اور جہاد کی تیاری شروع کردی گئی۔ حاجی امداد اللہؒ امیر، مولانا نانوتویؒ سپہ سالار، مولانا گنگوہیؒ قاضی مقرر ہوئے اور تھانہ بھون ''دارالاسلام'' قرار پایا۔ میرٹھ کے بعد دہلی، اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر جنگ چھڑ چکی تھی۔ آپؒ نے اپنے امیر کی قیادت میں جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تھانہ بھون بھی شدید جنگ کی لپیٹ میں تھا۔ قتل وغارت کا بازار گرم تھا۔ مکانات پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔

---

(۱) حاشیہ سوانح قاسمیؒ: ج ۱ ص ۷۱

(۲) حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ یہاں قلمی سہو ہوا ہے۔ (نعمان)

غرض دیکھتے ہی دیکھتے قصبہ تھانہ بھون خاکستر کا ڈھیر بن گیا۔ فسادیوں نے یہ کام کیا؛ لیکن انگریزوں کی طرف سے حضرت حاجی صاحبؒ اور آپ کے رفقائے کار پر الزام تھا کہ تھانہ بھون کے فساد میں پیش پیش تھے، اس بنا پر وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے گئے؛ لیکن حضرت نانوتویؒ کو پولیس گرفتار نہ کر سکی۔ سی. آئی. ڈی بھی پہنچی، پولیس بھی پیچھے لگی؛ لیکن آپ ہمیشہ بچ کر نکلتے رہے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ آپ مسجد میں باہر فرش پر کھڑے تھے، پولیس نے آپ ہی سے پوچھا کہ: مولوی قاسم کہاں ہے؟ ایک دو قدم آگے بڑھ کر فرمایا: ابھی تو یہیں تھے۔ پولیس والے یہ سمجھ کر یہ کوئی دوسرا شخص ہے، چھوڑ کر چلے گئے۔

وارنٹ نکلنے کے بعد حضرت مولانا رحمت اللہ علیہ صرف تین دن پوشیدہ رہے، اس کے بعد باہر آ گئے، اور فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین دن غارِ ثور میں رہے تھے، ہم نے اس کا اتباع کر لیا۔ آپ کے دوست خاص اور مصاحب قدیم مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی وارنٹ نکلے تھے۔ انہوں نے بھی ۱۸۵۷ء کے جہاد میں شرکت کی تھی۔ پولیس گرفتار کر کے سہارن پور لے گئی، پھر کچھ عرصے بعد مظفر نگر کی جیل میں منتقل کر دیا۔ جب پولیس آپ کو مظفر نگر لے جا رہی تھی، تو مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ راستے میں کھڑے ہو گئے، اور دور ہی سے آپس میں سلام کی نوبت آئی، اور اشاروں سے اظہار محبت جانبین سے کر دیا گیا(۱)۔

حَاوَلْنَ تَفْدِيَتِي وَخِفْنَ مُرَاقِبًا
فَوَضَعْنَ أَيْدِيَهُنَّ فَوْقَ تَرَائِبَا

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ چھ ماہ جیل میں رہے۔ انگریز حاکم نے دریافت کیا: تم نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھائے؟ اس وقت آپ کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ تسبیح اٹھا کر دکھائی اور فرمایا: ہمارا ہتھیار تو یہ ہے۔ دیکھو جھوٹ بھی نہیں بولا، اور یوں بھی نہیں کہا کہ: ہم نے ہتھیار نہیں اٹھایا۔ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے۔ کما فی الحصن الحصین! اپنے اس ہتھیار کا اقرار کر لیا۔

بیعت اور منازلِ سلوک:

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت قاسم العلوم والخیرات نانوتوی رحمۃ اللہ علیہما سبق کے ساتھی تھے۔ کئی سال دہلی میں گزارے تھے۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: جب میں اور مولوی محمد قاسم صاحبؒ دہلی میں استاذ رحمۃ اللہ علیہ (غالباً مولانا مملوک العلی صاحبؒ) سے پڑھتے تھے، ہمارا ارادہ سُلّم شروع کرنے کا ہوا؛ لیکن مولانا کو فرصت نہ تھی؛ اس لیے انکار فرماتے تھے۔ بالآخر میں نے عرض کیا کہ:

(۱) تذکرۃ الرشید، ج:۱، ص:۸۴۔

حضرت! ہفتے میں دو بار صرف پیر اور جمعرات (یا جمعہ) کو پڑھا دیا کیجیے۔ یہ منظور ہو گیا اور ہفتے میں دو سبق ہونے لگے۔ اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی۔ ایک روز یہی سبق ہو رہا تھا کہ ایک شخص نیلی لنگی کندھے پر ڈالے ہوئے آنکلے، اور ان کو دیکھ کر حضرت مولوی صاحبؒ مع تمام مجمع کے کھڑے ہو گئے، اور فرمایا کہ: بھائی حاجی صاحب آ گئے، اور حضرت مولاناؒ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: لو بھائی رشید! اب سبق پھر ہوگا۔ مجھے سبق کا بہت افسوس ہوا، اور میں نے مولوی محمد قاسم صاحبؒ سے کہا کہ: ''بھئی یہ اچھا حاجی آیا، ہمارا سبق ہی گیا''، مولوی محمد قاسم صاحبؒ نے کہا: بابا ایسا مت کہو، یہ بزرگ ہیں، اور ایسے ہیں ایسے ہیں''۔ ''ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہمیں مونڈیں گے''(۱)۔

حضرت حاجی صاحبؒ فارغ التحصیل عالم نہیں تھے؛ لیکن ایسے ایسے اکابر ان سے بیعت ہوئے، جو علم کے پہاڑ تھے۔ پھر حاجی صاحبؒ ہی کے ہو رہے، اور اسی کو مونڈنے سے تعبیر فرمایا۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ: کیا حضرت حاجی صاحبؒ مولوی نہ تھے؟ فرمایا: مولوی گر تھے، اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: میں علوم ہی کی وجہ سے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معتقد ہوا ہوں۔ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے، اور بہت جلدی ہی خلافت سے نواز دیے گئے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دونوں حضرات سے بہت محبت تھی۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

> ''جو آدمی اس فقیر ''امداد اللہ'' سے محبت وعقیدت رکھتا ہے، مولوی رشید احمد سلمہ اور مولوی محمد قاسم سلمہ کو جو تمام کمالات علوم ظاہری، اور باطنی کو جامع ہیں، بجائے میرے؛ بلکہ مجھ سے بھی بڑھ کر شمار کرے۔ اگر چہ معاملہ برعکس ہے، وہ بجائے میرے اور میں بجائے ان کے ہوتا۔ ان کی صحبت غنیمت جاننی چاہیے کہ ان جیسے آدمی اس زمانے میں نایاب ہیں''۔

ضیاء القلوب میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کا یہ ملفوظ بھی ہے:

> ''اگر حق تعالیٰ مجھ سے دریافت کرے گا کہ امداد اللہ کیا لے کر آیا؟ تو میں مولوی رشید احمد صاحب، اور مولوی محمد قاسم صاحب کو پیش کر دوں گا کہ یہ لے کر حاضر ہوا ہوں''۔

آخر کوئی تو وجہ تھی کہ ان دونوں حضرات نے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا، اور مرید ہونے کی ضرورت محسوس کی؟ بات یہ ہے کہ علم کے ساتھ قلب منیب بھی ہونا چاہیے۔ جو لوگ اس ضرورت کو محسوس نہیں کرتے، وہ علم کے غرور میں صاحب نسبت حضرات سے دور بھاگتے ہیں، اور محروم رہتے ہیں۔

(۱) تذکرۃ الرشید۔

یہ تو ماضی قریب کی باتیں ہیں، ماضی بعید میں حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شمس تبریزؒ کے مرید ہوئے اور پھر ان ہی کے ہو رہے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ بہت بڑے عالم تھے، صاحب جاہ تھے، بڑا مرتبہ تھا؛ لیکن انہوں نے ضرورت محسوس کی، اور اپنے باطن کو انابت الی اللہ سے خالی پایا۔ نفس کا مراقبہ ومحاسبہ کیا۔ اپنے مرشد کی طرف رجوع ہوئے، اور اصلاح باطنی کی طرف ایسے متوجہ ہوئے کہ نہ صرف اپنا بھلا کیا؛ بلکہ قیامت تک کے لیے علما کو بیدار کر دیا۔ منجیات ومہلکات سے آگاہ کیا، اور رہتی دنیا تک کے لیے ''احیاء العلوم'' دنیا میں چھوڑ گئے۔

جو لوگ تصوف وسلوک سے راضی نہیں، وہ کسی صاحب نسبت سے قریب ہی نہیں ہوتے کہ اس لائن کے فیوض وبرکات سے بہرہ ور ہوں:

''اَلنَّاسُ أَعْدَاءٌ لِمَا جَهِلُوْا''.

''تصوف وسلوک کے فوائد سے بے خبر ہیں، اس لیے اس کی مخالفت کرتے ہیں''۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ مشہور مصنف تھے، شہرت میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے لگ بھگ مقام رکھتے تھے، انہوں نے تعلق قائم کیا، تو ان کے متعلقین میں سے ایک بڑا حلقہ معترض ہوا، بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ: اتنے بڑے علامہ نے ایک ملا کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے؟ حضرت علامہؒ نے جواب دیا کہ: علم محض سے کام نہیں چلتا، علم کے ساتھ قلب منیب کی بھی ضرورت ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ: یہ لوگ ایک طرف تو علامہ کہتے ہیں، دوسری طرف معترض ہو رہے ہیں، اس سے تو اور عبرت لینی چاہیے کہ جب اتنے بڑے علامہ کو اصلاح نفس کے لیے کسی مرشد ومصلح کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے، تو کم علم کو کیوں کر اس کی ضرورت نہ ہوگی؟

جو حضرات صاحب نسبت ہیں، جس کو تعلق مع اللہ کی دولت حاصل ہے، وہ کچھ نصیحت کرتے ہیں، تو دل میں اترتی چلی جاتی ہے، اور جن کو یہ دولت نصیب نہیں، ان کے پاس صرف علم ہی علم ہے۔ وہ بڑی بڑی تقریریں کرتے ہیں، لوگ ان کی تقریریں کانوں کی عیاشی کے لیے سن لیتے ہیں، دل پر کسی کے کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ یہ تجرباتی باتیں ہیں۔ تجربہ بڑی دلیل ہے اور شاہد عدل ہے۔

مدارس میں اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ اساتذہ اور تلامذہ میں ذکر وفکر کی شان پیدا ہو۔ تزکیۂ باطن، تربیتِ نفس، کثرتِ ذکر، مراقبہ ومحاسبہ ہر فرد کے اندر ہونا چاہیے۔ ان کاموں کے لیے مرشد ومربی کی

ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں اکابر دیوبند کے خلفا موجود ہیں۔ اہل طلب ان سے رجوع فرمائیں۔علم بھی حاصل کریں، اور عملی زندگی بھی سدھاریں۔ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہوں گے۔ قرآن وحدیث کا علم تو آج کل مستشرقین کے پاس بھی ہے، اسلامیات پر کتابیں بھی لکھتے ہیں، سب کچھ پڑھتے ہیں؛لیکن گم راہ ہیں۔ ایمان ویقین،علم وعمل، ظاہر و باطن کی اصلاح، خدمت دین،فکرآخرت، سب ہی چیزوں کی ضرورت ہے(۱)۔

(۱)(مضمون ماخوذ از کتاب):الامام محمد قاسم نانوتویؒ-حیات، افکار،خدمات،ص:۷۶تا۸۸۔

سوانح قاسمی منظوم

حضرت مولانا محمد حسین فقیر دہلویؒ

مولانا محمد حسین واعظ دہلویؒ، موضع بُٹت ضلع مظفر نگر میں ۱۲۴۳ھ/ ۲۸-۱۸۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ دیگر اساتذہ کے علاوہ حضرت مولانا احمد علی سہارن پوریؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے تعلیم پائی۔ شعر میں حضرت ذوقؒ سے تلمذ تھا، ''فقیر'' تخلص کرتے تھے۔ طریقت میں حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ سے مستفیض تھے۔ ۲۲ر رمضان ۱۳۲۴ھ/ ۹ر نومبر ۱۹۰۶ء کو اکیاسی برس کی عمر میں وفات پائی۔

''تیغِ فقیر'' کے نام سے موصوف کا ''اردو دیوان'' ہے، جس میں ایک نظم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی شان میں ہے، جو حضرتؒ کی سوانح پر مشتمل ہے۔ شعریت کے لحاظ سے اس کا مقام خواہ کچھ نہ ہو؛ لیکن یہ حضرت فقیر دہلویؒ کی یادگار اور ان کے جذبات کا ترجمان ہے۔ یہی اس کی اصل قدر و قیمت ہے۔ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ نے ماہ نامہ بینات کراچی میں جب ''سوانح قاسمی منظوم'' شائع کی تھی، تو درجِ بالا تعارف تحریر فرمایا تھا۔ وہی تعارف یہاں تبرکاً موجود رکھا گیا ہے۔ (نعمان)

یہ عبد رب وہ ربانی ہیں عالم	مطیعِ حق وہ حقانی ہیں عالم
بڑے ذو علم، ذو حکمت ہیں قاسمؒ	حلیمِ امتِ حضرت(۱) ہیں قاسمؒ
یہ راہِ دین کے وہ راہ نما ہیں	کہ اہل قبلہ کے قبلہ نما(۲) ہیں
یہ آیاتِ الٰہی سے ہیں آیت	یہ ہیں مِن حضرۃ الهادی ہدایت
بقیہ ہیں سلف کے اب یہ عالم	وہ حجت ہیں خلف کے اب یہ عالم
کہ گو ہم عصر جمع آخریں ہیں	مگر ہم داستانِ اوّلیں ہیں
یہ ہیں سلطانِ احبار آج قاسم	سریرِ علم پر ذو التاج قاسم
مبلغ حاضر وغائب ہیں قاسم	رسول اللہ کے نائب ہیں قاسم

بہ امرِ دیں مہماتِ عظیمہ	من المولیٰ عطیاتِ عظیمہ
ہوئیں سہل آپ پر عونِ خدا سے	مگر کیا کام ہے عجب دریا سے
کہ رأس المخلصین ہے وصف ان کا	وہ صادق بالیقین ہے وصف ان کا
وہ عرفانِ الٰہی کی زباں ہیں	کلامِ کبریا کے ترجماں ہیں
وہ حافظ ہیں حدیثِ مصطفیٰ کے	معلّم سنتِ خیر الوریٰ کے
یہاں مسلول ہے وہ سیفِ سنت	کہ ہے مقتول ہر بو جہلِ بدعت
کمالِ علم کو جو کیجیے مسند	تو ہیں مسند الیہ اس کے یہ امجد
مضاف ان کی طرف ہے علم وحکمت	یہ اذکی الناس ہیں ذی فہم وخُبرت
علوم اوروں کو حاصل فی الکتب ہیں	مگر قاسم وہ اہل قلب ولب ہیں
علوم ان کے ہیں وہ موہوبۂ حق	کہ ظہرِ قلب پر ان کے ہیں مطلق
زِقسّامِ ازل ہے حظِّ قاسم	کہ قاسم ہیں وہ من مولائے عاصم
علوم دین وایماں کے جہاں کو	معلم رمز قرآں کے جہاں کو
نہیں ان کا کوئی صغریٰ وکبریٰ	کہ منتج ہو بغیر از خیرِ عقبیٰ
یہ شکلِ اوّلِ ترویجِ دیں ہے	بدیہی النتائج ہر کہیں ہے
ہوا یہ حاصلِ فکرِ طبیعت	کہ وہ کلی ہے یہ علم وفضیلت
جو کلّی مشکک سے ہے موسوم	یہ اہلِ علم کو ہے خوب معلوم
نہیں افراد میں اس کے مساوات	کمی بیشی ہے باہم ہے منافات
سو مولانا ہیں ایسے فردِ کامل	کہ گویا کلی ایک موتن ہے حاصل
وہ یعنی اب معاصر سارے ان کے	کہاں ہیں حلم میں ہم رتبہ ان سے
تو حاصل ہوگئی کلی یقینی	یہ اکمل کل سے ہیں فی علم دینی
نجوم حق ہیں ملفوظات ان کے	عجب دفتر ہیں مکتوبات ان کے
کہ جو اسفار دینی سے ہیں منقول	عجیب اسرار قلبی سے ہیں منقول
شفائے زائرین ان کے اشارات	نگاہ اس بشر پر ہے پر بشارات
یہاں جو فلسفی قسمت سے آئے	اشارات وشفا کو بھول جائے
کسی زائر کو ان کا دیکھ پانا	اور ان کا حسب سنت مسکرانا

وہاں تک غم زدہ کیسا ہی آئے	غم ان کو دیکھتے ہی بھول جائے
کوئی ہم دیکھنے والوں سے پوچھے	جو وہ دیکھے کوئی ایسے نہ دیکھے
مفسر ایسے عالم ہیں وہ محکم	ہیں گویا ابنِ عباس ان کے ہم دم
محدث ایسے ہیں وہ عبدِ ہادی	کہ گویا خود ہیں شاگردِ بخاری
احادیثِ نبی پر، جو ہیں مرفوع	عمل ان کی طبیعت کا ہے مطبوع
یہ سنت سے بہت ہی متصل ہیں	یہ اس مرسل کے دین پر مستقل ہیں
کہ ہے قصر الشریعت جس سے مرفوع	ہمیشہ دابر الکفار مقطوع
یہ ایسے کام میں ہیں آج مصروف	کہ ردِّ کفر بس ان پر موقوف
صحیح القول ہیں مشہورِ آفاق	وہ محمود وحسن ہیں ان کے اخلاق
کہ ریح عطر مجموعہ ہیں گویا	اور ان سے ہر طرف پہنچا ہے جھونکا
دلائل ان کے سب ہیں ایسے مقبول	نہیں موضوع ہونا ان کا محمول
مجیب ایسے کہ ہیں ختم المجیبیں	کہ پاتے ہیں مجیبیں ان سے تلقیں
جوابِ خصم میں ہیں ایسے یکتا	جواب ان کا نہیں ہے آج پیدا
کلام ان کا اگر سن پائے کافر	تو سن ہو جائے بت بن جائے کافر
مسلمانوں پہ ہے احسان ان کا	وہ ردِّ کفر ہے سامان ان کا
جو فی ردِّ نصاری حسبِ دل خواہ	وہ آئے مولوی رحمت اللہ
جو آئے کر گئے رفّاض کو زیر	جنابِ مولوی حیدر علی شیر
کہ ان سے رافضی گم راہ بھاگے	سب ہی یہ صورتِ روباہ بھاگے
وہ ہیں شیر نیستانِ تکلم	کہ ان سے ہوش ہیں رفاض کے گم
جو سوط اللہ کے آئے مولف	تو وہ تصنیفات لائے یہ مصنف
کہ کفّارِ ہنود ایسے ہوئے رد	یہ پوچھو ان سے تم کیسے ہوئے رد
اور اندرمن کو پوچھو کیا ہوا وہ	جو قبل از مرگ جیتا جل گیا وہ
تو ستّی ہوگیا اچھا ہوا ہاں	اسے بے کنٹھ میں پہنچا دیا ہاں
یہ سب ایک ایک قوم کافریں کے	مناظر تھے معاون شانِ دیں کے
مگر ہاں حضرت قاسم تو تنہا	مناظر کل کے ہیں ایسے مہیا

کہ اس کا بھی بیاں کچھ مختصر ہے	جو مشتاقوں کے اب پیشِ نظر ہے
تکلم میں طویل الباع یہ ہیں	وہ اکمل آج بالاجماع یہ ہیں
کہ جو اس دور میں اب کاملیں ہیں	وہ گویا ان کے آگے ناقصیں ہیں
جو اہل فضل ہیں مشہور آفاق	وہ ہیں مانند مفضول ان کے مشتاق
یدِ طولیٰ ہے ہر ہر فن میں ان کو	وہ پایا منصب احسن میں ان کو
مسلمانوں کی نصرت میں یہ دین دار	سرِ کفّار پر ہیں تیز تلوار

مباحثۂ رڑکی

کہیں جو ایک ہندو تھا دیانند	ہوا تھا مدعی ایسا دے چند
کہ میں بھی آپ سے ہوں گا مناظر	خبر سنتے ہی اس کی عبد غافر
یہ شاگردوں سے بولے مسکرا کر	کہ وہ کیا چیز ہے، دیکھو تو جا کر
جب اس پر چند شاگردوں کو بھیجا	تو سن کر پھٹ گیا اس کا کلیجا
کہ میرے منہ کی تھی جھوٹی سی ایک بات	وہ لائی سچ مچ مجھ پر یہ آفات
جب اس کے گرد شاگردانِ حضرت	ہوئے خواہانِ بحثِ دین وملت
نہ نکلا گھر سے دھوتی رام باہر	کہ اس کے دل میں بیٹھا اس قدر ڈر
کسی رستے سے ایسا ڈر کے بھاگا	پھر اس رستے کو وہ ہرگز بلا کا
نہ آیا سامنے ان کے جو کافر	تو ان سے کب وہ ہوسکتا مناظر
پھر اس کے شہر میں خدام حضرت	کئی دن بالفصاحت والصراحت
رہے مشغول ردِّ کفر ہندو	ہوئے مشہور عالم اس میں ہر سو
جو ردِ کفر کا دروازہ کھولا	کوئی کافر کہیں ان سے نہ بولا
ہوا روپوش یوں کافر دیانند	نہ ہونے پایا پھر دم بھر وہ آنند
جو اس کے چند کفریہ سوالات	وہ آئے فی حضوری ذی کرامات
جواب ایک ایک کے دو دو وہ لکھے	کہاں دنیا میں ہیں مضمون ایسے
کسی کے پاس ایسے ہوں دکھائے	کہیں ایسے سنے ہوں، تو سنائے
اگر انصاف سے دیکھیں وہ ہندو	ابھی اسلام لائیں سارے ہر سو

مگر انصاف کب ہے بہر کفار	سراسر قہرِ رب ہے بہر کفار
پھر آخر مرگیا جلدی دیانند	ہوا نار سقر میں جا کے آنند
جو ان کا ذرۂ خاک کف پائے	نگاہ کافر اندرمن میں آجائے
تو کیا طاقت ہے اُس خفاش وش کی	کہ اس خورشید سے اندھی نہ ہوتی
اگر وہ ذرہ برق قہر بن کر	جلائے خار زار کفر اندر

مباحثۂ شاہ جہاں پور

درونِ بلدۂ شاہِ جہاں پور	مناظر جب رہے وہ مہبط نور
ہجوم اس میں رہا اسلامیوں کا	بہت مجمع رہا نصرانیوں کا
بہت سے پادری پورے وہاں تھے	بڑے عالم نصاریٰ کے وہاں تھے
بہت عیسائی مرتد بھی وہاں تھے	بہت گوروں میں کالے درمیاں تھے
بہت ہندو بھی تھے اس میں فراہم	جو گوش ظاہر وباطن سے باہم
کلام دل نشیں سنتے تھے ان کا	وہ سب سن سن کے سُن ہوتے تھے گویا
طلاقت تھی لسانِ حق بیان میں	کوئی کم ہوئے گا ایسا جہاں میں
حقِ حقّیتِ اسلام ظاہر	کیا ایسا کہ تھے مبہوت کافر
جو نصرانی وہاں تھے رو بہ رو میں	عرق آلود تھے اس آرزو میں
کہ کاش ایسے پسینے ہم کو آتے	کہ ہم سارے اسی میں ڈوب جاتے
وہاں ہر قسم کے کافر ہوئے رد	مگر غالب ہے سب پر دینِ احمد
کسی نے دم نہ مارا ان کے آگے	ہوئے عاجز نصاریٰ ان کے آگے
رہے عاجز وہ سب بے عقل ودانا	کہ تھا ان کا جواب ایمان لانا
جواب ان کا یہ تھا جو وہ دیتے	کہ تاج اسلام کا سب سر پر لیتے
تعصب نے مگر یوں سب کو مارا	وہ کیا ہندو یہودی اور نصاریٰ
جو حق ہو غیرتِ صد شمس ظاہر	رہیں گے کفر کی ظلمت میں کافر
جو مہر کفر دل پر لگ چکی ہے	تو بے شک مہر والا دوزخی ہے
ہوئی وہ گرمیٔ ہنگامہ دوبار	کہ ہے آفاق میں ضرب المثل دار

کتابیں چھپ گئیں ہیں اس بیاں کی	وہ یعنی قصبۂ شاہِ جہاں کی
تامل سے جو کوئی ان کو دیکھے	جو ہو کافر بھی وہ اسلام لائے
ہوا ان سے وہ ردِّ دینِ شیعہ	عقاید اور اعمال شیعہ
کوئی ہم سر نظر آتا نہیں آج	بہ ہند وسند دیکھو تو کہیں آج
بہ شکل ظہر، عصر ان کا روشن	مگر خفاش چشم اعدائے ہر فن
جو ہیں محروم اس نور نظر سے	ممیّز کیوں ان کو خیر، شر سے

مباحثۂ میرٹھ

مقیم شہر میرٹھ جب تھے حضرت	وہاں حاضر تھا میں بھی ایک مدت
ہوا تھا اتفاق ایسا بھی ناگاہ	کہ دین شیعہ کا اک شخص آگاہ
بڑا ہی مجتہد تھا لکھنو کا	اور اس کا قبلہ وکعبہ لقب تھا
جو تھا اس رافضی کا نام حامد	غلط تھا چاہیے تھا اسم جامد
کہ مثل اسم جامد جس سے مطلق	نہ تھا کوئی بھی امیر خیر مشتق
کہیں میرٹھ میں آیا وہ جو اک دن	فروکش جا ہوا جنات میں جن
گیا رفّاض میں یعنی وہ ارفض	گرا جا کر مریضوں میں وہ امرض
خبر جب حضرت قاسم کو پہنچی	تو خوش ہو کر یہ فرمایا کہ جلدی
ابھی جاتا ہوں میں اس کے مکاں پر	مگر جاؤں گا میں جیسا ہوں احقر
نہ جائے یعنی میرے ساتھ کوئی	نہ پہناؤ مجھے پوشاک اچھی
ہمیشہ خاک ساریٔ زینت ان کی	جو رہتی تھی، وہی اس دن بھی رکھی
وہاں تنہا ہوئے جب رونق افزا	تو جا کر رافضی کو ایسا دیکھا
بڑا ایک گاؤ تکیہ ہے کہ اس پر	دھرا ہے لاش فربہ کو لگا کر
نکلتا منہ سے حقے کا دھواں ہے	کتاب اک سامنے رکھی وہاں ہے
سلام اس کو کیا، تو اس نے سن کر	جواب اس کا انہیں احقر سمجھ کر
اشارے سے دیا موہوم سا کچھ	نہ دل سے ملتفت ان پر ہوا کچھ
کلام اس سے کیا اوّل تو یہ تھا	کہ پوچھا مسئلۂ ارضِ فدک

تو اس نے پھر بھی احقر سا سمجھ کر ۔۔۔ کوئی عامی ہے، یہ کیا غور اس پر
جواب ان کو دیا بے رغبت ومیل ۔۔۔ رہا اس گاؤ تکیہ سے لگا بیل
سنا ردِّ جواب اپنا جو ان سے ۔۔۔ تو سمجھا کوئی عالم ہیں یہ پورے
ذرا لمحہ نہ گزرا تھا کہ کوئی ۔۔۔ وہاں آپہنچا مولانا کا فدوی
کیا عرضِ سلام اس نے جو ناگاہ ۔۔۔ نہ تھا وہ سرِ مولانا سے آگاہ
وہ بولا مولوی صاحب یہاں کیوں؟ ۔۔۔ ہوئے تم رونق افزا ناگہاں کیوں؟
تو سن کر مولوی صاحب وہ شیعہ ۔۔۔ گیا بھول اپنے اوصاف رفیعہ
وہیں اٹھ بیٹھا، اور بیٹھا ادب سے ۔۔۔ یہ پوچھا آپ ہیں میرٹھ میں کب سے؟
بہت باتوں کی رکھی حیلہ سازی ۔۔۔ مگر جو وقت کے ہیں فخر رازی
فدک کے امر میں تقریر معقول ۔۔۔ نہ چھوڑی اس سے تب وہ صورت غول
ہوا غائب کہیں اندر کے گھر میں ۔۔۔ نہ آیا پھر کہیں ظاہر نظر میں
گئے پیغام مولانا کے اکثر ۔۔۔ ذرا نکلو کہیں اندر سے باہر
مناظر ہم سے ہوجاؤ تو اچھا ۔۔۔ ذرا حق اپنا دکھلاؤ تو اچھا
کرو ہر مسئلے میں بات ہم سے ۔۔۔ وگر نہ ہو چکے تم مات ہم سے
نہ آیا رافضی ہرگز نہ آیا ۔۔۔ بہت کچھ ہوگیا، عاجز نہ آیا
بہت جب شہر میں اس کا مچا غل ۔۔۔ تو قوم رافضی جو تھے وہاں کل
ذلیل وسرنگوں شرمندہ ہو کر ۔۔۔ کئی دن تک نہ نکلے گھر سے باہر
ہمارے مجتہد کا یہ ہوا حال ۔۔۔ تو ہم بھی ہوگئے ذلت سے پامال
ہوئی جب امرِ سرّی کی یہ تاثیر ۔۔۔ تو جہری امر ہوتا مثل شمشیر
ابھی تھا خفیہ خفیہ یعنی پیغام ۔۔۔ جو ہوتا معرکہ فی مجمع عام
تو ہوتا شیعہ کو مرگ مفاجات ۔۔۔ نظر آتے سب احیا ان کے اموات
نکل کر رافضی بھاگا وہاں سے ۔۔۔ بہت تنگ آیا گویا اپنی جاں سے
تعصب نے مگر ایسا کیا حال ۔۔۔ کہ رکھا زیر پائے کفر پامال
ابھی تو باب توبہ کھل رہا ہے ۔۔۔ ادھر آ توبہ کر، بس دیر کیا ہے
وہ کیا ایمان لائے گا خدایا ۔۔۔ جنم ہندو کے گھر میں جس نے پایا

واقعۂ دہلی

کوئی دہلی میں ان لامذہبیوں کا	بڑا افسر تھا، اور پنجاب کا تھا
حدیث مصطفیٰ میں اپنا ہم سر	سمجھتا وہ نہ تھا دنیا کے اندر
تکبر علم کا تھا اس کو ایسا	کہ تھا شیطاں کو اس میں کبر جیسا
نمازیں اپنی مولانائے قاسم	ہمیشہ جامع دہلی میں لازم
سمجھتے تھے، تو اکثر بعد مغرب	ہوا کرتا تھا پنجابی مصاحب
بہت کچھ آپ کو گوشے میں لے کر	کیا کرتا تھا استفسار پُر شر
بہت شر اس کے ظاہر سے عیاں تھا	بہت اسرار میں بھی شر نہاں تھا
حضور حضرت قاسم وہ لیکن	نہ کرسکتا تھا ظاہر سرِّ باطن
ہمیشہ ساکت وصامت رہا وہ	جواب ان کا نہ کچھ بھی دے سکا وہ
بہ شکلِ اجہل الناس ان کے آگے	یہ خواہاں تھا کہیں جلدی سے بھاگے
حقیقت کیا تھی پنجابی کی آخر	کہ ہوسکتا وہ حضرت سے مناظر
یہ سارے مدعی اہلِ حدیث آج	اصولِ علم میں ہیں ان کے محتاج
جب ان سے گفتگو کچھ آگئی ہے	وہیں ہر قوم ساکت ہو رہی ہے
تکبر نے تباہ ایسا کیا ہائے	کہ راہ راستی پر کوئی کیوں آئے؟
الٰہی ہو عطا اخلاصِ نیت	رہیں سب دین کے ہم پر حمیت
نہ ہو تفریق باہم اہلِ دیں میں	رہیں سب طوع خیر المرسلیں میں

واقعۂ رام پور

جو شہر رام پور اب ہو وہ مشہور	وہاں نازل ہوئے وہ مہبطِ نور
تو معقولی وہاں کے پُر تکبر	رہے سب غرقِ گرداب تحیر
نہ آئے سامنے مردانِ دیں کے	ہوئے پیوند سب گویا زمیں کے
شفا تھی حفظ جن کو اور اشارات	وہ سارے بے حضوری ہوگئے مات
بڑا معقولی ہے، جو رام پوری	رہا وہ بھی تو محروم حضوری

تکبر نے اسے محروم رکھا	تو اس نے اپنے شاگردوں کو بھیجا
جو کامل منطقی بھی ہو چکے تھے	تکبر میں بھی ہم سر آپ کے تھے
کہ جاؤ مبلغ علم ان کا دیکھو	اور اس کو دیکھ کر ہم کو خبر دو
مقابل میں اگر کافی ہوئے تم	نہ ہوگی ہم کو پروائے تکلم
وہاں وہ نا مبارک جب کہ پہنچے	تو مولانا مبارک شغل میں تھے
مبارک رات تھی، وہ رات جس میں	یہ معقولی ہوئے سب مات جس میں
وہاں تھا یعنی شغل وعظ وتذکیر	رواں تھیں ہر طرف انہار تقریر
وہ تجری تحتہا الانہار کا سا	نمونہ جنت تذکیر میں تھا
ہزاروں سامعیں اس میں تھے حاضر	عجب مجلس تھی نورانی مظاہر
یہاں یہ بھی ہوا جوشِ بیاں میں	طلاقت تھی وہ حقانی زباں میں
کہاں ہیں آج افلاطونِ دوراں	کہاں ہیں آج وہ یونانیاں شاں
رہے وہ فلسفی روپوش کیوں آج	ہوئے وہ صورت مدہوش کیوں آج
نہ تھا ایسا میری ہیبت کا مقدور	مگر میں ہیبت حق سے ہوں مجبور
رہے باب ان کے نا مفتوح جس سے	رہے وہ صورت مطروح جس سے
ذرا جو سامنے آجاتے وہ بھی	تو کچھ ان کی بھی ہو جاتی تشفی
کہ شاید علم منطق بھول کر کچھ	وہ آتے دین کے اطوار پر کچھ
نہ تھی فخر وریا کی نیت اس میں	نہ تھا ان پر ظہور حجت اس میں
وہ جو شاگرد بے چارے گئے تھے	تو گویا جاتے ہی مارے گئے تھے
نہ تھا دم بولنے کا ان میں باقی	بنا زہر آب وہ منطق کا ساقی
نہ آیا کوئی جو غایب تھا روپوش	جو حاضر تھے، وہ تھے گویا کہ بے ہوش
سب ایسے محو تھے سمع بیاں میں	نہ تھی تاب کلام ان کی زباں میں
اشارات وشفا کے تھے جو استاد	اب ان کو ایساغوجی بھی نہیں یاد
ہوئی برخاست جب وہ بزم روشن	گئے احباب خوش، ناشاد دشمن
ہوئے استاد پر شاگرد حاضر	وہ سب مبہوت اور افسردہ خاطر
تو بولا: کیا ہوا تم کچھ نہ بولے	کہ کوئی مبلغ علم ان کا کھولے

وہ بولے: بول تھے وہاں پست لاریب کہ ان کا بول بالا تھا من الغیب
معاون ہوئے جس کا حق تعالیٰ تو اس پر ہوئے کس کا بول بالا
وہ جو بحر علوم ان کا رواں ہے وہ آیا بحر رحمت سے یہاں ہے
وہ ان کا علم ہے ذو لا تناہی وہ ہیں ذی قرب وعرفانِ الٰہی
وہاں ہوتے تمہارے ہوش بھی گم نہ ہوتی تم کو بھی تاب تکلم
رہا مبہوت سا وہ بھی یہ سن کر رہا حیرت زدہ سا سر کو دھن کر
تکبر نے نہ چھوڑا اس کو بے شک کہ آتا خود حضوری میں یکایک
تو کرتا علم دینی کا تعلم پر اس کے کبر نے اس کیا گم
عجیب اس وعظ کا شوروغل تھا یہی مذکور نسواں و رجل تھا
ہوا توحید و سنت کا ظہور آج بنا یہ رام پور اسلام پور آج
بہت نواب کے نوکر ہیں عالم مگر سارے مداہن ہیں وہ ظالم
نہیں وہ آمرینِ امر معروف کہاں وہ نہی منکر سے ہیں موصوف
خدایا دین فروشی بہر دنیا نہ ہوئے قسمت احباب عقبا
خیال آئے اگر اہل حسد کو گئے وہ کیوں امیروں کے بلد کو
جو نوابوں وزیروں کا ہے موقف وہاں تک کیوں گئے ذی شاں اشرف
یہ باعث تھا کوئی صالح وہاں تھے بہت پیر و ضعیف و ناتواں تھے
کہیں گھر سے نکل سکتے نہ تھے وہ سواری پر بھی چل سکتے نہ تھے وہ
جو مولانا سے ان کو تھی محبت وہ تھی ہم رتبہ عشقِ محبت
ہمیشہ ان کو لکھتے تھے وہ ذی الجاہ ذرا مجھ سے بھی تم مل جاؤ للہ
گئے تھے اس لیے وہ ذو مقامات کہ تھی مقصود محض ان کی ملاقات
بہت سے دل میں جو حبِ مساکیں تو ہے تفریح بھی ان کی من الدیں
ہوا یوں یہ عمل اس مستند سے دگر نہ کیا غرض تھی اس بلد سے
بیان کا ان کے کیا کہنا واللہ بیان اسرار مولی کا ہے واللہ
فصاحت ہے تو کیسی کچھ بیاں میں بلاغت ہے تو کیسی کچھ بیاں میں
کلام ان کا دل مؤمن کی تسکیں کلام ان کا سر کافر پہ سکیں

نظر ہے برقِ توحید الٰہی	مناظر کی مخاصم کی تباہی
جو آئے کل مذاہب کے مناظر	ہوئے وہ سب کے سب مبہوت کافر
ذرا بھی جس مناظر پر نظر جائے	تو کار صاعقہ اس پر وہ کر جائے
مطالب کے لیے مثبت ہیں کامل	یہ ہر ہر خصم کے مسکت ہیں کامل
یہ ہیں ایسے توجہ سے مناظر	کہ اظہار ثواب اس سے ہے ظاہر
یہ جس جس امر دیں میں مستدل ہیں	دلائل ان کے حق سے متصل ہیں
تصوف میں بڑے کامل ہیں قاسم	لباس فقر میں رافل ہیں قاسم
وہ ان کی بردباری خاک ساری	عجب ہے آپ پر انعام باری
کبھی ایذائے اعدا پر بھی زنہار	نہ تھے وہ منتقم مقبول غفار
بہ امر معرفت کامل ہیں قاسم	قبول خاص کے قابل ہیں قاسم
وہ ذکر اللہ کے عامل ہیں قاسم	بہ ظاہر خلق کے شامل ہیں قاسم
کہ وہ سلطان ذکر ان پر ہے غالب	یہ ذاتِ بحت کے ہیں محض طالب
کہ جلوت میں بھی ذو خلوت ہیں قاسم	یہ ایسے اہل محویت ہیں قاسم
کچھ استیعاب کی طاقت کہاں ہے	نمونے کو یہی کافی بیاں ہے
بحمد اللہ میں ادنا سا شاگرد	جو استاد البریہ کے رہا گرد
رہا تحدیث میں بھی ان کے شامل	رہا ناقص حضور فرد کامل
رہا میں مستفیضِ صحبتِ خاص	جو اک مدت بہ حال عزم واخلاص
رہی افزوں وہ ایماں کی حلاوت	وہ ذوقی امر ہے جاں کی حلاوت
نہیں ملفوظ ہوسکتا زباں سے	بری ہے ذوق ملفوظ وبیاں سے
الٰہی بندگانِ کاملین کا	اثر ایسا ہو حصہ ناقصین کا
کہ یہ بھی کامل الایمان ہوجائیں	امام المتقین ذی شان ہوجائیں
رہیں ازواج ان کے قرۃ العیں	رہیں اولاد بھی ذو خیر داریں
نہ سمجھے کوئی کبر ایسی دعا کو	ذرا دیکھو کلام کبریا کو
وہ خود تعلیم فرماتا ہے اس کو	عطائے کبریا کو فخر سے لو
الٰہی بندگان صالحین سے	مجھے نسبت ہے، یا بئس القریں سے

کہاں میں لاعب ولاہی وساہی
کہاں وہ موردِ لطف الٰہی

مگر ہاں بندگانِ صالحین سے
عطائے وصف حبِ دل نشیں سے

کہ شاید لطف حق جو جذب فرمائے
صلاح اپنے نصیبوں میں بھی ہوجائے

صرفتُ العمر فی لہو ولعب
فآھا ثم آھا ثم آھا

اُحبُّ الصالحین ولستُ منھم
لعل اللہ یرزقنی صلاحاً

مدیح حضرت قاسم تھے مذکور
دعا پر چاہیے اب ختم مسطور

جزائے خیر دے اللہ ان کو
دعا دیتی ہے خلق اللہ ان کو

جو آیا ہے حدیث مصطفیٰ میں
کہ نمل وحوت شاغل ہیں دعا میں

کہ یارب زندہ رکھ کل عالمین کو
خصوصاً عالمانِ علم دیں کو

خدایا جو کہ ہیں تیرے مذکّر
کلام ان کا ہے عالم میں مؤثر

بقائے ذکر ہے ان کے سبب سے
بقائے خلق ہے بس ذکر رب سے

کہ ہم بھی زندہ ہیں ان کے طفیلی
الٰہی طول ہووے عمر ان کی

کہ یہ ان کے سبب کرتے ہیں ہم چین
کہ ہے ان سے یہ ذکر رب کونین

سو مولانا سے میرا ظن غالب
یہی ہے اب تو بس رأس المطالب

میں اپنے ظن میں ایسا جانتا ہوں
حسیب ان کا ہے وہ غفار بے چوں

کہ مصداق اس کے ایسے ہوتے ہیں بس
کہاں سب آج جیسے ہوتے ہیں بس

مجھے اب تو بہ مثلِ مورد ماہی
دعا لازم یہی ہے یا الٰہی

حیات ان کی ہو اتنی طول و ذی جاہ
کہ ہوئے قصۂ کفار کوتاہ

الٰہی تو سلامت ان کو رکھنا
الٰہی باکرامت ان کو رکھنا

الٰہی امن سے رکھ ان کو محفوظ
رہیں وہ دشمنوں کے شر سے محفوظ

الٰہی کام جاں کے ان کو حاصل
مطالب دو جہاں کے ان کو حاصل

الٰہی ان کے سب اعمال مقبول
الٰہی ہو بقا ان کی بہت طول

الٰہی ان سے تو راضی ہمیشہ
وہ راضی تجھ سے ہر دم خیر پیشہ

صفی دنیا و عقبیٰ میں رہیں وہ
رضائے حق تعالیٰ میں رہیں وہ

یہ میں حارب بنا ان کے سبب سے
مقابل یہ جو ہوں اعدائے رب سے

وگر نہ میں تو وہ ہوں کیا کہوں میں	کہ میں ہی جانتا ہوں جو کہ ہوں میں
مجھے کافی ہے اتنا ہی تماثل	کہ ہے ہم قافیہ اس گل سے بلبل
یہ مدح مختصر کچھ لکھ چکا ہوں	غزل بھی اک ہدیہ بھیجتا ہوں
ہزج مقصور ہے یہ بحر اشعار	غزل کا بحر سالم میں سے اظہار
کہ بحر علم سالم ہیں وہ عالم	بڑے رتبے کے عالم ہیں وہ عالم
وہ بحر علم ہیں عالی مراتب	ہوئی بحر غزل ان کے مناسب

غزل

عطائے ربِّ عزت ہے وہ شانِ مولوی صاحب	نہیں آفاق میں اب ہم عنانِ مولوی صاحب
عجب ہی مہربانی خو ہیں مولانا ابو احمد	اور اس پر روئے خوب ومہربانِ مولوی صاحب
وہ نفرت اغنیا سے ہے کہ اپنی رہ گذر میں بھی	نہیں دیواریں ان کی سائبانِ مولوی صاحب
مگر الباس میں اطعام میں ایصال راحت میں	رہے مخدوم گویا خادمانِ مولوی صاحب
توکل آپ کا دیکھو نہ تھا زاد سفر کچھ بھی	بہت مسکین دیکھے ہم رہانِ مولوی صاحب
سبھی حجاج ہو کر آگئے آرام وراحت سے	توکل کے طفیلی دوستانِ مولوی صاحب
عطائے حق فراخی دل کی ہے ایماں سے کیا کچھ	کہ للتقویٰ ہے دل ذو امتحانِ مولوی صاحب
عطائے حق صفاتِ نیک ان کی ایسی لازم ہیں	کہ اکثر مدح خواں ہیں حاسدانِ مولوی صاحب
کتب خانہ نہیں کچھ پاس؛ مگر یہ علم کے مخزن	دیے اللہ نے دل اور زبان مولوی صاحب
اثر لاتی ہے ملفوظات میں قطرات کوثر کا	وہ حوتِ کوثرِ عرفاں لسانِ مولوی صاحب
بہ شکلِ ظہر ہے عصرِ مبارک ان کا نورانی	بچشمِ دل کوئی دیکھے زبانِ مولوی صاحب
جو اپنا وصف گم نامی بہت مرغوب ہے ان کو	یہی ہے حشر تک نام ونشانِ مولوی صاحب
کہاں اب قدر داں ان کے جہانِ بے بصیرت میں	کہ کن احسانوں سے ہے حسن جان مولوی صاحب
خدا اور مصطفیٰ کے قدر داں ہیں بندۂ مولیٰ	خدا اور مصطفیٰ ہیں قدر دانِ مولوی صاحب
ہمیشہ نور ایمانی تھا افزوں ان کی مجلس میں	یہ دیکھی ہم نے تاثیرِ بیانِ مولوی صاحب
نہیں کوئی مخاطب بھی صحیح ان کا مگر بے شک	رشید احمد ہیں ہاں ہم داستانِ مولوی صاحب
فقیر اب کاش کہ ہوجائے 'مخلص' ترجمہ تیرا	ہوا اخلاص سے تو ترجمانِ مولوی صاحب

فضل وکمال

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا اتباع سنت میں گہرا رنگ اور خاص مزاج ومذاق

حضرت سائیں توکل شاہ انبالویؒ

مرتب:

حضرت مولانا سید نور الحسن راشد کاندھلوی مدظلہٗ

حضرت مولاناؒ کا اتباع سنت میں کیسا اونچا مقام تھا، اور حضرت مولاناؒ ہر ایک قدم پر اتباع سنت اور طریق نبوی کی تحقیق، اس کی حتی الامکان پیروی، اور اس پر قدم بہ قدم عمل کا کسی قدر غیر معمولی اہتمام کرتے تھے؟ مولاناؒ کے اصحاب ومتوسلین کی اطلاعات وروایات کے علاوہ بعض اور ذرائع سے بھی اس کی تحقیق وتصدیق ہو رہی ہے۔ تصدیق بھی ایسے حضرات کی، جو خود راہِ معرفت کے رہ نورد، اور مراتب سنت کے رمز شناس تھے۔

حضرت مولاناؒ کے ایک مشہور معاصر اور نامور درویش ''سائیں توکل شاہ'' صاحب انبالویؒ (وفات: ۴ر ربیع الاوّل ۱۳۱۵ھ/۲ر اگست ۱۸۹۷ء) کو ایک مرتبہ حضرت سرور کائنات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی، دیکھا کہ حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم آگے تشریف لے جا رہے ہیں، سائیں صاحبؒ نیز ایک اور شخص (جن کو شاہ صاحبؒ نے پہچانا نہیں، دونوں) شوق زیارت میں پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ سائیں صاحبؒ تو دوڑے جا رہے ہیں؛ مگر وہ شخص اپنا ایک ایک قدم بہت سوچ سمجھ کر اور سنبھال کر رکھ رہے ہیں۔ سائیں صاحبؒ نے دیکھا، تو خیال آیا کہ شاید یہ شخص بدشوق یا ناواقف ہے، جو اس طرح سوچ سوچ کر آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔

سائیں صاحبؒ نے پہلے تو اس سے پوچھا: تم کون ہو؟

جواب ملا کہ میں ''محمد قاسم (نانوتوی)'' ہوں۔

''شاہ صاحب نے جو حضرت مولاناؒ سے پہلے سے غائبانہ یقیناً واقف تھے) مولانا سے کہا: ''بابا شوق نال بھجیا'' (بھائی! شوق سے دوڑ کر آ)۔

حضرت مولاناؒ نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا، وہی مولانا کی زندگی کا جوہر، دار العلوم دیوبند کا ذوق ومزاج اور دین کی اصل اصول ہے۔ جس نے اس نکتے کو پالیا، اس کو یقیناً دین کا صحیح ذوق حاصل ہوگیا، اور اگر خدانہ خواستہ اس میں کچھ نقص یا کمزوری ہے، تو یہ دیکھنے والے کے دین کا نقص اور کمزوری ہے، اور حق یہ ہے کہ ؎

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بو لہبی است

حضرت مولاناؒ نے سائیں صاحب کے جواب میں فرمایا تھا کہ:

''میں تو نشانِ قدم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر قدم رکھ کر چلتا ہوں، اور جس جگہ قدم خوب محسوس نہیں ہوتا، وہاں تامل کرتا ہوں۔ جب تک خوب یقین نہیں ہوجاتا کہ یہی نشان قدم ہے، اس وقت تک دوسرا قدم نہیں اٹھاتا۔ گو دیر میں پہونچوں؛ مگر قدم بہ قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے چلوں گا''۔

اس خواب کا سائیں توکل شاہؒ نے اپنے ایک مسترشد مولانا مشتاق احمد انبیٹھویؒ (وفات: ۲۷ر محرم ۱۳۶۱ھ/۱۴ر فروری ۱۹۴۲ء) سے خود ذکر کیا تھا۔ مولانا مشتاق احمدؒ نے لکھا ہے:

''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے جارہے ہیں، مولانا محمد قاسمؒ تو جہاں پائے مبارک حضور کا پڑتا ہے، وہاں دیکھ کر پاؤں رکھتے ہیں، اور میں بے اختیار بھاگا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچوں؛ چناں چہ میں آگے ہوگیا''[1]۔

مولانا مشتاق احمدؒ کے خلیفہ مولانا نور بخش توکلیؒ نے بھی یہ خواب سائیں صاحبؒ کے تذکرے میں نقل کیا ہے۔ مولانا نور بخشؒ لکھتے ہیں:

''شیخنا العلامہ مولانا مولوی حاجی حافظ مشتاق احمد صاحب چشتی صابری، ادام اللہ تعالیٰ فیوضہ لکھتے ہیں کہ حضرت مخدومنا توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے برسبیل تذکرہ عاجز سے فرمایا کہ: ایک مرتبہ خواب میں یہ دیکھا کہ حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جارہے ہیں، اور مولانا محمد قاسم دیوبندیؒ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے دوڑے کہ جلد حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچیں۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ تو وہاں اپنا قدم رکھتے تھے، جہاں حضور رسول اکرم

---

(۱) انوار العاشقین، ص: ۸۸۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کا نشان ہوتا تھا؛ مگر میں بے اختیار جا رہا تھا، آخر مولانا سے آگے ہوگیا، اور پہنچ گیا''(۱)۔

مگر مذکورہ دونوں روایتوں میں صرف اس خواب کا ضروری حصہ اور خلاصہ نقل کیا گیا ہے، مفصل خواب اور روایت حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے ایک اور معاصر اور تذکرہ نگار منشی فضل حق دیوبندیؒ نے مولانا کی سوانح میں نقل کی ہے، جس سے اس خواب کے تمام اجزا کا علم ہوجاتا ہے، وہ الفاظ یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

''ایک وسیع شاہ راہ ہے، اس میں بہت سے نقش قدم معلوم ہوتے ہیں، اور چلنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ (توکل شاہ صاحبؒ نے پوچھا کہ): یہ نشان کس کے قدم کے ہیں؟ (جواب میں) آواز آئی کہ حضرت رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سواری اسی راہ سے گئی ہے، اور جملہ صحابہؓ و تابعینؒ و تبع تابعینؒ بھی اسی راہ سے گئے ہیں۔

شاہ جی کو شوق زیارت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از حد ہوا، اور کمال شوق میں بے تحاشا دوڑے کہ جلد تر زیارت سے مشرف ہوں، اسی دوادوش میں کبھی شاہ جی کا قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑا، اور کبھی صحابۂ کرامؓ اور کبھی تابعینؒ، کبھی تبع تابعینؒ پر۔ اسی حالت میں جو یکا یک (شاہ جی صاحبؒ) کی نظر پھری، تو دیکھا کہ ایک اور شخص بھی اسی راستے کو آتا ہے؛ مگر آہستہ آہستہ سے چلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو شوق ہے، اور اس شخص کے پاس آکر پوچھا کہ تم کون ہو؟ (جواب دیا کہ میں) 'محمد قاسم ہوں'! شاہ جی کہا: 'بابا شوق نال بھجیا۔' (بابا شوق کے ساتھ دوڑ)۔ (مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا): میں تو نشان قدم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر قدم رکھ کر چلتا ہوں، اور جس جگہ قدم خوب محسوس نہیں ہوتا، وہاں تامل کرتا ہوں، جب تک خوب یقین نہیں ہوجاتا کہ یہی نشان قدم ہے، اس وقت تک دوسرا قدم نہیں اٹھاتا۔ گو دیر میں پہنچوں؛ مگر قدم بہ قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے چلوں گا''(۲)۔

---

(۱) تذکرۂ مشائخ نقش بندیہ: ص۴۰۶)

(۲) انوار قاسمی، ج:۱، ص:۱۷۵۔

مضمون ماخوذ از:　(مجلّہ صحیفۂ نور، کاندھلہ، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء، ص:۴۲-۲۴۰)

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، عارف باللہ ولیِ کامل

حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی قدس سرہٗ

ترجمہ:

مولانا عبدالقدوس قاسمی نیرانوی

مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ نے مدرسۂ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند کے ابتدائی حالات پر عربی میں ایک مختصر، مگر جامع رسالہ مرتب فرمایا تھا، جو "اَلْهَدِيَّةُ السَّنِيَّةُ فِي ذِكْرِ الْمَدْرَسَةِ الْإِسْلَامِيَّةِ الدِّيُوْبَنْدِيَّةِ" کے نام سے ۱۳۰۷ھ/ (۱۸۸۹ء) میں مطبع مجتبائی دہلی سے چھپا تھا۔ اس رسالہ میں مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا پرزور، پرجوش اور ایسا محبت آمیز تذکرہ کیا ہے، جس طرح کوئی عقیدت مند، یا چھوٹا اپنے بڑوں کا کرتا ہے۔ اسی میں مولانا محمد قاسمؒ کی وفات کا تذکرہ اور عربی فارسی کے مرثیے بھی شامل ہیں۔ یہاں حضرت مولاناؒ سے متعلق عربی منظومات اور مرثیے کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

> "الہدیۃ السنیۃ" مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ کے عربی ادب میں مہارت وکمال کی ایک یادگار ہے، اور اس کا ترجمہ بہت آسان نہیں ہے۔ راقم سطور نے اس خدمت کے لیے اپنے فاضل دوست مولانا عبدالقدوس صاحب قاسمی نیرانوی سے گزارش کی، مولانا ناچیز کا خط ملتے ہی از راہِ کرم خود آئے، اور یہیں بیٹھ کر گویا ایک ہی نشست میں قلم برداشتہ اردو ترجمہ کر دیا۔ مولانا کے دلی شکریہ کے ساتھ یہ ترجمہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جارہا ہے۔ (نور)

اردو ترجمہ:

"اَلْهَدِيَّةُ السَّنِيَّةُ فِي ذِكْرِ الْمَدْرَسَةِ الْإِسْلَامِيَّةِ الدِّيُوْبَنْدِيَّةِ".

حمد وثنا اور درود وسلام کے بعد عرض ہے کہ جب اللہ تعالیٰ شانہ وعز سلطانہ نے اس ملک میں خیر برپا کرنے اور اذعان ویقین اور تحقیق وتصدیق کے ساتھ دینی علوم اور ضروری فنون کے احیا کے ذریعے بندوں

✽ والد ماجد حضرت شیخ الہندؒ۔

کی راہ نمائی کا ارادہ فرمایا، تو ایک ایسے شخص کے دل میں مدرسے کی تاسیس کا خیال ڈالا، جو ذات سے سید، حسب ونسب میں اعلیٰ، شرافت ونجابت میں یکتا، قدسی صفات اور خدا داد عظمت کے مالک، خوش تدبیر، چھوٹوں کے لیے شفیق، بڑوں کی توقیر کرنے والے، اپنی مثال آپ۔ حسن وجمال، شوکت وجلال، صورت وسیرت، صفائی باطن، پاک طینتی، روشن فکری اور ذکاوت طبع میں بے مثال۔ بلند کردار، خوش منظر، صلاح ومشورے کی بھرپور قابلیت رکھنے والے۔ اگر کسی کو ہماری بات پر یقین نہ آئے، تو واقعہ یہ ہے کہ تجربات نے اس کی تصدیق کر دی ہے۔ موصوف شرم وحیا، تقویٰ وعبادت، جود وسخا کے پیکر اور فخر روزگار ہیں۔ (جن کا نام نامی) عالی جناب ''محمد عابدؒ'' ہے۔ اللہ انہیں قائم ودائم رکھے، ان کی بلند آرزوؤں کی تکمیل کرے، جب تک دنیا قائم رہے، اور پڑھنے لکھنے کا چلن رہے۔

اس مدرسے (مدرسۂ دیوبند) کی بنیاد تقوے اور بہترین طرز پر رکھی گئی ہے۔ اگر چہ نہ حالات موافق ہیں، اور نہ وقت ساز گار ہے۔ یہ سب خدائے عزیز وعلیم اور حکیم وعلیم کا مقرر کردہ نظام ہے۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، تو اس کے اسباب اور افراد کار مہیا کر دیتا ہے۔ جب وہ کوئی چیز چاہتا ہے، تو اس کے لیے اتنا کہنا کافی ہوتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں ہر چیز کی باگ ڈور ہے، جس کے حضور تم سب کو جانا ہے۔

چناں چہ سید صاحب نے اس فکر کی تائید اور اس کار ثواب میں تعاون کے لیے ۱۲۸۲ھ/ (۱۸۶۵ء) میں اہل خیر حضرات سے گزارش کی، انہوں نے آپ کی صدا پر کان دھرتے ہوئے لبیک کہا، اور آپ کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے آپ کے پیچھے ہو لیے۔ جس کے نتیجے میں مدرسہ آپ کی قابل قدر کوششوں سے علم اور اہل علم کا گہوارہ، فضل وکمال اور اس کے قدر دانوں کا مرکز، دین اور اس کے حاملین کی پناہ گاہ بن گیا، اور س میں تعجب کی کیا بات؟ بیٹا باپ کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور یہ اللہ کا فضل ہے، جس کو چاہتا ہے، اس سے نواز دیتا ہے۔ خدا کی ذات عظیم فضل والی ہے۔

بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے اس طے شدہ کام کی تکمیل واستحکام اور اسلامی علوم کے احیا کے لیے گرامیٔ مرتبت عالم دین کو مامور فرمایا، جو خوش شکل، پاک باز، ہر دل عزیز، نظیف الطبع، روشن دماغ، خوش خلق، اسلاف کی یادگار، اخلاف کی بصیرت آموزی کا سر چشمہ ہیں۔ اسی طرح فضل وکمال، وفور علم، طبیعت کی پاکیزگی، قلم کی شگفتگی، ضبط وتحمل کے ساتھ وقار وتمکنت اور کشادہ ذہنی میں پورے عالم میں ان کی نظیر نہیں۔ جی ہاں! مولانا موصوف لیاقت ومہارت، نرم خوئی، قول وقرار کی پابندی، گفتار وکردار کی ہم آہنگی، شرافت،

ذہانت، غیرت اور سخاوت وفیاضی میں بھی ممتاز ہیں۔ اللہ تعالٰی نے ان کو ایسے وقت کے لیے چنا، منتخب فرمایا، جو اسلام کی بے چارگی اور اسلامی قیادت کے فقدان کا وقت ہے۔

میری مراد عارف باللہ، ولیٔ کامل، ابوالہاشم مولانا ''محمد قاسم'' سے ہے۔ اللہ تعالٰی ان کی دست گیری فرمائے، اور ان کے مقام ومرتبے میں چار چاند لگائے۔ (ان کے اوصاف وکمالات اور عادات واطوار کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خمیر) عالی ظرفی، شرافت، سخاوت، غیرت، سیادت، خوش بختی، عظمت ووقار، جود وعطا، قیادت، طہارت ونزاہت، خدمتِ خلق، رواداری، علم وحکمت، جذبِ تعاون، عفت مآبی، پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی، مصائب وآلام سے نمٹنے کی صلاحیت، تشکر وامتنان اور احسان وکرم؛ ایسے اوصاف کے مجموعے سے اٹھا ہے، اور اس سے ان کا وجود اور سراپا تشکیل پایا ہے، وہ بلندیوں کے حصول کے لیے بلا توقف اور ہمہ دم راتوں کو سرگرم سفر رہے۔ انھوں نے فضائل ومکارم سے آراستہ ہونے کے لیے دنوں کا سفر پیہم جاری رکھا۔ انھوں نے سید عابد صاحبؒ کی پشت پناہی اور دست گیری کی، اور ان کے دوش بہ دوش کھڑے ہو گئے۔ پھر کیا تھا چمنستانِ علم لہلہا اٹھا۔ اس کے حوض بھر گئے۔ درخت اور جھاڑیاں گھنی اور شاداب ہوگئیں۔ طالبانِ علم طویل مسافت طے کر کے اس ریاضِ علم میں جوق در جوق آنے لگے۔ تشنگانِ علوم دور دراز مقامات سے اس کا رخ کرنے لگے۔ ہندوستان کے مختلف خطوں، جزیروں؛ بلکہ عرب جیسے ممالک سے بھی کتنے ہی طلبا ایسے ہیں، جنھوں نے علوم کی بلندیوں کو چھولیا، اور تکمیل کے بعد اس کی نشر واشاعت میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے اپنے فیضانِ علمی سے (خلقِ خدا کو) خوب خوب سیراب کیا۔ کتنے ہی مدارس اس مدرسے کے طرز پر قائم کیے گئے، اور اسی کے نہج پر ان کے نظام کی تشکیل پائی۔ یہ سب کچھ مولانا قاسم (جو بھلائیوں کو پھیلانے والے اور ظلم وجور کو مٹانے والے ہیں) کی ذات بابرکات سے وجود پذیر رہا۔ ''اور جس نے اسلام میں کسی اچھے طریقے کی بنیاد ڈالی، تو اس کو اس کا اور اس پر عمل کرنے والوں کا ثواب ملے گا''۔ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:

''اور باقی رہنے والی نیکیوں کا تیرے رب کے یہاں بہترین بدلہ ہے اور بہتر توقع''۔

میں نے مولانا کے فضل وکمال کی تعریف کرتے ہوئے (درج ذیل) اشعار کہے ہیں، اگرچہ میں کیا اور میری بساط کیا؟

اشعار کا ترجمہ:

۱- آخر کب تک دنیاداری میں پھنس کر دین سے غافل رہے گا؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ قارون جب مال

دار مصیبت سے دو چار ہوا؟

۲- جو چیز تجھے عاریتاً میسر ہے، اس پر نہ اترا، تو خود لاچار اور لاچار کی اولاد ہے۔

۳- تو اپنی حماقت سے آگ کی طرح کیوں سر اٹھاتا ہے؟ تیری اصل تو پانی اور مٹی ہے۔

۴- ذرا صبر سے کام لے اور اس کدوکاوش کو جس کو تو کر رہا ہے، اس یقین کے ساتھ چھوڑ دے کہ جو رزق مقدر میں ہے، وہ مل کر رہے گا۔

۵- اگر فتنوں سے پاک زندگی کا تو خواہش مند ہے، تو خانہ نشینی اور عزلت گزینی اختیار کر۔

۶- اور محنت کے ساتھ علم کا طالب بن، اور اہل علم کے دامن سے وابستہ ہو جا، اللہ تعالیٰ تجھے شیاطین کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

۷- علم ایک بیش قیمت جوہر ہے، جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے، اس کو حاصل کر، بھلے یہ جنس گراں مایہ چین میں دست یاب ہو۔

۸- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان صبح کے وقت میں فقیر ومحتاج ہوتا ہے، اور شام کو بادشاہوں کا بادشاہ ہو جاتا ہے۔

۹- علم دو طرح کا ہے: ایک وہ جو ''خالص ہدایت ورحمت'' ہے، دوسرے وہ ''جس کی شریعت میں گنجائش نہیں''۔

۱۰- اس لیے محدث (مولانا قاسم) کی صحبت اختیار کر، خود فریبی اور غفلت میں مبتلا شیخ رئیس کو چھوڑ دے۔

۱۱- نہ اس کی ''شفا'' میں شفا ہے، اور نہ اس کے ''اشارات'' اور ''قانون'' میں کوئی فائدہ۔

۱۲- اس مہتم بالشان علم سے اشتغال رکھ، جس میں کوئی کجی نہیں، جس میں معنعن اور مسند حدیثیں ہیں، اور جس کا وحی الٰہی (قرآن کریم) سے گہرا رشتہ ہے۔

۱۳- علم وہی قابل اعتنا ہے، جس میں قال الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صدا بلند ہو۔ اس کے علاوہ تو شیطانی وساوس ہیں۔

۱۴- اگر اس سلسلے میں جاہل لوگ زبان درازی کریں، تو ان سے کہہ دے: چھوڑو! تمہاری سوچ تمہارے ساتھ اور ہماری سوچ ہمارے ساتھ۔

۱۵- اگر تو چاہتا ہے کہ حق واضح ہو جائے، تو رفیق من! حق وشریعت کے امام سے رجوع کر۔

۱۶- جو مرجع خلائق، خوبیوں اور بھلائیوں کے جامع، ان کے پھیلانے والے ہیں۔ جن کے انفاس

کے سامنے چمن کی عطر بیزی بھی ہیچ ہے۔

۱۷-وہ شریعت کے محافظ، طریقت کے امام، حقیقت کے نقیب اور عزت وتمکنت کے مالک ہیں۔

۱۸-مخلوق خدا کے راہ نما، ظن وتخمین سے نہیں؛ بلکہ پورے وثوق کے ساتھ حقائق ودقائق کی نقاب کشائی کرنے والے ہیں۔

۱۹-کوئی ایسا علم نہیں، جس کا چشمہ شیریں ان کے پاس نہ ہو، اور اس کے اسرار کی انہوں نے پردہ کشائی نہ کی ہو۔

۲۰-دوست زادے! تم نے اپنے احسان وکرم سے ہمیں اپنا اسیر بنالیا ہے، اور فی زمانہ تم بے کسوں کے والی ہو گئے ہو۔

۲۱-میری طرف برائے مہربانی نگاہ کرم کرو۔ جناب من! تمہاری ایک نظر میرے لیے کافی ہے۔

۲۲-تم ہمیشہ سلامت رہو، اپنا فیض عام جاری رکھو، بخشش کرو اور پیہم کرو، جب تک بارش باغات کو سیراب کرے۔

جب ہندوؤں کے عالم اور ان کی بڑی شخصیت ''دیانند سرسوتی'' نے اپنے بے بنیاد اور لچر دلائل کے ذریعے اپنے اعتقادات کی حقانیت کا دعویٰ کیا، اور اپنی مضحکہ خیز اور بے حقیقت باتوں کو بنیاد بنا کر دین اسلام پر اعتراضات کرتے ہوئے یہ کہہ کر للکارا:

''آ جاؤ میدان میں! ہے کوئی مائی کالال جو مقابلہ کرے؟''

غرض حلق پھاڑ پھاڑ کر اس نے دعوت مبارزت دی، اور ہمہ حاضر اور غیر حاضر شخص سے نہ صرف مناظرہ کرنے کی بات کرتا؛ بلکہ لڑنے جھگڑنے کو تیار ہو جاتا، تو اس وقت اس نالائق کے اعتراضات کے حملے سے دین متین کی حفاظت کے لیے مولانا اٹھ کھڑے ہوئے، اور اس پر بچ نکلنے کی راہیں بند کر دیں۔ چناں چہ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی، اور پھر گوز مارتا ہوا بھگا۔ میں نے اس سلسلے میں درج ذیل اشعار کہے:

۱-دیانند حلق پھاڑ کر، ڈینگ مارتے ہوئے، خود بینی، فخر وغرور اور اتراہٹ کے ساتھ آیا، اپنی کذب بیانی پر نازاں اور بے اصل باتوں کو لے کر آپے سے باہر، جو اس نے کہا، وہ جھوٹ تھا۔

۲-اس نے ہر باشعور اور صاحب عظمت وشوکت انسان کو دعوت مبارزت دی۔ چناں چہ اسی کے تعاقب میں عظیم ترین اور یکتائے روزگار شخصیت اٹھی، جن کی ذات میں جادو تھا۔

۳- وہ شخصیت اچھائیوں کے پھیلانے والی، اور ظلم و جور کو مٹانے والی ہے، جس نے دین اسلام کو حسن و جمال سے آراستہ کیا۔

۴- ممدوح شیریں مشرب اور محقق ہیں، کسی طرح کی قیل وقال میں نہیں پڑتے۔

۵- وہ اپنے قول وعمل سے رشد وہدایت کا مرجع ہیں، اور حال و مستقبل میں رہبری کا سرچشمہ۔

۶- پھر جب اس احمق کی حیلہ گری نے اس کو عاجز کر دیا، اور اس نے باور کرلیا کہ اب مناظرے میں اس کی آفت آ گئی۔

۷- تو شرائط مناظرہ بیان کرتے ہوئے اس نے چال چلتے ہوئے کہا: ایسے ایسے میں میں تیار ہوں؛ ورنہ ہر گز نہیں۔

۸- اس کا برا ہو، وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا کہ پیچھے کو نہ پلٹا، اور اللہ تعالیٰ اس سے نبرد آزمائی کے لیے مسلمانوں کی طرف سے کافی ہے۔

۹- مخلوق خدا کے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پہ درود وسلام ہو، جب تک ہوائیں بھاری بادلوں کو اڑائے پھریں[1]۔

(۱) مجلّہ صحیفۂ نور- کاندھلہ، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء ص: ۵۱-۲۴۶۔

سبق آموز تاریخی حقائق

حضرت نانوتویؒ کے زہد وقناعت، فضل وکمال اور خدا ترسی کے بعض گوشے

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ ✿

عنوانات:

تنویر احمد شریفی

برادر محترم مولانا سید محمد از ہر شاہ صاحب قیصر، زادمجدہ کی ذرّہ نوازی کی یہ دولت ''سوانح قاسمی'' جلد اول کے مطالعے کا موقع نصیب ہوا۔ چھ سو تیرہ صفحات کی ایک ایک سطر کارآمد معلومات سے لب ریز نظر آئی؛ مگر ان میں جن واقعات نے خصوصی طور پر میرے قلب ودماغ کو متاثر کیا، اس پر کہیں کہیں نشان لگاتا گیا۔ آج کی فرصت میں ان ہی میں سے چند واقعات حاضر خدمت ہیں۔ خدا کرے دوسرے حضرات بھی ان سے سبق حاصل کریں۔ (ظفیر صدیقی)

علم سے زیادہ عمل پر نظر:

حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ جیسے ذمے دار بزرگ کا حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بیان ہے:

> ''میں نے انسانیت سے بالا درجہ ان (حضرت نانوتویؒ) کا دیکھا۔ وہ شخص ایک مقرب فرشتہ تھا، جو انسانوں میں ظاہر کیا گیا تھا''(۱)۔

یہ ایک عالم کا عالم کے متعلق بیان ہے کہ آپ صرف عالم ہی نہ تھے؛ بلکہ فنافی اللہ تھے۔ آہ! اب یہ بات ہمارے اس دور میں کہاں باقی رہی۔ اب تو صرف علم ہی کو سب سے بڑا سرمایہ سمجھا جاتا ہے؛ مگر

✿ مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند۔

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱،ص:۱۳۰۔

ہمارے اسلاف کی نظر علم سے زیادہ عمل پر تھی۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ علم کے ساتھ عمل نے ایک عالم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا، اور لوگوں کے دلوں میں ان کے احترام واکرام کا کتنا جذبہ پیدا کر دیا تھا؟

جو اللہ کا ہو گیا کائنات اس پر نچھاور ہے:

خود ان ہی مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے:

''میں پچیس برس حضرت مولانا نانوتویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، اور کبھی بلا وضو نہیں گیا''(۱)۔

اللہ اللہ! تعلق مع اللہ بھی کتنی بڑی دولت ہے، دنیا کے کسی بڑے سے بڑے حکمراں کا کبھی کسی نے یہ احترام کیا ہوگا؟ سچ ہے جو اللہ تعالیٰ کا ہو گیا، ساری کائنات اس پر نچھاور ہونا اپنے لیے فخر سمجھنے لگی۔

عشقِ نبوی کا سچا جذبہ:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ حج کے لیے تشریف لے گئے، حج سے فارغ ہو کر مدینۂ منورہ روانہ ہوئے، جب اس مقام پر پہنچے، جہاں سے قبۂ خضرا نظر آنے لگا، تو آپ کا حال یہ ہوا جیسا کہ آپ کے ساتھی کا آنکھوں دیکھا بیان ہے:

''جناب مولانا مرحوم نے اپنی نعلین اتار کر بغل میں دبالیں، اور پابرہنہ چلنا شروع کیا۔ میں نے ان کی دیکھا دیکھی اپنی جوتیاں اتار ننگے پیر ہم راہ مولانا مرحوم چلنا شروع کیا؛ مگر اس قدر پتھریاں پاؤں میں چبھنے لگیں کہ متحمل نہ ہو سکا، آخر جوتا پہن کر چلنے لگا؛ مگر مولانا مرحوم مدینۂ منورہ تک کئی میل آخر شب تاریک میں اسی طرح برہنہ پا پہنچ گئے''(۲)۔

دیکھیے اسے کہتے ہیں عشقِ نبی کا سچا جذبہ۔ یہاں عاشق جاں نثار کی شوق سرمستی قابل دید ہے۔ نو جوان ساتھی نوکیلے پتھروں پر تاب نہیں لاتا؛ لیکن یہ بوڑھا عالم جسم وجاں سے بے خبر انہیں پھولوں کی سیج سمجھ رہا ہے، اور کس شان سے جا رہا ہے کہ ''نوکیلے خاردار پتھر کے ٹکڑوں'' کو ذرہ برابر خاطر میں نہیں لاتا، اسی کا نام ہے صحابۂ کرامؓ کی سی زندگی۔

ہمارے علمائے کرام کے لیے اس واقعہ میں بڑا سبق ہے۔ کاش یہ سمجھیں کہ عالم کسے کہتے ہیں؟ لوگ چمکنا چاہتے ہیں، اور حضرت نانوتویؒ؟ معتبر راویوں کا بیان ہے کہ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

---

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱ ص:۱۳۰۔ (۲) ایضاً، ج:۱ ص:۱۵۶۔

''لوگ جان نہ گئے ہوتے، تو ایسا گم ہوتا کہ کوئی بھی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا''؟(۱)۔

کبھی فرماتے:

''اگر مولویت کی یہ قید نہ ہوتی، تو قاسم کی خاک تک کا بھی پتہ نہ چلتا۔ جانوروں کا بھی گھونسلا ہوتا ہے، مرے لیے تو یہ بھی نہ ہوتا، اور کوئی مری ہوا تک نہ پاتا''(۲)۔

اللہ اللہ! یہ جذبۂ خلوص وللّٰہیت! لوگ چمکنا چاہتے ہیں اور آپ گم ہونے کی سعی فرماتے ہیں۔ ہمارے اس دور کے علمائے کرام سوچیں کہ ہم خود کس انقلاب کی نذر ہو گئے؟ جو مٹنے اور گم ہونے کا سبق دینے کے لیے آیا تھا، آج اسی کے ماننے والے اپنے کو نمایاں کرنے کے درپے ہیں۔ یہ بھول رہے ہیں کہ نمایاں وہی کیا جاتا ہے، جو اپنے کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے:۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل وگل زار ہوتا ہے

نوجوان علما کے لیے درسِ عبرت:

نوجوان علما کے لیے یہ واقعہ سراپا درس عبرت وبصیرت ہے، جو لوگ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بڑی بڑی تنخواہوں پر بلاتے، ان کو جواب دیا جاتا:

''مجھے صاحبِ کمال سمجھ کر بلاتے ہیں، اور میں اپنے اندر کوئی کمال نہیں پاتا''(۳)۔

ہمارے زمانے میں لوگ اپنے کو ''خاک سار'' تو لکھتے ہیں؛ مگر نہیں جانتے کہ ''خاک ساری'' کسے کہتے ہیں۔ آیئے دیکھیے! یہ ہے ایک بڑے عالم کی سچی خاک ساری۔ ہم اپنا کمال کسی نہ کسی راستے سے ظاہر کرنا چاہتے ہیں، اور رات دن کرتے رہتے ہیں؛ مگر جو ہر فن مولانا ہے، اس کی زندگی کا یہ نقشہ ہے کہ بڑی بڑی تنخواہ آپ پر پیش ہوتی؛ مگر یہ کہہ کر انکار کر دیا جاتا ہے کہ یہاں رکھا ہی کیا ہے:۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

طالب علم کا صحیح مقام کیا ہے؟

جس زمانے میں حضرت نانوتویؒ حدیث پڑھتے تھے، اس زمانے کے متعلق حضرت تھانویؒ جیسے بزرگ کا بیان ہے:

---

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۲۴۵۔ (۲) ایضا، ج:۱، ص:۲۴۶۔ (۳) ایضاً، ج:۱، ص:۲۴۶۔

''مولانا محمد قاسم صاحبؒ فرماتے تھے: حدیث پڑھنے کے وقت میں یہی سوچا کرتا تھا کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں فرمائی؟''۔

اس سے اندازہ کیجیے کہ ایک طالب العلم کا صحیح مقام کیا ہے، اور اس کے غور وفکر کی لائن کس قدر درست ہے؟ اگر یہی طالب العلم آگے چل کر ''قاسم العلوم والخیرات'' بنا، تو حق یہ ہے کہ یہی ہونا چاہیے تھا، اور اس کا قائم کردہ ادارہ اگر دنیائے اسلام میں سب سے بڑھ کر ''مرکز حدیث'' کی حیثیت رکھتا ہے، تو کوئی تعجب وحیرت کی بات نہیں۔

یہ بصیرت افروز واقعہ ہمارے عزیز طلبہ کے لیے ''درسِ عبرت'' ہے۔ کاش یہ سوچیں اور غور کریں۔

قاسم ایسا سستا؟

لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ غدر کے بعد دہلی تشریف لائے، تو مفتی صدر الدینؒ کی خدمت میں ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ مفتی صاحبؒ حضرت گنگوہیؒ سے بڑی محبت وشفقت سے ملے، اور حالات کے ساتھ آپ نے یہ بھی دریافت فرمایا: ''میاں قاسم کیا کرتے ہیں؟'' حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا: ''مطبع میں تصحیح کرتے ہیں، آٹھ دس روپے تنخواہ پاتے ہیں''۔

یہ معلوم ہوکر مفتی صاحبؒ سناٹے میں آ گئے، اور حیرت وافسوس کے لب و لہجے میں ہاتھ پر ہاتھ مار کر فرمانے لگے: ''قاسم ایسا سستا، قاسم ایسا سستا۔ فقیر ہو گئے، فقیر ہو گئے''(۲)۔

ہزاروں پر لات مار کر آٹھ دس روپے کی ملازمت، اللہ شاہد ہے اگر مولانا نانوتویؒ چاہتے تو اپنے زمانے میں خدا کی دی ہوئی استعداد کی بہ دولت سیکڑوں روپے کی ملازمت کر سکتے تھے، مگر جو اپنے کو گم کر دینے کی فکر میں ہو اور حلال وغیر مشتبہ روزی کھانا چاہتا ہو وہ بڑی تنخواہ کی ملازمت کیسے قبول کرتا؟

بڑا عالم:

یہی مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کے علم وفضل کی گواہی دیتے ہوئے اس وقت کے ایک خدا رسیدہ بزرگ حافظ عبد القادر شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

''جا تو بڑا عالم ہے''(۳)۔

اور پنجاب کے ایک نامی گرامی صاحب کشف وکرامات بزرگ راؤ عبد الرحمٰن خانؒ نے حضرت نانوتویؒ کی دعا کے جواب میں فرمایا تھا:

---

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۲۴۶۔ (۲) ایضاً، ج:۱، ص:۲۵۲۔ (۳) ایضاً، ج:۱، ص:۲۵۶۔

''بھائی! تمہارے لیے کیا دعا کروں؟ میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں دونوں جہاں کے بادشاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بخاری شریف پڑھتے ہوئے دیکھا ہے''[۱]۔

غور کیجیے! کیا اس کے بعد بھی آپ کے علم وعمل میں کسی کو شبہ ہوسکتا ہے؟ مفتی صدر الدینؒ نے درد وسوز میں ڈوبی ہوئی آواز میں کتنا سچ فرمایا: ''قاسم ایسا ستا۔ قاسم ایسا ستا''۔

نبیوں والا کام:

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے رو کر اپنی ایک خاص حالت کا شکوہ فرمایا، تو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو خطاب کر کے فرمایا:

''تم سے حق تعالیٰ کو وہ کام لینا ہے، جو نبیوں سے لیا۔ جا کر دین کی خدمت کرو، ذکر وشغل کا اہتمام چھوڑ دو''[۲]۔

کل جو عظیم الشان خدمت حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ ہند وپاکستان اور دوسرے ملکوں میں ہوئی اس کا کوئی باخبر انکار کر سکتا ہے؟ دار العلوم دیوبند نامی دینی یونی ورسٹی کا پوری دنیا میں جو مقام ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

خدا ہی جانتا ہے اس ادارے سے کتنے مفسر، محدث، فقیہ اور مبلغ اسلام پیدا ہوئے، اور دنیا کے کن کن گوشوں میں پھیل کر دین کی خدمت کر رہے ہیں، اور جس نے کہا بلا مبالغہ بالکل درست کہا:

شاد باش وشاد زی، اے سر زمین دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

مدارس کے دشمن سرگرم ہیں:

لکھا ہے کہ رام پور منہیاران ضلع سہارن پور کے باشندوں نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے مشن میں ناکامیاب کرنے کے لیے یہ شرم ناک کارروائی کی:

''حکومت میں درخواست پیش کی، مولانا محمد قاسم صاحب نے دیوبند میں ایک مدرسہ گورنمنٹ کے مقابلہ میں کھولا ہے، (یعنی آپ کا مقصد یہ ہے کہ انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے)''[۳]۔

اپنوں اور غیروں دونوں نے چاہا کہ جو کام آپ کرنا چاہتے ہیں، نہ ہونے پائے؛ مگر آپ کے خلوص

---

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۲۵۷۔ (۲) ایضاً، ج:۱، ص:۲۵۹۔ (۳) ایضاً، ج:۱، ص:۲۷۲۔

وللّٰہیت کی یہ دولت نتیجہ کیا دیکھنے میں آیا؟ دنیا جانتی ہے، اور آزاد بھارت کا مورخ انصاف کے تقاضے پر لکھنے پر مجبور ہوگا کہ ہند و پاک کی آزادی بڑی حد تک ان ہی نفوس قدسیہ کی جدوجہد اور دعائے صبح گاہی کا نتیجہ ہے، جن کو حضرت قاسم نانوتویؒ کی غلامی کا شرف حاصل ہے؛ مگر آہ! پچھلے دنوں آزاد بھارت میں ''گھر تلاشی'' کا جو ذلت آمیز سلوک اس ادارے کے ساتھ کیا گیا، اسے دیکھ کر کہنا پڑتا ہے: ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی[1]

ایمان کامل اور تعلق مع الرسول:

آخری حج کے لیے حضرت نانوتویؒ تشریف لے گئے، تو واپسی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ:

''کشتی جب ساحل سمندر سے جہاز تک پہنچنے کے لیے کھلی، تو اس قدر تیز و تند ہوا چلنے لگی کہ کشتیاں اِدھر اُدھر قریب غرق ہونے کے جھک جاتی تھیں۔ کشتی پر جو لوگ سوار تھے، ہر ایک کا چہرہ زرد ہوجاتا تھا۔ اس طوفانِ بے تمیزی سے سب لوگ گھبراتے تھے''۔

مگر جانتے ہیں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا کیا حال رہا؟ ان کے ساتھ رہنے والے اپنی چشم دید گواہی دیتے ہیں:

''مگر مولانا اپنے حال پر رہے۔ ہم نے کبھی مولانا کو گھبراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مولوی صاحب اپنے معمولی کام بہ دستور انجام فرماتے رہے''[2]۔

اسے کہتے ہیں ''لَنْ یُّصِیْبَنَا اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا'' پر ایمان کامل۔ اب یہ باتیں ہمارے نوجوان علما میں کہاں باقی رہیں؟ جی چاہے تو علامہ اقبالؒ کا یہ شعر ذرا سے تصرف کے ساتھ پڑھ لیجیے:

کبھی اے نوجواں عالم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے ایک ٹوٹا ہوا تارا

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے ساتھ حضرت نانوتویؒ کو جو قلبی تعلق تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے، جو مولانا منصور علی خاں مرحوم نے لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اسم گرامی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا سن کر لرزہ بدن پر پڑ جاتا تھا، اور چہرے کا رنگ متغیر ہوجاتا تھا، اور ایک عجیب حالت نمایاں ہوتی تھی، جو معرض وجود میں نہیں آسکتی''[3]۔

---

(۱) سرکارِ ہند نے دار العلوم دیوبند کی تلاشی لی تھی، اس کی طرف اشارہ ہے۔ (شریفی)
(۲) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۲۸۲۔ (۳) ایضاً، ج:۱، ص:۲۸۲۔

نام سن کر جس پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہو، فرمایا جائے اس کے باطن اور تعلق مع الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہوگا؟

کہاں ہیں وہ لوگ، جن کو سمجھانے والے سمجھاتے ہیں کہ دیوبندی علما کے دلوں میں سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت ایسی نہیں، جیسی بریلوی رضا خانی مولویوں کے دل میں ہے؟ یہ دیوبندی علما کے جدامجد کا حال ہے۔ کیا ممکن ہے کہ آپ کی روحانی اولاد کو وراثت میں کچھ حصہ نہ ملا ہو؟

باطن کی اصلاح کی محنت ضروری ہے:

حضرت نانوتویؒ کے متعلق لکھا ہے کہ طریقت میں آپ کی قابلیت بہت قابل رشک تھی:

> ''شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہی آن واحد میں وہ مقامات سلوک طے ہوگئے، جو اکثر سالکوں کو سالہا سال کی محنت شاقہ میں بھی وصول نہیں ہوئے''۔

مگر بہ ایں ہمہ آپ نے باطن کی اصلاح کے لیے کس قدر جدوجہد فرمائی؟ اس واقعہ سے قیاس کیجیے۔ لکھتے ہیں:

> ''مگر بہ ایں ہمہ شان عبودیت آپ پر ایسی غالب تھی کہ آپ مدت تک شغل بارہ تسبیح، حبس دم، ذکر اڑہ وغیرہ میں مشغول رہے۔ چھ چھ سات سات گھنٹے برابر ذکر اڑہ اور حبس دم کرتے تھے۔ جس وقت آپ اس شغل کو کرتے، صرف ایک تہبند بدن پر رکھتے، وہ تہبند عرق بدن (پسینے) میں ایسا تر ہو جاتا تھا کہ بعد الفراغ اس کو بدن سے علاحدہ کر کے اور نچوڑ کر خشک کرتے تھے''[1]۔

ہمارے مدارسِ اسلامیہ کے اساتذۂ کرام سمجھتے ہیں کہ صرف کتب بینی ہی میں محنت کرنا بڑی کامیابی ہے، اور جو ظاہر کے ساتھ باطن کی صفائی سے غافل ہیں۔ یہ محنت ہے باطن کی اصلاح اور تزکیۂ قلب کے لیے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہمارے اسلاف کسی طرح بھی باطن کے لیے ظاہر سے کم محنت کرتے تھے؟ مگر اب ظاہر کے لیے تو کسی درجے میں محنت کی اور کرائی جاتی ہے؛ مگر دھیان بھی باقی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے دور میں علما تو ہوتے ہیں؛ مگر عمل کی جیسی دولت چاہیے، نصیب نہیں ہوتی۔ اب ہمارے مدارس اسلامیہ میں ''یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ'' کے ساتھ تعلق ہے، ''يُزَكِّيهِمْ'' کو اہل مدارس بھول گئے۔ ضرورت ہے کہ اربابِ اہلِ کمال اس طرف توجہ دیں۔

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۳۰۳۔

نائبِ رسول:

قلب اور باطن کی صفائی پر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو محنت کی تھی، کیا وہ کوئی بے سود محنت تھی؟ ''سوانح قاسمی'' پڑھیے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں اسی محنت نے کیا خوبی پیدا کر دی تھی۔ آپ کے ایک شاگرد رشید کا بیان ہے:

> ''مغرب کی نماز کے بعد حکم دیا گیا کہ چھتہ کی مسجد میں حاضر رہوں، صلوٰۃ الاوابین سے فارغ ہو کر میرا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر میری ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی سے اس طرح رگڑا، جیسے بان بٹے جاتے ہیں''۔

پھر جو کیفیت پیدا ہوئی، اس کے متعلق فرماتے ہیں:

> ''خدا کی قسم! میں نے بالکل عیاناً دیکھا کہ میں عرش کے نیچے ہوں، اور ہر چہار طرف سے نور اور روشنی نے میرا احاطہ کر لیا ہے، گویا میں دربارِ الٰہی میں حاضر ہوں۔ میں لرزاں و ترساں تھا کہ ساری عمر مجھ پر یہ کپکپی اور یہ خوف طاری نہ ہوا تھا۔ میں پسینے پسینے ہو گیا، اور بالکل خودی سے گزر گیا''[1]۔

کیا ہمارے لیے اس میں کوئی درس نہیں؟ نائبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم صحیح معنی میں ہمارے اسی طرح کے اسلاف تھے۔ اپنا ماحول دیکھ کر کہنا پڑتا ہے:

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیار

''رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ'' کی عملی تفسیر:

ایک دفعہ حج سے فارغ ہو کر مکۂ مکرمہ سے واپس ہونے والے تھے کہ یہ وحشت ناک خبر پہنچی کہ پلونا کے میدانِ جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ یہ خبر حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ پر بجلی بن کر گری، سفر ملتوی کر دیا۔ کچھ دنوں بعد واپس ہوئے؛ مگر کس طرح؟ کہ اسی غم میں:

> ''مولانا محمد قاسم صاحب کو علالت لاحق ہوئی، جو بہ ظاہر خفیف محسوس ہونے کی وجہ سے سفر کی مزاحم یا رفقا کو پریشان بنانے والی تو نہ ہوئی؛ مگر آہستہ آہستہ بڑھ کر وہی بیماری مرض الموت بنی''[2]۔

اب یہ احساس ملی و دینی لوگوں میں کہاں باقی رہا؟ اللہ اکبر! مسلمانوں کی تباہی و بربادی جو ہزاروں میل دور ہوئی تھی، اس نے ایک سچے مسلمان کو بیمار کر دیا، اور بالآخر اسی غم میں جان دے دی۔

---

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱ص:۳۶۶۔　　(۲) ایضاً، ج:۱ص:۳۱۶۔

''رُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ'' کی اس سے بڑھ کر سچی عملی تفسیر اور کیا ہوسکتی ہے؟ مسلمان لیڈرانِ قوم اس واقعے کو پڑھیں، اور اگر دل سے کوئی پکار اٹھے، تو ایمان داری سے اس پر عمل کرنے کی سعی کریں۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مرتبہ ایک حجام نے آ کر درخواست کی:

''تھانہ دار نانوتہ نے ایک عورت کے بھگانے کا جرم مجھ پر لگا کر چالان کا حکم دیا، میں بالکل بے خطا ہوں، خدا کے واسطے مجھے بچایئے''۔

کیا یہ روداد غم سن کر صرف نظر سے کام لیا کہ یہ کوئی پیر زادہ نہیں، کوئی رئیس نہیں، کوئی امیر کبیر کا بیٹا نہیں، جیسا کہ ہمارے اس دور میں ہوتا ہے؟ نہیں! بلکہ اس رودادِ غم نے ایک ساکن بحرِ محیط میں تلاطم کی سی کیفیت پیدا کردی۔ راوی کا بیان ہے:

''منشی محمد یٰسین سے عجب شان جلالی سے فرمایا کہ: اس غریب حجام کو تھانہ دار نے بے قصور پکڑا ہے، تم اس تھانے دار سے کہہ دو کہ: یہ حجام ہمارا آدمی ہے، اس کو چھوڑ دو؛ ورنہ تم بھی نہ بچو گے۔ اس حجام کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالو گے، تو تمہارے ہاتھ میں بھی ہتھکڑی پڑے گی''[1]۔

ایک غریب بے قصور کی حمایت کا جذبہ دیکھیے، اللہ اللہ! یہ شان جلالی کس کے لیے ہے؟ ایک بے یار ومددگار انسان کو ظلم سے بچانے کے لیے۔ جو لوگ قوم وملک کی ہم دردی کا نام لے کر اسمبلی اور کونسل کی کرسی حاصل کرتے ہیں، وزارت وسفارت کا اعزاز، اور صرف اعزاز نہیں، ہزاروں، لاکھوں روپے کماتے ہیں، وہ اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر ایمان داری کے ساتھ بتائیں، غریبوں کے لیے یہ سچا جذبہ ان کے دل کے کسی گوشے میں برائے نام سہی، ہے؟ آہ۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

جانتے ہیں اس حجام کا کیا ہوا؟ تھانے دار نے روزنامچہ پر لکھا ہوا نام کاٹ دیا، اور کاٹ کیا دیا، اس کو کاٹنا پڑا۔

عالمانہ شان کی مٹی پلید نہ کیجیے:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں نواب کلب علی خاں (رام پور) کے وزیر عثمان خاں اور ان کے سیکریٹری نے آ کر درخواست کی:

---

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۳۱۶۔

''نواب صاحب حضرت والاؒ کی زیارت کے بےحد آرزومند ہیں''۔

ناظرین سمجھتے ہوں گے مولانا رحمۃ اللہ علیہ فوراً ساتھ ہو لیے؛ مگر ان کی عالمانہ شان اور کمال استغنا ملاحظہ ہو، نواب صاحب مرحوم کے وزیر عثمان اور ان کے سیکریٹری کو برجستہ جواب فرمایا:

''نواب صاحب ہی تو میری ملاقات کے مشتاق ہیں، میں تو ان کی زیارت کا مشتاق نہیں ہوں، اگر ان کو اشتیاق ہے، تو خود مجھ سے ملنے آئیں، ان کے پیروں میں تو مہندی لگی ہوئی نہیں ہے''(۱)۔

یہ آج کا جواب نہیں، جب نواب بے چارے نوابی کھو چکے؛ بلکہ اس زمانے کی بات ہے، جب نوابی کے شباب کا زمانہ تھا، اور نواب صاحبان اپنے کو مالک الملک تصور کیے بیٹھے تھے۔ جو لوگ عالم کو دیکھنا چاہتے ہیں، اس واقعہ کو پڑھیں۔

اس واقعے میں ان لوگوں کے لیے بڑا اہم سبق ہے، جو محض وہمی دنیاوی عزت اور چند پیسوں کے لیے مال داروں کی جی حضوری میں لگے رہتے ہیں، اور اپنی عالمانہ شان اور انسانی خودداری کی مٹی پلید کرتے ہیں(۲)۔

تنک بخشی کو استغنا سے پیغامِ خجالت دے
نہ رہ منت کشِ شبنم، نگوں جام وسبو کردے

مولوی غریب نہیں ہوتا، غریبی اختیار کرتا ہے:

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایک خدا رسیدہ بزرگ اور ولیٔ کامل تھے، جن کی ولایت کی تصدیق حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ جیسے قطب وقت نے کی تھی۔ دنیا و مافیہا سے حضرتؒ کو کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔

حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ نے سچ تحریر فرمایا ہے:

''ملک و مال کے جھگڑے اگر حضرت نانوتویؒ اپنے سر رکھتے، تو یہ سورت ہی کیوں ہوتی؟ کہیں کے ڈپٹی کلکٹر یا صدر الصدور ہوتے''۔

چناں چہ آپ کے بہت سے استاذ بھائی اپنے وقت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے؛ مگر آپ کسی عہدے کو خاطر میں نہ لائے، ہمیشہ اس سے اپنے آپ کو دور ہی رکھنا ضروری سمجھا۔ حیرت ہے کہ آپ نے معاوضے پر اپنے شایانِ شان ملازمت کو بھی قبول نہ فرمایا۔ لکھا ہے:

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۳۲۲۔

(۲) آج کل علم کا لبادہ اوڑھنے والے چاپلوسی کی وسیع وعریض چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔ وہ اسے باربار پڑھیں۔ (نعمان)

''بھوپال سے غالباً نواب صدیق حسن خاں صاحب کی طرف سے مولانا نانوتویؒ کی طلبی آئی اور پانچ سو روپے ماہوار تن خواہ مقرر کی''(۱)۔

مگر آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ آپ نے اس سے بھی انکار فرمادیا۔ دنیا کہتی ہے کہ مولوی غریب ہوتا ہے؛ مگر خدارا! بتایا جائے کہ اتنی بڑی ملازمت کو ٹھکرادینا کسی غریب کا کام ہوسکتا ہے؟ تاریخ کے آئینے میں دیکھیے تو معلوم ہو کہ جو سچا مولوی ہوتا ہے، وہ ظاہری اعتبار سے جتنا بھی مفلوک الحال نظر آئے؛ مگر وہ دل کا بڑا غنی ہوتا ہے۔ اس کی غنا کی گرد کو بھی کوئی بڑا سے بڑا آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ حقیقت میں وہ عالم ہی نہیں، جو دنیا کا حریص ہو: ''اَلدُّنْيَا جِيْفَةٌ وَطَالِبُهَا كِلَابٌ''.

زبان سے میٹھے اور دل سے بھیڑیے:

مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے:

''حضرت نانوتویؒ کو حرام کے طعام سے جیسے نفرت تھی، ویسے ہی اس کا احساس بھی بہت جلد کرتے تھے''(۲)۔

جس کا قلب پاک ہوتا ہے، وہ حرام سے کوسوں دور ہی بھاگتا ہے۔ اب اس کا اہتمام کہاں باقی رہا؟ حال آں کہ یہ بنیادی چیز تھی۔ جب خون ہی حرام مال سے تیار ہوگا، تو اس سے حلال کام کی طاقت کیوں کر پرورش پائے گی؟ مولانا نانوتویؒ کی زندگی کا واقعہ ہے کہ اگر کسی غیر محتاط کی دل شکنی سے بچنے کے لیے اس کی دعوت قبول فرمالیتے اور چند لقمے کھالیتے تو:

''گھر پہنچ کر قے کرتے تھے''(۳)۔

واقعہ ہے، اب عام طور پر پورے معاشرے میں ایسے محتاط بزرگ چند گنے ہی چنے نکلیں تو نکلیں؛ ورنہ اب تو دعوت کھانے کے بعد احساس بھی نہیں ہوتا کہ مجھے حرام آمدنی سے کھلایا گیا، یا حلال آمدنی سے؟ پیر اور پیرزادوں کا اس سلسلے میں اور بھی برا حال ہے۔ ان کو جو امرا (اپنے مال حرام سے اپنے مال کو پاک کرنے کی نیت سے) نذرانے دیتے ہیں، اسے وہ اپنی تھیلی میں ڈال لیتے ہیں، اور ان کے پورے گھرانے کی اسی پر پرورش کا دار و مدار ہوتا ہے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خاندانی اور پیشہ ور پیروں کے لڑکے زبان کے شیریں اور دل کے بھیڑیے ہوتے ہیں۔ اور بڑی حد تک اسی کا نتیجہ ہے کہ ان دلوں میں نور نہیں ہوتا، گو ظاہری زیبائش و آرائش سے چہروں پر نور کی چمک پیدا کرنے میں کام یاب بھی ہوجاتے ہوں۔

---

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۳۵۸۔ (۲) ایضاً، ج:۱، ص:۳۶۵۔
(۳) ایضاً، ج:۱، ص:۳۶۵۔

عالمانہ ذمہ داری کا احساس:

جیسا کہ آپ جانتے ہیں حضرت نانوتویؒ ایک خداترس بزرگ تھے، اور اپنی لغزش کو کبھی نہیں چھپاتے تھے۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ عموماً مسئلہ پوچھنے والوں کو کسی دوسرے بزرگ کا نام بتادیا کرتے۔ ایک دفعہ کا واقعہ لکھا ہے:

''مولانا محمد قاسم صاحبؒ میرٹھ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے عشا کے وقت ایک مسئلہ پوچھا، آپ نے اس سوال کا جواب دیا۔ سائل جب چلا گیا، تو آپ کے ایک شاگرد نے عرض کیا کہ: مجھے یہ مسئلہ یوں یاد ہے۔ آپ نے فرمایا: تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب مستفتی کو تلاش کرنا شروع کیا، رات کافی گزر چکی تھی، تلاش پر اصرار جب زیادہ بڑھا، تو لوگوں نے عرض کیا: رات زیادہ ہوگئی ہے، اب آرام فرمایئے، ہم صبح ہونے پر اس کو بتادیں گے؛ لیکن آپ نے قبول نہ فرمایا، خود بہ نفس نفیس سیدنا الامام الکبیرؒ اٹھے اور رات کی اسی تاریکی میں اس مسئلہ پوچھنے والے کے مکان پر تشریف لے گئے، گھر میں سے اس کو بلایا اور فرمایا: ہم نے اس وقت مسئلہ غلط بتلا دیا تھا، تمہارے آنے کے بعد ایک شخص نے صحیح مسئلہ ہم کو بتلایا، اور وہ اس طرح ہے''(۱)۔

اللہ اکبر! بےنفسی اور للّٰہیت کا یہ عالم، اور اس سے بڑھ کر دین کے باب میں یہ بلیغ اہتمام اور اپنی عالمانہ ذمے داری کا اتنا زبردست احساس، اللہ تعالیٰ قیامت تک آپ کی قبر پُرنور پر رحمت کے پھول برسائے۔ اپنے بعد والوں کے لیے ایک عمدہ نمونہ قائم فرما گئے۔ رات کی تاریکی میں بہ نفس نفیس چل کر مستفتی کے گھر آنا، اور پھر اپنی غلطی بتا کر یہ کہنا کہ ''ایک شخص نے ہم کو صحیح مسئلہ بتایا'' خداترسی کا کتنا زبردست ثبوت ہے۔

اے کاش! ہمارے نوجوان علمائے کرام ان واقعات کو عبرت وبصیرت کی نظر سے پڑھتے، اور اسی نقش قدم پر اپنی سیرت کی تعمیر کرتے۔ آج کا روشن خیال طبقہ اس واقعہ کو پڑھ کر شاید قہقہہ لگائے کہ آخر مولوی تھے، بےوقوفی کی انتہا کردی۔ آخر اتنی رات گئے سائل کے گھر پہنچنا، اور مسئلے کی صحیح نوعیت بتانا کیا ضروری تھا؟ اور پھر اس کے اظہار کی کیا ضرورت تھی کہ ایک دوسرے شخص نے صحیح مسئلہ بتایا، جس سے اپنی سبکی ہوئی؛ مگر کیسے یقین دلاؤں کہ یہی سب سے بڑا کمال تھا۔

آج واعظ دوسروں کے لیے بتاتے ہیں اور خود کورے ہیں۔

---

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۸۸-۳۶۷۔

شاہ جہاں پور کا ''میلۂ خدا شناسی'' عہدِ قاسمی کا بہت مشہور واقعہ ہے۔ اس میلے میں ہزاروں ہندو، عیسائی اور دوسرے ادیان و مذاہب کے ماننے والوں کا اجتماع ہوا تھا، جس میں ہر مذہب و دین کے مبلغ اور اہلِ علم بھی شریک تھے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ''خلقِ عظیم'' پر ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی تھی، آپ نے اپنی تقریر میں جب مجمع کو خطاب کرکے فرمایا:

''انصاف سے کوئی صاحب بتلائیں تو سہی، اس قسم کے اخلاق کا کوئی شخص ہوا ہے؟ تو دیکھا گیا کہ سننے والوں پر ایک کیفیت تھی، ہر کوئی ہمہ تن گوش تھا، اور مولوی (محمد قاسم) صاحب کی جانب تک رہا تھا۔ کسی کی آنکھوں میں سنتے ہیں آنسو، کسی کی آنکھوں میں حیرت، اور یہ حال عوام ہی کا نہ تھا؛ بلکہ پادریوں کی یہ حالت تھی کہ نقشِ درو بے حس وحرکت بنے ہوئے تھے۔ انہیں پادریوں میں سے ایک پادری شاہ جہان پور سے بریلی پہنچ کر ایک صاحب کے آگے حضرت نانوتویؒ کی تقریر کی دل دوزیوں کا ذکر ان الفاظ میں کرنے لگا: اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے، تو اس (قاسم نامی) شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے۔ ایک نیک دل ہندو نے اپنے احساس کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ: ایسی تقریریں بیان کیں کہ پادریوں کو جواب نہ آیا، کوئی اوتار ہوں، تو ہوں''(۱)۔

یہ اس کی تقریر کا اثر ہے، جو اپنے کو زیادہ سے زیادہ بے حیا واعظ کہا کرتا تھا۔ یہ سب کیا تھا؟ عمل اور خدا ترسی کا نتیجہ تھا کہ رب العزت نے وعظ وتقریر میں یہ اثر دیا تھا۔ نام ونمود اور شہرت سے چڑھ تھی۔ تصنع اور تعلّی سے کوسوں دور تھے۔ جو کہتے اخلاص وللّٰہیت کی بنیاد پر کہتے۔ آج کل کے پیشہ ور واعظوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے، جو صرف سب دوسروں ہی کے لیے بتاتے ہیں، اور خود خالی دامن رہ جاتے ہیں۔

جس مقرر کی تقریر کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا، جانتے ہیں یہ ''میلۂ خدا شناسی'' تک کس طرح پہنچا تھا؟ کیا کار یا پالکی پر؟ ہزاروں انسانوں کے جلوس کے آگے؟ نعرۂ تحسین اور زندہ باد کے شور کے ساتھ گیا تھا؟ آہ! کیوں کر یقین دلایا جائے کہ یہ مقرر ٹیپ ٹاپ سے کوسوں دور تھا۔ حضرت مولانا احمد حسن امروہویؒ جیسے عالم بے بدل کا بیان ہے، اور بیان کیا! چشم دید گواہی ہے، فرماتے تھے:

''شاہ جہاں پور سے 'خدا شناسی میلے' تک جانے کے لیے راستے میں ایک ندی پڑتی تھی، مولانا (محمد قاسم) صاحب پیدل جارہے تھے، ندی میں پانی تھا، پاجامہ پہنے ہوئے دریا میں اتر پڑے، جس سے پاجامہ بھیگ گیا، پار اتر کر..... لنگی باندھی اور پاجامہ اتار کر، نچوڑ کر اور پیچھے لاٹھی پر ڈال کر جیسے گاؤں کے رہنے والے ڈال لیا کرتے ہیں، تشریف لے چلے''(۲)۔

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۳۹۹۔ (۲) ایضاً، ج:۱، ص:۴۵۳۔

''خدا شناسی میلے'' کے سب سے بڑے مقرر کو دیکھا کہ کیسی بے تکلفی سے ایک دیہاتی کی صورت میں جارہا ہے؟'' اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ '' کی عملی تفسیر اس سے بہتر اور کیا ہوسکتی ہے؟

ہندوپاک کے ایک ایک مشہور مقرر اپنے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ: آج کوئی بھی اس نرالی شان سے کسی تبلیغی جلسے میں شرکت کے لیے اپنے آپ کو تیار پاتا ہے؟ خدا گواہ ہے، اگر شان دار استقبال نہ ہو، آمد وخرچ کے علاوہ منہ مانگی فیس، یا نذرانہ نہ ملے، تو خط کا جواب تک نہ آئے۔ آنا تو درکنار، اور پھر بے بلائے آئے، ناممکن۔

استاذ کی نظر میں شاگرد:

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوداؤد کا ایک حصہ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوریؒ سے پڑھا تھا، مگر استاذ کی نظر میں آپ کی کیا حیثیت تھی؟ مولانا منصور علی خاںؒ فرماتے ہیں:

''ایسے نکاتِ حدیث وقتِ درس کے مولانا قاسم صاحبؒ نے بیان کیے کہ مولانا احمد علی صاحب مرحوم مجمع عام طلبہ فارغ التحصیل کے روبہ رو ان تو جیہاتِ مولانا مرحوم کو بیان فرما کر مولانا محمد قاسم صاحب کی بڑی تعریف کیا کرتے''(۱)۔

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں: آپ کا علم وفہم کتنا قابل رشک تھا؛ مگر بہ ایں ہمہ جانتے ہیں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاذ مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتنی تعظیم فرماتے؟ اپنے کو ''کفش بردار اوشاں'' لکھتے۔ آج تو استاذ کے مقابلے میں شاگرد کو آتا ہی کیا ہے، مگر بعض شاگردوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ استاذ کے سامنے گاؤ تکیہ کے سہارے پاؤں پھیلا کر بیٹھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں ہم چنیں دیگرے نیست: ؎

بریں عقل ودانش بہ باید گریست

گھر کی کیفیت:

بانیٔ دار العلوم دیوبند حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جن کے صدقے میں ہزاروں عالمانِ دین پیدا ہوئے، اور جن کے عقیدت مندوں کی اس زمانے میں بھی کمی نہ تھی؛ مگر دیکھیے! اس بوریہ نشین اور صحابۂ کرام کی زندگی کے عاشق کی رہائش کیسی تھی؟ آپ کے شاگرد رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ ایک دفعہ فرمانے لگے:

''اس منقطع عن الخلق اور زاہد فی الدنیا ذات (حضرت قاسم العلوم والخیراتؒ) کے حجرے

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۴۲۶۔

میں کچھ بھی تو نظر نہ آتا تھا، چٹائی بھی اگر ایک تھی، تو وہ بھی ٹوٹی ہوئی، گویا عمر بھر کے لیے اسی چٹائی کو منتخب فرمالیا تھا، نہ کوئی صندوق تھا، نہ کبھی کپڑوں کی گٹھری بندھی تھی''۔

آگے سفر کا حال بیان فرماتے ہیں:

''سفر میں بھی کوئی اہتمام نہ تھا، اگر کبھی ایک آدھ کپڑا ہوا، تو کسی کے پاس رکھوادیا؛ ورنہ اسی ایک جوڑے میں سفر پورا ہوتا، جو حضر میں پہنے ہوتے۔ البتہ ایک نیلی لنگی ساتھ رہتی تھی، جب کپڑے زیادہ میلے ہوگئے، تو لنگی باندھ کر کپڑے اتار لیے، اور خود ہی دھو لیے''(۱)۔

اسی کو کہتے ہیں صحابۂ کرامؓ کی سی زندگی۔ نہ گھر میں ساز وسامان، نہ زرق برق سجا سجایا کمرہ، نہ شیشہ اور آبنوس کی الماری، نہ بجلی کے حسین وجمیل قمقمے، اور نہ اوپر اور بغل میں بجلی کا پنکھا، نہ بچھی ہوئی چاندنی وقالین اور نہ گدا اور گاؤ تکیہ۔ حد ہے، نہ ایک بکس ہی ہے کہ جس میں دھلے دھلائے کپڑے، یا کوئی سامان وقت ضرورت رکھا جاسکے، اور اس سے بڑھ کر کپڑوں کی گٹھری بھی شاگرد کو نظر نہ آئی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہلکے پھلکے اور ضرورت سے زیادہ کوئی چیز نہیں۔ حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم):

''كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ''.

کی عملی تفسیر۔ لوگوں نے وعظ میں کہا اور سنا تو ہوگا؛ مگر اس کی عملی تفسیر شاید دیکھنے میں کبھی نہ آئی ہو۔

اے جنت الفردوس کے رہنے والے! تو نے اپنی زندگی کو اپنی روحانی اور علمی اولاد کے لیے سراپا نمونہ بنا کر پیش کیا۔ زمین وآسمان اور ہند کے در و دیوار گواہ ہیں کہ اس ہندوستان کی سرزمین کو ایک صحابی تو نہیں؛ مگر صحابی کی سی زندگی کا شیدائی اور ایک عاشقِ رسول نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا ہے۔

اللہ اللہ! سفر پر جارہے ہیں؛ مگر نہ کوئی خاص اہتمام ہے، اور نہ کسی چیز کی کوئی فکر، اور تو اور کپڑے بہت میلے ہوگئے، تو اتار کر خود اپنے دستِ مبارک سے دھو لیے۔ ہمارے وہ پیر اور پیرزادے کہاں ہیں، جو تزکیۂ قلب کے فرائض انجام دینے کا دعوی کرتے ہیں؛ مگر دنیا کی زیبائش وآرائش اور ٹیپ ٹاپ سے ان کو فرصت نہیں۔ کوٹھی، گدے دار کرسیوں اور قالین وگاؤ تکیے سے آراستہ ہے۔ خدام اور دربانوں کا پہرہ لگا ہے۔ سفر میں جارہے ہیں، تو اتنا سامان ہے، جتنا ایک اوسط درجے کے پورے گھر میں بھی نہیں ہوتا، اور کہاں ہیں ہمارے وہ علمائے کرام، جو دنیا کی چندروزہ زندگی پر لوگوں کو وعظ کہہ کر سنایا کرتے ہیں، اور خود سیکڑوں برس جینے کے سامان کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ یہ دیکھیے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سچے جانشین اور نائب کو ایک خداترس عالم باعمل اور اولوالعزم مبلغِ اسلام کو اور ایک واقعی پیر اور عملی واعظ کو۔

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۴۵۲۔

سفر وحضر میں کپڑوں کی فہرست:

یہیں یہ قصہ ختم نہیں ہوتا، حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے جسم مبارک پر سفر وحضر میں جولباس ہوتا، اس کی فہرست بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''بغیر کرتے کے بندوں دارا چکن (یا انگرکھا) اور پاجامہ، سردی ہوئی، تو مختصر سا عمامہ؛ ورنہ عموماً کنٹوپ تمام سردی میں سر پر رہتا''(۱)۔

وہ مسلمان جو علمائے دین کو برا بھلا کہتے ہیں، انصاف کریں، اس سے بڑھ کر بھی سادگی ممکن ہے؟ اور کیا اس میں صحابۂ کرامؓ کی سی زندگی کی جھلک نہیں ہے؟ اور یہ نہ سوچیے کہ یہ عارضی لباس تھا، نہیں! اسی طرز پر پوری زندگی گزار دی گئی۔

مرض الوفات میں جو لباس جسم پر نظر آئے، اس کی فہرست بھی ملاحظہ فرمائیے۔ امیر شاہ خاںؒ راوی ہیں:

''سر پر میلا اور پھٹا ہوا عمامہ، جس میں لہرے پڑے ہوئے تھے، اور چوں کہ سردی کا زمانہ تھا؛ اس لیے دھوتر کی نیلی رنگی ہوئی مرزئی پہنے ہوئے تھے، جس میں بند لگے ہوئے تھے، اور نیچے نہ کرتہ تھا اور نہ انگرکھا تھا، اور ایک رضائی اوڑھے ہوئے تھے، جو نیلی رنگی ہوئی، اور جس میں موی گوٹ لگی ہوئی تھی، جو پھٹی ہوئی تھی اور کہنہ تھی، اور کہیں سے بالکل اُڑی ہوئی تھی''(۲)۔

اللہ اکبر! یہ لباس ہے حضرت قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا، جو ہندوستان، پاکستان اور افغانستان وافریقہ کے تمام نامی گرامی اور مشہور اہل علم کے استاذ تھے، جو اپنے زمانے میں بہت سے نوابوں اور امرا کے مرجع تھے، اور جن کے ایک اشارۂ ابرو پر لاکھوں روپے بارش کی طرح برس سکتے تھے۔

کاش! علمائے کرام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی سے سبق حاصل کرتے، اور آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی سعی کرتے۔

امیر وغریب میں کوئی فرق نہیں:

عاشقِ رسول اور صحابۂ کرامؓ کی سی زندگی کے مالک حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع اور جذبۂ عدل ومساوات کا ایک دل پذیر واقعہ بھی پڑھیے۔ یہ بیان اس کا ہے جس نے بہ چشم خود یہ واقعہ دیکھا ہے، یعنی مولانا منصور علی خاں حیدر آبادیؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۴۵۲۔ (۲) ایضاً، ج:۱، ص:۴۵۳۔

''ایک دن چند مہمان کھانے کے واسطے ہاتھ دھونے کو اٹھے، اور دوسرے صاحب نے ان کے ہاتھ دھلا دیے؛ مگر ایک بڑھا مسکین شکستہ حال رہ گیا، اس کے کسی نے ہاتھ نہ دھلائے۔ سیدنا الامام الکبیرؒ اس تماشے کو دیکھ رہے تھے کہ بڑھے کو مسکین وغریب جان کر لوگوں کی توجہ اس کی طرف نہیں ہو رہی ہے۔ مولانا منصور علی خاںؒ کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ: بڑھا خود لوٹے کے واسطے جھکا ہی تھا کہ دیکھتے ہی مولانا (محمد قاسم) صاحبؒ نے جھپٹ کر اس قدر جلد وہ لوٹا اٹھا لیا کہ میں حیران رہ گیا، اور دونوں ہاتھوں سے نہایت ادب کے ساتھ لوٹا پکڑ کر اس بڑھے کے ہاتھ دھلا دیے''(۱)۔

مسلمانوں کے ساتھ خواہ کتنا ہی شکستہ حال ہو، احترام واکرام کا یہ دینی جذبہ کیا بتاتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں امیر وغریب اور شریف ووضیع کی کوئی تفریق تھی؟ اور اپنے مہمانوں کی خدمت کے لیے اس چستی سے کیا سبق ملتا ہے کہ خدانہ خواستہ آپ مہمانوں کی خدمت کو اپنے لیے باعث ننگ وعار سمجھتے تھے؟

خانقاہوں کے گدی نشین پیرزادے اور عافیت پسند قائدین ایمان داری سے بتائیں، کیا یہ دینی جذبہ ان میں باقی ہے؟ اب تو بڑی بڑی بارگاہوں میں بھی مہمانوں میں امیر وغریب اور شریف وکمینے کی جو تفریق ہونے لگی ہے، جبہ ودستار اور سوٹ بوٹ والوں کا دستر خوان الگ لگتا ہے، اور غریب اور شکستہ حال دین دار مسلمانوں کا علاحدہ۔ ایک طرف تعظیم وتکریم کی فراوانی ہوتی ہے، اور دوسری طرف تحقیر وتوہین کی، ''اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ''!

دین پر لگا دیا:

جس زمانے میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ منشی ممتاز علیؒ کے مطبع میں تصحیح کی خدمت پر تھے، تو آپ نے اس مطبع کے ایک دوسرے ملازم سے دوستی کی، جس کو دین سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ بعض لوگ ناخوش تھے کہ پابند شرع مولوی ہو کر ایک آزاد شخص سے یہ کیا دوستی کر چھوڑی ہے؟ مگر ملاحظہ فرمائیے: حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو پھر کس طرح راہِ راست پر ڈال دیا۔ لکھا ہے:

''ایک دن جب وہ اور مولانا تنہا تھے، مولانا نے حافظ جی سے کہا کہ: بھئی! ہماری دوستی کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ دونوں کا رنگ ایک ہی ہو۔ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تمہاری وضع قطع کچھ اور ہو، اور تمہارے دوست کی کچھ اور؟ فرمایا کہ لاؤ میں ہی تمہارا رنگ اختیار کرتا ہوں۔ (یہ سن کر) حافظ جی بے چارے کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، اور اس کے بعد پھر اپنے دوست کا

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۴۶۱۔

ایسا پختہ رنگ اختیار کیا کہ پرہیز گار مسلمانوں کی وضع قطع بھی کرلی، اور اس روز سے پکے نمازی اور نیک وضع بن گئے''(۱)۔

اللہ والے اور مخلص مسلمان کی باتوں کی تاثیر ملاحظہ فرمایئے، خدا شاہد ہے، اگر آج بھی اخلاص اور للہ فی اللہ کوئی اچھی بات کسی سے کہی جائے، تو ضرور اثر انگیز ہوگی؛ مگر آہ! اب اخلاص، للّٰہیت کہاں؟ اب تو ان کی جگہ نام ونمود اور مدح وستائش کی چھپی خواہش ہوتی ہے، پھر اثر کہاں سے آئے گا؟

مجھے بھی محبت رسول نصیب ہو:

کوئی مولوی عبدالسمیع صاحب تھے، جو بدعتوں کے قائل اور اہل بدعت کے وکیل بھی تھے۔ ان ہی کے متعلق:

''ایک صاحب نے میرٹھ میں مولانا (محمد قاسم صاحبؒ) سے دریافت کیا کہ مولوی عبدالسمیع تو مولودشریف کرتے ہیں، آپ کیوں نہیں کرتے؟''

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا:

''بھائی! انہیں (مولوی عبدالسمیع صاحب کو) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبت معلوم ہوتی ہے، مجھے اللہ تعالیٰ محبت نصیب کرے''(۲)۔

طرفہ تماشا ہے کہ آج ان ہی مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے خلاف رضا خانی غلاظت اچھالتے ہیں، اور ان کے نوجوان علما ناسمجھی سے نہ معلوم کیا کیا کہتے پھرتے ہیں۔ ایک طرف ''حسنِ ظن'' کا یہ عالم، اور دوسری طرف کچھ لوگوں نے دیوبندیوں کو کافر ثابت کرنے یا روٹی کمانے کے لیے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔

مخالفِ مسلک کا احترام:

جو لوگ علمائے دیوبند کو کافر کہہ کر اپنا جی ٹھنڈا کرتے ہیں، اسی گروہ کے ایک بزرگ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، پھر آپ نے کیا سلوک کیا:

''مولانا نے نہایت عزت کے ساتھ ان کو مہمان بنایا، سب طالب علموں کو سمجھا دیا کہ خبر دار کوئی گفتگو ان کے طریقے کے خلاف نہ کی جائے؛ کیوں کہ مہمان کی دل شکنی نہ کرنی چاہیے''(۳)۔

اللہ اللہ! اپنے مخالف مسلک کا یہ احترام واکرام ہے، اور یہاں تو دین کا یہ پاس کہ دل شکنی ناجائز، اور دوسری طرف اسی بدعتی گروہ سے متعلق علمائے کرام کا یہ حال ہے کہ کافر کہنے میں بھی عار نہیں سمجھتے۔

---
(۱) سوانح قاسمی، ج:۱،ص:۴۷۱۔ (۲) ایضاً، ج:۱،ص:۴۷۲۔
(۳) ایضاً، ج:۱،ص:۴۷۲۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مخالفوں سے جو اس خندہ پیشانی سے ملتے اور ان کی عزت کرتے تھے، اس کے متعلق ایک دفعہ ایک حکیم صاحب نے مولانا گنگوہیؒ سے شکوہ کیا کہ مولانا بھی عجیب آدمی ہیں؟ یہ سن کر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

> ''حکیم صاحب! آپ کیا فرمارہے ہیں؟ آپ ان کے قلب کی حالت ملاحظہ نہیں فرماتے؟ جس شخص کے قلب میں ایمان کی طرح یہ راسخ ہو چکا ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ ذلیل وخوار کوئی ہستی نہیں ہے''(۱)۔

یہ ایک عالم ربانی کی گواہی ہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع اور عجز وانکساری کی۔

سفر سے واپسی میں سنت کا اہتمام:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دستور تھا کہ سفر سے جب کبھی واپس ہوتے، تو سنت طریقے کے مطابق پہلے مسجد میں کچھ دیر قیام فرماتے۔ آنے کی خبر بستی میں کسی نہ کسی طرح پھیل جاتی، اور لوگ آکر گھیر لیتے۔ کبھی کبھی آپ کے بوڑھے ابا جان بھی غلبۂ محبت میں مسجد ہی میں دیکھنے آجاتے؛ مگر:

> ''جوں ہی حضرت والاؒ کی نظر والد بزرگ وار پر پڑتی، گھبرا کر لپکتے اور اپنے والد بزرگ وار کے قدموں پر گر جاتے، پھر والد کے قدموں سے سر اٹھاتے، اور ان کے ہاتھ کو چومتے''۔

اپنے وقت کے سب سے بڑے عالمِ دین کی انسانیت اور شرافت ملاحظہ فرمائیے کہ اپنے بوڑھے باپ کی کیسی تکریم فرماتے۔ مسلمانو! یہ ہے باپ کی عظمت، جو صرف زبان سے نہیں، عمل سے ثابت کی جا رہی ہے۔ قرآن وحدیث میں والدین کی عظمت کا حال پڑھا ہوگا، وعظوں میں سنا بھی ہوگا؛ مگر آنکھوں سے شاید پہلی ہی مرتبہ آپ کے زمانے والوں نے یہ منظر دیکھا ہو۔

اور مسجد سے جب گھر تشریف لاتے، تو سب سے پہلی ملاقات میں جب دیکھتے کہ حُقّہ والد کے آگے پڑا ہے، تو دریافت فرماتے کہ باوا جی! آپ کی چلم میں آگ بھی ہے یا نہیں؟ جب کبھی والد فرماتے کہ بھائی! بڑی دیر سے یوں ہی ٹھنڈا رکھا ہے، اس پر حضرت یہ فرماتے کہ لائیے میں لاؤں! حقے کو اٹھاتے، اسے تازہ کرتے اور والد کی خدمت میں تیار کرکے پیش فرمادیتے۔

سچ ہے آپ کی زندگی سراپا عمل ہی عمل ہے۔ کہتے کم اور کرتے زیادہ تھے۔ آج اس زندگی کا مسلمانوں میں کال سا پڑ گیا ہے، جس کی بے حد ضرورت ہے۔ کاش! مسلمان ان واقعات سے کوئی عملی سبق لیتے۔

---

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۴۸۳۔

حق دار کو حق ادا کر دیا:

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے:

''حضرت جب تحصیل علم سے فارغ ہوکر گھر پر آئے، تو املاک کا جائزہ لیا، اور تمام املاک کو مشتبہ اور بعض کو مغصوبہ پایا۔ والد کو بہت سمجھایا کہ یہ کمائی ناجائز اور مشتبہ ہے، قیامت کے مواخذے کا تقاضا ہے کہ حقیقی حق داروں تک ان کے حصے پہنچا دیے جائیں۔ پھر ان زمینوں کے غلے کے استعمال میں احتیاط شروع فرمائی، اور والد کو بار بار سمجھاتے رہے۔ یہی نہیں؛ بلکہ مفصل فرائض نکلوائے اور اوپر کی بعید بعید پشتوں کے حقوق اور حصے نکلوائے''(۱)۔

اللہ اکبر! یہ جذبۂ دینی- آج کل کتنوں کو اس پر یقین لانے میں دیر ہوگی؛ مگر ''سوانح قاسمی'' میں فرائض کی تحریر کا عکس موجود ہے۔ سوچیے تو سہی کتاب وسنت پر کیسا ایمان تھا؟ کیا بیسویں صدی میں یہ صحابۂ کرامؓ کی سی زندگی اختیار کرنا آسان بات ہے؟ اللہ جانتا ہے: خدا کے اس بندے نے وہی کام کیا، جو ایک پکے مسلمان کو کرنا چاہیے۔

موجودہ دور کے وہ مسلمان، جو مختلف حیلوں سے حق داروں کو محروم کرنے کی سعی کرتے ہیں، اور اسے پڑھ کر عبرت وبصیرت حاصل کریں، اور اپنے حیلوں سے توبہ کر کے پکے مسلمان بننے کی سعیِ بلیغ کریں۔ علمائے کرام، خانقاہی پیروں اور دیگر مسلمانوں کو اس واقعے کی روشنی میں اپنی اپنی زندگی کا جائزہ لینا چاہیے۔

شب عروسی کا قصہ:

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شب عروسی کا قصہ سننے کے لائق ہے، جس کی راوی حضرتؒ کی اہلیہ ہیں، جنہوں نے اپنے گھر والوں کو کہہ کر سنایا تھا؛ بلکہ تعلیم وتربیت فرمائی تھی۔ سنیے! حضرت کی اہلیہ محترمہؒ فرماتی ہیں:

''حضرت جب شب اوّل میں تشریف لائے، تو آتے ہی نوافل شروع فرما دیے۔ نوافل سے فارغ ہونے کے بعد میرے پاس تشریف لائے، اور متانت وسنجیدگی سے فرمانے لگے: جب تم کو اللہ نے میرے ساتھ وابستہ کر دیا ہے، تو نبھاؤ کی ضرورت ہے؛ مگر بہ صورت موجودہ نبھاؤ میں دشواری ہے کہ تم امیر ہو، اور میں غریب ونادار ہوں۔ صورتیں اب دو ہی ہیں، یا میں بھی تونگر بنوں، یا تم میری طرح نادار بن جاؤ۔ پھر فرمایا: میرا امیر بننا تو دشوار ہے؛ اس لیے آسان صورت دوسری ہو سکتی ہے کہ میری طرح ہو جاؤ''(۱)۔

---

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۴۹۶۔ (۲) ایضاً، ج ا، ص:۵۰۸۔

پھر اپنا شوہری حق اور ان کا بیوی کا حق جتلا کر پوچھا:

''جو کوئی تمہارے حق میں اچھا حکم دوں، تو مانو گی؟''

اہلیہ پہلے پہلی شب ہونے کی وجہ سے خاموش رہیں، اصرار پر فرمایا: ضرور مانوں گی۔ یہ سب قول وقرار لے کر فرمایا:

''اچھا! سب زیور اتار کر مجھے دے دو''۔

زیور دے دیا گیا، پھر کپڑوں اور جہیز کے سامانوں پر اختیار کا مطالبہ ہوا۔ اہلیہ کی طرف سے کہا گیا:

''آپ کو کلی اختیار ہے''[1]۔

آپ سمجھتے ہوں گے یہ رفیقۂ حیات کا بس امتحان تھا، اور یا ہنسی مذاق؟ مگر دل تھام کر سنیے! حضرتؒ نے کیا کیا:

''علی الصباح تمام زیورات، تمام جوڑے کپڑوں کے اور سارے برتن، جو ہزاروں روپے کا سامان تھا، سب کا سب چندۂ سلطانی (ترکی امدادی فنڈ) میں دے دیا''[2]۔

تمام لوگ آنکھ کھول کر دیکھیں، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہاں پہنچ کر قلم تھرا جاتا ہے کہ اس ذات گرامی کو کیا کہوں، ولی کہوں، قطب کہوں یا کیا؟ مگر اپنا ذوق کہتا ہے کہ کچھ نہیں، بس صحابہؓ کے ہو بہو نمونہ تھے، اور اپنے جد امجد حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے قابل فخر پوتے۔ ہمیں رب العزت کے لطف وکرم سے پوری توقع ہے کہ میدانِ حشر میں ان شاء اللہ! حضرت صدیق اکبرؓ کے ساتھ ہوں گے۔ حضرتؒ کے علمی اور روحانی پوتوں اور دوسرے مسلمانوں کے لیے ان واقعات میں ایک اہم سبق ہے، کاش قبول کریں۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ رخصت ہو کر گھر گئیں، تو گھر والے ان کو دیکھ کر متحیر رہ گئے۔ پھر سب نیا بنوا دیا گیا؛ مگر جیسا کہ خود ان ہی کی زبانی روایت نقل کی گئی ہے کہ دوبارہ جب مولانا کے یہاں آئیں، تو پھر وعظ ونصیحت فرما کر اور ان کو راضی کر کے ''مختار کل'' بن گئے، اور:

''صبح ہی یہ ہزاروں روپے کا سامان پھر سلطانی چندے میں دے ڈالا''[3]۔

اللہ اللہ! یہ جذبۂ حق کہ یہ ساری چیزیں کیوں گھر میں پڑی رہیں؟ ان سے ثواب کیوں نہ کمایا جائے؟ زیب وزینت اور آرائش ونمائش، یہ تو اسی زندگی تک محدود ہیں، ان سے صرف خیالی راحت حاصل ہوتی ہے،

---

(۱) سوانح قاسمی، ج۱، ص: ۵۱۰۔

(۲) ایضاً، ج۱، ص: ۵۱۱۔

(۳) ایضاً، ج۱، ص: ۵۱۳۔

پھران سے دائمی اورابدی زینت کا سامان کیوں نہ کر دیا جائے؟ چناں چہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ جب کسی معتقد نے ''ایک چادر بیش قیمت اور ایک عدد زیور طلائی بی بی صاحبہ (یعنی اہلیہ محترمہ) کی ملک کر کے بھیجا، تو اہلیہ سے فرمایا:

''فی الحقیقت چادر اور زیور سے دل خوش ضرور ہوتا ہے، لیکن چند روز کے استعمال سے یہ دونوں ہی چیزیں خراب ہو جائیں گی۔ جو کام اس ریشمیں چادر سے نکلے گا وہی لٹھے کی سفید چادر سے بھی نکل سکتا ہے۔ کسی مستحق کو دے دو۔ خداوند تعالیٰ ان کے عوض عاقبت میں پائدار لباس اور زیور عطا فرمائیں گے''(۱)۔

اب لوگ دوسروں کو تو نصیحت کرتے ہیں؛ مگر خود اپنے گھر سے صدقہ کریں، غیر ممکن! آج بڑے بڑے دین دار اور بہ ظاہر خداترس بزرگوں کی ''خانہ تلاشی'' لیجیے، وہاں دنیا ہی دنیا ملے گی، دین کا نام تک نہ ہوگا۔ یقین نہ آئے، تو ایک خفیہ کمیٹی مقرر کر کے رپورٹ مرتب کرا لیجیے۔ آج ہے کوئی پیر، پیرزادہ، ہے کوئی عالم اور دین دار مسلمان، جو اپنی بیوی کا زیور راہِ خدا میں دے دے، اور اپنے دل کو خوش اور مطمئن دیکھ سکے؟ اور بیوی کی حد تک تو دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کسی قیمت پر بھی بہ رضا و رغبت تیار نہیں ہو سکتی۔ الا ما شاء اللہ!

مگر اللہ اکبر! یہ صحابۂ کرامؓ کی زندگی گزارنے والا عالم ہے، جو خود اپنی ہی حد تک تیار نہیں؛ بلکہ اس کی بیوی بھی اسی رضا و رغبت کے ساتھ راہِ خدا میں دینے کو آمادہ ہے۔ سوانح میں یہ عبارت موجود ہے:

''بی بی صاحبہ نے فوراً چادر ریشمیں اور طلائی زیور دونوں کو دے دیا، اور دل پر میل نہ آیا''(۲)۔

چناں چہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا دستور تھا:

''مولانا نانوتویؒ کے معتقد آپ کی بیوی کے لیے قیمتی لباس اور زیور بنا کر بھیجتے؛ مگر مولانا بجائے بی بی صاحبہ کے مساکین کو دے دیا کرتے، اور بی بی صاحبہ کو خبر بھی نہ کرتے''(۳)۔

رب العالمین بال بال مغفرت فرمائے۔ بیسویں صدی میں وہ کام اور نمونہ قائم فرما گئے، جو عہد نبوت میں نظر آتے ہیں۔ ہمارے اس دور میں صحابۂ کرامؓ کا ''نقش قدم'' بھلا دیا گیا ہے۔ اے کاش! یہ جذبات دینی پھر مسلمانوں میں ابھرتے، اور زبان سے زیادہ لوگ دل کے اچھے ہوتے۔

علمائے کرام کی بیویاں متوجہ ہوں:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہؒ کا ایک واقعہ بھی سننے کے لائق ہے،

---

(۱) سوانح قاسمی، ج۱، ص:۵۱۵۔ (۲) ایضاً، ج۱، ص:۵۱۶۔

(۳) ایضاً، ج۱، ص:۵۱۸۔

وہی فرماتی تھیں کہ: مولانا کا دستور تھا کہ عشا کے بعد دودھ استعمال فرماتے تھے؛ چناں چہ جوں ہی آپ تشریف لاتے، میں دودھ کا پیالہ لے کر حاضر ہوتی؛ مگر:

''کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ حضرت نے نوافل میں پوری شب گزار دی اور میں بھی پوری شب پیالہ لیے کھڑی کی کھڑی رہ گئی''(۱)۔

اللہ اللہ! بیوی ہوتو ایسی۔ آج اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ علمائے کرام کی بیویاں اس سچے واقعہ کو پڑھیں اور سوچیں، یہ اطاعت کا جذبہ کیا ان میں بھی ہے؟ ہمارے اسلاف نے جہاں اوروں پر اثر ڈالا، وہاں سے زیادہ اپنی ''بیوی'' ہی پر اثر ڈالا، خود حضرت نانوتویؒ ہی کی اہلیہ محترمہؒ کا واقعہ نقل کیا ہے:

''اذان کی 'حی علی الصلوٰۃ' پر کام کو چھوڑ کر اس طرح اٹھ جاتی تھیں کہ گویا اس کام سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ بالکل ہر چیز سے بے گانہ بن جاتیں''(۲)۔

کاش! مسلمانوں کی تمام عورتوں میں دین کا یہ شغف پیدا ہو جاتا، پھر مسلمانوں کے اعمال واخلاق میں دیکھتے ہی دیکھتے ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا، اور پوری مسلمانی دنیا پر چھا جاتی۔ ہمارے علمائے کرام اس واقعے کو خصوصی طور پر اپنے اپنے گھروں کے متعلقین کو سنائیں، اور اپنے گھروں میں دینی ماحول پیدا کرنے کی سعی کریں۔

ذکر کی پابندی:

فرائض وسنن وغیرہ تو پابندی سے ادا کرتی ہی تھیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ اسی کے ساتھ ساتھ دوامی التزام یہ بھی تھا:

''بعد نماز صبح سر پر اور منہ پر اپنا دوپٹہ ڈال کر ہلکی ضرب سے ذکر کیا کرتی تھیں۔ آندھی ہو، مینہ ہو، سردی ہو، گرمی ہو، اس میں بال برابر فرق نہیں آتا تھا''(۳)۔

آہ! اب ایسی عورتیں ختم ہوگئی ہیں۔ گنے چنے گھروں میں کچھ پرانی قسم کی جو بوڑھی عورتیں رہ گئی ہیں، ان کے سوا اب یہ دینی جذبہ کہاں باقی رہا؟ اب تو ناول خوانی کا دور ہے، یا پھر سینما دیکھنے کا۔ رات سینما کے گیٹ پر کھڑے ہو جایئے، اور دیکھ لیجیے کہ بڑے بڑے شریف گھرانوں کی بہو بیٹیاں موٹر پر، رکشا پر اور دوسری سواریوں پر آئی ہیں، اور سینما گھر میں داخل ہو رہی ہیں۔ نماز، روزے کو ایک فرسودہ رسم سے زیادہ وقعت نہیں۔

---

(۱) سوانح قاسمی، ج۱،ص:۵۱۹۔

(۲) ایضاً، ج۱،ص:۵۱۹۔

(۳) ایضاً، ج۱،ص:۵۱۹۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی رفیقۂ حیات کا قلب اتنا صاف تھا کہ آپ کے سامنے جب حدیثیں بیان کی جاتیں، یا دین کی دوسری باتیں کہی جاتی تھیں، تو آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش شروع ہوجاتی۔ مولانا محمد طیب صاحب کا بیان ہے:

''میں نے حدیث جب شروع کی اور مشکوٰۃ میرے والد صاحب کے یہاں شروع ہوئی، پھر دوسرے سال مسلم شریف تھی، ان ہی کے یہاں ہوئی، تو میں سبق پڑھ کر گھر آ کر سبق کی تقریر دادی صاحبہ کو سنایا کرتا تھا۔ جب تک میں تقریر کرتا رہتا تھا، ان کی آنکھوں سے آنسو مسلسل جاری رہتے''(۱)۔

کہاں ہیں وہ عورتیں، جو اپنے کو مسلمان کہتی ہیں؟ اس بصیرت افروز واقعے کو پڑھیں، اور اپنے ایمان کا جائزہ لیں۔ پھر اعمال واخلاق اور عقائد ومعاملات کو کتاب وسنت کی ترازو پر تولیں، اور اپنے متعلق فیصلہ کریں۔

آہ! جن گودوں میں ہماری پرورش ہوتی ہے، وہی جب خشیت الٰہی اور دین کی محبت سے خالی ہوں گی، تو ہماری زندگی پر کیا اثر پڑے گا؟

''قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا''.

والی آیت سامنے رکھیں اور انصاف کیا جائے کہ دین دار مسلمان اس آیت پر کس حد تک عمل کرتے ہیں۔ صرف اپنا وظیفہ کافی نہ ہوگا۔ جب شریک کی زندگی بدعتوں اور مشرکانہ عقائد میں مبتلا ہوں (۲)۔

---

(۱) سوانح قاسمی، ج۱ص:۵۱۹۔

(۲) (ماخوذ از: ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند، اگست تا نومبر ۱۹۵۵ء)

تفسیر قرآن کا ایک مسئلہ

حضرت نانوتویؒ اور آپ کے تلامذہ میں تحقیقی مذاکرہ

مفسر قرآن حضرت مولانا سید اخلاق حسین قاسمیؒ

مفسر قرآن حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمیؒ دار العلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے علوم قرآنی سے شغف دیا تھا۔ ذیل میں موصوف کا ایک تحقیقی مقالہ پیش ہے۔

قرآن حکیم کی تفسیر کے ایک اہم مسئلے میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور آپ کے اکابر تلامذہ کے درمیان ایک تحقیقی مذاکرہ ہوا۔ دوسرے شرعی علوم کی طرح مولانا نانوتویؒ کا فکر و مذاق علم تفسیر میں بھی مجتہدانہ اور منفرد تھا۔ وہ چند بنیادی آیات جن کی تفسیر مولانا علیہ الرحمہ سے مختلف مضامین میں منقول ہے، ان کی تحقیق میں مولانا نے جو انداز اختیار کیا، اس سے یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ البتہ تفسیر کے موضوع پر مولانا کی کوئی بڑی مستقل کتاب موجود نہیں ہے۔ صرف چند مختصر کتابچے ہیں، یا پھر مختلف مباحث سے تعلق رکھنے والی آیات کی تحقیقی تشریحات ہیں۔

بہرحال! اس علمی مذاکرے سے پہلے تفسیر کے اس مسئلے پر علمائے متقدمین نے جو مباحث تفسیر کی کتابوں میں چھوڑے ہیں، پہلے ان پر ایک نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی معجزانہ بلاغت میں آیات قرآنی کے فواصل (قوافی) کی بلاغت کا بڑا حصہ ہے۔ ان فواصل میں خاص طور پر وہ فواصل جو الف نون، واو نون اور یا نون پر ختم ہوتے ہیں، قرآنی بلاغت کے حسن و جمال پر چار چاند لگا دیتے ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ قاری جب ان فواصل پر آیاتِ الٰہی کو ختم کرتا ہے، تو اس کی آواز میں خاص قسم کا دلکش ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اس لفظی رعایت کے ساتھ آیات اللہ کے معنوی حسن و جمال، اور مضمون کی وقعت اور کمال میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جس طرح ایک شاعر ضرورت شعری کی وجہ سے بعض ایسے الفاظ لے آتا ہے، جس سے ان کے کلام کا معنوی حسن باقی نہیں رہتا۔ یہ حروف کہیں الفاظ کے اصلی حروف ہوتے ہیں،

اور کہیں تثنیہ اور جمع کی ضمیروں کی علامات ہوتے ہیں۔

سورۂ مؤمنون کی خصوصیت:

سورۂ مؤمنون کی ایک سو اٹھارہ آیات ہیں، اور ان تمام آیات کے فواصل اور خواتیم ''وانون'' سے شروع ہوتے ہیں: ''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ''، اور ''یانون'': ''خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ'' پر ختم ہوتے ہیں۔ یہ سورت مکی ہے، اور مکۂ معظّمہ کے تیرہ سالہ دور میں توحید، آخرت، نبوت، انسانی تخلیق، ہلاک شدہ قوموں سے عبرت، قریش کے مظالم کے جواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر اور احسان کی تلقین، خدا تعالیٰ سے فضل و کرم کی دعا کے مضامین نازل ہوتے تھے۔ چناں چہ سورۂ مؤمنون میں یہ تمام مضامین موجود ہیں۔ ان تمام مضامین اور ہدایات کو قرآن کریم نے کس حسن بلاغت اور کس معنوی عظمت کے ساتھ صرف ''وانون''، اور ''یانون'' کے قوافی و خواتیم میں بیان کیا ہے؛ اسے معجزۂ قرآنی کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اہل زبان عاجز تھے کہ نثر میں شعر سے زیادہ دل کشی، نغمگی اور معنوی بلندی قرآن کریم پر ختم ہوگئی ہے۔ اس کا جواب ممکن نہیں۔ اس سورہ میں خدا تعالیٰ کی صفت کو جمع کے صیغوں میں چار جگہ بیان کیا گیا ہے:

﴿اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ﴾[1].

﴿اَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ﴾[2].

﴿وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِيْنَ﴾[3].

﴿اَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ﴾[4].

سورۂ یوسف میں دو جگہ آیا ہے:

﴿وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ﴾[5].

سورۂ ہود میں آیا ہے:

﴿اَنْتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِيْنَ﴾[6].

سورۂ تین میں آیا ہے:

﴿أَلَيْسَ اللهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ﴾[7].

---

(۱) سورۂ مومنون، آیت نمبر: ۱۴۔　　(۲) ایضاً، آیت نمبر: ۲۹۔
(۳) ایضاً، آیت نمبر: ۷۲۔　　(۴) ایضاً، آیت نمبر: ۱۱۸۔
(۵) سورۂ یوسف، آیت نمبر: ۶۴، ۹۲۔　　(۶) سورۂ ہود، آیت نمبر: ۴۵۔
(۷) سورۂ تین، آخری آیت۔

قریش کا عقیدہ:

مشرکین مکہ اپنے دیوی دیوتاؤں کو سب سے بڑا خدا نہیں مانتے تھے۔شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ: قریش کا عقیدہ یہ تھا کہ ہمارے چھوٹے چھوٹے کام اور ہماری چھوٹی چھوٹی ضرورتیں یہ دیوتا پوری کرتے ہیں، اور سب سے بڑے خدا نے یہ چھوٹے کام ان کے سپرد کر دیے ہیں۔ پھر اگر قرآن ایک عظیم خالق کے علاوہ دوسرے خالق، بڑے رازق کے ساتھ دوسرے رازق اور دوسرے حاکموں اور دوسرے رحم کرنے والوں کا تصور دیتا ہے،تو کیا اس سے مشرکین کے تصور کی تائید نہیں ہوتی؟

مفسرین کی تاویلات:

مفسرین نے ان آیات میں "أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ" کی آیت کو اہمیت دی ہے،اور اس کی تشریح میں بڑی بحث نقل کی ہے۔اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ صفت خلق وتخلیق ایک بنیادی صفت ہے، اس صفت میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسری ہستیوں کا تصور بہت سنگین شرک کی نوعیت رکھتا ہے؛ اس لیے مفسرین نے اس اشکال کو دور کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔ رہا دوسری صفات (روزی رسانی، رحم کرنا، حکومت کرنا) کا معاملہ،تو یہ صفات عالم اسباب میں مخلوق کے لیے ثابت ہیں۔عارضی صفات کے طور پر کہو یا مجازی طور پر کہو۔بہر حال خالقین کی تاویلات میں مختلف قول ملتے ہیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ لکھتے ہیں:عربی میں خلق وتخلیق کے الفاظ دو معانی میں استعمال کیے جاتے ہیں:

(۱) ایک حقیقی مفہوم میں،یعنی کسی شی کو عدم سے وجود میں لانا، یہ پیدا کرنا ہے۔اس مفہوم میں خالق کی صفت "بدیع"(بَدِيْعُ السَّمٰوَاتِ) کے ہم معنی ہوتی ہے،اور یہ صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ نہ عارضی طور پر مخلوق اس صفت سے موصوف ہوتی ہے،نہ حقیقی طور پر متصف ہوتی ہے۔

(۲) دوسرا مفہوم خلق کا صنعت، تقدیر اور تصویر کے معانی کے مطابق ہے۔عرب میں خالق، صانع کے معنی میں آتا ہے،یعنی بنانا، تیار کرنا۔امام مجاہدؒ نے یہی تاویل کی ہے۔

"قَالَ مُجَاهِدٌ: يَصْنَعُوْنَ وَيَصْنَعُ اللّٰهُ، وَاللّٰهُ خَيْرُ الصَّانِعِيْنَ".

"یہ انسان اشیا کو بناتے ہیں، تیار کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بھی بناتا ہے،اور اللہ تعالیٰ سب سے بہتر بنانے والا ہے"۔

مولانا تھانویؒ نے اسی تاویل کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔بیان القرآن میں لکھتے ہیں:

''سوکیسی شان ہے اللہ کی، جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے؛ کیوں کہ دوسرے صناع صرف تحلیل ترکیب کرسکتے ہیں، اعطائے حیات یہ خاص اللہ ہی کا کام ہے''[۱]۔

مولانا نے صنع اور صنعت کا مفہوم واضح کردیا کہ انسانوں کا بنانا اور پیدا کرنا یہ ہے کہ وہ موجودہ اشیا میں ترکیب وتحلیل کا عمل کرکے ایک دوسری چیز تیار کردیتے ہیں؛ لیکن عدم سے وجود میں لانا یہ صناعت صرف خدا ہی کے ساتھ خاص ہے۔

مشرکین سے قرآن نے کہا:

﴿إِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَوْثَانًا وَتَخْلُقُوْنَ إِفْكًا﴾[۲].

''اے مشرکو! تم خدا کے سوا دیوتاؤں کی عبادت کرتے ہو، اور تم نے جھوٹ گھڑ لیا ہے''۔

یہ جھوٹ ان بتوں کا وجود بھی ہے، اور تمہارے مشرکانہ خیالات بھی ہیں۔ اسی معنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف خلق وتخلیق کی نسبت کی گئی اور فرمایا گیا:

﴿وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي﴾[۳].

''اے عیسیٰ! تو مٹی کا پتلا پرندے کی نقل کا بناتا تھا میرے حکم سے''۔

یہ خلق کا مجازی مفہوم ہے۔ بعض مفسرین نے خالق کو مصورین کے معنی میں لیا ہے، اور اس کا مفہوم ہے: صورت گری کرنا، صورت بنانا، کسی چیز کی بھی ہو۔

امام سیوطیؒ نے جلالین میں اس کی تفسیر ''مقدرین'' سے کی ہے۔ تقدیر کے لغت میں دو معنی ہیں: ایک ''کسی چیز کو تیار کرنا''، دوسرے معنی ''اندازہ کرنا''۔ اب یہ تین تاویلیں ہوئیں: (۱) خالقین بہ معنی صانعین۔ (۲) مقدرین، (۳) مصورین، اور ان تینوں کا حاصل ایک ہے۔ یعنی خلق کے دوسرے مجازی معنی۔

امام رازیؒ نے بتایا کہ بعض لوگ مقدرین (تقدیر سے) کو اندازہ کرنے کے معنی میں سمجھتے ہیں، حال آں کہ اندازہ کرنا ظن وگمان سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف ناممکن ہے۔ امام کہتے ہیں کہ اگر تقدیر کے یہ معنی لیے جائیں گے، تو اس آیت کو متشابہات میں داخل کرنا پڑے گا[۴]۔

امام نے ایک توجیہ یہ بیان کی ہے کہ: یہ نسبت مشرکین کے اعتقاد کے مطابق کی گئی ہے۔ یعنی اے مشرکین! تمہارے خیال فاسد میں جو ہستیاں خالق ہیں، اور تم نے جنہیں خالق سمجھ رکھا ہے، خدا تعالیٰ ان سب سے افضل ہے؛ کیوں کہ وہ حقیقی خالق ہے۔

(۱) حضرت حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ، **بیان القرآن**۔
(۲) سورۂ عنکبوت: ۱۷۔ (۳) سورۂ مائدہ: ۱۱۰۔ (۴) تفسیر کبیر، ج: ۶، ص: ۲۸۶۔

جیسے سورۂ روم میں کہا گیا:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدِئُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾[1]۔

''اللہ تعالیٰ ہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا، اور یہ اس کے لیے آسان تر ہے''۔

مطلب یہ ہے کہ خدا کی قدرت میں تو اوّل و آخر ہر طرح پیدا کرنا برابر ہے، اوّل اور آخر میں کوئی فرق نہیں؛ لیکن اے مشرکین! تمہارے محسوسات وخیالات کے مطابق اوّل بار پیدا کرنے سے دوسری بار اس کا اعادہ کرنا آسان ہونا چاہیے۔ پھر عجیب بات ہے کہ تم پہلی پیدائش پر تو اللہ تعالیٰ کو قادر مانو، اور دوسری دفعہ میں پیدا کرنے (قیامت میں) کو ناممکن سمجھو؟ قاضی صاحبؒ نے ایک توجیہ یہ نقل کی ہے کہ یہ بہ طور فرض محال کہا گیا ہے۔ یعنی اگر فرض کرلیا جائے کہ خدا کے علاوہ بھی دوسرے خالق موجود ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان سب سے افضل قرار پائے گا[2]۔

صاحبِ روح المعانی اور امام رازیؒ نے اس بحث میں فرقۂ معتزلہ کے عقیدے کی بحث (بندہ اپنے افعال کا خالق ہے) کو داخل کر دیا ہے، جسے نقل کرنے کا یہ موقع نہیں۔

احسن الخالقین کے مختلف تراجم:

اس آیت کے اہلِ تراجم نے فارسی اور اردو میں جو تراجم کیے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱- پس بزرگ است خدا نیکوترین نگارندگان۔ (شاہ ولی اللہؒ، علامہ جرجانیؒ)

۲- پس بہت برکت والا ہے اللہ، بہتر پیدا کرنے والوں کا۔ (شاہ رفیع الدینؒ)

۳- سو بڑی برکت اللہ کی، جو سب سے بہتر بنانے والا۔ (شاہ عبدالقادرؒ)

۴- سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی، جو سب صناعوں سے بڑھ کر ہے۔ (مولانا تھانویؒ)

۵- پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔ (مولانا مودودی)

۶- جو سب بنانے والوں میں بہتر بنانے والا ہے۔ (ڈپٹی نذیر احمد)

تراجم کا یہ تنوع واختلاف مترجم کے اپنے فکری مذاق کے مطابق ہے۔

مولانا نانوتوی علیہ الرحمہ کی تحقیق:

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور آپ کے اکابر تلامذہ کے درمیان اس آیت (سورۂ مومنون: ۱۴) کی تفسیر کے

(۱) سورۂ روم، آیت: ۲۷۔ (۲) تفسیر مظہری، ج: ۶، ص: ۳۶۱۔

سلسلے میں تحقیقی مذاکرہ ہوا ہے، اوران حضرات نے یہ کوشش کی ہے کہ اس آیت کی تفسیر کسی تاویل کے بغیر کی جائے؛ مگرآ یئے غور کریں! وہ حضرات اکابر اپنی کوشش میں کس طرح اور کس درجے میں کام یاب ہوئے؟

ایک مجلس میں حضرت نانوتویؒ اور آپ کے بڑے ذی علم تلامذہ: مولانا محمد یعقوب صاحبؒ (صدر مدرس دارالعلوم)، مولانا سید احمد حسن امروہویؒ، مولانا سید احمد دہلویؒ (مصنف فرہنگ آصفیہ)، مولانا عبدالغنی صاحب پھلاودیؒ جمع تھے۔ مولانا نانوتویؒ نے ان حضرات کومخاطب کر کے فرمایا: قرآن کریم میں ''فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ'' کہا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ خدا کے سوابھی دوسرے خالق ہوسکتے ہیں؟ خدائے تعالیٰ نے اپنے لیے ''احسن'' کی صفت استعمال کی ہے، اور خالق کی جمع خالقین اس کے ساتھ لگائی ہے۔ مفسرین نے اس اشکال کو دور کرنے کے لیے خالقین کو مصورین کے معنی میں لیا ہے۔ یہ تاویل اگرچہ درست ہے؛ لیکن مجھے تاویل پسند نہیں، اس میں بڑی طوالت ہے۔ لہٰذا اس آیت کی ایسی تفسیر بیان کی جائے کہ کسی تاویل کی ضرورت نہ ہو، اور الفاظ اپنے اصلی معنی میں رہیں۔

اپنے استاذ محترم کے جواب میں استاذ کے محبوب ترین شاگرد مولانا سید احمد حسن صاحب امروہویؒ نے فرمایا: موصوف کی دو قسمیں ہیں: ایک موصوف بالذات اور دوسری موصوف بالعرض۔ موصوف بالذات تو خدا تعالیٰ کی ذات حق ہے؛ لیکن موصوف بالعرض دوسری مخلوق بھی ہوسکتی ہے۔

اس آیت میں صفت خالقیت کے ساتھ بالذات موصوف خدا تعالیٰ ہی ہے، اور خالق کی صفت سے متصف بالعرض انسان بھی ثابت ہوتا ہے۔ (یعنی صفت حقیقی اور صفت عارضی ومجازی کا فرق بیان کیا گیا)۔ اس تفسیر پر کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔ قرآنی الفاظ اپنے اصلی مفہوم میں رہتے ہیں۔ جیسے سورۂ یوسف میں کہا گیا: ﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ﴾(۱)۔ ''اور ہر صاحبِ علم کے اوپر ایک علیم ذات موجود ہے''۔

ذی علم سے عارضی علم والے مراد ہیں، اور علیم سے ذاتِ حق مراد ہے۔ یہ توجیہ اپنے مفہوم ومطلب میں واضح ہے۔ راقم نے مولانا کی عبارت کو اپنے الفاظ میں آسان کر کے نقل کیا ہے۔

دوسری توجیہ چوں کہ اس ناچیز کی سمجھ میں نہیں آئی (۲)، کافی غور وخوض کے بعد یہ عاجز ناکام رہا، اس لیے اس توجیہ کو مولانا ہی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے، تاکہ اہل علم غور کر کے اس کا مطلب واضح کریں۔

---

(۱) سورۂ یوسف، آیت: ۷۶۔

(۱) واضح رہے کہ صاحب مضمون حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی کی یہ گفتگو اُس عبارت پر مشتمل ہے، جو مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کی مرتب کردہ کتاب ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ- احوال وآثار وباقیات ومتعلقات'' کے صفحہ ۶۷۸–۶۷۹ پر درج ہے۔ تاہم مولانا قاسمی سے ملاقات وگفتگو کے بعد مولانا راشد کاندھلوی نے اصل ماخذ سے رجوع کر کے ہمیں یہ اطلاع بھجوائی ہے کہ مولانا عبدالغنی پھلاودیؒ کی توجیہی عبارت کا خط کشیدہ جملہ دراصل یوں ہے: ''مخلوق کے اندر جو صفت ہوگی وہ بالعرض ہوگی، بالذات نہیں ہوسکتی''۔ کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کرلی جائے گی۔ بہر حال اس کے بعد وہ اعتراض یا تضاد غالباً رفع ہوجاتا ہے، جس کی شکایت آئندہ سطروں میں مولانا قاسمی نے اپنے زیر نظر مضمون میں کی ہے۔

مولانا (نانوتویؒ) نے فرمایا:

اب رہی یہ بات کہ خالقین کی تفسیر مصورین کے ساتھ کیوں کر ہوسکتی ہے؟ تو اس کی صورت یہ ہے کہ جب کہ کائنات کا وجود "حقیقت ممکن" ہے کہ جو نہ محض وجود ہے، نہ محض عدم ہے؛ بلکہ دونوں سے مرکب ہے، اور وہ تیسری شئ ہے کہ جیسے نور اور سایہ کے درمیان میں ایک خطِ انتزاعی (خط امتیازی) پیدا ہو جاتا ہے کہ جس کو نہ محض وجود کہہ سکتے ہیں، نہ محض عدم کہہ سکتے ہیں؛ بلکہ یہ ایک تیسری شئ ہے کہ جس کو "حقیقت ممکن" کہہ سکتے ہیں۔

پس جب کہ یہ صفت انتزاعی مخلوق کی ثابت ہوگئی، تو مخلوق کے اندر جو صفت ہوگی، وہ بالعرض نہیں ہوسکتی؛ لہٰذا صفت خالقیت بھی بالعرض ہی مخلوق کے اندر ممکن ہوگی۔ اس صورت میں کوئی خلجان باقی نہیں رہتا[۱]۔

واضح رہے کہ اس عبارت کی آخری سطروں میں تضاد نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے منطق کی جو نہایت باریک مثال دی ہے، وہ اہل علم کی وضاحت کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہ عبارت ان افادات کی ہے، جو مولانا عبدالغنی پھلاودیؒ نے ایک مجلس میں اپنے استاذ مولانا نانوتویؒ کے حوالے سے بیان کیے، اور اس میں یہ لکھا کہ مولانا احمد حسن صاحب نے یہ توجیہات اپنے استاذ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے اصول وکلیات کی روشنی میں بیان کیں[۲]۔

اب غور کیجیے کہ مولانا نانوتوی علیہ الرحمہ نے اپنے شاگردوں سے جو خواہش کی تھی ﴿أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ کی وہ تفسیر بیان کی جائے، جس میں تاویل کی ضرورت نہ ہو، اور اس آیت کے الفاظ اپنے اصلی معنی پر قائم رہیں۔ کیا مولانا کی وہ خواہش پوری ہوئی؟ وہ خواہش اس ناچیز کے خیال میں مولانا احمد حسن صاحب امروہویؒ کی تفسیر سے پوری نہیں ہوئی؛ کیوں کہ مولانا نے موصوف بالعرض کی جو صورت بیان کی ہے کہ اس میں انسان خالق کی صفت سے بالعرض موصوف ہوتا ہے، وہ اس تاویل کی صورت میں ہوتا ہے، جب خالق کے لفظ کو صانع کے مفہوم میں لیا جائے اور یہ تاویل ہے۔ خالق کی صفت کو اپنے اصلی اور حقیقی مفہوم میں رکھتے ہوئے انسان کی صفت قرار نہیں دیا جاسکتا، اور حضرت نانوتویؒ اس تاویل کو ناپسند کرتے تھے، جیسا کہ آپ کی تقریر مذکور سے واضح ہوتا ہے۔ خالق کی صفت اگر اپنے اصلی معنی میں رہتی ہے، تو وہ خدا کی صفت کے طور پر رہتی ہے، جو موصوف بالذات ہے۔ عارضی کی صورت میں نہیں رہتی۔

(۱) قاسم العلوم کے احوال وآثار، ص:۶۷۹۔
(۲) ایضاً، ص:۶۷۹۔

مولانا عبدالغنی صاحب پھلاودیؒ نے اس علمی مجلس کی جو رپورٹ دی ہے، اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مولانا نانوتویؒ اپنے شاگرد رشید کی اس تفسیر سے مطمئن ہوئے یا اس پر کچھ کلام فرمایا؟

''اسرار قرآنی'' (فارسی) کے نام سے مولانا علیہ الرحمہ کے چند مختصر کتابچوں کا تذکرہ کیا گیا ہے؛ لیکن ان میں جن تفسیری تحقیقات کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں مذکورہ زیر بحث آیت شامل نہیں ہے[1]۔

بے تاویل تفسیر:

حضرت مولانا نانوتوی علیہ الرحمہ کی پسند کے مطابق اگر اس آیت کی کوئی تفسیر کی جاسکتی ہے، تو وہ اس ناچیز طالب علم کے نزدیک یہ ہے کہ ''احسن'' کو مبالغہ کے مفہوم میں لیا جائے، اور ﴿أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ میں خالق کی جمع خالقین کو آیت کے فاصلہ (قافیہ) کی رعایت پر محمول کیا جائے، اور ہم نے شروع میں تحریر کیا ہے کہ خالقین اور حاکمین وغیرہ کے اسمائے جمع قرآن کریم کے بلیغ ترین اسلوب سے تعلق رکھتے ہیں۔

اہل لغت نے لکھا ہے کہ ''أَفْعَلُ'' کے وزن پر جو کلمات مبالغہ کے معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں، ان میں ایک ''أَحْسَنُ'' کا کلمہ ہے۔ دوسرے اسما یہ ہیں، جو افعل کے وزن پر ہیں، اور ان کا مفہوم اسم تفضیل کا نہیں ہے؛ بلکہ مبالغہ کا ہے: ''أعطی، أتلف، أملق، أخلف'' وغیرہ۔

امام المفسرین شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے ''خَيْرٌ'' (صیغۂ تفضیل) کا ترجمہ دو جگہ مبالغہ کا کیا ہے۔ ایک سورۂ مؤمنون، آیت نمبر: ۷۲:

﴿وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ﴾

''وہ ہے بہتر روزی دینے والا''۔

دوسری سورۂ یوسف، آیت: ۵۹:

﴿وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ﴾

یہ قول حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے بارے میں ہے، جو آپ نے اپنے بھائیوں سے کہا۔ شاہ صاحبؒ ترجمہ کرتے ہیں:

''میں خوب طرح مہمانی کرنے والا ہوں''۔

جب کہ مولانا تھانویؒ نے تفضیل کا ترجمہ اس طرح کیا:

---

(۱) قاسم العلوم...... احوال وآثار، ص: ۱۵۷۔

''میں سب سے زیادہ مہمان نوازی کرتا ہوں''۔

شاہ صاحبؒ نے اسی فقرے (سورۂ مؤمنون:۲۹) میں تفضیل کا ترجمہ کیا، وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں حضرت نوح علیہ السلام کا قول ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قول میں شاہ صاحبؒ نے تفضیل کے ترجمہ کو مناسب نہیں سمجھا؛ کیوں کہ ایک کریم ابن کریم پیغمبر کی زبان پر دوسروں سے مقابلے کے پیرائے میں اپنی برتری کا اظہار ان کی شان کے شایاں نہیں تھا۔ غور کریں! کس قدر باریک بینی کے ساتھ شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ نے کلام الٰہی کا ترجمہ کیا ہے۔

مولانا فراہی کا ترجمہ:

سورۂ تین کی آیت نمبر:۸:

﴿ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ ﴾

کا ترجمہ مولانا فراہیؒ نے یہ کیا ہے:

''کیا خدا سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں''؟ (۱)۔

وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا کے علاوہ بھی دوسرے حاکم موجود ہیں؟ تعجب ہے کہ علامہ فراہیؒ کا ذہن اس آیت کے ترجمہ کے وقت اس طرف نہیں گیا کہ صاحب کلام نے اس آیت کی معنوی بلاغت کے مقابلہ میں لفظی بلاغت کو ترجیح دی، جیسا کہ مولانا نے سورۂ اخلاص کی آیت ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے، اور توحید کے اثبات اور شرک کی تردید پر بڑی جامع بحث کرنے والا ذہن حاکم حقیقی کے ساتھ دوسرے حاکموں کے تصور پر کیوں خاموش ہو گیا ہے؟

ابتلائے عام:

آج کل اس قسم کی آیات کے طغرے عام طور پر بازاروں میں فروخت کیے جا رہے ہیں، اور گھر گھر اور دکان دکان یہ طغرے در و دیوار کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ کئی دفعہ بعض مسلمانوں نے مجھ سے ان طغروں کا مطلب پوچھا، اور یہ اشکال پیش کیا کہ: کیا اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے خالق، دوسرے رازق اور دوسرے حاکم بھی موجود ہیں؟ میں نے ان کو مطمئن کرنے کی یہی صورت آسان سمجھی کہ تفضیل کے صیغوں کا ترجمہ شاہ صاحب کے ترجمے (آیت نمبر ۲۷) کے مطابق ان کے سامنے پیش کیا، اور تفضیل کے صیغوں کے عام تراجم سے ان کی توجہ ہٹا دی (۲)۔

---

(۱) تفسیر فراہی، ص:۳۰۵۔ (۲) بصائر قرآن، حصہ دوم، ص:۵۷-۳۴۹۔

خدمات

علمائے ہند کی شان دار تاریخ کا ایک ورق

بانیٔ دارالعلوم دیوبند
اور
بانی دارالعلوم حرم صولتیہ مکہ معظّمہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی نور اللہ مرقدہٗ

عنوانات:

تنویر احمد شریفی

مسلمانوں کا دورِ ابتلا:

ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے زوال اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقبال کا دور مسلمانوں کے لیے جہاں سیاسی اور دولتی حیثیت سے انتہائی ابتلا اور آزمائش کا تھا، وہیں مذہبی اور علمی حیثیت سے بھی کچھ کم صبر آزما نہ تھا۔ یہ انقلاب محض حکومت کا انقلاب نہ تھا؛ بلکہ حقیقتاً تہذیب وکلچر، مذہب وملت اور دین ومعاشرے کے انقلاب کے جراثیم بھی اپنے دامن میں لے کر آیا تھا۔ ہندوستان کے علمی اداروں کا چراغ گل ہو رہا تھا، اور مسلمانوں پر جہل ونادانی کی بلا مسلط ہوتی چلی جارہی تھی۔ نئی طاقت اسلام کی حامی نہ تھی؛ بلکہ مسیحیت کو اپنے دامنوں میں لے کر آئی تھی۔ پادریوں کے فلک شگاف نعرے اور مناظروں کی مبارزت طلبی کے آوازے فضائے ہند میں گونجنے شروع ہوگئے تھے، اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی جہالت سے فائدہ اٹھا کر مسیحیت کے چراغ میں برابر تیل ڈالا جارہا تھا۔ غرض مسلمانوں کا دین ودنیا، مذہب واقتدار؛ بلکہ حیثیت عرفی تک معرض زوال میں آچکی تھی، اور ضرورت تھی کہ ماضی کے تصورات کو چھوڑ کر مستقبل کی فکر کی جائے؛ اس لیے جہاں ہندوستان کے ریاست پسند طبقے نے مسلمانوں کے رسمی اقتدار کو سنبھالنے کی فکر کی، وہیں علمائے اسلام نے اس بڑھتی ہوئی جہالت اور اس کے زیر سایہ بڑھتی ہوئی مسیحیت اور لادینیت کی روک تھام کی۔

بلائے جہل سے بچانے کے لیے قومی مدارس کا سلسلہ شروع کیا، اور مسیحیت کا طلسم توڑنے کے لیے عیسائیوں کی تحدی اور چیلنجوں کو قبول کر کے باطل شکن مناظروں کا دروازہ کھولا گیا۔ قلمی، لسانی اور قلبی جہاد سے ان کے بڑھتے ہوئے فتنوں کی روک تھام کی گئی، تاکہ بے خبر مسلمانوں کو کذب و باطل کے جال میں پھنسنے سے بچایا جائے، اور اس طرح اسلامی ملت اور شریعت دشمنانِ حق کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہے۔

اس سلسلے میں ہمیں دو عظیم المرتبت شخصیتیں افق ہند پر آفتاب و ماہ تاب کی طرح درخشاں نظر آتی ہیں، جنہوں نے اپنے متماثل اور باہم دیگر متشابہ کارناموں اور ایک دوسرے کے اشبہ طرزِ عمل سے مسلمانانِ ہند کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو سہارا دیا اور پار لگایا۔

ایک: حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، بانیٔ دارالعلوم دیوبند، اور ایک: حضرت مجاہد جلیل مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، بانیٔ دار العلوم حرم صولتیہ، مکۂ معظّمہ (قدس اللہ اسرارہما)۔

ان دونوں بزرگ ہستیوں نے ایک ہی لائن پر کام کیا، ایک ہی نصب العین پیش کیا، ایک ہی قسم کے اصول پر گامزن ہوئے، اور ایک ہی اندازِ فطرت سے مسلمانانِ ہندوستان کی راہ نمائی کی۔

حضرت نانوتویؒ کا سلسلۂ نسب:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (احقر کے جد امجد) ضلع سہارن پور کے ایک قصبہ ''نانوتہ'' میں ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب تقریباً چوالیس واسطوں سے حضرت قاسم ابن محمد ابن ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہم سے جاملتا ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ بلخ سے ہندوستان وارد ہوئے، اور اپنی قابلیت سے شاہ جہانی دربار میں باریاب ہو کر عہدہ و مناصب حاصل کیے، اور قصبۂ نانوتہ کی جاگیر دربار شاہی کی طرف سے مرحمت ہوئی۔

تعلیم و تربیت:

حضرت قاسم العلومؒ نے دہلی کے مشہور شاہی مدرسے (حال موسوم بہ عربک کالج)[1] میں تعلیم پائی۔ فن حدیث محدثِ ہند حضرت شاہ عبدالغنی قدس سرہٗ سے حاصل کیا، اور ولی اللہی خاندان کے روحانی چشم و چراغ بنے، اور آپ کے بزرگوں نے آپ کو ''شاہ اسماعیل شہید ثانی'' کا لقب دیا۔ فنون کی مہارت اپنے عم بزرگ وار مولانا مملوک العلی صاحب نانوتوی قدس سرہٗ سے پیدا کی، جو دہلی کے شاہی مدرسے میں استاذ تھے،

(۱) اب اس جگہ ایک ہسپتال بنا ہے۔ کالج کا نام و نشان نہیں ہے۔ (شریفی)

اور تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کی دولت آفتاب طریقت حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حاجی امداد اللہ صاحب فاروقی تھانوی قدس سرہٗ سے حاصل کی۔

حکمت ولی اللّٰہی کا نقش ثانی:

اور آخر کار علم لدنی میں لسان الغیب ثابت ہوئے۔ غیبی حقائق سے دین کے تمام گوشے واشگاف کیے۔ اصول اسلام مبرہن کیا، اور اپنے مخصوص طرز استدلال سے ایک ''نئے علم کلام'' کی بنیاد ڈالی جو حکمت ولی اللّٰہی کا نقش ثانی ہے۔

علمی اور اخلاقی کارنامے:

ہندوستان میں عیسائیوں، آریوں اور دوسرے مذاہب باطلہ کے جتھوں میں مناظروں، تقریروں اور تصانیف کے ذریعے حق کی منادی کی، اور بالآخر اپنے علم وعمل کو متعدی اور دوامی بنانے کے لیے آپ نے اپنی ایک جامع ترین یادگار جو آج اطراف واکناف عالم کے لیے ایک چشمۂ آب حیواں ہے، یعنی ''دار العلوم دیوبند'' قائم کرکے اپنے علمی وعملی اور اخلاقی کارناموں کو زندۂ جاوید فرما دیا۔

حضرت کیرانویؒ کا سلسلۂ نسب:

ٹھیک اسی طرح حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ ضلع مظفر نگر کے ایک قصبہ ''کیرانہ'' میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی رحمہ اللہ سے ملتا ہوا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔ مولانا مرحوم کے مورث اعلیٰ شیخ عبدالرحمٰنؒ گازرونی غازی تھے، جو سلطان محمودؒ کے فاتح لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے۔ اسی سلسلۂ نسب کی سنہری کڑی نواب مقرب الخاقان (عرف نواب مقرب خاں) ہیں، جو جہانگیر کے زمانے میں امیر البحر تھے۔ نواب صاحب کی دعوت پر خود جہانگیر کیرانہ آیا۔ نواب صاحب کی بہترین یادگار کیرانہ کا ایک عظیم الشان پختہ تالاب ہے۔ کیرانہ میں نواب صاحب کا دربار تھا، اور اس کا محلِ وقوع ''محلّہ دربار'' ہی کے نام سے موسوم ہوگیا۔ مولانا مرحوم نواب صاحب کے خیر الخلف خاندان سے تھے، اور ان کی پیدائش اسی محلۂ دربار میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت اور مشن:

آپ کی اعلیٰ تعلیم دہلی کے شاہی مدرسۂ مذکورہ میں ہوئی۔ آپ کا شمار ہندوستان کے اُن معدودے چند علما میں ہے، جنہوں نے دین وملت کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین ٹھہرالیا تھا۔ مذاہب باطلہ کے رد

میں تقریر، تحریر اور مناظروں سے محیر العقول کارنامے انجام دیے، اور اپنی دینی و ملی خدمات کو دوامی بنانے کے لیے آپ نے مرکز اسلام بلد امین ''مکۂ مکرمہ'' میں ایک دار العلوم بہ نام ''مدرسۂ صولتیہ'' محرم ۱۲۹۲ھ (فروری ۱۸۷۵ء) میں قائم فرمایا، جس کا مقصد باشندگانِ حرم اور بالخصوص ہندی مسلمان مہاجرین کی تعلیم وتربیت تھا، جو بہ طور ان کی یادگار کے آج تک قائم اور رو بہ ترقی ہے۔

بہر حال! ان دونوں بزرگوں کی مجموعی زندگی اور اس کی تاریخ یکسانی لیے ہوئے ہے، جس نے ہندوستان کی ظلمتوں میں روشنی پھیلائی اور کتنے ہی تاریک دلوں کو ایمانی شعاعوں سے منور کیا۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے نتائج:

اس دور میں سب سے اہم ترین مقصد اسلام کی حفاظت اور دین وملت کا تحفظ تھا؛ کیوں کہ ۱۸۵۷ء میں ملت کی شوکت ختم ہو چکی تھی، ساکھ اُٹھ چکی تھی، وسائلِ حیات پر اغیار کا قبضہ ہو چکا تھا، اور مذہب وملت دونوں ہی بے سہارا رہ گئے تھے۔ ایسے وقت میں تحفظ دین ہی سب سے بڑا جہاد اور اس کے ذریعے مسلمانوں کو سنبھال لے جانا ہی سب سے بڑی سیاست تھی۔

شاملی کا میدان جہاد:

اس تحفظ دین کی لائنوں پر ان ہر دو بزرگوں کی چال کلیتاً یکسانی لیے ہوئے اور باہم متماثل اور متشابہ تھی۔ مثلاً ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رست وخیز میں حضرت قاسم العلومؒ اپنی حمیت دینی، غیرت ملی اور تحفظ اسلام کی خاطر اولاً تلوار بہ دست اور سر بہ کف ''شاملی'' کے میدان جہاد میں اترے، جہاد کیا، جوہر شجاعت دکھائے، شاملی کی تحصیل فتح کر لی؛ مگر یہ ہنگامہ مسلمانوں کی شکست اور انگریزوں کی فتح پر منتج ہوا۔

حضرت نانوتویؒ کے وارنٹ گرفتاری:

انگریزی تسلط پر حضرت قاسم العلومؒ کا وارنٹ جاری ہوا۔ اس دور میں مکانوں، مسجدوں اور دیہات میں جہاں جہاں بھی حضرتؒ کا ورود ہوتا رہا، وہیں پولیس محاصرے کرتی پھرتی رہی، اور تلاشیاں لیتی رہی؛ مگر اس انتہائی دوڑ دھوپ کے باوجود بھی حضرتؒ نہ اس کے ہاتھ آئے، نہ گرفتار کیے جا سکے۔

حضرت نانوتویؒ سے سوال: مولوی قاسم کہاں ہیں؟

ایک بار مسجد چھتہ دیوبند میں تھے، مخبر نے خبر دی، مسجد کا محاصرہ پولیس نے کر لیا، خود سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مسجد میں آ کر حضرتؒ ہی سے پوچھا کہ: مولانا محمد قاسم کہاں ہیں؟ حضرتؒ نے ایک قدم پیچھے

ہٹ کر فرمایا کہ: ابھی یہیں تھے، دیکھ لیجیے۔ دیہات میں بھی یہ ہی صورتیں پیش آتی رہیں کہ کپتان پولیس مخبری کے بعد تحقیق کے لیے آتا، تو خود حضرتؒ ہی ان کے سامنے اطمینان سے آتے، گفتگو فرماتے۔ غلط گوئی بھی نہ فرماتے اور اپنا پتہ بھی نہ دیتے۔ یہاں تک کہ امنِ عام کا اعلان ہو گیا۔

مسیحیت کا مقابلہ:

انگریزوں کا اقتدار جم جانے کے بعد جب حضرت والاؒ کو مسیحیت کی بڑھتی ہوئی رو سے اندیشہ ہوا کہ وہ کہیں مسلمانوں کو بہا نہ لے جائے، جب کہ مادی اقتدار بھی اس کی پشت پر ہے، اور شوکت کی نظر فریبیاں بھی اس کی ساتھ ہیں۔ نیز پادری علی الاعلان اسلام کے خلاف زہر بھی اگلنے لگے ہیں، جس سے ناواقف مسلمانوں کے بہک جانے کا خطرہ ہے، تو آپ نے خصوصیت سے ادھر توجہ فرمائی۔ عیسائیوں کے اعتراضات کے سلسلے میں تقریرات کا سلسلہ شروع فرمایا۔

ہندوؤں اور عیسائیوں سے مناظرے:

اور ان کے وسوسوں کو اپنے مضبوط طرزِ استدلال سے پادر ہوا ثابت کیا، بحثیں کیں؛ بلکہ ملک کے تمام مذاہب کے جتھوں ہندو سناتن آریہ وغیرہ کے بھرے مجمع میں اسلام کی منادی کی، اعلان حق کیا اور دنیا پر اتمام حجت کر کے اسلام کی حقانیت عیاں کر دی۔ ''مباحثۂ شاہ جہان پور'' آپ کا مشہور عالم کارنامہ اور علمی شاہ کار ہے، جس میں ذمے دارانِ مذاہب کے روبہ روان پر اتمام حجت فرماتے ہوئے انہیں پیغام الٰہی واضح طریق پر پہنچا دیا۔

پنڈت دیانند سرسوتی بانی مذہب آریہ، پنڈت اندرمل وکیل سناتن دھرم، پادری اسکاٹ اور پادری نولس وکلائے مذہب عیسوی وغیرہ کو اپنے باطل شکن بیانات سے اعتراف شکست پر مجبور کر دیا۔

حقانیت اسلام کا اعتراف:

اور انہیں چاروناچار حقانیت اسلام کا اعتراف کرتے ہوئے یہاں تک بھی اقرار کرنا پڑا کہ اگر دنیا میں کسی شخص کی تقریر پر ایمان لایا جا سکتا ہے، تو وہ مولانا محمد قاسم صاحب ہیں۔ حتی کہ پنڈت دیانند سرسوتی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مُولبی کاسم (مولوی قاسم) ایک بڑا وَدْوان ہی نہی؛ بلکہ اس کے پیٹ میں خدا بولتا ہے۔

حضرت کیرانویؒ کا فنڈر سے مناظرہ:

ٹھیک اسی نہج پر حضرت اقدس مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی علیہ الرحمہ نے جب محسوس کیا کہ

پا پایانِ مسیحیت اسلام کے خلاف اپنی دریدہ دہنی میں حدود سے متجاوز ہونے لگے ہیں، بہادر شاہ کے آخری دور اور مسلمانوں کی اجتماعی مغلوبیت اور پستی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مسیحیوں کا مایۂ ناز پایا۔ یعنی پادری فنڈر جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر روزانہ عصر مغرب کے درمیان ناواقف عوام کے سامنے دین مسیحی کے فضائل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی مزعومہ کمزوریوں کو بڑے دھڑلے کے ساتھ بیان کرتا ہے، تو آپ نے جرأت ایمانی کے ساتھ پہلے تو پادری فنڈر کے علمی موقف کا اندازہ کرنے کے لیے اس سے تحریری مراسلت فرمائی، اور بالآخر بہ ماہ رجب ۱۲۷۰ھ/ اپریل ۱۸۵۴ء (جس کو آج ڈیڑھ صدی ہو چکی ہے) اکبر آباد (آگرہ) میں وہ مشہور عالم مناظرہ کیا، جو مولانا کے ردعیسایت کا ایک شاہ کار اور نمونہ تھا۔

عیسائیت اور اسلامیت:

حتی کہ دین اسلام کی متیقن حقانیت کے سلسلے میں اپنی خداداد علمی قوت اور پادری کے مبطلانہ ضعف پر یقین واطمینان رکھتے ہوئے اس کی یہ شرط بھی مان لی کہ اگر مولانا مرحوم پادری فنڈر کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکے، تو وہ مذہب عیسوی قبول کر لیں گے، اور اگر پادری فنڈر جواب سے عاجز رہ گیا، تو وہ مسلمان ہو جائے گا۔ جلسے کے مقرر شدہ حکم اونچے طبقے کے انگریزی حکام، بااثر مقامی افراد اور ذی علم ہندو مسلمان اشخاص کی ایک جماعت تھی۔ رسالت نبوی کا اثبات، قرآن حکیم کا منزل من اللہ ہونا اور بلا کسی تحریف وتبدیل کے باقی رہنا، ابطال تثلیث اور تحریف انجیل وغیرہ مسائل موضوع بحث ٹھہرے۔ مولانا مرحوم نے دنیا کے تمام پادریوں کو چیلنج کرتے ہوئے پادری فنڈر کو للکارا، اور تین دن مسلسل مناظرے سے ہزار ہا اہل نظر انسانوں کے مجمع میں مسیحیوں کو اتنی کھلی شکست دی کہ مسیحیوں کے اس بڑے باپ کو منہ چھپا کر فرار کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔ بھرا مجمع موجود، حکم موجود، سامعین منتظر؛ مگر پادری فنڈر غائب تھا۔ مولانا نے مستند دستاویزی ثبوت سے عیاں کر دیا کہ یہ انجیل نہ اصل انجیل ہے، اور نہ اصل کے مطابق نقل ہی ہے۔ اس میں پادریوں کی خیانتیں اور وقتی ضرورتوں، نیز ملکی وتمدنی تقاضوں سے انجیل میں ترمیمات اور کمی بیشی کے سارے پول اس انداز سے کھول کر رکھ دیے کہ پادریوں کو منہ دکھانے کی جگہ نہ رہی، اور پادری فنڈر کو ''تا بہ دروازہ باید رسانید'' کی مثل کے مطابق دروازے تک ہی نہیں؛ بلکہ اس کے گھر تک پہنچا کے چھوڑا۔ وہ روپوش ہو کر فرار ہوا، تو سیدھا لندن جا کر ٹھہرا۔

جہاد شاملی میں شرکت:

آگرہ میں اس مناظرہ کے بعد ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ رست خیز برپا ہو گیا۔ مولانا مرحوم انگریزوں کے

سخت مخالف تھے، اور شاملی کے میدان میں مجاہدین کی جماعت میں صف آرا تھے۔ ان کے محلۂ دربار میں ہندو مسلمان پناہ لیتے تھے، اور امن کے ساتھ انہیں چھپا کر رکھا جاتا تھا؛ کیوں کہ ہندو مسلم اتفاق اخلاص کی سطح پر قائم تھا۔

حضرت کیرانویؒ کے وارنٹ گرفتاری اور اپنوں کی خیانت:

انگریزوں کا تسلط ہو جانے کے بعد مولانا کا وارنٹ جاری ہوا؛ مگر پولیس تلاش کے باوجود ناکام رہی۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں ہی میں سے بعض خود غرض اور کوتاہ اندیش افراد نے مولانا کے بارے میں مخبری کی کہ وہ دربار کی مسجد میں نماز پڑھنے آئے ہیں۔ پولیس پہنچی، محاصرہ کیا؛ لیکن مولانا مرحوم کو موقع مل گیا، اور وہ مسجد کے ایک حجرہ سے نکل کر، جس کا دروازہ محلے کے ایک مکان میں تھا، اور اُدھر اس سے جنگل ملا ہوا تھا، پنجیٹھ ایک گاؤں میں چلے گئے، جو کیرانہ سے ایک کوس کے فاصلے پر واقع ہے، اور جس میں کیرانہ کے عثمانی اور انصاری شیوخ کی زمین داری ہے۔ مولانا اپنے ایک کاشت کار کے یہاں مقیم تھے کہ اسی خائن مخبر نے (جو اپنوں ہی میں سے تھے) اس کی بھی مخبری کر دی۔ پولیس نے گاؤں پہنچ کر اس کاشت کار کے مکان کا محاصرہ کر لیا اور تلاشی لی، وہ کاشت کار گاؤں کا مکھیا بھی تھا، اس کو جب فوج کی آمد کا علم ہوا، تو اس نے حضرت مولانا مرحوم سے فرمایا کہ: کھرپا لے کر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں۔ گورا فوج اسی کھیت کی ایک پگ ڈنڈی سے گزری۔ حضرت مولانا مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ: میں گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں، وہ میرے جسم پر لگ رہی تھیں، اور میں ان کو اپنے پاس سے گزرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

پولیس نے پہچانا اور جہاز جدہ روانہ ہو گیا:

آخر مولانا مرحوم بچتے بچاتے سورت کی بندرگاہ تک پہنچ گئے اور ایک بادبانی جہاز میں کسی نہ کسی طرح سوار ہو گئے؛ مگر ایک پولیس انسپکٹر نے مولانا کو پہچان لیا، اور فوٹو سے چہرے کی مطابقت کر کے فوٹو اور وارنٹ دکھلایا، اور کہا کہ: مجھے آپ کی گرفتاری کا حکم ہے؛ مگر میں مسلمان ہوں۔ یہ لفظ اس کی زبان سے نکلا ہی تھا کہ جہاز نے لنگر اٹھا دیا اور جدہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ مولانا کی زبان پر اس وقت یہ شعر تھا:

نظر بچا کے بتوں کی چلا ہوں کعبہ کو
خدا کے ہاتھ ہے اب شرم وآبرو میری

پادری فنڈر اپنے عہدے سے معزول:

پادری فنڈر ہندوستان سے فرار ہونے کے بعد لندن پہنچا؛ مگر اس الزام میں کہ اس نے دین عیسوی کی

اشاعت میں سیاسی قوت سے کام لیا ہے، اپنے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ وہ یہاں سے معزول ہونے کے بعد قسطنطنیہ پہنچا۔ سلطان عبدالعزیز کا عہد تھا۔ ٹرکی اور انگلستان کے تعلقات خوش گوار تھے۔

فنڈر کی سلطان عبدالعزیز سے ملاقات:

پادری فنڈر نے بارگاہ سلطانی میں باریاب ہو کر عرض کیا کہ: ہندوستان میں میرا ایک مسلمان عالم سے مذہبی مناظرہ ہوا، جس میں عیسائیت کو فتح اور اسلام کو شکست ہوئی؛ مگر چوں کہ انگریزوں کا حال ہی میں ہندوستان پر قبضہ ہوا ہے، اور انہیں اپنی سیاسی مصالح کے ماتحت مسلمانوں کی تالیفِ قلوب منظور تھی، اس لیے مجھ پر عتاب ہوا، اور میں اپنے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ سلطان کی عنایت اگر میرے شاملِ حال ہو جائے، اور وہ انگریزوں سے میری سفارش فرما دیں، تو لندن کے چرچ میں پھر مجھے میرا مذہبی عہدہ مل سکتا ہے۔

سلطان کا معاملات کی آ گاہی کے لیے شریف مکہ سے رابطہ:

سلطان عبدالعزیز کو چوں کہ مذہبی معاملات سے دل چسپی تھی؛ اس لیے ان کی خواہش ہوئی کہ پادری کے اس بیان کی تحقیق کی جائے۔ چناں چہ شریفِ مکہ کے نام فرمان جاری فرمایا کہ: اس سال موسم حج میں جو ہندوستانی علما اور باخبر حجاج مل سکیں، ان سے اس مناظرے کی کیفیت معلوم کر کے اطلاع دی جائے۔ شریفِ مکہ امیر عبداللہ مرحوم کو اس مناظرے کی پوری کیفیت معلوم ہو چکی تھی، اور اس لیے وہ مولانا مرحوم پر بہت عنایت مبذول کرتے تھے۔ اس فرمان کے صادر ہوتے ہی شریف مکہ نے فوراً بارگاہِ خلافت میں مناظرے کی مختصر کیفیت کے ساتھ یہ بھی اطلاع دی کہ وہ عالم جس سے ہندوستان میں پادری فنڈر کا مناظرہ ہوا ہے، مکۂ معظّمہ میں موجود ہیں۔

حضرت مولانا کیرانویؒ کی قسطنطنیہ طلبی:

اس پر سلطان نے مناظرے کی مفصل کیفیت بیان کرنے اور ہندوستان میں جدید حکومت اور انقلاب کے چشم دید واقعات کا براہِ راست علم حاصل کرنے کی غرض سے مولانا مرحوم کو قسطنطنیہ طلب کر لیا۔ مولانا مرحوم خاص اعزاز کے ساتھ سرکاری طور پر قسطنطنیہ تشریف لے گئے، اور شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرائے گئے۔ سلطان معظم شاہانہ عنایت کے ساتھ عموماً نماز عشا (میں) مولانا کو شرف باریابی بخشتے تھے۔ ان کے علمی کمالات اور بیان واقعات سے مستفید ہوتے۔ اس خاص وقت اکثر خیر الدین پاشا، صدر اعظم ٹرکی اور شیخ

الاسلام وغیرہ اکابر ملک شریک صحبت رہتے تھے۔

فنڈر مولانا کی آمد کاسن کرفرار:

فنڈر کو جب مولانا کی آمد کی اطلاع ہوئی، تو قسطنطنیہ سے قبل از شکست ہی فرار ہوگیا، اور خاموشی سے راتوں رات غائب ہوا کہ شاید پھر عمر بھر بھی اس نے یورپ کی کسی کھڑکی سے مسلم یورپ اور اسلامی ایشیا کی طرف جھانکنے کی جرأت نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ ''رحمت اللہ'' کے بعد ''عدو اللہ'' کی پیش ہی کیا چل سکتی تھی؟ جوں ہی موسیٰ آیا، اور عصا ڈالا، تو فرعون کا پتہ نہ رہا، اور اسے ڈوبتے ہی بن پڑی۔

سلطان کی مناظرہ کے حالات سے آگاہی:

سلطان نے مولانا کی زبان فیض ترجمان سے مناظرے کے حالات نہایت دل چسپی سے سنے، اور نتیجے سے بہت خوش ہوئے، اور مولانا کو واپسی کے وقت خلعتِ فاخرہ کے ساتھ ''پایۂ حرمین شریفین'' کے بلند پایہ خطاب، تمغۂ مجیدی درجۂ دوم اور گراں قدر مالی وظیفے سے سرفراز فرمایا۔

حضرت نانوتویؒ سے مناظرے میں پادریوں کی شکست:

بہر حال! وہاں حضرت قاسم العلومؒ نے پادری نولس اور اسکاٹ کو شکست فاش دے کر فرار پر مجبور کر دیا، اور حسب بیان ثقات پادری میدان مباحثہ سے کرسیاں چھوڑ چھوڑ کر بھاگے، اور زبان سے اعتراف شکست کرتے ہوئے فرار ہوئے، اور یہاں مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے پادری فنڈر کو شکستِ فاش دے کر بہ یک بنی و دو گوش فرار پر مجبور کر دیا، جو ہندوستان تک چھوڑ کر بھاگا اور گھر سے ورے اسے پناہ نہ ملی۔

دونوں حضرات کے کام ایک؛ مگر تھوڑا سا فرق:

فرق اتنا ہے کہ وہاں جہاد پہلے ہوا، اور مناظرہ بعد میں، اور یہاں مناظرہ پہلے ہوا، اور جہاد بعد میں۔ جہاد میں دونوں حضرات مجتمع رہے اور مناظروں میں فصل رہا۔ پھر بعد جہاد و تسلط انگریز وہاں بھی وارنٹوں کے باوجود گورنمنٹ ان کی گرفتاری پر قدرت نہ پا سکی، اور یہاں بھی وارنٹ کے ہوتے ہوئے حکومت کی بے بسی نمایاں رہی، اور یہ ان دونوں بزرگ واروں کے حال پر اللہ کا فضل تھا، جن سے اسے آئندہ کام لینا تھا۔

قلمی جہاد اور حضرت نانوتویؒ:

اس لسانی اور سنانی جہاد کے بعد قلمی جہاد کی نوبت آئی، تو اُدھر حضرت قاسم العلومؒ نے ردِّ عیسائیت پر جامع ترین بیانات اپنے رسائل و مکاتیب میں زیب قلم فرما کر آنے والوں کے لیے اپنے مخصوص علم کا نادر روز

گارذخیرہ بہ طورترکہ میراث چھوڑا، اوراپنی معرکۃ الآراتحریرات ''حجۃ الاسلام''، ''تقریردل پذیر''، ''گفتگوئے مذہبی''، ''مباحثۂ شاہ جہاں پور'' اور ''اسرار الطہارۃ'' وغیرہ میں ردعیسائیت اوررد مذاہب باطلہ کے وہ وہ محکم و مضبوط اورعقلی اصول تحریرفرمائے کہ ان کی موجودگی میں عیسائیت وغیرہ کے لیے حجت کے ساتھ پنپنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ نیز اسلامی اصول وکلیات کا ایسے فلسفیانہ اور عارفانہ انداز اور ایسے سائنٹفک طریقوں سے اثبات فرمایا کہ ایک کٹر سے کٹر ملحد اور دہریے کوبھی ماننے کے سوا چارۂ کار باقی نہ رہے۔

حضرت کیرانویؒ کی کتاب ''اظہارالحق'':

اور ادھراسی طرح حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے دورانِ قیام قسطنطنیہ میں سلطان ٹرکی کے ارشاد وایما اور صدر اعظم کی خواہش پر مناظرے کے واقعات اور پادریوں کے تمام ان اعتراضات کے متعلق، جووہ اسلام پرکرتے ہیں، ایک نہایت ہی مبسوط کتاب بہ نام ''اظہارالحق'' عربی میں مرتب کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کی، جس میں تاریخی اور دستاویزی ثبوت سے انجیل کی تحریفات کا پردہ چاک کیا۔ عقلی اور نقلی دلائل سے موجودہ عیسائیت کی دھجیاں بکھیر دیں، اور اسلامی دنیا کوصدی بھر کے لیے عیسائی دسیسہ کاریوں سے مطمئن فرمادیا۔ یہ کتاب ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں قسطنطنیہ میں چھپی۔ پھرصدرِاعظم کے حکم سے بعض ترکی علما نے اس کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا۔ جو ''ابرازالحق'' کے نام سے وہاں شائع ہوا۔ نیز حکومتِ عثمانیہ ہی کی طرف سے یورپ کی متعدد زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے شائع کیے گئے (۱)، جن کو پادریوں نے خاص اہتمام سے تلف کرنے کی سعی کی؛ مگر اطفائے نورحق کے ارادے ناکام رہے، اور اتمامِ نورحق ہوکررہا۔ ﴿وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ﴾.

متعدد منصف مزاج عیسائیوں اور انگریزوں نے اس سے متاثر ہوکر دامنِ اسلام میں پناہ لی، اور یہ کتاب کفار کے علی الرغم زبانوں کے مختلف پیرایوں اورلباسوں میں جلوہ گر ہوتی رہی، اورایشیا اور یورپ کے بڑے بڑے ممالک نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ٹرکی اور یورپ سے یہ کتاب مصر میں پہنچی، اوروہاں متعدد بار طبع اورشائع ہوئی۔ ہندوستان میں مولوی غلام محمد بھانجارانديری نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے گجراتی زبان میں اس کا ترجمہ کیا، جوصوبۂ گجرات میں شائع ہوا، اوروہاں کی ہدایت کا باعث ہوا۔

ٹائمز آف لندن کا تبصرہ:

آج سے اکہتر سال قبل (۲) جب ''اظہارالحق'' کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا، تو ٹائمز آف لندن نے اس پرتبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

---

(۱) اس کا اردو ترجمہ پاکستان کے مایہ ناز عالم مولانا جسٹس محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہٗ نے ''بائبل سے قرآن تک'' کے نام سے کیا ہے، جوتین جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ (شریفی)

(۲) زیرنظر نمبر کی اشاعت کے وقت ایک سوپینتیس سال کا عرصہ ہوگیا ہے۔ (شریفی ۲۰۱۵ء)

''لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے، تو دنیا میں مذہب عیسوی کی ترقی کے لیے میدان باقی نہیں رہے گا''۔

نواب اسماعیل خاں صاحب مرحوم، رئیس وتاؤلی ضلع علی گڑھ نے ٹائمز آف لندن کا یہ تبصرہ مکۂ معظّمہ میں مولانا مرحوم کی خدمت میں خاص اہتمام سے پیش فرمایا تھا۔

دیگر تصانیف:

اس کے علاوہ مولانا نے نو کتابیں اور تصنیف فرمائیں:

(۱) ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء ''اِزَالَۃُ الْأَوْھَامِ'' (فارسی) جو نصاریٰ کے رد میں ہے، جس کا ایک نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۲) اسی سن میں دوسری کتاب ''اِزَالَۃُ الشُّکُوْکِ'' (اردو) دو جلدوں میں تحریر فرمائی، جس کی پہلی جلد مولانا مرحوم کے شاگرد رشید مولانا عبدالوہاب صاحبؒ بانی مدرسۂ باقیات الصالحات مدراس نے طبع کرائی، اور دوسری جلد جناب مہتمم صاحب مدرسہ موصوف نے چھپوائی۔

(۳) تیسری کتاب ''اعجاز عیسوی'' تصنیف فرمائی، جس میں بائبل کا مکمل طور پر محرف ہونا ثابت فرمایا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار آگرہ میں اور دوسری بار مطبع رضوی دہلی میں طبع ہوئی ہے۔

(۴) چوتھی کتاب ''أَصَحُّ الْأَحَادِیْثِ فِي اِبْطَالِ التَّثْلِیْثِ'' ہے، جس میں دلائل عقلیہ ونقلیہ سے تثلیث کو باطل محض کر کے چھوڑا ہے۔ مطبع رضوی دہلی میں صرف ایک بار طبع ہوئی ہے۔

(۵) پانچویں کتاب ''بُرُوْقٌ لَامِعَۃٌ'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے اثبات میں ہے، جو ہنوز طبع نہیں ہوئی۔

(۶) چھٹی کتاب ''اَلْبَحْثُ الشَّرِیْفُ فِي اِثْبَاتِ التَّنْسِیْخِ وَالتَّحْرِیْفِ'' ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں لکھی گئی، جس میں تحریف انجیل پر محققانہ بحث کی گئی ہے، اور فخر المطابع دہلی میں طبع ہوئی ہے۔

(۷) ساتویں کتاب ''معدل اعوجاج المیزان'' ہے، جو پادری فنڈر کی تالیف میزان الحق کا محققانہ جواب ہے۔ چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

(۸) آٹھویں کتاب ''تقلیب المطاعن'' ہے، جو پادری لاسمند کی کتاب ''تحقیق دین حق'' کا محققانہ رد ہے۔ چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

(۹) نویں کتاب "معیار التحقیق" ہے، جو پادری صفدر علی کی تالیف "تحقیق الایمان" کا دندان شکن جواب ہے۔ چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

(۱۰) اور دسویں کتاب یہ "اظہار الحق" مذکور ہے، جو رد نصاریٰ میں ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ ﴿تِلْکَ عَشَرَةٌ کَامِلَةٌ!﴾

قاسم ورحمت کے کارناموں میں یکسانیت ہے:

بہر حال! ان دونوں اکابر قاسم ورحمت کے اس کارنامے وتحفظ دینِ حق ورد مذاہب باطلہ میں بھی کلیتاً یکسانی پائی ہے۔ ایک قاسم علم ومعرفت ہیں، جن کے علوم وکمالات نے مشرق ومغرب کو رنگ دیا اور صبغۃ اللہ سے مشرق ومغرب تک کے لوگ منصبغ ہو گئے، جس سے ﴿إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ﴾ کا ظہور ہوا، اور دوسرے رحمتِ باری ہیں، جو اہل عرب اور اہل عجم پر بارش بن کر برسے اور دلوں کی جلی ہوئی کھیتیوں کو سیراب کر دیا، جس سے ﴿فَانْظُرْ إِلٰى آثَارِ رَحْمَةِ اللهِ كَيْفَ يُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ کا ظہور ہوا۔ گویا دونوں ہی آسمانی برکات کے نزول وظہور کی آیت اور نشانی ثابت ہوئے۔

مسلمانوں کی خدمت اور تعلیمی مراکز کا قیام:

اس رد مذاہب باطلہ اور عیسائیت کی مغربی آندھیوں سے قلعۂ اسلام کو محفوظ کر دینے کے بعد ان دونوں بزرگواروں کے دلوں میں من جانب اللہ پھر یہ داعیہ ابھرا کہ مثبت پہلو میں مسلمانوں کے اصل ایمان کو محفوظ رکھ کر اس کی ترقی کے لیے اور ساتھ ہی اس نور ایمانی کے متعدی اور دوررس بنانے کے لیے ایسے تعلیمی مرکز قائم کیے جائیں، جن کا موضوع اسلامی مقاصد کی تکمیل، مسلمانانِ ایشیا اور خصوصاً مسلمانان ہند کی علمی وعملی تربیت، اور ان کا اخلاقی نشو ونما ہو، اور ان میں ایسے سرفروش مجاہد افراد پیدا کیے جائیں، جو قلم وزبان اور لسان وجنان سے اسلام کے سچے خادم، اور اس کے جاں باز سپاہی ثابت ہوں، تاکہ وہ قلبی دولت جوان بزرگواروں کے قلوب کو من جانب اللہ عطا ہوئی ہے، ان کے ان سچے جانشینوں اور وارثوں تک منتقل ہو سکے، اور اس کا سلسلہ رہتی دنیا تک قائم رہے۔

دار العلوم دیوبند:

چناں چہ اس جذبہ کے ماتحت حضرت قاسم العلومؒ نے تو دیوبند (ضلع سہارن پور- یو. پی) میں ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں ایک دار العلوم کی بنیاد ڈالی، جس میں دیوبند کے محلۂ دیوان کے چند باخیر متمول

شیوخ نے اپنی زمینیں مدرسے کے لیے عطا کی۔ پھر مقامی اور بیرونی اہل خیر کے عطایا شامل ہوئے، اور رفتہ رفتہ مدرسے کے لیے عمارات کا سلسلہ شروع ہوا، اور اس طرح اس دار العلوم کی بنیاد پڑی، جو بعد میں دنیائے اسلام کا مذہبی مرکز اور طالبانِ علم نبوت کا مرجع بنا۔ جس سے علم واخلاق کی نہریں اطرافِ عالم میں بہہ نکلیں، اور آج تقریباً ڈیڑھ ہزار طلبہ (اب تقریباً چار ہزار، اور اسی طرح ہر شعبہ میں کثیر اضافے)، دوسو اہل کارانِ دفاتر اور چالیس اساتذہ پر مشتمل ایک جامعہ کی حیثیت میں قائم ہے، اور بیس شعبوں پر اپنے نظم کو منقسم کیے ہوئے ہے(۱)۔ ہند وبیرونِ ہند، افغانستان، پاکستان، ترکستان، انڈونیشیا، ایران، حجاز وغیرہ کے طلبائے دین کو اپنی نورانی شعاعوں سے منور کر رہا ہے، اور جس میں علمی ودینی تکمیل کے علاوہ معاشی ضروریات کی تکمیل کا مقصد بھی صنعت وحرفت کے ایک مستقل محکمے کی صورت سے پورا کیا جا رہا ہے۔

دار العلوم حرم صولتیہ:

ٹھیک اسی جذبے کے ماتحت جب کہ ہندوستان کے تاریخی انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد تنصر ونصرانیت کے آثار سے بچنے اور بچانے کے لیے ہندوستان کی ایک مقدس جماعت نے حجاز کی طرف رخ کیا، تو انہیں میں مولانا رحمت اللہ صاحبؒ بھی مہاجر کی حیثیت سے مکۂ معظّمہ حاضر ہوئے، اور مرکز اسلام مکۂ معظّمہ میں ایک دینی دار العلوم کی بنیاد ڈالی۔

دار العلوم کے لیے سب سے پہلا مسئلہ زمین کا تھا، سو ارضِ مقدس میں زمین مل جانے کا مسئلہ عجب انداز سے خداساز طریقہ پر حل ہوا۔ حرم شریف میں تعمیری مرمت کی ضرورت پیش آئی۔ اس میں کام کرنے کے لیے تقریباً سولہ مقدس علما منتخب کیے گئے، جن میں مولانا رحمت اللہ صاحبؒ بھی شامل تھے۔ مولانا کی یہ خصوصیت رہی کہ آپ اس مدت مرمت میں صائم بھی رہے اور محرم بھی، اور بہ حالت احرام وصیام اس مقدس مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ ختم تعمیر پر سلطان کی طرف سے ان تمام علما کو خلعت عطا کیے گئے؛ مگر مولانا نے مدرسۂ صولتیہ کے پاک منصوبے کے پیش نظر بجائے خلعت کے مدرسے کے لیے زمین طلب کی اور ذاتی منافع پر اس دینی منفعت عام کو ترجیح دی۔ حکومت نے بھی بہ رضا ورغبت اس پاک خواہش کا احترام کرتے ہوئے مدرسے کے لیے مطلوبہ زمین عطا کردی، اور اس طرح مولانا کے حسن نیت، عزم صادق اور ایثار کے طفیل من جانب اللہ زمینِ مدرسہ کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس کے بعد مصارف تعمیر کا اہم سوال تھا، تو وہ بھی مولانا ہی کے پاک جذبے سے حل ہوا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ مولانا کی حسنِ نیت اور اخلاص کی برکت سے

---

(۱) یہ اعداد وشمار اس وقت کے ہیں، جس وقت یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ اب یہ اعداد وشمار کئی گنا بڑھ چکے ہیں۔ (شریفی)

۱۲۹۱ھ/۷۵-۱۸۷۴ء میں کلکتہ کی ایک متموّل بیوہ ''صولت النساء بیگم'' اپنے داماد اور بھائی کی معیت میں بہ ارادۂ حج مکۂ مکرمہ حاضر ہوئیں، اور کسی ذریعہ سے مولانا کے حالات اور ان کے افادی جذبات سے مطلع ہو کر مولانا سے ملیں، اور مکان مدرسہ کی تعمیر کے لیے مبلغ تیس ہزار روپے کا عطیہ بہ عجز و نیاز پیش کیا، جس سے اس دار العلوم کی قدیم عمارت تیار ہوئی، اور مدرسے نے اپنے پاکیزہ مقصد باشندگانِ حرم (مہاجر ہوں یا غیر مہاجر) کی اولاد کی دینی تعلیم کی عملی تکمیل شروع کر دی۔ اسی دین دار خاتون کے نام نامی پر مدرسے کا نام ''مدرسۂ صولتیہ'' رکھا گیا۔ ساتھ ہی طلبا کی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے شریف پیشے اور صنعت و حرفت کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری کیا، جو بحمد اللہ حسن اسلوب سے قائم ہے۔ بعد میں مختلف شان دار عمارتیں بڑھتی رہیں۔ ایک خوش نما مسجد ہندی طرزِ تعمیر پر تیار ہوئی۔ دار الحدیث کا خوش نما ہال تیار ہوا، جو دیدہ زیب اور قابل دید ہے۔ عملے میں اضافہ ہوا، اور مدرسے کے کاروبار بانی کے حسن نیت کے اثر سے روبہ ترقی رہے اور ہیں[1]۔

دار العلوم حرم کا فیض دیوبند میں:

اسی ضمن میں یہ عرض کرنا بھی دل چسپی اور افادے سے خالی نہ ہوگا کہ دار العلوم حرم صولتیہ مکۂ مکرمہ کا ایک اساسی فیض دار العلوم دیوبند کو بھی پہنچا، اور وہ یہ کہ قاری عبد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ جو کیرانہ کے متصل ہی کسی گاؤں کے رہنے والے تھے، اور مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کے گویا ہم وطن تھے، مکہ ہی کے قیام میں ایک اعلیٰ ترین قاری و مجود ہو چکے تھے۔ انہیں مولانا مرحوم نے صولتیہ میں مجودِ دار العلوم مقرر کیا، جن سے مکی اور خصوصاً ہندی طلبا بہت زیادہ فیض یاب ہوئے، اور ان ہی ہندی فیض یافتوں کے ذریعہ ہندوستان میں فن تجوید کی اشاعت ہوئی۔ چناں چہ قاری عبد اللہ صاحبؒ کے اعلیٰ ترین شاگرد حضرت قاری عبد الرحمٰن صاحب الہ آبادیؒ نے الہ آباد میں تجوید قرآن کی تعلیم اور مشق قرأت کا سلسلہ شروع فرمایا، اور سیکڑوں افراد ان کے فیض سے بہترین مجود بنے۔ جنھوں نے ہندوستان میں اس فن کو رواج دیا، انہیں میں مولانا قاری عبد الوحید خاں صاحب الہ آبادیؒ بھی تھے، جو قاری عبد الرحمٰن صاحبؒ کے تلمیذ رشید تھے، اور دار العلوم دیوبند میں بہ حیثیت صدر القراء بلائے گئے، جن کے ماتحت یہاں فن تجوید و قرأت کا ایک مستقل شعبہ کھولا گیا۔

---

(۱) حضرت کیرانویؒ نے جس جگہ (حارۃ الباب میں) یہ مدرسہ قائم فرمایا تھا، اب اس جگہ یہ مدرسہ نہیں ہے۔ ۲۰۰۹ء میں حرم محترم کی توسیع کے نام پر یہ جگہ حکومت نے لے لی، اور اس کی رقم اہل مدرسہ کو دے دی۔ اس سے مدرسے کی جگہ حرم محترم سے پانچ کلومیٹر دور ''کعکیہ'' میں لی گئی ہے، اور اب بحمد اللہ! اسی طرح تعلیمی سلسلہ جاری ہے۔ مدرسے کی قدیم جگہ پر (جس میں مدرسے کی مسجد بھی تھی) بڑے بڑے ہوٹل بن گئے ہیں۔ سعودی حکومت ویسے تو اپنے کو اسلامی کہتی ہے؛ لیکن مساجد کی ان کے ہاں اہمیت نہیں ہے۔ انہیں توڑ کر یہود و ہنود کے ہوٹل بھی تعمیر کرا دیتے ہیں۔ العیاذ باللہ! (شریفی)

یہ عجیب لطیفہ ہے کہ اس شعبے کا ظاہری محرک احقر راقم الحروف کی مکتب نشینی کا سلسلہ ہوا۔ میرے مکتب میں بٹھلائے جانے کے سوال پر والد مرحوم اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مشورے سے طے پایا کہ مجھے ابتدا ہی سے کسی قاری سے قرآن شریف کی تعلیم دلائی جائے، تا کہ قرأت وتلاوت اور ادائیگی ابتدا ہی سے صحیح رہے۔ شدہ شدہ یہ منصوبہ اس روپ میں آ گیا کہ کیوں نہ دار العلوم ہی میں ایک شعبۂ تجوید قائم کر دیا جائے؟ جس میں یہ بھی پڑھے اور دوسرے طلبہ کے لیے بھی تجوید وقرأت میسر آ جائے۔ بالآخر یہی طے ہوا کہ شخصی تعلیم کے لیے قاری بلوانے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ دار العلوم ہی میں تجوید کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ آخر کار اسی نصب العین نے عملی جامہ پہنا اور جناب مولانا قاری عبد الوحید خاں صاحبؒ، تلمیذ مولانا قاری عبد الرحمٰن صاحبؒ، تلمیذ مولانا قاری عبد اللہ مہاجر مکیؒ (مجود مدرسۂ صولتیہ) دار العلوم دیو بند میں بلا لیے گئے، اور ان کا یا دار العلوم دیو بند کے شعبۂ تجوید کا سب سے پہلا شاگرد، جس نے الف با سے تجوید شروع کی یہی راقم الحروف ہوا۔ اس بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے دار العلوم میں رہ کر بھی شرف تلمذ کی پہلی نسبت دار العلوم حرم صولتیہ مکۂ مکرمہ سے حاصل ہے۔ یا بہ الفاظ دیگر میں ابتدائے مکتب نشینی ہی میں بہ یک وقت دار العلوم دیو بند کا بھی تلمیذ تھا، اور دار العلوم حرم صولتیہ کا بھی۔ (وَكَفٰى بِيْ فَخْرًا)

آج بحمد اللہ! یہ دار العلوم حرم صولتیہ پوری آب وتاب سے تعلیم دین کا کام کر رہا ہے۔ تقریباً پانچ چھ سو کے درمیان طلبا ہیں (۱)۔ کثیر انتظامی عملہ ہے، اور اساتذہ کا ایک بڑا عدد مصروف تعلیم ہے۔ آج مولانا الشیخ محمد سلیم اس کے ذمے دار ناظم اور رئیس عمومی ہیں، جن کی سرپرستی اور ذمے داری میں دار العلوم صولتیہ ترقی کر رہا ہے۔ ممدوح حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کے برادر اکبر کی اولاد کے سلسلے میں ہیں، اور ان کے خلفِ صالح ہیں؛ کیوں کہ مولانا کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ بہر حال! تاسیسِ ادارت کے سلسلے میں ان دونوں بزرگوں حضرت قاسم العلومؒ اور مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کے کاموں میں یک سانی پائی جاتی ہے۔

دونوں بزرگوں کا ایک بنیادی اصول:
''حکومت وقت سے امداد نہ لی جائے'':

پھر ان دونوں درس گاہوں کے اصول اساسی بھی اتنے یک ساں اور اس قدر باہم متشابہ ہیں کہ ان دونوں بزرگوں کے منور دماغوں کی یک سانی، اور ان کے ایک ہی مشکاۃِ نور سے ماخوذ ہونے کی کھلی دلیل ہیں۔ مثلاً ان دونوں دار العلوموں کے بارے میں ان دونوں بزرگوں کا بنیادی اصول یہ تھا کہ حکومت وقت سے کبھی امداد نہ لی جائے؛ بلکہ حکومتوں سے مستغنی بن کر عام مسلمانوں کے چندوں اور عطیات سے ان قومی

مرکزوں کا کام چلایا جائے۔ چناں چہ حضرت قاسم العلومؒ نے بنائے دار العلوم کے جو آٹھ اساسی اصول اپنے قلم مبارک سے لکھے ہیں، ان میں سے اہم ترین اصول یہی ہے کہ اس مدرسے میں حکومت کی امداد کبھی نہ لی جائے۔ اسی اصول کے ماتحت آج تک دار العلوم دیوبند نے کبھی بھی حکومت سے نہ امداد کی درخواست کی، اور نہ بلا درخواست ہی جب کبھی حکومت نے خود امداد دینے کی خواہش کی، تو اسے کبھی قبول ہی کیا؛ بلکہ شکریے کے ساتھ ہمیشہ اصول کا حوالہ دے کر معذرت کر دی۔

سر جیمس مسٹن کی پیش کش:

چناں چہ حضرت والد صاحب مرحوم کے زمانۂ اہتمام میں "سر جیمس مسٹن" گورنر یو. پی نے تقریبا ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں دار العلوم دیوبند کے معائنہ کے وقت اپنی اسپیچ میں کہا کہ:

"اگر دار العلوم میری گورنمنٹ کی امداد کی پیش کش قبول کرے، تو میں اسے جاری کرنا اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا"۔

لیکن ایڈریس میں پہلے ہی اس سے معذرت کر دی گئی تھی۔

نواب سر احمد سعید خاں کی خواہش اور اصول قاسمی:

خود احقر کے ابتدائی زمانۂ اہتمام، یعنی ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء میں نواب سر احمد سعید خاں صاحب گورنر وقت صوبۂ یو. پی دار العلوم میں تشریف لائے، اور احقر سے بہ حیثیت مہتمم دار العلوم موقت اور دوامی امداد اور بھاری امداد دینے کی از خود تحریک فرمائی؛ لیکن اسی اساسی اصول کا حوالہ دے کر شکریہ کے ساتھ معذرت کر دی گئی۔ حال آں کہ ان کی ذات گرامی؛ بلکہ ان کے بزرگوں سے دار العلوم اور اکابر دار العلوم کے ہمیشہ گہرے تعلقات رہے ہیں، اور الحمد للہ! اب تک ہیں۔ خود ان کی ذات سے اپیل کر کے چندہ لیا گیا؛ مگر حکومت کی امداد ان کے مخلصانہ واسطے سے بھی قبول نہیں کی گئی۔

بعینہ یہی اصول حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے بھی اپنی بنائے دار العلوم حرم صولتیہ کی اساس قرار دیا، اور حکومتِ وقت سے استغنا ہی پر مدرسے کی بنیاد رکھی۔ حال آں کہ وہاں کی مقامی حکومت مسلم حکومت تھی، جو شریف مکہ کی زیر امارت قائم تھی، اور اس حکومت کی مافوق حکومت خلافت ترکیہ تھی، جو مذہباً و مشرباً دار العلوم حرم صولتیہ کی ہم نوا تھی، اور پھر سلطان ٹرکی اور شریف مکہ مولانا مرحوم پر حد درجہ مہربان؛ بلکہ ان کے معتقد بھی تھے؛ لیکن ذاتی تعلقات کی خوش گواری کے باوجود حکومتوں سے استغنا کے اصول کی ہمیشہ حفاظت کی گئی۔

سلطان عبدالحمید خاں کی امداد شکریہ کے ساتھ واپس:

سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے اپنے دورِ حکومت میں سلطنت عثمانیہ سے دار العلوم حرم صولتیہ کے لیے ایک معقول امداد منظور فرمائی؛ لیکن بانیٔ مدرسہ نے اپنے حکیمانہ دماغ اور دور اندیشانہ فراست سے سلطنت اسلامیہ کی بھی اس گراں قدر اور مستقل امداد کو نتائج کے پیش نظر قبول کرنے سے بہ صد شکریہ معذرت فرمادی۔ حضرت مولانا محمد سعید صاحب مرحوم (نبیرہ برادر اکبر حضرت مولانا مرحوم وسابق مہتمم دار العلوم حرم صولتیہ ووالد بزرگ وار حضرت مولانا محمد سلیم صاحب حال مہتمم دار العلوم صولتیہ [(۱)]) نے مجھ سے خود بیان فرمایا کہ: موجودہ حکومتِ مکہ نے بھاری امداد دار العلوم کے لیے منظور فرمائی؛ لیکن انہوں نے اصول کی پابندی اور اپنی خداداد ذہانت وفراست کے تحت بہ صد شکریہ اور بہ حسن ردقبولیت سے انکار کردیا، اور آج دار العلوم دیوبند کی طرح دار العلوم حرم صولتیہ مکۂ معظّمہ کا کاروبار بھی مسلمانوں اور بیش تر مسلمانانِ ہند وپاکستان کے عام عطیات اور چندوں پر چل رہا ہے، اور اسی کو یہ دونوں ادارے اپنی راستی اور استقامت کی دلیل سمجھتے ہوئے اس پر قانع اور شاکر ہیں، جس سے واضح ہے کہ تاسیس مدارس کے ملتے جلتے اور یک ساں جذبات کے ساتھ ان کے اساسی اصول وضع کرنے میں بھی دونوں بزرگ واروں کے جذبات یک سانی ہی کے ساتھ کام کر رہے تھے۔

روز بد کی تاریکیوں میں اکابر کا آفتاب:

بہرحال! اصول، عمل، طریق عمل، مقاصد، نصب العین اور کارناموں کے لحاظ سے یہ دونوں بزرگ ایک اصل کی دو شاخیں نظر آتے ہیں، جنہوں نے ہندوستان کی ڈولتی ہوئی کشتی کی مذہبی اور علمی حیثیت سے ناخدائی کی، اور گرتے ہوؤں کو سنبھال لے گئے، اور اس بے کسی کے دور میں اس حد تک سہارا دے گئے کہ چند ہی دن میں مسلمان ان کی دکھائی ہوئی شاہ راہ پر چل کر پنپ گئے؛ بلکہ قوی اور مضبوط ہو گئے، اور ان کا دماغی اور علمی سرمایہ اغیار کی دست برد سے محفوظ ہو گیا۔ سوائے ان کے جو اس پگ ڈنڈی سے الگ ہو گئے، اور ان سے اپنا دامن جدا کرلیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہندوستان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس روز بد کی تاریکیوں میں ان اکابر جیسے آفتاب ماہ تاب اس کے سر پر چمکتے رہے، اور بالآخر ان کی روشنی میں اس کی ساری ظلمتیں کافور ہوتی رہیں۔ **اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دورِ ظلمات میں بھی اگر روشنی کا کوئی مینار ہے، تو وہ ان ہی اکابر کا نقش قدم ہے، اور اس پر چلنے اور چلتے رہنے کے بعد کسی قسم کی مایوسی کی کوئی وجہ مسلمانوں کے لے باقی نہیں رہتی [(۲)]۔**

(۱) اب مولانا محمد سلیم صاحبؒ کے صاحب زادے مولانا مسعود سلیم صاحب مہتمم ہیں۔ (شریفی ۲۰۱۵ء)

(۲) جلی حروف کا قول جہاں عوام کے لیے توجہ کا طالب ہے، وہیں اہل علم بالخصوص دیوبندی کتب فکر کے حامل علما کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اسے بار بار پڑھیے اور سوچیے کہ ہم اس پر ثابت قدم ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے، تو شکر ادا کیجیے، اگر نفی میں ہے، تو اصلاح کیجیے۔ (شریفی)

قاسم ورحمت کا غناوتوکل:

اس مقبولیتِ عامہ اورمرکزیتِ تامہ کے ساتھ ہردو بزرگوں کا غناوتوکل اوراسباب دنیا سے بے نیازی بھی کچھ یک ساں ہی انداز کی تھی، جو ان ہی جیسے اہل اللہ کے شایان شان تھی۔ حضرت قاسم العلومؒ کی طلبی بعض حکومتی اور دولتی مراکزمثل ریاست بھوپال وغیرہ سے ہوئی کہ حضرتؒ وہاں پہنچ کرعلمی اور دینی قیادت فرمائیں۔ مشاہرے بھی وقت کے لحاظ سے بھاری بھاری پیش کیے گئے؛ لیکن انہوں نے اپنے استغنا کی حفاظت فرماتے ہوئے یہ ہی جواب دیا کہ: ؎

ما آبروئے فقر قناعت نمی بریم

حتیٰ کہ خود اپنے ہی قائم فرمودہ ادارے ''دارالعلوم دیوبند'' کی بھی کبھی ملازمت قبول نہیں فرمائی، نہ کوئی عہدہ لیا۔ تابہ معاوضہ چہ رسد؟

اسی طرح حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے بھی دارالعلوم حرم صولتیہ کوخود اپنی حوصلہ مندی اور اولو العزمی سے قائم فرمایا۔ اس کے لیے سرتاپا خدمت وعمل رہے، اوراس کے مصارف کے لیے تحصیل سرمایہ کی ان تھک سعی بھی فرمائی؛ لیکن خود اپنے لیے نہ کبھی کوئی معاوضہ قبول فرمایا، نہ دارالعلوم حرم سے کوئی ادنا مالی منفعت حاصل کی: ؎

أُولٰـئِکَ آبَـائِـي، فَـجِـئْـنِـي بِـمِثْـلِهِـمْ
إِذَا جَـمَـعَـتْـنَـا يَـا جَـرِيْـرُ الْـمَـجَـامِـعُ

بڑا ہوتے ہوئے چھوٹوں سے بھی اپنے کوچھوٹا سمجھنا:

بہرحال! تحفظ دین، جہادلسان وسنان، جہاد جنان وارکان، تاسیس مراکز دین، خدمت خلق اللہ، تربیت عالم، تعلیم طلاب، خیرخواہی بنی نوع، ایثاروتواضع کے ساتھ معاملات، بڑا ہوتے ہوئے چھوٹوں سے بھی اپنے کوچھوٹا سمجھنا ان حضرات کی باقیات صالحات ہیں۔ اسی لیے وہ ۱۸۵۷ء کے بعدغم زدہ مسلمانوں کی منجدھار میں پڑی کشتی کے ناخدا، اور بکھرے ہوئے قافلوں کومجتمع کرنے کے قافلۂ سالار بنائے گئے تھے۔

حضرت نانوتویؒ کی تدفین ایک نبی کی قبر میں:

بالآخرعلم وفضل کے یہ دونوں خزانے اپنی اپنی تکوینی اوراختیاری خدمات کی تکمیل کرکے رفیق اعلیٰ سے جاملے۔ حضرت قاسم العلوم ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء میں رہ گزر سے عالم جاودانی ہوئے، اوردارالعلوم دیوبند کے

قرب وجوار میں اپنی وصیت کے مطابق گورِغریباں میں آرام فرما ہوئے، اور حسب مکاشفہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ، مہتمم اوّل دار العلوم دیوبند وخلیفۂ ارشد حضرت شاہ عبد الغنی محدث دہلویؒ:
''ایک نبی کی قبر میں دفن ہوئے''۔

حضرت کیرانویؒ مقدس خطے میں:

اور اُدھر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے اس دار فانی کو چھوڑ کر عالم باقی کی طرف رحلت فرمائی، تو ارض مقدس حرم مکی میں جہاں ہزار ہا انبیا علیہم السلام کی خاک پاک اور اجساد طیبہ محفوظ ہیں، آرام فرما ہوئے[1]۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(۱) (ماخوذ از): ماہنامہ دار العلوم دیوبند، شوال المکرّم ۱۳۷۰ھ/ جولائی ۱۹۵۱ء، ص: ۵۱ تا ۶۱۔

''دارالعلوم کا بانی''
تاریخ وحقائق کی روشنی میں

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمہ اللہ

سہ روزہ اخبار ''مدینہ'' بجنور کی ۹ر ربیع الاوّل ۱۳۸۵ھ/ ۹ر جولائی ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بجنوریؒ کا ایک مضمون ''بانئ دارالعلوم دیوبند'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، جو بعد میں ''تذکرۂ شیخ الہندؒ'' کا حصہ بھی بنا۔ اس کے بارے میں حضرت مفتی صاحبؒ نے اسی زمانے میں دارالعلوم دیوبند سے مراسلت بھی فرمائی تھی۔ اس سلسلے میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایک طویل مضمون سپرد قلم فرمایا تھا، جس میں ''دارالعلوم دیوبند کا بانی'' کے عنوان سے تاریخ کی روشنی میں محققانہ بحث ونظر کے ساتھ حقائق کا جائزہ لے کر حقیقت حال کو واضح کیا گیا ہے۔ (نعمان)

قیام دارالعلوم:

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جب دہلی کی سلطنت کے ساتھ دہلی کی درس گاہیں مٹ رہی تھیں، علمی خانوادوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تباہ وبرباد کیا جارہا تھا، اور بہ ظاہر اسباب علم دین کے لیے کوئی ظاہری سہارا باقی نہیں رہ گیا تھا کہ ہندوستان میں ان کا وجود قائم رہ سکے، تو اللہ کی فیاض قدرت نے اعجازی طور پر وقت کے چند نفوس قدسیہ کے ہاتھوں دارالعلوم دیوبند کو وجود بخشا اور دیوبند جیسی کوردہ بستی میں، جہاں علم سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا، اور رسوم کی گرم بازاری تھی، یہ علم وہدایت کا سرچشمہ جاری ہوا، جس نے تھوڑی ہی مدت میں صرف ہندوستان ہی نہیں؛ بلکہ بیرون ہند: یاغستان، افغانستان، جزائر شرق الہند، جاوا، ساٹرا، تبت، چینی ترکستان، روسی ترکستان، خیوہ، بخارا، قازان، بلخ، برہما، افریقہ، شام، عراق اور حجاز تک اپنے علم کے دھارے پھیلا دیے، اور جو کام حکومتی یونیورسٹیاں اپنے کروڑوں روپے کے میزانیوں اور اقتدار کے زور وقوت سے نہ کرسکیں، وہ کام اس غریب الحال ادارے نے غریبوں کے معمولی پیسوں سے کر دکھایا۔

دارالعلوم کی بنا کا مسئلہ:

دارالعلوم کی تاسیس میں پیش قدمی کس نے کی، جس پر بانی کا اطلاق کیا جائے؟ سو دارالعلوم اور ملک کے عام علمی حلقوں میں اس عظیم ادارے کا بانی ''حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ العزیز'' کو سمجھا جاتا ہے، جو عموماً زبانوں پر مذکور اور قلوب میں متعارف ہیں؛ لیکن کچھ عرصے سے اس کے خلاف یہ منفی آواز کانوں میں پڑ رہی ہے کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ بانیٔ مدرسہ نہیں ہیں، اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس منفی آواز کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے؛ بلکہ کچھ پہلو ایسے ضرور موجود ہیں کہ ان کی رو سے بہ ظاہر اس منفی آواز کی گنجائش بھی نکلتی ہے۔

یہ بحث الگ ہے کہ اس منفی آواز کی بنیادیں تاریخی طور پر کیا مقام رکھتی ہیں؟ تاہم آواز ہے اور اٹھی ہوئی ہے، اور اس آواز کی تصدیق و تکذیب سے قطع نظر اس سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے بانیٔ مدرسۂ دیوبند ہونے کی نفی کا تصور بعض حلقوں میں موجود ہے۔

سوانح قاسمی اور تاسیس دارالعلوم کا تذکرہ:

تقریباً ۱۳۷۲ھ/(۱۹۵۳ء) میں جب سوانح قاسمی کا مسودہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کے قلم سے مرتب ہو رہا تھا، تو اس حلقے کے بعض حضرات نے اس تصور پر کہ ''سوانح قاسمی'' میں یقیناً مدرسۂ دیوبند کی تاسیس کا تذکرہ آئے گا، اور ممکن بلکہ اغلب ہے کہ دارالعلوم اور عام علمی حلقوں میں شہرت عامہ کے مطابق بانیٔ مدرسہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کو ظاہر کیا جائے۔ ان کے پاس دیوبند سے ایک تحریر پہنچی کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا بانیٔ مدرسہ ہونا خلافِ واقع ہے؛ بلکہ اس کے بانی حضرت مولانا عابد صاحب دیوبندیؒ ہیں۔

صفر ۱۳۸۵ھ/(جون ۱۹۶۵ء) کی مجلس شوریٰ دارالعلوم کے اجلاس سے کچھ قبل پھر اس حلقے سے اراکین مجلس شوریٰ بہ شمول مہتمم کے نام الگ الگ مراسلے پہنچے، جن میں اس منفی دعوے کی تجدید کی گئی تھی کہ حضرت والاؒ بانیٔ مدرسۂ دیوبند نہیں ہیں۔

پھر اس سے متصل ۹ر ربیع الاول ۱۳۸۵ھ/(۹ر جولائی ۱۹۶۵ء) کو اخبار ''مدینہ'' بجنور میں ایک مقالہ بہ عنوان ''دارالعلوم دیوبند کا بانی'' شائع ہوا، جس کا مضمون تقریباً وہی ہے، جو مذکورہ مراسلوں کا تھا، اور بہ طور سند نفی وہی حجتیں اس میں بھی پیش کی گئی تھیں، جو ان مراسلوں میں تحریر کی گئی تھیں، جو اراکین مجلس شوریٰ کے نام بھیجے گئے تھے۔

مسئلۂ بنا کی تنقیح:

بہر حال! یہ منفی آواز مخصوص حلقے ہی کی کیوں نہ ہو؛ مگر بار بار ذمہ دارانِ مدرسہ کے سامنے آتی رہی ہے۔ میرے خیال میں یہ کسی طرح مناسب نہ ہوگا کہ اس آواز کو صدا بہ صحرا سمجھ کر اس کا جواب خاموشی سے دیا جائے، جیسا کہ اب تک دیا جاتا رہا ہے، جب کہ اس صدا کی کچھ بنیادیں ہیں، اور ان میں سے بعض دل لگتی بھی ہیں؛ اس لیے معقول بات یہ ہوگی کہ یا تو منفی دعویٰ تسلیم کیا جائے، یا عدم تسلیم کی وجوہ ظاہر کی جائیں، تاکہ دوسرے حضرات بھی مطمئن ہو سکیں، اور ایک مسئلہ خواہ مخواہ بے وجہ مختلف اور نزاعی نہ بنا رہے، جس سے قلب میں بُعد کی آب یاری ہوتی رہے۔ جب کہ دار العلوم سب کی مشترکہ متاع ہے، اور اس کے معاملات سے منفی پہلو کے دعوے دار بھی اتنے ہی متعلق ہیں، جتنا کے مثبت پہلو کے مدعی ہو سکتے ہیں؛ اس لیے مناسب ہوگا کہ اس مشترک اور متفق علیہ پونجی کو ایک مسئلے کے بے معنی اختلاف سے مختلف فیہ نہ بنایا جائے، اور منفی اور مثبت جہتوں پر انصاف واعتدال کی نگاہ ڈال کر حقیقت واقعہ کا سراغ لگایا جائے، تاکہ یہ مسئلہ نزاعی انداز سے قائم نہ رہے۔ البتہ حجت وبینہ سے ثابت شدہ چیز بھی کسی کے نزدیک قابل تسلیم نہ ہو، تو یہ نزاع واختلاف کہلاتا ہے، اور اس میں صاحبِ حجت معذور ہوتا ہے۔

بانیٔ دار العلوم کوئی بھی فرد ہو یا جماعت، اصل شیٔ بنا ہے، جس نے مسلمانانِ ہند وبیرونِ ہند کو نظری اور عملی قدروں کے ساتھ راہِ استقامت پر ڈالا، اور انہیں ایک خاص فکر عطا کیا، اور سو برس سے آج تک اس کی وہی افادی نوعیت قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ بناو تاسیس اینٹ پر اینٹ رکھ دینے کا نام نہیں؛ ورنہ بانی معمار کو ہونا چاہیے؛ بلکہ حقیقی بنا وہ فکر ونظر اور وہ نصب العین ہے، جس کے لیے کسی ادارے کا آغاز کیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ فکر سامنے آنے سے صاحبِ فکر یا مفکر ذات بھی طبعاً سامنے آجائے، اور اس کی تاسیس کی نوبت پر کلام بھی کیا جائے؛ لیکن حقیقتاً مقصودِ اصلی بنا ہی رہی ہے؛ اس لیے میرا روئے سخن بنیاد سے بانی کی طرف جانا ہے، بانی سے بنیاد کی طرف آنا نہیں ہے، اور اس لیے یہ مضمون محض اصولی اور تاریخی نقطۂ نظر سے پیش کیا جا رہا ہے، جس میں بہ لحاظ بانی ابتدا ہی سے کوئی خاص متعین شخصیت پیش نظر نہیں۔ نیز یہ پیش کش بھی مثبت انداز سے ہے، منفی طور پر نہیں؛ اس لیے اگر منفی پہلو کے مدعیوں پر کوئی تنقیدی نگاہ بھی ڈالی گئی ہے، تو وہ صرف تحقیق کے ضمن میں ہے، خود تنقید اصل یا مقصود نہیں۔

حاجی محمد عابد حسین صاحبؒ اور بنائے دار العلوم:

نفی کے حلقہ نے دار العلوم دیوبند کا بانی حضرت حاجی عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو قرار دیا ہے؛

لیکن عرض کردہ نقطۂ نظر سے یہ زیرِ بحث ہی نہیں، اور نہ حضرت ممدوحؒ کے بانی ہونے سے کسی کو انکار ہے۔ خود احقر نے بھی اپنی متعدد تحریرات میں انہیں بانیانِ مدرسے میں گنایا ہے؛ لیکن مسئلہ کا منفی پہلو کہ ان کے سوا کسی دوسرے پر بانی کا اطلاق نہیں ہوسکتا، یا تشخیص کے ساتھ کہ فلاں بانی نہیں محلِ بحث ہے۔

بلا شبہ حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کو جن واقعات کی بنا پر بانی کہا گیا ہے، وہ اپنی جگہ صحیح ہیں؛ لیکن واقعات صرف وہی نہیں؛ بلکہ اور بھی ہیں، اور اتنے ہی صحیح ہیں، جتنے کہ یہ ہیں؛ اس لیے اگر کل واقعات کو سامنے رکھ کر نتیجہ اخذ کیا جائے، تو وہ پورا اور مکمل ہوگا، ناقص اور نا تمام نہ ہوگا؛ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ دوسرے واقعات بھی سامنے رکھ دوں، تاکہ اخذ کردہ نتیجہ جامع اور واقعات کا نچوڑ ثابت ہو۔

حضرت نانوتویؒ سے دارالعلوم کی نسبت:

واقعہ نگاری کے سلسلے میں یہ خامہ فرسائی اس لیے نہیں، اور نہ ہونی چاہیے کہ ہم خواہ مخواہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بانئ دار العلوم ثابت کرنے کی غرض سے کوئی قلمی جدوجہد کریں، اور سچ پوچھیے تو یہ کچھ حضرت ممدوحؒ کے لیے فخر کی بات بھی نہیں کہ انہیں وقت کے ایک مقامی مدرسہ کے بانی یا مجوز کی حیثیت سے پیش کرنے کی سعی کی جائے، جیسا کہ محترم مقالہ نگار مدینہ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے؛ کیوں کہ ادارے سے حضرت والاؒ کی شخصیت نہیں بنی؛ بلکہ آپ کے دور میں شرفِ مرکزیت ہی وہ ادارہ پا سکتا تھا، جسے آپ سے کوئی نسبت ہو جاتی؛ اس لیے ظاہر ہے کہ دیوبند کے مدرسہ کی طرف آپ کو، یا آپ کی طرف مدرسہ کو منسوب کرنے کی غرض یہ نہیں ہوسکتی کہ آپ کے مفاخر کی فہرست میں کوئی اضافہ کیا جائے، جب کہ آپ کی زندگی کے بلند ترین نصب العین کا خاکہ ایک ایسی ہمہ گیر اور جامع تحریک کی نوعیت لیے ہوئے ہے، جس کے مختلف مظاہر میں سے یہ مدرسہ بھی ایک مظہر ہونے کی حیثیت رکھتا ہے؛ اس لیے اس مدرسہ کی ابتدا کی حد تک تو شاید حضرت والاؒ کا تذکرہ کچھ زیادہ موزوں بھی نہ ہو، پھر بھی یہ سطور محض تاریخی حیثیت سے صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے پیش کی جارہی ہیں کہ حقیقتاً تاسیسِ مدرسہ سے حضرت نانوتویؒ کے تعلق کی نوعیت کیا تھی، جس کی بنا پر آپ کو بانئ دار العلوم کہا جاتا ہے؟

بنا کی روایات تحقیق وتجزیے کی روشنی میں:

نیز بانی سے متعلق روایات کے اختلاف وتضاد کی وجہ سے چوں کہ یہ مسئلہ پیچیدہ اور معرکۃ الآراء بھی ہے؛ اس لیے بہ حیثیت ایک مؤرخ کے یہ فریضہ ہر تاریخ نگار کے سامنے آنا چاہیے کہ ساری روایات پر نظر ڈال کر درایت وتنقیح کے ساتھ واقعات کی روشنی میں کوئی قولِ فیصل سامنے لے آیا جائے۔

بانئ دارالعلوم کے بارے میں روایتیں متعدد بھی ہیں اور باہم متعارض بھی۔ اگر یہ روایتیں افواہی ہوتیں، تو ہوسکتا تھا کہ سب کو ساقط الاعتبار قرار دے کر ان میں سے کسی ایک کو قرائن وشواہد کی مدد سے ترجیح دے دی جاتی، اور بقیہ کو رد کردیا جاتا؛ لیکن آخر لکھی پڑھی دستاویزات کو کیا کہہ کر ٹھکرادیا جائے؟ پھر ایک آدھ کے علاوہ منسوب بھی ایسے ثقہ افراد اور نفوسِ قدسیہ کی طرف ہیں کہ جن کے نام سے ہمارا ہی نہیں، ہماری روایت و درایت ہی کا نہیں؛ بلکہ اس دور کے پورے فنِ روایت کا اعتبار قائم ہوتا ہے۔ درصورتِ ثبوتِ روایات کسی ایک کا رد اور کسی کا قبول بھی دشوار ہے کہ روایات کا ردوطرد درحقیقت اربابِ روایات کی تردید وتکذیب ہے۔ جب کہ یہی حضرات بانیانِ مدرسہ اپنے سوا ہر ایک کو بانی کہہ رہے ہیں۔ تواضع پر محمول کیا جائے، تو ایک ہی راوی کی دو مخالف روایتوں کے باہمی تخالف اور تضاد کو کیا کہا جائے؟ پھر ایک روایت مثبت پہلو پر مشتمل ہے، منفی پہلو کہ ''فلاں بانی نہیں ہے'' کسی روایت میں نہیں۔ نفی خواہ لازم آجائے؛ مگر اس کا التزام کسی راوی یا مدارِ روایت نے نہیں کیا کہ ان روایات کو کسی مجادلہ ونزاع ہی کا ثمرہ کہہ کر رد کردیا جائے؛ اس لیے ان میں کافی احتیاط اور تعمق سے غور کرکے اصلیت کے سراغ لگانے کی ضرورت ہے، اور یہ کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے کہ بہ یک جنبشِ قلم یہ کہہ کر معاملہ ختم کردیا جائے کہ ''فلاں بانی نہیں ہے'' اور ''نہ ہوسکتا ہے''۔ ''بانی'' کی تشخیص کے سلسلے میں روایات حسبِ ذیل ہیں:

۱-حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی روایت:

حضرت اقدس مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اوّلین صدر مدرس دارالعلوم دیوبند نے تو اپنی مؤلفہ مختصر ''سوانح قاسمی'' میں تین افراد کے مجموعے کو بانی ومجوزِ مدرسہ کہا ہے۔ چناں چہ ایک جگہ یہ ذکر کرتے ہوئے کہ حضرت نانوتویؒ میرٹھ میں تھے، اور میں نے ان سے اسی زمانے میں ایک جماعت کے ساتھ صحیح مسلم پڑھی۔ فرماتے ہیں:

> ''یہی وہ زمانہ تھا کہ مدرسۂ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی، مولوی فضل الرحمٰن اور مولوی ذوالفقار علی اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں، مدرس کی تن خواہ پندرہ روپے تجویز فرمائی اور چندہ شروع ہوا''(۱)۔

۲-سوانح مخطوطہ کے مصنف حاجی فضل حق صاحب مرحوم کی روایت:

''سوانح مخطوطہ'' کے مصنف (منشی فضل حق صاحب مرحوم دیوبندیؒ مہتمم ثالث دارالعلوم دیوبند ومتوسل خاص

(۱) مختصر سوانح قاسمی، ص:۳۹۔

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ) نے ان تین میں سے دو کو اس تفصیل سے مجوز و بانی کہا ہے کہ محرک مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانیؒ تھے اور بانی حاجی محمد عابد صاحبؒ تھے۔ اس روایت میں مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ کا نام نہیں۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''مدرسہ اسلامیہ دیوبند کی بنائے اول آپ (حاجی محمد عابد صاحب) نے ڈالی تھی، اور آپ ہی اس کے مربی و سرپرست ہیں۔ مختصر کیفیت اس (بنائے مدرسہ) کی جو لطف سے خالی نہیں، عرض کرتا ہوں۔ سب سے پہلے مولوی فضل الرحمٰن صاحب دیوبندی سلمہ اللہ تعالیٰ اس مدرسہ کے محرک ہوئے، اور چند بار آپ (حاجی محمد عابد صاحب) کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ اگر ایک مدرسہ علم دین کا جاری کیا جاوے، تو خالی نفع سے نہ ہوگا''[1]۔

۳- تذکرۃ العابدین کے مؤلف کی روایت:

''تذکرۃ العابدین'' کے مصنف جناب حاجی نذیر احمد صاحب مرحوم خلیفہ حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ نے اس کے برعکس حاجی محمد عابد صاحبؒ کو مجوز و بانی اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو محض تعمیل کنندہ اور کارپرداز ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب حضرت حاجی (محمد عابد) صاحبؒ نے دوبارہ چلہ کر لیا، تو ایک روز آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، صبح کو مولوی فضل الرحمٰن صاحبؒ وغیرہ کو بلایا، اور فرمایا کہ: علم دین اٹھا جاتا ہے، کوئی تدبیر کرو کہ علم دین قائم رہے۔ جب پرانے عالم نہ رہیں گے، تو کوئی مسئلہ بتانے والا بھی نہ رہے گا۔ جب سے دہلی کا مدرسہ گم ہوا ہے، کوئی علم دین نہیں پڑھتا۔ اس وقت سب صاحبوں نے عرض کیا کہ: جو تدبیر آپ فرمائیں وہ ہم کو منظور ہے۔ آپ نے فرمایا: چندہ کر کے مدرسہ قائم کرو، اور کاغذ لے کر اپنا چندہ لکھ دیا، اور روپے بھی جمع کر دیے''[2]۔

۴- حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کی روایت:

حضرت اقدس حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ اجرائے مدرسہ کو تین افراد کی سعی کا ثمرہ ظاہر فرما رہے ہیں: حضرت نانوتویؒ، حضرت حاجی عابد حسین صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ۔ چناں چہ حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

''اب اس مضمون کو ایک عظیم اور مقدس بشارت و علامتِ مقبولیت پر ختم کرتا ہوں، اور وہ

(۱) سوانح مخطوطہ: محفوظ بہ خزانہ دار العلوم۔
(۲) تذکرۃ العابدین، ص: ۶۹۔

بشارت حضرت سیدی ومرشدی الحاج الحافظ الشاہ محمد امداداللہ قدس سرہٗ کا ایک ملفوظ ہے، جو مجموعہ مکتوبات کے مکتوب ہیج دہم (اٹھارہ) بہ نام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ وحضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا ایک جزو ہے، جو ابتدائے مدرسے کے وقت صادر ہوا ہے۔ ملفوظ:

''از اجرائے مدرسہ علم دین بہ سعیٔ آں عزیزاں وعزیزم حافظ عابد حسین صاحب چہ خوش ہار ونمود کہ بہ بیاں نمی آید''(۱)۔

۵-حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب اوران کے معاصرین کی روایت:

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ اپنی کتاب ''الهدية السنية'' میں (جو عربی زبان میں دیوبند، مدرسۂ دیوبند اور منتسبین مدرسہ کے حالات پر مشتمل ۱۳۰۷ھ (۱۸۹۰ء) میں لکھی گئی ہے) صرف حاجی محمد عابد صاحبؒ کو بانیٔ مدرسہ ظاہر فرمارہے ہیں، جس کا ترجمہ اور ماحصل اردو زبان میں یہ ہے:

''جب اللہ تعالیٰ شانہ وعز سلطانہ نے ان دیار کی خیر کا ارادہ فرمایا، تو سید جلیل ذی نسب عالی فخر امثال وامجاد سید اجل ''محمد عابد''، ادامہ اللہ وابقاہ کو اس مدرسے کی تاسیس کا الہام فرمایا، جس کی بنیاد تقوے پر رکھی گئی''(۲)۔

۶-اسی کی تائید ذیل کی روایت سے بھی ہوتی ہے:

حضرت گنگوہیؒ اور ان کے ساتھ مولانا حکیم ضیاء الدین رام پوریؒ، مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندیؒ، مولانا فضل الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ، حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندیؒ، منشی فضل حق صاحب دیوبندیؒ ممبران مدرسہ؛ سب مل کر حاجی محمد عابد صاحبؒ ہی کو بانی ومجوزِ مدرسہ قرار دے رہے ہیں۔ چناں چہ ان چھ بزرگوں کے دستخطوں سے ۲۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۰۶ھ (۲۵ر جنوری ۱۸۸۹ء) کو مولانا رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ کے حج کو جانے کے موقع پر ایک اشتہار شائع کیا گیا، جس میں حاجی محمد عابد صاحبؒ کو دوبارہ مہتمم مدرسہ بنادیے جانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس اشتہار کی عبارت کا متعلقہ ٹکڑا یہ ہے:

''ناچار بہ جز اس تدبیر کے کوئی چارہ نہ بن پڑا کہ سب مجتمع ہوکر بہ خدمت بابرکت حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب، دامت برکاتہٗ (بانی ومجوزِ اول مدرسۂ ہٰذا وحال سرپرست وسرآمدار بابِ شوریٰ) حاضر ہوں......الخ''(۳)۔

---

(۱) القاسم دیوبند کا دارالعلوم نمبر، ۳۰ر محرم ۱۳۴۷ھ/ ۱۹ر جولائی ۱۹۲۸ء۔

(۲) الهدية السنية، ص:۲۔

(۳) اشتہار مطبوعہ ومحفوظ بہ دارالعلوم۔

گو بانی و مجوزِ اول وغیرہ کے الفاظ اشتہارِ مطبوعہ میں دوقوسوں کے درمیان لکھے گئے ہیں، اور قوسین بہت ہی خفیف لگائی گئی ہے، جس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ قوسین کے درمیان کی عبارت، جسے ہم نے بھی اصل اشتہار کے مطابق قوسین ہی میں لکھا ہے، الحاقی ہو؛ مگر چوں کہ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ کی کتاب ''ہدیۂ سنیہ'' میں تاسیس کو حضرت حاجی صاحبؒ کی طرف اصل عبارتِ کتاب میں منسوب کیا گیا ہے؛ اس لیے اس شبہ کو نظر انداز کر دیا گیا، گو شبہ کا محل کافی موجود ہے۔

۷- حیدرآباد کمیٹی کی رپورٹ:

حیدرآباد دکن کی ایک کارکن کمیٹی نے ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۵ء) کے نزاع کے موقع پر دار العلوم کی تائید وحمایت کرتے ہوئے اپنی جو رپورٹ موسم بہ ''تذکرہ'' بہ توسط مُہتمم وقت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمہ اللہ مجلس شوریٰ مدرسۂ دیوبند کو بھیجی ہے، اس میں وہ بانیِ مدرسہ اور محرک و مجوز حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کو قرار دے رہی ہے، جس کا ایک جملہ یہ ہے:

> ''مجلس بعد جلسۂ کامل عرض کرتی ہے کہ بانیان اور محرکِ اعظم اس (مدرسہ) کے دو نفس نفیس تھے: ایک مولوی محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ اور دوسرے جناب مولوی رشید احمد صاحب مدفیوضہم''(۱)۔

۸- حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کی روایت:

مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ صدر جمعیت علمائے ہند ورکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند بھی اپنے مرتبہ قانون (دستور اساسی دار العلوم دیوبند) میں، جو ۱۳۶۷ھ (۴۸-۱۹۴۷ء) میں ترتیب دیا گیا، حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہما اللہ کو ہی بانیِ مدرسہ قرار دے رہے ہیں، جس کی اس مجلس کے تمام اراکین شوریٰ نے جنھوں نے بہ اتفاق رائے یہ دستور ہر دفعہ پر پوری بحث و تمحیص کے بعد منظور کیا ہے، توثیق کی ہے، جن میں خصوصیت سے قابل ذکر حضرت مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب کٹھوریؒ صدر جلسہ، حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ، حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ، حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا حکیم محمد یٰسین صاحب نگینوی، مولانا حکیم مشیت اللہ صاحب بجنوری وغیرہ ہیں۔ چناں چہ حضرت مفتی صاحبؒ ممدوح دستور میں دار العلوم کے مسلک کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دار العلوم کا مسلک اہل السنّت والجماعت حنفی مذہب اور اس کے مقدس بانیوں حضرت

---

(۱) تذکرہ، ص: ۲۰۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی وحضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہما کے مشرب کے موافق ہوگا''[۱]۔

۹-حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کی روایت:

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ صرف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کو بانیٔ مدرسہ قرار دے رہے ہیں؛ چناں چہ وہ حضرت ممدوحؒ کے فضائل ومناقب ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''پیش وائے منازلِ دین، رہنمائے مراحلِ یقین، آیت قدرتِ الٰہی، مایۂ رحمتِ نا متناہی، غفراں مآب، مغفرت جناب حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کہ کدور ایں حدیقہ پر بہار و بانیٔ ایں بنائے فیض آثار بودہ، جزاہ اللہ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء''[۲]۔

۱۰-حضرت نانوتویؒ کا ذاتی ارشاد:

خود حضرت نانوتویؒ اپنی اس معرکۃ الآراء تقریر میں جو عمارتِ دار العلوم کا سنگِ بنیاد رکھنے کے دن جامع مسجد دیوبند میں حضرتؒ نے کی ہے، بانی ہونے کی نسبت باشندگانِ دیوبند کی طرف فرما رہے ہیں، حضرتؒ کے جملے حسبِ ذیل ہیں:

''اس مدرسے کی بنیاد دیوبند والوں نے ڈالی، اس امر میں وہ سب کے امام ہیں''[۳]۔

﴿تِلْکَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾

ان دس روایات میں مشترک طور پر بانی کے سلسلے میں چھ نام تشخیص کے ساتھ آرہے ہیں:

(۱) حضرت حاجی محمد عابد صاحب۔

(۲) حضرت نانوتوی۔

(۳) حضرت گنگوہی۔

(۴) حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب۔

(۵) حضرت مولانا فضل الرحمٰن۔

(۶) اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہم اللہ۔

---

(۱) دستورِ اساسی، ص: ۵۔

(۲) روداد جلسۂ دستار بندی دار العلوم دیوبند، بابت ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء، ص: ۲۳/۲۴۔

(۳) روداد مدرسۂ دیوبند، بابت ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کو بانی کہہ کر گویا خود اپنے بانی ہونے کی نفی کر رہا ہے۔

روایت کا قدرِ مشترک اور ماحصل:

یہ بحث تو جداگانہ ہے کہ ان روایتوں کی درایتی پوزیشن کیا ہے، اور ان کے تضاد کو رفع کرنے کی کیا صورت ہے؟ یہاں سر دست صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان روایات سے حسبِ ذیل دو نتیجے واضح طور پر سامنے آتے ہیں:

۱- ایک یہ کہ یہ سب روایتیں مثبت انداز کی ہیں، جو کسی نہ کسی کو بانی ثابت کر رہی ہیں۔ منفی انداز کی نہیں، جو کسی کے بانی ہونے کی نفی کے لیے بیان کی گئی ہوں۔ اندریں صورت اگر کسی روایت کو کسی کے بانی ہونے کی نفی کے لیے استعمال کیا جائے، تو دوسری روایت خود اس کی نفی کر کے ثابت کردہ بانی کی نفی کر دے گی، اور اس طرح کوئی ایک بھی بانی باقی نہ رہے گا۔

۲- دوسرے یہ کہ روایات کے اس قدر مشترک سے یہ صاف نمایاں ہے کہ بانی ہونا ایک شخصیت میں منحصر نہیں کیا جا سکتا، اور یہ کہ ان روایات کے مدار حضرات جن سے یہ روایتیں صادر ہوئی ہیں، وحدتِ بانی کے قائل نہیں؛ بلکہ تعدد بانی کے مدعی ہیں؛ اس لیے حصر کے ساتھ کسی ایک کے بانی ہونے کا دعویٰ کر دیا جانا ساری روایات کے خلاف یقیناً ایک غیر تاریخی دعوی ہوگا، جس سے اس سلسلے کی ساری تاریخ ہی ختم ہو جائے گی۔

بانیین کے تعدد کا اثبات:

اس لیے اوپر سے لے کر آج تک دار العلوم کے ذمے دار حضرات بانی کے تعدد کو تسلیم کرتے رہے، نہ کبھی اس کے اعلان سے گریز کیا اور نہ کبھی اس کی کوشش کی کہ بانی کو کسی ایک شخصیت میں محصور کر کے دوسرے بانیوں کے بانی ہونے کی نفی کی جائے، خواہ ان کے بانی ہونے کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم خامس دار العلوم دیوبند حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے سفر مالٹا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> ''مولانا (حضرت شیخ الہندؒ) کے ارشاد کے مطابق ان میں (کارکنانِ مدرسہ میں جو حضرت شیخ الہندؒ کے تشریف لے جانے سے شکستہ خاطر تھے) تازہ روح پھونک دی، اور سب نے ٹھان لیا کہ یہ دینی امانت (مدرسۂ دیوبند) جو مقدس بانیان کی وراثت سے موجودہ جماعت کے ہاتھ آئی ہے، اس کی حفاظت اس وقت تک ہر ممکن ذریعے سے پوری طرح کی جائے، جب تک کہ

محض بہ فضلِ خداوندی اس کے سنبھالنے کے لیے دوسری جماعت تیار نہ ہو جائے''[۱]۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اپنے ایک مضمون ''تشریح واقعۂ دیوبند'' میں لکھتے ہیں:

> ''اور باوجود اس کے مولانا محمد احمد صاحبؒ (مہتمم خامس دارالعلوم) کی زبردست شخصیت نے دارالعلوم کی پرانی پالیسی کو تھامے رکھنے میں جو ایک ذمے دار اور بہادر مہتمم کا سب سے بڑا فریضہ ہے، اپنی کیسی اولوالعزمی، جاں فشانی اور تحمل صدمات کا ثبوت دیا، اور کس تدبر اور ہوش مندی کے ساتھ مدرسے کے کل پرزوں کو باہم مربوط رکھ کر اس فیض تعلیم و ترویج دین الٰہی کو بیش از بیش جدوجہد کے ساتھ شائع کیا، جو مدرسے کے بانیوں نے اس سے ارادہ کیا تھا''[۲]۔

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''دارالعلوم کے بانیوں اور سرپرست حضرات اور منتظمین میں چوں کہ خلوص اور تقدس بہ درجہ اتم موجود تھا؛ اس لیے (مدرسۂ دیوبند) ابتدا ہی سے روز افزوں ترقی کے مدارج طے کر رہا تھا''[۳]۔

احقر راقم الحروف نے اپنی ایک ذمے دارانہ تحریر میں مدرسۂ دیوبند کی تاسیس کا ۱۸۵۷ء والا پس منظر دکھلاتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس وقت چند اہل اللہ اور نفوسِ قدسیہ کے مصفی قلوب میں ارشاداتِ غیب کے تحت علم وعمل کے تحفظ اور صیانتِ دین کا ایک جذبۂ صادقہ ڈالا گیا، چند مخلص قلوب مستعد ہوئے کہ قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں کو باقی رکھنے کے لیے ایک علمی ادارہ (مدرسۂ دیوبند) قائم کیا جائے''[۴]۔

تعددِ بانی تسلیم، مگر بانیٔ اعظم کا تشخص:

بنابریں بانی کے سلسلے میں اثبات ونفی کا مخلوط طریقہ کہ کسی ایک کو بانی ثابت کر کے دوسروں کے بانی ہونے کی نفی کی جائے، نہ ان تاریخی روایتوں سے جوڑ کھاتا ہے، اور نہ ہی مدرسے کے باخبر اور مبصرین کے تاریخی اسوہ کے مطابق ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان ذمے داروں کے سامنے مذکورہ تاریخی روایتوں کی کتاب کھلی ہوئی تھی، اور وہ ان ساری روایات اور ان کے رواۃ کی عدالت وثقاہت اور پختگی وثبوت کی وجہ سے

---

(۱) رودادِ مدرسۂ دیوبند، بابت ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء۔

(۲) تشریح واقعۂ دیوبند، (۵-۱۳ر رمضان ۱۳۳۳ھ/ ۲۵ر جولائی ۱۹۱۵ء)، ص:۴۔

(۳) حیات شیخ الہند، ص:۲۶۔

(۴) دارالعلوم کی سرسٹھ سالہ زندگی، بابت ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۱ء)، ص:۱۔

ترجیح وانتخاب اور رد وانکار کا راستہ اختیار کر ہی نہیں سکتے تھے؛ اس لیے تعددِ بانی کے قائل رہے؛ البتہ بانئ اعظم ایک کو مانتے رہے، جس میں دوسروں کے بانی ہونے کی نفی شامل نہ تھی، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

بنائے حضرت نانوتویؒ کی نفی کا دعویٰ تاریخ کی روشنی میں:

مدعیانِ نفی نے جو زیرِ نظر مقالات میں حصر کے ساتھ حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کے بانی ہونے اور حضرت نانوتویؒ کے بانی نہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے، وہ یقیناً کوئی تاریخی دعویٰ نہیں کہلایا جا سکتا؛ بلکہ ان کا ایک استنباطی دعویٰ ہوگا اور وہ بھی ناتمام۔ جب کہ اس سلسلے کی دوسری روایتیں ان کے سامنے ہیں ہی نہیں، جن کے مجموعے ہی سے پورا نتیجہ نکالا جا سکتا تھا۔ اسی لیے ان کے اس دعوے کو یہ دوسری روایتیں رد کر رہی ہیں؛ اس لیے تاریخی طور پر یہ دعویٰ اور اس کے اثبات کا طرزِ استدلال کوئی تاریخی اہمیت نہیں رکھتا، جب تک کہ عرض کردہ روایات کا تضاد رفع کر کے نتیجہ نکالنے کی کوئی آخری اور منقح صورت پیدا نہ کی جائے، دراں حالے کہ یہ بجائے خود ایک نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ اور فنی طور پر سخت ترین مرحلہ ہے کہ اس تضاد کو رفع کرنے کے لیے ترجیح وانتخاب کا راستہ اختیار کیا جائے، یا تطبیق اور جمع بین الروایات کا۔

اس سلسلے میں طبعاً سب سے پہلا مرحلہ اسی منفی دعوے پر نظر کرنے کا آتا ہے کہ آیا اس نفی کی وجوہ اس درجے کی ہیں کہ ان سے یہ نفی کا نتیجہ نکالا جا سکے یا نہیں؟ تاکہ اس کے اور مثبت دعووں پر غور کیا جا سکے۔

میں اس سلسلے میں جو کچھ بھی عرض کروں گا، وہ تین مقالات پیشِ نظر رکھ کر عرض کروں گا:

(۱) ایک وہ مراسلہ جو ''سوانح قاسمی'' کے وقت مولانا مناظر احسن صاحبؒ کے پاس بھیجا گیا ہے۔

(۲) دوسرا وہ مراسلہ جو مجلس شوریٰ صفر ۱۳۸۵ھ (جون ۱۹۶۵ء) کے اراکین کے پاس ارسال کیا گیا ہے۔

(۳) اور تیسرا مدینہ اخبار کو وہ مقالہ جو بہ عنوان ''دار العلوم دیوبند کا بانی'' ۹ر ربیع الاوّل ۱۳۸۵ھ (۹ر جولائی ۱۹۶۵ء) کو شائع کیا گیا ہے۔

ان تینوں تحریرات کا مجموعہ اس زیرِ نظر تحریر میں سامنے رہے گا، اور یہی تحریریں اس مقالہ کی نگارش کا محرک بھی بنی؛ اس لیے تنقید وتائید کے سارے پہلو ان سب ہی پر عائد ہوں گے، کسی ایک کا نام، یا حوالہ دے کر الگ الگ کوئی بحث نہ کی جائے گی۔ نیز چوں کہ ان مقالات کا اصل موضوع حضرت نانوتویؒ کے بانی ہونے کی نفی ہے؛ اس لیے میں انہیں ''منفی نگار حضرات'' کے عنوان سے تعبیر کروں گا۔

ان حضرات نے بانی سے متعلقہ روایات میں ترجیح وانتخاب اور نفی وانکار کا راستہ اختیار کر کے

خصوصیت سے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ کے بانی ہونے کی نفی، اور حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کے بانی ہونے کا اثبات بہ طور موضوع ومقصد اختیار فرمایا ہے۔ شاید اس لیے کہ ان دو ہی بزرگوں سے متعلق روایتیں ان تک پہنچی ہوں گی، تو انہیں سے حضرت حاجی صاحبؒ کو بانی ثابت کرتے ہوئے صرف حضرت نانوتویؒ کے بانی ہونے کی نفی کی گئی۔ گو ''مدینہ'' کے مقالے کی حد تک حضرت والاؒ کے وقار کو تھامنے، یا یوں کہیے کہ دار العلوم سے ان کی ایک عمومی نسبت کو کسی حد تک قائم رکھنے کے لیے اعتذار کے لہجے میں یہ ضرور کہا گیا ہے کہ:
حضرت والاؒ کی شان سے فروتر ہے کہ وہ کسی ایک مدرسے کے بانی کہلائیں، جب کہ وہ ہندوستان میں ایک عمومی تعلیمی تحریک کے بانی، اور ایک عظیم دینی انقلاب کے محرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حضرت والاؒ کے عمومی محرک ہونے کا یہ دعویٰ اپنی جگہ صحیح، اور بلاشبہ حضرت والاؒ کا ۱۸۵۷ء کے بعد یہ ایک مستقل ذوق، یا بہ طور الہامِ ربانی ایک مستقل داعیۂ باطن تھا کہ ملک میں دینی مدارس کا جال پھیلا دیا جائے۔ ان کے نزدیک شرحِ صدر کے ساتھ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے پنپنے اور عزت کے ساتھ زندہ رہنے کی صورت بہ جز دینی تعلیم وتربیت اور قیام مدارس کے دوسری نہ تھی؛ اس لیے وہ یہ تحریک لے کر کھڑے ہوئے، جو دار العلوم دیوبند کے قیام سے ہندوستان میں بہ صورتِ قیام مدارس کامیابی کے ساتھ پھیلی، اور اس کے پھل پھول نمایاں ہوئے۔ چوں کہ سب سے پہلا چندے کا مدرسہ ہندوستان میں یہی قائم ہوا، اور پھر اس کے نقشِ قدم پر دوسرے سیکڑوں ہزاروں مدارس نے جنم لیا۔ چناں چہ اس بارے میں خود حضرت نانوتویؒ کی بھی یہی تصریح ہے۔ آپ نے مدرسۂ دیوبند کے جلسۂ سالانہ تقسیم اسناد وانعام بابت ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> ''چوں کہ اکثر مدارس اس مدرسے کی دیکھا بھالی مقرر کیے گئے ہیں، یا کیے جاتے ہیں، تو گو کوئی مدرسہ اس سے ترقی پا جائے، پر اہل عقل کے نزدیک وہ بھی دیوبند ہی کا پرتو ہوگا، اور اس پر جب یہاں کے باشندوں کی شکستہ حالی اور پریشان روزگاری پر نظر کی جائے، تو یہ ان کی ہمت کی بات کسی طرح ان کاموں سے کم نہیں، جو اہل سلطنت نے بہ رفاہِ عام کیے ہیں''[۱]۔

حضرت نانوتویؒ ایک نہیں متعدد دینی مدارس کے بانی ہیں:

لیکن اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر بعض ''منفی نگار حضرات'' کی عبارت کا یہ جملہ کہ:

''حضرت مولاناؒ کو کسی ایک مدرسے کا بانی قرار دینا ایک تاریخی غلطی ہے''۔

(۱) روداد مدرسۂ دیوبند، بابت ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء، ص: ۱۲۔

بہ ایں معنی تو بالکل صحیح ہے کہ وہ کسی ایک مدرسے کے بانی نہ تھے؛ بلکہ اپنے اس خاص مکتبِ فکر کی تحریک عام کے سبب اس فکر کے تمام مدارس کے بانی تھے، اور انہیں بانیٔ مدرسۂ دیوبند ہی نہیں؛ بلکہ بانیٔ مدارسِ ہند کہنا چاہیے، اور بلا شبہ اس معنی کے لحاظ سے یہ جملہ ان کے شایانِ شان اور ان کی عمومی تحریک کی کام یابی کے حسبِ حال ہوگا؛ لیکن اگر اس جملے کے معنی یہ ہوں کہ: اس عمومی تحریک کی بنیاد پر ان کا کسی بھی مدرسے کی خصوصی تاسیس سے کوئی تعلق نہیں تھا، تو یہ خود ایک تاریخی غلطی ہے۔ دراں حالے کہ حضرت والاؒ نے اپنی اس عمومی تحریک اور ہمہ گیر جذبے کے تحت اپنی خصوصی مساعی سے بھی جگہ جگہ خود پہنچ کر مدرسوں کی بنیادیں رکھیں اور مدارس قائم فرمائے، اور وہ آج تک ان کے بانی کہلاتے ہیں۔ جیسے مرادآباد، گلاؤٹھی، انبیٹھہ، تھانہ بھون، شاہ جہاں پور، بریلی اور نگینہ وغیرہ۔ ان میں اپنے ہی شاگردوں کو مدرس کی حیثیت سے بھیجا؛ حتی کہ بعض مدارس میں تو دیوارِ مدرسہ پر یہ عبارت بھی آج تک کندہ شدہ موجود ہے:

''قائم کردہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ''۔

جیسے مدرسۂ شاہی مرادآباد۔ چناں چہ حضرت والاؒ کی ان خصوصی تاسیسوں کا یہ علم و یقین اس حد تک عام تھا کہ علما کے خاص ماحول سے گزر کر دوسرے طبقات میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ سرسید بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴/اپریل ۱۸۸۰ء میں حضرت نانوتویؒ کی وفات پر اپنے تعزیتی مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''اُن (حضرت نانوتویؒ) کی کوشش سے علومِ دینیہ کی تعلیم کے لیے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی و کوشش سے اسلامی مدارس قائم ہوئے''۔

مولانا منصور علی خاں صاحبؒ (افسر الاطباء ریاست حیدرآباد، دکن) اپنی کتاب ''مذہبِ منصور'' میں حضرت نانوتویؒ کی مخصوص سوانح درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں اکثر مقامات پر مدارسِ دینی جناب مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اور مشورے سے جاری ہیں، خصوصاً مدرسۂ دیوبند۔ اول مولانا مرحوم نے اسی مدرسے کو چندے سے قائم فرمایا تھا''(۱)۔

یہ دونوں بزرگ ان مدارس کے قیام کو حضرتؒ کی عمومی تحریک کا نہیں؛ بلکہ خصوصی سعی اور مخصوص جد وجہد کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں۔

---

(۱) مذہبِ منصور، ج:۲، ص:۱۷۷۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ کی عمومی اور ہمہ گیر ذات کو جیسے ایک عمومی تحریک کے بانی کی حیثیت سے کسی ایک مدرسہ کی تاسیس میں محدود ومحصور کر دینا تاریخی غلطی ہے۔ اسی طرح انہیں خود ان ہی کی تحریک کے عموم میں نہ لا کر ان کی خصوصی تاسیسوں سے انکار کر دینا، اس سے بھی بڑی تاریخی غلطی ہے؛ اس لیے مدرسۂ دیوبند سے آپ کے بانی ہونے کی نفی کے لیے یہ عمومی تحریک نہ کوئی حجت ہے، نہ استدلال، زیادہ سے زیادہ اعتذار ہے؛ مگر اس کا نام دلیل نہیں۔

حضرت نانوتویؒ کا چندے میں پہل نہ کرنے کا مسئلہ:

رہا حضرتِ والاؒ کے بانی نہ ہونے کے سلسلے میں سندِ نفی کے طور پر یہ کہا جانا کہ: انہوں نے مدرسے کے ابتدائی چندہ وصول کرنے میں پہل نہیں کی، اور نہ وہ چندہ ہوتے وقت دیوبند میں موجود تھے؛ لیکن یہ عمل حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کا ہے، تو ظاہر ہے کہ کسی کا چندہ ہوتے وقت موجود نہ ہونا، یا کسی کا چندہ وصول کرنے میں پہل کرنا نہ بانی ہونے کی نفی کے لیے کافی ہے، نہ اثبات کے لیے، اور نہ ہی کسی ادارے کے قیام کے سلسلے میں یہ کوئی ایسی بنیاد ہے کہ اسے دلیل کی حیثیت دی جائے۔ گو اس تنقیح کا یہ ہرگز منشا نہیں کہ میں حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کے بانیانِ مدرسہ میں سے ہونے کی نفی کا قائل ہوں، یا اس کا ادعا کر رہا ہوں، ہرگز نہیں! میں تو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، خود اپنی متعدد تحریرات میں تعددِ بانی کا قائل ہو کر انہیں بانیوں میں شمار کرتا ہوں، اور ہمارے قلوب میں ان کی وہی عظمت وتقدیس موجود ہے، جو ایک باخدا بزرگ کی ہونی چاہیے؛ لیکن جہاں تک استدلال کی نوعیت کا تعلق ہے، محض ان مذکورہ طریقوں سے نہ حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کے بانی ہونے کا کوئی پختہ ثبوت ہوتا ہے، اور نہ حضرت قاسم العلوم والخیراتؒ کے بانی ہونے کی نفی ہی کی کوئی بنیاد نکلتی ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے نام حاجی صاحبؒ کا ایک گرامی نامہ اور اس کا تجزیہ:

اس سلسلے میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو تاسیس دار العلوم سے بے تعلق بلکہ بے خبر ثابت کرنے کے لیے سب سے بڑی دلیل حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کے گرامی نامے کے اس ٹکڑے کو بتایا گیا ہے جس میں حاجی صاحبؒ مدرسے کے قیام کے لیے چندہ کر کے حضرت نانوتویؒ کو ان الفاظ میں اطلاع دے رہے ہیں:

”کل عصر اور مغرب کے درمیان تین سو روپے جمع ہو گئے، اور اب آپ تشریف لے آیئے“[1]۔

---

(۱) مدینہ اخبار، ۹ ربیع الاوّل ۱۳۸۵ھ۔

اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ حضرت نانوتویؒ کو اس وقت تک قیامِ مدرسہ کی خبر تک بھی نہیں تھی۔ اس خط سے ہی انہیں پہلی بار اطلاع ہوئی کہ دیوبند میں کوئی مدرسہ قائم ہو رہا ہے، اور جب وہ قائم ہوا، تو حضرت نانوتویؒ قیامِ مدرسہ کے وقت دیوبند میں موجود بھی نہ تھے؛ اس لیے وہ بانی کیسے ہوئے؟

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حاجی صاحبؒ کا یہ خط ہی اس کی مستقل دلیل ہے کہ حضرت نانوتویؒ تاسیس مدرسہ سے نہ لاعلم تھے، نہ بے تعلق؛ بلکہ انہیں اس خط سے پہلے ہی سے اس کا علم بھی تھا، اور اس سے گہرا تعلق بھی تھا؛ حتی کہ اس چندے کے بارے میں بھی وہ مطلقاً بے خبر نہ تھے؛ کیوں کہ اول تو خط کی مذکورہ عبارت کے اسلوبِ بیان ہی نے یہ ساری بات واشگاف کر دی ہے، اور ''اب'' نے تو اس حقیقت کو بالکل ہی کھول کر رکھ دیا ہے کہ حضرتِ والاؒ اس خط کے پہنچنے سے قبل ہی ان تمام امور سے باخبر؛ بلکہ ان میں مؤثر انداز سے دخیل تھے؛ کیوں کہ اس قسم کے مواقع پر لفظ ''اب'' کسی معلوم معاملے کے لگے ہوئے انتظار کو رفع کرنے اور ابتدائی مراحل کے مختتم ہو جانے پر اصل مقصد کی تکمیل کرانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ وہ (معہود فی الذہن) معاملہ جس کا آپ کو انتظار تھا، یا آپ اسے کچھ اہم یا مشکل سمجھ رہے تھے، مکمل ہو چکا ہے، اب آپ آ جائیں، یعنی آنے میں کوئی تامل محسوس نہ کیا جائے، وجہِ تامل رفع ہو چکی ہے، اور اس میں کوئی حالت منتظرہ نہیں رہی، لہٰذا اب آنے میں تاخیر نہ ہونی چاہیے۔

یہی اسلوبِ بیان اس خط میں اختیار کیا گیا ہے، جس سے صاف واضح ہے کہ ان دونوں بزرگوں میں نہ صرف یہ کہ تاسیس مدرسہ کا منصوبہ علم ہی کی حد تک تھا؛ بلکہ کوئی عملی صورت بھی باہم طے شدہ تھی، اور جوں ہی اس کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے، ووں ہی حضرت حاجی صاحبؒ نے انتظاری کیفیت ختم کرنے کے لیے لفظ ''اب'' کے ساتھ اسی انداز میں حضرت والاؒ کو اطلاع دے دی، جیسے کسی قصہ طلب کام کی اطلاع بہ حالت انتظار کنائی الفاظ میں دیا کرتے ہیں؛ اس لیے اس خط کی رو سے دعویٰ کرنا کہ حضرت نانوتویؒ کو اس خط سے پہلے مدرسے کے قیام و اجرا، اور ان مراحل کے منصوبوں کی کوئی خبر تک نہ تھی، کم از کم اس خط کے اسلوب اور طرزِ بیان سے مفہوم نہیں ہوتا؛ بلکہ یہ خط حضرت والاؒ کی لاعلمی اور بے تعلقی کے بجائے میں تو سمجھتا ہوں کہ پہلے سے ذہن میں آئے ہوئے علم اور معاملے کی طے شدگی؛ بلکہ اس کے ساتھ منصوبے کے بہ روئے کار لائے جانے کے انتظار کی دلیل ہے۔

حاجی صاحبؒ کے خط کی بنیاد پر ایک فرضی تخیل:

پھر اس خط کی غرض و غایت کے سلسلے میں یہ تخیل قائم کر لینا کہ حاجی صاحبؒ نے حضرتِ والاؒ کو مدرسی پر

بلانے کے لیے یہ خط لکھا، اس خط پر ایک بے بنیاد اضافہ ہے، جس کا خط کی عبارت یا اس کے کسی ایک لفظ میں اشارتاً یا کنایتاً کوئی ذکر ہی نہیں۔ غور کیا جائے کہ خط کے اجمالی؛ بلکہ کنائی اسلوبِ بیان سے بالخصوص حضرتِ والاؒ کی مزعومہ بے خبری کے ساتھ انہیں ملازمت کے لیے اچانک بلا بھیجنا، اور وہ بھی مبہم اور ناتمام الفاظ میں کہ چندہ ہو چکا ہے، اب آپ آ جائیں، محض ایک عقدِ مجہول کی صورت ہے، جو حضرت نانوتویؒ کی مزعومہ لاعلمی اور بے خبری کی حالت میں ایک بے معنی، اور ان بزرگوں کی شان سے فروتر بات ہے؛ کیوں کہ اس عنوانِ بیان کا حاصل یہ نکلے گا کہ سارے کام ہو گئے، چندہ بھی ہو گیا، مدرسہ بھی قائم ہو گیا، صرف مدرس کا تقرر باقی ہے، اب آپ مدرسی کے لے آ جائیں۔ گویا حضرتِ والاؒ کو ملازمت کی تلاش تھی، اور حضرت حاجی صاحبؒ سے کہہ رکھا تھا کہ کوئی مدرسہ قائم ہو، تو میرا بھی خیال رکھیں؛ اس لیے حاجی صاحبؒ نے بر وقت تحریر فرمایا کہ چندہ تین سو روپیہ ہو گیا ہے، یعنی تن خواہ ملنے میں دشواری نہ ہوگی، اب آپ آ جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس خط کی غرض و غایت مدرسی، اور اس کی غرض حضرت والاؒ کا بلاوا قرار دینا قطع نظر خط کے اسلوب کے ان بزرگوں میں سے کسی کی بھی شان کے شایاں نہیں۔

حاجی صاحبؒ کے خط کی غرض و غایت:

اگر مدرسی کے لیے حضرتؒ کو بلایا جانا خط کی غرض و غایت ہوتی، اور حضرتؒ اس قصے سے کلیتاً لاعلم اور بے خبر ہوتے، گویا قیامِ مدرسہ کی یہ بالکل ابتدائی اطلاع ہوتی، جس کی حضرتؒ کو پہلے سے مطلق خبر نہ ہوئی، تو خط کا اسلوبِ بیان یہ ہوتا کہ: **"میرا ارادہ مدرسہ قائم کرنے کا ہے، چندہ بھی کر چکا ہوں، مدرس کی تلاش ہے، آپ مدرسی قبول فرمائیں اور تشریف لے آئیں"۔ نہ یہ کہ "چندہ ہو چکا ہے اب آپ آ جائیں"**۔ ورنہ اس اندازِ بیان پر قدرتاً حضرتؒ کے ذہن میں جب کہ وہ معاملہ ہی سے بے خبر تھے، یہ سوالات پیدا ہونے چاہیے تھے کہ کیسا چندہ؟ کس کام کے لیے کیا گیا ہے؟ مجھے آخر کیوں بلایا جا رہا ہے؟ جب کہ میں برسرِ کار بھی ہوں، آخر مجھے ایک جمی جمائی اور مطابق ذوق جگہ سے بے وجہ کیوں اکھاڑا جا رہا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

مگر نہ تو حاجی صاحبؒ کوئی واضح بات لکھتے ہیں اور نہ حضرت والاؒ کو اس اجمال سے کوئی استعجاب ہوتا ہے، نہ وہ کوئی سوال کرتے ہیں؛ بلکہ اپنی خوشی کا اظہار کر کے پندرہ روپے ماہوار کا ایک مدرس نامزد کر کے بھیج دیتے ہیں۔ اس صورت میں یہ مجمل اور کنائی خط اور اس کا بلا استفسار و استعجاب یہ تفصیلی جواب اس کی واضح دلیل ہے کہ ان بزرگوں کے درمیان پہلے سے کوئی منصوبہ طے شدہ تھا؛ ورنہ اطلاع محض تین سو روپے کے جملے سے حضرت نانوتویؒ نے خود بہ خود کیسے سمجھ لیا کہ یہ سارا قصہ قیامِ مدرسہ کے لیے کیا جا رہا ہے، اور مجھے

مدرسی کے لیے بلایا جارہا ہے؟

اس لیے جب تک یہ سارے منصوبے ان دونوں بزرگوں کے درمیان پہلے سے طے شدہ نہ مانے جائیں، خط کا اجمال اور جوابِ خط کی تفصیل معقول نہیں ٹھہر سکتے؛ البتہ اگر معاملہ دونوں بزرگوں کے درمیان طے شدہ اور معہود فی الذہن مانا جائے، تو یہ اجمال وتفصیل دونوں اپنی اپنی جگہ معقول اور قابلِ قبول ہو جاتی ہیں، اور حاصل یہ نکلتا ہے کہ حاجی صاحبؒ نے خط میں تو کسی تصریح کی ضرورت یوں نہ سمجھی کہ یہ سب معاملہ حضرتؒ کے ذہن اور علم میں پہلے ہی سے ہے، اور باہم طے شدہ ہے، فقط چندے کی اطلاع کر کے بلایا جانا کافی ہے، وہ خود ہی سمجھ جائیں گے۔ اور ادھر حضرت والاؒ نے جواب میں تفصیل کر کے مدرسہ کا ذکر بھی فرما دیا؛ بلکہ اسے ''مدرسۂ مذکور'' کے عنوان سے تعبیر فرمایا، جب کہ حاجی صاحبؒ کے خط کے اس ٹکڑے میں مدرسہ کہیں بھی مذکور نہیں، اور چندے کی خبر پر ملا محمود صاحبؒ کو پندرہ روپے ماہوار پر نامزد کر کے بھیجنے کی بھی اطلاع دے دی، اور آئندہ کے لیے اپنے ساعی رہنے کی اطمینان بخش خبر بھی دے دی، جو اس کی صاف دلیل ہے کہ یہ سب قصے حضرتؒ کے ذہن اور علم میں تھے؛ کیوں کہ ظاہر ہے کہ ایسی کنائی عبارت سے کسی پہلے سے طے شدہ منصوبے ہی کو سمجھ کر قابلِ عمل درآمد سمجھا جاتا ہے، نہ کہ مجہولِ مطلق کو۔

اس لیے حاجی صاحبؒ کے خط کی غرض و غایت چندے کی اطلاع دے کر حضرت نانوتویؒ کو مدرسی کے لے بلایا جانا نہ صرف یہ کہ خط میں روایت پر محض اپنا ایک قیاسی اضافہ ہے؛ بلکہ درایتاً غیر معقول بھی ہے؛ اس لیے اس خط اور اس کے اندازِ بیان سے نہ تو حضرتؒ کی بے خبری ثابت ہوتی ہے، اور نہ قیامِ مدرسہ سے ان کی بے تعلقی؛ بلکہ اس کا عکس ثابت ہوتا ہے۔ اور اس صورتِ حال کے تحت اس خط سے حضرتؒ کے بلاوے کی غرض نہ مدرسی کے لیے بلاوا نکلتی ہے، نہ حضرتؒ کے لیے اجرائے تنخواہ کی سہولت کی خوش خبری؛ بلکہ خط کا صاف اور متبادر مفہوم صرف یہ ہوسکتا ہے کہ چندہ ہو چکا ہے، اب آپ آ کر مدرس کا اجرا کر دیں اور اسے قائم کر دیں، جس میں اب کوئی حال منتظرہ باقی نہیں ہے۔ ابتدائی مراحل چندہ وغیرہ سب طے ہو چکے ہیں۔

حضرتِ والاؒ نے اس طے شدہ منصوبے اور کارِ خیر کی عملی تاخیر گوارہ نہ کرتے ہوئے لکھ بھیجا کہ مدرس بھیج رہا ہوں، یعنی کارِ تدریس کا آغاز کر دیا جائے، اس میں کسی انتظار کی ضرورت نہیں۔ چوں کہ زمانہ خیر و برکت کا تھا، قلوب اخلاص وللّٰہیت سے پر تھے؛ اس لیے اصل مقصد کو پیشِ نظر رکھا گیا، جو تعلیم کا اجرا تھا۔ چناں چہ حاجی صاحبؒ نے حضرتؒ کے تحریر فرمانے پر تعلیم کا آغاز کرا دیا، اور حضرتؒ کی تحریر کے بعد ان رسمیات کو غیر ضروری سمجھا کہ اس خط کے بعد اجرائے تعلیم حضرتِ والاؒ کے افتتاح کرنے پر معلق پڑا رہے، جو خود ان کی منشا

کے خلاف ہے۔

اندریں صورت حاجی صاحبؒ کے خط سے حضرتِ والاؒ کی قیامِ مدرسہ سے بے تعلقی اور بے خبری کا نتیجہ نکالنا ذاتی تخیل ہے، خط کا مفہوم نہیں۔ ساتھ ہی اس پر بھی غور کیا جائے کہ حاجی صاحبؒ کے خط میں تو نہ مدرس کا ذکر ہے، نہ مدرس طلبی کا، اور نہ مدرس کے سلسلے میں کسی معاملے کے طے کرنے کا، جیسے تن خواہ وغیرہ۔ اور ادھر مزعومہ طور پر حضرت نانوتویؒ اس قصے سے مطلقاً لاعلم اور بے خبر بھی ہیں؛ مگر پھر بھی از خود مدرس کا تقرر بھی فرما دیتے ہیں، خود ہی پندرہ روپے ماہ وار مدرس کی تن خواہ بھی مقرر فرما دیتے ہیں اور ان سارے معاملات کو مکمل طریق پر طے کر کے مدرس کو بھیج بھی دیتے ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا ایک بے تعلق اور لاعلم محض آدمی کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ ایک سو اسی روپیہ سالانہ کے مستقل بوجھ کا کسی دوسرے آدمی کو خواہ مخواہ مکلّف ٹھہرا دے، اور بلا استمزاج کیے ہوئے اسے مجبور کر دے کہ وہ دواماً یہ مصارف اپنے سر رکھے؟ کم از کم عقل و فہم اس کے سمجھنے سے قاصر ہے؛ اس لیے بھی خط اور جوابِ خط کی یہ ساری صورتیں اس وقت تک معقول نہیں ٹھہر سکتیں، جب تک کہ ان دونوں بزرگوں میں قیامِ مدرسہ کا منصوبہ پہلے سے طے شدہ اور باہمی طور پر سمجھا سمجھایا نہ مانا جائے؛ ورنہ حضرت نانوتویؒ کو قیامِ مدرسہ سے بے تعلق اور لاعلم ماننے کی صورت میں حاجی صاحبؒ کا یہ کنائی خط قصہ طلب عبارت میں بھیج دینا، اور حضرت والاؒ کا جواب میں ایک تفصیلی پروگرام بنا کر لکھ بھیجنا اور حاجی صاحبؒ کے سر ایک مسلسل بار عائد کر دینا کوئی معقول بات نہیں رہتی، چہ جائے کہ اس غیر معقول صورتِ حال کو قیامِ مدرسہ سے حضرتِ والاؒ کی بے تعلقی اور لاعلمی کی حجت کے طور پر پیش کیا جائے۔

حاجی صاحبؒ کے خط کی حقیقی وضاحت:

حقیقت یہ کہ حضرت حاجی صاحبؒ کے خط کی یہ مجمل عبارت قدرتاً دوسرے جملوں کو چاہتی ہے۔ اگر یہ خط پورا نقل کر دیا جاتا، تو بات صاف ہو جاتی؛ لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ خط محفوظ ہے یا ضائع ہو چکا ہے۔ تاہم یہ غنیمت ہے کہ ابھی اس خط کے دیکھنے والے موجود اور بہ قیدِ حیات ہیں، ان کے بیان سے وہ امور جو ہم نے اس مجمل عبارت سے بہ طورِ استنباط کے پیش کیے ہیں، نصِ صریح بن جاتے ہیں۔

حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم صاحبؒ سابق صدر مدرس دار العلوم دیو بند نے فرمایا، اور سوانح قاسمی کی تالیف کے وقت لکھ کر بھی دے دیا تھا، جو شامل فائل ہے کہ میں نے حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کا وہ خط حاجی نذیر احمد صاحبؒ خلیفہ حضرت حاجی صاحبؒ (مصنف تذکرۃ العابدین) کے پاس اپنی آنکھوں سے

دیکھا اور پڑھا ہے، جو حضرت حاجی صاحبؒ نے حضرت نانوتویؒ کو لکھا تھا، اس میں صراحتاً یہ مضمون مرقوم تھا:

''وہ جو آپ میں اور ہم میں باہم مذاکرات ہوتے رہتے تھے کہ کوئی مدرسہ قائم کیا جائے، فقیر کو ایک دن خیال آ گیا اور چندے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، کل عصر مغرب کے درمیان تین سو روپے ہو گئے، اب آپ تشریف لے آئیں''۔

حضرت حاجی صاحبؒ اور حضرت نانوتویؒ کا تاسیسِ دارالعلوم کے متعلق مشترک منصوبہ:

اس جملہ سے وہ پوری بات واضح ہو گئی، جو ہم نے شائع شدہ جملے کے اسلوبِ بیان سے بہ طور استنباط عرض کی تھی کہ تاسیس مدرسہ کا منصوبہ ان دونوں بزرگوں کے علم میں تھا، باہم طے شدہ تھا، اور اجرائے مدرسہ کے لیے اسی کے تحت چندہ کیا گیا اور حضرت والاؒ کو بلایا گیا؛ اس لیے خط کی یہ تحریری اطلاع حضرتؒ کے لیے کوئی ابتدائی یا نئی خبر نہ تھی؛ اس لیے انہوں نے سارا واقعہ پیش نظر رکھ کر جواب میں سارا پروگرام تفصیل سے لکھ بھیجا، اور حاجی صاحبؒ نے اس کے مطابق اسے عملی جامہ پہنا دیا۔

نیز اسی سے یہ بھی کھل گیا کہ اس خط کے ذریعہ حضرت نانوتویؒ کو اسی مقصد کے لیے بلایا گیا تھا، جس مقصد کے لیے ان بزرگوں میں باہم مذاکرے ہوتے تھے، اور وہ یقیناً مدرس کے انتخاب وتقرر کے مذاکرے نہ تھے کہ اول تو کسی شخص کا مدرسی پر مقرر کیا جانا کوئی ایسا اہم اور پیچیدہ مسئلہ نہ تھا کہ اس پر آٹھ نو برس مسلسل مذاکرے ہوں۔

دوسرے یہ جزوی بات طبعاً مدرسے کا منصوبہ طے ہو جانے کے بعد کی تھی، نہ یہ کہ مدرسہ تو قائم نہ ہو، اور مدرس کا انتخاب وتقرر کا مسئلہ چھڑ جائے اور برسوں چھڑا رہے۔

تیسرے یہ کہ اس سے زیادہ بے معنی اور بے حیثیت بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے یہ مذاکرے اپنی مدرسی قائم کرنے کے لیے کیے ہوں؟ جب کہ ان کے ہم عصروں کے ذہنوں میں ان کی مزاجی کیفیت کا پورا علم تھا کہ کسی مدرسہ میں بیٹھ کر اور مدرس بن کر پڑھانا ان کی آزاد فطرت کے خلاف ہے، جس پر انہوں نے اپنی پوری زندگی گزاری، اور خود دارالعلوم میں بھی مدرس کی حیثیت سے کبھی نہیں پڑھایا۔ چھتہ کی مسجد میں بہ طور خود منتخب افراد کی تعلیم وتربیت کا ذاتی سلسلہ قائم رکھا، یہ نہ مدرسۂ دیوبند میں بیٹھ کر پڑھانا تھا، نہ مسجد چھتہ میں مدرسِ مدرسہ کی حیثیت سے پڑھانا تھا۔ جو بے محل طریق پر میری طرف منسوب کر کے مدینہ اخبار کے مقالے میں اس پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ مدرسی شخصی تھی نہ کہ رسمی، یا ملازماتی، اور تعلیم وتعلم آپ کا شغلِ دوامی تھا؛ مگر آزادانہ!

حضرت نانوتویؒ کا دار العلوم سے رسمی نہیں حقیقی تعلق:

چناں چہ ''سوانح مخطوطہ'' کے مصنف لکھتے ہیں:

''(حضرت نانوتویؒ کے) اخلاص کا یہ حال کہ جملہ قول وفعل آپ کے لوجہ اللہ تھے۔ ریا کا نام نہ تھا۔ طمع نفی کی بوبھی نہ تھی۔ کبھی وعظ پر اجرت نہیں لی، نہ کبھی نفسانی خواہش سے وعظ کہا، نہ کبھی قرآن وحدیث کو مال دنیا کی عوض میں پڑھا پڑھایا، جو کام تھا وہ محض للہ۔ بے طمع ہونا آپ کا ظاہر و باہر؛ کیوں کہ اگر آپ کو طمع دنیوی ہوتی، تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ سونے کی دیواریں بنالیتے۔ مدرسۂ دیوبند کے مکان کو لاکھوں اینٹوں سے تعمیر کرایا؛ مگر اپنے گھر میں ایک پھوٹا روڑا بھی نہ لگوایا''(۱)۔

اسی سوانح میں دوسری جگہ لکھا ہے:

''یہ سب کو معلوم ہے کہ مدرسۂ اسلامیہ دیوبند آپ ہی کا ساختہ پرداختہ ہے، اور کیا کچھ اس کا کارخانہ؟ کہ چھوٹی سی سرکار؛ مگر ہرگز کبھی اس کی کسی چیز سے نفع نہیں اٹھایا۔ اپنے پاس سے دینا جانتے تھے، لینے کا نام نہ تھا''(۲)۔

جس سے واضح ہے کہ آپ کی خدمتِ مدرسہ لوجہ اللہ تھی اور تعلیم اپنی شخصی تھی۔ آپ کے اس درس میں اساتذۂ دار العلوم بھی شریک ہوتے تھے؛ بلکہ فرمائش کر کے حدیث یا تفسیر کا درس شروع کراتے تھے، جیسے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، صدر مدرس دار العلوم کی فرمائش پر تفسیر کا درس شروع کرایا، جو چھتہ کی مسجد میں شروع ہوا، جس میں عموماً اساتذۂ دار العلوم شریک تھے۔ حضرت والاؒ نے اپنے شخصی درس کے لیے کچھ ہونہار طلبا منتخب کر لیے تھے، اور سفر وحضر میں ان کے پڑھانے اور تربیت دینے کا سلسلہ قائم رہتا تھا۔ بہ صورت قیامِ دیوبند چھتہ کی مسجد میں، اور بہ صورتِ سفر جہاں بھی قیام ہو، وہیں یہ درس جاری رہتا۔ حسبِ روایت مولانا مبارک علیؒ سابق نائب مہتمم دار العلوم دیوبند: ''حضرت والاؒ کا سفر گنگوہ ہوا، تلامذہ ساتھ تھے، اور وہاں ابوداؤد شریف کا درس دیا، جو اس زمانے میں معمول تھا، ناغہ نہیں فرمایا، اور سبق کچھ زیادہ مقدار میں ہوا، تو بہ طور مزاح حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ: ''یہاں اس تیز روی سے یہ طالب علم کیا خاک سمجھے ہوں گے؟''۔ حضرتؒ مسکرا دیے اور درس جاری رہا۔

بہر حال! حضرتؒ کی اس شخصی تدریس کا نہ بانی کے مسئلے سے کوئی تعلق تھا نہ ملازماتی مدرسی سے؛ اس لیے چھتہ کی مسجد کی اس تدریس کا انتساب رسمی تدریس سے اور وہ بھی میرے حوالے سے خلاف واقعہ ہے۔

(۱) سوانح مخطوطہ، ص: ۱۶۔ (۲) ایضاً۔

خلاصہ یہ ہے کہ حاجی صاحبؒ کا حضرت والاؒ کو اطلاع دے کر بلانا تدریس کے لیے نہیں تھا؛ بلکہ اجرائے مدرسہ کے لیے تھا، جس کے لیے ان بزرگوں میں برسوں مذاکرے ہوتے رہے۔

اجرائے مدرسے کے لیے حضرت نانوتویؒ ہی کو کیوں دعوت دی گئی؟

اسی کے ساتھ اس خط کا یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ حاجی صاحبؒ نے اجرائے مدرسہ کے لیے یہ دعوت آخر حضرت نانوتویؒ ہی کو کیوں دی؟ اور کسی کو کیوں نہیں دی؟ جب کہ خود دیوبند میں اہل علم وفضل دوسرے بھی تھے۔ سو اس کی وجہ حضرت نانوتویؒ کی شخصیت اور ذاتی وجاہت سے قطع نظر اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ بنیادی مذاکرات کا تعلق ہی ان سے تھا، اور حضرت والاؒ ہی نے قیامِ مدرسہ کا جذبہ ان میں پیدا کیا تھا؛ اس لیے حضرت حاجی صاحبؒ کا قیامِ مدرسہ کی اس ابتدائی جدوجہد چندہ وغیرہ کے لیے اٹھنا حضرت نانوتویؒ ہی تحریک کے زیر اثر عمل میں آیا۔ جسے حاجی صاحبؒ نے مذاکراتِ باہمی کے لفظ سے تعبیر فرمایا؛ اس لیے ان مذاکرات کی بنا پر وہ اجرائے مدرسہ کے لیے حضرت والاؒ ہی کو بلا سکتے تھے کہ یہ انہیں کی تاثیر وتصرف کے ظہور کی صورت پیدا ہو رہی تھی؛ ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت نانوتویؒ کی یہ اجتماعی رنگ کی تعلیمی تحریک، جس کے تحت ملک میں چندے کے مدارسِ دینیہ کا وجود ہوا، حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ نے ان میں پیدا نہیں کی تھی، جس سے غالباً ''منفی نگار حضرات'' بھی انکاری نہیں ہیں۔ چناں چہ مدینہ اخبار کے مقالے میں محترم مقالہ نگار نے تحریر فرمایا ہے:

> ''یقیناً مدرسے کا یہ خاکہ (اجتماعی رنگ کی تعلیمی تحریک) حضرت حاجی (محمد عابد) صاحبؒ کے ذہن میں نہ تھا، وہ محدود دائرے میں مدرسے کو چلانا چاہتے تھے''......الخ[1]۔

مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم جمعیت علمائے ہند نے فرمایا:

> ''اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ دار العلوم کے پر شوکت تصور سے حضرت حاجی (محمد عابد) صاحبؒ کا ذہن خالی تھا''[2]۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

> ''حاجی صاحب مرحوم کے سامنے (دار العلوم کا) وہ مستقبل نہ تھا، جو حضرت مولانا نانوتویؒ کو نظر آ رہا تھا''[3]۔

---

(۱) مدینہ اخبار، ۹ ربیع الاوّل ۱۳۸۵ھ)
(۲) علمائے ہند کا شاندار ماضی، ص: ۶۰۔
(۳) ارواحِ ثلاثہ، ص: ۱۸۹۔

حاجی صاحبؒ کا درویشانہ مزاج اور اجتماعیت سے پرہیز:

حقیقت یہ ہے کہ حضرت حاجی محمد عابد حسین صاحبؒ پر رنگِ سلوک غالب تھا؛ بلکہ کسی حد تک تصوف کی مروّجہ رسوم کی پابندیاں بھی تھیں، اور وہ ایک تارک الدنیا بزرگ تھے، جنوں نے (بہ تصریح مصنف ''سوانح مخطوطہ'') اپنی ساری جائداد واملاک راہِ خدا میں دے کر فقیری اور گوشہ گیری اختیار فرمالی تھی۔ ان کا اصلی ذوق گوشہ نشینی تھا۔ اسی لیے چھتہ کی مسجد کو انہوں نے اپنا قرار گاہ بنالیا تھا، اور اس میں درویشانہ انداز سے رہتے تھے۔ اجتماعیت یا علمی انداز سے کسی ہمہ گیر تحریک کے لیے اٹھنا ان کا مذاق ہی نہ تھا؛ اس لیے یہ مانا جانا مشکل ہے، اور کسی نے مانا بھی نہیں کہ: ''قاسمی تحریک'' حضرت حاجی محمد عابد حسین صاحبؒ کی تاثیر وتصرف کا نتیجہ تھی۔

دوسرے یہ کہ اجتماعی رنگ کی تحریک جس پر تعلیم کا سرپوش پڑا ہوا تھا، ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے تاثرات کا نتیجہ تھی، تا کہ تعلیمی رنگ سے تربیتی انداز میں اس ناکامی کی تلافی کی جائے۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ ۱۸۵۷ء کی تحریک جہاد میں شامل نہیں تھے کہ ان میں یہ تاثرات پیدا ہوتے، اور کوئی ہمہ گیر فکر ان میں نمایاں ہوتا؛ اس لیے یہی ماننا پڑے گا کہ حاجی صاحبؒ کی یک سوئی کی زندگی میں تعلیمی سلسلے کی یہ خاص حرکت خواہ وہ محدود ہی پیانے پر کیوں نہ ہو، حضرت نانوتویؒ ہی کی پیدا کردہ تھی، جو ان مذکورہ ''مذاکرات'' کی صورت سے چھتہ کی مسجد میں ۱۸۵۷ء کے بعد آٹھ نو برس تک وقتاً فوقتاً جاری رہی، اور جب بھی حضرتؒ کا دیو بند آنا ہوتا، تو قیام چھتہ ہی کی مسجد میں ہوتا۔ ان ایام میں اس مبارک مسجد میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب دیو بندیؒ کی آمد ورفت بھی ہوتی، جیسا کہ ''سوانح مخطوطہ'' کے مصنف نے اس کی بھی صراحت کی ہے، اور وہ بھی چھتہ ہی کی مسجد میں قیام فرماتے تھے؛ اس لیے حضرتؒ نے بھی اپنے ہنگامی قیام کے لیے اور مستقل قیامِ دیو بند کے بعد رہائش کے لیے اسی مسجد کو اختیار فرمایا۔

حضرت نانوتویؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ کا باہمی ربط وضبط:

اس گہ وبے گہ کے مسلسل قیام سے ان بزرگوں میں غیر معمولی ربط وضبط اور قلبی تعلق کے باہمی علاقے قائم ہوئے۔ حضرت حاجی صاحبؒ علم اور علما کی عظمت تو پہلے سے غیر معمولی طور پر اپنے اندر لیے ہوئے تھے، اب حضرتِ والاؒ کی پیاپے آمد سے معیت اور تبادلۂ خیالات وافکار سے علم براری اور عالم پروری کے جذبات بھی ان میں بھر گئے، اور سلسلۂ تعلیم کے اجرا وقیام کی قوتِ قریبہ بھی پیدا ہو گئے، جس سے وقت مقدر آپہنچنے پر وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے، اور مدرسہ قائم کرنے کے لیے چندہ مانگنے کے لیے انتہائی بے

نفسی سے خود ہی اپنا رومال دوسروں کے سامنے پھیلایا، جس کو حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ نے اپنی ایک طویل نظم میں، جو مدرسۂ دیوبند کے جلسۂ سالانہ تقسیم انعام، بابت ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) کے موقع پر پڑھی گئی، ظاہر فرمایا ہے: ؎

مردِ حق عابد صداقت کیش	اوّلاً گستراند رومالش
ہم بہ اخلاصِ دل دراں بہ نہاد	چیزے از طیبات اموالش
گوئیا ایں ہمہ فتوح کثیر	در رسیدہ ہمہ بہ افضالش

لیکن حاجی صاحبؒ کے ان جدید تاثرات کو جو قیامِ مدرسہ کے لیے ایک دم داعی ہو گئے، سرچشمہ کہاں تھا؟ اور یہ پر و بال کہاں سے آئے؟ تو مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ ہی اسی نظم میں سرچشمہ کا بھی پتہ دے رہے ہیں کہ وہ سرچشمہ ''فیضانِ قاسمی'' تھا، جس سے پر و بال کی یہ پرواز حاجی صاحبؒ میں اچانک رونما ہوئی۔ فرماتے ہیں: ؎

لیکن ایں طائر ہمایوں فال
شد ز قاسم عطا پر و بالش

غور کرنے کی بات ہے کہ اس نظم میں حضرت حاجی صاحبؒ کے چندہ کرنے اور رومال پھیلانے کا ذکر ہے، جو اجرائے مدرسہ سے یقیناً پہلے کی چیز ہے، اور محض مبادی میں سے؛ لیکن اسے بھی مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ ''عطائے قاسم'' سے تعبیر کر رہے ہیں، جس سے واضح ہے کہ حضرت والاؒ نے مذاکرات کے ذیل میں صرف قیامِ مدرسہ ہی کا جذبہ ان میں پیدا نہیں کیا؛ بلکہ بہ طور اصول کے یہ بھی ذہن نشین کیا کہ بنائے مدرسہ چندے کے اصول پر ہونی چاہیے، سرکاری گرانٹوں، یا امیروں کی جاگیروں کے بھروسہ پر نہ ہو، تاکہ یہ ادارہ عوامی رہے، سرکاری یا جاگیرداری نہ ہو جائے۔ غالباً اسی لیے حضرت حاجی صاحبؒ نے اجرائے مدرسہ کے لیے جب حضرت والاؒ کو بلایا، تو سب سے پہلے چندے ہی کا ذکر کیا، اور وہ بھی تعین مقدار کے ساتھ؛ ورنہ فی نفسہٖ اس کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ اس موقع پر چندہ اور اس کی مقدار کا ذکر کیا جائے۔

شاید اسی اہمیت کے پیش نظر مولانا منصور علی خاں صاحبؒ (تلمیذ حضرت نانوتویؒ) نے مدرسۂ دیوبند کے قیام کو حضرت نانوتویؒ کی طرف منسوب کرتے ہوئے خصوصیت سے اس کی بنیاد چندہ ظاہر کی ہے:

> ''خصوصاً مدرسۂ دیوبند اول مولانا مرحوم (حضرت نانوتویؒ) نے اس مدرسے کو چندے سے قائم کیا تھا''(۱)۔

(۱) مذہب منصور، ج:۲، ص:۱۷۷۔

دار العلوم کے لیے چندے کی تجویز حضرت نانوتویؒ ہی کی اسکیم تھی:

پس ایک طرف حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب اس تحصیل چندۂ مدرسہ کو ''عطائے قاسم'' سے تعبیر کر رہے ہیں، اور ایک طرف مولانا منصور علی خاںؒ اسے بنائے مدرسہ کے سلسلے میں بہ طور بنیاد کے ذکر کر رہے ہیں، اور ادھر حضرت نانوتویؒ اپنے اصولِ ہشت گانہ میں چندے کی دفعہ کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں کہ اول وآخر دنوں دفعات چندے ہی کے بارے میں لائی گئی ہیں۔ یہ تینوں وثیقے ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتے ہیں کہ حضرت نانوتویؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ میں قیامِ مدرسہ ہی کا منصوبہ طے شدہ نہ تھا؛ بلکہ چندے کی اسکیم بھی طے شدہ تھی، اور اسی کے تحت حضرت حاجی صاحبؒ نے چندہ کیا، اور پھر خصوصیت سے خط میں چندے ہی کا ذکر تعین مقدار کے ساتھ کر کے حضرتؒ کو بلایا، جس کا مقصد یہ تھا کہ سب معاملہ اول سے لے کر آخر تک آپ ہی کے اصول ومقاصد کے مطابق ہوا ہے؛ اس لیے اب آپ کو آنے میں تامل نہ ہونا چاہیے؛ بلکہ اشعار مذکورۂ بالا سے یہ حقیقت بہت صاف ہو کر عیاں ہو جاتی ہے کہ جب یہ مبادی اور تحصیل چندہ کے پر وبال اور یہ پرواز ''عطائے قاسم'' ہیں، تو قدرتی طور پر حاجی صاحبؒ کے یہ تمام اقدامات درحقیقت قاسمی اقدامات ہوئے، اور کہا جا سکتا ہے کہ قاسمی تحریک کا سب سے پہلا اثر دیوبند ہی میں مدرسۂ دیوبند کے قیام کی صورت میں نمایاں ہوا۔

یہی بنیاد تھی کہ اجرائے مدرسہ اور آغازِ تعلیم کے لیے حضرت حاجی صاحبؒ نے صرف حضرت والاؒ ہی کو بلایا، جب کہ یہ سب فیضان انہیں کا تھا۔ کیا اس کے بعد بھی یہ کہنے کی کوئی گنجائش ہے کہ دیوبند کے مدرسے کے قیام وتاسیس کا حضرت نانوتویؒ سے کوئی تعلق نہ تھا؟ بلکہ انہیں حاجی صاحبؒ کے خط ملنے سے پہلے اس کی خبر تک بھی نہیں تھی کہ دیوبند میں کوئی مدرسہ قائم ہونے والا ہے؟ میں تو عرض کروں گا کہ مدرسہ ہی کی نہیں، چندے تک کی اسکیم سے بھی حضرتؒ بے خبر نہ تھے، اور یہ ابتدائی مرحلہ بھی ان دونوں بزرگوں میں طے شدہ تھا۔ اسی لیے حاجی صاحبؒ کے خط میں اہمیت کے ساتھ چندے کی اطلاع دے کر حضرت والاؒ کو بلایا گیا، تا کہ مدرسے کی تاسیس کا عوامیت پر قائم ہونا نمایاں ہو جائے۔

اجرائے تعلیم کے وقت حضرت نانوتویؒ کی عدم موجودگی کی وجہ:

رہا یہ کہ اجرائے تعلیم کے وقت حضرت والاؒ دیوبند میں موجود نہ تھے۔ کیا اس وقت جو وہاں موجود تھے، وہ سب کے سب مدرسۂ دیوبند کے بانی تھے؟ اس لیے کہ موجود تھے۔ اگر حضرتِ والا موجود نہ تھے، تو اجرائے مدرسہ کے حق میں ان کا تحریری اذن ومنشا موجود تھا۔ ان کا تقرر کردہ اور بھیجا ہوا مدرس بہ تعین تنخواہ

موجود تھا۔ ان کی مؤثر تحریک اور مذاکروں کا نمایاں ثمرہ موجود تھا، جس کا حاجی صاحبؒ اپنے خط میں اور مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ اپنی نظم میں اعتراف فرمارہے ہیں؛ اس لیے یہ عدم موجودگی ان کے بانی ہونے کی پوزیشن میں اگر وہ بانی تھے، کیا خلل انداز ہوسکتی ہے؟

البتہ ایک سوال یہاں ضرور پیدا ہوتا ہے کہ میرٹھ سے دیوبند حضرت والاؒ کی آمد و رفت بہ کثرت تھی، اور ۱۸۵۷ء کے بعد اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی، جیسا کہ "سوانح مخطوطہ" کے حوالے سے عرض کیا جاچکا، پھر اجرائے مدرسہ کے لیے ایک دن یا چند گھنٹوں کے لیے دیوبند تشریف لے آنے میں آخر کیا رکاوٹ تھی؟ بالخصوص جب کہ اس ادارے کے قیام کے سلسلے میں برسوں مذاکرے بھی فرمائے، خواص وعوام کو آمادہ بھی کیا اور ان کا عین متمنا یہی تھا؛ لیکن جب وہ مبارک ساعت آئی کہ وہ قائم ہو، تو حضرتؒ بلانے پر بھی تشریف نہیں لائے؟

اس کا ایک ظاہری اور بڑا سبب تو حضرت والاؒ کی زندگی اور آپ کا قلبی مقام ہے، اور وہ یہ کہ آپ کمالِ تواضع وانکسار کے سبب امتیاز وشہرت اور نام آوری کے مواقع سے طبعاً گھبراتے تھے۔ امامت سے ہمیشہ گھبراتے تھے۔ خطابت ووعظ سے بے حد بچتے تھے۔ بیعت کرنے سے گریزاں رہتے تھے، اور اگر کسی کو کر بھی لیا، تو تربیت کے بعد اجازت وخلافت دینے سے گھبراتے تھے کہ شیخ کہلائیں۔ خود اجازت دینے کے بجائے کمال کسر نفسی سے حضرت گنگوہیؒ کی طرف رجوع کرادیتے تھے کہ اجازت وہاں سے لو۔ اگر حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری رحمہ اللہ حکماً حضرتؒ سے وعظ نہ کہلائیں، اور حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ بیعت کرنے پر مجبور نہ کریں، تو شاید عمر بھی وہ یہ راستہ نہ چلتے۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ زندگی اجرائے مدرسہ کے اس کھلے امتیازی مقام کو کیسے برداشت کرتی؟ اس لیے خود تشریف نہیں لائے؛ مگر جو کام خود آکر انجام دیتے، وہ بہ احسن اسلوب وہیں سے انجام دے دیا، جیسا کہ ملا محمود صاحبؒ کے بھیجنے کی تفاصیل سے اندازہ ہوسکتا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کا شمار برطانوی گورنمنٹ کے باغیوں میں:

دوسری بنیادی وجہ یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ جہادِ شاملی کے سربراہوں میں سے تھے۔ آپ کو گورنمنٹ اپنے کھلے باغیوں میں شمار کرتی تھی۔ چناں چہ اس جنگ میں شکست کے بعد آپ کا وارنٹ گرفتاری نکلا ہوا تھا، بلیک لسٹ میں نام آیا ہوا تھا اور پولیس ہر وقت تلاش وجستجو میں سرگرداں رہتی، اور شبہہ پر بھی ان مقامات کا محاصرہ کیا جاتا رہتا تھا، جہاں حضرتؒ کی موجودگی کی خبر دی جاتی تھی؛ اس لیے آپ ہر وقت گورنمنٹ کی

نگاہوں میں معتوب اور مشتبہ تھے، اور گورنمنٹ کا یہ تصور آپ کے حق میں بے محل نہ تھا کہ آپ کو ذرا بھی کوئی موقع ملے گا، تو آپ اس گورنمنٹ کی تخریب وبغاوت سے نہ چوکیں گے۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں اگر حاجی صاحبؒ کی اطلاع پر حضرتؒ خود دیوبند پہنچ کر مدرسۂ دیوبند کا افتتاح واجرا کرتے، تو حکومت کو یہ باور کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا کہ اس مدرسہ کی بنیاد باغیانہ جذبات پر رکھی گئی ہے، اور یہاں جہاد کے سوا اور کوئی تعلیم نہیں دی جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ شروع ہی سے گورنمنٹ اس کی تخریب کے درپے ہو جاتی، یا اسے قائم ہی نہ ہونے دیتی، یا چلنے نہ دیتی، اور وہ فکرِ خاص جس پر یہ مدرسہ قائم کرنا مقصود تھا (جس کا تذکرہ آگے آرہا ہے) کبھی بھی آگے نہ بڑھ سکتا۔ بہ الفاظِ دیگر وہ ساری اسکیم ہی فیل ہو جاتی، جو حضرت والاؒ کے ذہن کی امانت بنی ہوئی تھی۔

ادھر حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ جن سے نو برس تک اس اجرا وقیامِ مدرسہ کے مذاکرے ہوتے تھے، نہ سیاسی لائن کے آدمی تھے، اور نہ اس تحریکِ جہاد میں شریک تھے۔ ایک صوفی صافی تارک الدنیا اور گوشہ نشین؛ مگر بااثر بلکہ وسیع الاثر بزرگ تھے، جن کے خلاف انگریزوں کے ذہن میں کوئی تصور اور کوئی جذبہ نہ تھا؛ اس لیے حضرت والاؒ نے اپنی انتہائی دانش مندی سے باوجود اطلاع ودعوت کے اجرائے مدرسے کے وقت خود دیوبند سے غیر حاضر رہ کر یہی ضروری سمجھا کہ مدرسے کا افتتاح ان کی عدم موجودگی میں حضرت حاجی صاحبؒ کے ذریعے عمل میں آئے، تاکہ ابتدا ہی سے گورنمنٹ مدرسے کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنا نہ شروع کردے، اور وہ فکر جو اس مدرسے کے ذریعے چلانا مقصود ہے، اوّل مرحلے ہی میں محو نہ کر دیا جائے۔ مدرسہ جم جانے اور اس کے اثرات ملک میں پھیل جانے کے بعد قدرتی طور پر ایسے خطرات کا پیش آنا یقینی نہیں رہ سکتا تھا؛ اس لیے ابتدا ہی میں حضرتِ والاؒ نے اس کی رعایت ضروری سمجھی اور وقت پر اپنی غیر حاضری سے ان خطرات کا سدِ باب فرما دیا۔

گلاؤٹھی کے مدرسے کے خلاف حکومتِ وقت کا رجحان:

اس قسم کے خطرات اس دور میں محض احتمالی نہ تھے؛ بلکہ واقعاتی شکل لیے ہوئے تھے۔ چناں چہ حضرت والاؒ ہی کے بعض قائم فرمودہ مدارس کے اوّل مرحلے میں یہ خطرہ عملی صورت میں پیش آیا، اور مدرسے کو اس وقت تک بند کر دینا پڑا، جب تک حالات اطمینان بخش نہ ہو گئے۔ حضرت والاؒ نے گلاؤٹھی پہنچ کر اپنے ایک متوسل منشی مہربان علی صاحبؒ رئیس اعظم گلاؤٹھی کو مدرسہ قائم کرنے پر آمادہ فرمایا۔ مقررہ وقت پر انہوں نے سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے حضرتِ والاؒ کو دعوت دی، آپ نے گلاؤٹھی پہنچ کر ۱۲۹۲ھ/

(۱۸۷۵ء) میں جو مدرسۂ دیوبند کی عمارت بننے کا سال ہے، مدرسے کا اجرا فرمایا اور خود ہی اس کا نام ''منبع العلوم'' تجویز فرمایا۔ مدرسے کی مدرسی کے لیے حضرتِ والاؒ نے اپنے بڑے داماد مولانا عبداللہ صاحب انبیٹھوی کو تجویز فرما کر بھیجا، جن کے ساتھ ان کے صاحب زادے مولانا محمد میاں صاحب مہاجر کابل اور خود حضرتِ والاؒ کے صاحب زادے (میرے والد بزرگ وار) حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ بہ حیثیت طالب علم کے تھے۔ مدرسہ کی تاسیس پر چھ مہینے ہی گزرنے پائے تھے کہ کلکٹر نے منشی مہربان علی صاحبؒ کو بلا کر تہدید آمیز لہجے میں کہا کہ کیا اس مدرسہ کے بنیاد مولوی محمد قاسم نے رکھی ہے؟ اور کیا اس میں جہاد اور بغاوت کی تعلیم دی جارہی ہے؟ منشی صاحب گھبرا گئے اور انہوں نے بہت ہی دب کر یہ جواب دیا کہ جی نہیں، وہ تو ایک مکتب ہے، جس میں نماز اور روزے کے کچھ مسائل بتا دیے جاتے ہیں اور کچھ قرآن شریف کی تعلیم دے دی جاتی ہے؛ مگر کلکٹر کا انداز دیکھ کر منشی صاحبؒ موصوف اس قدر مرعوب اور خوف زدہ ہوئے کہ انہیں آ کر مدرسہ بند کرنا پڑا، اور مولانا عبداللہ صاحبؒ کو مجبوراً جواب دینا پڑا۔ کچھ عرصے بعد جب یہ قصہ ماضی ہو گیا، تب پھر از سرِ نو مدرسہ میں تعلیم شروع ہوئی اور مدرسے کا ثانوی وجود ہو سکا۔

یہ واقعہ حضرت مولانا محی الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس مدرسۂ گلاؤٹھی نے مولانا بشیر احمد خاں صاحب مرحوم مدرس دار العلوم دیوبند سے بیان فرمایا، اور مولانا موصوف نے دار العلوم کے بزرگوں کے ایک اجتماع میں، جس میں یہ احقر بھی حاضر تھا، یہ واقعہ نقل فرمایا۔ اس سلسلے میں مولانا ممدوحؒ نے اس مدرسے کی تاسیس کے محرکات کے بارے میں ایک لطیفہ بھی نقل فرمایا کہ: منشی مہربان علی صاحبؒ کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، انہوں نے اپنے شیخ حضرت نانوتویؒ سے اس بارے میں دعا کی درخواست کی۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ تم گلاؤٹھی میں دینی مدرسہ قائم کر دو، تو اللہ تعالیٰ تمہیں پسری اولاد دے گا۔ اس پر منشی صاحبؒ نے قیامِ مدرسے کا ارادہ کیا، اور حضرتِ والاؒ کو گلاؤٹھی بلا کر اس کا سنگِ بنیاد رکھوایا؛ لیکن چھ ماہ کے اندر جب وہ کلکٹر کی غضب ناکی کا واقعہ رونما ہوا، اور منشی صاحبؒ نے مدرسہ بند کر دیا، تو دیوبند آ کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے مدرسہ بند کرنے کا واقعہ ذکر کیا، مولاناؒ نے جوش اور جذبے سے فرمایا کہ ''یہ نہیں تو وہ بھی نہیں''۔ اگر مدرسہ نہیں تو نرینہ اولاد بھی نہیں۔ چناں چہ منشی صاحب نے محض نرینہ اولاد کے لیے دوسری شادی کی؛ مگر نرینہ اولاد عمر بھر کبھی نہ ہوئی۔

بہر حال! عرض کرنا یہ ہے کہ اس دور میں مدرسہ، یا دوسرا ادارہ خصوصیت سے حضرت نانوتویؒ کے انتساب سے برطانوی گورنمنٹ کی نگاہوں میں کھٹک جاتا تھا، اور وہ اس کے درپئے تخریب ہو جاتی تھی۔ اگر

حضرتِ والاؒ مدرسۂ دیوبند کے اجرا کے لیے میرٹھ سے دیوبند پہنچ کر خود مدرسے کا اجرا فرماتے، تو ممکن تھا کہ یہی حشر اس کا بھی ہوتا، جو مدرسۂ گلاؤٹھی کا ہوا؛ بلکہ اس سے زیادہ؛ کیوں کہ گلاؤٹھی کا مدرسۂ دیوبند کے مدرسے سے نو برس بعد جاری ہوا، جب کہ ملک میں برطانوی حکومت کی طرف سے امن وامان کا اعلان ہو چکا تھا، اور ملک کے کام اپنی اپنی جگہ جم گئے تھے؛ لیکن حضرت نانوتویؒ اور ان کے انتساب سے جاری شدہ کاموں کے بارے میں حکومت کی کھٹک بہ دستور باقی تھی، تو نو برس پہلے جب کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے آثار پوری طرح مضمحل بھی نہ ہونے پائے تھے، حضرتؒ کی نسبت سے جاری شدہ کام اور وہ بھی تعلیمی ادارہ حکومت کو کس قدر کھٹکتا اور وہ اس کے استیصال میں کیا کچھ نہ کرتی؟ اس لیے حضرتؒ نے کمالِ احتیاط سے مصلحتاً مدرسے کے ابتدائی ایام میں بہ سلسلہ اجرا وقیامِ مدرسہ آگے آنا پسند نہیں فرمایا، گو اندرونی طور پر اس کے ابتدائی مراحل اور سلسلۂ تعلیم کے آغاز کے وسائل، جیسے مدرس کا تقرر وتعین واجرائے تنخواہ اور مستقبل میں مساعی کی بشارت وغیرہ کے مبادی سب آپ ہی نے طے فرمائے۔

پس اجرائے مدرسہ کے وقت حضرتؒ کی اس عدم موجودگی کو بانیٔ مدرسہ ہونے کی نفی کے لیے حجت بنانا صرف لفظ ''عدم موجودگی'' کو سامنے رکھ کر اس کے پیچھے کی ساری تاریخ اور واقعات سے لاعلمی پر مبنی ہے۔

﴿حَفِظْتَ شَيْأً وَغَابَتْ عَنْكَ أَشْيَاءُ!﴾

بہر حال! یہ عدم موجودگی بہ وقتِ اجرا حضرت والاؒ کے بانی ہونے کی نفی کے لیے کارگر نہیں ہوسکتی، جب کہ واقعات کا ذکر کردہ تسلسل سامنے موجود ہو۔ نیز مدرسۂ دیوبند کے اجرا وقیام سے حضرت نانوتویؒ کی بے تعلقی جو اس خط کی ایک ناتمام عبارت سے ثابت کی جاری ہے، یوں بھی مستبعد اور بعید از قیاس ہے کہ ایک ایسی شخصیت جو عمومی طور پر اس دور میں ایک ہمہ گیر تعلیمی تحریک اور اجرائے مدارس کی محرک اعظم تسلیم کی گئی ہو، اور اس نے جگہ جگہ خود پہنچ کر مدارس قائم بھی کیے ہوں، اس کا خود اپنے گھر میں قیامِ مدرسہ سے نہ صرف بے تعلق؛ بلکہ لاعلم محض ہونا غیر قدرتی ہے۔ حضرتؒ کی ہمہ گیر شخصیت کے لیے زیادہ موزوں اور شایانِ شان یہی ہوسکتا تھا کہ وہ باہر سے پہلے اپنے گھر کی زیادہ فکر کریں اور اپنی اسلامی تعلیمی تحریک کو زیادہ سے زیادہ دیوبند میں ابھاریں، تا کہ باہر والوں کے لیے مثال قائم ہو، اور تحریک آگے بڑھے۔ سو اندازہ ہوتا ہے کہ حضرتِ والاؒ کے فیضان نے پہلے دیوبند ہی کو تاکا ہے، اور اس کے بعد ہی طبعی ترتیب سے آپ درجہ بہ درجہ آگے بڑھے ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کی اصلاحی تحریک:

''سوانح مخطوطہ'' کے مصنف نے حضرتِ والاؒ کو آفتاب سے تشبیہ دیتے ہوئے دیوبند کو قمر کہا ہے، اور بتایا ہے کہ اس سے ہندوستان کے شہر اور قصبے روشن ہوئے، اور یہ قمر آفتابِ قاسمی سے چمکا، تو صورتِ دلیل یہ ہو جاتی ہے کہ آفتاب نے قمر کو روشن کیا، اور قمر نے پورے ملک پر اپنا نورانی سایہ پھیلا دیا، جس سے یہ طبعی ترتیب نکل آئی کہ آپ نے پہلے اپنے گھر کو ہی چمکایا، بعد میں ماحول کی طرف توجہ فرمائی، جس کو ''سوانح مخطوطہ'' کے مصنف نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

> ''وہ آفتابِ عالم تاب (حضرت نانوتویؒ) مشرقی نانوتہ میں طلوع ہوا، اور زمین دیوبند کو منور فرمایا، اور منور بھی کیسا؟ قمر بنا دیا اور اس قمر سے تمام ہندوستان کے قصبوں اور شہروں کو روشن کر دیا۔ دیوبند کے حدود دہلی سے بڑھ گئے۔ دیوبند یا ایک کوردہ تھا، یا ایسا نام روشن ہوا کہ مرکز خواص وعوام ہو گیا اور دار العلم بن گیا''(۱)۔

رہا یہ کہ دیوبند کی اس ماہ تابِ ضیا کی نوعیت کیا تھی؟ تو سچ پوچھیے تو نورانیتیں دو ہی ہیں: نورِ اخلاق اور نورِ علم۔ سو حضرتِ والاؒ نے تحریکِ خاص سے خواص کو مذاکرات کے ذریعے آمادہ کرنے کے ساتھ ساتھ اصلاحی انداز میں عام اہل دیوبند کی طرف دونوں ہی طریقوں سے توجہ فرمائی۔ ان کی پہلی توجہ اصلاحِ اخلاق ومعاشرت کی طرف منعطف ہوئی، اور جو جاہلانہ رسوم ورواج یہاں جڑ پکڑ چلے تھے ان کا انسداد فرمایا:

> ''جب مولانا کا چند روز دیوبند میں قیام ہوا، تو آپ کو اہل دیوبند کے حال پر رحم آیا، اور ان کی درستی اور اصلاحِ معاش ومعاد کی طرف متوجہ ہوئے''(۲)۔

قصبۂ دیوبند کی پانچ قدیم خرابیوں کی اصلاح:

جس کی تفصیل دوسری جگہ یہ کی ہے:

اس قصبے میں پانچ بنیادی خرابیاں گھر کر چکی تھیں، اور ان سے پھر دوسری بیماریاں نشو ونما پا رہی تھیں:

(۱) ایک حج کی طرف کوئی عام توجہ باقی نہیں رہی تھی، اور ایک عظیم رکن اسلام متروک ہو چکا تھا، جس سے اجتماعی عبادت وعمل کی زندگی برباد ہو چکی تھی۔

(۲) دوسرے نکاحِ بیوگان کہ اسے ایک قبیح ترین عیب سمجھا جانے لگا تھا، اور اس کا نام لینے سے بھی تلواریں کھنچ جاتی تھیں، جس سے معاشرہ اور رہن سہن فاسد ہو کر رہ گیا تھا۔

---

(۱) سوانح مخطوطہ، ص:۱۹۔ (۲) ایضاً: ص ۳۹)

(۳) تیسرے نفاقِ باہمی جس سے مقدمہ بازی کی کثرت ہوگئی تھی، اور برادریوں میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ اتفاق واتحاد کا نشان مٹ چکا تھا، جس سے قوت اور قومی طاقت کا فقدان ہو چکا تھا۔

(۴) چوتھے بیاہ شادی کی مسرفانہ رسمیں، فضول خرچی اور اس پر مفاخرت سے معیشت تباہ ہو رہی تھی۔

(۵) پانچویں غمی کی جاہلانہ رسمیں، جس سے عقائد وافکار وخیالات کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ بالخصوص تشیع کا زیادہ غلبہ تھا۔ ہر سنی آدھا شیعہ تھا، تقریباً ہر مسجد سے تعزیہ اٹھتا تھا، ماتمی مجلسیں ہوتی تھیں اور عزاداری اپنے پورے عروج پر تھی۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ یہ سب کچھ سنیت کے نام پر ہو رہا تھا۔

غرض یہ پانچ بنیادی خرابیاں تھیں، جس سے عبادتی زندگی، معاشرتی زندگی اور معاملاتی زندگی برباد ہو رہی تھی۔ حضرتِ والاؒ نے مواعظ اور تدابیر سے ان رسوم کا انسداد فرمایا۔ نہ صرف وعظ وپند سے؛ بلکہ تنظیم اور عملی قوت سے بھی رؤسائے دیوبند اور برادریوں کو جمع کر کے سب کے اتفاق سے حضرتِ والاؒ نے ایک کتبہ اور وثیقہ لکھایا، جس میں عہد کیا گیا تھا کہ شادی غمی کی رسمیں یک قلم موقوف، مستورات کا ہندوانہ لباس یک قلم ختم، اور نزاعاتِ باہمی کا تصفیہ حسبِ اصول شرعیہ ہوا کرے، اور اس کے لیے اس عہد نامے میں سب سے پہلی دفعہ یہ تھی کہ کوئی مقدمہ یا معاملہ، جس میں فریقین مسلمان ہوں، سرکاری کچہری میں نہ جائے، اور ایک عدالتِ شرعی (محکمۂ قضا) مقرر ہو، جس کے حاکم حضرتِ والاؒ ہوں۔ چناں چہ یہ شرعی عدالت قائم ہوئی، اور برسہابرس کے الجھے ہوئے مقدمات، جنہوں نے قصبے میں نااتفاقی اور ناچاقی پھیلا رکھی تھی، منٹوں میں طے ہونے لگے، اور لوگوں میں باہمی میل ملاپ اور محبت وودادکی روح دوڑ گئی۔ جیسا کہ ''سوانح مخطوطہ'' میں صفحہ ۴۵ سے صفحہ ۴۷ تک یہ تمام تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

دوسری توجہ تعلیم کی طرف فرمائی، جس سے اصل دین قلوب میں متعارف ہو، اور تمام دینی مقاصد کے ذہنوں میں جاگزیں ہونے کی صورت پیدا ہو جائے، جب کہ جہالت نے ان کے قلوب کو جکڑ لیا تھا، جس کا واحد ذریعہ تعلیمی مدرسے کا قیام ہی ہو سکتا تھا، جو حضرتِ والاؒ کی بنیادی تحریک تھی؛ لیکن اس کے لیے عام قلوب میں استعداد پیدا کی جانی ضروری تھی۔ جب تک عوام میں اپنی جہالت اور علم کی ضرورت کا احساس نہ ہوتا، قیامِ مدرسہ ممکن نہ تھا، جو حقیقتاً ان ہی کی اعانت کا محتاج تھا۔ سو اس سلسلے میں حضرتِ والاؒ نے بھرپور توجہ فرمائی۔ خواص وعوام دونوں پر اثر ڈالا، اور اپنی اپنی نوعیت سے دونوں حلقوں کے ذہن کو بنایا، جس کی قدرتی صورت یہ بنی کہ قیام مدرسہ سے بہت پہلے ہی سے حضرتِ والاؒ کی آمد ورفت دیوبند میں شروع ہو چکی تھی۔ آپ کے قرابتی تعلقات اہل دیوبند سے کافی تھے۔ آپ کی بڑی بہن دیوبند ہی میں بیاہی تھیں، آپ کے

والد ماجد کی بہن، یعنی آپ کی پھوپھی بھی دیو بند ہی میں بیاہی گئیں۔ پھر خود آپ کی شادی بھی دیو بند میں ہوئی۔ اس بنا پر دیو بند میں آمد و رفت بہ کثرت رہتی تھی، اور دیو بند مثل آپ کے وطن ثانی کے تھا۔ ۱۸۵۷ء/ کے بعد یہ آمد و رفت اور بھی بڑھ گئی، اور قیام کچھ زیادہ ہونے لگا، جیسا کہ ''سوانح مخطوطہ'' میں مرقوم ہے۔ چوں کہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب دیو بندیؒ اور حاجی محمد عابد صاحبؒ چھتہ کی مسجد میں قیام پذیر تھے، حضرتِ والاؒ نے ان بزرگوں کی وجہ سے اسی مسجد میں قیام کیا، اور ان دونوں بزرگوں سے کمال درجے کا انس اور ربط ضبط ہوگیا۔ یہی زمانہ ان مذاکرات کا ہے، جو قیامِ مدرسہ کے سلسلے میں حضرتِ والاؒ نے ان حضرات سے کیے اور ان کے ذہن میں اس دور کے مصیبت زدہ اور شکست خوردہ مسلمانوں کو سنبھالنے اور ابھارنے کے لیے تعلیمی تحریک پیوست کی، اور ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں بہ صورتِ مرقومہ بالا اس کا ظہور ہوا۔ صاحبِ سوانح مخطوطہ لکھتے ہیں:

''مولانا مرحوم (حضرت نانوتویؒ) کی دیو بند میں بہت سی قرابتیں قدیمہ و جدیدہ ہیں، اس لیے مولاناؒ کی آمد و رفت یہاں اکثر رہتی تھی؛ مگر آزادی اس درجے بڑھی ہوئی تھی کہ نہ کسی سے رلنا نہ ملنا، سب سے الگ رہنا؛ مگر ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) میں جو کہ چوبیس سال کا عرصہ ہوا آپ کی دیو بند میں آمد و رفت اور زیادہ بڑھ گئی اور قیام بھی زیادہ سے زیادہ ہوا۔ یہ وہ سال مبارک ہے، جس میں دیو بند بختِ خفتہ بے دار ہوا، اور ظلم و جہل کی رات تمام ہوئی، اور علم و عمل کی صبح صادق نمودار ہوئی۔ اسی زمانے میں جناب مولوی رفیع الدین صاحب و جناب حاجی محمد عابد صاحب دیو بندی سلمہما اللہ تعالیٰ، جن کی مختصر کیفیت آگے عرض کروں گا، چھتہ کی مسجد میں قیام پذیر تھے۔ مولانا نے ان بزرگوں کی وجہ سے اسی مسجد میں قیام کیا اور ان دونوں بزرگوں سے کمال درجے کا اتحاد پیدا ہوگیا''(۱)۔

ظاہر ہے کہ ۱۲۷۴ھ/(۱۸۵۷ء) کے بارے میں صاحبِ سوانح مخطوطہ کا یہ کہنا کہ ظلم و جہل کی رات ختم ہوئی، اور علم کی صبح صادق نمودار ہوئی، قیامِ مدرسہ کی طرف تو اشارہ ہو ہی نہیں سکتا؛ کیوں کہ مدرسہ کا قیام تو اس سے نو سال بعد ۱۲۸۳ھ/(۱۸۶۶ء) میں ہوا ہے؛ اس لیے یہ علم کی صبح صادق درحقیقت علم کی وہی داغ بیل، یعنی قیامِ مدرسہ کے سلسلے کے باہمی مذاکرے ہیں، جن کے نتیجے میں نو سال بعد مدرسہ کا قیام عمل میں آیا۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صاحبِ سوانح مخطوطہ جیسے حضرات اس ابتدا ہی سے انتہا کو سمجھ گئے تھے کہ یہ مذاکرے کچھ رنگ لانے والے ہیں اور علم کی پو پھٹنے کی خبر دے رہے ہیں۔ نیز صبح صادق کی نمود کو

---

(۱) سوانح مخطوطہ، ص:۲۹۔

پورے دیوبند کی طرف منسوب کر کے یہ کہنا کہ اس قصبے کے بختِ خفتہ بے دار ہو گئے، اس کی علامت ہے کہ صاحبِ سوانح کے نزدیک پورے قصبے پر ان مذاکرات کے اثرات پڑ چکے تھے۔ چناں چہ ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) سے قبل کی آمد کے بارے میں صاحبِ سوانح کا یہ کہنا کہ حضرتؒ میں یک سوئی کا غلبہ تھا، تو ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) کے بعد کی آمد کا صاف مطلب یہ نکلا کہ اب حضرتِ والاؒ حریم اختفا سے نکل کر باذن اللہ رلنے ملنے اور سب میں گھل مل جانے کے مقام پر آ چکے تھے، تاکہ انہیں بھی اپنی حقیقی روح سے آشنا بنائیں، اور یہ حقیقی روح وہی قاسمیت اور علمی تحریک تھی جسے گھل مل کر آپ نے عوام آشنا بنایا، اور جسے صاحبِ سوانح نے علم کی صبح صادق ہونے سے تعبیر کیا ہے، جو ۱۸۶۶ء میں علم کا سورج طلوع ہونے کی خبر دے رہی تھی۔

بہر حال! اس طرح آپ نے دیوبند کو علم اور اخلاق دونوں سے آراستہ کرنے کی جدوجہد فرمائی، تاکہ دیوبند کی مثال سے پورا ملک اور پورے ملک سے پھر پورا عالمِ اسلام منور ہو سکے۔ چناں چہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس حقیقت کو تاریخی طور پر واشگاف بھی کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جب وہ طبیبِ روحانی (حضرت نانوتویؒ) اپنی قوم (اہل دیوبند) کی اصلاح (رسوم مروجہ وقبائح اخلاق ومعاشرہ) سے فارغ ہوا، تمام ہندوستان کے مسلمانوں پر نظر ڈالی اور بہ نظرِ غور دیکھا، تو دریافت کیا کہ مادۂ جاہلیت بعض کے اندر پیدا ہو چکا ہے، اور خوف ہے کہ اس مادے سے امراضِ متعدی پیدا ہو جائیں اور رفتہ رفتہ وہی امراض وبائی ہو کر ایک عالم کو ہلاک کر دیں، اور اس مرض کا چلتا ہوا نسخہ علم دین ہے، جہاں تک ممکن ہو اس کی اشاعت میں سعی کی جائے۔ چناں چہ مدرسۂ اسلامی عربی دیوبند جاری کیا''(۱)۔

اس سے واضح ہے کہ حضرتِ والاؒ کا ملک سے پہلے اپنے گھر کی طرف توجہ فرمانا محض قیاسِ جلی ہی کے مطابق نہیں؛ بلکہ واقعہ بھی یہی ہے کہ آپ نے سب سے پہلے اہل دیوبند کی طرف توجہ فرما کر پہلے خواص کا ذہن بنایا، جس کی طرف حضرت حاجی صاحبؒ نے مذاکرات کے عنوان سے اشارہ فرمایا، اور پھر عوام کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔

معاشرے کی اصلاح کے بعد تعلیمی تحریک کا اجرا:

ابتداً اصلاحِ رسوم اور اصلاحِ معاشرہ کا وظیفہ انجام دیا، پھر اصل دین دلوں میں جمانے کے لیے

---

(۱) سوانح مخطوطہ، ص: ۹-۴۷۔

تعلیمی تحریک کے سلسلے سے مدرسہ کا قیام عمل میں آیا، تاکہ اصلاحی سلسلہ تعلیمی راستے سے آگے بڑھے اور پختہ ہو کر ملک گیر ہو جائے۔ اس کے مبادی اور ابتدائی مراحل طے کرنے میں حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پیش قدمی فرمائی۔ اب آگے یہ ان اکابر اہل اللہ کی للّٰہیت اور بے لوث جذبۂ خدمت کی بات ہے کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے تو ازراہِ حق پسندی اجرائے مدرسہ کے لیے حضرت نانوتویؒ کو بلانا ضروری سمجھا، جب کہ ان میں یہ جذبہ اور ابتدائی عمل کا ابھار حضرتِ والاؒ ہی کے مذاکرات سے پیدا ہوا تھا، جو ان کے خط سے ظاہر ہے، اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ازراہِ عجز و نیاز اور بہ مصالح مذکورہ اپنی آمد کے انتظار میں اس کارِ خیر کا تعین کر کے دیوبند بھیج دیا، تاکہ تعلیم کا اجرا بلا کسی تاخیر و انتظار کے جلد عمل میں آ جائے۔ بہر حال! وقت کے قدرتی تقاضے اور تاریخی تصریحات کے بہ موجب تحریکِ قاسمی کا اولین نقش قدرتی طور پر پہلے دیوبند ہی پر پڑنا چاہیے تھا اور پڑا، کہ یہی نقشِ اوّل آخر کار نقشِ ثانی کا پیش خیمہ بن سکتا تھا، جو پورے ملک کے لیے بنا۔

بہر حال! حاجی صاحبؒ کے خط کی مختصر عبارت کے ساتھ اس کے قدرتی ٹکڑوں کو ملائے جانے سے مدرسۂ دیوبند کا یہ ابتدائی اجرا جو حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا، حضرت نانوتویؒ سے اس طرح وابستہ ہو جاتا ہے کہ حاجی صاحبؒ کا اقدام در اصل حضرتِ والاؒ ہی کا اقدام تھا، اور اجرائے تعلیم کے وقت ان کی عدم موجودگی سے بانی ہونے کی پوزیشن میں کوئی خلل واقعہ نہیں ہوتا کہ اسے وجہِ انکار بنایا جائے؛ بلکہ خط کی ان تصریحات کے بعد یہ انکار ﴿تَوْجِیْهُ الْقَوْلِ بِمَا لَا یَرْضٰی بِهِ الْقَائِلُ﴾ کا مصداق ہو کر رہ جاتا ہے؛ اس لیے یہ نفی حیرت ناک ہے کہ دیوبند کے مدرسہ کی تاسیس سے حضرت نانوتویؒ حضرت حاجی صاحبؒ کے خط پہنچنے تک بے تعلق؛ بلکہ لاعلم محض تھے، جب کہ خواص و عوام دونوں کا تاثر اس بارے میں حضرتؒ ہی کے مذاکروں اور تحریک سے ہوتا رہا، جس کا اندازہ حضرت حاجی صاحبؒ کے خط اور مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کی نظم سے ہوتا ہے، اور پورے قصبے کے جذبے اور تاثر کا اندازہ خود حضرتِ والاؒ کی تقریر کے ایک جملے سے اور صاحبِ سوانح مخطوطہ کی عبارت سے ہو رہا ہے۔ دونوں صورتوں میں حضرت والاؒ کی مدرسۂ دیوبند کے قیام و اجرا سے بے تعلقی اور لاعلمی بے بنیاد ہو کر رہ جاتی ہے، جس پر "منفی نگار حضرات" نے اپنے مقالات میں زور دیا اور اسے منفی دعوے کی حجت کے طور پر استعمال کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ منفی پہلو پر زور دیتے ہوئے حضرت نانوتویؒ کے بانیٔ مدرسۂ دیوبند نہ ہونے کی دلیل میں حضرت حاجی صاحبؒ کا جو خط ناتمام انداز سے پیش کیا گیا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ نفی نہیں نکلتی؛ بلکہ اس

کے برعکس اثبات نکل رہا ہے، اور خط کے باقی ماندہ جملے ملا لینے سے تو مستقلاً اس نفی کا رد نکل آتا ہے۔

ایک نامعلوم وغیر محقق رسالے کا حوالہ:

رہا وہ کہن سال رسالہ، جسے مدینہ اخبار میں محترم مقالہ نگار نے تخمینی طور پر نصف صدی سے زائد کی عمر کا بتلایا ہے، اور حضرتِ والاؒ کے بانی ہونے کی نفی میں اسے بہ طور سندِ نفی پیش کیا گیا ہے؛ اس لیے قابل بحث نہیں کہ نہ اس کا نام معلوم، نہ مصنف کا پتہ، نہ سن تصنیف۔ اگر اس رسالے کی تخمینی عمر کے ساتھ مصنف کا بھی کوئی تخمینی پتہ نشان دے دیا جاتا، اور تخمینی ہی طور پر اس تحریر کا کوئی اسم ورسم بھی سامنے رکھ دیا جاتا، تو اس پر کچھ عرض کیا جاتا؛ لیکن تحریر کی اس گم نامی کی صورت میں عرض بھی کیا جائے، تو کیا عرض کیا جائے؟ پھر جو کچھ اس گم نام تحریر میں کہا گیا ہے، (مثلاً حضرت نانوتویؒ کے بانی ہونے کا قصہ ۱۹۰۵ء سے شروع کیا گیا ہے، اس سے پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ وہ بانئ مدرسہ ہیں)، سو اس کی حقیقت کچھ تو خود حضرت حاجی صاحبؒ کے خط کی عبارت سے، کچھ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کی نظم سے اور کچھ سرسید اور مولانا منصور علی خاںؒ وغیرہ کے نوشتوں سے اور کچھ سوانح مخطوطہ کی تصریحات سے سامنے آ چکی ہے، جو یقیناً ۱۹۰۵ء سے پہلے کی بات لکھ رہے ہیں، نہ کہ گورنر صاحب والے جلسے اور اس کے بعد کی۔ نیز اس کے بارے میں اور کچھ شہادتیں آگے بھی آنے والی ہیں۔

اصل بانی کا تعیّن:

بہر حال! جب حضرتِ والاؒ کے بانی ہونے کی نفی کالعدم ہوگئی، جس کا واقعات نے ساتھ نہیں دیا، تو اصل سوال پھر لوٹ آیا کہ بانی کون ہے؟ اور یہ کہ اوپر کی عرض کردہ متضاد روایات کو سامنے رکھ کر آج کس کو بانی کہا جائے اور کس کو نہ کہا جائے؟ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہوسکتا، جب تک کہ روایات کا تضاد ختم نہ ہو، یا متضاد روایتیں ختم نہ ہوں، یعنی صورتیں دو ہی ہیں: ایک متضاد روایتوں میں ترجیح وانتخاب کہ کسی ایک روایت کو قرائن کی مدد سے ترجیح دے کر بقیہ کو رد کر دیا جائے، دوسرے تطبیق اور جمع بین الروایات کہ کسی ایک روایت کا بھی نہ انکار کیا جائے، نہ اسے چھوڑا جائے؛ لیکن سب روایتوں کو جمع کر کے ان کا صحیح محمل متعین کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بغیر بانی کا تعین نہیں ہوسکتا۔

رفعِ تضاد کی پہلی صورت، یعنی رد وانکار اور ترجیح وانتخاب رواۃ کی ضبط وعدالت اور جلالتِ شان کے لحاظ سے دشوار تر اور مشکل ہے، بالخصوص جب کہ وجوہِ انکار بھی منقح نہیں ہیں؛ اس لیے احقر کے خیالِ ناقص میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ان روایات میں سے کسی ایک کو بھی رد کیا جائے، یا کوئی ایسی تاویل کی

جائے، جو محض لفظی ہیر پھیر سے تعلق رکھتی ہو، اور دل اسے قبول نہ کرتا ہو؛ اس لیے کہ اتنے اکابر کی شہادتوں کو بہ یک جنبش قلم غلط ٹھہرا کر کسی ایک شخصیت کے بانی ہونے اور دوسری کے بانی نہ ہونے پر اصرار کیا جانا، خواہ وہ حاجی محمد عابد صاحبؒ ہوں، یا حضرت نانوتویؒ، کم از کم ان روایتوں اور راویوں کے منصب ومقام سے میل نہیں کھاتا، اور اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ مخالف دستاویزی تحریرات باہم ٹکرانے کے لیے نہیں ہیں، کہ ایک سے دوسری کو ساقط الاعتبار بنایا جائے؛ ورنہ ان سب کی دستاویزات ساری کی ساری ختم ہو جائے گی، اور کوئی ایک بھی بانی ثابت نہ ہوگا؛ بلکہ راویوں کی ثقہ وعدالت اور تقدیس وحرمت اس کی مقتضی ہے کہ ان سب روایتوں کو قبول کر کے ان میں بہ لحاظ نوعیتِ واقعات تطبیق دی جائے، اور سب کو اپنے موقع پر قرائن وشواہد اور واقعات کی مدد سے چسپاں کیا جائے، جس کی نوعیت اس کے سوا دوسری نہیں ہے کہ یہ سب حضرات بہ حیثیت مجموعی بانی ہیں۔ جہاں تک اس مسئلے کی تفصیل کا تعلق ہے، اس کی نوعیت یہ محسوس ہوتی ہے کہ مدرسۂ دیوبند کی یہ ساری بنائیں جن کی رو سے مختلف حضرات کو بانی کہا جا رہا ہے، درحقیقت ایک بنا کے مختلف پہلو ہیں، جو حسبِ مناسبت مختلف حضرات کے ذریعے رونما ہوئے ہیں۔

قدرتی بات ہے کہ جب بھی کسی جماعتی نصب العین یا عمومی ادارے کے قیام کا مسئلہ سامنے آیا، تو طبعی طور پر اس کے قیام وانصرام میں مختلف شخصیتیں جمع ہو کر اپنی اپنی نوعیت سے آگے بڑھتی ہیں، اور اپنی اپنی صلاحیتیں عمل میں لا کر ہر ہر فرد اپنے اپنے رنگ سے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے؛ اس لیے ان کے قیام میں درجہ بہ درجہ سب کا حصہ شامل ہوتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کسی ادارے کے آغاز وافتتاح یا اجرا کے وقت اس کا ہر پہلو اولیت ہی لیے ہوتا ہے، اس صورت میں جو فرد بھی اس کے کسی پہلو کو بہ روئے کار لائے گا، وہ اس کے حق میں اوّلیت ہی لیے ہوئے ہوگا، جس کو تاسیس کہتے ہیں؛ اس لیے اس کے آغاز کنندہ پر بانی اور مؤسس کا اطلاق درست ہو سکتا ہے، خواہ وہ کسی جزوی پہلو کا افتتاح کرے یا کل کا، جب کہ نفس ادارہ ہی اوّلیت اور آغاز کے مقام پر ہے، تو اس کا ہر ہر فرد بھی اولیت اور آغاز کی شان لیے ہوئے ہوگا۔

مثلاً اگر تعلیمی نصب العین سامنے ہو، جسے کسی جماعتی یا ادارتی صورت سے وجود دیا جا رہا ہو، تو قدرتی بات ہے کہ کوئی اس کی تجویز پیش کرتا ہے، کوئی تعلیم کا اجرا کرتا ہے، کوئی وسائلِ تعمیر فراہم کرتا ہے، کوئی اس کا مسلک ومشرب، یعنی پالیسی طے کرتا ہے، کوئی اس کے بنیادی اصول وضع کر کے دستور بناتا ہے، کوئی اس کے انتظامی اور تعلیمی قواعد وضوابط بناتا ہے، کوئی اس کی تعمیر اٹھانے کے لیے آگے بڑھتا ہے، اور کوئی اسے بہ روئے کار لانے کے لیے ذہن بناتا ہے، اور خواص وعوام میں روح پھونک کر ان کے جذبات کو قیامِ ادارے

کے لیے برانگیختہ کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے یہ علمی آغاز کرنے والے سب کے سب بانی ہی کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں، جب کہ ان سب کا بنا سے تعلق ہوتا ہے۔ اندریں صورت ظاہر ہے کہ جس کے سامنے ان میں بنا و تاسیس کا کوئی بھی پہلو نمایاں ہوگا، خواہ وہ جزوی ہو یا کلی، جس کو کسی شخصیت نے آگے بڑھایا ہوگا، تو واقعاتی سطح پر وہ اس کو بانی کے لفظ سے یاد کرے گا، اور اس میں حق بہ جانب ہوگا، جب کہ ہر پہلو کی آغازِ ادارہ میں بنا ہی رکھی جاتی ہے۔

بانی ہونے کی مختلف حیثیتیں:

اس اصول کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ خاص خاص بناؤں کے دائرے میں، مثلاً حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ اجرائے تعلیم و افتتاحِ مدرسہ اور فراہمیٔ وسائل کی حیثیت سے بلاشبہ بانی ہیں، جس میں پہل اور اولیت ان ہی کا حصہ ہے۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ اس عمل کے مذکرِ اول اور معینِ تاسیس کی حیثیت سے بانیٔ مدرسہ ہیں کہ یہ عمل ان ہی کا حصہ ہے اور اس میں پہل انہوں نے ہی کی۔

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ مؤیدِ اوّل اور معینِ تاسیس کی حیثیت سے بانیٔ مدرسہ ہیں، کہ ان کے ہر ہر لفظ سے تائید و نصرت اور تعاون کا عمل نمایاں ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ محدثِ اوّل کی حیثیت سے بانیٔ مدرسہ ہیں کہ اس مدرسہ میں تعلیم حدیث کے بانی مبانی رہے ہیں، اور اس عمل میں بلاشبہ اولیت کا فخر ان ہی کو حاصل ہے۔

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ اس مدرسہ کے فقہی مسلک اور اس میں تصلب پیدا کرنے کی حیثیت سے بانیٔ مدرسہ ہیں کہ ان ہی سے اس عمل کی بنیاد قائم ہے۔

بانی کی عمومی نسبت:

البتہ جو لوگ بنیاد کے ان تمام پہلوؤں میں کسی شخصیت کی روح کو دوڑتا ہوا دیکھتے ہیں، جس کے آثار جڑ بنیاد سے لے کر شاخوں اور پھل پھول پتیوں تک میں پھیلتے ہوئے محسوس ہو رہے ہوں، ادارے کی در و دیوار، افعال و آثار، پالیسی اور حکمت عملی، اساسی اصول، بنیادی طریق کار، رنگِ تعلیم و تربیت اور اس کے پروردہ فضلا کے اخلاق و ملکات کی نوعیت میں اسی کے آثار رچے ہوئے دکھائی دیں، جس سے یہ ساری تاسیسیں جزوی ہوں، یا خصوصی اسی کے فیضان سے متحرک نظر آئیں؛ بلکہ اس میں مدغم ہوں، تو لوگ علی الاطلاق اسی کو بانی کہنے میں قلوب کی تسکین محسوس کریں گے۔ اس صورت سے بنا کی مختلف اور خاص خاص

نسبتوں میں اسی روح الکل کے بانی ہونے کی عمومی نسبت آ جاتی ہے، اور من جانب اللہ عام زبانوں پر اس کا چرچا اور قبولِ عام پھیل جاتا ہے۔

پس جیسے ان سب اکابر کو اپنی اپنی نوعیت سے بانی کہنے میں لوگ حق بہ جانب ہیں، ایسے ہی اس جامع شخصیت کو علی الاطلاق بانی کہنے اور اس کے بانی ہونے کو من اللہ سمجھنے میں بھی حق بہ جانب ہیں، جس کی تکذیب ممکن نہیں۔ بالخصوص جب کہ اس معنوی نسبت و غلبے کے ساتھ ساتھ رسمی انداز سے بھی بناو تاسیس میں اس کا ہاتھ ہو، اور کھلا دخل نمایاں ہو، تو پھر تشخص و انفرادیت کے ساتھ اسے بانی پکارنے میں کسی تامل و جھجک محسوس کرنے کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔

پس تاریخی طور پر بلاشبہ مدرسۂ دیوبند کی تاسیس کے سلسلے میں ان سب اکابر کا ہاتھ ہے؛ لیکن عموماً بانی کا لفظ بولتے وقت جمع الکل اور روح الکل ہونے کی شان چوں کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میں نمایاں ہے؛ اس لیے بہ حیثیت بانی ان ہی کا نام زبانوں پر جاری ہوا، اور خواص وعوام میں ابتدا ہی سے اس کا چرچا پھیل گیا، جس میں دوسرے حضرات کے بانی ہونے کی نفی شامل نہیں۔ اس طرح یہ تمام متضاد روایتیں ایک نقطے پر جمع ہوسکتی ہیں اور ان کا تضاد ختم ہوسکتا ہے۔

جمعِ روایات کا احسن طریقہ:

ہمارے خیال میں ہمارے سلف نے بھی جمع روایات کا یہی طریقۂ کار اختیار کیا ہوا تھا؛ کیوں کہ اس سے صرف نظر کیا جانا مشکل ہے کہ ان بزرگوں کے سامنے جنہوں نے کسی نہ کسی کے بانی ہونے کا دعویٰ کیا ہے، یہ ساری ہی روایتیں ہوں گی، جن میں کسی دوسرے کو بانی کہا گیا ہے۔ اگر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت نانوتویؒ کو بانی کہہ رہے ہیں، تو وہ اس سے کیسے بے خبر ہوں گے کہ ایک اشتہار میں انہوں نے حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمہ اللہ کے بانیٔ مدرسہ ہونے پر بھی اپنے تصدیقی دستخط ثبت کیے؟ اور ساتھ ہی اس سے کیسے بے خبر ہوں گے کہ کہنے والوں نے خود انہیں بھی بانی کہا ہے؟

اور اگر مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کو بانی کہہ رہے ہیں، تو کیا انہیں اس کا علم نہ ہوا ہوگا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ جیسے ثقہ بزرگ نے خود انہیں بھی بانی کہا ہے؟

اور اگر مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تین افراد کو بانی کہہ رہے ہیں، تو کیا انہیں یہ علم نہ ہوا ہوگا کہ ان کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ خود انہیں بھی بانیوں میں شمار کر رہے ہیں؟

اور اگر حضرت شیخ الہندؒ حضرت نانوتویؒ کو بانی اور قائم کنندہ مدرسہ کہہ رہے ہیں، تو کیا انہوں نے اپنے

والد بزرگ وار کی کتاب ''الہدیۃ السنیۃ'' کبھی نہیں پڑھی ہوگی، جس میں حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کو بانی کہا گیا ہے؟

اور گر حضرت تھانویؒ حضرت نانوتویؒ کو بانیٔ مدرسہ فرما رہے ہیں، تو کیا انہیں یہ علم نہ ہوگا کہ ان کے شیخ طریقت حضرت حاجی امداد اللہؒ خود حاجی محمد عابد صاحبؒ کو بھی بانیوں میں شمار کر رہے ہیں؟

اور اگر حضرت گنگوہیؒ حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کو بانی کہہ رہے ہیں، تو کیا انہیں اس ''تذکرہ'' کا علم نہ ہوا ہوگا، جس میں خود انہیں بھی بانی کہا گیا ہے؟ دراں حالے کہ یہ رسالہ'' تذکرہ'' ۱۳۱۷ھ/ (۱۸۹۹ء) میں لکھا گیا ہے، اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۱۳۲۳ھ/ (۱۹۰۵ء) میں پورے چھ برس بعد میں ہے۔

بہر حال! جب ایک ہی دور کی یہ ساری باتیں ہیں، اور کہنے والے خود سننے والے بھی ہیں، تو ہر ایک بانی والی روایت ہر ایک کے سامنے ضرور آئی ہوگی۔ بہ الفاظ دیگر بانی والی روایتوں کا یہ تضاد روایتوں کے اصل سرچشمے کے سامنے بھی ہوگا؛ لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کو بانی کہتے رہے، اور کسی نے کسی کے حق کہ خود اپنے بھی بانی ہونے کی نفی نہیں کی، اور اس طرح ان میں سے ہر ہر فرد ان متضاد روایتوں کے ماتحت گویا کئی کئی آدمیوں کو بانی تسلیم کرتا رہا، اور کبھی بھی اسے اپنی یا دوسروں کی تضاد بیانی کا دھیان نہ گزرا۔ ان اکابر واعیان کی ثقاہت وعدالت کے پیش نظر اس کا صاف اور کھلا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان حضرات کے ذہنوں میں یہ بانی والی روایتیں متضاد بھی نہ تھیں؛ ورنہ دو ضدوں کے درمیان رہ کر یہ ساری متضاد روایتیں کیسے قبول کر لیتے؟ بلکہ وہ ان روایات سے بنائے مدرسہ کو ایک ہی بنا سمجھ کر بنا کی مختلف نوعیتیں اور مختلف پہلو اپنے ذہنوں میں لیے ہوئے تھے، اور ہر روایت کو کسی نہ کسی ایک پہلو کا ترجمان سمجھے ہوئے تھے؛ اس لیے اس سے بتلائے ہوئے بانی کو اس پہلو کے لحاظ سے وہ بانی تصور کرتے تھے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان روایتوں میں تضاد ہی نہ تھا، اور نہ وہ غیر صحیح تھیں؛ بلکہ ان کے ذہن میں ہر روایت کا ایک خاص محمل تھا، جس پر محمول ہو کر یہ روایت کسی بھی دوسری روایت سے متصادم نہ تھی؛ اس لیے وہ رفعِ تضاد کے ساتھ ان متعارض روایتوں کو قبول کیے ہوئے تھے، اور وہ رفعِ تضاد ہی تھا اور یہی ہو بھی سکتا تھا کہ ان حضرات کے نزدیک بنا کے کسی نہ کسی مخصوص پہلو کے لحاظ سے ان روایتوں کی ہر نام بردہ شخصیت بانی تھی؛ اس لیے جن کے سامنے جو پہلو آیا، جس سے کوئی شخصیت وابستہ دیکھی، اس نے اسی کے لحاظ سے اسے بانی کہہ پکارا۔ اس طرح ایک ایک راوی نے کئی کئی بانیوں کے بانی ہونے کا دعویٰ کیا، جس

میں کوئی تضاد نہیں۔

بانیٔ مطلق:

البتہ جس شخصیت میں بنا کے مخصوص اصول اور بنا کا وہ خاص فکر دیکھا، جس پر ادارہ کھڑا ہوا ہے، اسے علی الاطلاق بانی کہا۔ پس ادارے کے اضافی بانی تو کئی ثابت ہوئے اور حقیقی اور مطلق بانی ایک ہی رہا؛ اس لیے اگر رفعِ تضاد کی آج بھی یہ صورت اختیار کر لی جائے، جو ان اسلافِ کرام کے ذہنوں میں تھی، تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اور کیا ضرورت ہے کہ ان روایتوں کو ٹکرا کر نفی و اثبات کا معرکہ قائم کیا جائے؟ کیوں کہ ہر ایک کو الگ الگ بانی کہہ کر ہر دوسرے کے بانی ہونے کی نفی کی جائے گی، تو قدرتاً کوئی ایک بھی بانی ثابت نہ ہوگا، اور اتنی بڑی عظیم القدر بنا بلا بانی کے رہ جائے گی؛ اس لیے روایات میں تطبیق اور رفعِ تضاد کی آسان اور واقعاتی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ بانی سب ہوں؛ مگر اضافی اور ہر ایک کے بانی ہونے کی نوعیت جدا جدا ہو، اور ان میں بانی مطلق ایک ہو، جس کے فکری اصول مضبوط رہنمائی اور دیے ہوئے نقشے پر ادارہ کھڑا ہوا ہو، اور چل رہا ہو۔

دارالعلوم کے محرکِ حقیقی اور مفکرِ اوّل:

پس حضرت نانوتویؒ اس سارے سلسلے کے محرکِ اوّل اور مفکر ہونے کی حیثیت سے اس مدرسے کے بانیٔ اعظم ہیں، جنہوں نے ان سب بانیوں میں حرکت پیدا کی، اور ان میں منصوبہ بندی کی زندگی پیدا کر کے ان بانیوں کے سربراہ کی حیثیت سے آگے آئے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اسی حقیقت کی طرف ''سوانح قاسمی'' میں ''تاذین خاص'' اور ''تاذین عام'' کے لفظ سے اشارہ فرمایا ہے کہ آپ نے اپنی تاذین (اذن) سے بہ توسط حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ اس کام کی تکمیل فرمائی؛ اس لیے عام زبانوں میں علی الاطلاق بانی وہ کہلائے؛ حتی کہ بانیوں کا حلقہ بھی انہیں بانی کہنے سے خاموش نہیں رہا؛ اس لیے بہ حیثیت بانی ان ہی کا نام مخلوق کی زبان پر چڑھ گیا، اور اضافی بانیوں کی بنا کی جزوی نسبتیں اس بانیٔ اعظم کی کلی، اور اجتماعی نسبت میں گم ہوکر رہ گئیں، جس سے صورت یہ بن گئی کہ اوروں کو بانی کہلانے کے لیے مضامین لکھنے کی ضرورت پڑی ہے، اور حضرتِ والاؒ کو بانی کہلانے کے لیے کسی قلمی یا زبانی جدوجہد کی حاجت نہیں پڑتی؛ بلکہ من اللہ اس تاسیس کی عام تلقی بالقبول کے ساتھ زبانیں ان کے بانی ہونے کے بارے میں خود بہ خود گویا اور دل خود بہ خود معترف ہیں۔ نہ صرف آج ہی؛ بلکہ ابتدائے مدرسہ سے آج تک یہی صورت حال قائم اور زبان زد چلی آ رہی ہے، جب کہ حضرت والاؒ ہی میں بنائے مدرسہ کی یہ ساری شانیں مجتمع دیکھی گئیں۔

چناں چہ ان تمام خصوصیاتِ بنا کا حضرتِ والاؒ میں جمع ہو جانے کا اجمالی نقشہ جو اسلافِ کرام ہی کی شہادتوں سے ہم تک پہنچا ہے، ذیل میں ملاحظہ فرمایا جائے، جس کی بنا پر حضرتِ والاؒ کو خواص وعوام بانی سمجھتے ہیں اور سمجھنے پر مجبور ہیں:

۱- اس سے کسی نے بھی انکار نہیں کیا کہ حضرت نانوتویؒ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد شکست خوردہ مسلمانوں کے لیے بہ طور تلافیٔ مافات ایک اجتماعی رنگ کی تعلیمی تحریک لے کر اٹھے، جو آگے بڑھی، اور اس کے اثرات بہ تدریج ملک میں پھیل گئے، جس سے میکالے کی تعلیمی اسکیم آزاد نہ رہی کہ پوری قوم کو بہا لے جائے؛ بلکہ اس کے مقابل ایک دوسری ہمہ گیر تحریک بھی آ گئی، اور اس نے بھی قوم کا ایک بڑا حلقہ گھیر لیا، جیسا کہ ''مدینہ'' کے محترم مقالہ نگار نے اسی کو ''تحریکِ قاسمی'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ مدرسۂ دیوبند اسی تحریک کا مظہر اتم ہے، جیسا کہ اس کے کاموں سے نمایاں ہے۔

۲- اس تحریک کی ابتدا دیوبند سے ہوئی، اور حضرتِ والاؒ نے خصوصی طور پر قیام مدرسہ کے لیے لوگوں کے ذہنوں کو ہموار کرنے کی جدوجہد یہیں سے شروع فرمائی، مذاکرات کے ذریعے خواص کو ابھارا، جیسا کہ حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کے خط سے ظاہر ہے، اور ترغیب وتحریض کے ذریعے عوام کے جذبات ہم وار کیے، جیسا کہ صاحبِ سوانح مخطوطہ کی رویات سے واضح ہے، اور یہی جذبات مدرسۂ دیوبند کے قیام کا سبب بنے، جو حضرتِ والاؒ کے پیدا کردہ تھے۔

۳- یہ تحریک اپنے عملی رخ کے لحاظ سے درحقیقت بنائے مدارس کی تحریک تھی۔ چناں چہ حضرت والاؒ کی اس تحریک کا اثر ملک میں جابہ جا مدرسے قائم ہونے ہی کی صورت میں نمایاں ہوا۔ حضرتؒ نے خود بھی خصوصی مشوروں اور تذکیرات ومساعی سے مدارس قائم کرائے، اور جگہ جگہ خود بھی پہنچ کر مدرسوں کی بنیادیں رکھیں، جن کے بانی کی حیثیت سے وہ یاد کیے گئے۔ مدرسۂ دیوبند بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں؛ بلکہ اسی کلیہ کا جزو ہے، جیسا کہ سرسید، مولانا منصور علی خاںؒ اور مؤلف سوانح مخطوطہ کی تصریحات سے واضح ہے۔

۴- حضرتِ والاؒ کی اس تحریک کا سب سے پہلا اثر بھی دیوبند ہی میں نمایاں ہوا، اور اس نوعیت کا سب سے پہلا چندے کا مدرسہ ہندوستان میں دیوبند ہی میں قائم ہوا، اور دیوبند جب کہ بہ وجوہ متعددہ حضرتِ والاؒ کے وطن کی حیثیت رکھتا تھا، تو آپ نے وطن کے حق کو مقدم رکھتے ہوئے قیام مدرسہ کے لیے یہاں محض ایک عمومی تحریک یا خصوصی تحریض پر قناعت نہیں فرمائی؛ بلکہ آگے بڑھ کر خصوصی طور پر عملی اقدامات بھی کیے، جن سے مدرسۂ دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ جیسا کہ سوانح مخطوطہ کی تصریحات سے واضح

ہے، اور حضرت حاجی صاحبؒ کے خط اور حضرتِ والاؒ کے جوابِ خط سے بھی اس پر روشنی پڑ رہی ہے۔

۵-چھتہ کی مسجد کے مذاکرات درحقیقت خواص کی ذہن سازی اور ان کے دلوں میں قیام مدرسہ کے جذبات کی تخم ریزی تھی، جس سے حضرت حاجی صاحبؒ کی یک سو، اور خلوت پسند طبیعت اس جلوتی لائن پر آئی، اور تاسیس مدرسہ کے ابتدائی مراحل انہوں نے ان ہی مذاکرات کے زیر اثر انجام دیے؛ اس لیے ان کے اقدامات درحقیقت ''فیضان قاسمی'' سے تھے، اور یہ ابتدائی تاسیس بھی بہ لحاظ حقیقت تاسیس قاسمی تھی، جیسا کہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کی نظم سے واضح ہے۔

۶- ان مذاکرات کو یاد دلا کر جب کہ ان ہی کی بنیاد پر حضرت حاجی صاحبؒ نے خصوصیت سے حضرتِ والاؒ ہی کو اجرائے مدرسہ کے لیے بلایا، جیسا کہ خود حاجی صاحبؒ کے خط سے واضح ہے، تو اس سے صاف نمایاں ہے کہ خود حاجی صاحبؒ کے ذہن میں بھی حضرتِ والاؒ کا محرک و مجوزِ مدرسہ ہونا جاگزیں تھا، جو بنائے مدرسہ کی اصل اور اساس ہے؛ ورنہ اگر یہ دعوت محض اخلاقی ہوتی، تو مذاکرات کا حوالہ دے کر ہرگز نہ دی جاتی؛ اس لیے گو اجرائے تعلیم کا ظہور حاجی صاحبؒ کے عمل اور حرکت سے ہوا؛ لیکن حقیقتاً ان ہی مذاکارات کی عملی تعمیل تھی، جو مدرسے کے اجرا کی اساس ثابت ہو چکے تھے، اور یہ اساس حضرت نانوتویؒ کی قائم فرمودہ تھی، جیسا کہ مذکورہ خط سے نمایاں ہے۔

۷- اس مدرسے کو جاری کرنے کے لیے حضرت نانوتویؒ ہی نے ملا محمود صاحبؒ کو مدرس بنا کر اور ان کی تنخواہ پندرہ روپیہ ماہوار تجویز کر کے میرٹھ سے دیوبند بھیجا، جس کا حاصل یہ ہے کہ اجرائے مدرسہ ان کے اذن اور ان کے ارسال کردہ مدرس سے ہوا، گو حضرت والاؒ بقائے مدرسہ ہی کی مصالح کے پیش نظر اس اجرا کے وقت دیوبند میں تشریف نہیں لائے، جیسا کہ تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے؛ مگر ساتھ ہی ساتھ آئندہ کے لیے مدرسے کے حق میں ساعی رہنے کے وعدے سے حضرت حاجی صاحبؒ کی تسلی ہو گئی، جیسا کہ حضرتِ والاؒ کے جوابی خط سے واضح ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی فکر پر دارالعلوم کا قیام:

۸- ساعی ہونے کے وعدے کے ایفا کے سلسلے میں بالآخر حضرتِ والاؒ قیامِ مدرسہ کے تھوڑے ہی عرصے میں دیوبند تشریف لے آئے، قیام فرمایا اور غیر رسمی طور پر ہر طرح سے مدرسے کو ہاتھ میں لیا، اس کی سرپرستی فرمائی، اس کی مستقل عمارت کی فکر فرمائی اور ایک بڑا جلسہ بلا کر عمارت کا سنگ بنیاد رکھایا۔ حاجی صاحبؒ کو باوجود ان کے مستقل تعمیر مدرسہ کے خلاف ہونے کے اس پر راضی کیا، اور شریکِ تاسیس فرمایا،

جیسا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصریحات سے ظاہر ہے، جو رسالہ دار العلوم میں شائع شدہ ہیں۔

فضلا کے قاسمی ہونے کی وجہ:

۹- نظامِ تعلیم کا ڈھانچہ مرتب فرمایا، اس کے مناسبِ حال تعلیمی اور انتظامی شخصیتیں جمع کیں۔ انتظامِ مدرسہ کے اساسی اصول وضع فرمائے، جو آج تک اس کے نظم کی اساس بنے ہوئے ہیں، ان میں اپنی ہمہ گیر اجتماعیت کے رنگ کو منضبط فرمایا، جس سے اس ادارے میں تعلیم وتربیت کا سلسلہ قائم ہے، اور فضلائے دیوبند کا یہی وہ امتیازی رنگ ہے، جس کی بنا پر انہیں ''قاسمی'' کیا جاتا ہے، اور وہ دوسری جگہ کے فضلا سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔

غرض ادارے کے اصول سے لے کر فروع تک ہر دائرے پر دیوبند آتے ہی حضرتِ والاؒ کا چھا جانا، جب کہ وہ رسمی انداز کے نہ منتظم ہوئے نہ مدرس، نہ کبھی دار العلوم میں بیٹھ کر پڑھایا، نہ دفتر کی کسی اسامی پر بیٹھ کر کارِ نظم سے تعلق رکھا؛ مگر پھر بھی سب کے سب ان کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے سرگرم رہے۔ ذرا بھی چوں وچرا نہ کی، اور کسی کے بھی دل میں یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ آخر ایک بیرونی، بے تعلق، لاعلم محض آدمی کیوں اور کس استحقاق سے ادارے میں آتے ہی اس طرح گھس گیا کہ گویا ادارہ تنہا اسی کا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ دلوں میں اسے ابتدا ہی سے اس ادارے کا ہمہ اوست اور اس کی اساس وبنیاد اور ادارے کی تاسیس سے لے کر تدریس ونظم تک اسی کو قیامِ ادارے کا ذمے دار سمجھا جا رہا ہو؛ ورنہ عادتاً ایک بے تعلق اور بے خبر انسان کا اچانک پہنچ کر اس طرح دخیل ہو جانا برداشت نہیں کیا جاتا۔

۱۰- پھر بنیادی چیز وہ فکر اور نصب العین ہے، جس پر دارہ قائم کیا جائے، سو ابتدائے تاسیس سے ہی مدرسۂ دیوبند کا قیام حضرت والاؒ ہی کے خصوصی فکر پر عمل میں آیا، جیسا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مقولے سے نمایاں ہے، جسے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ روایت فرما رہے ہیں۔ مولانا موصوف اپنے ایک طویل مضمون ''احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن''[۱] میں لکھتے ہیں کہ میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے فرستادے کی حیثیت سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ان کا سیاسی مسلک معلوم کرنے کے لے حاضر ہوا، اور میں نے سوال کیا۔ فرماتے ہیں کہ میں:

---

(۱) حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کا یہ مضمون اب کتابی شکل میں مکمل، مبوب اور معنون شائع ہو چکا ہے، جسے کراچی کے مکتبۂ رشیدیہ نے شائع کیا ہے، جو اب بہ سہولت کسی بھی تجارتی مکتبہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ (نعمان)

''اپنی بات (حضرت شیخ الہند کے سیاسی مسلک کے بارے میں استفسار) ختم کر چکا، تو دیکھا کہ حضرت (شیخ الہندؒ) پر ایک خاص حال طاری ہے، اور اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسمؒ بانی دار العلوم دیوبند کو، جن کو وہ ''حضرت الاستاذ'' کے لفظ سے یاد کیا کرتے تھے، ان ہی کا نام لے کر فرمایا: ''حضرت الاستاذ نے اس مدرسے کو کیا درس وتدریس، تعلیم وتعلم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے، تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے''(۱)۔

اس سے صاف نمایاں ہے کہ یہ مدرسہ محض تعلیم وتعلم ہی کا مدرسہ نہ تھا؛ بلکہ ایک خاص مکتب فکر اور مکتب خیال بھی تھا، جس پر اس کی بنیاد رکھی گئی، اور وہ مکتب فکر یقیناً حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کا نہ تھا؛ بلکہ حسبِ تشریح شیخ الہندؒ حضرت نانوتویؒ کا تھا؛ اس لیے اس فکر کے بانی حضرتؒ ہوئے۔ اس فکر کو ہی محترم مقالہ نگار ''مدینہ'' نے ''قاسمی تحریک'' کے عنوان سے تعبیر کیا ہے، اور صحیح کیا ہے؛ لیکن ان کے سامنے چوں کہ مولانا مناظر احسنؒ کی یہ روایت نہ تھی؛ اس لیے وہ اس تحریک کو ایک عمومی رنگ سے لکھ کر مدرسۂ دیوبند کی بنا سے اس کا کوئی خصوصی تعلق قائم نہ فرما سکے۔

قاسمی فکر کے اصول ہشت گانہ پر دار العلوم کا ارتقا:

۱۱- حضرتِ والاؒ کا یہ فکر عملی طور پر تو ان کی تعلیمات میں لپٹا ہوا تھا، جس کے نمونے وہ مخصوص فضلا تھے، جو قاسمی مکتبِ فکر سے پیدا ہوئے، اور دیوبند سے لے کر بیرونِ دیوبند، ہند اور بیرون ہند تک پھیل گئے، اور مدارس کو سنبھالا، اور اجتماعی طور پر یہ فکر ان کے آٹھ بنیادی اصول میں لپٹا ہوا آپ نے مدرسۂ دیوبند کے لیے وضع کیے اور آپ ہی کے قلم سے لکھے ہوئے خزانۂ دار العلوم دیوبند میں محفوظ ہیں۔ ''سوانح قاسمی'' وغیرہ میں اس کا فوٹو بھی شائع ہو چکا ہے، ان اصول پر خود حضرتِ والاؒ نے بہ طور عنوان جو عبارت لکھی، وہ حسبِ ذیل ہے:

''وہ اصول جس پر یہ مدرسہ نیز اور مدارسِ چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں''۔

اس عبارت سے واضح ہے کہ حضرتِ والاؒ کے نزدیک درحقیقت مدرسہ کی بنا ان اصول پر کی گئی ہے؛ اس لیے خود ہی ان اصول کو بنائے مدرسہ قرار دیا۔ پس اگر اینٹ گارے سے اس کی صورت کی بنیاد رکھی گئی،

---

(۱) ماہ نامہ دار العلوم دیوبند، ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ/فروری ۱۹۵۳ء)

تو ان آٹھ معنوی اینٹوں پر اس کی حقیقت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ ان اصول پر حضرتِ والاؒ نے اپنے مخصوص اجتماعیت کے رنگ کو منضبط کر دیا ہے۔

پہلا اصول:

آپ کا اولین منشا یہ تھا کہ یہ مدرسہ عوامی ہو، یعنی عوام کا ہو، غرباء کا ہو، سرکاری یا جاگیردارانہ یا نوابی نہ ہو، اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ اس کی تعمیر صرف عوام کے پیسے سے ہو، اور اس میں دخل عوام کا ہو؛ اس لیے سب سے پہلا اصول عوامی چندے کا رکھا گیا، اور اس کی بھی تکثیر پر زور دیا گیا کہ جہاں تک بھی ہو، اسے پھیلایا جائے، اور اس کا دائرہ وسیع کیا جاتا رہے۔ کسی ایک شہر یا صوبے میں محدود ہو کر نہ چھوڑ دیا جائے۔ اصولِ ہشت گانہ میں اس اصول کو اولیت دے کر درحقیقت اس کی اہمیت واضح فرمائی ہے۔ پس مدرسۂ دیو بند کا پہلا بنیادی اصول ''رابطۂ عوام'' ثابت ہوا، جس پر آج حکومتوں اور ساری ہی اجتماعیّتوں کی بنیاد ہے۔

دوسرا اصول:

دوسری بنیاد یہ تھی کہ اس مدرسہ کے نظام میں جو بھی مستفید کی حیثیت سے داخل ہو، اس کی امداد واعانت، اس کے طعام وقیام کی انتہائی سعی عمل میں لائی جائے؛ کیوں کہ اس تربیتی ادارے میں داخل ہونے والے ہی اس کے تیار کردہ نظام کے کل پرزے بنیں گے۔ اگر وہ صحیح طور پر ادارے میں فٹ اور اس سے مربوط ہوں گے، تو وہی دوسرے دن اس نظام کے دست و باز و ثابت ہوں گے؛ اس لیے اجرائے طعام بلکہ اس کی بھی افزائش وتکثیر پر زور دیا گیا، جو تربیت اور وابستگی کی روح اور اجتماعیت کا پہلا زینہ ہے۔ اسے ''رابطۂ خواص'' کہا جائے، تو بے جا نہ ہوگا۔ نیز اسی دفعہ سے علی الاعلان واضح کر دیا گیا کہ حضرتؒ کے نزدیک فری تعلیم اور مفت تربیت ہی قومی بچوں کو آگے بڑھا سکتی تھی۔ خرید کردہ تعلیم اور بہ قیمت ملنے والی تربیت نہ تعلیم ہے، نہ تربیت؛ بلکہ بزنس ہے، جس سے صاحبِ ضمیر پیدا نہیں ہو سکتے؛ بلکہ بکے ہوئے افراد ہی تیار ہو سکتے ہیں۔

تیسرا اصول:

تیسری بنیاد یہ تھی کہ اس مدرسہ کا نظام شورائی ہو، اس کی ایگزیکٹو کونسل اہل شوریٰ پر مشتمل ہو۔ یہی باڈی اہل چندہ کی وکیل ہو، پھر ان سب کے نمائندے کے طور پر مہتمم کا عہدہ رکھا، جو درحقیقت اہل شوریٰ کا

وکیل اور کار پرداز ہے؛ اس لیے اس اصول کا حاصل جمہوریت یا مرکزیت ہے، یعنی دار العلوم کا نظام خواہ وہ کلی ہو، یعنی پورے ادارے کا ہو، جزوی یعنی اندرونی شعبہ جات کا ہو، نہ تو استبداد اور شخصیتِ محضہ پر مبنی ہو، اور نہ ہی لامرکزیت پر، جس کا نام اس زمانے میں ''جمہوریت'' رکھا گیا ہے؛ بلکہ قیادتِ شورائیہ پر ہو۔ ایک صاحبِ عزم ہو، اور اس کی پشت پر شورائی قوت ہو، تاکہ اس نظام کا ہر مسئلہ نکھرا ہوا ثابت ہو، اور اس میں پوری قوم کا دماغ شامل ہو، جو باہمی تعاون وتناصر اور مابینی اتحاد کا بنیادی وسیلہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی اجتماعیت آگے نہیں بڑھ سکتی۔

چوتھا اصول:

چوتھی بنیاد مربیوں کا وحدتِ ذوق ہے، جو باہمی اتحاد کی روح ہے۔ مختلف المذاق اور متفاوت المشرب مربیوں کے جمع ہوجانے پر نہ صرف یہ کہ مستفیدوں کی تربیت نہیں ہوسکتی؛ بلکہ ذہنی کشاکش اور خارجی نزاع وجدال بھی نقد وقت ہوتا ہے، جس سے مقصد پیچھے رہ جاتے ہیں، اور جھگڑے آگے آجاتے ہیں؛ اس لیے اتحادِ مشرب کو مدرسے کے ''نظامِ اجتماعی'' کے لیے اساسی قرار دیا گیا، جس کا قدرتی ثمرہ ایک نصب العین پر لگ کر جزوی اغراض سے بالاتری اور بے غرضانہ خدمت ہے، جس میں خود بینی اور آزار رسانی کا وجود نہیں ہوتا، اور یہی اجتماعیت کی روح ہے، جو نظام کو آگے بڑھاتی ہے۔

پانچواں اصول:

پانچویں بنیاد؛ بلکہ بنیادوں کی بنیاد ''علم اور تعلیم'' ہے، جس کی لائنوں سے یہ سارا نظام اٹھایا گیا کہ وہ اپنی حدود میں مکمل ہو۔ اپنے نصاب اپنے نظام اور اپنی تنظیم کے لحاظ سے مضبوط اور مستحکم ہو۔ اگر اس میں نقص آجائے، خواندگی نہ ہو، یا ناقص ہو، تو سارا نظام بے گانہ اور یہ پورا کارخانہ معطل اور لایعنی ہوگا۔ نہ آباد ہوگا، نہ فائدہ رساں رہے گا۔

چھٹا اصول:

چھٹی بنیاد اختیارِ اسباب کے بعد اسباب سے بے نیازی اور خدا پر بھروسہ ہے، جو مسبب الاسباب اور کارسازِ حقیقی ہے۔ یقین رکھا جائے، تو اس کی مدد پر نہ کہ بے سہارا اسباب پر، اور حقیقی توجہ ہو، تو صرف مالک الملک پر، نہ کہ فانی مملوکات پر؛ اس لیے نظامِ ادارہ کسی کارخانۂ تجارت اور اس کی یقینی آمدنی، یا کسی امیر محکم القول یا کسی حاکم کی قوت وحول اور ان کی موعودہ گرانٹوں پر نہ چلا جائے، کہ ان امور پر بھروسہ کر لینے سے

توجہ الی اللہ اور سرمایہ رجوع الی اللہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ امداد غیبی منقطع ہو جاتی ہے، اور کثرتِ وسائل کے سبب لوگ کھانے بانٹنے میں لگ کر باہمی نزاع وجدال کا شکار ہو جاتے ہیں، جس سے نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، اور بندگی کا مادۂ خوف ورجا پادرِ ہوا ہو جاتا ہے، جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، جس سے اوپر کی مدد آتی ہے؛ اس لیے بہ درجۂ اسباب اس قسم کی بے سروسامانی ملحوظ رکھنے پر زور دیا گیا۔

ساتواں اصول:

اس سلسلے میں خصوصیت سے سرکار اور امرائے حکام کی شرکت زیادہ مخل اور مضر تھی، تو اسے خصوصیت سے روک دیا گیا، جو درحقیقت استغنا اور غنا کی روح ہے، اور کوئی بھی نظام پابستگی، محتاج گی اور درماندگی کے ساتھ نہیں چل سکتا، جب تک کہ اربابِ نظام میں خودارادیت کی روح دوڑی ہوئی نہ ہو۔

آٹھواں اصول:

آٹھویں بنیاد یہ ہے کہ مخلص اور بے غرض افراد کا چندہ یا تعاون زیادہ حاصل کیا جائے، جن کا رخ چندہ دینے سے نام آوری اور جاہ وشہرت نہ ہو۔ نظر بر احوال ان کا حسنِ نیت کھلا ہوا ہو کہ اسی سے ادارے کے نظام میں خیر وبرکت آ سکتی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ لقمۂ حلال ہی عطا کنندہ اور عطا یافتہ دونوں میں توفیق کے دروازے کھول سکتا ہے۔ مسلوب التوفیق لوگوں سے حقیقی معنی میں وہ اجتماعی خدمت نہیں بن پاتی، جو دلوں کا مطلوب اور عقل کا مرغوب ہے۔ ممکن ہے کہ اموال کے رطب ویابس سے کوئی نظام وسیع ہو جائے؛ مگر وہ صورتاً نظم ہوگا، جو حقیقت سے خالی ہوگا۔ اس سے نہ دلوں کو چین مل سکتا ہے، نہ روحوں کو سکون، جو سارے نظاموں کا مقصودِ اصلی ہے؛ اس لیے اس تعاونِ باہمی یا اعانتِ مابینی کے سلسلے سے ''رابطۂ عوام'' پیدا کرنے میں انتخاب اور ''نگاہِ انتخاب'' کو ضروری قرار دیا گیا، تاکہ ''نظامِ اجتماعیت'' محض مادی ہو کر نہ رہ جائے؛ بلکہ روحانیت اور اخلاقیت سے بھرپور ہو۔

اصولِ ہشت گانہ کا عملی انطباق:

عجیب بات یہ ہے کہ ان اصولِ ہشت گانہ کی ابتدا بھی چندے سے کی گئی، اور انتہا بھی چندے پر کی گئی، جس سے واضح ہے کہ رابطۂ عوام حضرتؒ کی نگاہ میں اہم ترین چیز تھی، جس پر آنے والے زمانے کی تعمیر ہونے والی تھی۔ پس پہلی دفعہ میں اگر تکثیر چندہ پر زور دیا گیا ہے، تاکہ عوام کی قوت زیادہ سے زیادہ حاصل ہو، تو آخر کی دفعہ میں اس کی تحدید پر زور دیا گیا ہے کہ یہ تکثیر محض مخلصین کے دائرے میں محدود رہے۔ یہ

الفاظِ دیگر باور کرایا گیا ہے کہ غیر مخلصوں یا دائرۂ اخلاص سے بے خبر اور بے گانہ طبقوں کا تعاون اس مخلصانہ ادارے کے لیے کبھی مفید نہ ہوگا، اور نہ پھر کسی مقررہ نہج پر اس کا نظام چل سکے گا۔

حضرتِ والاؒ کے ان اصولِ ہشت گانہ کی اس تشریح سے ظاہر ہے کہ رابطۂ عوام، قومی تربیت اور ٹریننگ، نظامِ شورائی، مرکزیت وقیادت، اتحادِ خیال، وحدتِ ذوق، استحکام، تعلیم، انضباط تربیت، صاحب ضمیر افراد کی پیداوار، قومی استغنا وخودداری، عزم، خود ارادیت، انتخابِ حلقہ جات حضرتِ والاؒ کی اجتماعیت کے عناصرِ خاص تھے، جنھیں آپ نے ان آٹھ اصولوں میں منضبط فرما کر اپنا نقطۂ نظر واضح فرمایا ہے۔

قاسمیت یا قاسمی تحریک:

یہی وہ اجتماعی رنگ کا تعلیمی نظام ہے، جسے یاد کرنے والوں نے ''قاسمیت'' یا ''تحریکِ قاسمیت'' سے یاد کیا ہے، جو آج کی رسمی تحریکوں سے بالاتر اور بالکل جداگانہ ہے؛ لیکن اس کا ڈھانچہ آج کے ترقی یافتہ اور مروجہ نظاموں سے الگ بھی نہیں ہے؛ بلکہ ملتا جلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی اسی فکرِ خاص سے ہوسکتی تھی؛ اس لیے اگر اسی کی تلافی کے لیے مدرسۂ دیوبند قائم کیا گیا، اور بلاشبہ قائم کیا گیا، جیسا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا مقولہ گزر چکا ہے، تو مدرسۂ دیوبند کی بنیاد اسی فکر اور انھیں اصول پر ہونی چاہیے تھی، اور اگر یہ بنیاد حضرت نانوتویؒ نے ڈالی ہے، اور بلاشبہ ڈالی ہے، تو وہی اس کے حقیقی بانی ٹھہرتے ہیں، جب کہ وہی ۱۸۵۷ء کی تلافی کا تصور بھی ذہن میں باندھ سکتے تھے، اور وہی اسے لے کر بھی اٹھے۔

پس جیسے مدرسہ کی ظاہری تعمیر کے وقت آپ نے ہی صورتِ مدرسہ کا سنگِ بنیاد رکھا، ایسے ہی مدرسے کی معنوی تعمیر کے لیے آپ ہی نے ان اصول سے حقیقتِ مدرسہ کی بھی تاسیس کی، اور ان اصول پر خود ہی یہ عنوان بھی قائم فرمایا کہ یہ اصول مدرسہ کی بنیاد واساس ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود ان کے ذہن میں بھی شعوری طور پر یہ حقیقتِ واقعہ موجود تھی کہ وہ اس مدرسہ کی بنیاد رکھ رہے ہیں؛ ورنہ اصولِ ہشت گانہ پر خود ہی یہ عنوان قائم نہ فرماتے؛ لیکن ادعا کبھی نہیں فرمایا، جیسا کہ بحمد اللہ! ان بانیوں میں سے کسی ایک نے بھی نہیں کیا؛ لیکن ادعا نہ کرنے سے یہ ضروری نہیں ہے کہ حقیقتِ واقعہ کا ادراک وشعور بھی نہ ہو۔ چناں چہ اس شعوری حقیقت کے تحت حضرتِ والاؒ نے بے جھجک خود ہی مدرسہ کے لیے مدرس کا انتخاب کر کے بھی بھیجا، اور اس کی تنخواہ بھی خود ہی جاری کر دی، اور پھر خود ہی اپنے برادرِ عم زاد، جو آپ کے فیض یافتہ اور تلمیذ بھی تھے، یعنی صاحب العلم والعرفان حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سرکاری ملازمت چھڑا کر مدرسۂ دیوبند کی صدر مدرسی کی مسند پر لا بٹھایا، جو اس فکرِ خاص کے حامی اور اس سے سرشار تھے۔

حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ کے تائیدی ارشادات:

۱۲- شاید حضرتِ والاؒ کی اسی تاسیسی خصوصیت کی طرف حضرتؒ کے شیخ طریقت حضرت اقدس حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کا ذیل کا جملہ بھی مشیر ہے، جو انہوں نے دیوان محمد یٰسین صاحب، عرف دیوان اللہ دیا مرحوم، خادمِ خاص حضرت نانوتویؒ واولین ناظم کتب خانہ مدرسۂ دیوبند سے اس وقت فرمایا، جب انہوں نے حج کے موقع پر مکۂ مکرمہ سے رخصت ہوتے وقت اپنے شیخ الشیخ حضرت اقدس حاجی امداداللہؒ سے عرض کیا کہ: ''حضرت! ہمارے مدرسے کے لیے دعا فرماتے رہیں''۔

تو فرمایا: ''چہ خوش؟ راتوں سجدے میں پیشانیاں ہم نے رگڑیں کہ خدایا! مسلمانانِ ہند کی بقاوحفاظت کے لیے ایک مدرسہ کو وجود عطا فرما، اور مدرسہ آپ کا ہوگیا''؟

اس کے بعد فرمایا: ''خیال یہ تھا کہ مدرسہ نانوتہ میں قائم ہوگا، یا تھانہ بھون میں۔ کیا خبر تھی کہ اس دولت کو دیوبند والے لے اڑیں گے''۔

یہ روایت اجمال کے ساتھ ''سوانح قاسمی'' میں، اور قدرے تفصیل کے ساتھ ''ارواحِ ثلاثہ'' میں بہ الفاظِ مختلفہ بیان کی گئی ہے، جیسا کہ ''سوانح قاسمی'' کے جلد دوم، صفحہ ۲۲۳؍ میں حوالہ موجود ہے۔ میں نے خود بھی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہے۔ اس روایت کے تحت حضرتِ اقدسؒ کا قیامِ مدرسہ کے سلسلے میں نانوتہ کا نام لینا، اور ذہن میں اس کا تصور آنا، اسی وقت ممکن تھا کہ وہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میں اس خاص قسم کے مدرسہ کی تاسیس کا جذبہ اور تعلیمی تحریک کا فکرِ خاص محسوس فرما رہے ہوں، جو بعد میں ''تحریک قاسمی'' اور قیامِ مدرسہ کی صورت میں نمایاں ہوا، اور شاید اسی بنا پر (جیسا کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا اور بارہا سنا) کہ حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ نے ۱۸۵۷ء؍ کے بعد خود اپنے لیے بھی حضرتؒ کی معیت میں ہجرت کی اجازت چاہی، تو فرمایا کہ: تم ہندوستان ہی میں ٹھہرو، تم سے خدا کو یہاں کام لینا ہے۔ وہ کام یہی تعلیمی نظام اور اس کے ذریعے مسلمانانِ ہند کو سنبھالنا تھا، جو دیوبند سے چل کر ملک گیر؛ بلکہ عالم گیر ہونے والا تھا۔

رہا یہ کہ تھانہ بھون کا نام بھی اس بارے میں حضرتِ اقدسؒ کی زبان پر آیا، تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۱۸۵۷ء؍ کے بعد قیامِ مدرسہ کا یہ داعیہ خود حضرتِ اقدس حاجی امداد اللہؒ کا بھی ہو، جب کہ وہ ۱۸۵۷ء؍ کے معرکے میں ''امام الکل'' تھے، اور ۱۸۵۷ء؍ ہی کے معرکہ کی ناکامی کی تلافی کے لیے اس مدرسہ کے قیام کی ضرورت سمجھی ہو، (جیسا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے مقولے سے ظاہر ہوا)، اور اسی جذبہ کے

تحت کسی دینی مرکز کے قیام کی راتوں دعائیں فرماتے رہے۔

پس اس حقیقت کے پیش نظر کہ مرشد تھانویؒ کا جذبہ مسترشد نانوتویؒ کے ہاتھوں پورا ہونے والا ہے۔ حضرتِ اقدسؒ کے قیامِ مدرسہ کی نسبت ذوات کا نام لیے بغیر ان کے وطنوں کی طرف فرمادی کہ مدرسہ تھانہ بھون میں قائم ہوگا، جو مرشد کی جگہ ہے، یا نانوتہ میں قائم ہوگا، جو مسترشد کی جگہ ہے؛ لیکن یہ قسمت کی یاوری ہے کہ دیوبند کی چھوٹی سی گم نام بستی اس دولت کے لیے ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھی، اور وہ اس دولت کو لے اُڑی۔ گویا اس تعبیر سے حضرت نانوتویؒ کے بانیٔ مدرسۂ دیوبند ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ فرمایا گیا۔ رہا یہ کہ مدرسہ کا تھانہ بھون یا نانوتہ میں قیام نہ ہوا، سو اس کی وجہ جو بزرگوں سے سننے میں آئی ہے، یہ ہے کہ یہ دونوں بستیاں جہاد کا مرکز اور انگریزوں سے بغاوت کا سرچشمہ بن چکی تھیں؛ اس لیے انگریز نے ان دونوں بستیوں کو تہس نہس کر دینے کی سعی کی۔ بطونِ اوراق میں محفوظ ہے کہ اگر مدرسہ نانوتہ یا تھانہ بھون میں قائم ہو جاتا، تو مدرسہ کا بھی وہی حشر ہوتا، جو ان بستیوں کا ہوا؛ البتہ دیوبند کی بستی ان تحریکات سے خالی اور الگ تھلگ تھی، اور یہاں جہاد وغیرہ کا چرچا نہ تھا؛ اس لیے اجرائے مدرسہ کے لیے اسی بستی کو منتخب کیا گیا، اور یہ بستی یہ دولت لے اُڑی۔

ان ایک درجن وجوہ ودلائل کو سامنے رکھ کر اندازہ کیا جائے کہ ایک شخصیت خاص حالات کے تحت ایک ہمہ گیر تعلیمی تحریک لے کر اُٹھے، جس کی بنیاد وقیام مدارس پر ہو، اس کے تحت مدارس قائم ہوں، خود بھی مدارس قائم کرے، اور دوسروں سے قائم کرائے، خاص دیوبند میں اس تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خواص وعوام کو آمادہ کرے اور اُبھارے، اسی کے تحت مدرسہ کا وجود عمل میں آیا۔ اجرائے مدرسہ کے لیے اس ترغیب وتحریض کو یاد دلا کر خصوصیت سے اسی کو دیوبند بلایا جائے، خود کے نہ آسکنے پر تنخواہ دار مدرس بھیج کر مدرسہ جاری کر دینے کا منشا ظاہر کرے، جو اس کا تحریری اذن ہو، حاجی محمد عابد صاحبؒ اس کی تحریر پر مدرسہ کا اجرا عمل میں لائیں، اور اس دور کے ذمہ دار اس اجرا کو؛ بلکہ اس کے مبادی تک کو ''عطائے قاسم'' یا ''فیضانِ قاسمی'' سے تعبیر کریں۔ اسی کے فکر اور منصوبے پر مدرسے کی بنیاد رکھی جائے۔ وہی شخصیت مستقبل کے لیے مساعی کا وعدہ دے، اور بالآخر دیوبند پہنچ کر ہر طرح مدرسہ کو ہاتھ میں لے، اور بلا جھجک مدرسہ اس کے حوالے ہو جائے۔ مدرسہ کی عمارت کا سنگِ بنیاد خود ہی رکھائے، اس کے نظامِ تعلیم وانتظام کا ڈھانچہ بھی خود ہی بنائے، اور اس کے ہمہ جہتی دخل وتصرف کو لوگ بلا چون وچرا اس طرح قبول کریں، جیسے اس کے اکابر اس کے منتظر بیٹھے تھے۔ نہ کسی کو اس عمل دخل پر استعجاب ہو، نہ تحیر، پھر اس کے اکابر اس مدرسہ کی بنا کو اس کے

وطن کی طرف منسوب کر کے اس کی تاسیس باور کرائیں، اور جن احوال و اسباب پر مدرسہ کا قیامِ عمل میں آئے، وہ اس کے اوپر گزرے ہوئے احوال ہوں، تو یہی وہ بنیادی امور ہیں، جو کسی ادارے کی تاسیس کا صحیح مفہوم کہے جا سکتے ہیں؛ اس لیے سوچا جائے کہ علی الاطلاق بانی کسے کہا جائے؟

خواص وعوام کی زبان پر بنا کی نسبت:

بہر حال! یہ ہے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے بانیٔ مدرسہ ہونے کی نوعیت، جس کی رو سے انہیں خواص وعوام کی زبانوں پر بانی بولا جاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہندوستان کے حسبِ حال حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعلیمی رنگ میں ایک ہمہ گیر اجتماعی رنگ کے مؤسس تھے۔ اس فکر کا مظہر اتم دارالعلوم دیوبند ہے، جس کا خاکہ پیش کیا جا چکا ہے؛ اسی لیے اس ادارے کا بنیادی مزاج، رنگِ تعلیم، ذوقِ ہمہ گیری اور اندازِ جامعیت وہی ہے، جو حضرت والاؒ کا تھا، اور طبعی طور پر اساس کا رنگ ہوتا بھی وہی ہے، جو مؤسس کا ہو، پھر اس کا بنیادی مسلک اور ذوق جس پر سو برس سے اس کے فضلا کی تعلیم و تربیت ہو رہی ہے، سب جانتے ہیں کہ وہ حضرتِ والاؒ ہی کا ہے، جسے اس احاطے میں ''قاسمیت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

غرض ذوق وفکر، مسلک ومشرب اور اجرائے تعلیم سے لے کر عملی تربیت، اجرائے تعلیم کا عملی اذن اور آخر عمارتِ مدرسہ کا سنگ بنیاد، جس سے مدرسہ نے استقلالی صورت حاصل کی وغیرہ؛ سارے ہی وہ امور ہیں، جن سے تاسیس مدرسہ کے بارے میں حضرت نانوتویؒ کا مدرسہ سے نہ صرف گہرا اور خصوصی تعلق ہی ثابت ہوتا ہے؛ بلکہ آپ ہی اس کے مدارِ کل نمایاں ہوتے ہیں؛ اس لیے اور حضرات اگر بانی ہیں، تو وہ بانیٔ اعظم اور بانیوں کے سربراہ ہیں۔ یہی حقیقت حضرت شیخ الہندؒ کے ایک قصیدے میں جو انہوں نے حضرتِ والاؒ کی آمدِ دیوبند اور سلسلۂ علم، یعنی مدرسۂ دیوبند کے اجرا کے بارے میں لکھا ہے، حسبِ ذیل شعر سے حضرتِ والاؒ کا سربراہِ بانیاں ہونا نمایاں ہے:

جملہ اعیان واکابر تھے جلو میں اس کے
اس کی شوکت کو پہنچتی تھی کہاں شوکتِ جم

حضرت نانوتویؒ کے بانی ہونے کی نسبت شروع سے چلی آ رہی ہے:

یہی بنیاد ہے، جس کی بنا پر روایات کا ایک عظیم ذخیرہ ملتا ہے، جو حضرتِ والاؒ کو بانیٔ مدرسہ قرار دے رہا ہے۔ اس میں بھی بڑے اکابر اہل اللہ اور عظامِ رجال شامل ہیں، جو آپ کو بانی کے نام سے یاد کر رہے ہیں۔ ان شہادتوں میں ایک طبقہ حضرت نانوتویؒ کے اکابر کا ہے، ایک معاصرین کا، ایک تلامذہ ومستفیدین

کا اور ایک مشاہیرِ ملک کا ہے، جو آپ کو مختلف عنوانوں سے دار العلوم کا مؤسس اور دار العلوم کو ان کے آثار اور باقیاتِ صالحات بتلا رہا ہے۔ کسی نے انہیں بانی کہا۔ کسی نے انہیں مدرسہ کا مصدر کہا، جس سے مدرسہ صادر ہوا ہے۔ کسی نے مدرسہ کو ان کی عمدہ ترین یادگار بتلایا۔ کسی نے انہیں مدرسہ کا قائم کنندہ کہا۔ کسی نے مؤسس کے لفظ سے یاد کیا۔ کسی نے مدرسہ کو ان کی باقیاتِ صالحات میں سے کہا، اور کسی نے انہیں اس باغ کا باغ بان کہا وغیرہ وغیرہ۔ غرض تعبیریں مختلف ہیں، اور منشا ایک ہے: ؎

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُکَ وَاحِدٌ
وَکُلٌّ اِلٰی ذَالِکَ الْجَمَالِ یُشِیْرُ

اور پھر ان شہادتوں کا ایک بڑا اعدد وہی ہے، جو ۱۹۰۵ء سے قبل کا ہے۔ جب کہ ایک کہنہ اور گم نام تحریر کے گم نام مصنف نے اس قسم کی شہادتوں کو جو سب کی سب ان کے سامنے ہیں بھی نہیں، خلافِ واقعہ کہہ کر انہیں ۱۹۰۵ء سے ایک جاری شدہ پروپیگنڈہ بتلایا ہے؛ لیکن ان شہادتوں سے واضح ہے کہ ابتدائے مدرسہ ہی سے حضرتِ والاؒ کا بانیٔ مدرسہ ہونا اپنوں اور پرایوں میں ایک بدیہی اور متواتر حقیقت کی حیثیت سے مسلم تھا، ذہنوں میں متعارف تھا، اور زبان وقلم پر اس کا چرچا پھیل چکا تھا۔

بنائے دار العلوم کے متعلق ناقابلِ تردید شہادتیں:

۱- حضرتِ والاؒ کے اکابر میں سب سے بڑی شخصیت ان کے پیر ومرشد حضرت اقدس حاجی محمد امداد اللہ قدس سرہٗ کی ہے۔ وہ حضرت نانوتویؒ کی وفات پر اپنے ایک تعزیتی مکتوب میں، جو مکۂ مکرمہ سے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی قدس سرہٗ مہتمم ثانی مدرسۂ دیوبند کے نام بھیجا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

”عزیز مرحوم (حضرت نانوتویؒ) کے جو شاگرد ومرید اور دوست ہیں، سب مدرسہ کی طرف توجہ رکھیں کہ عزیز مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی عمدہ یادگار یہ مدرسہ ہی ہے، اس سے غفلت نہ کریں“[1]۔

۲- حضرتِ والاؒ کے معاصرین میں اس وقت کے ذمہ دار اکابر میں سے حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ مہتمم ثانی دار العلوم دیوبند کی مقدس شخصیت اس ماحول میں معروف ترین شخصیت ہے۔ حضرت ممدوحؒ حضرت نانوتویؒ کی وفات پر بہ حیثیت مہتمم اپنے تعزیتی مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

”اس چشمۂ فیض (مدرسۂ دیوبند) کے منبع اور اس آبِ حیات کے مصدر اور اس آفتاب عالم تاب کے مظہر آپ (حضرت نانوتویؒ) ہی ہیں“[2]۔

(۱) مکتوب محفوظ محافظ خانۂ دار العلوم۔
(۲) روداد دار العلوم دیوبند، بابت ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء۔

۳-مولانا محمد منیر صاحب نانوتویؒ مہتمم رابع مدرسۂ دیوبند (جو جہادِ شاملی میں حضرت نانوتویؒ کے مخصوص رفیق اور ہر وقت کے ساتھی تھے) حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس دار العلوم کے عہدۂ اہتمام پر تقرر کا ذکر کرتے ہوئے مدرسۂ دیوبند کی بنیاد و تاسیس کو حضرت نانوتویؒ کے دستِ مبارک اور سعی قدم کی طرف منسوب فرما رہے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''اُمید ہے کہ ان (حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ) کا مہتمم مدرسہ ہونا مدرسے کے ثبات اور ترقی کے لیے ایسا ہی مبارک ومفید ہوگا، جیسا کہ ان کے والد ماجد علیہ الرحمۃ والغفران (حضرت نانوتویؒ) کا قدم اور دست مبارک اس مدرسے کی بنیاد اور سرپرستی کے واسطے مبارک ہوا''[1]۔

۴-حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ جن کا شمار بانیانِ دار العلوم میں اس دور کے بزرگوں نے کیا ہے، اپنے ایک مضمون میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت تحریر فرماتے ہیں:

''پیش وائے منازل دین، رہنمائے مراحل یقین، آیت قدرتِ الٰہی، مایۂ رحمتِ نامتناہی، غفران مآب، مغفرت پناہ جناب حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کہ کدیور ایں حلقہ پر بہار وبانی ایں بنا فیض آثار بودہ، جزاہ اللہ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء''[2]۔

پھر اپنی نظم موسوم بہ ''ارمغانِ مدرسہ'' میں حضرت نانوتویؒ کے اصولِ اساسی ہشت گانۂ دار العلوم دیوبند میں سے ایک اصول (کہ اس مدرسے کے لیے کبھی کسی مستقل آمدنی کی سبیل نہ پیدا کی جائے؛ ورنہ امدادِ غیبی منقطع ہوجائے گی) کی ترجمانی کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:ـ

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کے لیے
کوئی سرمایہ بھروسے کا ذرا ہوجائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ
یہ سمجھ لینا کہ بے نور وضیا ہوجائے گا[3]

۵-حضرت والاؒ کے تلامذہ اور طبقۂ تلامذہ کے مقدس افراد میں سے حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہٗ کا مقولہ بہ روایت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ گزر چکا ہے:

''حضرت الاستاذ (حضرت نانوتویؒ) نے اس مدرسے کو کیا درس وتدریس، تعلیم وتعلم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے

(۱) روداد مدرسۂ دیوبند، بابت ۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۶ء۔
(۲) روداد جلسہ دستار بندی دار العلوم دیوبند، بابت ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء: ص ۴-۲۳۔
(۳) ماہ نامہ القاسم، دار العلوم نمبر محرم ۱۳۴۷ھ/ جولائی ۱۹۲۸ء، ص: ۳۳۔

کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے"(۱)۔

اس میں حضرت نانوتویؒ کی مدرسۂ دیوبند کا قائم کنندہ فرمایا گیا ہے، اور اسی متن کی شرح حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے قصیدے میں فرمائی ہے، جو حضرت نانوتویؒ کے مرثیہ کے طور پر لکھا ہے، اس کے چند متفرق اشعار بلا ترتیب درج ذیل ہیں:۔

شیخ الہندؒ کے قلم سے حضرت نانوتویؒ کا مرثیہ:

آپ نے اپنے جلیل القدر استاذ کا ذکر بہ سلسلہ قیامِ مدرسۂ دیوبند فرمایا ہے۔ اس وقت کے جہل ظلم کی تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ۔

اتنے میں دیکھتے بس کیا ہیں ایک مردِ خدا	آرہا تیز رَوی سے ہے لیے ساتھ علم
بے نیازی وتوکل رخِ روشن سے نمود	قطع منزل کے لیے دونوں قدم تیغ دودم
گاڑ کر اس نے علم ایک ندا کی ایسی	یک بہ یک چونک پڑے اہل غدر اہل خیم
اس کی آواز تھی یا بانگِ خلیلِ الٰہی	کہہ کر لبیک چلے اہلِ عرب اہلِ عجم
باندھ کر چست کمر کہتے ہوئے نحن معک	چل پڑے جو بھی ملا اس یم رحمت کا قدم
اس مربیِ دل وجاں کی مسیحائی سے	علم دین زندہ ہوا جہل نے لی راہِ عدم
علم کو لا کے ثریا سے ثریٰ پر رکھا	آنکھوں سے دیکھا لیا عَلَّمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ
دولتِ علم سے سیراب کیا عالم کو	قاسمِ علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اس کا علَم
طائر علم شریعت کے یہ دیپن	برکتِ حضرتِ قاسم سے ہے مامونِ حرم
سلسلے علم کے امصار وقریٰ تک جاری	اس کی ہمت سے ہوئے بل یہ ترا فیض اعم
جملہ اعیان واکابر تھے جلو میں اس کے	اس کی شوکت کو پہنچتی تھی کہاں شوکتِ جم

"علم کا جھنڈا گاڑنا" بنائے مدرسہ کی طرف اشارہ ہے۔ "بانگِ خلیل الٰہی" سے آواز کی ہمہ گیری اور عرب وعجم میں فیضان کی عمومیت کی طرف اشارہ ہے۔ "نحن معک اور یم رحمت کا قدم" سے حضرت والاؒ کے ساتھ وقت کے اکابر واعیان کی معیت وپیروی کی طرف اشارہ ہے۔ "امصار وقریٰ میں علمی سلسلوں کے پھیل جانے" سے قیامِ مدرسہ کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، جو حضرتِ والاؒ کی بنیادی تحریک تھی۔ "جملہ اعیان واکابر کے جلو میں" ہونے سے اجتماعی رنگ کے تعلیمی سلسلے میں حضرتِ والاؒ کے قائد اور سربراہ ہونے

(۱) ماہنامہ دارالعلوم، بابت جمادی الثانی ۱۳۷۳ھ، ص: ۴۲۔

کی طرف اشارہ ہے، جس سے آپ کا مدرسۂ دیوبند کے قیام کے حق میں سربراہِ بنا ہونا اور بانیوں کی جماعت کو متحرک کرکے بانی بنانا واضح ہوتا ہے، جو آپ کے ''بانیٔ اعظم'' ہونے کی دلیل ہے۔

مولانا محمد میاںؒ مہاجر کابل کی سند میں بانی کا ذکر:

۶ -مولانا محمد میاں انبیٹھویؒ مہاجر کابل (جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے نواسے اور مولانا مملوک العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے، یعنی مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی بہن کے پوتے ہیں) کی قلمی سند میں لکھا گیا ہے، جو دارالعلوم سے انہیں عطا کی گئی تھی:

''فَـإِنَّـهُ حَـفِـيْـدُ مَـوْلَانَـا أَنْـصَـارُ عَـلِي، وَحَـفِـيْـدُ بِـنْـتِ أُسْـتَـاذِ الْأَسَـاتِـذَةِ الْأَعْـلَامِ مَوْلَانَـا مَـمْـلُـوْكُ الْعَـلِي الـنَّـانُـوْتَـوِي، وَابْـنُ بِـنْـتِ الْإِمَـامِ، حُـجَّـةُ الْإِسْـلَامِ، مَوْلَانَـا مُـحَـمَّـدُ قَـاسِـمُ نَـانُـوْتَـوِي، مُـؤَسِّـسُ هَـذِهِ الْـمَـدْرَسَـةِ''(۱).

اس سند پر (جو پرانے کاغذات میں محفوظ ہے) حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب، رکن مجلس شوریٰ مدرسہ، حضرت مولانا حکیم محمد حسن صاحب، برادر خورد حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب، جناب حاجی ظہور الدین صاحب دیوبندی، ممبر مدرسہ رحمہم اللہ، اور دوسرے اکابر اساتذہ کے دستخط ہیں، جس میں بانی اور مؤسس کا لفظ حضرت نانوتویؒ کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

حضرت تھانویؒ کی شہادت:

۷-حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ، جو حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی معتقدین میں سے تھے؛ حتی کہ اس دور کے نزاع کے وقت بھی انہوں نے حضرت حاجی صاحبؒ کے یہاں کی حاضری ترک نہیں فرمائی۔ ۱۹۰۵ء سے بہت پہلے اپنی ''مثنوی: ''زیر و بم''، لکھی ہے، اس میں حضرت نانوتویؒ کی نسبت تحریر فرماتے ہیں:ـ

اے کجا رفت آں مدارِ اہتدا　　آں محمد قاسم مولائے ما
مرشد موصل برائے طالباں　　ہادیٔ کامل برائے گم رہاں
داشت حرفِ علمِ دیں ہمت بلند　　مدرسہ کردہ بنا در دیوبند(۲)

---

(۱) سند محفوظ بدارالعلوم۔　　(۲) مثنوی زیر و بم، بہ حوالہ القاسم دارالعلوم نمبر، ص:۱۹۔

۸-مولانا نواب محی الدین خاں صاحبؒ رئیس مرادآباد وتلمیذ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ، قاضی ریاستِ بھوپال نے ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۶ء) میں آج سے بہتر سال قبل (۱) مخالفین دار العلوم کے پھیلائے شکوک شبہات کا جواب ایک تحریر موسوم بہ ''تذکرہ'' میں دیتے ہوئے اس کے مقدمے میں فرمایا:

''کیوں کہ جیسا کہ اس (مدرسۂ دیوبند) کا قیام تمام مدارس کے قیام کا سبب تھا، ایسے ہی بہ ظاہر حال اس کی خرابی بھی باقی مدارس کی خرابی کی دلیل ہوسکتی ہے، اور بالخصوص اس سبب سے اور زیادہ رنج والم تھا کہ یہ بنیاد حضرت اقدس مولانا واستاذنا حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسمؒ کی قایم کی ہوئی ہے اور اس میں تزلزل آنا گویا تمام متوسلانِ حضرتِ مرحوم کے قیامت کا نمونہ ہے''(۲)۔

۹-سوانح مخطوطہ کے مصنف حاجی فضل حق صاحب رحمہ اللہ، مہتمم ثالث مدرسۂ دیوبند اس سوانح میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''خلاصۂ کلام یہ ہے کہ علاوہ بے شمار حسنات اور باقیاتِ صالحات کے تین کام مہتم بالشان مولانا علیہ الرحمہ (حضرت نانوتویؒ) سے ظہور میں آئے: اول مدرسۂ دیوبند، دوم مباحثۂ شاہ جہاں پور، سوم ترویج نکاحِ بیوہ گان''(۳)۔

۱۰-مولانا منصور علی خاں صاحبؒ تلمیذ حضرت نانوتویؒ و ناظر الاطباء ریاست حیدرآباد دکن کی تحریر ان کی ایک مطبوعہ تصنیف ''مذہبِ منصور'' میں طبع شدہ موجود ہے، جو پہلے پیش کی جاچکی ہے۔ اس کا یہ جملہ مکرر پیش ہے، جس میں حضرتِ والاؒ کو قائم کنندۂ مدرسۂ دیوبند کہا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''خصوصاً مدرسۂ دیوبند، اول مولانا مرحوم (حضرت نانوتویؒ) نے اس مدرسے کو چندے سے قائم کیا تھا''(۴)۔

۱۱-حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ سابق مہتمم دار العلوم دیوبند نے اپنے ایک ذمہ دارانہ پمفلٹ میں، جو بہ عنوان ''دار العلوم دیوبند کے اطمینان بخش حالات'' شائع ہوا تھا تحریر فرمایا:

''حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب بانی دار العلوم دیوبند قدس سرہ العزیز کی ذاتِ گرامی کی طرف مسلمانانِ عالم کا رجحان ومیلان......الخ(۵)۔

(۱) اور اب زیرِ نظر ''حجۃ الاسلام نمبر'' کے وقت ایک سو چوبیس سال ہو رہے ہیں۔ (نعمان ۲۰۱۵ء)
(۲) تذکرہ، ص: ۲۔
(۳) سوانح مخطوطہ، ص: ۵۵۔
(۴) مذہب منصور، ج: ۲، ص: ۷۷۔
(۵) پمفلٹ مطبوعہ، ص: ۷۔

دارالعلوم کی مسجد کا کتبہ:

۱۲- پھر اسی نسبتِ بانی کے ساتھ حضرت ممدوحؒ نے دارالعلوم دیوبند کی خوش نما مسجد کی لوح ۱۳۲۸ھ/ (۱۹۱۰ء) میں سنگِ مرمر کا ایک کتبہ بہ موجودگی حضرت شیخ الہندؒ و بہ علم حضرت ممدوحؒ نصب کرایا، جو آج تک نصب شدہ موجود ہے، اور اس کتبہ پر حضرت ممدوحؒ کا قطعۂ تاریخ بھی کندہ ہے۔ کتبے کی عبارت حسبِ ذیل ہے، جس میں حضرتِ والاؒ کو بانیٔ دارالعلوم لکھا گیا ہے:

> ''الحمدللہ! کہ اس مسجدِ مقدس متعلق مدرسۂ اسلامیہ دیوبند بہ صرفِ زر و بذلِ ہمت جناب حاجی سیٹھ غلام محمد اعظم، ساکن راندیر، ضلع سورت، بہ زمانۂ اہتمام مولانا محمد احمد، خلف الرشید حضرت مولانا محمد قاسم قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ بانی مدرسہ یک ہزار و سہ صد و بست و ہشت (۱۳۲۸ھ) انجام پذیر رفت''۔

۱۳- مولانا سعید الدین صاحب رحمہ اللہ ممبر مجلس شوریٰ دارالعلوم و تلمیذ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب میں جو صفر ۱۳۴۶ھ (اگست ۱۹۲۷ء) میں مطبع علوی بھوپال میں چھپ کر شائع ہوا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہی وجہ ہے کہ جب حضرت بانیٔ مدرسہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں جس طرف ان کی توجہ ہوگئی، اسی طرف مدرسہ کے لیے امداد و فتوحات ہونے لگتی تھیں، اور اہل اسلام متوجہ ہوتے تھے۔ اسی توجہ کا ظہور حضرت صدر مہتمم صاحب (حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ) کے ذریعہ ہو رہا ہے''[1]۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی تحریر:

۱۴- حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ کے سلسلے میں مولانا عبیداللہ صاحب سندھیؒ ناظم جمعیۃ الانصار دیوبند اپنے پمفلٹ ''قواعد و مقاصد جمعیۃ الانصار'' (مطبوعہ قاسمی پریس دیوبند) میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''الحمدللہ! کہ اس مبارک تمہید ابتدائے جمعیۃ الانصار اور عظیم الشان جلسۂ دستار بندی مدرسۂ عالیہ (دیوبند) کی صورت میں شمس الائمہ حضرت مولانا محمود حسن صدر المدرسین اور فخر الاسلام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم مدرسہ جو مقدس بانی قدس سرہٗ کے ظاہری و باطنی جانشین ہیں، کی متفقہ کوشش سے نمودار ہوئی''[2]۔

---

(۱) مکتوب، ص: ۸۵۔

(۲) قواعد و مقاصد جمعیۃ الانصار، ص: ۳۰۔

حضرت علامہ کشمیریؒ کی تقریر:

۱۵- حضرت الاستاذ الاکبر العلامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند نے علامہ رشید رضا مصریؒ کی آمد پر جو تقریر عمارتِ دار العلوم میں فرمائی، اس میں ایک جگہ حضرت نانوتویؒ کے مناقب وفضائل کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"تَلَمَّذَ عَلَى الشَّيْخِ عَبْدِالْغَنِي، شُمُسُ الْإِسْلَامِ وَالْمُسْلِمِيْنِ، اَلْعَارِفُ الْحَافِظُ الْمُحَقِّقُ اَلشَّيْخُ مُحَمَّدُ قَاسِمُ، أَبُوْ أَحْمَدُ، (وَأَشَارَ بِيَدِهِ إِلَى مَوْلَانَا الْحَافِظُ مُحَمَّدُ أَحْمَدُ — رَحِمَهُ اللّٰهُ — اَلْمُهْتَمِمُ فِي هٰذِهِ الْمَدْرَسَةِ الدِّيُوبَنْدِيَّةِ، الْجَالِسُ فِي هٰذِهِ الْحَفْلَةِ 'طَيِّبٌ'، مُؤَسِّسُ هٰذِهِ الْمَدْرَسَةِ الْعَالِيَة وَبَانِيُهَا".

دوسری جگہ فرمایا:

"ثُمَّ لَمَّا اسْتَوَلَّتِ الْأَجَانِبُ عَلَى هٰذِهِ الْبِلَادِ وَقَامَتِ الْحَرْبُ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ، أَسَّسَ الشَّيْخ مُحَمَّدُ قَاسِمُ هٰذِهِ الْمَدْرَسَةَ الْعَالِيَّةَ، فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا كَثِيْراً، جَزَاهُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ"(۱).

حضرت میاں اصغر حسین صاحبؒ کا حوالہ:

۱۶- حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ محدث دار العلوم دیوبند (المعروف بہ "میاں صاحبؒ) تحریر فرماتے ہیں:

"اگر وہ (حضرت شیخ الہندؒ) متاعِ دنیا کی طلب فرماتے، تو بہت مواقع ایسے تھے کہ لوگ حضرتؒ کو سر آنکھوں پر بٹھلاتے، اور صد ہا روپیہ مشاہروں اور نذرانوں کی صورت میں پیش کرتے؛ لیکن آپ نے باوجود ذاتی ضرورتوں کے ہمیشہ اپنے استاذ (حضرت نانوتوی قدس سرہٗ) کے لگائے باغ دار العلوم دیوبند کی سرسبزی وشادابی کو مطمحِ نظر رکھا، اور اسی دینی خدمت میں عمر تمام کردی"(۲)۔

(۱) روداد دار العلوم دیوبند، بابت ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء، ضمیمہ: ص ۴۰)

(۲) حیات شیخ الہندؒ ص: ۲۰، مطبوعہ قاسمی پریس دیوبند)

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی شہادت:

۱۷- حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تحریر موسوم بہ ''دار العلوم کی دوازدہ سالہ زندگی'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''چوں کہ حسبِ وصیتِ بانیٔ دار العلوم ہر مدرس اور ملازم دار العلوم کا فریضہ ہے کہ وہ توسیع چندہ اور ترقی دار العلوم کی کوشش بلیغ عمل میں لائے''......الخ[1]۔

سر سید کا تعزیتی مضمون:

۱۸- پھر یہ تصور صرف اعیانِ مدرسہ ہی کا نہیں تھا؛ بلکہ اس دور کے مشاہیر اور سر برآوردگانِ ملک کا بھی تھا، جو دار العلوم کے لحاظ سے بیرونی لوگ تھے۔ جب کہ اس دور میں دار العلوم کا نہ کوئی پروپیگنڈہ تھا، نہ اس کا کوئی رواج تھا، اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی، اور ساتھ ہی یہ زمانہ ۱۹۰۵ء کا بھی نہ تھا کہ اسے بیسویں صدی عیسوی کی تبدیلی کے نیچے لاکر غلط بیانی قرار دیا جائے۔ ان میں سے سر سید بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، (جن سے حضرت نانوتویؒ کی کتنے ہی مسائل میں مخالفت بھی چلتی رہی ہے)۔ وہ اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴؍ اپریل ۱۸۸۰ء میں حضرتؒ کی تعزیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اُن ہی (حضرت نانوتویؒ) کی کوشش سے علومِ دینیہ کی تعلیم کے لیے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی وکوشش سے اسلامی مدرسے قائم ہوئے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت اور افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں، یا چند آنسو بہا کر اور رومال سے پونچھ کر صاف کرلیں؛ بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں۔ دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے، اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ یہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے''۔

۱۹- ۳؍ صفر ۱۳۱۵ھ (۴؍ جولائی ۱۸۹۷ء) جسے آج اسّی برس[2] ہو چکے ہیں، عالی جناب مولوی شوکت حسین صاحبؒ ساکن ورنگل اپنی ایک مطبوعہ اپیل بہ نام ''گزارش'' میں جو پندرہ صفحے کا ایک پمفلٹ ہے، تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) دار العلوم کی دوازدہ سالہ زندگی، ص: ۱۳[3]۔

(۲) اور اب ایک سو بائیس سال۔ (نعمان ۲۰۱۵ء)

(۳) جو مدرسہ میں مولاناؒ کی دوازدہ سالہ زندگی کے سنین ہیں۔ (طیب)

''حضرت ممدوح الشان (حضرت نانوتویؒ) علمائے متاخرین میں بہت ہی بڑے نامور فاضل اور بانسبت بزرگ تھے۔ مدرسۂ دیوبند کی بنا بھی ان کے مبارک ہاتھوں کی ڈالی ہوئی ہے۔ کیا شک ہے کہ ان کا شمار علما میں سے تھا''(۱)۔

مولانا حکیم عبدالحیؒ ناظم ندوۃ العلماء کی تاریخ میں بانی کا تذکرہ:

۲۰-:۱۳۱۲ھ (۱۸۹۵ء) میں آج سے بہتر سال قبل، یعنی ۱۹۰۵ء سے بہت کافی پہلے حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ (از احفاد حضرت سید احمد شہیدؒ) اپنے سفر نامے میں جو ۱۳۱۲ھ میں بہ وقت سیر دار العلوم یہاں کے حالات کے بارے میں لکھا گیا ہے، دار العلوم سے متعلق ایک نزاع کا ذکر کرتے ہوئے (جس کی تفصیلات کو وہ حضرت شیخ الہندؒ سے سنا ہوا ظاہر فرمارہے ہیں) لکھتے ہیں:

''مختصر یہ ہے کہ اس نزاع کی بنیاد اسی وقت پڑ گئی تھی، جس وقت مدرسۂ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی تھی، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بانی مدرسہ جناب مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم نے مدرسہ کے جو اصول اس وقت قائم کیے تھے، اور جن پر اب تک عمل درآمد ہے، ان میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ......الخ(۲)۔

ان اکابر و اعیان کے اتنے بڑے جم غفیر کی شہادتوں کو جو حضرتِ والاؒ کو بانی مدرسہ پکار رہا ہے، نہ جھٹلایا جا سکتا ہے، نہ رد کیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی اتنے ثقات وکُبَریٰ عادتاً جھوٹ پر جمع ہو سکتے ہیں۔ نیز یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی غلط پروپیگنڈے کا شکار تھے؛ کیوں کہ ان میں بہت سے وہ ہیں، جو ان کے تلامذہ اور بلا واسطہ مستفیدین کے طبقے میں سے ہیں، جنہیں ان اکابر سے براہِ راست سماع ولقا حاصل ہے۔ پھر ساتھ ہی ساتھ یہ سارے بیانات مثبت ہیں کہ ''فلاں صاحب بانی ہیں'' جو پشت پر دلائل لیے ہونے کی علامت ہے، منفی نہیں ہیں کہ ''فلاں بانی نہیں ہیں''۔ جس کے لیے نہ دلیل کی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ ان کا حقیقت ہونا ہی ضروری ہوتا ہے؛ اس لیے انکار کی کوئی وجہ نہیں رہتی؛ بلکہ چار و ناچار تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حضرتِ والاؒ بانیٔ مدرسہ تھے، اور اگر دوسرے حضرات کو ایک ایک دو دو شہادتوں کی بنا پر بانی کہا جانا ضروری ہے، تو حضرتِ والاؒ کو شہادتوں کے اتنے کثیر عدد کی وجہ سے جو حدِ تواتر سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے، بہ طریق اولیٰ بانی کہا جانا ضروری ہے۔

---

(۱) گزارش، ص:۴۰۔
(۲) رسالہ دار العلوم، شوال ۱۳۷۱ھ/ جولائی ۱۹۵۲ء۔

پھر اور حضرات کے بانی ہونے کا ثبوت اگر سو برس بعد کی کچھ شہادتیں ہیں، تو حضرتِ والاؒ کے بانی ہونے کا ثبوت پورے سو برس کی مسلسل شہادتوں کے ساتھ تلقی بہ قبولِ عام ہے، جو صدی کے کسی حصے میں بھی منقطع نہیں ہوا؛ بلکہ صدی کے ہر حصے میں چھوٹے اور بڑے یہی کہتے آ رہے ہیں، اور تاریخ کے اوراق بھرے آ رہے ہیں کہ حضرتِ والاؒ بانیٔ مدرسۂ دیو بند ہیں؛ اس لیے ایسے ثابت شدہ دعوے کے رد کیے جانے کی کوئی وجہ سامنے نہیں آتی کہ اسے قبول نہ کیا جائے۔

رشتۂ اعتدال:

خلاصہ یہ ہے کہ اس بارے میں جماعتِ دار العلوم دو کناروں کے بیچ میں ہے، اور افراط و تفریط سے ہٹ کر کمالِ اعتدال کا رشتہ سنبھالے ہوئے ہے۔ نہ تو وہ اس افراط میں مبتلا ہے کہ بانیٔ مدرسۂ دیو بند کے سلسلے میں حضرت نانوتویؒ کے نام سے گریزاں ہو کر بانی ہونے کی نفی پر تل جائے، اور اس نفی ہی کو اپنا موضوع ٹھہرا لے، اور نہ اس تفریط میں غرق ہے کہ خواہ مخواہ کھینچ تان کر تن تنہا صرف انہیں کو بانی پکار کر دوسروں کے بانی ہونے کے انکار پر آ جائے، جو حقیقتاً بنائے مدرسہ میں تاریخی طور پر دخل رکھتے ہیں؛ بلکہ ہمارا فکر و نظریہ یہ ہے کہ مثبت انداز میں ہر بانی کا جو مقام تاسیس ہے، وہ اسے دیا جائے، اور دل میں اس کی نوعیتِ تاسیس کی عظمت رکھی جائے، اور بانیٔ مطلق ایک کو سمجھا جائے، جب کہ بنا کی ساری خصوصیات اس میں جمع ہیں اور وہ حضرت نانوتویؒ ہیں۔ جس سے بانی کے سلسلے کی تمام روایات قابلِ قبول بھی ہو جاتی ہیں اور تضاد بھی ختم ہو جاتا ہے، اور رفعِ تضاد کی اس صورت میں اسلافِ دار العلوم کا نقشِ قدم بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ!

بہر حال! جب کہ ثقات و اعیان کی یہ بیسیوں شہادتیں واضح کرتی ہیں کہ حضرتِ والاؒ کا بانیٔ دار العلوم ہونا خواص و عوام کے قلوب میں متعارف اور مسلم تھا، تو اتنے مثبت دلائل و شواہد اور واضح قرائن کے ہوتے ہوئے منفی پہلو کی چند کمزور شہادتیں تاریخ کو نہیں بدل سکتیں؛ البتہ ان مثبت دلائل کو ان کی اسی نوعیت کے ساتھ قبول کیا جائے گا، جو حقیقتاً ان کی واقعاتی نوعیت ہے، اور واقعات ہی نے متعین کی ہے، اور اسی سے ان کا صحیح محمل متعین کیا جائے گا، جو عرض کیا گیا، جس سے حضرتِ والاؒ کے بانیٔ مدرسۂ دیو بند ہونے کی نوعیت واشگاف ہو جاتی ہے۔

بنائے مدرسہ کے بعد اس سے حضرتِ والاؒ کے تعلق کی نوعیت اور اس کے اثرات:

قدرتی بات ہے کہ بنا میں بانی کا عمل دخل کلی طور پر خود اعتمادی لیے ہوئے ہوتا ہے، اور قوم بھی اسے اپنا

محسن سمجھتے ہوئے اس کا اثر مانتی ہے؛ اس لیے طبعی طور پر مدرسہ کے تمام نظری اور عملی کاموں میں بانیوں کی اس مقدس جماعت کا، جن کے اسمائے گرامی مذکورہ روایات میں بانی کے آئے ہیں، درجہ بہ درجہ عمل دخل یہی نوعیت لیے ہوئے ہے؛ مگر یہاں بھی حضرت نانوتویؒ بانیوں کے سربراہ ہی کی حیثیت سے دکھائی دیتے ہیں، اور ان کے کاموں میں غیر اختیاری طور پر اختیاری اور خود اعتمادی کی خصوصی شان محسوس ہوتی ہے، جو ان کے بانئ مطلق ہونے کی کھلی شہادت ہے۔

اس سلسلے میں حضرتِ والاؒ کے تعلق کے دو رخ ہیں: پہلا یہ کہ جہاں تک مدرسہ سے مالی یا اخلاقی یا کسی بھی مادی مفاد حاصل کرنے کا تعلق ہے، حضرتِ والاؒ نہ صرف اس سے بے نیاز ہی رہے؛ بلکہ پورے قصد اور ہمت کے ساتھ اس سے بچنے کی سعی فرماتے رہے۔ نہ کبھی کوئی رسمی عہدہ قبول فرمایا، نہ معاوضہ طلبی کا کوئی ادنا تصور ان کے ذہن میں آیا۔ نہ تن بدن کی کسی ادنا راحت طلبی کے مدرسہ سے روادار ہوئے، جس کی وجہ آپ کی روحانیت کا علو مقام اور ساتھ ہی آپ کی طبیعت کی افتاد، مزاج کی وارستگی، طبعی آزادی اور فطری غنا و سیر چشمی تھی، جو ایسے مفادات کا تحمل ہی نہیں کرسکتی تھی۔ "سوانح مخطوطہ" کے مصنف لکھتے ہیں:

> "اور آپ (حضرت نانوتویؒ) کا قول تھا کہ مجھ کو پوری راحت اسی میں ملتی ہے کہ میں اپنے طور پر رہوں، غیر کا تابع ہوکر رہنا پسند نہیں آتا"[1]۔

ظاہر ہے کہ اس طبعی افتاد کے ساتھ منافع کوشی کے تصورات کیسے جمع ہوسکتے تھے؟ پھر اس غنا کے ساتھ ایثار کا عالم یہ تھا کہ بہ قول صاحب سوانح مخطوطہ:

> "اور (حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے) تقسیم مال ومتاع خود ہر ہر خاص وعام میں خوب مشق حاصل کی"[2]۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں مدرسہ سے ذاتی مفاد حاصل کرنے کا کوئی ادنا تصور بھی قائم نہیں کیا جاسکتا؛ بلکہ اگر کیا جاسکتا ہے، تو یہ کہ مدرسہ پر حضرت والاؒ خود اپنی ذات سے خرچ کرتے ہوں، نہ کہ مدرسہ کو اپنے اوپر خرچ کرتے ہوں۔ چناں آپ کی طبعی اور فطری افتاد بتلاتے ہوئے "سوانح مخطوطہ" کے مصنف لکھتے ہیں:

> "مولانا (حضرت نانوتویؒ) نے اپنے عمل کو کسرِ نفسی سے صحیح کیا۔ اپنے علم کو جبر نقصان مسلمانوں اور مقابلہ کفار ومشرکین میں صرف کیا اور اپنی قوتِ عملیہ کو ہر چہار طرف سے سکیڑ کر بہ شکل جذر ظاہر کیا اور "لا" کلمہ سے اپنے آپ کو ایسا نفی کیا کہ ذات صفر کی برابر ہوگئی، اور "الا" کلمہ سے ضربِ اثبات ایسی لگائی کہ حاصلِ ضرب ایک رہا، اور عمل جمیع برادران اسلام اور تفریق بین الکفر والاسلام اور تقسیم مال خود ہر ہر خاص وعام میں خوب مشق حاصل کی"[3]۔

---

(۱) سوانح مخطوطہ، ص: ۳۸۔ (۲) سوانح مخطوطہ، ضمیمہ۔ (۳) سوانح مخطوطہ، ضمیمہ)

کسر نفسی کی بنا پر حضرت نانوتویؒ کا استغنا:

ظاہر ہے کہ جب کسر نفسی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، تو مدرسہ سے کسی عہدے یا منصب کی طلب کا سوال ختم ہوجاتا ہے، جو حبِ جاہ کا شعبہ ہے، اور جب مالی ایثار حد کو پہنچا ہوا تھا، تو معاوضہ طلبی کے تصورات ناممکن ہوجاتے ہیں، جو حبِ مال کے شعبے ہیں۔ ''سوانح مخطوطہ'' کے مصنف لکھتے ہیں:

''مدرسۂ اسلامی دیوبند آپ (حضرت نانوتویؒ) ہی کا ساختہ پرداختہ ہے، اور کیا کچھ اس کا کارخانہ ہے کہ چھوٹی سی سرکار؛ مگر آپ نے ہرگز کبھی اس کی کسی چیز سے نفع نہیں اٹھایا۔ اپنے پاس سے دینا جانتے تھے، لینے کا کام نہ تھا''(۱)۔

چناں چہ روداد مدرسۂ دیوبند بابت ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں صفحہ ۹ پر حضرتؒ کا چندہ بھی درج ہے، جس سے واضح ہے کہ مدرسے پر خرچ فرماتے رہتے تھے۔

آگے حضرتِ والاؒ کی بے نفسی، بے طمعی اور زہد وقناعت کے بارے میں مزید تفصیل سے لکھتے ہیں:

''اگر آپ (حضرت نانوتویؒ) کو طمع دنیوی ہوتی، تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ سونے کی دیواریں بنا لیتے۔ مدرسۂ دیوبند کے مکان کو لاکھوں اینٹوں سے تعمیر کرایا؛ مگر اپنے گھر میں ایک پھوٹا روڑا بھی نہ لگوایا''(۲)۔

ایک جگہ آپ کے تقوے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اور یہاں تک مدرسہ کے مال سے احتیاط تھی کہ اگر کبھی بہ ضرورت مدرسہ کے دوات وقلم سے کوئی اپنا خط لکھ لیتے، تو فوراً ایک آنہ مدرسہ کے خزانے میں داخل کردیتے، اور فرماتے کہ یہ بیت المال کی دوات ہے، ہم کو اس پر تصرف جائز نہیں ہے''(۳)۔

غرض طمع نفس اور لالچ کا تصور حضرتِ والاؒ کے آس پاس بھی نہ تھا کہ عہدوں یا نمائشی اقتدار کے جذبات دل میں اُبھرتے۔ سوانح مخطوطہ کے جملے یہ ہیں:

''اخلاص کا یہ حال کہ جملہ قول وفعل آپ کے خالصاً للہ تھے، ریا کا نام نہ تھا، طمع نفسی کی بو بھی نہ تھی، کبھی وعظ پر اجرت نہ لی، نہ کبھی نفسانی خواہش کی وجہ سے وعظ کیا، نہ کبھی مالِ دنیا کے عوض میں پڑھایا''(۴)۔

حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) سوانح مخطوطہ، ص:۱۵۔ (۲) ایضاً، ص:۱۶۔
(۳) ایضاً، ص:۱۶۔ (۴) ایضاً، ص:۱۶۔

''مسئلہ کبھی نہ بتلاتے، حوالہ کسی پہ فرمادیتے، فتویٰ لکھنا اور مہر کرنا تو درکنار، اول امامت سے بھی گھبراتے، آخر کو اتنا ہوا کہ وطن میں نماز پڑھادیتے۔ وعظ کبھی نہ کہتے تھے''(۱)۔

گو بعد میں حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوریؒ کے جبر واصرار سے وعظ فرمانا شروع کیا، جیسا کہ ''مختصر سوانح قاسمی'' میں مرقوم ہے۔

ظاہر ہے کہ اس جذبہ کے بعد اخلاقی مفادات یا جاہی عہدے حاصل کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؛ اس لیے آپ نے کبھی رسمی عہدہ قبول نہیں فرمایا۔ نہ رسمی طرز کے مدرس بنے، نہ منتظم، نہ ناظم، نہ مہتمم اور نہ کبھی کسی مالی معاوضے کا سوال درمیان میں آیا۔ جس میں علاوہ حضرتِ والاؒ کی مزاجی افتاد کے بنیادی وجہ یہ تھی کہ مدرسہ کو وجود آپ سے ملا تھا، نہ کہ آپ کو مدرسہ سے۔ مدرسہ کے عہدے آپ سے بنے تھے، نہ کہ آپ عہدوں سے۔ مدرسہ کا مالیہ آپ سے وجود پذیر ہوتا تھا، نہ کہ آپ مالیے سے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ہمہ وقت مدرسہ کو اپنا پروردہ سمجھ کر اس پر جھکا ہوا ہو، اس میں یہ طلبیں کیسے جاگزیں ہو سکتی تھیں؟

مالی منافع کو چھوڑ کر راحتِ نفس کے لیے بھی آپ نے مدرسہ کو کبھی ذریعہ نہیں بنایا۔ سوانح مخطوطہ میں ہے:

''آپ کے مزاج میں حرارت بہت تھی، اور موسم گرما میں سردمکان بہت مرغوب تھا۔ مدرسہ میں ایک سرد خانہ (تہ خانہ) تیار ہوا، اور گرمی کی بہت شدت تھی، مولوی رفیع الدین صاحب نے عرض کیا کہ: سرد خانہ تیار ہے، وہاں دوپہر کو آرام کیا کیجیے۔ مولانا نے فرمایا: 'ہم کون جو اس میں آرام کریں؟ وہ حق ہے طالب علموں کا'، اور کبھی آپ نے سرد خانہ میں جا کر استراحت نہ کی اور گرمی کی تکلیفیں سہا کیں''(۲)۔

بہر حال! اس غنا وایثار، زہد وقناعت اور صبر وتحمل کے لیے علو مقام کے ساتھ ظاہر ہے کہ منافع طلبی اور مفاد پرستی کا جوڑ لگنا ناممکن تھا؛ اس لیے حضرت والاؒ نے مدرسۂ دیوبند سے استحصال کا کبھی کوئی واسطہ اور تعلق نہیں رکھا، نہ کبھی عہدے دار بنے، جیسے مدرس یا منتظم۔ نہ کبھی رسمی انداز سے اس کے کارکن ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس مزاج اور اس حال ومقام پر ہوتے ہوئے، جیسے یہ ناممکن تھا کہ حضرتؒ کا کوئی معاصر جو ان کے مزاج کو پہچانتا ہو، انہیں مدرسۂ دیوبند کی مدرسی یا ملازمت کے لیے بلائے، ایسے ہی یہ بھی ناممکن تھا کہ خود حضرت والاؒ بھی اس قسم کی موظفانہ خدمات اور ان سے استحصال مفادات کا کوئی تصور بھی ذہن میں لائیں۔

---

(۱) مختصر سوانح قاسمی، ص:۱۱۔

(۲) سوانح مخطوطہ، ص:۱۶۔

دارالعلوم سے حضرت نانوتویؒ کے تعلق کی نوعیت:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مدرسہ سے آپ کے تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ سمجھا جائے کہ آپ اجرائے مدرسہ کرا کر اس سے قطعاً بے تعلق ہو گئے تھے؟ اور اس کے کسی فکر و عمل میں آپ کی شرکت نہ تھی؟ مگر ظاہر ہے کہ بے تعلقی کے تصور کی یہاں کوئی گنجائش نہیں نکلتی؛ کیوں کہ ایک شخص کسی بنا کو اس سے بے تعلق ہونے اور اس سے منقطع ہو جانے کے لیے قائم نہیں کرتا؛ ورنہ قائم کرنے ہی کی اسے کیا ضرورت درپیش تھی؟

دوسرے یہ کہ حضرتِ والاؒ نے اپنے اس جوابی خط میں (جو قیامِ مدرسہ کے سلسلے میں آپ نے حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کو لکھا تھا) خود ہی یہ بشارت دی تھی کہ ''میں مدرسہ کے حق میں ساعی رہوں گا''۔ ظاہر ہے کہ اس وعدے کا ایفائے انقطاعِ سعی و عمل اور بے تعلق رہنے سے نہیں ہو سکتا تھا؛ بلکہ مدرسہ کے ساتھ انتہائی تعلق اور اس کے بارے میں پوری جد و جہد اور عملی مساعی سے ہی ہو سکتا تھا۔

تیسرے یہ کہ بہ قول حضرت شیخ الہندؒ جب حضرت نانوتویؒ نے ایک فکرِ خاص پر پورا مدرسۂ دیو بند قائم فرمایا کہ وہ فکر پھیلے اور آگے بڑھے (جیسا کہ سابق میں گزر چکا ہے)، تو مدرسہ سے بے فکری، بے تعلقی اور کلی علاحدگی سے یہ غرض و غایت آخر کیسے پوری ہو سکتی تھی؟ اور اس فکر کو صاحبِ فکر کی بے تعلقی کی صورت میں آخر کون چلاتا اور پورا کرتا؟

ان تمام واقعاتی وجوہ کا قدرتی تقاضا ہے کہ حضرتِ والاؒ اجرائے مدرسہ کے بعد بھی مدرسہ سے اتنے ہی متعلق ہوں، جتنا کہ اس کی تاسیس سے متعلق رہے، کہ یہ بھی بانی ہونے کا ایک قدرتی اقتضا ہے؛ بلکہ غور کیا جائے، تو مدرسہ کی ذمہ داری سب سے زیادہ بہ لحاظِ اصول و فکر حضرتِ والاؒ ہی پر عائد ہو سکتی تھی، جس کو آپ نے اجرائے مدرسہ کر کے طبعاً خود اپنے سر عائد فرما لیا تھا۔ چناں چہ ان اصولی استدلالی تقاضوں کو اگر تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے، تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ حضرتِ والاؒ اگر تا بہ حدِ مفادات ذاتی مدرسہ سے بے نیاز اور بے تعلق تھے، تو بہ حدِ سعی و عمل ہمہ وقت اس میں منہمک اور مشغول بھی تھے، اور آپ کا ہمہ وقتی عمل مدرسہ ہی کی فلاح و بہبود اور اس کی ہی ہر جہتی ترقی تھا۔ ''سوانح مخطوطہ'' میں ہے:

۱- حال آں کہ رات دن مدرسہ کی اسلوبی میں مصروف رہتے اور تعلیم میں مشغول''(۱)۔

ظاہر ہے کہ یہ رویہ کہ کمالِ استغنا بھی ہو، اور کمالِ عمل بھی، اور کمالِ مرجعیت بھی، اسی فرد کا ہو سکتا ہے، جو اول سے لے کر آخر تک مدرسہ کے قیام و اجرا کی اصل و اساس اور ادارے کا ہمہ اوست مانا گیا ہو، اور اس

---

(۱) سوانح مخطوطہ، ص:۱۶۔

نے محض اپنے فکر کو (جو ملھم من اللہ ہو) آگے بڑھانے کے لیے ادارے کو قائم کیا ہو، جس میں ذاتی مفاد کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ چناں چہ مدرسہ کے کاموں میں آپ کی ذہنی مصروفیت اور صرفِ ہمت کا اندازہ اس ایک وقعہ سے ہوسکتا ہے:

حضرت نانوتویؒ کا دارالعلوم کے بنیادی امور میں تصرف:

۲- حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم ثانی مدرسۂ دیو بند کا خود اپنا مقولہ ہے، جو ''ارواحِ ثلاثہ'' میں نقل کیا گیا ہے:

''مدرسہ کا اہتمام میں نہیں کرتا؛ بلکہ حضرت نانوتویؒ کرتے ہیں، جو کچھ مولانا کے قلب پر وارد ہوتا ہے، وہ بعینہٖ میرے قلب میں منعکس ہوجاتا ہے، اور وہ کام کرگزرتا ہوں۔ چناں چہ میرے کام کرنے کے بعد حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ: مولانا! اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، میرے دل میں بھی یہی آرہا تھا، جو آپ نے کیا''۔

اس سے صاف نمایاں ہے کہ حضرتِ والاؒ کا امورِ مدرسہ میں دخل وتصرف صرف علم ہی کی حد تک محدود نہ تھا؛ بلکہ آپ جزوی جزوی امور پر توجہ بھی رکھتے تھے؛ ورنہ ایک ذمہ دار کارکن (مہتمم) کی جزئیاتی امور میں ہمت افزائی، رہنمائی اور باطنی تاذین کے کوئی معنی ہی نہیں ہوسکتے۔

۳- اس ذہنی اور قلبی مصروفیت اور ہمتِ باطن کے علاوہ آپ کا ظاہری عمل بھی کسی ایک نوع میں منحصر نہ تھا؛ بلکہ ہمہ جہتی تھا۔ آپ روزمرہ کی جزئیات کے علاوہ اہم بنیادی امور: تقرر، تنزل اور عزل ونصب وغیرہ جیسے امورِ کلیہ میں بھی ابتدا ہی سے دخیل تھے۔ چناں چہ مدرسہ کی عین ابتدائی تاسیس کے وقت میرٹھ سے ملا محمود صاحبؒ کا تقرر بہ حیثیت مدرس آپ ہی نے بہ اختیار خود کر کے دیو بند بھیجا، اور آپ ہی نے پندرہ روپیہ ماہ واران کی تنخواہ جاری فرمائی، جو ایک بااختیار ذمہ دار کا کام ہوتا ہے، جیسا کہ خود حضرتِ والاؒ کے مکتوب بہ نام حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ سے نمایاں ہے، جو گزر چکا ہے۔

۴- پھر آپ ہی نے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسی غنی و مستغنی شخصیت پر زور اور دباؤ ڈال کر انہیں عہدۂ مہتممی پر مقرر فرمایا۔ ''سوانح مخطوطہ'' میں ہے:

''حضرت مولانا مرحوم کے دباؤ سے آپ نے (مولانا رفیع الدین صاحبؒ) نے عہدۂ اہتمام مدرسۂ دیو بند اپنے سر دھرا؛ ورنہ بہت گھبراتے تھے''[1]۔

---

(۱) سوانح مخطوطہ، ص: ۳۵۔

۵-حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کوصدر مدرس مدرسۂ دیو بند بنا کر آپ ہی نے دیو بند بلایا، اورصدر مدرسی پر مامور فرمایا۔حضرت میاں صاحب (مولانا اصغر حسین) رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (ابن مولانا مملوک العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ)، جو اجمیر میں سو روپیہ مشاہرہ پر مدرس رہ چکے تھے، اور پھر بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے ارشاد سے اس (صدر مدرسی کی) خدمت (پر) مدرسۂ دیو بند کو ایک اسلامی خدمت سمجھ کر اواخر ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) میں تشریف لائے، اور نہایت قلیل مشاہرہ بیس روپے (کچھ عرصے بعد تیس روپے) پر صدر قرار پائے''(۱)۔

بہر حال! ان تقررات سے ظاہر ہے کہ مہتمم مدرسہ، صدر مدرس مدرسہ، مدرس دوم مدرسہ (ملا محمود صاحبؒ) آپ ہی کے مقرر فرمودہ تھے، جو ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) اور اس سے متصل سنین میں عمل میں آئے، جس سے واضح ہے کہ میرٹھ چھوڑنے سے قبل ہی حضرتِ والاؒ کے تصرفات اہم امور میں ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) ہی سے جاری ہو گئے تھے۔ پھر یہی نہیں؛ بلکہ مدرسہ کی عام جزئیات تک میں بھی آپ ہی کا منشا کارفرما تھا۔ چناں چہ روزمرہ کی جزئیات میں آپ کا دخل وتصرف ''سوانح مخطوطہ'' کی اس عبارت سے ظاہر ہے:

۶- ''آپ (حضرت مولانا رفیع الدین صاحب) کی اور مولانا (نانوتویؒ) کی کبھی صراحتاً یا کنایتاً، خفیہ یا علانیہ کسی طرح کی مخالفت (دربارۂ امورِ مدرسہ) نہیں ہوئی؛ بلکہ روز بہ روز ترقی..........'' الخ(۲)۔

جزئیاتِ عمل میں مخالفت کی یہ نفی اسی وقت برجائے خود صحیح ہوسکتی ہے کہ حضرت والاؒ کا جزئیاتِ اہتمام اور مدرسہ کے جزو وکل میں عمل دخل ہو؛ ورنہ موافقت ومخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

۷-حضرتِ والاؒ ہی نے مدرسہ میں فن سپہ گری کا شعبہ جاری فرمایا، اور خود اپنی نگرانی میں طلبا کو لکڑی اور تلوار کے ہاتھ سکھواتے تھے، کہ درحقیقت ۱۸۵۷ء کا یہ بھی ایک فکر تھا، جیسا کہ صاحبِ سوانح مخطوطہ نے اسے بالتفصیل بیان کیا ہے، اور بعض معترضین کا یہ مقولہ بھی نقل کیا ہے:

''اب یہ مدرسۂ عربیہ تھوڑا ہی رہا ہے، یہ مدرسۂ حربیہ ہو گیا ہے''۔

دارالعلوم کی رودادوں میں حضرت نانوتویؒ کا نام سرفہرست:

۸-۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) میں مدرسے کے قیام کا اعلان جن بزرگوں کی طرف سے ہوا ہے ان میں

(۱) حیات شیخ الہند، ص:۱۰۔

(۲) سوانح مخطوطہ، ص:۳۵۔

سرفہرست حضرتؒ ہی کا اسم گرامی ملتا ہے، جیسا کہ روداد مدرسۂ دیوبند، بابت ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) کے صفحہ ۳ر سے ظاہر ہے۔

۹- پھر ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) سے ۱۲۹۷ھ (۱۹۲۷ء) تک درجاتِ عربیہ کا امتحان بھی آپ ہی بہ شمول بعض اراکین خود لیتے تھے، باضابطہ رپورٹ اور رائے اپنے دستخط سے جو سرفہرست ہوتے تھے، دفتر اہتمام میں داخل کرتے تھے، جو رودادوں میں برابر شائع ہوتی تھی۔ چناں چہ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں مدرسۂ دیوبند کے سب سے پہلے سالانہ امتحان کے نتائج کی رپورٹ میں سرفہرست حضرتؒ کے دستخط ہیں، اور پھر دوسرے بزرگوں مثل مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر مدرس مدرسۂ دیوبند، مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ ڈپٹی انسپکٹر سررشتۂ تعلیم ضلع سہارن پور، مولوی مہتاب علی صاحبؒ مدرس تحصیل اسکول دیوبند کے دستخط ہیں (۱)۔

۱۰- پھر روداد مدرسہ بابت ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں ہے:

> ''امتحان سالانہ تحریری وتقریری نہایت احتیاط و کمال مصروفیت سے جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب بہ شمول دیگر علما و فضلا کے کئی روز تک لیا اور کیفیت ذیل تحریر فرمائی'' (۲)۔

۱۱- سالانہ امتحان کے پرچہ ہائے سوال بھی حضرتِ والاؒ ہی بہ شمول حضرت صدر مدرس تحریر فرماتے تھے۔ روداد کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

> ''اور امتحان تحریری میں ہر روز جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب و جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے سوالات تحریر فرمائے۔ جب امتحان پورا ہولیا، تب جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب و مولوی محمد یعقوب صاحب نے باہم مل کر اُن کے جوابات دیکھے'' (۳)۔

اسی طرح ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) کی روداد میں نتائج امتحان کی رپورٹ میں حضرتِ والاؒ کے دستخط سر فہرست ملتے ہیں۔ غرض سال بھر کی پڑھائی، اور اس کے نچوڑ میں نتائج امتحان سالانہ میں حضرتِ والاؒ کا گہرا عمل دخل اور ذمہ دارانہ رویہ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) سے جو مدرسہ کی تاسیس کا سال ہے، حضرتؒ کے سن وصال ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) تک مسلسل رودادوں میں مذکور چلا آ رہا ہے۔

امورِ مدرسہ میں حضرت نانوتویؒ کا عمل دخل:

۱۲- ساتھ ہی مدرسہ کے سالانہ جلسہ ہائے تقسیم انعام و تقسیم اسناد کے سلسلے میں حضرتِ والاؒ ہی آگے آگے

---

(۱) روداد مدرسۂ دیوبند، بابت ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء)۔

(۲) روداد ۱۲۸۵ھ، ص: ۶۔

(۳) روداد مدرسۂ دیوبند، بابت ۱۲۸۷ھ، ص: ۱۰۔

سربراہِ کار کی شان سے دکھائی دیتے ہیں۔ حضرتؒ ہی جلسے کے سامنے تقریریں فرماتے تھے، اور صرف وعظ و پند ہی نہیں؛ بلکہ ان تقریروں میں مدرسہ کی سالانہ کارگزاری کا بیان بھی ہوتا تھا۔ نیز اس میں چندہ دہندگان کا شکریہ، چندے کی اپیل اور مدرسہ کے بارے میں لوگوں کو توجہ دہانی بھی ہوتی تھی، جو ایک عملی ذمہ دار کی شان ہوتی ہے۔ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں جو مدرسہ کی عمارت کے سنگِ بنیاد رکھنے کا سال ہے، حضرتِ والاؒ کی تقریر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے ان کی موجودگی میں سنائی۔ بہ ظاہر موقع کی اہمیت کی وجہ سے یہ تقریر تحریری طور پر مرتب فرمائی گئی ہے، جس میں مدرسہ کی دس سالہ کارگزاری نمایاں کی گئی ہے، جسے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے ذریعہ سنوایا گیا۔ چناں چہ یہ تقریر اور ہر سال کی ایسی ہی تقریریں رودادوں میں طبع شدہ موجود ہیں، جن سے حضرتِ والاؒ کی مدرسہ کے بارے میں ذمہ دارانہ مصروفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۳- حتیٰ کہ حضرتِ والاؒ کے نام سے مدرسے کے لیے چندے کی اپیل بھی شائع ہوتی تھی، جو روداد میں شائع شدہ موجود ہے[1]۔

۱۴- ۱۲۹۴ھ (۱۸۶۸ء) میں حضرت نانوتوی، مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا رفیع الدین رحمہم اللہ کی حج کی روانگی کی کیفیت لکھ کر آخر میں لکھا گیا ہے:

> ''الحمد للہ! کہ ماہ ربیع الاوّل ۱۲۹۵ھ میں حضرات ممدوح الصدر (حضرت نانوتوی، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا رفیع الدین صاحب) مع الخیر والعافیت رونق افروز مدرسہ ہوئے، اور خدا کا فضل اور ان حضرات کی کرامت ہے کہ ان کے زمانۂ غیبت میں اس کارخانے میں کچھ کسی قسم کا کوئی حرج واقع نہیں ہوا''[2]۔

یہ مدرسہ کے کاموں میں ان کی غیبت میں حرج واقع نہ ہونے پر شکرِ الٰہی بجالانا اس کی واضح دلیل ہے کہ یہ سب حضرات اپنے اپنے دائرے میں ہمہ وقت کارہائے مدرسہ میں اس طرح مصروف رہتے تھے کہ ان کی غیبت میں اندیشہ تھا کہ امورِ مدرسہ میں خلل پڑ جائے؛ مگر خلل واقعہ نہ ہونے پر شکر الٰہی بجالایا گیا۔

۱۵- اور آخر میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرتؒ کی ہمہ وقتی مصروفیات کو بہت ہی صریح اور واضح الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔ حضرت ممدوحؒ بہ حیثیت مہتمم مدرسہ حضرتؒ کی وفات کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اور جیسے مولانا رحمۃ اللہ علیہ مسلسل مختلف خدمات و معاونتِ دار العلوم میں مصروف رہتے تھے ایسے ہی.....'' الخ[3]۔

(۱) دیکھیے: رودادِ مدرسۂ دیوبند، بابت ۱۲۹۳ھ، ص: ۳۸۔

(۲) روداد ۱۲۹۵ھ، ص: ۱۔　　(۳) رودادِ مدرسہ، بابت ۱۲۹۷ھ، ص: ۳۔

دارالعلوم کی شاخوں کا قیام بہ ایما حضرت نانوتویؒ:

۱۶- مدرسۂ دیوبند کی شاخوں اور فروعی مدارس میں جو بیرونِ دیوبند خود حضرت والاؒ ہی کے قائم فرمودہ تھے، مدرسین کو بھیجنا حضرتِ والاؒ ہی کے امر و اذن سے ہوتا تھا، اور حضرتؒ کے مخصوص تلامذہ کا ان میں تقرر ہوتا تھا۔ چناں چہ مظفر نگر میں مدرسہ قائم فرما کر اس میں اپنے ہی تلمیذ مولانا محمد مراد صاحب پٹنیؒ کو بھیجا، اور مراد آباد میں مولانا احمد حسن صاحبؒ کو، انبیٹھہ میں مولانا صدیق احمد صاحبؒ کو، نگینہ میں مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ کو اور دیوبند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کو مامور فرمایا، وغیرہ وغیرہ! ''سوانح مخطوطہ'' میں اس کی کچھ تفصیلات دی گئی ہیں، اور مختلف روداد ہائے مدرسہ میں بھی اس سلسلے کے کچھ تاریخی ٹکڑے ملتے ہیں۔

گو رسمی طور پر حضرتِ والاؒ نے مدرسہ کا کوئی عہدہ قبول نہیں فرمایا؛ لیکن مدرسے کے رسمی کاموں میں کوئی ایسا کام نہیں ملتا، جس میں آپ کا عمل دخل نہ ہو، خواہ عہدے داروں کا تقرر ہو، یا شعبہ جات کا اضافہ، انضباطِ اصول و قواعد ہوں، یا روزمرہ کی جزئیات، جیسا کہ ان ایک درجن سے زائد انواعِ کار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۷- حتیٰ کہ حضرتِ والا کی تعلیمی مصروفیات کو دیکھ کر جو بہ طور خود تھیں، اربابِ مشورہ نے انہیں رسمی خدمت سپرد کر دیے جانے، اور ان پر مدرسہ سے کچھ معاوضہ لینے پر اصرار کیا؛ مگر ہرگز قبول نہیں فرمایا۔ ''سوانح مخطوطہ'' میں ہے:

> ''اوائل میں اہل شوریٰ نے درخواست کی کہ آپ بھی اس مدرسے کی مدرسی قبول فرمائیے اور اس کے عوض میں کسی قدر تنخواہ؛ مگر قبول نہ فرمایا، اور کبھی کسی طور یا ڈھنگ سے ایک حبہ تک کے مدرسے سے روادار نہ ہوئے''(۱)۔

جس سے واضح ہے کہ آپ کی ہمہ وقتی اور غیر معمولی خدمت و مصروفیت اس درجے پر تھیں کہ آپ اس کے ہوتے ہوئے کوئی گھریلو کام یا فراہمی معاش نہیں کر سکتے تھے، جو بہ ظاہر اسبابِ گزر بسر کا ذریعہ بنتے، تو اربابِ شوریٰ نے معاوضہ قبول کرنے کی درخواست کی۔ غالبًا اسی وجہ سے ذمہ دارانِ مدرسہ نے آپ کے حق میں اعلیٰ رسمی عہدوں کے القاب بے دریغ استعمال کیے ہیں، جس سے خود حضرتِ والاؒ کارِہ تھے، جیسے ''سرپرست''، یا ''مربی''، یا ''مدبر امور'' وغیرہ، جو آپ کی ہمہ وقتی خدمات و تصرفات کی واضح دلیل ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے لیے سرپرست، مربی اور مدبر مدرسہ کے القاب:

۱۸- مثلاً قیامِ مدرسہ کے بعد آپ ہی اس مدرسے کے اولین سرپرست کہلائے۔ حضرت مولانا

---

(۱) سوانح مخطوطہ، ص: ۱۶۔

محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ''مختصر سوانح قاسمی'' میں لکھتے ہیں:

''(حضرت نانوتویؒ) شروع مدرسہ میں دیوبند آئے، پھر ہر طرح اس مدرسے کے سرپرست ہوئے''(۱)۔

''سوانح مخطوطہ'' کے مصنف نے لکھا ہے:

''جس قدر مدرسے کے کارکن ہیں، ما شاء اللہ! بجائے خود بے نظیر ہیں۔ سرپرست دیکھو تو مولانا (نانوتوی) مرحوم جیسا با کمال، مہتمم رفیع الدین صاحب جیسا باوقار، مدرسین نورٌ علیٰ نور۔ من جملہ ان کے جناب مولانا محمد یعقوب صاحب مدرسِ اوّل، ہر بات میں سب سے اوّل'' الخ(۲)۔

اس عبارت میں مدرسے کے کارکنوں کے عنوان کے نیچے عہدوں کے القاب کے ساتھ حضرتؒ کا ذکر کیا جانا، بجائے خود اس کی واضح دلیل ہے کہ آپ محض تبرک کے درجے میں سرپرست نہ تھے؛ بلکہ عملی سرپرست تھے، اور مشغولِ کار ذمہ داروں میں شمار کیے جاتے تھے؛ البتہ موظفین وملازمین میں سے نہ تھے؛ بلکہ آپ کا سارا عمل حسبۃً للہ ہوتا تھا۔

۱۹- :۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵ء) میں مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ کے عہدۂ اہتمام پر تقرر کی تجویز کے سلسلے میں لکھا ہے:

''اور حسب مقتضا ومصلحتِ وقت بہ اتفاق رائے جملہ اہل مشورہ وصاحب سرپرست (حضرت گنگوہیؒ) مولوی حافظ احمد صاحب خلف الرشید حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ العزیز سرپرست اول مدرسۂ ہٰذا مہتمم مقرر ہوئے''(۳)۔

اس عبارت میں حضرتِ والاؒ کو مدرسۂ دیوبند کا اوّلین سرپرست کہا گیا ہے۔

بہرحال! مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور صاحب سوانح مخطوطہ نے سرپرست کل اور بعد کے ذمہ دارانِ مدرسہ نے حضرتِ والاؒ کو سرپرستِ اوّل مدرسۂ دیوبند ظاہر کیا، جو بلاشبہ ایک تصرف وعمل کا منصب ہے، جس کا تجاویز کی منظوری میں مؤثر دخل رہا ہے، جیسا کہ خود اسی تجویز میں حضرت گنگوہیؒ کی بہ حیثیت سرپرست منظوری تجویز اہتمام میں دکھائی گئی ہے۔

۲۰- :۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں جب حضرتِ والاؒ مع دیگر علما وفضلا کے حج کو تشریف لے گئے، اور

---

(۱) مختصر سوانح قاسمی، ص:۳۹۔

(۲) سوانح مخطوطہ، ص:۳۴۔

(۳) روداد سالانہ دارالعلوم دیوبند، بابت ۱۳۱۳ھ، ص:۳۔

۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں واپسی ہوئی، تو اس میں حضرتِ والاؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب منشی فضل حق صاحب مہتمم وقت مدرسۂ دیوبند کی عبارتِ ذیل رودادِ مدرسہ میں ملتی ہے، جو قابل توجہ ہے:

''حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب ادام اللہ فیوضہم مدبر و مربی مدرسۂ ہذا'' الخ(۱)۔

ظاہر ہے کہ سرپرست یا مربی کا مدبر مدرسہ کا اطلاق کسی ایسی ہی ذات پر ہوسکتا ہے، جو ہمہ وقت ظاہر وباطن مدرسہ کے کاموں میں منہمک ہو، اور اسی کی منشا پر سارے کام چل رہے ہوں۔ نیز مہتمم اور ذمہ دارانِ کار یہ منصبی القاب اسی وقت کسی شخص کے لیے استعمال کرسکتے ہیں، جسے مدرسہ میں اوپر سے لے کر نیچے تک ذمہ دار کارکن اسے مدرسہ کا ہی نہیں؛ بلکہ خود اپنا بھی مرجع الامور سمجھے ہوئے ہوں، اور تاسیس سے لے کر تفریعی امور تک میں اسے سربراہ اور قائد تسلیم کیے ہوئے ہوں۔ بلاتشبیہ اس کی ایسی ہی مثال ہے، جیسے گاندھی جی کانگریس کے چار آنے کے ممبر تک نہ تھے؛ مگر ساری کانگریس اور سارے کانگریسی ان ہی کو کانگریس کا مربی ورہنما اور کرتا دھرتا اور ہیرو سمجھتے تھے۔ ان ہی کی پالیسی، ان ہی کے اصول اور ان ہی کی تعلیمات کو آزادیٔ ملک کی اساس وبنیاد قرار دیے ہوئے تھے۔ اسی طرح حضرت نانوتویؒ مدرسۂ دیوبند کے چار پیسے کے بھی ملازم نہ تھے، نہ کوئی عہدے دار، نہ منصب دار؛ لیکن ادارے کے سارے حلقۂ اثر میں کرتا دھرتا اور ہیرو ان ہی کو سمجھا جاتا تھا۔ نہ محض خوش اعتقادی کے طور پر؛ بلکہ ابتدائے تاسیس اور تاسیس کے بعد ان کی ہمہ وقتی خدمات اور مصروفیات کی وجہ سے اور قدم قدم پر انہیں کی رہنمائی کی وجہ سے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے استغنا اور مزاجی وارستگی کا حاصل یہ نہیں تھا کہ تاسیس مدرسہ کے بعد انہوں نے مدرسہ سے کوئی تعلق نہیں رکھا، اور وہ صرف چھتہ کی مسجد میں شخصی طور پر صرف تعلیم وارشادات اور اشغالِ باطنی، یا شخصی درس وتدریس، یا تصنیف وتالیف، یا تبلیغی اسفار میں وقت گزارتے تھے، نہیں! بلکہ آپ کے عزیز اوقات کا زیادہ حصہ مدرسہ کے کاموں، اس کی بہبود وفلاح، اور اس کی توسیع وترقی میں صرف ہوتا تھا، گریز اگر تھا، تو صرف رسمی عہدے داری، یا مالیاتی انتفاع سے تھا، جسے وہ خود ہی فرما چکے تھے کہ مجھے کسی کے تابع ہوکر رہنا پسند نہیں آتا؛ لیکن اس کے معنی عمل کی نفی کے نہیں؛ بلکہ عملی خود اعتمادی اور استقلال کاری کے ہیں؛ ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ کیا حضرتِ والا نے مدرسہ کی بنیاد اس سے بے تعلق رہنے، یا اس سے گریزاں ہونے کے لیے رکھی تھی؟ نہیں! بلکہ اپنے عملی، علمی اور فکری منصوبوں کو چلانے اور آگے بڑھانے کے لیے رکھی تھی، تاکہ ۱۸۵۷ء کی شکست کی تلافی ہو، اور ایک جماعت ان

---

(۱) رودادِ مدرسۂ دیوبند، بابت ۱۲۹۵ھ: ص ۱)

جذبات کی حامل پیدا ہو جائے جو ۱۸۵۷ء کے مجاہدین اپنے اندر لیے ہوئے تھے، نیز یہ کہ جماعت مقامی نہ ہو؛ بلکہ ملک گیر؛ بلکہ اس سے بھی آگے ہو کر عالم گیر ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کا ذریعہ تعلیم وتربیت ہی ہوسکتا تھا، جس سے دل ودماغ کی تعمیر ہوتی ہے، اور اس کا ذریعہ مدرسہ ہی ہوسکتا تھا؛ اس لیے مدرسۂ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی، جس سے یہ فکر شروع ہوا، اور براہ مدارس پھیلتے پھیلتے عالم گیر بن گیا، جس میں علم واخلاق کے ساتھ استقلال، خود اختیاری، غناواستغنا اور غیرت وحمیت سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتے تھے۔

چناں چہ اس جماعت نے غریبانہ زندگی کو سرمایہ دارانہ زندگی پر اور مستغنیانہ اور خودکارانہ زندگی کو امرا اور حکومتوں کی محتاج گی کی زندگی پر، اور بالا دستی کی زندگی کو زیردستی کی زندگی پر ترجیح دی، جو حضرتِ والاؒ کا فکر تھا۔ سو ظاہر ہے کہ یہ فکر مدرسہ سے ہٹ کر، یا اس سے کٹ کر رہنے سے پورا نہیں ہوسکتا تھا؛ اس لیے جس نے اس مقصد کے لے مدرسہ قائم کیا تھا، اسے مدرسہ سے بے تعلق رہنے کے بجائے سب سے زیادہ امورِ مدرسہ میں مصروف اور مشغول رہنا چاہیے تھا؛ اس لیے حضرتِ والاؒ اس بارے میں جہاں سب سے زیادہ غنی تھے، وہیں سب سے زیادہ مصروف بھی تھے، اور تا انقضائے حیات مسلسل اور برابر مصروف رہے۔ چناں چہ یہ مصروفیت ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) سے ہی شروع ہوگئی تھی، جو مدرسہ کے آغاز کا سال ہے، حال آں کہ اس وقت تک حضرتِ والاؒ کا میرٹھ سے تعلق قائم تھا، جیسا کہ رودادوں سے ظاہر ہے؛ لیکن سالانہ امتحانات، تقریروں میں اپیلیں، تقرراتِ اور توسیع وترقی کے منصوبے وغیرہ اس وقت سے حضرتؒ کے فکر اور رائے کے مطابق شروع ہو گئے تھے، اور پھر حضرتؒ کے قیام، دیوبند کے بعد تو یہ مشاغل مسلسل اور ہمہ وقتی ہو گئے، جس سے حضرتِ والاؒ کے اس فکر ونصب العین کے جو اثرات اس مدرسہ سے ہند وبیرونِ ہند میں ظاہر ہوئے سب کے سامنے ہیں، اور تاریخ شاہد عدل ہے۔

بہر حال! حضرت والاؒ کی یہ خودکارانہ اور استقلالی شان عمل بھی بجائے خود ان کے بانیٔ مدرسہ ہونے کی ایک مستقل دلیل ہے؛ کیوں کہ جو شخص نہ عہدے دار ہو، نہ تنخواہ دار، نہ مدرس ہو، نہ ملازم، نہ ناظم ہو، نہ منتظم، اور دخیل کار اس درجے ہو کہ تمام مدرس وملازم، ناظم ومنتظم اور مہتمم غرض سارے عہدے دار اس کے خم ابرو دیکھتے ہوں، اور وہ بھی محض روحانی یا اخلاقی طور پر نہیں؛ بلکہ رسمی طور پر بھی، اور پورے زور اور خود اعتمادی کے ساتھ ان کی عملی سرپرستی کرتا ہو، تو یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس ذات کو نفس ادارے کے حق میں چشمہ، اور مصدر اور اس کے کاموں کے لیے منبع اور مخزن سمجھا گیا ہو۔ اس سے ہی ادارے نے جنم لیا ہو، اور اس سے ادارے کے کاموں کا آغاز ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہی معنی کسی ادارے کی تاسیس کے ہوتے ہیں، جس سے بانی

کی حیثیت مشخص ہوتی ہے، اور بہ حیثیت بانی قلوب اس کی طرف خود بہ خود ملتفت ہو جاتے ہیں۔ پس آپ کا بانی؛ بلکہ سر براہ ہونا جہاں سابق میں عرض کردہ وجوہ و دلائل سے ثابت شدہ ہے، وہیں مدرسے کے کاموں میں آپ کی اس مصروفیت، مرجعیتِ عامہ اور مؤثر دخل کاری سے بھی نمایاں ہے۔

حاصلِ بحث:

خلاصہ یہ ہے کہ ان تفصیلات سے بانی والی روایتوں میں مذکورشدہ افراد کے بانی ہونے کی نفی نہ کرتے ہوئے حضرت نانوتویؒ کے بانی ہونے کی نوعیت بھی واضح ہوگئی، اور ساتھ ہی حضرتِ والاؒ کے بانی ہونے کی جامع شان بھی ہویدا ہوگئی، جو مدرسے کے قیام سے لے کر اس کے عملی کاموں کے انصرام وغیرہ تک سے نمایاں ہوتی رہی۔ شاید اسی نوعیت کے پیشِ نظر حضرت مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم جمعیۃ العلماء ہند نے جو حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خاندانی تعلق بھی رکھتے ہیں، حاجی صاحب ممدوحؒ کو بانیانِ مدرسہ میں شمار کرتے ہوئے حضرت نانوتویؒ کو "بانیٔ اعظم" کے لقب سے یاد کیا ہے، جو اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ بنائے مدرسہ کی جو نسبتیں اور حضرات میں خاص خاص خصوصیتیں لیے ہوئے تھیں، وہ حضرتِ والاؒ میں جامعیت کے ساتھ سب جمع تھیں، اور ظاہر ہے کہ جامعیت کسی نسبت کے لیے کمالِ ثبوت اور کمالِ امتیاز کا ذریعہ ہوتی ہے نہ کہ نفی اور تساوی کا۔

حضرت نانوتویؒ کی نسبت سب نسبتوں کی جامع ہے:

پھر جب کہ حضرتِ والاؒ کی نسبت ان تمام نسبتوں کی جامع ثابت ہوتی ہے، جو اس احاطہ میں پھیلی ہوئی ہیں؛ اس لیے حضرتِ والاؒ کے بعد اس دار العلوم کی رنگ کاری کرنے میں ایک دو شخصیتیں نہیں؛ بلکہ اباً عن جدٍ مختلف رنگ کی کتنی ہی شخصیتوں کا ہاتھ رہا ہے، جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی استعداد وصلاحیت سے اپنے مناسبِ حال دار العلوم کے کسی نہ کسی پہلو اور نسبت کو اُبھار کر ان قاسمی نسبتوں کو اجاگر کیا۔ کسی نے اسے ساری مجموعی شان سے اُبھارا، جیسے حضرت شیخ الہندؒ۔ کسی نے اس کی اجتماعی شان کو تقویت دی، جیسے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی اور حضرت مولانا محمد میاں صاحب انبیٹھوی مہاجر کابل رحمہم اللہ نے۔ کسی نے اس کا علمی وقار بلند کیا، جیسے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سر پرست رابع دار العلوم دیوبند، حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہما اللہ۔ کسی نے اس کی انتظامی اور تنظیمی شان بلند کی، جیسے حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم خامس دار العلوم و حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم سادس دار العلوم۔ رحمہما اللہ! کسی نے

اس کے تقدس اور مشیخیت کی شان کا بول بالا کیا، جیسے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہما اللہ۔ کسی نے اس کی فنی اور استدلالی شان کو اونچا کیا، جیسے حضرت مولانا غلام رسول خان صاحب، حضرت علامہ مولانا محمد براہیم صاحب صدر المدرسین دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا رسول خان صاحب، اور حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب شیر کوٹی رحمہم اللہ۔ کسی نے اس کی ادبی شان کو بڑھایا، جیسے حضرت مولانا عبد الصمد صاحب نگینوی، اور حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امرہوی رحمہما اللہ۔ کسی نے اس کے مسلک کے تحفظ اور دفاع پر تقریر وتحریر سے پورا زور صرف کیا، جیسے حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری، اور ان کے امثال، رحمہم اللہ تعالیٰ! ان کے علاوہ اور بہت سے اساتذۂ علوم وفنون نے جن کی فہرست طولانی ہے، اس کی آبیاری میں حصہ لیا، جو اسی سے بنے اور اسی میں فنا ہو گئے۔

بہر حال! جب کہ دار العلوم اپنی جامع نسبت کے سبب کسی ایک پہلو، یا ایک نسبت کا نام نہ تھا؛ بلکہ ان ساری نسبتوں کے مجموعے کا نام تھا؛ اس لیے ہر نوع کی شخصیت بھی اس نے بنائی، اور پھر ہر شخصیت سے اپنے کسی نہ کسی پہلو کو روشن کرنے کا کام لیا، اور اسے بڑھا کر اونچا کیا؛ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ دار العلوم کی گل کاری ایک دو محدود شخصیتوں پر منتہی ہو کر ختم ہو گئی؛ بلکہ وہ ہمہ گیر رہی اور تا حال جاری ہے، اور فرقِ مراتب کے ساتھ برابر جاری رہے گی، جب تک علمِ الٰہی میں مقدر ہے۔ ان شاء اللہ!

خلاصہ یہ ہے کہ اس دار العلوم کے جامع مکتبِ فکر کے تحت اکابر واساطین دار العلوم اس کے مختلف پہلوؤں کو حسبِ تقاضائے وقت لے کر اُٹھے، اور اپنے اپنے وقت میں مثالی ثابت ہوئے؛ اس لیے دار العلوم کی ترقیات کسی ایک دو کی نہیں؛ بلکہ درجہ بہ درجہ ان سارے بزرگوں کی رہینِ منت ہیں، جن کی چند مثالیں ہزاروں میں سے بہ طور نمونہ عرض کی گئیں۔ ان میں سے جس پر جس شان کا غلبہ ہو، اوہ اسی شان سے معروف اور متعارف ہوا؛ مگر یہاں شان چوں کہ ایک آدھ نہیں؛ بلکہ بہت سی ہیں؛ اس لیے ان کے مجموعے ہی کا نام ”دار العلوم دیوبند“ ہے۔ کسی ایک شان کو دار العلوم نہیں کہا جائے گا، اور سب ہی شانوں کو اونچا کرنے سے اس کا اصلی مقام ظاہر ہو سکتا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے بانی ہونے کی جامع نوعیت:

میرے خیال میں یہ چند سطریں حضرت نانوتوی قدس سرہ العزیز کے بانیٔ دار العلوم دیوبند ہونے کی جامع نوعیت کے لیے کافی ہیں، جس کے تحت وہ ”بانیٔ دار العلوم دیوبند“ کے لقب سے مشہور ہوئے، اور جب بھی دار العلوم کا ذکر آتا ہے، تو تنہا ان ہی کو بانی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، جس میں نہ دوسرے

حضرات کے بانی ہونے کی نفی شامل ہے، نہ بانیوں سے متعلقہ روایات سے کسی کا انکار۔

بہر حال! ان تمام متضاد روایتوں کی تطبیق وجمع کا نچوڑ، جس سے تمام متضاد روایتیں جمع ہوکر اپنے اپنے محل پر چسپاں ہو جاتی ہیں، ہر روایت کا واقعی مقام اسے مل جاتا ہے، اور ہر ایک کا محمل متعین ہو کر مجموعے سے جامع حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ امید ہے کہ ان سطور سے اُن حضرات کے خلجانات رفع ہو جائیں گے، جو ایک کو بانی کہہ کر دوسرے کے بانی ہونے کی نفی کو تاریخ سمجھے ہوئے ہیں۔ ﴿وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي بِنِعْمَتِهِ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ﴾[1].

(۱) سہ روزہ مدینہ- بجنور، ۱۷، ۲۵، ۲۸/ اکتوبر، یکم، ۵/ نومبر ۱۹۶۵ء۔

آزادی کی خوشی کی تکمیل
اور
مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ

حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہ بڑی حکیمانہ تحریر ہے۔ اس میں ہمارے اکابر، بالخصوص حضرت حجۃ الاسلامؒ کی آزادی کی جدوجہد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ''اصول ہشت گانہ'' کی تشریح حکیمانہ الفاظ میں آ گئی ہے، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ''دیوبند مکتب فکر'' عدم تشدد کا حامل ہے۔ جو تشدد پر یقین رکھے، اس کا ''دیوبندی'' ہونا ایک سوال ہے۔ (نعمان)

آج ۱۵/اگست ۱۹۵۷ء ہے، جو ہندوستان کا یوم آزادی ہے۔ ملک کا ہر ایک باشندہ خوشیاں منا رہا ہے، اور کوئی شبہ نہیں کہ آزادی سے بڑھ کر خوشی منانے کی اور کوئی چیز ہو بھی نہیں سکتی، جب کہ آزادی ہی ہر خوشی کا سرچشمہ ہے؛ لیکن آزادی ہمیں اچانک نہیں مل گئی، اور آسمان سے بارش کی طرح ایک دم برس نہیں گئی؛ بلکہ کتنے ہی صبر آزما دنوں، مہینوں اور سالوں، کتنے ہی دار و رسن کے ہنگاموں اور قید و بند کے ہیبت ناک کٹہروں؛ بلکہ کتنی ہی تڑپتی ہوئی لاشوں سے گزر کر یہ آزادی کی دولت ہم تک پہنچی ہے۔ گو آج کی تاریخ میں آزادی کا پارسل ہمیں بہ یک دم اور پُر امن طریق پر اچانک شب کے بارہ بجے موصول ہو گیا؛ لیکن وہ کتنے تاریک سمندروں سے گزرتا ہوا ہندوستان پہنچا؟ کتنے طوفانوں میں سے نکلا، اور کتنی خطرناک خلیجیں اس کی راہ میں حائل ہوئیں؟ جن کا کتنے ہی آہنی قسم کے انسانوں نے مقابلہ کیا؟ ایسے اہم سوالات ہیں، جن سے ہماری تاریخ وابستہ ہے، جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا؛ اس لیے آزادی کی خوشی کے ساتھ اگر ان غموں کی اور غم سہنے والی عظیم المرتبت شخصیتوں کی داستان سامنے نہ لائی جائے، جو آزادی کے اوّلین علم بردار تھے، تو نہ آزادی کی خوشی ہی مکمل ہو سکتی ہے، اور نہ یوم آزادی کوئی روشن دن ہی بن سکتا ہے؛ کیوں کہ ہماری خوشی کی تعمیر ان ہی کے غموں اور غم خواریوں کی اساس پر کھڑی ہوئی ہے۔ اگر وہ قید و بند اور دار و رسن کا غم نہ کھاتے، تو یہ آزادی کی خوش بو ہمارے دماغ تک نہ پہنچتی؛ اس لیے ہماری خوشی ان کی آزادی خواہانہ روش کے تذکرہ

کیے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔

آزادی کا ہیرو:

ایسی بلند پایہ شخصیتیں کافی تعداد رکھتی ہیں، جنہوں نے اپنے اپنے موقع پر سرفروشی کے جوہر دکھائے، اور ایثار وقربانی سے گو اپنے کو ختم کرلیا؛ مگر آنے والی نسلوں کے لیے آزادی کی خوشیاں منانے کی فضائیں ہموار کر گئے۔ ان میں متعدد شخصیتیں آزادی کے ہیرو کی حیثیت رکھتی ہیں، جن کے تذکروں سے تاریخ کا دامن بھر پور ہے۔

میں اس موقع پر ایک ایسی نامور اور عظیم القدر شخصیت اور اس کی اصولی شاہراہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نہ صرف ذاتی طور پر حصہ ہی لیا، اور نہ صرف ایک ہیرو؛ بلکہ امیر لشکر وسپہ سالارِ فوج کی حیثیت سے شاملی کے میدان جنگ میں پیش قدمی کی، کہ اس میں اور شخصیتیں بھی پیچھے نظر نہیں آتیں؛ بلکہ جنگ کی فتح وشکست کو آنکھوں میں رکھ کر آزادی پسندی اور آزادی خواہی کی ایک ایسی اصولی شاہراہ ڈال دی، جس سے جماعتیں کی جماعتیں آزادی کے میدانوں میں مارچ کرتی ہوئی نظر آنے لگیں؛ بلکہ دلوں اور دماغوں کی تربیت ہی آزادیٔ ضمیر، آزادیٔ زبان وقلم اور آزادیٔ ملک وملت کے جذبات کی اساس پر ہوتے رہنے کی راہ پڑ گئی، اور جو فتح شاملی کا میدانِ کارزار تیغ وسناں سے نہیں پاسکا تھا، وہ ان اصول کے ہتھیاروں سے قلم وزبان کے میدان میں نظر آ گئی، اور نظر بازوں سے ہم کنار ہوگئی۔

میری مراد اس سے حضرت اقدس حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ بانی دار العلوم دیوبند کی ذات گرامی ہے، جو اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہٗ کے دل ودماغ کے اور علماً وعملاً امداد اللّٰہی لسان کی حیثیت سے اولاً شاملی کے ۱۸۵۷ء کے میدان میں سامنے آئے، اور اس ہنگامہ رست وخیز کے خاتمہ پر انہوں نے علم وعمل کی رونمائیوں کے لیے دار العلوم دیوبند کی تاسیس کی۔

شاملی کے میدان کی تلافی:

گویا شاملی کا میدان اور دار العلوم کی زمین ایک ہی حقیقت کے دو رخ تھے۔ فرق تیغ وسنان وقلم وزبان کا تھا۔ وہاں تشدد کے ساتھ آزادیٔ ملک وملت اور آزادیٔ مذہب ودین کا نصب العین سامنے تھا، اور یہاں عدم تشدد کے ساتھ علمی، اخلاقی اور آئینی رنگ میں وہی منصوبہ پیش نظر تھا۔ وہاں اس نصب العین کے لیے افراد استعمال کیے جارہے تھے، اور یہاں اس کے افراد بنائے جانے لگے۔ وہاں نام میدان جنگ کا تھا، اور یہاں نام مدرسہ اور مکتب، امن وصلح کا تھا۔ وہاں قلب ودماغ کے اشاروں پر ہاتھ پیر کام کر رہے تھے، اور

یہاں بہ راہِ راست دل ودماغ نے خود اپنے تصرفات دکھلائے۔

غرض حضرت والاؒ نے میدانِ شاملی کے نتائج پیش نظر رکھ کر دار العلوم دیوبند کی تاسیس کی، اور اس کے اصول اور نظام کار کو ایسے انداز پر اٹھایا کہ شاملی کے میدان کی تلافی ہو، اور جو منصوبہ اس وقت کامیابی سے ہم کنار نہ ہوسکا تھا، وہ اب ہو جائے۔

سیاسی محکومیت کے ازالے کی واحد تدبیر:

حضرت والاؒ نے دار العلوم دیوبند؛ بلکہ ۱۸۵۷ء کے بعد تمام دینی مدارس کے لیے آٹھ اصول کا ایک دستورِ اساسی مرتب فرمایا، جو دار العلوم کی معنوی تاسیس تھی۔ اس کی ہشت گانہ دفعات میں اپنے ذہن کا وہ جمہوری نظام، جس کو آپ وقت کی پکار سمجھ رہے تھے، اور جو ایک طرف اگر علاقۂ خواص پر مشتمل تھا، تو دوسری طرف اس کی روح رابطۂ عوام تھی، ذہن سے نکال کر کاغذ پر رکھ دیا۔

حضرت والاؒ ان اصول کے راستے سے قوم کو حکومتِ وقت اور امرائے عصر سے بے نیاز ہو کر حق خود ارادیت اور حق خود اختیاری کے ساتھ اپنے قدموں پر کھڑا کرنا چاہتے تھے؛ کیوں کہ جو قوم خود اپنی قدر سے قادر نہ ہو، وہ ہمیشہ دوسروں کے رحم وکرم پر جیتی ہے، اور وہ جینا زندگی نہیں، موت بہ صورت حیات ہے۔

حضرت نے ۱۸۵۷ء کے بعد بھانپ لیا تھا کہ اگر قوم میں ملک وسیاست کے ساتھ علم واخلاق اور ذہن وفکر میں بھی حق خود ارادیت باقی نہ رہا، تو اس قوم کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی، اور وہ کبھی بھی اجتماعی طور پر خود اختیار بن کر نہ ابھر سکے گی؛ اس لیے حضرت والاؒ کے نزدیک قوم کی سیاسی محکومی اور اجتماعی غلامی کے ازالے کی واحد تدبیر ہی یہ تھی، اور واقعہ یہی تھا کہ قوم کو علم ودین کے راستے سے اجتماعیت کی لائنوں پر ڈال دیا جائے، اور یہ جب ہی ممکن تھا کہ تعلیم وتربیت کے نظام کو شخصیاتی لائن کے بجائے جماعتی اصول پر قائم کیا جائے، تاکہ ایک طرف تو عوام کی قوت اس کے ساتھ ہو جائے، اور دوسری طرف اس تعلیم اور نظم تعلیم کے پروردوں میں دینی حدود کے ساتھ جمہوری تنظیم کا مذاق پیدا ہو جائے۔

حضرت والاؒ دل کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ زمانہ عوام کو ابھارنے والا ہے، حکم رانی کی قوتیں عوام کی طرف منتقل ہونے والی ہیں، اگر یہ صورتِ حال خود رو طریق پر ہوئی، تو اس عوامیت میں لادینی کے جراثیم کارفرما ہو جائیں گے، جس سے اس دین شعار قوم کی حقیقی بنیادیں ہی ختم ہو جائیں گے، اور اس کا قومی وجود ہی سرے سے باقی نہ رہے گا۔

اس لیے آپ نے اس ادارے میں تعلیم تو خالص دین کی جاری فرمائی اور نظامِ تعلیم یعنی نظم ادارے

کے اصول اجتماعی اور جمہوری رنگ کے رکھے، تاکہ دین اور نظم دونوں کے مجموعے سے قوم میں دینی خود اختیاری کی قوت پیدا ہو جائے کہ:

"اَلْمُلْکُ وَالدِّیْنُ تَوْأَمَانِ". "ملک اور دین دو جڑواں بچے ہیں"۔

ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتا۔

جہادِ شاملی کے رخ کی تبدیلی:

حضرت والاؒ کے ان اصولِ ہشت گانہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اصول لکھتے وقت آپ گویا شاملی کے میدان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ قوم کی ہزیمت وشکست کا منظر آپ کے سامنے ہے، اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ حکومتِ متسلطہ شکست خوردہ قوم کے حقوقِ آزادی کو کچل رہی ہے، اور اس کے قومی تشخص اور حقِ خود ارادیت کو، اور ساتھ ہی اس کے مذہب اور قومی بنیادوں کو، جن پر اس کی قومی شخصیت کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، پامال کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیلات آپ کو "سوانح قاسمی" میں ملیں گی، جن کا سلسلہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔

حضرتؒ نے ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد محسوس کیا کہ اب تلوار سے تلوار کے مقابلے کا وقت نہیں ہے، تو آپ لوہے کی تلوار میان میں کر لیتے ہیں، اور تعلیمی لائن کے ہتھیار میان سے نکال کر میدانِ مقابلہ میں آ جاتے ہیں۔ گویا شاملی کا جہاد ابھی ختم نہیں ہوا، صرف رخ بدلا ہے، اور ہتھیاروں کی نوعیت تبدیل ہوئی ہے۔

اس ٹھنڈے مقابلے کا پہلا قدم قوم کی سنبھال اور رکھوالی تھی، جب کہ اسے ناتربیتی اور لاتعلیمی ہی کی وجہ سے شکست اور ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا تھا؛ اس لیے اس جدید اقدام میں تعلیم وتربیت کے راستے سے قدیم ناتربیتی اور لاتعلیمی کے اثرات زائل کرنے تھے۔ احساس کم تری کو دلوں سے دور رکھنا تھا، تاکہ حوصلوں میں فرق نہ آ جائے۔

آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ:

دوسرا قدم دین کی اخلاقی تربیت، صفائی قلب، پاکیزگیٔ نفس اور جذباتِ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ سے قوم کی تعمیر تھی، تاکہ آزادیٔ ضمیر کی روح اس میں مستحکم ہو جائے۔

اور تیسرا قدم علم وعمل اور اخلاق کے ان سانچوں میں حریتِ نفس اور آزادیٔ ملک وملت کے ایسے جذبات کا رنگ بھرنا تھا، جن میں فکر وبصیرت کے ساتھ اخلاص وایثار اور قوم پروری کی روح دوڑ رہی ہو۔

دار العلوم کے یہ بنیادی اصول اجتماعی روح کے ساتھ حضرتؒ نے اس وقت وضع فرمائے، جب کہ

نئے تسلط واقتدار کے زیر اثر سر برآوردگانِ ملک عوام کے جذبات سے الگ ہو کر طاقتِ متسلطہ کی گود میں اپنے کو ڈال رہے تھے۔ ''حریت کاری'' کے بجائے ''وفاداری'' کا خمار خودسروں کے سروں میں بھر چکا تھا، اور قومی رشتے حکومتی رشتوں پر بھینٹ چڑھائے جارہے تھے۔

حضرتؒ نے اس وقت ان آٹھ اصول کے راستے سے استغنائی رنگ میں اس ادارے کی بنیاد رکھی، اور اس علمی تنظیم سے خواص کے ذریعے عوام کو ابھارنے اور مضبوط بنانے کا پرداز ڈالا، اور ملک کے اونچے طبقے سے ہٹ کر جو حکومت کی گود کی طرف بڑھ رہا تھا، ایک آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ ان اصول کے راستے سے کرلیا۔

ان اُصول اور ان کے بنائے ہوئے علمی اداروں، یعنی دارالعلوم دیو بند، اور اس کی فروعات سے ملک کی علمی اور دینی خدمات کیا ہوئیں؟ اور ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے ایک ایک کونے؛ بلکہ پوری دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں علم واخلاق اور قال اللہ وقال الرسول کی روشنی کس حد تک پہنچی اور پھیلی؟ اس تحریر میں میرا موضوع بحث نہیں، میری غرض صرف یہ ہے کہ اس کے علاوہ اجتماعی لائنوں میں ان اصول نے کیا اثر دکھلایا، اور اس دارالعلوم سے علمی تنظیم کی صورت سے اجتماعی رجحانات اور ان کے عملی نتائج کس حد تک ظاہر ہوئے؟

خاموش راہ نمائی کے آٹھ اصول:

سو ان کا اجمالی خاکہ سامنے لانے کے لیے پہلے ان اصول ہشت گانہ کا متن پڑھیے، اور پھر ان کے پیدا کردہ ذوق اور ذوق سے پیدا شدہ عملی آثار کو دیکھیے۔

اصول کا متن جو حضرت والاؒ کے قلم کا لکھا ہوا خزانۂ دارالعلوم میں محفوظ ہے، حسب ذیل عنوان سے شروع ہوتا ہے:

''وہ اصول جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور مدارسِ چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں''۔

(اس عنوان کے نیچے حسبِ ذیل آٹھ اصول قلم بند فرمائے گئے ہیں):

۱- اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ اپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیر اندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

۲- ابقائے طعامِ طلبہ بل کر افزائش طعامِ طلبہ میں جس طرح ہو سکے، خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

۳-مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسے کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدا نہ خواستہ جب اس طرح کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفتِ رائے، اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو، تو پھر اس مدرسے کی بنا میں تزلزل آ جائے گا۔ القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس وپیش میں اسلوبیِ مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو، اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہارِ رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں، اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں۔ یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آ جائے گی، تو اگر چہ ہماری مخالفت ہی کیوں نہ ہو، بہ دل و جان قبول کریں گے، اور نیز اسی وجہ سے ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور رمشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں، جو ہمیشہ مشیرِ مدرسہ رہتے ہیں، یا کوئی وارد و صادر، جو علم وعقل رکھتا ہو، اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو، اور اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہل مشورہ سے مشورے کی نوبت نہ آئے، اور بہ قدرِ ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو، تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھے کیوں نہ پوچھا؟ ہاں! اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا، تو پھر اہل مشورہ معترض ہوسکتا ہے۔

۴-یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں، اور مثل علمائے روزگار خود بیں اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں۔ خدا نہ خواستہ جب اس کی نوبت آئے گی، تو پھر اس مدرسے کی خیر نہیں۔

۵-خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے، یا بعد میں کوئی اور انداز مشورے سے تجویز ہو، پوری ہو جایا کرے؛ ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا، اور اگر ہوگا، تو بے فائدہ ہوگا۔

۶-اس مدرسے میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ! بہ شرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی، جیسے جاگیر یا کارخانۂ تجارت، یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا، جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی، اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

۷-سرکار کی شرکت اور امرا کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸- تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجبِ برکت معلوم ہوتا ہے، جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

جمہور کا ادارے اور عوام سے رابطہ:

ان اصولِ ہشت گانہ کی رو سے حضرت والاؒ نے:

۱- سب سے پہلے اس ادارہ کو عوامی اور جمہوری قرار دیا، اور اس کی کفالت کا بار عوامی چندوں پر رکھا، تا کہ یہ ادارہ سرکاری یا کسی مخصوص پارٹی کا کہلانے کے بجائے جمہوری اور عوامی کہلائے۔ پھر اس کی ضروریات کی اپیل بھی براہِ راست عوام ہی سے رکھی، جس کا سلسلہ واسطہ بلاواسطہ قائم رکھنے کی ہدایت فرمائی، تا کہ کسی وقت بھی ادارہ عوام اور جمہور سے مستغنی نہ ہو، اور عوام کی توجہ کسی آن ادارے سے ہٹنے نہ پائے۔ ساتھ ہی تکثیرِ چندہ کی مساعی جاری رکھنے کی بھی تلقین فرمائی، جس کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی، تا کہ جس رفتار سے چندہ بڑھے، اسی رفتار سے ادارے کا حلقۂ اثر بھی وسیع ہوتا چلا جائے، اور زیادہ سے زیادہ عوام کا رابطہ اس سے قائم ہوتا رہے۔

چناں چہ اسی اصول کی روشنی میں اس ادارے کی مجلس شوریٰ (جو اس کے نظم ونسق کی ذمہ دار ہے) کو وکیل اہل چندہ اور مالیات میں نمائندۂ عوام قرار دیا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ عوام صرف چندہ دہندگان ہی نہیں؛ بلکہ بہ واسطۂ مجلس شوریٰ اس کے مالی مصارف کے نگراں اور مجوز بھی ہیں، اور اول سے آخر تک ادارے میں ان ہی کا عمل دخل ہے۔

آج کی دنیا میں سیاسی انقلاب لانے والی، یا حکومت چلانے والی جماعتوں کا بنیادی اصول کیا اس سے کچھ مختلف ہے؟ ان کے یہاں آج کے جمہوری دور میں انقلاب لانے کا بنیادی اصول رابطۂ عوام کے سوا اور کیا ہے؟ اور اس رابطے کی صورت آخر اس کے سوا کیا ہوتی ہے کہ عوام کو مرکز سے وابستہ کر کے ان کی قوت سے کام لیا جائے، اور ان ہی کے حصۂ رسد سرمایہ سے کام کو آگے بڑھایا جائے۔

خلافت کمیٹی قائم ہوئی، تو اس نے بھی عوام کو ممبر بنا کر رکنیت کی فیس رکھ دی۔ کانگریس کمیٹی رونما ہوئی، تو اس نے بھی عوام کی ممبری سے کام چلایا۔ دوسری سیاسی پارٹیاں اُبھریں، تو انہوں نے بھی عوامی ممبر سازی اور رکنیت کی فیس رکھ کر ہی عوام سے رابطہ قائم کیا، جس سے انقلابی کام آگے بڑھا۔

حضرت والاؒ نے آج سے سو برس پہلے، جب کہ رابطۂ عوام کا سسٹم عام نگاہوں کے سامنے نہیں آیا تھا، یہ عوام کا ادارہ قائم کر کے عوام کو فیس رکنیت کے عنوان کے بجائے عوامی چندے کے نام پر ادارے سے

وابستہ کیا۔ اسی طریق کار کو بعد کے مبصروں نے مدارس کے بجائے انجمنوں اور کمیٹیوں کی صورت سے اپنایا۔ فرق یہ رہا کہ سیاسی انجمنوں کا مقصد کوری سیاست تھی، اور اس ادارے کا مقصد سیاست اور دیانت کا مرکب نصب العین تھا۔ سیاسی کمیٹیوں نے سیاسی عنوان سے کام کیا، اور اس ادارے نے اپنی سیاست کو تعلیمی لائنوں سے آگے بڑھایا، جس میں آزادیٔ وطن کے ساتھ آزادیٔ مذہب وملت کی روح بھی قائم رکھی۔

بہر حال! اس اوّلین اصول کی روح اس عوامی چندے کی جدوجہد سے ملک کے عوام اور غربا سے زیادہ سے زیادہ رابطہ قائم کرنا تھا، تاکہ ادھر تو عوام اس ادارے کو اپنی چیز سمجھیں، اور اُدھر اس علمی ادارے سے وابستگی کے راستے سے ان میں علمی شعور پیدا ہو۔

ظاہر ہے کہ جب کہ ہر قوم میں اکثریت عوام اور غربا ہی کی ہوتی ہے، اور وہی قوم کی قوت اور ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں، اور اسی لیے ہر اجتماعی کام کا مدار رائے عامہ پر ہوتا ہے؛ اس لیے اصول مذکورہ کی رو سے عوام یا رائے عامہ کو پشت پر لے کر درحقیقت آزادیٔ ملک وملت کی ایک بنیادی قسط حاصل کر لی گئی، اور یہ اجتماعیت کی لائن کا پہلا قدم تھا، جو اس ادارے نے جنم لیتے ہی اٹھایا۔

سرکاری امداد کا بدل:

۲- اسی کے ساتھ دوسرے اصول میں قوم کے غریب بچوں، یعنی طلبا کی امدادِ طعام وغیرہ اور اس کی افزائش وتکثیر ضروری قرار دی، تاکہ ان کی دل جمعی اور وابستگی کے واسطے سے قوم اور ملک کو اس ادارے سے وابستگی روز بہ روز بڑھتی رہے۔ گویا پہلا اصول اگر رابطۂ عوام کا رکھا گیا، جو پچاس برس بعد انقلابوں اور جمہوری حکم رانیوں کی اساس بننے والا تھا، تو دوسرے اصول میں عوام کو خود بھی ادارے کی طرف بڑھنے کا موقع دیا، تاکہ اس دوطرفہ رابطے سے اتحادِ باہمی کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی رہیں۔

گو اس دور کے سرکاری لائنوں کے افراد کی طرف سے اس عوامی چندے کی تحصیل ووصول اور غریب طلبا کی امداد کو بھیک مانگنے اور بھیک منگے تیار کرنے سے تعبیر کیا گیا؛ کیوں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے لیے چندے کے ادارے کا قیام ایک نئی چیز تھی، اور سب سے پہلا چندے کا مدرسہ دار العلوم ہی تھا، جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا؛ لیکن حضرت والاؒ اپنے نورِ فراست سے محسوس کر چکے تھے کہ سرکاری ایڈ کے ساتھ قومی روح کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی، اور اس سرکاری امداد کا بدل بہ جز قومی چندے کے دوسرا نہیں؛ اس لیے ان مطاعن کی پرواہ کیے بغیر آپ نے انگریزی سرکاری کے علی الرغم ادارے کو اس لائن سے آگے بڑھایا؛ مگر زمانے کی رفتار نے بہت جلد اس رابطۂ عوام کی ضرورت واہمیت سمجھا دی

اور یہ بھیک مانگنے اور بھیک منگے بنانے کا سسٹم بالآخر ہر قوم پرور کو اختیار کرنا پڑا؛ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس بارے میں دار العلوم نے ملک کی قیادت کی اور قومی اداروں کے قیام کی لائن سے حریت طلبی کا یہ اولین اصول عملی طور پر دنیا کے سامنے لا رکھا۔

تالیفِ خواص:

۳- رابطۂ عوام کے ساتھ اجتماعی لائنوں میں علاقۂ خواص بھی ناگریز تھا، تو حضرت والاؒ نے تیسرا اصول تالیفِ خواص کا رکھا، جس کی رو سے اس ادارے کو شخصیاتی یا انفرادی رکھنے کے بجائے شورائی قرار دیا، تا کہ اس کے کام شخصی ہونے کے بجائے جماعتی رنگ سے انجام پائیں؛ کیوں کہ شخصیتوں پر مبنی کام شخصیتوں کے اُٹھ جانے سے ختم ہو جاتے ہیں؛ لیکن جماعتی کام افراد کے اٹھتے رہنے کے باوجود بقا پذیر رہتا ہے۔

ساتھ ہی ان مخصوص افراد کے رد و قبول کا معیار بھی کھول دیا کہ شورائی ارکان مخلص ہونے کے ساتھ ساتھ صداقت و ایثار لیے ہوئے ہوں، اجتماعیت کا مذاق رکھتے ہوں، بات کی پچ اور سخن پروری کی خو نہ ہو کہ اگر کسی کی شخصی رائے نہ چلے، تو اس میں واک آؤٹ کا جذبہ ابھر آئے؛ بلکہ حق پسندی کا جذبہ رکھتے ہوں کہ اپنی رائے کے مخالف بھی حق نظر آئے، تو گردن جھکا دیں۔

پس آزادیٔ ضمیر تو ایسی ہو کہ اپنی سچی رائے کے اظہار میں جھجک محسوس نہ کریں، اور حق پسندی یہ ہو کہ دوسرے کی رائے سمجھ میں آ جانے کے بعد مان لینے میں تامل تک نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اس آزادیٔ ضمیر کے ساتھ آزادانہ دستوری فرائض ادا کرنے والوں سے آزاد ہی فضا پیدا ہو سکتی ہے، اور ایسی آزاد فضا میں تعلیم بھی ہوگی، تو آزاد، اور نظم و نسق بھی ہوگا، تو آزاد، اور اس سے تربیت پا کر نکلنے والے بھی ہوں گے، تو آزاد ضمیر، جو آزاد ہی ماحول پیدا کر دینے کی صلاحیتیں رکھتے ہوں گے۔ پس اس اصول سے حضرت والاؒ نے ذہنی آزادی کی بنیاد ڈال دی، جو خارجی آزادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے، اور اس طرح گویا آزادی کی ایک اور قسط حاصل ہو گئی۔

پھر اس تالیفِ خواص کا دائرہ بھی محدود یا تنگ نہیں رکھا؛ بلکہ رائے مشورے کا دروازہ ہر وارد و صادر، ہر ذی عقل اور فہیم آدمی کے لیے کھلا رکھا، جو اس قسم کے تعلیمی اداروں اور ان کے مقاصد سے ہم دردی رکھتا ہو، گویا علاقۂ خواص میں رابطۂ عوام کو فکری حد تک بھی نہیں چھوڑا گیا، تا کہ ادارہ چند مخصوص اہل الرائے کی آرا میں محدود ہو کر ملک کے عام ذی رائے اور زیرک طبقے کی فکری اعانتوں سے محروم اور منقطع نہ ہو جائے، جو انجام کار کاموں کے نقصان اور جماعتی نظم میں ضعف و اختلال کا سبب ہوتا ہے، اور بالآخر نظم میں محدودیت

واستبداد پیدا ہوکر جماعتی تعصب اور گروہ بندی کے جراثیم رونما ہو جاتے ہیں، جو آزادی کے حق میں سنگِ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ پس اس اصول سے راہ آزادی کا ایک بھاری پتھر ہٹا دیا گیا، جو اُصولِ آزادی کی ایک اہم قسط ہے۔

اتحادِ مشرب:

۴- مرکز میں مربیوں اور کارکنوں کا اتحادِ مشرب لازمی قرار دیا، تاکہ اتحادِ خیال سے جماعتی نظم متحد اور مستحکم رہے؛ ورنہ درصورت اختلافِ مشرب تقابلِ باہمی پھر اس سے خود بینی و خودستائی، اور اس سے دوسروں کی توہین و آزار رسانی کے جراثیم اُبھر کر جماعتی نظم اور داخلی دل جمعی اور جماؤ کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں۔ انتظامات میں پارٹی فیلنگ شروع ہو جاتی ہے، جو انجام کار غلامی کی جڑوں کو اور زیادہ مستحکم کر دیتی ہے، جو ایک آزادی پسند اور حریت طلب جماعت کے سمِ قاتل ہے۔

اس لیے حضرت والاؒ نے اس غلامی شکن اصول سے آزادی کا ایک اور مانع مرتفع فرما دیا، یا جماعتی آزادی کے پروگرام کی ایک اور اہم قسط حاصل کر لی، جس سے آزادی کی منزل قریب اور یقینی ہو جاتی ہے۔

ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی استعداد:

۵- تجویز نصاب، مقدارِ خواندگی اور اندازِ تعلیم کو اس اصول کی رو سے نہ تو شخصی محض رکھا، جس میں وسعت نہ ہو، اور نہ عامۃ الناس کے عامیانہ آرا و قیاسات کے تابع کیا، جو عقلی تقاضوں اور مقتضیاتِ وقت سے معرّیٰ ہو؛ بلکہ مشورۂ خاص اور ان ہی اہلِ علم اور اہلِ تجربہ کی رایوں پر مبنی رکھا، جو مثلِ علمائے روزگار خود بیں اور دوسروں کے درپئے آزار نہ ہوں، تاکہ تعلیم آزاد بھی رہے، اور اس میں عامۂ مسلمین کے حالات اور وقت کے تقاضوں کی رعایت بھی ملحوظِ نظر رہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی آزاد؛ مگر مطابقِ حالات و مقتضیاتِ تعلیم سے دل و دماغ بھی آزاد؛ مگر پابند حدود ہی پیدا ہو سکتے تھے، اور ایسے ہی معتدل افراد سے ایک ایسے درمیانی قسم کے انقلاب کی توقع باندھی جا سکتی تھی، جو ملک کی ساری قوموں کے لیے قابلِ قبول اور اپنے اپنے دائرے میں نفع بخش ہو، جو نہ بے قید قسم کے انسانوں سے ممکن تھا، نہ غلامی پسند اور محدود الخیال افراد سے متوقع تھا۔

پس اس پانچویں اصول سے عمومی آزادی اور ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی استعداد پیدا کر دی گئی، جس سے آزادی کی منزل قریب سے قریب تر لے آئی گئی۔

یہ اس سے کچھ مختلف نہیں ہے کہ ہر انقلاب پسند ادارہ اپنے مطلوبہ رنگ کے انقلاب کے مطابق ہی

کانسٹی ٹیوشن بنا کر افراد تیار کرتا ہے۔ تنگ دل طبقہ تنگ دلانہ لٹریچر دماغوں میں ٹھونستا ہے، اور متعصب فرقہ تعصب آمیز کورس سے دل و دماغ کو تنگ نظر بناتا ہے، انجام کار جو طبقہ بھی انقلاب میں غالب آجاتا ہے، انقلاب اور تعمیر جدید میں اسی کی ذہنیت کار فرما ہو جاتی ہے۔ متعصب تھا تو انقلاب و تعمیر میں تعصب و تنگ دلی کے مظاہرے ہونے لگتے ہیں، اور فرقہ پرست تھا تو فرقہ پرستی کے؛ اس لیے حضرت والاؒ نے نصاب کو کوری آزادی و بے باکی اور خالص بستگی و غلامی دونوں ذہنیتوں سے الگ رکھ کر درمیانی رکھا، جو دل و دماغ میں ہر طبقے کے لیے گنجائش اور وسعت پیدا کر سکے کہ اسی سے درمیانی قسم کا انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔

روحانیت و اخلاق کے ذریعہ سے آزادی کی منزل:

۶-عطیات اور چندوں کے سلسلے میں امرا پر نظر اور ان کے وعدوں یا جاگیروں یا کارخانہ ہائے تجارت وغیرہ کے مستقل ذرائع آمدنی پر بھروسہ رکھنے سے اس چھٹے اصول میں کافی طور پر ڈرایا گیا، تاکہ ذہنی مرعوبیت اور اسیریٔ دل و دماغ کے جراثیم پرورش نہ پاسکیں، اور ادارہ خود غرض سرمایہ داروں کی نفسانی اغراض کی آمیزش سے پاک رہے، جو ذہنی ہی نہیں، خارجی آزادی کے حق میں بھی زبردست رُکاوٹ ہیں۔

کیا آج کے دور میں سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کے ختم کرنے کے دعوؤں سے فضائے عالم گونج نہیں رہی ہے؟ اور کیا ہر انقلابی پارٹی سرمایہ داروں کو راہ سے ہٹانے کی کوشش میں لگی ہوئی نہیں ہے؟ جب کہ وہ دیکھتی ہے کہ مطلوبہ انقلاب میں یہی سرمایہ دار پارٹی اپنے سرمائے اور عیش پسندانہ وسائل کی حفاظت کی خاطر انقلاب میں حارج ہوتی ہے۔ حضرت والاؒ نے اسے اس وقت محسوس کیا، جب مزدور اور سرمایہ دار کا کوئی رسمی سوال دنیا میں پیدا نہ ہوا تھا؛ مگر پیدا ہونے والا تھا۔

حضرت والاؒ اپنے نورِ فراست اور اپنے مذہب کے اصول کی روشنی میں دیکھ رہے تھے کہ انقلاب لانا کبھی سرمایہ داروں کا کام نہیں ہوا؛ بلکہ ہمیشہ جفاکش مزدور قسم ہی کے لوگ اس میدان میں آگے آئے ہیں، اور اب بھی وہی آگے آئیں گے؛ اس لیے آپ نے اپنے غریب اور متوکل طبقے کو، جسے وہ اس ادارے میں تیار کرنا چاہتے تھے، سرمایہ دار طبقے سے بے نیاز بنا کر الگ کر دیا، تاکہ ادھر تو یہ غریب طبقہ اس بیماری سے محفوظ رہے، اور اُدھر وہ روگ زدہ طبقہ بھی کسی حد تک شفا پا جائے؛ کیوں کہ ایک صورت تو اسے بدکا کر اور اس سے رقیبانہ تقابل ڈال کر اسے ختم کرانے کی تھی، اور ایک صورت اس سے مستغنی بن کر اسے مفلوج کر دینے کی تھی، جس سے وہ خود ہی اپنے روگ کو پہچان کر اسے زائل کرنے کی فکر میں لگ جائے۔

پہلی صورت میں کام یابی موہوم اور فساد یقینی تھا، اور دوسری صورت میں کام یابی یقینی اور امن و اصلاح

کے ساتھ۔ نیز پہلی صورت میں شور شرابہ اور ڈھونگ زیادہ ہے اور عمل کم، اور دوسری صورت میں اس کے برعکس کام اور کار برآری زیادہ ہے اور دعوؤں کا شور کم۔ نیز پہلی صورت میں سرمایہ داروں کو چونکانا اور مقابلے کی دعوت دینا ہے، اور دوسری صورت میں اسے ایک طرف چھوڑ کر خاموشی سے اس کی راہیں مسدود کر دینا ہے۔

حضرت والاؒ نے اس اصول میں دوسری صورت اختیار فرمائی، جو امن وسلامتی کے ساتھ سرمایہ داری کا جنازہ سامنے لے آتی ہے؛ کیوں کہ اس میں استغنائی رنگ سے سرمایہ داری کے جذبات کی حقارت دل میں اتاری گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ استغنا سے سرمایہ داری کو مٹانے والا خود سرمایہ دار بننے کی کبھی آرزو نہیں کر سکتا؛ لیکن سرمایہ کی محبت سے سرمایہ داری کو مٹانے کا خواہش مند درحقیقت سرمایہ کا خواہش مند ہے، جو اپنے رقیب کو راستے سے ہٹا کر اس کی جگہ لینا چاہتا ہے، جس سے سرمایہ دار تو مٹ سکتا ہے، مگر سرمایہ داری نہیں مٹ سکی۔ ظاہر ہے کہ جب ملک کی اکثریت (جو غیر سرمایہ دار غربا ہی کی ہوتی ہے) سرمایہ داری سے بے نیاز ہو گئی، تو قوم کی اکثریت سے سرمایہ دارانہ جذبات ختم ہو گئے، اور غنی کے آگے محتاج خود ہی جھک جاتا ہے۔

اس لیے حضرت والاؒ نے ادارے کی آمدنی، تعمیر اور دوسرے کاموں میں ایک گونہ بے سروسامانی، توکل اور استغنا کا اصول رکھ کر ادارے کو غریبانہ اور متوکلانہ انداز میں چلانا چاہا ہے، تاکہ کارکنوں میں تو سرمایہ اور سرمائے کا غرور پیدا نہ ہونے پائے، اور جن کو یہ روگ لگا ہوا ہے، وہ ادھر جھک جائیں، جس سے ان کے غرور میں کمی آجائے، اور اس طرح یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے قریب آجائیں، اور ان میں رقابتوں کے جوش سے باہمی نزاعات نہ پیدا ہوں، جس سے اوّلاً ذہنی آزادی اور ضمیر کی حریت ختم ہو جائے، اور پھر خارجی آزادی کے امکانات بعید سے بعید ہو جائیں۔

پس حضرت والاؒ نے اس اصول کے ذریعہ حصولِ آزادی کی ایک اور منزل قریب کر دی؛ مگر مادیت کے راستے سے نہیں؛ بلکہ روحانیت واخلاق کے راستے سے۔

سرکاری امداد سے احتراز کی حکمت:

۷- ادارے کے لیے گورنمنٹ کی امداد کو مضر بتلا کر اس سے بچتے رہنے کی ہدایت فرمائی، اور اس طرح ادارے کو سرکار کی مداخلت سے بچا کر تعلیمی آزادی کو برقرار رکھا گیا ہے، جو حقیقی آزادی کی اصلی منزل ہے؛ کیوں کہ اقتصادی غلامی ہی بالآخر سیاسی اور انتظامی غلامی پر منتج ہوتی ہے؛ اس لیے اس ساتویں اصول سے

اقتصادی آزادی حاصل کی گئی ہے۔

کیا اس کو ترکِ موالات نہیں کہتے؟ جس کو سیاسی پارٹیاں مختلف اندازوں سے استعمال کرتی ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں بہ سلسلۂ تحریک خلافت اور پھر بہ سلسلۂ تحریک آزادیٔ وطن کھدر پوشی کو رواج دے کر بیدیسی کپڑے کا نکاس بند نہیں کیا گیا؟ جس سے مانچسٹر وغیرہ کے کارخانے کافی متاثر ہوئے۔ نیز دیسی صنعتوں کو رواج دے کر بیدیسی سامانوں کا عملاً بائیکاٹ نہیں کیا گیا؟ اور کیا آج بھی ملکی اور قومی حکومتیں غیر ملکی سامانوں کی درآمد پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر کے ان کا نکاس نہیں روک رہی ہیں؟ تاکہ خود اپنے ملک کی تجارت وصنعت ترقی پائے، اور ملک ہر سامان میں غیر ملکوں کا اقتصادی محتاج وغلام رہنے کے بجائے خود کفیل ہو جائے کہ اس کے بغیر ملک کی اپنی بنیادیں مستحکم نہیں ہوتیں۔

ٹھیک اسی طرح اس اصول کی رو سے اس اجنبی حکومت کی درآمد بند رکھی گئی، جو ملک کی آزادی کی پامال کنندہ تھی، تاکہ یہ قومی ادارہ اپنی ضروریات میں خود کفیل رہے، اور قومی ہے، تو قومی ہی سرمائے سے چلے، اسے غیر قومی رنگ کے سرمائے کا دستِ نگر بن کر اقتصادی غلامی کا شکار ہونا نہ پڑے، جس سے وہ ہمیشہ سرکاری مداخلتوں کا نشانہ بنا رہے۔

بہر حال! جو مالی عدم تعاون کھدر پوشی اور بہ دیسی کپڑے کے بائیکاٹ میں مضمر تھا، وہی اس سرکاری ایڈ سے احتراز اور قومی سرمائے میں محدود رہنے میں مخفی تھا، صرف صورت اور مالی نوعیت بدلی ہوئی ہے؛ اس لیے حضرت والاؒ کی دوربین آنکھ سو سال پہلے وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، جو دوسروں کی آنکھوں نے بہت بعد میں دیکھا، اور پھر بھی پورا نہیں دیکھا۔

سرمایہ داری پر ضرب کاری:

۸-اس آٹھویں اصول میں کارکنانِ ادارہ کو غریب منش رہنے اور سرمایہ دار بننے سے روکا گیا ہے، جیسا کہ چھٹے اصول میں سرمایہ داری کے خاتمہ کی تدبیر بتلائی گئی تھی؛ کیوں کہ اس دفعہ کا حاصل یہ ہے کہ ادارے کے سلسلے میں غربا کے تعاون اور موالات کو اصل رکھا جائے، اور ان ہی کے انداز پر غریبانہ انداز میں کام چلایا جائے کہ ادارے کے لیے یہی پائداری اور پختگی کا سامان ہے۔

گویا اس دفعہ کا مفاد تعلیمی لائن سے غیر سرمایہ داروں کی ایک مستقل برادری کا قیام ہے؛ مگر غیر رسمی طور پر بلا اندازِ تقابل ورقابت جو ظاہر ہے کہ سرمایہ داروں کے مقابلے میں اقلیت ہی میں رہے ہیں، اور یہی وجہ ان سے بعد اور تنفر کی ہوتی ہے کہ وہ اکثریت کی ضرورت کی حد تک بھی سرمائے سے محروم کیے رہتے

ہیں۔اس کا ثمرہ یہ نکل سکتا ہے کہ جب یہ اکثریت اپنے کمالِ قناعت وتوکل سے سرمایہ داروں سے مستغنی ہوجائے، تو قدرتاً سرمایہ دار اس کے محتاج ہوجائیں گے، اور وہ بہ شوق ورغبت اپنا سرمایہ ایسے انسانوں اور کاموں پر لاکر نثار کرنے کے آرزومند ہوجائیں گے، جس سے سرمایہ داروں کا سرمایہ خود بہ خود باہر آجائے، اور غیر سرمایہ داروں کے حقوق قدرتی طور پر وصول ہوتے رہیں۔

اس طرح یہ دفعہ سرمایہ داری کے سر پر ایک کاری ضرب ہے؛ مگر موافقت اور مدارات کے پیرائے میں، جس سے ان دوطبقوں میں منافرت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ آزادی کی راہ کا روڑا بنے؛ اس لیے اس دفعہ سے بھی اقتصادی آزادی کا ایک اہم مورچہ فتح ہوجاتا ہے۔

تنظیمِ مدارس آزادی کی خشتِ اوّل:

۹- یہ حضرتؒ کے آٹھ حکیمانہ اصول کی تشریح تھی ؛ لیکن غور کیا جائے، تو ایک نواں اصول ان کے عنوان سے نمایاں ہوتا ہے، اور وہ تنظیمِ مدارس کا اصول ہے؛ کیوں کہ عنوانِ بالا میں دارالعلوم اور دوسرے مدارسِ چندہ کو ان ہی اصولِ ہشت گانہ کے نیچے جمع کرکے انہیں ایک دوسرے کا شریک ٹھہرایا گیا ہے، جو رابطۂ مدارس کی ایک معقول اور مؤثر صورت ہے، اور ظاہر ہے کہ مدارس کا رابطہ، مدارس کے فضلا کا قدرتی رابطہ ہے؛ اس لیے اس اصول میں تنظیم کردی گئی ہے، جو انقلاب اور آزادی کے لیے خشتِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔

پھر حضرت والاؒ نے صرف نظری ہی طور پر یہ اصول نہیں بتلایا؛ بلکہ عملی طور پر ان ہی اصولِ ہشت گانہ کی روشنی میں بہت سے مدارس خود قائم فرمائے، اور بہت سے مدارس اپنے متوسلین کے ذریعہ قائم کرائے۔

گویا ۱۸۵۷ء کے بعد آپ کی مستقل سیاست ہی یہ تھی کہ جگہ جگہ آزاد قومی مدارس قائم کیے جائیں، اور ان میں آزاد ضمیر نوجوان تیار کیے جائیں۔ اگر لارڈ میکالے یہ دعویٰ لے کر اٹھے کہ:

> **”ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے، جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں؛ مگر دل ودماغ اور طرزِ فکر کے لحاظ سے انگلستانی ہوں“۔**

تو ان مدارس سے عملی طور پر یہ صدا بلند ہو کہ:

> **”ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نونہال تیار کرنا ہے، جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں؛ مگر دل ودماغ اور طرزِ فکر کے لحاظ سے عربستانی اور ہندوستانی ہوں“۔**

چناں چہ ایسے ہی نوجوان تیار کرنے کے لیے اگر دیوبند میں دارالعلوم قائم فرمایا، تو مرادآباد میں مدرسۂ

قاسم العلوم قائم کیا۔ سنبھل میں مدرسۂ عربیہ الگ قائم کیا۔ امروہہ میں مدرسۂ جامع مسجد قائم فرمایا۔ گلاؤٹھی میں مدرسہ قائم فرمایا۔ انبیٹھہ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسہ قائم فرمایا۔

غرض جہاں جہاں حضرتِ والاؒ خود پہنچے، وہاں خود، اور جہاں ان کے خدام اور متوسلین پہنچے، وہاں ان کے واسطے سے بہ تاکید تمام آزاد مدرسے قائم کرائے، جس سے اطرافِ ملک میں بہ کثرت مدارس قائم ہوئے، پھر ان مدارس کے نقشِ قدم پر اور سیکڑوں مدارس کی بنیادیں رکھی گئیں، جس سے آپ صرف ''بانئ دارالعلوم دیوبند'' ہی ثابت نہیں ہوتے ؛ بلکہ اس نوعیت خاص کے لحاظ سے ''بانئ مدارسِ ہند'' ثابت ہوتے ہیں، اور پھر آپ نے ان مدارس کو ان ہی اصولِ ہشت گانہ سے وابستہ کر کے جس کی صراحت عنوان بالا میں ہے، ان مدارس کی روحانی تنظیم بھی فرمائی، جس سے ان کے پروردہ افراد خود ہی منظم ہو گئے اور ایک تنظیمی مذاق لے کر اُبھرے۔

جمعیۃ العلماء کا پس منظر:

چناں چہ آزادی کی تحریکات شروع ہوتے ہی یہ مدارس کی بے شمار جماعتیں رسمی طور پر منظم ہوگئیں، اور انہوں نے جمعیۃ العلماء کے نام سے جنگِ آزادی میں حصہ لے کر ملک کی جو شاندار سیاسی خدمات انجام دیں، اور جو جو بے نظیر قربانیاں پیش کیں، تاریخ اس سے انکار نہیں کر سکتی۔

جمعیۃ العلماء کے افراد پر شخصی حیثیت سے نکتہ چینی ہر وقت ممکن ہے؛ لیکن اس کے اصول و مقاصد اور اس کے تحت مجموعی حیثیت سے اس کی عظیم خدمات نکتہ چینی سے یقیناً بالاتر ہیں۔ اگر یہ علما کی جماعت اس تنظیم مدارس کی لائن سے میدان میں نہ آتی، تو عوام کا اس سے جوق در جوق آوازۂ آزادی کا خیر مقدم کرنا عادتاً مشکل تھا۔

اس ملک کا مزاج ہی مذہبی ہے، اور اس کے لیے مذہبی آواز ہی میں جذب و کشش ہے۔ وہ کوری سیاسی آواز پر گوش بر آواز نہیں ہوتا۔ اسی لیے علما کے میدان میں آنے سے پہلے یہاں کے عوام سے میدان خالی تھا۔ اللہ و رسول کے نام کی صدا بلند ہوتے ہی عوام سے میدان پٹ پڑے، اور یہ ظاہر ہے کہ مذہبی صدا مذہبی حلقوں ہی سے اٹھی، جو مدارس کی صورت میں اس وقت سے منظم تھے، جب کہ عوام اس قسم کی رسمی تنظیموں کے تصوارت سے خالی تھے۔

ملت کا وقار باز یافت کرنے کے اصول:

یہ غیر رسمی؛ مگر رسمی سے زیادہ پائدار تنظیم حضرت والاؒ ہی کے ان اصول ہشت گانہ اور طرز عمل سے ہوئی،

جس میں سیاسی مقاصد کے ساتھ دینی اور مذہبی جذبات بنیاد بنے تھے، اور جوں ہی اس مدارسی تنظیم کو رسمی انداز میں لایا گیا، یعنی جمعیتی پلیٹ فارم جگہ جگہ کھولے گئے، ووں ہی عوام سے سیاسی میدان بھر گئے، اور جوش وخروش کے حیرت ناک منظر سامنے آئے، جس کی شہادت تحریکِ خلافت اور پھر تحریک آزادیٔ وطن دے سکتی ہے۔

بہر حال! حضرت والاؒ نے ۱۸۵۷ء کی شکست پر میدان شاملی مسلمانوں کی ہر جہتی آزادی مٹ جانے کے جو مظاہر آنکھوں سے دیکھے، ان کا تیر بہ ہدف علاج آزادی کے ان ہی بنیادی اصولوں اور ان کی عملی تشکیل سے ہوسکتا تھا، جو بنائے مدارس اور تعلیمی نظام کی لائن سے بہ روئے کار لائے گئے۔

''سوانح مخطوطہ''(۱) کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف آج ہی اس نظام کے نتائج کا مشاہدہ کرنے والے اس کے قائل اور اس سے متاثر نہیں ہوئے؛ بلکہ اس ابتدائی دور کے لوگ بھی؛ حتی کہ مخالفین تک بھی اس وقت، جب کہ یہ نظام ایک مخالف ماحول میں قائم کیا جا رہا تھا، اس کے اعتراف پر مجبور تھے کہ ملت کے گئے ہوئے وقار کی بازیافت کے لیے ان اصول سے بہتر تیر بہ ہدف نسخہ دوسرا نہیں ہوسکتا، جن کے سامنے دلّی کی ویرانی اور اس کی مرکزی جہت کے تباہ ہوجانے سے پورے ملک کے حال اور مال کی تباہی عیاں تھی۔ صاحبِ ''سوانح مخطوطہ'' نظامِ مدرسہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اور جو فوائد معاش و معاد کے مسلمانوں کو اس سے (ان اساسی اصول کے نظامِ تعلیم سے) حاصل ہوئے، اور ہوں گے، وہ مثل آفتاب کے روشن ہیں، یہاں تک کہ مخالفین بھی مانتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی اصلاح کے لیے اور غیر قوموں پر غالب ہونے کے لیے (جنہوں نے انہیں مغلوب کیا) اس سے بہتر اور مجرب نسخہ کوئی نہیں''۔

گویا اس دور میں بھی جب کہ حکومت حاکمانہ رنگ سے چلتی اور ملتی تھی، محض حکیمانہ رنگ سے انقلاب لانے کے ڈھنگوں سے دنیا واقف تھی۔ ان اصول کی معنویت اور نتیجہ خیزی کو تسلیم کیا جا چکا تھا، اور مخالفین تک کی طرف سے اعتراف کیا جا رہا تھا۔

---

(۱) ''سوانح مخطوطہ'' کے مؤلف جناب حاجی فضل حق صاحب مرحوم ہیں، جو دارالعلوم کے اولین طبقے میں ممبر کی حیثیت سے مجلس شوریٰ کے رکن رہے، پھر ایک زمانے تک دارالعلوم کے مہتمم بھی رہے۔ ممدوح دیوبند کے باشندے اور حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے معتقدین خاص میں سے تھے۔ آپ نے حضرت والاؒ کی سوانح مرتب کی، جو زمانے کی دست برد سے ضائع ہوگئی۔ اس کے کچھ بچے کھچے اور پھٹے ہوئے اوراق پرانے کاغذات میں دست یاب ہوئے، جن سے کافی معلومات بہم پہنچیں اور ''سوانح قاسمی'' میں ان سے کافی مدد ملی۔ اس مضمون میں جہاں ''سوانح مخطوطہ'' کا لفظ آئے، اس سے یہی ''سوانح قاسمی'' مراد ہوگی۔ (طیب)

آج کی اجتماعی مساعی کے سلسلے میں نصف صدی کے پیہم تجربات کے بعد ملک جن اصول تک پہنچا ہے، اور جن پر چل کر اس نے بیدیسی غلامی سے نجات پائی، وہ سرِ مو ان اصول سے متجاوز نہیں ہیں، جو حضرت والاؒ تقریباً ایک صدی پیش تر ۱۸۵۷ء کے بعد اجرائے مدرسے کے وقت اپنے قلم سے لکھ چکے تھے، اور عین اس وقت، جب کہ ملک اور قوم کے بارسوخ افراد وطبقات اپنی زندگی حکومتِ متسلطہ کے رحم وکرم پر ڈال دینے اور اس کی حمایت ووفاداری ہی کو سب سے بڑی ترقی اور معراج کمال سمجھے ہوئے تھے، اور اس میں سرگرم عمل تھے۔

عوامی قوت کا پرداز:

پھر حضرتِ والاؒ نے ان اصول پر اس وقت اس ادارے (دار العلوم) کی بنیاد رکھی، جب کہ ملک کے بارسوخ طبقات بہت سے معاشرتی اور معاشی اداروں کی بنیاد نہ صرف منشائے حکومت کی تکمیل، اس کی پوری پوری وفاداری اور اشتراکِ عمل کے اصول ہی پر رکھ رہے تھے؛ بلکہ ان بنیادوں میں ان مجاہد وسر بہ کف علما ومفکرین کے ساتھ تحقیر وتمسخر کا برتاؤ اور عوام کو ان سے نفرت دلانے کا جذبہ بھی پیوست کیا جا رہا تھا۔

گویا ''اینٹی ملاّ ازم'' کا پرداز بھی ساتھ ہی ساتھ ڈالا جا رہا تھا؛ لیکن حضرتِ والاؒ کے ان اساسی اصول پر قائم شدہ نظام میں جہاں بیدیسی اقتدار کی شکست وریخت کے نتائج مخفی تھے، وہیں ان میں اس تحقیر وتمسخر کے اکھاڑ پھینکنے کی قوت بھی مضمر تھی؛ کیوں کہ ان اصول کا حاصل رابطۂ حکومت نہ تھا؛ بلکہ رابطۂ عوام کا استحکام تھا، اور ۱۸۵۷ء کے بعد متسلطہ اقتدار کے خلاف مشینی قوت کے بجائے عوامی قوت ہی مؤثر ثابت ہو سکتی تھی، جسے حضرتِ والاؒ نے پرکھ لیا تھا، جس کو اس زمانے ہی میں مخالفین تک بھی مان چکے تھے، اور جب کہ یہ عوامی قوت براہِ راست ان ہی علما کے ہاتھ میں تھی اور ہے، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ عوامی قوت کی بیداری کے وقت ہر طبقہ ان لوگوں کی طرف نہ جھکتا، جو اس عوامی قوت پر قابض اور اسے جائز طریق پر استعمال کرنے کے ڈھنگ سے واقف تھے۔

نتیجہ یہ ہوا اور ہونا بھی چاہیے تھا کہ جن علما کو نکما اور بے کار یا قوم پر ناحق بار باور کرایا جا رہا تھا، جوں ہی عوامی تحریکات شروع ہوئیں، یا عوام کی قوت سے حکومتِ متسلطہ کے اقتدار کے خلاف عصبیاتی جنگ کا آغاز ہوا، تو وہی ''اینٹی ملاّ ازم'' والے طبقات ملاؤں کے طرف جھکنے پر مجبور نظر آنے لگے، اور اسٹیجوں پر وہی تمسخر ونفرت اظہارِ عقیدت ونیاز میں تبدیل ہونے لگے۔

یہی علما جو ۱۸۵۷ء کے بعد ان اصول کے زیر سایہ مدارس کی خلوت گاہوں میں برائے چندے

خاموش بیٹھ گئے تھے، وہ بالآخر اسٹیجوں کی جلوت گاہوں میں اس شان سے اچانک نمایاں ہوئے کہ چار وناچار ان کے کار آمد ہونے کو تسلیم کرلیا گیا، اور پھر عوامی تحریکات اکثر وبیشتر ان ہی کی قوت کے ہاتھوں چلیں، اور آگے بڑھیں۔

عدم تشدد کے راستے سے انقلاب کا ذہنی خاکہ:

ان اصول کے زیر اثر تربیت پانے والے علما بالآخر آزادیٔ ملک کا جھنڈا لے کر سب سے پہلے سامنے آئے، اور جو کام میدانِ شاملی کی تلواروں سے پورا نہ ہوسکتا تھا، وہ امن کی زبان وقلم سے پورا ہوگیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر مدرس اوّل دار العلوم دیوبند نے جو مسجد چھتہ کے عناصر اربعہ میں سے ایک عنصر تھے، حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس خلجان کے ذکر پر کہ:

> ''اب ہندوستان کی حکومت انگریزوں جیسی مدبر اور قوی قوم کے ہاتھ میں آ گئی ہے، اور ان کے پنجے ایسے جم گئے ہیں کہ اب دھن کا استخلاص بہ ظاہر ممکن نظر نہیں آ تا''۔

ارشاد فرمایا:

> ''حاجی صاحب! آپ کیا فرما رہے ہیں؟ ہندوستان صف کی طرف لوٹ جائے گا۔ لوگ سوئیں گے، انگریزوں کی حکومت میں اور صبح کو جاگیں گے دوسری حکومت میں''۔

یعنی تشدّد اور تلوار کے راستے سے نہیں، جو حکومتوں کے لوٹنے کا متعارف اور واحد طریقہ سمجھا جاتا ہے؛ بلکہ امن وعدم تشدد کے راستے سے یہ لوٹ پوٹ عمل میں آئے گی۔ جس سے واضح ہے کہ یہ بزرگ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سے عدم تشدد کی راہ سے انقلاب کا خاکہ ذہنوں میں لیے ہوئے تھے، اور حضرت نانوتویؒ نے اس خاکے کو ان اصولِ ہشت گانہ کی دفعات میں تعلیمی رنگ سے بھر دیا، جس کو اس وقت کے ماحول میں اپنے سمجھے ہوئے تھے، اور بہ قول صاحبِ ''سوانح مخطوطہ'': مخالف بھی معقول اور مؤثر تسلیم کر چکے تھے۔

یورپ کے مشاہدات میں حضرت نانوتویؒ کے اصول کی قدر وقیمت:

اس مختصر مضمون کی حد تک میرا یہ موضوع نہیں ہے کہ ملک کی آزادی میں ان علمائے کرام کا کتنا اور کیا حصہ تھا؟ اسے پوری بالغ نظری کے ساتھ مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیت علمائے ہند نے اپنی مشہور تصنیف ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' میں تاریخی حوالوں سے کھول دیا ہے۔

نیز دوسرے اہل قلم بھی اس موضوع پر کافی تحریری سرمایہ فراہم کر چکے ہیں، تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ ملک کے استخلاص اور آزادی کا یہ نیا نقشہ ان ہی مجاہدین شاملی نے بنایا، اور ۱۸۵۷ء کے بعد ان

کے پیشرو حضرت اقدس مولانا نانوتویؒ تھے، جن میں یہ جوش امتیازی شان سے اُبھرا ہوا تھا، اور انہوں نے اپنے اس جوش کو ہوش کی شکل دے کر آئینی رنگ سے ان ''اصولِ ہشت گانہ'' کے اساسی نظام میں بھر دیا تھا، جو اس اقامتی تربیت گاہ (دارالعلوم دیوبند) کے لیے آپ نے وضع فرمائے۔

دارالعلوم کے ان فضلا کے ذریعے جنہوں نے ان اصول کے زیر سایہ تربیت پائی، یہ رنگ ملک میں پھیلنا شروع ہوا، یہاں تک کہ ملک کے ایک بڑے طبقے کا جو عوام پر اثر رکھتا تھا، ذہن ہی یہ بن گیا اور عوامی رابطے کی وہ عمومیت یا جمہوریت جو ان اصول میں پنہاں تھی، ان تربیت یافتوں کے راستے سے سو برس پہلے کی ہنڈیا کا اُبال چھلکا، تو چولہے کے گرد و پیش چاروں ہی سمتوں کو تر کر کے رہا۔

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم فرمایا کرتے تھے، جس کو احقر نے خود بلا واسطہ ان سے سنا کہ:

''میں نے حضرت نانوتویؒ کے اصول کی قدر و قیمت یورپ جا کر سمجھی۔ بالخصوص یورپ وایشیا کے متعدد انقلابات کی بنیادوں کو میں صرف ان ہی اصول کی روشنی میں پا سکا ہوں، اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں ان اصول کی شرح لکھنے بیٹھ جاؤں تو دو ضخیم جلدیں تیار کر دوں گا''۔

رئیس الاحرار کا غایتِ تاثر:

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم ۱۹۲۴ء میں جب بہ سلسلۂ تحریکِ خلافت دیوبند تشریف لائے، اور احقر ہی کے مکان پر حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے مہمان کی حیثیت سے فروکش ہوئے، تو حضرت کے ان اصولِ ہشت گانہ کو دیکھ کر جو دارالعلوم کا سنگِ بنیاد ہیں، رو پڑے اور غایتِ تاثر سے بے ساختہ فرمایا کہ:

''یہ اصول تو الہامی معلوم ہوتے ہیں، ان کا عقلِ محض سے کیا واسطہ؟''۔

چناں چہ ان اصول کی دفعات میں نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت نانوتویؒ کے قلم سے بھی باوجود ذوقِ اخفا کے جگہ جگہ یہ الفاظ نکل گئے ہیں کہ ''یوں معلوم ہوتا ہے''، اور ''یوں نظر آتا ہے''، اور ''ایسا ہو جائے گا'' وغیرہ۔ جو ان اصول کے الہامی ہونے کی گویا خود صاحبِ اُصول کی طرف سے بھی شہادت ہے۔

انقلاب ۱۹۴۷ء کے اوّلین ہیرو:

بہر حال! ان اُصول کی روشنی میں جو کچھ ہوا، اس پر ۱۹۴۷ء شاہد ہے، اور ان انقلاب ۱۹۴۷ء کے اولین ہیرو قدرتاً وہی سمجھے جا سکتے ہیں، جو ۱۸۵۷ء میں بھی اسی اسٹیج پر تھے، جس پر آزادی خواہ طبقے بعد میں آئے، اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اپنے اساسی اصول و عمل کی راہ سے اسی اسٹیج پر رہے۔

بہر حال! حضرت نانوتویؒ نے اگر ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لیے یہ دارالعلوم قائم کیا تھا،

جیسا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ اس بارے میں معروف ہے، اور رسالہ دار العلوم میں شائع ہو چکا ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ اس ادارے اور اس کے اصولِ تربیت نے یہ تلافی کر دکھائی، اور زیادہ نہیں، صرف نوّے سال کی مدت میں، جو ایک ملک کی نہیں ؛ بلکہ ایک فرد کی عمر ہوتی ہے۔ ایک عظیم ترین طاقت کو جو ۱۸۵۷ء میں ایک ملک کے جائز حقداروں کو پامال کر چکی تھی، ۱۹۴۷ء میں مسکینانہ ضعف اور مظلومانہ فروتنی سے نیچا دکھا دیا۔ ہندوستان صف کی طرف لوٹ گیا۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کی شب میں لوگ سوئے انگریزوں کی حکومت میں اور صبح کو جاگے قومی حکومت میں، اور اس طرح ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی ہوگئی۔ گو متسلطہ طاقت نے جاتے جاتے بھی آزادی کے نقشے کو بگاڑ دینے کے کافی سامان فراہم کر دیے، جن کا بگاڑ کافی نمایاں ہوا، اور ابھی تک ہے؛ لیکن جن اصول کی صداقت نے اصل نصب العین کو رونما کیا تھا، انہیں اصول کی صداقت اس بگاڑ کے دفعیہ کی بھی کفیل ہوسکتی ہے، بہ شرطے کہ ان اصول پر اسی سابقہ رنگ سے عمل کیا جائے۔

پھر اصول ہی نہیں، مدرسے کے عملی پروگرام کی تشکیل میں بھی حضرت والاؒ نے وہی ''تلافی'' والا نصب العین پیش نظر رکھا۔ آپ نے ایک طرف فنِ سپہ گری کی مشق کا شعبہ طلبہ کے لیے بہ تقاضائے وقت ضروری سمجھا، جس سے طلبا میں قوت قائم رہے، اور اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ پائیدار ہوتا رہے۔ اس میں بعض لوگوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ یہ ''مدرسۂ عربیہ'' کیا ہوا، ''مدرسۂ حربیہ'' ہو گیا، تو حضرت والاؒ نے بہ قول صاحب ''سوانح مخطوطہ'' اس پر مبسوط تقریر فرمائی، اور عصری اور شرعی تقاضوں کو جواب میں پیش کیا۔

عدالت شرعیہ کا قیام:

دوسری طرف قومی محکمۂ قضا قائم فرمایا، تا کہ متعلقینِ مدرسہ اپنے متعلقین اور حلقۂ اثر میں عدل وقسط اور انصاف پسندی قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ ان میں اپنے باہمی جھگڑوں کو خود نمٹانے اور شرعی اصول کو ہر معاملے میں حکم بنانے کا سلیقہ اور جذبہ اُبھرا رہے۔ چناں چہ ''سوانح مخطوطہ'' کے مصنف نے اس تحریری معاہدے کا ذکر کرتے ہوئے، جس میں اہلِ دیوبند سے آپ نے مختلف معاشرتی امور کے بارے میں عہد کرایا، ایک دفعہ یہ بھی ذکر کی ہے کہ:

> ''کوئی مقدمہ یا معاملہ، جس میں فریقین مسلمان ہوں، سرکاری کچہری میں نہ جاوے، اور اس کے حاکم مولانا محمد قاسم تھے''۔

چناں چہ سیکڑوں مقدمات، جو برس ہا برس سے کچہریوں کی دفتری طوالتوں میں الجھے پڑے تھے،

منٹوں میں فیصل ہونے لگے۔ یہ شرعی کچہری چھتہ کی مسجد میں قائم ہوئی۔ معاملات اور مقدمات کی تعداد جب زیادہ ہونے لگی، تو فصلِ خصومات کا یہ کام مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس دار العلوم کے سپرد فرمایا گیا، اور انہیں کو مستقل قومی قاضی قرار دیا گیا، اور جب اس سلسلے کا کام بڑھا، تو اسی نسبت سے دیوبند کی سرکاری منصفی کی رونق گھٹنی شروع ہوگئی، اور یہی مقصد بھی تھا کہ متسلطہ قوت کا اثر ورسوخ ہر سمت سے کم اور کمزور ہوتا چلا جائے۔

دار العلوم میں صنعت وحرفت کے شعبے کا مقصد:

اسی کے ساتھ حضرتؒ نے دار العلوم میں صنعت وحرفت کا شعبہ بھی قائم فرمایا، جیسا کہ ''سوانح مخطوطہ'' میں اس کا تذکرہ موجود ہے، تاکہ ادارے کے فضلا معاشی ضروریات میں خود کفیل بننا سیکھیں۔

بہ ظاہر یہ مقابلہ تھا اس رد کا کہ اس وقت کی تعلیم کا انتہائی نقطۂ نظر ملازمت تھا، وہ بھی سرکاری، جس کا مآل اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا تھا کہ اسکولی اور کالجی تعلیم سے لوگ سرکاری ملازمت کرنا سیکھیں، اور اس ملازمت سے اپنی غلامی کی جڑوں کو مضبوط بنائیں۔ اس کا ردِ عمل صحیح معنی میں یہی ہوسکتا تھا کہ لوگ اس غلامی آموز تعلیم سے ہٹ کر اس تعلیم میں لگیں، جو غنا واستغنا کا جوہر پیدا کرے، اور جہاں تک معاش کا تعلق ہے، سرکاری ملازمتوں سے الگ رہ کر صنعت وحرفت یا قومی ملازمت سے اپنے گزر بسر کا سامان کریں۔

دار العلوم کے ذریعے ''ہندو مسلم'' کا پرداز:

ایک طرف دار العلوم کے چندوں کا دائرہ اتنا وسیع رکھا گیا کہ ان میں غیر مسلم بھی شریک ہوسکیں۔ چناں چہ دار العلوم کی ابتدائی رودادوں میں بہت سے ہندوؤں کے چندے بھی لکھے ہوئے ہیں۔

حضرت والاؒ کی تجویز پر یہ بھی تحریک کی گئی کہ ملک کے تمام مطابع اور پریس بلاتفریق مذہب وملت اپنی مطبوعات کا ایک ایک نسخہ کتب خانہ دار العلوم کو عنایت کریں۔

چناں چہ سب سے پہلے اس صدا پر لبیک کہنے والی شخصیت ایک ہندو کی تھی، اور وہ منشی نول کشور[1] مالک مطبع نول کشور لکھنؤ تھے، جنہوں نے اپنے پریس کی تمام مطبوعات کا ایک ایک نسخہ دار العلوم میں بھیجا، جس پر دار العلوم کی جانب سے ان کے حق میں شکریہ و دعا کا ہدیہ پیش کرنے کے لیے دار العلوم کی مجلس شوریٰ

---

(۱) منشی صاحب کے متعلق ان کی اولاد میں سے پڑتوتے، یا اس سے نیچے کی نسل میں سے کسی نے حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری شہیدؒ سے ختم نبوت کے دفتر کراچی میں ملاقات میں یہ بات بتلائی تھی کہ وہ انتقال سے پہلے مسلمان ہوگئے تھے۔ واللہ اعلم! یہ بات اس زمانے میں روزنامہ جنگ میں چھپی بھی تھی۔ (نعمان)

منعقد ہوئی، جس میں حضرت نانوتوی قدس سرہ بھی شریک تھے، اور شکریے کی ایک مستقل تجویز پاس کر کے ان کے پاس بھیجی گئی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والاؒ اس ادارے کو عوامی ہی نہیں ؛ بلکہ ایک ایسا ہمہ گیر ادارہ بنانا چاہتے تھے، جس میں غیر اقوام کی ہمدردیاں بھی شامل رہیں۔ گویا ہندو مسلم اتفاق کا پرداز بھی ڈال دیا گیا۔

دار العلوم میں بین الاقوامیت کا عنصر:

بلکہ ''سوانح مخطوطہ'' کی تصریحات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت والاؒ اس دار العلومی تحریک کو نہ صرف ملک گیر ہی بنانا چاہتے تھے، جس میں اس ملک کی ہر قوم کی ہمدردیاں اس ادارے اور اس کی تحریک کے لیے حاصل ہوں ؛ بلکہ اسے عالم گیر بھی دیکھنا چاہتے تھے، اور اس علمی حلقے کا رشتہ بیرونی ممالک کے مسلمانوں اور ان کی حکومتوں سے جوڑنا چاہتے تھے۔ چناں چہ ترکی کی خلافت سے جو اس وقت پورے عالم اسلامی پر اثر رکھتی تھی، انتہائی شد و مد سے اپنے تعلقات کو دینی اور علمی حیثیت سے وابستہ فرمایا۔ سلطان عبد الحمید خاں والیٔ ترکی کی مدح میں قصائد لکھے، اور ہندوستانی مسلمانوں کو ان کی ہمدردی پر اُبھارا؛ حتیٰ کہ جب ترکی کی جنگ روس سے ہوئی، تو حضرت والاؒ نے ترکی کے لیے چندہ شروع کیا، اور اپنے گھر کا سارا اثاثہ، اپنی اہلیہ محترمہ کا تمام جہیز، کپڑا، زیور، برتن؛ سب کچھ ترکوں کی حمایت کے لیے قربان کر دیا۔

تنظیمِ ملت کا نیا خاکہ:

اس سے اندازہ کر لیا جائے کہ اس دار العلوم کی تحریک کا مرکب نصب العین صرف تعلیم ہی کی حد تک محدود نہ تھا؛ بلکہ اس کے ضمن میں آزادی پسندی، غلامی شکنی، اسلامی اتحاد، وطنی اتحاد، قومی خودمختاری، حق خود ارادیت، معاشی استغنا، وسائلِ قوت کی فراہمی، رابطۂ عوام، تالیفِ خواص وغیرہ کے ملے جلے جذبات کار فرما تھے۔ اور دار العلوم کی تاسیس ایک خاص مکتبِ فکر کی تاسیس تھی، جیسا کہ حضرتِ والاؒ کے اصولِ ہشت گانہ اور جاری کردہ نظامِ کار سے واضح ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آپ اس مدرسے کے کارکنوں اور پروردوں میں استغنا کی روح پھونکتے ہوئے انہیں حکومتِ وقت سے بے پرواہ اور قوم کے غریب افراد اور عوام سے زیادہ سے زیادہ مربوط فرمانے کی راہ ڈال رہے تھے؛ ورنہ تکثیر چندہ اور وہ بھی زیادہ تر غربا سے، پھر افزائش طعامِ طلبہ کی سعی، جو قوم کے غریب بچے ہی ہو سکتے تھے، اور ادھر حکومتِ وقت کی امداد سے کلی استغنا؛ بلکہ ممانعت، اور امرا اور جاگیرداروں پر تکیہ کر کے ان کے فخورانہ عطیات سے اعراض کا مطلب آخر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ حکومتِ وقت کے علی الرغم

رابطۂ عوام کو مستحکم اور مضبوط کیا جائے، تاکہ ملک کے عوام اس مدرسے کو اپنی چیز سمجھیں، اور اس کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو کر اپنی عوامی طاقت سے انہیں آگے بڑھائیں؛ ورنہ محض درس وتدریس کی حد تک تنظیمِ ملت کے اس نئے خاکے کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی؟

پھر اگر محض مذہبی تعلیم وتعلم ہی نصب العین کی آخری حد تھی، تو مدرسے میں فن سپہ گری کے شعبے کے قیام کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی؟ جسے حضرت والاؒ نے اہتمام کے ساتھ خود قائم فرمایا۔ نیز محض مذہبی تعلیم ہی پیش نظر ہوتی، تو حضرت والاؒ صنعت وحرفت کا شعبہ اس مدرسے میں قائم نہ فرماتے، جو خالص معاشی مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر اگر یہ محض ایک مذہبی مکتب تھا، تو حضرتِ والاؒ شرعی محکمۂ قضا قائم فرما کر اعضائے مدرسہ کو اس کا جج مقرر نہ فرماتے، جو خالص ایک سیاسی مسئلہ تھا۔

اسی طرح صرف مذہبی تعلیم ہی کا خاکہ مدرسے کے کاروبار کی آخری حد ہوتی، تو مدرسے کے چندہ دہندوں میں غیر مذہب کے لوگوں کے عطیات شامل کیے جانے کا کوئی تصور سامنے نہ آنا چاہیے تھا، نہ ہندو مسلمان سے بلا تخصیص مذہب وملت چندے قبول کیے جاتے، اور نہ ہندو چندہ دہندگان کی دعا وشکریے سے ہمت افزائی کی جاتی۔ پھر اگر کاروبارِ مدرسہ کی انتہائی غرض وغایت محض کتابی درس وتدریس تھی، تو حضرتِ والاؒ اس مدرسے کے سرپرست اور ہمہ اوست ہوتے ہوئے سلطانی چندے کی بنیاد ڈال کر اور خلیفۃ المسلمین سلطان عبد المجید خاں والیٔ ترکی کی مدح میں قصائد لکھ کر خلافتِ ترکی سے رشتۂ ارتباط قائم کرنے کی صورتیں پیدا نہ فرماتے۔

گویا آپ نہ صرف ملک کی اندرونی اقوام ہی سے رشتۂ یگانگت قائم فرمانے کے داعی تھے؛ بلکہ بیرون ملک سے بھی رشتۂ اتحاد کا سلسلہ پھیلانا چاہتے تھے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مدرسہ محض کتبِ درسی کی تعلیم کا مدرسہ نہ تھا؛ بلکہ حضرتؒ اسے ایک ملی جلی تحریک کے مرکز کی حیثیت سے قائم فرما رہے تھے، جس کے نظام کار میں علم وعمل، معاش ومعاد، قوم ووطن اور دین ومذہب کی حمایت ونصرت کے ملے جلے جذبات ایک دم پیش نظر تھے، جو حضرت والاؒ کے وسیع اور ہمہ گیر ذہن سے نکل کر اس مدرسے کی بنیادوں میں پیوست ہوئے، اور اس کے اثرات تعلیمی راہوں سے اس ادارے کے تربیت یافتہ فضلا ومتوسلین میں حسبِ استعداد وقابلیت نفوذ پذیر ہوتے رہے۔

قیام دار العلوم کا بنیادی محرک:

بہر حال! دار العلوم کے یہ اساسی اصول اور اس کا نظام کار اس ہمہ گیر حکمت عملی اور وسیع نظام کی غمازی

کرر ہا ہے، جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد شاملی کے میدان سے لے کر آئے، اور اس کی ناکامی کی تلافی کے لیے بہ قول حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ یہ مدرسہ قائم فرمایا۔ غور کیا جائے، تو یہ اس امانت کی ادائیگی تھی، جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہید بریلویؒ سے حضرت شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ میں، اور ان سے بواسطہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمہ اللہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ تک منتقل ہوئی، اور حاجی صاحبؒ کے لوگوں میں بالآخر پوری قوت کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے قلب و دماغ کا جوہر بن گئی، جنہیں حاجی صاحبؒ نے اپنی زبان اور اپنے مقاصد کا ترجمان فرمایا تھا، جیسا کہ اس کی تفصیلات ''سوانح قاسمی'' میں دیکھی جا سکتی ہیں؛ اس لیے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کے ترجمان خاص ہی سے ان جذبات کے بقاوترویج اور اظہار و اعلان کی توقع ہو سکتی تھی، اور وہی ایسے ہمہ گیر ادارے کے اصول و نظم کا تصور باندھ سکتے تھے۔

اصول آزادی کی امین شخصیت:

بہر حال! ان اصولِ ہشت گانہ کے مرکب نصب العین کی یہی وہ اصولی اور عملی خصوصیات ہیں، جن کی مادی اور معنوی شکل کا نام ''دارالعلوم دیوبند'' ہے، اور جس نے بالآخر ۱۸۵۷ء کی پسپائی کی تلافی کر دکھائی اور آزادئ ملک وملت کے لیے جو خاموش رہنمائی اس نے کی، وہ اشتہاروں، پوسٹروں، رسالوں، اخباروں اور عموی پروپیگنڈوں کے شورمحشر میں نظر نہیں آتی۔

اس لیے اس یوم آزادی کے موقع پر جب کہ دنیا مختلف اندازوں سے اس کی یاد منا رہی ہے، اور مختلف انداز کی یادگاریں قائم کرنے کے مشورے دیے جا رہے ہیں، ہم نے مناسب سمجھا کہ ان اصول کے تذکرے سے یاد منائیں، جن پر چل کر دنیا آزادی کی منزل پر پہنچی، اور اس شخصیت کا ذکر خیر کریں، جن کا وسیع اور ہمہ گیر ذہن ان دواعی آزادی کا نہ صرف جذبات؛ بلکہ اصول کے درجے میں بھی امین تھا، اور جو ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہو کر ملک کا ذہن آزادی پسند اور حریت طلب بناتے رہے، تا آں کہ آزادی سامنے آ کھڑی ہوئی، اور آج ہر ایک کو اس کی خوشی منانے کا موقع ملا[1]:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

محمد طیب غفرلہ

مدیر دارالعلوم دیوبند ۱۵؍ اگست ۱۹۵۷ء

---

(۱) (ماخوذ از): توضیحات حکیم الاسلام، ص: ۶۲۹ تا ۶۵۷۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

دینی وملی، تعلیمی وروحانی خدمات کی ایک جھلک

حضرت مولانا نسیم احمد فریدی امروہویؒ✿

ابھی غزوۂ بالاکوٹ کو ختم ہوئے دو سال ہوئے تھے۔ قوت علم اور قوت عمل کے عظیم ورفیع علم بردار حق کی حمایت میں اپنی جان کی بازی لگا کر اور خاک وخون میں لت پت جنت الفردوس کی طرف رخصت ہو چکے تھے۔ فضائے ہند میں ایک سنسناہٹ تھی، غم وحزن کی لہریں مسلم ہندی کے قلب میں رہ رہ کر اٹھ رہی تھیں۔ اس کے چہرے اور آنکھوں کے آنسو کہہ رہے تھے کہ یا اللہ! اب اسلام اور مسلمانوں کی بقاوترقی کی کیا صورت بنے گی؟ تقدیر نے کہا: گھبراؤ نہیں، تم پر کوہِ غم تو ضرور ٹوٹا ہے، مگر رحمت خداوندی سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ ان مجاہدین کی آواز حق کی بازگشت اپنا رنگ لائے گی۔ ان کی قربانیاں کتنوں کو متحرک کر دیں گی؟ کتنی روحوں کو گرما دیں گی؟ اتنے میں دو آبے کی ایک گم نام بستی ''نانوتہ'' کی سرزمین سے یہ خبر مشہور ہوئی کہ شیخ اسد علی صدیقی کے یہاں ایک فرزند پیدا ہوا ہے، اس کا اصلی نام ''محمد قاسم'' ہے، تاریخی نام ''خورشید حسین'' ہے۔ اس کی پیشانی بتا رہی تھی کہ اسد علی کا یہ بچہ آگے چل کر ''حجۃ الاسلام'' ثابت ہوگا، علوم ومعارف کو تقسیم کرے گا، تعلیمات محمدیہ رائج کرنے کے لیے اس کی ذات ایک مستقل دار العلم ہوگی۔ آفتاب نصف النہار ہو کر چمکے گا۔ دینی قوت عمل سے اپنی مختصر سی زندگی میں ایک ہلچل ڈال دے گا۔

اللہ اللہ! کتنے خوش قسمت تھے شیخ اسد علی مرحوم، جن کا نورِ نظر اور لختِ جگر یہ پیدائشی باکمال انسان تھا، جس نے پورے خاندان کو مشہور کر دیا۔ پورے علاقے کو جگ مگا دیا۔ پورے ملک میں اسلام کی لاج رکھ لی۔ جو عالم بھی تھا اور صوفی بھی، مجاہد بھی تھا اور مناظر بھی، حافظ بھی تھا اور مفسر بھی، فقیہ بھی تھا اور محدث بھی۔ جس کا خط دیدہ زیب، جس کی تقریر ''دل پذیر''، جس کی تحریر ''آب حیات''۔ جس نے اپنے زمانے کی

✿ خلیفہ ومجاز شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنیؒ۔

ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر ایک علم کلام کی بنیاد ڈالی، جس نے علوم اسلامیہ کو زندہ رکھنے کے لیے ایک مرکز قائم کیا، جس میں ولی اللہی اور عزیزی فلسفہ وحکمت کو رائج کیا، جس نے توحید کا ڈنکا فضائے ہند ہی میں نہیں، نتیجے کے لحاظ سے تمام اقصائے عالم میں بجایا۔

یہ فرزند توحید کچھ زیادہ عمر لے کر نہیں آیا تھا، صرف انچاس سال کی عمر ہوئی؛ مگر اتنا کام کیا کہ سو سال میں بھی مشکل سے ہو سکتا ہے۔ پوری زندگی اتباع سنت، خدمت اسلام و مسلمین اور انسانیت کی خیر خواہی میں نہایت گم نامی اور سادگی کے ساتھ گزاری۔ اپنے کمالات کو بے انتہا چھپایا۔ اپنی زندگی کو شہرت کے ذرائع سے کوسوں دور رکھا؛ مگر کوئی با کمال چھپا رہ سکتا ہے؟ پھول پتوں میں نہاں ہو کر بھی پوشیدہ نہیں ہوتا۔ آج اس دنیا سے رخصت ہوئے اس کامل انسان کو ۸۵ سال ہو گئے (۱)؛ لیکن جتنا زمانہ گزرتا جا رہا ہے، اس کے کمالات واضح تر ہوتے جا رہے ہیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی تحریر فرماتے ہیں:

> ''ایک دن آپ (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) فرماتے تھے کہ: ''اس علم نے روکا؛ ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا''۔ میں کہتا ہوں کہ اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا، جو کمالات تھے وہ کس قدر تھے، کیا ان میں سے ظاہر ہوئے؟ اور آخر سب کو خاک میں ہی ملا دیا۔ اپنا کہنا کر دکھلایا''(۲)۔

حضرت مولانا حکیم سید فخر الدین حسنی رائے بریلویؒ نے ''مہر جہان تاب'' میں حضرت قاسم العلومؒ کا بھی تذکرہ کیا ہے، چند سطریں اس کی بھی پیش کرتا ہوں:

> ''مولانا محمد قاسم نانوتوی ابن شیخ اسد علی: علامۂ عصر، فہامۂ دہر، فاضل متبحر، مناظر، مباحث، حسن التقریر، ذکی، ماہر در معقولات از عہد طفلی، طباع، بلند ہمت، وسیع حوصلہ، جفاکش، جری بودہ در ۱۲۶۰ھ در دہلی رفت و بہ خدمت مولوی مملوک العلیؒ آغاز تعلیم کرد وحدیث بہ حضور شاہ عبدالغنی محدث مجددی دہلویؒ خواند...... اکثر از پادریاں و پنڈتاں مباحثۂ مذہبی می کرد و غالب می آمد، و از تصنیفاتش ''حجۃ الاسلام'' و ''قبلہ نما'' مشہور اند......''(۳)۔

---

(۱) صاحبِ مضمون کے ان جملوں سے اس مضمون کا سنہ تحریر بھی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء میں لکھا گیا ہے، یعنی زیر نظر نمبر کی اشاعت سے ترپن سال پہلے۔ (نعمان)

(۲) سوانح عمری، ص: ۱۰۔

(۳) مہر جہان تاب، قلمی۔

حضرت مولانا رفیع الدین عثمانی دیوبندی مہتمم اول دار العلوم دیوبند کے داماد مولانا ضیاء الحق عثمانی مرحوم نے مختصر طریقے پر حضرت قاسم العلومؒ کی پوری زندگی کا حساب اس طرح لگایا ہے:

''آپ کی عمر انچاس سال چار ماہ چار یوم ہوئی، اور یہ عمر اس تفصیل سے بسر ہوئی: نو سال والدین کے (زیر سایہ) ناز ونعمت میں، آٹھ سال تعلیم وتربیت میں، آٹھ سال ذکر وشغل میں، چوبیس سال ترقیٔ اسلام اور رفاہِ مسلمین (کے کاموں) میں۔

۴؍ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ/ مطابق ۱۵؍ اپریل ۱۸۸۰ء؍ یوم پنج شنبہ ایک بجے دن کے ضیق النفس کی بیماری سے انتقال فرمایا''[1]۔

اس یادداشت کی رو سے حضرت قاسم العلومؒ کو صرف چوبیس سال ترقیٔ اسلام اور رفاہِ مسلمین کا کام انجام دینے کا موقع ملا ہے۔ حساب لگایا تو ٹھیک ۱۲۷۳ھ؍ مطابق ۱۸۵۷ء؍ سے اس رفاہی کام کا آغاز ہوتا ہے۔

میدان شاملی:

محرم ۱۲۷۴ھ/ ستمبر ۱۸۵۷ء؍ میں بہ تقاضائے حمیت اسلامی شاملی کے میدان میں معرکۂ جہاد گرم کیا۔ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہؒ کی راہ نمائی اور دیگر رفقا کی رفاقت میں فرنگیوں کی طاقتور فوج سے مقابلہ کیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ نتیجے کے لحاظ سے بہ ظاہر ناکام یابی ہوئی؛ لیکن دنیا کو دکھا دیا کہ حق کے متوالے ضرورت پڑ جانے پر کفن بر دوش ہو کر بھی نکل پڑتے ہیں۔ حافظ محمد ضامن تھانویؒ اس معرکہ میں شہید ہوئے۔ حضرت قاسم العلومؒ کو اس سالک راہ طریقت، مرد مجاہد کی جدائی کا بڑا صدمہ ہوا۔ ایک درد انگیز طویل مرثیہ لکھا، جس کا ایک ایک شعر خون کے آنسو بہانے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ مرثیہ مجھے مکۂ معظّمہ میں مدرسۂ صولتیہ کے کتب خانے سے ملا۔ حضرت حاجی صاحبؒ کی کتابوں میں حکیم ضیاء الدین رام پوریؒ کی لکھی ہوئی ایک کتاب ہے، جو حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ کی مختصر سوانح پر مشتمل ہے، اسی کتاب میں یہ مرثیہ درج ہے، ناظرین ''ندائے ملت''[2] کے لیے اس مرثیہ کے چار شعر یہاں لکھتا ہوں: ؎

شہید راہِ حق حافظ محمد ضامن چشتی
بنایا تھا جسے حق نے ملا کر عشق وعرفاں سے
مدد کر صبر کچھ اب کے دل مضطر کے ہاتھوں سے
نظر آتا ہے غم میں ہاتھ دھو بیٹھیں گے ہم جاں سے

(۱) یادداشت مولانا حاجی ضیاء الحق عثمانی دیوبندیؒ، نزد دفتری نور الحق عثمانی مدظلہٗ۔
(۲) وہ رسالہ جس سے یہ مضمون اخذ کر کے اس نمبر میں شامل کیا گیا ہے۔ (نعمان)

نظر آئے گی یارب پھر بھی وہ صورت کبھی ہم کو
سنیں گے پھر بھی وہ آواز ان لب ہائے خنداں سے
دل مایوس کی کوئی نہیں صورت تسلی کی
مگر ہاں سر نکالو تم اگر گنجِ شہیداں سے

اس معرکہ کے بعد پیر طریقت حضرت حاجی صاحبؒ نے ہجرت کی راہ اختیار کی۔ مرید صادق کے قلب پر پیرومرشد کی مفارقت کا کس قدر صدمہ ہوگا، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ رفیق غم گسار، رشید الملۃ والدین حضرت گنگوہیؒ گرفتار ہوئے، جیل میں رہے۔ کتنے اور رفقا ہوں گے، جو شاملی کے میدان میں خاک وخون میں تڑپے ہوں گے۔ بنا بنایا نقشہ بگڑ گیا۔ فرنگی دوبارہ برسرِ اقتدار آ گیا۔ مغلیہ سلطنت کو اپنی آنکھوں کے سامنے برباد ہوتے دیکھا۔ انگریز کے انتقامی جذبات نے مسلمانوں کو عموماً اور حقانی علما و مشائخ کو خصوصاً تہ تیغ کیا۔ پھانسی پر چڑھایا۔ کالے پانی بھیجا۔ یہ سب واقعات حضرت مولاناؒ کے سامنے ہوئے۔ خود ان کی گرفتاری کا وارنٹ تھا، وہ تو یہ کہیے کہ قدرت کو اسلام اور مسلمین کی خدمت وحمایت کے لیے ان کو بچانا منظور تھا؛ ورنہ فرنگی کے آہنی پنجے میں گرفتار ہونے میں کوئی کسر تھوڑی رہ گئی تھی۔ ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) سے لے کر ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) تک دس سال کا زمانہ عسرت کے ساتھ ساتھ خاموشی وروپوشی، درد والم اور غم وحزن اور انتہائی کرب و بے چینی میں گزارا۔ اس عرصے میں کس قدر تکالیف اٹھائیں؟ کیا کیا مصائب جھیلے؟ رفاہیت کے کاموں کو کس طرح انجام دیا؟ اس کی تفصیل نہ خود بیان کی، نہ کسی نے لکھی۔ اتنا پتہ چلا کہ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) میں حج وزیارت کے لیے گئے، علاوہ فریضۂ حج کی ادائیگی کے پیرومرشد کی ملاقات بھی پیش نظر ہوگی۔ دس سال کے غور وفکر، حجاز مقدس کے برکات اور پیرومرشد کی توجہات کے نتیجے میں حضرت قاسم العلومؒ باطل زہریلے اثرات کو زائل کرنے کے لیے ایک تریاق تیار کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) میں خدا کا نام لے کر اس زمانے کے اہل اللہ کی ہم راہی میں دیوبند جیسے ایک چھوٹے سے قصبے میں ایک مدرسۂ اسلامیہ کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ یہ ان کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے اور جس کو رفاہِ اسلام اور رفاہِ مسلمین کے سلسلے میں شاہ کار کہنا چاہیے۔ فرنگی جو جو جال مسلم سلطنت کو برباد کرنے کے بعد دین اسلام کی بربادی کے لیے تیار کر رہا تھا، نظام تعلیم میں مذہب اسلام کے خلاف جو سازش بہ روئے کار لایا تھا، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہٗ کی طرح حضرت قاسم العلومؒ کی کڑی نظر اس پر تھی۔

۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) سے ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) تک کا دور، وہ دور ہے، جس میں تصنیف وتالیف کے

ساتھ ساتھ درس وتدریس کا مشغلہ بھی ہے۔ جس مدرسے کی بنیاد خود رکھی، اس میں بیٹھ کر نہیں پڑھایا۔ کبھی نانوتہ میں، کبھی میرٹھ میں، کبھی دہلی میں کسی مطبع میں، یا کسی مکان میں شاگردوں کی ایک مختصر جماعت کو پڑھاتے ہوئے ملتے ہیں؛ البتہ وفات سے کچھ عرصے پہلے بیماری کے زمانے میں دیوبند میں چھتہ والی مسجد میں حدیث کا درس دیا ہے۔ حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدیقی امروہی مفسر نے یہیں آپ سے ترمذی شریف پڑھی ہے۔ اس عرصے میں اپنے تلامذہ کی ایک مختصر؛ مگر بے مثال جماعت تیار کی، جس میں راس الاذکیاء حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ، فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، حضرت مولانا عبدالعدل پھلتی، حضرت مولانا عبدالعلی صاحب عبداللہ پور میرٹھیؒ، حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدیقی امروہیؒ، حضرت مولانا نواب محی الدین مرادآبادیؒ، حضرت مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوریؒ، حضرت مولانا منصور علی خاں مرادآبادیؒ وغیرہم جیسے اکابر امت کو اپنے فیوض وبرکات اور چشم خاص کی تاثیر سے تیار کیا۔ جن کا فیض ان شاء اللہ تعالیٰ! قیامت تک جاری رہے گا۔ سچ پوچھیے تو ان شاگردوں نے اور ان کے بعد ان کے شاگردوں نے علم وعرفان کے چشمے جاری کردیے اور ہند اور بیرونِ ہند میں توحید وسنت کے چراغ روشن کیے۔

دیگر مدارس کا قیام:

علاوہ دیوبند کے براہِ راست یا بالواسطہ دوسرے مقامات پر بھی مدارس اسلامیہ قائم فرمائے۔ امروہہ، مظفرنگر، مرادآباد، خورجہ، سنبھل، نگینہ اور نہ معلوم کن کن شہروں اور قصبوں میں اپنے ایما سے یا خود جا کر یا کسی شاگرد کے ذریعے مدرسے کھلوائے۔ درحقیقت شمالی ہند کے یہ مدرسے مذہبی چھاؤنیاں تھیں، جنھوں نے ہر دور میں باطل طاقت کے مقابلے میں دفاعی خدمات انجام دیں۔

مطابع میں تصحیح:

اسی زمانے میں حضرت قاسم العلومؒ ہم کو کبھی تو مطبع احمدی میں بیٹھے ملتے ہیں، کبھی مطبع ہاشمی میرٹھ میں۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ تصحیح کر کے پانچ چھ روپیہ ماہوار اپنے خرچ کے لیے حاصل کر لیتے ہیں، اور اس میں سے بھی کچھ شاگردوں پر صرف کر دیتے ہیں۔ مطبع مجتبائی دہلی سے بھی تعلق ہے۔ منشی محمد ممتاز علیؒ سے بھی اچھے تعلقات ہیں۔ ان کے مطبع میں بھی شاید تصحیح کا کام کیا ہے۔ حضرت قاسم العلومؒ نے ان مطابع سے اور ان کے علاوہ دیگر مطابع سے نہ معلوم علوم وفنون کی کتنی کتابوں کو چھپوایا ہوگا؟ مدارس کا نظام قائم ہو رہا تھا؛ مگر

کتابیں نایاب یا کم یاب تھیں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی غیر محسوس جدو جہد سے مدارس کے کتب خانے بہت جلد علمی کتابوں سے لب ریز ہو گئے۔ غالباً یہی مصلحت تھی کہ کسی چھوٹے بڑے مدرسے میں بیٹھنے کے بجائے چھاپے خانوں میں رہ کر اپنے رفاہی دور کا ایک بڑا حصہ گزارا۔

ٹرکی اور روس کی جنگ میں چندے کی تحریک اور فتویٰ:

وفات سے تقریباً تین سال پہلے ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں سلطان روم (ٹرکی) اور روس کی جنگ چھڑی، تو حضرت قاسم العلومؒ بے چین ہو گئے، اور اس سلسلے میں ترکوں کی امداد کے لیے تمام مسلمانوں سے چندے کی تحریک کی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ بابت "تحریک چندہ برائے عسکر سلطان عبدالحمید خاں"، مطبع ہاشمی میرٹھ میں چھپ کر شائع ہوا تھا، وہ اب قریب قریب نایاب ہے۔ اسی زمانے میں اس جنگ کے سلسلے میں ایک فتویٰ بھی مرتب فرمایا، جس کو احقر نے قلمی شکل میں دیکھا ہے۔

حج:

حضرت قاسم العلومؒ نے تین حج کیے: پہلا ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) میں، دوسرا ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) میں، تیسرا ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں۔ سفر حج و زیارت کے سلسلے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کوئی سفر نامہ تحریر نہیں فرمایا، جس سے پوری تفصیلات معلوم ہوتیں۔

مذاہب کانفرنس میں شرکت:

۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) اور ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں میلۂ خدا شناسی (جس کو مذاہب کانفرنس کہا جا سکتا ہے) میں شرکت فرمائی۔ ان دونوں کانفرنسوں میں مختلف مذاہب کے مبلغین، مناظرین، وکیل اور نمائندے شریک ہوئے تھے۔ حضرت قاسم العلومؒ نے بہ حیثیت وکیل اسلام ان جلسوں میں مباحثہ و مناظرہ کر کے اور اپنی بہترین تقاریر کے ذریعے فرزندانِ توحید کا سر افتخار بلند کر دیا۔ گفتگوئے مذہبی اور مباحثۂ شاہ جہاں پور میں ان دونوں جلسوں کی مفصل روداد موجود ہے۔ ان دونوں جلسوں کی کیفیت آخر میں قدرے تفصیل سے عرض کروں گا۔

میرٹھ اور رڑکی میں دفاعی خدمات:

اس سے اگلے سال پنڈت دیانند سرسوتی نے میرٹھ میں قیام کر کے اسلام اور قرآن پر اعتراضات کیے، تو حضرت مولاناؒ باوجود علالت کے وہاں تشریف لے گئے، اور بہت چاہا کہ پنڈت جی سے گفتگو کریں؛

مگر انہوں نے گفتگو کا موقع نہیں دیا۔ وہ حضرت مولاناؒ کے کام یاب مباحثے اور الہامی تقریروں کو دوسرے میلۂ خدا شناسی میں دیکھ اور سن چکے تھے۔ پھر رڑکی میں قیام کر کے پنڈت جی نے اپنے مشہور اعتراضات دہرائے اور برسرِ عام ان کو بیان کیا، حضرتؒ کو اطلاع ہوئی، تو مع جماعت تلامذہ و رفقا باوجود ضعف و نقاہت کے تشریف لے گئے اور دعوت مناظرہ دی۔ وہاں بھی پنڈت جی نے دو بہ دو گفتگو مذہب نہ سمجھی۔ حضرت مولاناؒ نے رڑکی میں اپنے لائق و فاضل شاگردوں کو حکم دیا کہ جو جو اعتراضات ہم تک پہنچے ہیں، ان کے جوابات مختلف جگہوں پر کھڑے ہو کر دیے جائیں۔ چناں چہ وہاں کئی دن قیام فرمایا۔ حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب صدیقی امروہیؒ، رڑکی میں حضرت قاسم العلومؒ کے ہم راہ تھے۔ احقر نے کئی مرتبہ ان کی زبانی رڑکی کے واقعات سنے ہیں۔

حضرت قاسم العلومؒ نے ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) اور ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) کے درمیانی وقفے میں ''قبلہ نما''، ''حجۃ الاسلام'' اور ''انتصار الاسلام'' تین معرکۃ الآراء کتابیں تحریر فرمائیں۔ ''قبلہ نما'' کو میں نے اسی مضمون کی تیاری کے دوران میں پہلی مرتبہ غور سے پڑھا۔ حق یہ ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مخالفین اسلام کے اس اعتراض کا کہ اسلام کعبہ پرستی کی تعلیم دیتا ہے، اتنا محققانہ، تشفی بخش اور مسکت جواب دیا ہے کہ کوئی انصاف پسند یا مخالف اس اعتراض کو قیامت تک پھر نہ دہرا سکے گا۔

شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے وابستگی:

حضرت قاسم العلومؒ نے شیخ المشائخ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے ہاتھ پر غالباً تعلیم سے فارغ ہو کر بیعت کی تھی؛ مگر آپ کو اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو بچپن ہی سے حضرت حاجی صاحبؒ سے واقفیت تھی۔ حضرت مولاناؒ کے خاندان میں حضرت حاجی صاحبؒ کی ننھیال تھی۔ دوسرے ان کی ہم شیر نانوتہ میں بیاہی گئی تھیں۔ ان سے ملنے کے لیے حضرت حاجی صاحبؒ نانوتہ جاتے رہتے تھے۔ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نے سوانح قاسمی میں تحریر فرمایا ہے کہ کتاب کی جزو بندی (جلد سازی) ہم دونوں نے بچپن ہی میں حضرت حاجی صاحبؒ سے سیکھی تھی، اور ہم اپنی کتابوں کی جلد اپنے ہاتھ سے باندھ لیا کرتے تھے۔ اس وقت سے یہ ربط بڑھتا رہا۔ بالآخر روحانی ارتباط قائم ہوا۔ وادیٔ سلوک میں قدم رکھ کر تمام منازل کو طے کیا۔ اس سلسلے میں آپ نے جو کمالات حاصل کیے، اس کا اندازہ خود پیر و مرشد کی چند مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں سے ہوتا ہے۔ حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے بارے میں ''ضیاء القلوب'' میں جو تحریر فرمایا ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

''اور جو شخص اس فقیر سے محبت وعقیدت وارادت رکھے، مولوی رشید احمد سلمہٗ گنگوہی اور مولوی محمد قاسم سلمہ نانوتوی کو کہ تمام کمالات ظاہری و باطنی ان میں موجود ہیں، مجھ راقم کی جگہ سمجھے؛ بلکہ مجھ سے فائق المدارج جانے۔ اگر چہ ظاہری معاملہ برعکس ہوگیا کہ میں ان کی جگہ اور وہ میری جگہ ہوگئے، اور ان کی صحبت کو غنیمت سمجھے کہ اس زمانے میں ایسے آدمی نایاب ہیں، اور ان کی خدمت بابرکت سے فیض یاب ہوتا رہے، اور طریق سلوک جو اس رسالے میں لکھا گیا ہے، ان کے سامنے حاصل کرے، ان شاء اللہ تعالیٰ! بے بہرہ نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے اور اپنی عرفانی نعمتیں اور قربت کے کمالات سے مشرف کرے، اور بڑے بڑے مرتبوں پر پہنچائے، اور ان کے نور ہدایت سے عالم کو منور کرے اور تا قیامت اپنے نبی اور اس کے آل کے طفیل سے ان کا فیض جاری رکھے''(۱)۔

حضرت حاجی صاحب کو اپنے باکمال ومخلص مرید وخلیفہ حضرت قاسم العلومؒ کے انتقال کا بڑا صدمہ ہوا۔ مکہ معظّمہ سے ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا:

''اس صدمے نے ہم سب کو ضعیفی میں ڈال دیا''۔

ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

''اس صدمے نے فقیر کو زندگی سے بے مزہ کردیا''۔

ایک مکتوب میں ارقام فرمایا:

''جو تم میں بڑے اور مدرسے (دار العلوم دیوبند) کے سرپرست تھے، راہی دارِ بقا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ! اب تم سب کو چاہیے کہ جان ودل سے مدرسے کی بہبودی اور بھلائی میں کوشش وسعی کرو کہ جس سے نعمائے دارین حاصل ہوں''۔

ایک موقع پر تحریر فرمایا:

''سب مدرسے کی طرف توجہ رکھیں کہ عزیزم رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی عمدہ یادگار یہ مدرسہ ہے''(۲)۔

حیات قاسم العلومؒ کے تمام گوشوں پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہندوستان کے اندر ناسازگار ماحول میں ملت اسلامیہ کے جو کام حضرت مولاناؒ نے کیے، اور ان میں اتنی برکت ہوئی وہ نتیجہ ہے اخلاص وللّٰہیت کا، توکل وایثار کا، تواضع وانکسار کا۔ خدمت خلق کا جذبہ ان کی رگ رگ میں پیوستہ تھا۔

(۱) تصفیۃ القلوب، ترجمہ ضیاء القلوب، مطبوعہ مجتبائی، ص: ۰۲-۱۰۱۔
(۲) ماخوذ از ذخیرۂ مکتوبات اکابر، بزد دفتری نور الحق عثمانی مدظلہ۔

ان کے دل میں عام انسانیت کا بالعموم اسلام اور اہل اسلام کا بالخصوص درد تھا۔ یہ سب خوبیاں اور عقل معاد کی تابناکیاں، خلوص ویقین، ذکر اللہ اور اتباع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں حاصل ہوئی تھیں۔ اوّل وہ ایک شیخ کامل کا دامن تھام کر ''پیش پائے کاملے پامال شو'' کا مصداق بنے، پھر فروغ ملت کے سلسلے میں جو کچھ خدمات کیں ان میں برکات کا ظہور ہوا۔

چوبیس سال خدمت اسلام اور رفاہِ مسلمین کے کاموں میں صرف کرنے سے پہلے آٹھ نو سال تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کے ذریعے خود کو سنوارنے میں صرف کیے۔ ہم وابستگانِ قاسمی کے لیے یہ ایک قابل تقلید نمونہ اور نا قابل فراموش سبق ہے۔

بیعت وارشاد:

حضرت قاسم العلومؒ بیعت بہت کم فرماتے تھے۔ انہوں نے اپنے اندر کے حالات و کیفیات کو اتنا چھپایا کہ اس کی کم مثالیں ملتی ہیں۔ نسبت باطنی میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے صرف ایک خلیفہ ومجاز کا پتہ مجھے چل سکا ہے، وہ حضرت مولانا حکیم محمد صدیق صاحب مرادآبادیؒ تھے۔ آیئے اس موقع پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تلقینی کلمات اور پڑھ لیجیے، جو ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۸ء) میں کسی جمعہ کے دن بہ مقام نانوتہ غالباً کسی کو بیعت کرتے وقت ارشاد فرمائے تھے۔ قطب الوقت حضرت مولانا حافظ عبد الغنی پھلاودیؒ نے منشی فضل حق دیوبندی مرحوم کی بیاض سے ان کلمات کو ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۵ء) میں نقل کیا تھا۔ ان میں سے چند کلمات بہ طور تبرک یہاں لکھتا ہوں۔ ان سے اندازہ ہوگا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا انداز طبیعت کیا تھا، اور وہ اپنے متوسلین میں کس درجے دین داری اور اخلاص دیکھنا چاہتے تھے:

۱- اپنے آپ کو سب سے کم تر سمجھنا۔

۲- سارے تصوف کا خلاصہ دو چیزیں ہیں۔ بہ قول شیخ سعدی علیہ الرحمہ:

یکے آں کہ بر خویش خود بیں مباش
دوم آں کہ بر غیر بد بیں مباش

۳- ذکر واذکار سے مقصود محض محبت الٰہی ہے، اور محبت الٰہی بدون پیروی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پوری پوری نہیں ہوسکتی؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی محبوب خدا کا نہیں، اور ظاہر ہے کہ محبوب کا قول وفعل محبوب ہوتا ہے۔

۴- کشف وکرامات سالک کے لیے کوئی ضروری یا عمدہ یا بہتر شی نہیں؛ بلکہ کم تر درجہ ہے۔

نادان بچے کوشیرینی وغیرہ کی طمع دے کر مکتب میں لے جاتے ہیں، نہ کہ مردِ داناں کو۔

۵-ہر شیٔ میں سے کسی قدر اللہ نکالنا چاہیے۔

۶-جس ورد یا وظیفے کو شروع کرے، اس پر مداومت چاہیے، خواہ قلیل ہو یا کثیر۔

۷-خدائے تعالیٰ کا منشا، یوں معلوم ہوتا ہے کہ رات دن کا نصف عبادت میں صرف ہو، اور نصف حوائج ضروریہ میں۔

۸-ایسی محفلوں اور مجلسوں میں جس میں ذکر خدا اور رسول نہ ہو، نہ بیٹھنا چاہیے۔

۹-اکثر تنہا رہنا چاہیے۔

۱۰-حتی الوسع ہاتھ سے ر‌پے سے پیسے سے مسلمانوں کے ساتھ سلوک کرنا چاہیے۔

۱۱-علماو صلحا کی صحبت اختیار کرنا چاہیے اور جہلا سے پرہیز۔

شاگردوں پر شفقت:

اپنے شاگردوں سے بڑی محبت اور ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے، ان کو مکاتبت میں اونچے القاب سے یاد فرماتے تھے۔ حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدیقی امروہیؒ کے ذخیرۂ مکتوبات میں سے ان کے صاحبزادے مولانا عبدالمؤمن صدیقی زید مجدہم کے ذریعے حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مکتوب گرامی حاصل ہوا ہے، جو فارسی زبان میں ہے، اور حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ کے نام ہے۔ اس کے اول و آخر کا ترجمہ پیش کرتا ہوں، اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ اپنے شاگردوں پر کتنے شفیق تھے۔ داخلی قرائن سے پتہ چل رہا ہے کہ یہ مکتوب مبارک میرٹھ سے تحریر فرمایا ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد قاسم عفی اللہ عنہ

عزیزم مولوی فخر الحسن اَجْعَلَهُ اللّٰهُ مُفَخَّراً وَمُعَظَّماً کی خدمت میں اوّلاً سلام مسنون پیش کر کے گزارش کرتا ہے کہ: میرا حال ہر طرح سے بہ فضل الٰہی ٹھیک ہے؛ البتہ آں عزیز کی مفارقت ملال انگیز حادثہ ہے۔ بندۂ کم ترین آں عزیز اور عزیزم مولوی احمد حسن (امروہی) کو مثل چشم و چراغ دیکھتا تھا، اپنا دست و پا سمجھتا تھا، نہیں سمجھتا تھا کہ روز مفارقت بھی آنے والا ہے۔ آں عزیز تو چلے گئے، اب عزیزم مولوی احمد حسن کچھ عرصے بعد (فارغ ہو کر) چلے جائیں گے۔ پھر وہی میں اور وہی گوشۂ تنہائی۔ اس عرصے میں آں عزیز کا جو خط پہنچا، تو رنج پنہاں نمودار ہو گیا اور ہلالِ جدائی تازہ ہو گیا۔

میرے بھائی! مجبوری کی بات ہے، اگر عسرت و افلاس آں عزیز کے اقارب کو درپیش نہ ہوتا، جس کی وجہ سے (آں عزیز نے ملازمت اختیار کی)، تو میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ آں عزیز کو جدا کروں؛ مگر جو پیش آئے، بہ جز صبر چارہ نہیں ہے۔ ہر چند دور ہوں؛ مگر اگر عنایت احباب شامل حال ہو جائے، تو نزدیک ہوں۔

''نسائی شریف'' ان شاء اللہ تعالیٰ! پرسوں شنبہ کے دن شروع ہوگی۔ ''میر زاہد'' امور عامہ عرصہ ہوا ختم ہوگئی؛ لیکن ''صحیح مسلم'' کے اسباق جو آخر سے باقی تھے، اس اثنا میں پڑھے گئے، اس کے بعد مولوی محمود حسن (دیوبندی)، مولانا احمد علی (سہارن پوری) کے نسخہ نسائی کی تلاش میں جو کہ دوسرے نسخوں کے مقابلے میں صحیح ہے، سہارن پور گئے تھے اور وہاں سے دیوبند گئے، شاید دو روز وہاں مقیم رہ کر واپس آ گئے ہیں۔ شرح چغمینی بھی شروع ہوگئی ہے۔ اس کے چند ورق پڑھے جا چکے ہیں۔ چار پانچ دن ہوئے مولانا رشید احمد صاحب کا گنگوہ سے خط آیا تھا، اس میں ارقام فرمایا تھا کہ: محمد ذکی ابن مولوی محمد تقی کا انتقال ہوگیا۔ ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ!﴾ سب کی طرف سے خصوصاً مولوی محی الدین (مرادآبادی) کی طرف سے کہ انہوں نے سلام لکھنے کو کہہ دیا ہے، سلام قبول ہو۔ مولوی محمد ہاشم (میرٹھی) سلام کہتے ہیں۔ جلد اپنے حال کی اطلاع دیں؛ اس لیے کہ بخار اور دردِ سر کی شکایت جو لکھی تھی، اس سے طبیعت کو پریشانی ہے''۔

پہلا میلۂ خدا شناسی:

۱۲۰۰ھ (مطابق ۱۸۷۶ء) میں پہلا میلۂ خدا شناسی ہوا، جس میں حضرت قاسم العلومؒ نے شرکت فرمائی۔ تمام مذاہب کے مناظرین و مبلغین اس میں جمع تھے، مگر اصل مقابلہ عیسائیوں سے تھا۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں فتح مبین حاصل کرائی۔ بڑے بڑے فاضل عیسائیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ چاندا پور میں جو شاہ جہاں پور سے پانچ چھ کوس پر ہے، یہ میلہ ہوا۔ منشی پیارے لال کبیر پنتھی نے یہ میلہ قائم کیا تھا۔ جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بھی شرکت کی استدعا وہاں سے ہوئی، تو نانوتہ سے پاپیادہ روانہ ہوئے۔ دیوبند میں ایک شب قیام فرمایا۔ مظفر نگر اور میرٹھ میں بھی ایک ایک شب قیام رہا۔ بالآخر دہلی پہنچے۔ ۵؍مئی کو بہ ہمراہی مولانا سید ابو المنصور و دیگر رفقا و تلامذہ دہلی سے روانہ ہو کر ۶؍مئی کو بعد عصر شاہ جہان پور پہنچے۔ وہاں حضرت مولاناؒ اپنے آپ کو چھپانے اور غیر معروف تاریخی نام ''خورشید حسین'' بتاتے رہے۔ رات کو ایک سرائے میں قیام کر کے بعد نماز صبح پیدل چاندا پور تشریف لے گئے۔ مدت مباحثہ دو روز تھی؛ مگر بہ اصرار

حضرت مولاناؒ - پادری نولس نے ایک دن اور بڑھانے کا وعدہ کرلیا تھا۔ کالے، گورے، ہندوستانی، انگلستانی تمام پادری اس مجمع میں موجود تھے۔ تقریر کا وقت پندرہ منٹ، سوال و جواب کا دس منٹ مقرر ہوا۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بہت چاہا کہ مدت تقریر بڑھادی جائے؛ مگر عیسائیوں نے نہ مانا۔ پادریوں کی ہر ہر جا و بے جا شرط کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مان لیا، اور نہایت تحمل اور اطمینان سے ان کی ہر ہر بات کا جواب دے دیا۔

ایک دن دورانِ تقریر میں ایک پادری نے جس کے گلے میں فوجی تمغہ تھا، حضرت مولاناؒ کو غلط طریقے سے ٹوکا، تو حضرت محدث امروہی کو اس پر غصہ آ گیا، اور اچھی طرح اس کو ڈانٹا؛ لیکن حضرت مولاناؒ نے اپنے فاضل شاگرد کے غصے کو یہ فرما کر روکا: ''یہ آپ کو نہیں کہتے، مجھے کہتے ہیں''۔

بعد اختتام جلسہ وہی پادری صاحب، جنھوں نے درمیان تقریر اعتراض کیا تھا، ملنے آئے اور کہا میں ملنے آیا ہوں، اب رخصت ہوتا ہوں۔ حضرتؒ نے فرمایا: آپ نے بڑا کرم کیا۔ اس کے بعد ان پادری صاحب نے کہا: ''مولوی صاحب آپ کی تقریر نہایت عمدہ ہے''۔

جب اہل اسلام میلے سے روانہ ہوئے، تو گاڑیوں کی قطار سے بیس قدم پر ایک جوگی جارہا تھا، اس کے معتقد اس کے ساتھ تھے، حضرت مولاناؒ کی طرف اشارہ کر کے اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: جے مولبی (یہ مولوی) ہے، اتفاقاً حضرت مولاناؒ کی نظر اس پر پڑ گئی، اس نے سلام کیا، حضرتؒ نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا، وہ جوگی دوڑا اور گاڑی تھام کر حضرت مولاناؒ سے کہا: تم نے بڑا کام کیا۔ حضرتؒ نے فرمایا: میں نے کیا کیا؟ اللہ تعالیٰ نے کیا۔ اس نے کہا: سچ کہتے ہو۔ پھر جوگی نے چار انگلیوں سے اشارہ کر کے کہا: جب تم نے بولی ماری (تقریر کی)، تو ہم نے دیکھا: پادری کا اتنا سریر (جسم) گھٹ گیا تھا۔ حضرتؒ نے فرمایا: تم کہاں تھے؟ خیمے کے باہر تھے؟ جوگی نے کہا: ہم بھی خیمے کے اندر تھے؟ پھر حضرتؒ نے فرمایا: تمہارا نام کیا ہے؟ جوگی نے کہا: ''جانکی داس''۔

بعد اختتام جلسہ مولوی عبدالوہاب ساکن بریلی نے ایک پادری سے کیفیت جلسہ پوچھی، اس نے کہا: کیا پوچھتے ہو، ہم کو بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا، اور بہت سے علمائے اسلام سے اتفاق گفتگو ہوا، پر نہ یہ تقریریں سنیں، نہ ایسا عالم دیکھا، ایک پتلا دبلا سا آدمی، معمولی سے کپڑے، یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ عالم ہیں، ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا بیان کریں گے؟ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ حق کہتے تھے، پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے، تو اس کی شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے۔

دوسرا میلۂ خدا شناسی:

اگلے سال ۱۲۹۴ھ (مطابق مارچ ۱۸۷۷ء) میں دوسرا میلۂ خدا شناسی منعقد ہوا۔ اس میں تمام مذاہب کے مناظر اور مبلغین موجود تھے۔ اس سال علاوہ پادری نولس کے پادری واکر صاحب اور پادری اسکاٹ صاحب بھی تھے۔ ہنود میں پنڈت دیا نند سرسوتی اور منشی اندرمن بھی آئے تھے۔

پادری اسکاٹ کا معقول دانی میں بڑا شہرہ تھا؛ مگر پھر بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی گزشتہ سال کی فاتحانہ الہامی تقاریر سے تمام مذاہب کے نمائندے بالعموم اور پادری صاحبان مرعوب تھے۔ اس سال حضرت مولاناؒ چاہتے تھے کہ گفتگو کا سلسلہ دو دن سے زیادہ چلے، تا کہ حقانیت اسلام کو واضح کرنے کا زیادہ موقع مل جائے؛ مگر دیگر مذاہب کے وکلا خصوصاً پادریوں نے کہا: ہم کو زیادہ فرصت نہیں ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر فرمایا:

> ''یہ بات (کہ ہم کو زیادہ فرصت نہیں، دو دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتے) ہمارے کہنے کی تھی۔ باوجود افلاس و بے سر و سامانی قرض دام لے کر اپنی ضرورتوں پر خاک ڈال کر ایک مسافت دور دراز قطع کر کے یہاں تک پہنچے۔ پھر اس پر یہ قول ہے کہ جب تک حسب دل خواہ فیصلہ نہ ہو جائے گا، نہ جائیں گے، اور آپ صاحب تو اسی کام کے نوکر، آنے جانے میں کوئی دقت نہیں۔ اس کے کیا معنی کہ آپ کو فرصت نہیں؟ یہ عذر کرتے، تو ہم کرتے''۔

اس اجتماع میں بھی حضرت قاسم العلومؒ نے توحید، سیرت نبوی اور حقانیت اسلام پر نقلی و عقلی دلائل سے بحث فرمائی، اور اپنی تقاریر سے تمام مذاہب کے نمائندوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس مرتبہ بھی نمایاں کامیابی ہوئی۔ پادری اسکاٹ نے اختتام جلسے کے بعد ایک صاحب سے کہا: کہ مولوی صاحب مولوی نہیں، صوفی مولوی ہیں، اور اس قسم کا علم اب اہل اسلام میں نہیں رہا، اور یہ بھی اقرار کیا کہ کوئی شخص الٰہیات میں اہل اسلام کا ہم پلہ نہیں (۱)۔

---

(۱) (ماخوذ از): ندائے ملت۔ لکھنؤ ۱۹۶۳ء، ص: ۳-۱۷۔

حضرت مولانا نانوتویؒ اور ان کی خدمات

مولانا محمد رضوان ادروی، فاضل دیوبند

صاحبِ مضمون کے حالات وتعارف سے ہم واقف نہیں ہیں، بس ''فاضل دیوبند'' ہونا بھی اونچی نسبت رکھتا ہے؛ لیکن یہ مضمون بہت معلوماتی اور پر اثر ہے۔ اسے پڑھیے اور بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی دعا اور کوشش ضرور کیجیے۔ (نعمان)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس صفحۂ گیتی پر کتنے گل بوٹے اپنی پُر کیف آب وتاب کے ساتھ کھلے اور مُرجھا گئے، اور اس چمنستان میں کتنے بلبل وعندلیب اپنی وجد آفریں اور دل کش آواز سے مترنم ہوئے اور چلے گئے، اور کتنے ہونہار کھلاڑی کھیل کے میدان میں آئے، اور اپنا کھیل کو دکھا کر عالمِ بقا کو سدھار گئے، یہاں تک کہ ان کا نام ونشان تک بھی باقی نہیں رہا:

بس نامور بہ زیرِ زمین دفن کردہ اند!
کرم ستیش بر روئے زمیں بر نشاں نماند

مگر یہ آسمان وزمیں، چاند وسورج جیسے پہلے قائم تھے، ویسے ہی اب بھی قائم ہیں۔ ذوق نے سچ کہا ہے:

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گی

مگر پھر بھی خدا کے کچھ ایسے مخلص خدا ترس نیک بندے دنیا میں آئے، جنہوں نے نہایت خلوص اور صداقت کے ساتھ قومی وملی خدمات انجام دیں۔ وہ دے کر چلے تو گئے؛ مگر ان کی سچی خدمات کے سبب ان کی نیک نامی اور فائز المرامی کا ستارہ آج تک آسمانِ شہرت پر چمک دمک رہا ہے، اور دنیا انہیں اچھے ناموں سے یاد کرتی ہے، اور تا قیامت یاد کرتی رہے گی:

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بہ عدل
گرچہ بسے گزشت کہ نوشیرواں نماند!

انہیں لائق ومخلص خدا ترس نیک سیرت، دوربیں انجام فہم لوگوں میں سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ہیں، جو ۱۲۴۸ھ ہجری (۱۸۳۲ء) میں قصبۂ نانوتہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ آپ اپنے زمانے کے ایک جید عالم، صوفی منش اور نبیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول: ''عُلَمَاءُ أُمَّتِي كَأَنْبِيَاءِ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ'' کے مصداق تھے۔

آپ نے قوم وملت کی جو خدمات انجام دی ہیں، اور اس امت مرحومہ پر جو احسانات کیے ہیں، وہ کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے قبل ملک میں جا بجا خصوصاً دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان، کشمیر، اجمیر، دکن، حیدرآباد، فرخ آباد، لکھنؤ، خیرآباد، پٹنہ وغیرہ علم وفن کے مرکز تھے۔ مدارس کی کفالت اس زمانے کے نواب اور رؤسا خود کیا کرتے تھے؛ مگر جب انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط ہوا، اور مسلمانوں کو اپنے دین ومذہب کی تعلیم وتعلم میں منہمک اور دین ومذہب میں پوری طرح رنگا ہوا پایا، تو ان کے متعصب دل سے برداشت اور بدبیں آنکھوں سے دیکھا نہیں گیا، اور انہیں یہ فکر رہنے لگی کہ مسلمانوں کے بچوں کو ان کے دین سے پھیر دیا جائے، یا کم از کم اپنے دین سے لاپرواہ بنا دیا جائے۔

چناں چہ ''اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ'' کے فلسفے کے تحت حکومت کی زبان بجائے فارسی کے (جو مسلمانوں کی زبان تھی) انگریزی قرار دے دی گئی، اور عربی وفارسی کے تمام مدارس کو پیغام فنا سنا دیا گیا، اور علمائے ملت کو ایک دیہاتی جاہل سے بھی زیادہ بے حیثیت کر دیا گیا۔ جگہ جگہ انگریزی کورس کے اسکول کالج قائم کیے جانے لگے۔ عیسائی اور مسلم نما پادری سانپ بچھو کی طرح ملک کے چپے چپے میں رینگنے لگے اور اپنے مذہب کا پرچار کرنے لگے۔

یہ مذہب اسلام اور اس کے ماننے والوں پر ایک ایسی مصیبت اور تباہی تھی کہ جہاں تمام ظاہری تدبیریں ختم ہو چکی تھیں، اور تقدیر تدبیر پر غالب آ چکی تھی؛ مگر پھر بھی کچھ لوگ ایسے تھے، جن کے دلوں میں خدا کا ڈر، قلوب نور ایمانی سے روشن، روحیں فیض عرفانی سے شاداب اور ان کے اندر قوم وملت کا درد تھا۔ انہوں نے ان دشمنان اسلام کے اس منصوبے کو مٹانے کے لیے مدارسِ عربیہ کا قیام از بس ضروری سمجھا۔ چناں چہ سب سے پہلے جنہوں نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا، وہ قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام:

اپنے چند رفقا کو لے کر دیوبند میں ''دارالعلوم'' نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، اور اس کے پروان

چڑھانے میں دامے، درمے، قدمے، سخنے جیسے بھی ہوسکا، کوشش کرتے رہے، اور مدرسے سے کوئی بھی ذاتی غرض وابستہ نہیں رکھی۔

مولانا گیلانی مرحوم حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کی سوانح میں لکھتے ہیں کہ: ابتدا میں مدرسے کے ارباب حل وعقد نے یہ چاہا کہ آپ بھی مدرسے کی مدرسی منظور فرمالیں اور اس کے عوض کسی قدر تنخواہ لے لیا کریں؛ مگر آپ نے شوریٰ والوں کی اس خواہش کو منظور نہیں کیا، اور کبھی کسی طور یا ڈھنگ سے مدرسے سے ایک دانے تک کے روادار نہ ہوئے۔

اب تو دنیا کا حال کچھ اور ہی ہے۔ اگر کوئی مدرسہ قائم کرتا ہے، تو اس کا سب سے بڑا منصوبہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس مدرسے کے مہتمم یا صدر مدرس بن جائیں، اور اپنا سکہ عوام میں اس طرح جما دیں کہ سب کے سب ہماری مٹھی میں آجائیں۔ مدرسے میں جس طرح چاہیں، الٹ پھیر کریں۔

نیز مولانا مرحوم لکھتے ہیں کہ: اگر بہ غرض ضرورت مدرسے کی دوات قلم سے کوئی اپنا خط لکھتے، تو ایک آنہ پیسہ مدرسے میں داخل فرما دیتے، اور فرماتے کہ یہ بیت المال کی دولت ہے، اس میں تصرف کسی کا جائز نہیں۔ حضرت نانوتویؒ کے مزاج میں حرارت تھی، موسم گرما میں سرد مکان بہت مرغوب تھا۔ مدرسے میں ایک سردخانہ تیار ہوا؛ گرمی کی شدت تھی، حضرت مولانا رفیع الدینؒ نے، جو اس وقت مدرسے کے مہتمم تھے، حضرت مولانا نانوتویؒ سے کہا کہ: مدرسہ میں سردخانہ بن گیا، وہاں دوپہر کو آرام فرمالیا کریں۔ تو جواب دیا: ہم کون جو اس میں آرام کریں؟ اس کے حق دار تو طلبہ ہیں۔

چناں چہ آپ نے کبھی مدرسے کے سردخانے میں آرام نہیں فرمایا۔ یہ سب کیوں تھا؟ محض اس لیے کہ حضرت نانوتویؒ کے دل میں ملت اسلام اور اس کے ماننے والوں کا سچا درد تھا۔ قوم وملت کی خدمت کا خالص اور صحیح جذبہ تھا۔ چناں چہ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں نے جو اوہام باطلہ پیدا کردیے تھے، جس کی وجہ سے دین کی طرف سے بے توجہی اور آپس میں انتشار پیدا ہورہا تھا، اس مدرسے کے ذریعے ان تمام کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کرنا اور سچا مسلمان بنا دینا اس کا مقصد عظیم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مدرسے میں کبھی سرکاری امداد لینا گوارا نہیں کیا، اور نہ ڈپٹی انسپکٹروں کو اپنے ہاں آنے کا موقع دیا، جو انہیں سرکار کی وفاداری پر مائل کرتے؛ بلکہ شرع محمدی کی تعلیم غریب مسلمان قوم کے چندے پر منحصر رکھی۔ چناں چہ حضرت نانوتویؒ نے اپنے وصیت نامے میں تحریر فرمایا:

”۱- اس مدرسے میں آمدنی کی سبیل جب تک یقینی نہیں ہے، تب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ

تعالیٰ! بہ شرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلتا رہے گا۔ اگر کوئی آمدنی ایسی حاصل ہوگئی، جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت یا کسی امیر کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا، جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا، اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی۔ کارکنوں میں نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

۲-سرکار کی شرکت اور امرا کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۳-تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے، جن کو اپنے سے امید نام وری نہ ہو، یا کچھ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائے داری کا سامان معلوم ہوتا ہے''۔

روشن مستقبل:

اسی ایثار و ہمدردی و اخلاص کا نتیجہ ہے کہ آج سے ایک صدی پہلے جو دارالعلوم ایک مکتب کی شکل میں ظہور پذیر ہوا تھا، آج اس کی فلک پیا کوہ ہیکل عمارتوں کا سلسلہ طویل وعریض رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ جس سے ہر سال تقریباً دوسو تشنگانِ علوم- علوم نبوت ومعرفت سے سیرابی حاصل کر کے اپنے وطنوں کو واپس ہوتے ہیں[۱]۔

عام تعلیمی تاریخ نہ سہی؛ لیکن اسلامی علوم کی تدریس وتعلیم کی ہندوستان کی حد تک نہیں؛ بلکہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ سارے عالم اسلامی کی تعلیمی تاریخی کا تذکرہ دارالعلوم دیوبند کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔

انگریزوں سے نفرت:

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ مولاناؒ کے اندر قوم وملت کا درد تھا، وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو کسی پہلو سے کم زور نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انگریزی حکومت کے مسلط ہوتے ہی پادریوں کا ٹڈی دل ہندوؤں اور مسلمانوں کے دھرم اور دین کے چاٹ جانے کے لیے ملک کے طور وعرض میں پھیلا ہوا تھا۔ سرکاری حکام خفیہ اور بسا اوقات علانیہ بھی دام سے، درم سے، قدم سے ان پادریوں کی ہمت افزائیوں میں مشغول ومنہمک نظر آتے تھے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے دینی پیشواؤں کی تحقیر وتوہین کا بازار ہر طرف گرم تھا۔ دین کے ان خطرات کے ساتھ ساتھ دنیا کا حال یہ تھا کہ بڑے بڑے راجہ اور والیانِ ریاست، نواب اور رئیس نانِ شبینہ کے محتاج بن کر گلی کوچوں میں ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ عوام کی غربت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ سیر یا ڈیڑھ سیر اناج پر ہر ہندوستانی گردن کٹوانے پر تیار ہو جاتا تھا۔

(۱) اس وقت اس کی تعداد کئی گنا زیادہ ہوگئی ہے۔ (نعمان)

بغاوتِ ہند:

ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ حضرت مولاناؒ کے قلب مبارک میں انگریزی حکومت کی طرف سے جو نفرت اور گرانیاں پیدا ہو چکی تھیں، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اپنی کتاب ''ہدیۃ الشیعہ'' میں لکھتے ہیں کہ: ''کسی کو میٹھا بھاتا ہے، کسی کو نمکین، کسی کو ایک چیز کی طرف رغبت ہوتی ہے، کسی کو نفرت''، اور تمثیل میں لکھتے ہیں کہ: ''انگریزوں کو عطرِ نفیس سے نفرت اور مچھلی کے اچار سے (جسے سونگھ بھی لیجیے، تو دماغ چھوڑ، جان کی خیر نہیں) رغبت ہے''۔ آگے کے الفاظ ہیں کہ: ''پاخانہ کے کیڑے گندگی میں خرم وشاد عیش وآرام سے رہیں، اور خوش بو سونگھیں، تو مر جائیں''۔

یہ تو خیر معمولی بات ہے۔ مغل حکومت کے تابوت میں آخری کیل ٹھوکنے کے لیے انگریزوں کی طرف سے جب اعلان کیا گیا کہ لال قلعہ سے آلِ تیمور کا آئندہ کسی قسم کا تعلق باقی نہیں رہے گا، اور بہادر شاہ مرحوم کے بعد شاہی خاندان کے لوگوں کو قلعے سے نکال دیا جائے گا۔ حکم دیا گیا کہ آئندہ بہادر شاہ مرحوم کا بیٹا ''مہرولی'' پر مسکن پذیر ہو۔ یہ فیصلہ ۱۸۵۰ء میں کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں حضرت نانوتویؒ کو دلی میں کوچۂ چیلاں کے ایک مکان میں ایک جھلنگے پر جس حالت میں پایا گیا، اس کو حضرت مولانا یعقوب علیہ الرحمہ سے سنیے۔ لکھتے ہیں:

> ''بجائے مزاج شگفتہ ہونے کے ترش رو مغموم رہتے تھے۔ بال بکھرے ہوئے، کپڑے میلے کچیلے، جوئیں سر میں بھری ہوئیں، نہ کھانے کی خبر، نہ پہننے کی پرواہ، کئی کئی دن کی پکی ہوئی خشک روٹیوں کے ٹکڑوں کو بھگو بھگو کر چبا لینا، پھر اسی جھلنگے پر پڑا رہنا''۔

غرض یہ کہ حضرت نانوتویؒ کے قلب کی گرانی، جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، حد سے گذری ہوئی تھی۔ غدر کے بعد انگریزی قوم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کا نقاب اتار کر براہِ راست ہندوستان کا جائزہ لے لیا، اور ملکہ وکٹوریہ کو ہندوستان کی قیصرہ بنا کر دلی میں ملکہ کی تاج پوشی کا جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس زمانے میں حضرت نانوتویؒ کا قیام دلی میں تھا، دیکھا گیا کہ جوں ہی اس جشن کے انعقاد کا ساز وسامان ہونے لگا، تو حضرت نانوتویؒ دہلی سے دیوبند چلے آئے، اور فرمایا کہ مجھ سے ان انگریزوں کی شوکت نہیں دیکھی جاتی؛ اس لیے دیوبند چلا آیا، کہ نہ دیکھوں گا، نہ کوفت ہوگی۔ نیز فرمایا کہ اتنی طاقت تو ہے کہ سارا دربار درہم برہم کردوں؛ مگر سنبھالنے والے نظر نہیں آتے:

لو أن شيئا يستطاع استطعته
ولكن ما لا يستطاع شديد

۱۸۵۷ء کا انقلاب اور حضرت نانوتویؒ:

مولانا گیلانی مرحوم سوانح قاسمیؒ میں لکھتے ہیں کہ: ۱۷۵۷ء کے ٹھیک ایک سو سال بعد جوں ہی ۱۸۵۷ء کا سال شروع ہوا، جنوری کا پہلا مہینہ شروع تھا کہ کلکتہ کی چھاؤنی ڈم ڈم میں پہلی دفعہ کارتوسوں میں گائے اور سور کی چربی کے قصے کا آغاز ہوا۔ وہی قصہ بڑھتا رہا، کارتوسوں کو دانت سے کاٹنے کے حکم کی تعمیل سے جن ہندوستانی سپاہیوں نے انکار کیا تھا، ان کی پلٹن ہی کو گورنر جنرل نے برخاست کردیا، جس سے ہندوستانی فوجوں میں کافی خوف وہراس اور آزادی کے جذبات پیدا ہوئے۔

بارک پور (کلکتہ) کی چھاؤنی میں اسی کا ردِ عمل اس شکل میں ہوا کہ ایک سپاہی نے افسر پر حملہ کردیا، اسی کو جرم قرار دے کر بارک پور کی تمام سات پلٹنوں کو موقوفی کے ساتھ گورنر جنرل نے ایک جمعدار اور ایک سپاہی کو پھانسی پر چڑھادیا، اور دو کو کالے پانی کی سزا، حبس دوام کی شکل میں دے دی گئی۔ جرم کے مقابلے میں سزا کی سختی ہندوستانی فوجوں کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی۔ جہاں جہاں فوجی چھاؤنیاں تھیں، اندر ہی اندر سلگتی ہوئی یہ آگ پہنچتی رہی، یہاں تک کہ ۵ رمئی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۰ رمضان ۱۲۷۳ ہجری کو میرٹھ کی چھاؤنی میں بھی آگ بھڑک اٹھی۔ گوروں کی تعداد میرٹھ کی چھاؤنی میں دو سو سے زائد نہ تھی، اس کے مقابلے میں ہندوستانی فوجیوں کی تعداد دس ہزار کے قریب تھی، مزید برآں فوج کے چاروں طرف ظاہر ہے کہ آبادی ہندوستانیوں ہی کی تھی۔ ایسی صورت میں جو کچھ ہونا تھا ہوا۔ جیل خانہ آباد کیا گیا، لائن میں آگ لگادی گئی، گورے چمڑے کا جو آدمی بھی سامنے آجاتا، مرد ہو یا عورت، بچے ہوں یا جوان، بلا امتیاز ہندوستانیوں نے سب کا صفایا شروع کردیا۔ انگریزوں نے انتہائی روک تھام کی کوشش کی؛ مگر کچھ کامیابی نہیں ہوئی، واقعہ اپنی انتہائی حد کو پہنچ گیا۔

یوں تو ہر ہر علاقے کو انگریزوں سے پاک وصاف کرنے کا ارادہ کرلیا گیا؛ مگر صوبہ جات متحدہ آگرہ واَوَدھ کے ساتھ ساتھ بندیل کھنڈ اور صوبۂ بہار کے بعض قصبوں تک یہ آزادی کی تحریک پھیل گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ میرٹھ جہاں سے یہ آگ اٹھی تھی، روہیل کھنڈ کے سارے اہم مقامات اس کے اردگرد چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ان سے متأثر نہ ہونے کی کیا وجہ تھی؛ بلکہ قدرتی طور پر جو علاقے دلی سے متصل تھے، جیسے مظفرنگر، سہارن پور وغیرہ، وہ سب اس جذبۂ آزادی سے رمضان میں متأثر ہوچکے تھے۔ مولانا نانوتویؒ ان دنوں نانوتہ ہی میں قیام پذیر تھے۔

حضرت مولانا محمد یعقوبؒ اجمالی طور پر لکھتے ہیں کہ ان دنوں نانوتہ میں چند ہنگامے مفسدین کے پیش

آئے، جس کا سلسلہ کافی عرصہ تک رہا اور مولانا نے مفسدین کے خلاف پورا پورا حصہ لیا۔

تھانہ بھون میں حکومت کے خلاف مجلس شوریٰ:

۱۸۵۷ء کا جہاد پورے بارہ مہینے ملک میں رہا۔ تین مہینے سہارن پور میں۔ سہارن پور میں پنکھی نامی کوئی انگریز افسر باغیوں کی سرکوبی کے لیے حکومت کا مجاز بنا کر انتظاماً متعین کیا گیا۔ ابتداً سہارن پور میں اس تحریک کے قصے دبے دبے سے تھے۔ قاضی عبدالرحیم، قاضی عنایت علی خاں کے بھائی چوں کہ سہارن پور علاقے کا مرکزی شہر تھا، تھانہ بھون سے ہتھیاروں کی خریداری کے شوق میں اپنے چند احباب کے ساتھ آئے اور سرائے میں کسی دوست کے پاس ٹھہرے۔ اتفاق کی بات ایک تھانہ بھون کا بنیا، جوان لوگوں سے کھنچا ہوا تھا، ان دنوں سہارن پور میں ٹھہرا ہوا تھا، بنیے نے انتقام کا موقع غنیمت سمجھا، چناں چہ سیدھا پنکھی افسر کے پاس پہنچ گیا اور یہ بات اس کے کان میں پھونک دی کہ قاضی عبدالرحیم دہلی کمک بھیجنے کے لیے ہاتھی خریدنے یہاں آیا ہوا ہے۔ انگریز افسر نے ایک گارڈ سرائے میں بھیج دی اور عبدالرحیم اور ان کے احباب کو قید کر لیا گیا۔

چوں کہ انگریزوں کا دماغ پہلے ہی سے بوکھلایا ہوا تھا، اور حد سے زیادہ اختیار بھی قدرتاً آدمی کو بدمست بنا دیتا ہے، پنکھی نے جیل کے بعد نہ صبر ہی سے کام لیا، نہ اصل واقعے کی تفتیش کی، اور اس ناکردہ گناہ جماعت کو پھانسی کا حکم دے دیا:

بات کیا تھی جب مفت کی حجت ٹھہری
اس خطا پر مجھے مارا کہ خطاکار نہ تھا

یہ خبر جب سہارن پور سے تھانہ بھون پہنچی، تو سارے قصبے میں کہرام مچ گیا، اور قاضی عبدالرحیم کی بے کسی اور خلاف توقع موت سے قاضی عنایت کے اوپر رنج وغم، حزن وملال کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، جوشِ حزن میں بھائی کے انتقام کا خیال پختہ ہوگیا اور انتقام کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے، اور انتصار کے لیے تھانہ بھون کے اطراف وجوانب میں جو قصبات تھے، وہاں کے باشندوں کو بھی قاضی صاحب نے بلایا اور انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کرنے پر مجلس شوریٰ منعقد ہوئی، جس میں مولانا نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، مولانا شیخ محمد تھانویؒ اور دوسرے حضرات موجود تھے۔

چناں چہ باہم گفتگو ہوئی۔ سوال یہ تھا کہ اس بغی وعدوان اور بے جا ظلم کے مقابلے میں انتصار کے فرض کو محسوس کرتے ہوئے کیا جہاد وقتال پر آمادہ ہونے کا وقت آ گیا ہے؟

مولانا گیلانی مرحوم ایک کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: اس موقع پر جہاد کے سب خلاف تھے، صرف حضرت مولانا نانوتویؒ مدعیانہ طور پر اس میں پیش پیش تھے۔ سب نے جو حجتیں خلاف ملیں، پیش کیں، حضرت مولانا نانوتویؒ نے جوش وخروش کے ساتھ سب کا مسکت جواب دیا۔ مولانا شیخ محمد تھانویؒ نے آخری عذر یہ پیش کیا کہ اگر آپ کی حجتیں اور باتیں مان لی جائیں، تو سب سے بڑی شرط جہاد میں نصب امام کی ہے، امام کہاں ہے کہ اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے؟

حضرت نانوتویؒ کی تجویز پر امیر جہاد کا انتخاب:

حضرت شیخ محمد تھانویؒ کے اس سوال کے جواب میں مولانا نانوتویؒ نے فرمایا کہ: حضرت مرشد برحق حاجی صاحب موجود ہیں، انہیں کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔ کس کو جرأت تھی کہ امامت کی تمام شروط کو پورا کرنے والی شخصیت کامل پر جرح وقدح کی ہمت کرتا؟ تجویز پیش ہوئی اور حضرت اقدس حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہٗ مرکز جہاد بن گئے، اور حضرت محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ سب سے بڑے علم بردار جہاد۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ جامع مجاہدین (کہ وعظ وپند، ترغیب وترہیب سے مجاہدین کو مختلف مواقع دیہات وقصبات سے جمع کر کے میدان میں لائیں)، حضرت نانوتویؒ امیر عسکر منتخب ہوئے۔

والدہ ماجدہ سے اجازت:

جاننے والے جانتے ہیں کہ والدین یا ان میں سے کوئی زندہ ہوں، تو ان سے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت بھی شرعاً ضروری ہے، لہٰذا اس شرعی شرط کے پورا کرنے کے لیے آپ اپنے مکان نانوتہ تشریف لے گئے۔ اپنی والدہ کے بہت ہی مطیع اور فرماں بردار تھے۔ روزانہ دونوں وقت پاؤں دبانا آپ کا معمول تھا۔ اپنے معمول کے مطابق والدہ ماجدہ کے پاؤں دباتے ہوئے ماں کو مخاطب کر کے فرمانے لگے کہ: خدا کی راہ میں مال کو فدا کرنا ایسا ہے، اور خوشی سے جو جان خدا کے حوالے کر دیتا ہے، اس کا ایسا درجہ ہے وغیرہ۔ اسی قسم کی پر اثر تمہید بیان کر کے عرض کیا کہ: جہاد فرض ہو چکا ہے۔ اسی کے ساتھ والدہ ماجدہ سے یہ بھی فرمایا کہ: میں چاہتا ہوں کہ آپ خوشی سے مجھے اس کی اجازت دے دیں، تا کہ آپ کو بھی اجر ملے؟ چناں چہ حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ: میری والدہ بڑی سمجھ دار تھیں، فرمانے لگیں: کہ بیٹا! تم اللہ ہی کی چیز تو ہو، میں خوشی سے اللہ کے سپرد کرتی ہوں، اور اسی کے ساتھ ایمان و یقین کے گھرانے کی اس خاتون نے اپنے اکلوتے جوان بیٹے سے خطاب کر کے کہا کہ: اگر تم زندہ آ گئے، تو میں تم سے مل لوں گی، نہیں تو آخرت میں ان شاء اللہ! ملنا ہوگا۔

والدہ ماجدہ سے اجازت طلبی کے بعد آپ والد محترم کے پاس اجازت لینے کی غرض سے حاضر ہوئے، اور نہایت انکساری ونرمی سے اس عزم کو ظاہر کیا۔ والد صاحب ہچکچائے اور اجازت دینے میں تامل کیا؛ مگر آپ نے ”لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ“ پرعمل فرمایا، اور اپنے والد کے سامنے سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے کہ بندہ رخصت ہوتا ہے، اور جہادی مرکز تھانہ بھون پہنچ گئے۔

مجاہدین کا پہلا حملہ:

چند فوجی سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسیں لدوائے سہارن پور سے کیرانہ کی طرف جارہے تھے۔ تھانہ بھون میں جو لوگ جہاد کے لیے تیار ہو کر جمع تھے، تمام کے تمام سمٹ کر باغ شیر علی کی سمت سڑک پر جا پڑے، اور جس وقت سوار سامنے سے گزرا، اس کا اسباب لوٹ لیا۔ ایک سوار اسی جنگ میں زخمی ہو کر مشرق کی سمت جنگل کو بھگا؛ مگر تھوڑے فاصلے پر گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ یہ تھانہ بھون کے مجاہدوں کی پہلی کامیابی تھی۔

شاملی کی جنگ:

تھانہ بھون سے چند میل کے فاصلے پر قصبۂ شاملی پڑتا ہے، اس قصبے میں چھوٹی سی گڑھی تھی، جو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ انگریزوں کی فوج اسی گڑھی میں قلعہ بند تھی۔ باغ شیر علی والے ہنگامے کی خبر جب ضلع میں پہنچی، تو حاکم ضلع کی طرف سے تھانہ بھون کو فوج کشی کا حکم ہو گیا، اور شاملی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کا نقارہ بجا دیا گیا۔ مسلمانوں کو جب یہ خبر پہنچی، تو سرفروشانِ دین سروں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر ایک منظم طاقت سے ٹکرانے کے لیے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے، اور تھانہ بھون سے شاملی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ حضرت نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا حافظ ضامن علی شہیدؒ، مولانا محمد منیر نانوتویؒ بہ نفسِ نفیس اس یورش میں شریک تھے۔

اِدھر حضرت نانوتویؒ شاملی کی طرف روانہ ہوئے، اُدھر نواب شیر علی خاں مرادآبادیؒ حضرت نانوتویؒ کے معتقد اور بادشاہِ دہلی کے مصاحب خاص اور معتمد علیہ تھے۔ حضرت نانوتویؒ نے ان کی معرفت بادشاہ دہلی، یعنی ظفر شاہ کو جنگ پر آمادہ کیا۔ غرض یہ تھی کہ بادشاہ انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت استعمال کر کے دلی کو ان سے پاک کرنے کی سعی کرے، اور ہم تھانہ بھون اور شاملی سے جہاد کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھیں۔ اگر صحیح اُصول پر دونوں طرف سے یہ حملہ دفاع عمل میں لے آیا گیا، تو دہلی کا آزاد ہونا عین ممکن ہے۔ تھانہ بھون سے جس وقت یہ مجاہدوں کا دستہ شاملی کے ارادے سے روانہ ہونے لگا، تو وقت اور مقام کے امیر المؤمنین حضرت حاجی امداد اللہ علیہ الرحمہ نے مولانا محمد منیر صاحبؒ جن کو اس جہادی تنظیم میں (یاورِ

حربی) کا عہدہ دیا گیا تھا، خصوصیت کے ساتھ مخاطب ہو کر حاجی امداد اللہ علیہ الرحمہ نے وصیت کی تھی کہ مولانا نانوتویؒ بالکل آزاد اور جری ہیں، صف میں بے حجابانہ گھس جاتے ہیں؛ اس لیے کسی وقت آپ ان کا ساتھ نہ چھوڑیں۔

آپ کی ہدایت کے مطابق مولانا محمد منیرؒ فرماتے ہیں کہ: مولانا نانوتویؒ کے پس پشت بہ طور محافظ میں اس طرح رہتا تھا کہ حضرت نانوتویؒ کو احساس نہ ہو کہ وہ ان کی محافظت کر رہے ہیں۔ مولانا محمد منیرؒ ہی فرماتے ہیں کہ: اس ہنگامۂ حشر خیز میں حضرت نانوتویؒ میدانِ جنگ کے ایک کنارے پر دم لینے کے لیے کھڑے تھے کہ انگریزی فوج کا ایک سپاہی جو صورتاً سکھ معلوم ہوتا تھا، اور ڈیل ڈول میں اتنا طویل وعریض تھا کہ حضرت نانوتویؒ جیسے آدمی اس میں کئی بن جاتے۔ انگریزی فوج کے اس سپاہی نے حضرت نانوتویؒ کو میدان کے کنارے کھڑا پا کر دور سے تاکا اور غصے میں لپک کر اس طرف آیا، اور حضرت نانوتویؒ کا ڈانٹا اور کہا کہ تم نے بہت سر اٹھا رکھا ہے۔ اب آ، میری ضرب کا جواب دے۔ اسی کے ساتھ تلوار جو اس کے ہاتھ میں تھی، اس کو بلند کرتے ہوئے چلایا کہ یہ قبضہ تیرے لیے موت کا پیغام ہے۔

یہ فقرہ ابھی تمام نہیں ہوا تھا کہ دیکھا گیا کہ دودھارا قبضہ پوری قوت سے اٹھا کر حضرت نانوتویؒ پر چلانا چاہا تھا کہ حضرتؒ کے زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری ہوئے کہ: باتیں کیا بنا رہا ہے، اپنے پیچھے کی خبر لے۔ کچھ ایسے لہجے میں یہ بات اس کے کان میں پڑی کہ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا، اس کا مڑنا تھا کہ مولانا بجلی کی طرح مڑے، مڑنے کے بعد آپ کی طرف رخ کرنے کا موقع بھی نہیں ملا کہ حضرت نانوتویؒ نے وار اتنی قوت سے کیا کہ تلوار دائیں مونڈھے کو کاٹ کر گزرتی ہوئی بائیں پہلو پر آ کر رکی۔ دیکھا گیا تو اس سپاہی کا عفریتی جسد اس طرح خاک پر پڑا ہوا تھا کہ سر سے پیر تک دو پارہ ہو کر آدھا اِدھر آدھا اُدھر گرا ہوا تھا۔ اس غیر معمولی کامیابی نے چستی اور چالاکی کی کئی گنی قوت آپ میں بھر دی، اور آپ بے باکی، لاپرواہی سے پاؤں رکھتے ہوئے صفِ قتال میں آ گئے۔

شاملی گڑھی کا محاصرہ:

جنگ میں انگریزی فوج کو شکست فاش ہوئی۔ شکست کے بعد انگریزی فوج کے آدمی شاملی کی گڑھی میں چھپ گئے اور مجاہدوں نے گڑھی کا محاصرہ کر لیا۔ گڑھی کھلے میدان میں واقع تھی۔ سوائے ایک چھوٹی سی مسجد کے جو اسی سمت میں تھی کوئی اور چیز نہ تھی کہ جسے باہر والے آڑ بنا سکیں۔ مسجد کا پھاٹک گڑھی کی طرف تھا، جسے انگریزی فوج کے آدمیوں نے بند کر دیا تھا، اور اِدھر باہر تھانہ بھون کے بے پناہ مجاہدین پتنگوں کی

طرح میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان پر انگریزی فوج کے بندوق چی دیوار کی آڑ لے کر تابڑتوڑ گولیاں برسا رہے تھے۔ اس مختصر سی مسجد کے علاوہ غریب مجاہدین کو گولیوں سے بچنے کی کوئی اور جگہ نہ تھی، جس کی وجہ سے سیکڑوں مجاہدین شہید ہو گئے۔

تدبیریں سوچی جاتی تھیں؛ لیکن کوئی تدبیر اس وقت کارآمد نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت اپنے ہوش وحواس کے توازن کو قائم رکھتے ہوئے مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ایک غیر معمولی جرأت آزما اقدام کا عزم مصمم کرلیا۔ مسجد سے مولاناؒ کی نظر اس چھپر پر پڑی جو مسجد کے دروازے کے قریب تھا اور اچانک ایک جنگی چال کا الہام ہوا کہ اس چھپر تک پہنچنے کی کوئی صورت نکل آئے، تو اس کو نکال کر دوازے کے کواڑوں پر رکھ دیا جائے اور پھر اس میں آگ لگا دی جائے، جس سے کواڑ بھی جل جائیں گے، اور گڑھی میں گھسنے کا موقع بھی نکل آئے گا؛ لیکن انگریزی فوج کے سپاہی گڑھی کی دیواروں پر اور ان کی آڑ میں پوری نگرانی کرر ہے تھے کہ گڑھی کے دروازے تک کوئی پہنچنے نہ پائے، اگر کوئی پہنچنے کی کوشش کرتا، تو نظر پڑتے ہی اس پر گولیاں برسانے لگتے۔ ایسی صورت میں چھپر تک پہنچنا اور اس کو اکھاڑ کر دروازے کے کواڑوں تک لا ملانا بڑا مشکل کام تھا؛ مگر جن کی ہمتیں بلند اور ارادے بالا ہوتے ہیں، وہ انہیں نازک مواقع پر اپنے جوہر دکھاتے ہیں۔ چناں چہ مولانا محمد قاسم علیہ الرحمہ اس آتشیں تجویز پر عمل کرنے کے لیے تنہا آمادہ ہو گئے، اور دیکھا گیا کہ کوندتی ہوئی بجلی کی طرح گولیوں کی بوچھاڑ کے درمیان سے نکلتے ہوئے چھپر تک جا پہنچے اور اسے آگ لگادی۔ ان جلتے ہوئے کواڑوں کو بجھانے کی ہمت محصور فوجیوں کو نہ ہوئی۔ کواڑ جل کر راکھ ہو گئے اور مجاہدین کے لیے دروازہ کھل گیا۔ یلغار کرتے ہوئے مجاہدین گڑھی کے اندر گھس گئے اور جنگ ہونے لگی۔ فتح مجاہدین کے حق میں آئی اور انگریزی فوج نے ناکامی کا منہ دیکھا اور شاملی پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔

حضرت حافظ ضامنؒ کی شہادت:

مجاہدین کا جو دستہ شاملی پر حملہ کرنے کے لیے تھانہ بھون سے روانہ کیا گیا تھا، اس کے امیر حضرت ضامن علیہ الرحمہ تھے۔ جب شاملی گڑھی کا دروازہ کھلا، اور مجاہدین کو اندر گھس کر انگریزی فوج سے لڑنے کا موقع ملا، تو حضرت ضامن علیہ الرحمہ کو بہ حیثیت امیر اندر آنے والے مجاہدین اور باہر کے مجاہدین کی نگرانی کے لیے اندر سے باہر اور باہر سے کبھی اندر مسلسل آمد ورفت جاری رکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اسی سلسلے میں جب آپ گڑھی کے کھلے میدان کی طرف رخ کیے کھڑے تھے کہ کسی سپاہی نے گڑھی کی فصیل سے تاک کر ایسی گولی چلائی کہ آپ کی ناف پر لگی، جس کی وجہ سے آپ زمین پر گر گئے؛ مگر اس وقت

بھی اتنا ہوش تھا کہ بہ ہیئت تشہد قبلہ رخ زمین پر بیٹھ گئے، آس پاس کے لوگ دوڑے اور حضرت کو یہی کہتے پایا: ''مجھے مسجد لے چلو، مجھے مسجد لے چلو''۔

قال الشاعر: ؎

ذکرتک والخطي يخطر بيننا
وقد نهلت منا المثقفة السمر

''اے میرے محبوب! میں نے تجھے اس وقت بھی یاد کیا، جب کہ خطی نیزے ہمارے درمیان چل رہے تھے، اور ہم ہی سے مضبوط گندم گوں نیزے سیراب ہو رہے تھے''۔

حضرت حافظ صاحبؒ کے اس حکم کی تعمیل کا موقع سب سے پہلے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو ملا۔ آپ لپک کر تڑپتی نعش کو کاندھے پر اٹھا کر مسجد میں لے آئے، اور حضرت حافظ صاحبؒ کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تلاوتِ قرآن میں مصروف ہو گئے۔ حضرت مولانا رشید احمدؒ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور زبان پر کلام اللہ، یہاں تک کہ حافظ صاحبؒ علیہ الرحمہ کا آپ کے سامنے وصال ہو گیا۔ اِنَّا للهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ!

مولانا محمد قاسم صاحبؒ:

شاملی کے انہیں ہنگاموں میں حضرت نانوتویؒ کو پٹ پُری پر جو انتہائی نازک مقام تھا گولی لگی تھی، اس سے داڑھی کے کچھ بال بھی جل گئے۔ لوگوں نے سمجھا کہ شہید ہو گئے؛ مگر اک دم ہمت سے اٹھے اور چہرے پر ہاتھ پھیرا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

حضرت مولانا گیلانی نے مولانا محمد یعقوب علیہ الرحمہ کی کتاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ: ایک بار گولی چل رہی تھی، یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، جس نے دیکھا جانا گولی لگی، ایک بھائی دوڑے، پوچھا: کیا ہوا؟ فرمایا: گولی لگی۔ عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا: گولی کا کہیں نشان نہ ملا، اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔

مولاناؒ نے مصنف مذکور ہی کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہیں ایک نے منہ در منہ بندوق ماری، جس کے سنبھے سے ایک مونچھ اور داڑھی مولانا نانوتویؒ کی جل گئی اور کچھ آنکھ کو صدمہ پہنچا، اور خدا جانے گولی کہاں گئی؛ مگر حفاظت الٰہی بر سر تھی، کچھ اثر نہ ہوا۔ (ص ۳۷)

تھانہ بھون کی بربادی:

جس وقت گورنمنٹ کو شاملی کی انگریزی فوج کے مارے جانے اور خزانے کے لوٹے جانے کی اطلاع ملی، تو مظفر نگر کا کلکٹر شاملی پہنچا اور چاروں طرف لاشوں اور قصبے کی ویرانی دیکھ کر غصے سے تھرا اٹھا، اور اسی

ارتعاشی حال میں کہا کہ تھانہ بھون کو بھی اسی طرح مسمار کر کے چھوڑوں گا۔

اِدھر شاملی کو دیکھ کر مظفر نگر کا حاکم واپس ہوا کہ دلی کی فتح کی خبر بھی عام ہوئی، اسی درمیان میں سرکاری گوئندوں نے حکومت تک یہ خبر پہنچائی کہ تھانہ بھون کے جہاد میں اصل الاصول امیر المؤمنین حضرت حاجی امداد اللہ اوران کے رفقا مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی علیہم الرحمہ وغیرہم حضرات تھے۔

مظفر نگر کا حاکم شاملی کے انتقامی غصے کی آگ میں جل بھن رہا تھا کہ دلی کی فتح کی خبر سنتے ہی اپنے زیر اقتدار فوجیوں کے دستے کو تھانہ بھون کی طرف مارچ کرنے کا حکم دے دیا۔ صبح ہوتے ہی تھانہ بھون کو سرکاری فوج نے گھیر لیا اور مشرقی جانب سے گولہ باری شروع کر دی۔ قصبے والوں کی طرف سے جوابی فائر ہونے لگے؛ لیکن ان غریبوں کے پاس گولہ بارود اتنا کہاں تھا، جو انگریزوں کی توپوں اور گولہ بارود کے ذخیروں کا مقابلہ کرتے۔ بالآخر قصبے والے چند گھنٹوں سے زیادہ نہ ڈٹ سکے۔ دن نکلنے پر فوج قصبے میں داخل ہوگئی اور قتل وقتال، لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ رات کی تاریکی کے چھانے سے پہلے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے اڑا دیے گئے اور مکانات پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دی گئی۔

مولانا محمد قاسمؒ کے نام وارنٹ:

شاملی کے جہاد میں حضرت مولانا محمد قاسم علیہ الرحمہ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حاجی امداد اللہؒ وغیرہم کے اصل الاصول ہونے کی خبر جب حکومت میں دے دی گئی، تو فوراً ان تینوں حضرات کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے، اور گرفتار کرنے والوں کے لیے انعام مقرر کر دیا گیا؛ اس لیے لوگ ان حضرات کی تلاش میں تگ ودو کرنے لگے۔

جب حضرت مولانا محمد قاسم علیہ الرحمہ ڈھونڈے جانے لگے، تو خدام نے عرض کیا کہ: حضرت! روپوش ہو جائیں، یہ کوئی توکل کے خلاف نہیں۔ حضرت نانوتویؒ اپنی فطری شجاعت اور ہمتِ قلب کی وجہ سے کھلے بندوں پھرتے تھے؛ مگر جب روپوشی کے مشورے دینے والوں کا اصرار حد سے زیادہ بڑھ گیا، تو اپنی سسرال کے عالی شان مکان ''دیوان'' میں روپوش ہو گئے، اور تین دن پورے ہوتے ہی اک دم باہر نکل آئے۔ لوگوں نے پھر بہ منت روپوشی کے لیے عرض کیا، تو مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے جواب دیا کہ تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنت سے ثابت نہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غارِ ثور میں تین ہی دن روپوش رہے۔

جب مولاناؒ مکان سے باہر نکلے، تو حکومت میں مخبروں نے خبر کر دی، اور مکان کی تلاشی ایسے وقت میں

لی گئی، جب کہ مولانا مکان کے احاطے سے باہر آ چکے تھے؛ لیکن اس کے بعد دیوان والوں کا گھر مخبروں کی نظروں میں چڑھ گیا تھا۔

مولانا کی چھتہ کی مسجد میں تلاشی:

تین دن مکان میں روپوش ہونے کے بعد آپ باہر نکل آئے اور چھتہ کی مسجد میں رہنے لگے۔ مخبروں نے حکومت کو مطلع کر دیا کہ مولانا نانوتویؒ چھتہ کی مسجد میں ہیں۔ چناں چہ مسجد کا محاصرہ کر لیا گیا اور کپتان مسجد میں آیا، تو حضرتؒ مسجد میں ٹہل رہے تھے۔ کپتان نے مولانا ہی سے پوچھا کہ مولانا محمد قاسم کہاں ہیں؟ تو حضرت نے ایک قدم ہٹ کر فرمایا کہ ابھی یہیں تھے، دیکھ لیجیے!

کپتان دیکھ بھال میں مصروف ہوا، اور اُدھر حضرت نانوتویؒ غایت اطمینان سے مسجد سے باہر نکل آئے، اور پولیس کے درمیان سے گزرتے ہوئے دوسری قریب کی مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ کپتان مسجد سے ناکام نکلا اور حضرت کو دیکھتے ہوئے کہا کہ مولانا تو یہی معلوم ہوتے ہیں۔ چناں چہ جس مسجد میں آپ گئے، اس کا بھی محاصرہ کر لیا گیا، پھر حضرت نانوتویؒ مسجد سے نکل کر تیسری مسجد میں چلے گئے۔ غرض یہ کہ حضرتؒ کے لیے خدا کی حفاظت شامل حال رہی اور پولیس آپ پر قابو نہ پا سکی۔

موضع چکوالی میں مولانا نانوتویؒ کا قیام:

چوں کہ پولیس والے آپ کی جستجو اور تلاش میں ہمیشہ محو رہتے تھے، ان کے نسبتی بھائی شیخ نہال احمدؒ رئیس دیوبند نے مجبور کیا کہ آپ کچھ دن ہمارے گاؤں موضع چکوالی میں قیام فرمائیں۔ جب حضرتؒ نے شیخ نہال احمد صاحبؒ کو اس پر زیادہ مصر پایا، تو چکوالی میں قیام کرنا قبول کر لیا؛ مگر زیادہ دن تک آپ اس گاؤں میں قیام نہ کر سکے اور مخبر نے آپ کے قیام کی خبر گورنمنٹ کو دے دی اور پولیس نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ شیخ نہال احمدؒ چوں کہ مولانا کو اس گاؤں میں لائے تھے؛ اس لیے نہایت خائف و ہراساں اور پریشان ہو گئے۔ شیخ کی پریشان حالی کو دیکھ کر حضرت نانوتویؒ نے ذرا سخت لہجے میں فرمایا: ”آپ تو خوف زدگی اور سراسیمگی کی صورت بنا کر مجھے پکڑوا کر رہیں گے، آپ مطمئن رہیں، میں اپنی حفاظت خود کر لوں گا“۔

مولانا نانوتویؒ گھر سے باہر نکل آئے اور سامنے پولیس کا کپتان کھڑا دیکھ کر مطمئن ہو کر کہا: آیئے آیئے! تشریف لایئے۔ اس کے بعد مولاناؒ نے چائے تیار کرائی اور کپتان کو پلائی۔ کپتان آپ سے مانوس ہو کر پوچھتا ہے کہ آپ مولانا محمد قاسم صاحب سے واقف ہیں؟ مولانا نے جواب میں کہا: جی ہاں! میں ان کو خوب جانتا ہوں۔ اس پر کپتان نے کہا: ہم زنانہ مکان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں؟ مولانا نے خندہ پیشانی سے فرمایا: ”شوق

سے تلاشی لے سکتے ہیں''۔

کپتان اندر داخل ہوا، اور مکان کے ہر حصے کی تلاشی لی، مولانا بھی کپتان کے ساتھ تلاشی میں شریک تھے۔ کپتان اپنے مقصد میں ناکام ہوکر'' چکوالی'' سے رخصت ہوا، اور خبر دینے والوں پر غضب ناک ہوا کہ تم غلط خبریں دیا کرتے ہو۔ کپتان کے رخصت ہونے کے ساتھ ساتھ حضرتؒ نانوتہ رخصت ہو گئے۔ کپتان کو معلوم ہوا کہ مولانا تو یہی تھے۔ پولیس کو نانوتہ کی طرف مارچ کرنے کا حکم دے دیا۔ مولانا کو اس کی اطلاع ہوئی، تو دوسرے راستے سے دیو بند پہنچ گئے۔ پولیس کے آدمی دیو بند آئے، اور مولانا کی تلاشی لی؛ مگر ناکام رہے۔

اِدھر تو حضرت مولانا محمد قاسم علیہ الرحمہ دیو بند، چکوالی، نانوتہ کے ایرے پھیرے میں تھے، اور آپ کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ علیہ الرحمہ ان ہی دنوں حرمین کی نیت سے گھر (تھانہ بھون) سے باہر نکل چکے تھے، اور چوں کہ آپ کے نام بھی وارنٹ گرفتاری تھا؛ اس لیے چند ماہ انبالہ، تگری، پنج لاسہ وغیرہ مواضع قصبات میں اپنے آپ کو چھپایا، اور آخر کار سندھ اور کراچی کے راستے سے عرب کا راستہ اختیار کیا؛ اس لیے حضرت مولاناؒ بھی جیسا کہ ''سوانح قاسمی'' میں لکھا ہے کہ اپنے پیر و مرشد کی زیارت کی غرض سے دیوڑیہ، گمتھلہ، لاڈویہ، پنج لاسہ، جمنا پار کئی بار آئے گئے۔

معافی نامے کا اعلان:

یکم اکتوبر ۱۸۵۸ء میں بہ مقام الہ آباد لارڈ کیننگ نے ملکہ وکٹوریہ کے اس معافی نامے کو پڑھ کر سنایا، جس کے بعد سمجھا جاتا تھا کہ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے شرکا کو چھوڑ دیا گیا۔ ہاں ایسے لوگ:

۱- جنہوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو پناہ دی ہو،

۲- جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے ہوں،

۳- جنہوں نے ترغیب بغاوت کی دی ہو۔

ان کے متعلق ملکہ وکٹوریہ کے معافی نامے میں یہ لکھا تھا کہ ان کی نسبت صرف وعدہ ہو سکتا ہے کہ ان کی جان بخشی ہوگی؛ لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں ان سب احوال پر جن کے اعتبار سے یہ اپنی اطاعت سے پھر گئے، کامل غور کیا جائے گا۔ ایسی صورت میں حضرت حاجی صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی علیہم الرحمہ کے لیے اس اعلان میں آزادی نہیں؛ بلکہ ابھی ہٹے تلے رہنے کا انتباہ تھا اور یہ ۱۸۶۰ء تک باقی تھا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۹ء تک ہندوستان میں حکومت کی اسی تیز نظر کے نیچے گزار کر

۱۸۶۰ء؍ میں آپ حج کے لیے روانہ ہوئے۔تو جہاد کی جس مہم کا آغاز ۱۸۵۷ء؍ میں ہوا تھا، آپ ستاون، اٹھاون، اُنسٹھ، ساٹھ؛ بلکہ بعد زیارت حرمین شریفین سے ایک برس کچھ کم و زیادہ میں وطن آئے، یعنی ۱۸۶۱ء؍ میں واپسی ہوئی۔ گویا پانچ سال تک مسلسل بغیر کسی انقطاع کے جہاد میں مشغول رہے۔(سوانح قاسمی)

پادری تاراچند سے مباحثہ:

مسلمانوں کے دورِ اقتدار ختم ہونے کے بعد پادری بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں پہنچ کر دوسروں کے دین ومذہب پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔

ان ہی دنوں دہلی میں بھی پادریوں کے لیکچروں کا چرچا تھا، اور مسلمانوں میں سے بعضے بے چارے اپنی ہمت سے ان کا مقابلہ کرتے؛ مگر کوئی اہل علم جن کا یہ کام تھا، اس طرف توجہ نہیں دیتا تھا؛ لیکن حضرت نانوتویؒ کے سینے میں جو دل تھا، جب تک وہی دل اور دل کا وہی درد کسی میں نہ ہو، اندازہ نہیں کرسکتا کہ حضرتؒ پر پادریوں کی ان باتوں کو سن سن کر کیا گزرتی تھی۔ اگر یہ منہ لگانے کے لائق ہوتے، تو خود ہی آپ میدان میں اتر آتے۔ آخر کار جب ضبط کا یارا نہ رہا، تو آپ نے اپنے شاگردوں کو فرمایا کہ تم بھی بازار میں کھڑے ہوکر کچھ بیان کیا کرو، اور جو مسلمان نصاریٰ کے مقابلے میں بیان کرتے ہیں، ان کی امداد کیا کرو۔ چناں چہ شاگردوں نے بھی پادریوں کے مباحثے میں حصہ لینا شروع کردیا۔

اسی زمانے میں ایک کالے پادری ماسٹر تاراچند کی دلّی میں خاصی شہرت تھی، مشہور ہوا کہ عیسائیوں کی وکالت ماسٹر تاراچند صاحب ہی کریں گے۔ اس خبر سے لوگوں میں تشویش پیدا ہوگئی اور کسی وجہ سے اس مباحثے کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی، تو آپ کو مناظرے میں شرکت پر مجبور کیا گیا، تو آپ پادری تاراچند سے گفتگو پر آمادہ ہوگئے؛ مگر شرط یہ ٹھہری کہ تاراچند کو میرے نام اور میری شخصیت کا علم نہ ہو، اور نہ عوام کو۔ میں ایک عامی مسلمان کی حیثیت سے حاضر ہوجاؤں گا اور جو کچھ سمجھ میں آئے گا، عرض کروں گا۔لہٰذا مباحثہ طے پایا اور حضرت مولانا نانوتویؒ عامی کی شکل وصورت بنائے مجلس میں حاضر ہوگئے۔ چناں چہ پادری تاراچند سامنے آیا، اور رٹے رٹائے اعتراضات کا آموختہ سنانے لگا۔ آپ نے اپنی غیر معروف شخصیت اور معصوم صورت کے ساتھ جوابی تقریر کی۔ جب تقریر ختم کی تو مجلس میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور تاراچند آپ کی تقریر سن کر مجلس سے چل نکلا۔

میلۂ خداشناسی اور مولانا نانوتویؒ:

پادری نولس انگلستانی شاہ جہان پور مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ماسٹری کے علاوہ قریب آس پاس

میں مشن کا کام انجام دیتے تھے۔

شاہ جہاں پور سے متصل قصبہ چاندا پور اسی سلسلے میں پادری نولس جایا کرتے، اور وہاں وعظ کہا کرتے تھے۔ وہاں کے ایک خوش حال باشندے منشی پیارے لال کبیر پنتھی ان کی تقریروں میں شریک ہوا کرتے۔ رفتہ رفتہ پادری صاحب اور منشی پیارے لال کے درمیان تعارف ہوا، اور میل مراسم بڑھ گئے:۔

رفتہ رفتہ دو دلوں میں واسطہ بڑھتا گیا
گاہے گاہے کی ملاقاتیں جواں ہوتی گئیں

یہاں تک کہ منشی پیارے لال کی رسائی پادری صاحب کے توسط سے حکام تک ہونے لگی اور پادری صاحب کی صحبت نے منشی جی کو اتنا تو ضرور متأثر کردیا تھا کہ اگر عیسائیت کو قبول نہیں کرسکے، تو اپنے آبائی دین کو بھی اب کچھ پختہ نہیں سمجھتے تھے۔

الغرض پادری نولس کی تحریک اور منشی جی کے احباب کے مشورے سے یہ تجویز طے پائی کہ چاندا پور کے متصل منشی جی کی زمین داری میں ایک گاؤں ''سارنگ پور'' نامی ہے، وہاں منشی جی کی مملوکہ زمین اور باغات ہیں، جن کے درمیان ایک ندی بہتی تھی، اس ندی کے کنارے ایک میلہ کیا جائے، جس کا نام ''میلۂ خداشناسی'' ہو، جس میں ہر مذہب وملت کے لوگ جمع ہوکر مذہب کی تحقیق میں مناظرہ ومباحثہ کریں۔ چناں چہ پہلی مرتبہ میلہ دو روز رہا، تو جہاں اس میلے میں دوسرے مذاہب کے نمائندے تھے، ان میں مسلمانوں کے نمائندوں کی تعداد بھی تقریباً بیس بتائی جاتی ہے۔

اس سلسلے میں پرلطف بات یہ ہے کہ یہ میلہ اپنے عنوان ہی سے شہرت پذیری کی کافی ضمانت رکھتا تھا، پھر باضابطہ اشتہارات اور اخبارات کے ذریعے اگر پورے ہندوستان میں نہ سہی؛ مگر یوپی میں تو ضرور اس کا علان ہوجاتا تھا۔

جب اس میلے کے انعقاد کی خبر حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کو پہنچی، تو اپنے عزیز مولوی محمد منیر صاحبؒ کو (جو اس زمانے میں بریلی رہتے تھے) لکھا کہ کیفیتِ مناظرہ اور محل نزاع سے مطلع کیجیے۔ مولوی محمد منیر صاحبؒ نے غایت احتیاط سے کام لیتے ہوئے شاہ جہاں پور کی پولیس کے انسپکٹر مولوی عبدالحی نامی سے اس کی تفصیل پوچھی، تو انسپکٹر صاحب نے جواب دیا کہ یہ قصہ بے اصل ہے، علما کے آنے کی کچھ حاجت نہیں۔

اور ادھر میلے کے انعقاد کی خبر مشتہر ہوتے ہی شاہ جہاں پور کے مسلمانوں نے حالات کی نزاکت کا اندازہ کیا اور مولانا نانوتویؒ کو واقعے کی نوعیت سے مطلع کرتے ہوئے قدم رنجہ فرمانے کی زحمت دی تھی،

اور دوسرے ذرائع سے بھی آپ تک خبریں پہنچ رہی تھیں۔ جب شاہ جہاں پور کے مسلمانوں کا دعوت نامہ پہنچا، تو آپ نانوتہ سے پیدل چل پڑے۔ ایک رات دیوبند، مظفر نگر، میرٹھ میں گزارتے ہوئے دہلی پہنچے، جہاں آپ کو انسپکٹر مولوی عبدالحی صاحب کا پیغام ملا کہ علما کے آنے کی حاجت نہیں۔

اس پیغام کی وجہ سے آپ کا ارادہ سست ہوگیا؛ لیکن از روئے احتیاط شاہ جہاں پور خط لکھا، جس میں واقعی کیفیت مطلوب تھی اور ادھر میلے کے انعقاد ہونے کو کل تین دن رہ گئے تھے؛ اس لیے شاہ جہان پور سے لوگوں نے تار دیا کہ آپ جلد آئیں۔ اس تار کے آجانے کے بعد آپ کے ارادے میں پختگی آ گئی، اور آپ گیارہ بجے ریل میں سوار ہو کر بہ روز شنبہ (ہفتہ) ٦ رمئی ١٨٧٧ء کو عصر بعد شاہ جہان پور پہنچ گئے۔ رات تو شاہ جہان پور سرائے میں اپنے شاگرد رشید مولانا محمود حسنؒ کے ساتھ گزاری، پھر صبح کی نماز پڑھ کر پیدل ہی چاندا پور جہاں میلہ منعقد ہونے والا تھا، پہنچ گئے۔

میلۂ خدا شناسی کا ایک مقصد مذاہب کی تحقیق بتائی جاتی ہے۔ چناں چہ ہر مذہب کے لوگ میلے میں جمع ہوئے اور مباحثے کے لیے تین فریق ہندو، مسلمان، عیسائی قرار پائے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ جب میلے کا مقصد حق مذہب کی تحقیق تھی، تو ہر فریق دوسرے فریق سے مذہب کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتا؛ مگر ایسا نہیں ہوا؛ بلکہ ہندو، عیسائی دونوں فریق کا رخ مذہب اسلام کے ماننے والوں کی طرف تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے جہاں اور لوگ وہاں نمائندگی کرنے کی حیثیت سے بلائے گئے تھے، انہیں میں ایک بہ ظاہر انجان اور پوشیدہ شخصیت حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کی تھی، جو مجلس مباحثہ اور مجلس سے باہر اسلام کی حقانیت پر تقریریں کرتے رہے، اور اپنے ساتھیوں سے بھی یہ کہہ دیا کہ ہر جگہ جا جا کر اسلام کی حقانیت وصداقت پر وعظ وتقریر کریں۔

حضرت مولانا نانوتویؒ کے مخالفین کے دندان شکن جوابات اور حق آگاہ تقاریر سے جس حد تک بھی لوگ متاثر ہوئے ہوں، تو ان کے متعلق پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ مولانا گیلانیؒ ایک حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”ہر کوئی ہمہ گوش ہو کر حضرت مولاناؒ کی جانب تک رہا تھا۔ کسی کی آنکھوں میں آنسو، کسی کی آنکھوں میں حیرت۔ پادریوں کی یہ حالت تھی کہ ششدر و بے حس وحرکت۔ قصہ کوتاہ مولوی محمد قاسم صاحبؒ کی خوش بیانی اور پادری صاحب کی افسردگی قابلِ دید تھی“[1]۔

نولس صاحب اور اسکاٹ صاحب جو یورپین نژاد پادری تھے، ان کے متعلق لکھا ہے کہ نولس صاحب نے رخصت ہوتے وقت حضرت والاؒ سے کہا کہ: میں آپ کے اخلاق سے بہت خوش ہوا، پھر نام ونشان

(١) سوانح قاسمی بہ حوالہ میلۂ خدا شناسی۔

مکان پوچھا، اور اسکاٹ صاحب کہتے تھے کہ اس شخص کی باتیں بہت ٹھکانے کی ہیں، یہ مولوی نہیں یہ صوفی مولوی ہے۔

بسا اوقات پادریوں نے یہ کوشش کی کہ حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کی تقریروں کو مکمل نہ ہونے دیا جائے۔ پادری نولس نے تو یہ حد کردی کہ پہلے میلے کے پہلے اجلاس ہی میں آپ کے رنگ و ڈھنگ کو دیکھ کر وہ اس دیدہ دلیری پر اتر آیا کہ دوسرے دن کا اجلاس جب شروع ہوا، اور حضرت مولاناؒ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ: پادری صاحب کے ذمے ہمارے کل کے اعتراضات باقی ہیں۔

پادری نولس نے جواب میں کہا کہ کل کی بات کل کے ساتھ گئی۔

اسی طرح دوسرے میلے کے موقع پر کہنے والوں نے کہا کہ دو چار منٹ چار بجنے میں باقی ہیں، تو انہیں میں ہم کچھ کہہ لیں گے؛ مگر پادریوں نے ایک نہ سنی۔ سراسیمگی اور پریشانی میں اپنی بعض کتابیں بھی چھوڑ گئے۔ ان کے اٹھانے کا انہیں ہوش نہ رہا، اور برہمی پیدا کرنے کے لیے جلسے میں شور برپا کردیا۔

یہ پادریوں کا حال تھا؛ مگر اس سے کچھ کم ہندوؤں کا حال نہ تھا۔ ہندو مذہب کے نمائندے پنڈت دیانند سرسوتی اور پنڈت اندرمن کی نسبت مجلس کے برخاست ہوجانے کے بعد ایک شخص نے آکر مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے کہا کہ آپ کی یہ دونوں بہت تعریف کرتے تھے۔

مباحثہ شاہ جہاں پور کے حوالے سے مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں:

> ''باہر آتے ہی مولانا نانوتویؒ کے گرد ایک ہجوم تھا، ہندو مسلمان سب گھیرے کھڑے تھے، مسلمانوں کی اس وقت جو کیفیت تھی، سو تھی؛ مگر ہنود بھی کچھ کم متاثر نہ تھے۔ جس راستے سے گزرتے، ہندو آپ کی طرف اشارہ کرکے کہتے کہ: یہ ہیں، اور جب آپ میلے سے لوٹے اور شاہ جہاں پور کے بازاروں سے گزر رہے تھے، تو ہندو دکان داروں کی انگلیاں اٹھتی تھیں''[1]۔

رُڑکی میں پنڈت دیانند سرسوتی کا فرار:

آپ ۱۸۷۷ء میں مارچ کے مہینے میں شہاجہاں پور میلے میں دوسری بار تشریف لے گئے، پھر وہاں کی بحث وتمحیص اور مباحثے سے فارغ ہوئے، تو اسی سال اکتوبر کے مہینے میں تیسری بار زیارت بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، اور ۱۸۷۸ء مارچ کے مہینے میں ہندوستان واپس تشریف لائے۔

مکہ اور جدہ کے درمیان آپ پر اس مرض کا حملہ ہوا، جو آپ کی ناسوتی زندگی کی گویا آخری علامت تھی۔

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: سوانح قاسمی۔

خیر کسی طرح آپ کو ہندوستان آنے والے جہاز پر سوار کر دیا گیا۔ ایک دن تو یہ نوبت آئی کہ آپ کے اصحاب آپ سے مایوس ہو گئے۔ وطن پہنچنے کے بعد بھی آپ زیر علاج رہے، صحت کلی تو حاصل نہ ہوئی؛ بلکہ کبھی کبھی دورہ سانس کا ہوتا، زیادہ بولنا، دیر تک کچھ فرمانا مشکل ہو گیا۔

آپ ان ہی حالات میں تھے کہ ۱۲۹۵ھ/مطابق ۱۸۷۸ء/ماہ جولائی میں پنڈت دیانند سرسوتی نے رُڑکی میں آ کر سر بازار اسلام پر چند اعتراضات کیے۔ جس کی وجہ سے رڑکی کے مسلمان پریشان ہوئے، اور آپ کو رُڑکی آنے پر مجبور کر دیا۔ مسلمانوں کی طلبی اور دین وملت کی حمیت وغیرت نے مولانا کو اس ضعف ونقاہت میں بھی رڑکی پہنچا دیا۔

اطراف وجوانب سے مولاناؒ کی تقریر کے اشتیاق میں لوگ جمع ہو گئے۔ رُڑکی پہنچ کر مولاناؒ نے بہت چاہا کہ پنڈت جی سے اعتراض بالمشافہ سنوں اور بہ عنایت خداوندی اسی وقت اس کے جواب دوں؛ مگر پنڈت جی تیار نہیں ہوئے اور عذر پیش کیا کہ فساد کا خطرہ ہے۔

آپؒ کے رڑکی تشریف لانے کی اطلاع ضلع مجسٹریٹ کو ہوئی، تو اس نے ملاقات کی خواہش کی، تو آپ نے پہلے تو انکار کیا؛ مگر جب دیکھا کہ پنڈت جی فساد کا بہانہ نکال کر مناظرے سے بھاگنا چاہتے ہیں، تو اس مصلحت کے پیش نظر مجسٹریٹ سے ملے۔ مجسٹریٹ نے کہا کہ فساد کے ہم ذمے دار ہیں۔ تو اس پر پنڈت جی نے کہا کہ: میں نے مناظرے کا ارادہ نہیں کیا ہے۔ جس کے جواب میں حضرت والاؒ نے کہا کہ: اب ارادہ کر لیجیے، مگر اس پر پنڈت جی تیار نہ ہوئے؛ مگر پھر بھی حضرت نانوتویؒ نے پنڈت جی کا پیچھا نہیں چھوڑا، اور مناظرے پر مصر رہے، تو پنڈت جی نے کہلا بھیجا کہ: زیادہ سے زیادہ دو سو آدمیوں کے درمیان آپ کے جوابات سننے کے لیے تیار ہو سکتا ہوں، اور پنڈت جی کی ضد اسی نقطے پر ختم نہیں ہوئی؛ بلکہ یہ شرط لگائی کہ جس جگہ میں ٹھہرا ہوا ہوں، وہاں آپ آئیں، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔

پنڈت جی کی قیام گاہ رڑکی چھاؤنی کے حدود میں تھی، جہاں مذہبی بحث ومباحثے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ تو وہاں بھی جانے کے لیے تیار ہو گئے؛ مگر جب اس کی اطلاع چھاؤنی والوں کو پہنچی، تو ممانعت کر دی کہ چھاؤنی کے حدود میں مناظرہ نہ ہونے پائے۔ پنڈت جی کی مراد یہی تھی۔

حضرت نانوتویؒ پھر بھی ہٹے نہیں؛ بلکہ یہ کہا کہ چھاؤنی کے حدود کے باہر کسی محفوظ مقام میں مناظرہ ہو جائے؛ مگر جب دیکھا کہ پنڈت جی کسی طرح راضی نہیں ہو رہے ہیں، تو آپ کا پیغام پنڈت جی کے پاس پہنچا کہ مرضی ہو، تو آؤ، مناظرہ تحریری سہی؛ مگر جواب تو درکنار! پنڈت جی اپنی راہ لی شکرم میں بیٹھ کر

روانہ ہو گئے۔

بیوہ عورتوں کا نکاحِ ثانی کا احیا:

ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کے تہذیب واخلاق اورطور وطریق کا اثر ہندوؤں پر پڑا ویسے ہی یہاں کے ماحول سے مسلمان بھی اپنے کو دور نہ رکھ سکے، اور کچھ یہاں کے رسم ورواج کا رنگ ان پر بھی چڑھا۔ ہندوؤں میں پہلے ستی کی رسم تھی کہ جس عورت کا شوہر انتقال کر جاتا، وہ عورت اپنی زندگی شوہر کی نذر کر کے پوری وفاداری کا ثبوت دیتی۔ مسلمانوں نے بھی اپنی شرافت اسی میں سمجھی کہ جب کسی عورت کے شوہر کا انتقال ہو جائے، تو پھر اس عورت کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ دوبارہ نکاح کر کے اپنے پہلے شوہر کی توہین کرے۔ یہ عقیدہ مسلمان مردوں سے کہیں زیادہ عورتوں میں راسخ تھا۔ یہ رسم بد جو انسانی تقاضے اور سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تھی، اس کو مٹانے اور:

"مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا".

کے مطابق عقد بیوگان کی سنت کو زندہ کرنے کا احساس حضرت شاہ ولی اللہؒ کو ہوا، اور آپ کے بعد اس کا اعلان حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہید بریلوی علیہما الرحمۃ نے کیا۔ پھر اس تحریک کو آگے بڑھانے میں مولانا نانوتویؒ کے استاد مولانا مملوک العلی صاحبؒ اور کاندھلہ کے مشہور بزرگ مولانا مظفر حسینؒ مشغول ہوئے۔ پھر ان دونوں بزرگوں کے قدم بہ قدم مولانا نانوتویؒ نے جدوجہد شروع کر دی۔ اپنے مواعظ وخطبات میں مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلانے لگے۔ جب اوّل اوّل لوگوں کے کانوں میں یہ نئی بات پڑی، تو چونکے اور گھر گھر اس کا چرچا ہوا، اور بعضوں نے تو آپ کے خلاف منصوبے بھی بنائے۔

چوں کہ عقد ثانی کو مردوں سے کہیں زیادہ عورتیں اپنی عفت وناموس کے لیے داغ سمجھتی تھیں؛ اس لیے حضرت نانوتویؒ نے اپنی تقریر کا سلسلہ مردوں ہی تک نہیں محدود رکھا؛ بلکہ آپ کے وعظ مستورات میں بھی ہونے لگے، اور کوئی عورت چاہے بیوہ ہو یا غیر بیوہ، اور وارثِ بیوہ، ایسا نہیں رہا کہ جس کے کانوں تک عقدِ ثانی کے فضائل نہ پہنچے ہوں۔

جب آپ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا، تو کسی کو یہ امید نہیں تھی کہ یہ کام چل نکلے گا؛ لیکن حضرت نانوتویؒ نے اس تحریک کو روبہ عمل ہونے کے لیے اپنے ایک مخلص عزیز حاجی محمد یٰسین صاحبؒ (جن کی ایک بہن بیوہ تھیں) آمادہ کیا، وہ اپنی بہن کا نکاح ثانی کرادیں۔ حاجی محمد یٰسین صاحبؒ نے اپنی ہم شیر کا نکاح ثانی کرادیا۔ چوں کہ وہ بلند خاندان کے تھے؛ اس لیے ان کا یہ فعل بہت مؤثر ہوا۔

ان ہی دنوں میں جب کہ عقدِ بیوگان کا بہت شور تھا، حضرت نانوتویؒ کی ایک بہن بیوہ ہو گئیں، جو صاحب اولاد اور عمر رسیدہ تھیں۔ آپ ایک مرتبہ عقدِ بیوگان کے سلسلے میں تقریر فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے تقریر ہی کے درمیان آپ پر یہ اعتراض کرنا چاہا کہ آپ کی ہم شیر تو خود بیوہ ہیں، ان کا نکاح ثانی کیوں نہیں کرا دیتے؟ مولانا نے معترض کی اتنی ہی بات سنی تھی کہ ''حضرت! مجھے کچھ عرض کرنا ہے'' کہ آپ نے تقریر کو موقوف کیا اور حاضرین کو ٹھہرا کر گھر گئے اور اپنی ہم شیر سے پیر پکڑ کر عرض کیا کہ آپ کی ایک ہمت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت زندہ ہو جائے گی۔ ہم شیر نے کہا کہ بھائی! میرے پیر تو چھوڑو، میں اس قابل کہاں کہ کسی سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی احیا کا سبب بنوں؟ تو آپ نے فرمایا کہ: آپ نکاح کرلیں۔ اس پر بہن نے کہا کہ: بھائی! تم دیکھ رہے ہو کہ میں ضعیف ہو چکی ہوں، بال سفید ہو چکے ہیں، نکاح کی عمر نہیں ہے۔ حضرت والا نے فرمایا: سب صحیح؛ مگر نکاح محض عقدِ بیوگان کی سنت کے احیا کے لیے ہوگا، کسی طبعی ضرورت کی بنا پر نہیں۔ اس پر بہن راضی ہو گئیں۔ اسی وقت گھر ہی میں حضرتؒ نے نکاح پڑھایا اور نکاح سے فارغ ہوتے ہی باہر تشریف لے آئے اور پھر وعظ شروع کر دیا۔ معترض کھڑا ہوا، اور کہا کہ آپ دوسروں کو عقدِ بیوگان کی تلقین کرتے ہیں، اور آپ کے گھر میں خود آپ کی بہن بیٹھی ہوئی ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ: کون کہتا ہے کہ بیٹھی ہوئی ہیں، ان کے نکاح کے شاہدین تو خود اس مجلس میں ہیں۔ چناں چہ گواہوں نے گواہی دی کہ ہاں ان کا نکاح ہماری موجودگی میں ہو چکا ہے۔ اس سے تمام لوگ متاثر ہوئے اور اسی مجلس میں تقریباً پچاس ساٹھ نکاح ہوئے، اور پھر یہ تحریک آگے چل نکلی۔

بدعات کے خلاف اقدام:

جیسے آپ نے عقد بیوگان کی تبلیغ واشاعت میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا تھا، ایسے ہی وہ رسوم جو مسلمانوں میں رواج پا گئی تھیں کہ جن کے اندر دین کا جز بن جانے کی صلاحیت موجود تھی، جیسے بیمار پرسی کے سلسلے میں رسوم بڑھاتے ہوئے لوگوں نے اس نوبت تک پہنچا دیا تھا کہ علاج معالجے کے ناگہانی مصارف کے ساتھ ساتھ ایک مستقل مالی مصیبت اس خاندان پر ٹوٹ پڑتی، جس میں اتفاقاً کوئی بے چارا مرض کا شکار ہو جاتا۔ خصوصاً عورتیں ڈولوں میں کس کس کر یکے بعد دیگرے بیمار کے گھر پر یلغار کر دیتی تھیں۔ ان کی خاطر ومدارات سواری کے قصوں سے لوگوں کا ناک میں دم آ گیا تھا؛ لیکن رسوم کی ان زنجیروں کو توڑنا آسان نہیں تھا؛ مگر آپ کے اخلاص وصداقت اور قوم وملت کے درد نے دیوبند کے مسلمانوں کو اس پر راضی کر لیا کہ عورتیں جو مریض کی عیادت کو جاتی ہیں اور اس بیمار اور تیمار دونوں کو تکلیف ہوتی ہے؛ اس لیے اب ایسا نہیں

ہوا کرے گا اور اس رسمی دستور کو ترک کردیں گے، یعنی مسنون طریقے پر جو مزید اضافے باعث گرانی بن گئے ہیں، وہ چھوڑ دیے جائیں گے۔

موت کے بعد سوم، چہارم، دہم، بستم، چہلم، چھ ماہی، برسی کے نہ ختم ہونے والے دعوتی مطالبات تھے، جو برادری والوں کی طرف سے مرنے والے کے پس ماندگان پر عائد ہوتے، اور جس طرح بھی ہو، ان مطالبات کی تکمیل پر غریب مجبور ہوتے تھے۔ حضرت نانوتویؒ نے ان رسوم کے ختم کیے جانے پر مسلمانوں سے عہد لیا اور لوگ اس پر تیار بھی ہو گئے۔

اس کے علاوہ اور بھی ان رسوم کے ختم کرنے کی کوشش کی جو شریعت میں محمود نہیں تھیں؛ بلکہ قوم کے لیے دنیاوی حیثیت سے بھی وبالِ جاں تھیں۔ چناں چہ مولانا گیلانیؒ نے لکھا ہے:

> ''شادیوں میں فضول خرچی موقوف ہوگئی اور رسوم کی پابندی بالکل نہ رہی۔ نیز میت کے رسوم بہت کم ہوگئے۔ اکثر جگہ سے سوم، دہم، بستم، چہلم سب موقوف ہوگئے''(۱)۔

دیو بند سے تعزیہ داری کا خاتمہ:

یہی دیو بند جو آج ہندوستان کے اہل سنت والجماعت کا ملجا و ماویٰ بنا ہوا ہے۔ جس زمانے میں حضرت نانوتویؒ دیو بند کو وطن بنا کر یہاں مقیم ہوئے تھے، تو یہاں کے اچھے اچھے ممتاز گھرانوں میں تفضیل کا اثر موجود ہی نہیں؛ بلکہ غالب تھا۔

دیو بند میں حضرت والاؒ کے گھر کی تمام ضرورتوں کی سربراہی کا تعلق جناب دیوان جی محمد یٰسین صاحبؒ سے تھا، جو حضرتؒ کے فدا کار اور بہت عقیدت مند تھے، جن کا شمار دیو بند کے سربرآوردہ شیوخ میں تھا۔ ان کے ہاں کی تعزیہ داری بہت مشہور تھی؛ مگر مولانا نانوتویؒ کی صحبت بابرکت کے فیض نے دیوان جی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ میں اپنے اقتداری دائرے میں تعزیہ داری کی رسم ختم کر کے رہوں گا۔ جس مسجد میں شیخ الاسلام سیدنا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے، یہی دیوان جی کے محلے کی مسجد تھی، جس میں تعزیہ رکھا جاتا تھا اور محرم میں اسی مسجد سے وہ تعزیہ اٹھتا تھا۔ اٹھانے والے سنی ہوتے تھے اور کچھ شیعہ گھرانے بھی اس جگہ تھے۔

دیوان جی نے سب سے پہلے اسی اپنے محلے کی مسجد سے تعزیے کے قصے کو پاک کرنے کا ارادہ کیا، اور اعلان کر دیا کہ اس مسجد سے اس سال تعزیہ نہیں اٹھے گا۔

(۱) سوانح قاسمی، ص: ۵۴۔

دیوبند کی شیعہ آبادی ہی میں نہیں؛ بلکہ تعزیہ پرست سنیوں میں بھی اس اعلان سے کھلبلی مچ گئی۔ اس محلے کے شیوخ بگڑ گئے اور کہا کہ سر قلم ہو جائیں گے؛ مگر تعزیہ اٹھے گا۔ یہ سن کر دیوان جی کی زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ: ''اگر گزرا، تو میری لاش پر سے گزرے گا''۔

اس کی خبر جب حضرت نانوتویؒ کو ہوئی، اور معلوم ہوا کہ شہر میں عظیم ترین ہنگامہ بپا ہونے کا خطرہ ہے، تو ایک دن جب دیوان جی حضرتؒ کی مجلس میں حاضر تھے، اور شہر کے اکابر شیوخ اور دوسری برادری کے بڑے بھی موجود تھے، تو مولانا نانوتویؒ نے دیوان جی کو مخاطب کر کے کہا کہ: بندۂ خدا! اگر ایسا ہی کرنا تھا، تو مجھ سے ذکر تو کر لیا ہوتا، اور اس کے بعد اسی بھری مجلس میں آپ نے اعلان کیا کہ خیر! اب اگر ایسا کہہ دیا گیا تو دوسرا سر قاسم کا لگا ہوا ہے۔ جب یہ بات شہر میں مشہور ہوئی تو پیشہ ور برادریاں متحد ہو کر تیار ہو گئیں کہ اگر شیوخ نے دیوان محمد یٰسین صاحب کے ساتھ کوئی نازیبا برتاؤ کیا تو یہ ساری برادریاں ان شیوخ کے مدمقابل ہو جائیں گی۔

اور بات کچھ ان پیشہ ور برادریوں تک محدود نہ رہی؛ بلکہ خود شیوخ میں دو جماعتیں ہو گئیں، بڑی جماعت حضرت نانوتویؒ کی حمایت پر تُل گئی، گویا پورا شہر ان شیوخ کے مقابلے میں تُل گیا، جو حضرت نانوتویؒ اور دیوان جی کی مخالفت کر رہے تھے۔

سارے شہر کے مسلمانوں سے مقابلے کی ہمت آخر مخالفوں کا گروہ کیسے کر سکتا تھا؟ یوں ایک بڑے فتنے کا قلع قمع ہو گیا اور باہمی خون ریزی سے دیوبند والے بچ گئے، اور ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ دیوان جی کی مسجد سے تعزیہ اٹھنا ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، اور جب ایک جگہ سے یہ قدیم رسم اٹھ گئی، تو شہر کی جن جن سنی مسجدوں میں سے تعزیے اٹھتے تھے، وہ سب ختم ہو گئے۔

ایک واقعہ:

محرم کے مہینے میں حضرت نانوتویؒ قصبہ ''پور قاضی'' پہنچے، تو آپ کی آمد کی خبر وہاں کے شیعوں کو ہوئی، تو ایک وفد ان کے سربرآوردوں کا حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور یہ خواہش کی کہ ماتم کی مجلس میں شریک ہو کر پور قاضی کے شیعوں کو ممنون فرمایا جائے۔ حضرتؒ نے قبول فرما لیا؛ مگر یہ فرمایا کہ میری بھی ایک شرط منظور کی جائے کہ میں جو کچھ عرض کروں، اسے سن لیں۔ وفد نے اس شرط کو منظور کر لیا؛ مگر ان کی طرف سے مزید مطالبہ پیش ہوا کہ آپ کے وعظ سے پہلے مجلس ہوگی، اس میں حلوہ بھی تقسیم ہوگا، وہ بھی آپ کو قبول کرنا پڑے گا، آپ نے اس اضافے کو بھی مان لیا، اور حسب وعدہ ماتم کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ حلوا جو

دیا گیا، آپ نے لے لیا۔ جب شیعوں کی پیش کردہ شرائط پوری ہوگئیں، تو ماتم کی اسی مجلس میں آپ نے کھڑے ہو کر ایک مبسوط تقریر فرمائی۔ سننے والے یہ خلاصہ بیان کرتے تھے کہ ہدایت کے لیے مولاناؒ نے فرمایا کہ: علم و عمل دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔ علم کے لیے تو اللہ کی کتاب ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت پاک میں نسلی مناسبت کی وجہ سے عمل کی صلاحیت نسبتاً زیادہ ہونی چاہیے۔ الغرض ماتم کی اس مجلس میں اس اجمال کی تفصیل کچھ اس نہج سے کی گئی کہ بجائے ماتم کے وہ تبلیغ کی مجلس بن گئی، اور آپ کے اس وعظ سے بہت سے لوگوں کو توبہ کی توفیق ہوئی۔

آپ کی خدمات کا مختصر خاکہ پیش کیا جا سکا ہے؛ کیوں کہ:

لا یدرک الواصف المطري خصائصه

وان یکن سابقا في کل ما وصفا

(۱) (ماخوذ از): ماہنامہ دارالعلوم دیو بند، دسمبر ۱۹۶۰ء تا فروری ۱۹۶۱ء۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کی ادبی کاوشیں

پروفیسر مولانا محمد انوار الحسن شیرکوٹیؒ، فاضل دیوبند ✿

نظرِ ثانی:

محمد نعمان ارشدی

محترم پروفیسر صاحب مرحوم صاحبِ قلم بزرگ تھے۔ موصوف نے ماہ نامہ دار العلوم دیوبند میں ایک طویل سلسلۂ تحریر ''تذکرۂ ادبائے دیوبند'' شروع کیا تھا، جس کی پانچویں قسط سے پندرھویں قسط (گیارہ اقساط) تک حضرت حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ہم نے حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتی لائبریری سے دار العلوم کے وہ رسالے حاصل کر کے یہ مضمون لیا ہے۔ (نعمان)

اس نئی روشنی کی دنیا میں جہاں برقی قمقمے سیرِ طور کا لطف دے رہے ہوں، میں گزشتہ تیرھویں صدی ہجری کا ایک پرانا؛ مگر نور افزا چراغ قاری کے سامنے لے کر آیا ہوں۔ اس شمع کو پرانی شمع کہنا زمانے کی نسبت سے ہے؛ ورنہ حق تو یہ ہے کہ عہدِ ماضی کے اس روشن آفتاب کے سامنے زمانۂ حال کی ساری شمعیں اور قمقمے ماند اور پھیکے ہیں۔ یہ وہ علم کا روشن سورج ہے، جس کی ضیا باریوں نے بہت سے روشن چاند اور ستارے منور کیے۔ میری مراد اس آفتاب سے حجۃ الاسلام، مصلح نشأۃ ثانیہ، بانئ دار العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کے گلشنِ علم کے صدا بہار پھول مشامِ جاں کو ہمیشہ بساتے رہیں گے: ؎

گاہے گاہے باز خواں ایں قصّۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

✿ صاحبِ ''انوارِ قاسمی''

انوار! عالم ارواح سے جب یہ روحانیت کا پیکر عالم اجسام کو روانہ ہوا، تو فرشتوں نے کوثر کے پانی سے اس کو نہلایا، سر پر علم کا تاج رکھا، درویشی کا جامہ گلے میں پہنایا، قرآن وسنت کا ہار سینے پر لٹکایا، ریاضت وعبادت کا کاجل آنکھوں میں لگایا۔ رحمت کے فرشتے جلو میں تھے، دنیا کی سرحد تک آئے اور الوداع کہہ کر رخصت ہوئے۔ سدھارو! اللہ کا دین زندہ کرنے کے لیے تمہیں بھیجا جاتا ہے۔

پیدائش:

اس مقدس ہستی نے نانوتہ ضلع سہارن پور کی زمین کو اپنی پیدائش سے شرف بخشا۔ ''قبلہ نما'' کے دیباچے میں مولاناؒ خود اپنے وطن کا نشان دیتے ہیں:

''بست وسوم ماہ شعبان کو رڑکی سے روانہ ہوا، اور ایک دن منگلور، دو تین دن دیوبند ٹھہر کر ستائیسویں کو اس قصبۂ ویرانہ میں پہنچا، جس کو ''نانوتہ'' کہتے ہیں، اور اس خاک سار کا وطن بھی یہی ہے''(۱)۔

حکیم احمد عشرتیؒ برادر زادہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اولین صدر مدرس دار العلوم دیوبند نانوتہ کی جغرافیائی پوزیشن ''مکتوباتِ یعقوبی'' کے دیباچے میں اس طرح لکھتے ہیں:

''یہ قصبہ (نانوتہ) تحصیل دیوبند ضلع سہارن پور میں دہلی سے جانب شمال اسی میل کے فاصلے پر واقع ہے، جس کے حدود اربعہ یہ ہیں:

''مغرب میں گنگوہ بارہ میل، مشرق میں دیوبند سولہ میل، شمال میں سہارن پور اٹھارہ میل اور جنوب میں تھانہ بھون نو میل''۔

اس قصبے کے شیخ سیدوں کا علم وفضل وطبابت دور دور مشہور تھا''(۲)۔

نام نامی:

مولانا کا نام نامی ''محمد قاسم'' ہے۔ اپنی تمام تصانیف میں یہی نام تحریر فرمایا ہے۔ ''تصفیۃ العقاید'' کے خط میں بہ نام سرسید لکھتے ہیں:

''کم ترین ہیچ مداں محمد قاسم بعد سلام مسنون گزارش پرداز ہے......''۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے ''سوانح قاسمی'' میں تاریخی نام ''خورشید حسین'' تحریر فرمایا ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ خود ''فیوض قاسمیہ'' کے ایک خط بہ نام حکیم ضیاء الدین مولوی حامد حسین شیعہ سے مذہبی گفتگو کے سلسلے میں اپنا اصلی نام چھپاتے ہوئے تاریخی نام اس طرح بتایا ہے:

---

(۱) قبلہ نما، ص:۳۔　　(۲) مکتوبات یعقوبی، ص:۶۔

''شخصے دراں جلسہ از آشایاں احقر بود او بے ساختہ بہ تعظیم برخاست واہل مکان راازمولویت من خبر داد، ایں خبر از وباوشاں رسید، مگر چوں نام من نہ گفتہ، پس از استفسار خورشید حسین گفتم''(۱)۔

ترجمہ از فارسی: ''اس مجلس میں ایک شخص میرا واقف تھا، وہ بے ساختہ میری تعظیم کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، اور میرے مولوی ہونے کی خبر صاحب مکان کو اور اس سے ان کو ہوگئی؛ لیکن چوں کہ واقف نے میرا نام نہیں بتایا تھا؛ اس لیے پوچھنے پر میں نے خورشید حسین (تاریخی نام) بتلایا''۔

والد اور قومیت:

مولانا رحمہ اللہ کے والد بزرگوار کا نام نامی ''شیخ اسد علی'' صاحبؒ تھا۔ مولانا شیخوں کے خاندان سے ہیں اور شیخ بھی صدیقی۔ پیر جی محمد عارف صاحبؒ کو خطاب کرتے ہوئے سرسید کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اجی حضرت! امیروں کے ذہن وفہم وعقل وادراک کے ہزاروں گواہ ہوتے ہیں، غریبوں کے فہم وفراست کا کہیں ایک بھی نہیں سنا۔ اس صورت میں کیوں کر کہہ دیجیے کہ سید صاحب ایک غریب سے شیخ زادے کی مان جائیں؟''(۲)۔

خط کشیدہ جملے میں سید صاحب کی مناسبت سے اپنے آپ کو ''شیخ زادہ'' ظاہر کیا ہے، اور حق تو یہ ہے کہ یہاں شیخ زادہ کہہ کر مولانا نے کمال کیا ہے۔

وطن کی ابتدا:

مولانا کے جد امجد قاضی مظہر الدین صاحبؒ، جن کا مزار ''جہاں آباد'' (دہلی) میں ہے، ۸۷۱ھ/ (۱۴۶۷ء) میں سمرقند سے سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں آئے، جن کو سکندر لودھی نے جہان آباد (دہلی) کی قضا کا عہدہ بخشا، اور ان کے بیٹے قاضی میران بڑےؒ کو ''نانوتہ'' کا قاضی بنایا، تاکہ وہاں کے سرکش ہندو، راج پوت اور گوجروں کی خودسری مٹائیں۔ چناں چہ بہ حکم شاہی قاضی میاں بڑےؒ نے نانوتہ میں رہائش اختیار کی۔ میراں بڑے مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ سے تیرھویں پشت میں بزرگ ہیں۔

سلسلۂ نسب تا حضرت ابوبکر صدیقؓ:

حکیم امیر احمد عشرتیؒ ''مکتوبات یعقوبی'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

---

(۱) فیوض قاسمیہ، ص:۶۔
(۲) تصفیۃ العقاید، ص:۵۔
(۳) مکتوبات یعقوبی، ص:۳۰۔

''قاضی میراں بڑےؒ ابن قاضی مظہر الدین صاحبؒ کا سلسلۂ نسب چودہ واسطوں سے خواجہ یوسفؒ سے ملتا ہے، اور خواجہ یوسفؒ کا چار واسطوں سے شیخ رکن الدین سمرقندیؒ سے، اور وہ پوتے ہیں شیخ اسماعیل شہیدؒ کے اور وہ بیٹے ہیں شیخ نور الدین قتالؒ کے، اور ان کا سلسلۂ نسب بارہ واسطوں سے شیخ قاسمؒ سے ملتا ہے، اور وہ پوتے ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفۂ اوّل رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے''(۱)۔

اس سلسلۂ نسب کے اعتبار سے حضرت مولانا صدیقی شیخ تھے۔ قاضی میراں بڑے تک سلسلۂ نسب حسب ذیل ہے:

قاضی میراں بڑے	شاہ محمد
قاضی جمال الدین	مولوی محمد ہاشم
قاضی امان اللہ	شیخ محمد مفتی
مفتی مبارک	
قاضی طٰہٰ	
	شیخ ابوالفتح
شیخ حکیم عبداللہ	شیخ علاؤالدین
شیخ حکیم غلام مشرف	شیخ محمد بخش
مولانا احمد علی رحمہ اللہ حکیم ولی محمد	حافظ محمد حسن رحمہ اللہ شیخ غلام شاہ
مولانا مملوک صاحب	شیخ اسد علی
سالک ومجذوب حافظ وحاجی مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، اوّلین صدر مدرس دار العلوم دیوبند	عارف کامل حافظ حاجی حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ (بانی دار العلوم دیوبند)

بہ قول مولانا محمد یعقوب صاحبؒ: ''حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دار العلوم دیوبند شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ (جنوری یا فروری ۱۸۳۳ء) میں پیدا ہوئے۔ آپ کی صحیح تاریخ پیدائش پردۂ تاریکی میں رہی۔ مولانا کے والد صاحب شیخ اسد علیؒ نے وطن اور دہلی میں تعلیم پائی تھی۔ شاہ نامہ وغیرہ کتابیں پڑھی تھیں۔ کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے؛ لیکن نمازی اور پرہیز گار آدمی تھے۔

(۱) مکتوبات یعقوبی، ص: ۸۔

بچپن اور تعلیم:

مولانا کے ابتدائی حالات کا ایک خاکہ ''سوانح قاسمی'' مصنفہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے پیش کرتا ہوں، اس سے ابتدائی تعلیم اور بچپن کا جائزہ لگائیے:

''ہمارے وطن میں ایک قضیہ پیش آیا۔ شیخ تفضّل حسین شیعہ مذہب ہو گئے تھے اور ہماری جائداد کے شریک تھے۔ ان سے اور مولوی (محمد قاسم) صاحبؒ کے دادا شیخ غلام شاہ سے فساد ہوا، اور شیخ تفضّل حسین مولوی صاحبؒ کے ماموں میاں فصیح الدینؒ کے ہاتھ سے زخمی ہو کر مر گئے۔ ہر چند کہ اس مقدمے میں خیریت رہی اور حاکم کی طرف سے کسی کو کچھ سزا نہ ہوئی؛ مگر بنائے مخاصمت کچھ پہلے تھی، اب زیادہ ہوگئی، تب یہ خوف ہوا کہ مبادا کوئی صدمہ مخالفوں کے ہاتھ سے ان کو پہنچے؛ اس لیے (مولوی صاحبؒ) کو دیوبند بھیج دیا۔ یہاں مولوی مہتاب علی صاحبؒ[1] کا مکتب تھا۔ شیخ کرامت حسین مرحوم کے گھر پر شیخ نہال احمدؒ پڑھتے تھے۔ مولوی صاحبؒ کو انہوں نے عربی شروع کرائی، پھر مولانا (محمد قاسم صاحبؒ) اپنے نانا (مولوی وجیہہ الدین صاحب) کے پاس رہے، وہاں مولوی محمد نواز صاحب سہارن پوریؒ سے کچھ پڑھا۔ فارسی اور عربی کی کتابیں اول کی کچھ حاصل کیں۔ مولوی صاحبؒ سہارن پور سے وطن آئے اور ان کے نانا کا انتقال (اس سال کے وبائی بخار میں) ہوا، بہت سے لوگوں کو ہوگیا تھا۔ اس زمانے میں مولوی (محمد قاسم) صاحبؒ کا ساتھ رہا''[2]۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؒ نے بسم اللہ اپنے وطن میں کسی سے کی اور بعد ازاں شروع کی کتابیں وہیں کسی سے پڑھ کر دیوبند پہنچے، اور اس قابل ہو گئے ہیں کہ دیوبند میں مولانا مہتاب علی صاحبؒ سے عربی شروع کی ہے۔ اپنے نانا کے پاس دوران قیام میں مولوی محمد نواز سہارن پوریؒ سے فارسی اور ابتدائی عربی کی کچھ کتابیں پڑھ کر وطن واپس ہو گئے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا، جب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے صرف ایک سال بڑے تھے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ مولانا کم عمری میں کافی تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی محشی تحریر سوانح قاسمی: صفحہ ۶ / سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مولانا محمد قاسم صاحبؒ

(۱) مولانا مہتاب علی صاحبؒ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ کے بڑے اور حقیقی بھائی تھے، یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ کے تایا تھے۔ (انوار)

(۲) سوانح قاسمی، ص: ۵/۶۔

مولوی محمد نواز صاحب سہارن پوریؒ سے پڑھ رہے تھے اس سال رجب ۱۲۵۸ھ/ (اگست ۱۸۴۲ء) کو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے والد مولانا مملوک العلی صاحب نانوتویؒ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلویؒ (نبیرۂ شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ) کے ہمراہ حج کو روانہ ہو چکے ہیں۔ گویا مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے دس سال کی عمر میں؛ بلکہ کچھ پہلے عربی شروع کر دی تھی، جب کہ آپ کی پیدائش ۱۲۴۸ھ/ (۱۸۳۲ء) کی ہے۔

بچپن میں ذکاوت وذہانت:

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ''سوانح قاسمی'' میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''جناب مولوی (محمد قاسم) صاحبؒ لڑکپن سے ذہین، طباع، بلند ہمت، تیز، وسیع حوصلہ، جفاکش، جری، چست وچالاک تھے۔ مکتب میں اپنے سب ساتھیوں سے ہمیشہ اول رہتے تھے۔ قرآن شریف بہت جلد ختم کرلیا۔ خط اس وقت سب سے اچھا تھا''[1]۔

اس مذکورہ بالا عبارت سے مولانا کی طبیعت کی افتاد، ذہانت وذکاوت، طباعی اور بلند ہمتی، خوش خطی اور جفاکشی غرض تمام ذہنی اور جسمانی قوی کی بالیدگی، اور ان کی حیاتی نشو ونما کے اٹھان کا پتہ چلتا ہے، جو ان کے مستقبل کی غمازی کر رہا ہے کہ یہ ہستی ایک روز ''قاسم العلوم'' بنے گی۔

تعلیم کے لیے دہلی کا سفر:

مولانا مملوک العلی صاحبؒ حج سے جب ایک برس کے بعد ۱۲۵۹ھ/ (۱۸۴۳ء) میں جیسا کہ سوانح قاسمی کے صفحہ ۶/ کے حاشیہ سے معلوم ہوتا ہے، دہلی پہنچے، جہاں مولانا مملوک العلی صاحبؒ دہلی کے مشہور مدرسۂ عالیہ (جو غالباً آج کل عربک کالج کے نام سے مشہور ہے[3]) میں جو سرکاری مدرسہ تھا، صدر مدرس تھے۔ ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ (جنوری ۱۸۴۴ء) میں مولانا مملوک العلی صاحبؒ سالانہ تعطیل میں نانوتہ تشریف لائے، تب انہوں نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے فرمایا کہ میں تمہیں دہلی لے جاؤں گا۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

> ''جب والد صاحب مرحوم حج سے تشریف لائے، اور وطن آئے، تب مولوی (محمد قاسم) صاحبؒ سے کہا کہ میں تم کو ساتھ لے جاؤں گا۔ بعد اجازت والد صاحب کے دہلی روانہ ہوئے۔ ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ/ کے آخیر میں وطن سے چلے اور دوسری محرم ۱۲۶۰ھ/ کو دہلی پہنچے۔ چوتھی کو سبق شروع ہوئے۔ مولوی صاحبؒ نے کافیہ شروع کیا اور احقر نے میزان اور گلستان''[2]۔

(۱) سوانح قاسمی، ص:۵۔　(۲) سوانح قاسمی، ص:۳۰۔　(۳) اب وہ بھی ختم ہوگیا۔ (نعمان)

دورانِ تعلیم دہلی میں مولانا کی ذکاوت کا چرچا:

اس عبارت سے (معلوم ہوا کہ) کافیہ سے دلی میں مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم کا آغاز ہوا ہے؛ لیکن کس سے تعلیم شروع کی؟ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی حسب ذیل عبارت پڑھیے:

''پھر تو مولوی صاحبؒ ایسے چلے کہ کسی کو ساتھ ہونے کی گنجائش نہ رہی۔ یہ معقول کی مشکل کتابیں: میر زاہد، قاضی، صدرا، شمس بازغہ ایسا پڑھا کرتے تھے، جیسے حافظ منزل سناتا ہے۔ کہیں کہیں کوئی لفظ فرماتے جاتے اور ترجمہ تک نہ کرتے۔ والد صاحب مرحوم کے بعض شاگردوں نے کہا بھی کہ حضرت! یہ تو کچھ سمجھتے نہیں معلوم ہوتے۔ جناب والد مرحوم نے فرمایا کہ میرے سامنے طالب علم بے سمجھے چل نہیں سکتا''[۱]۔

مذکورہ بالا عبارت صاف بتا رہی ہے کہ کافیہ مولانا مملوک العلی صاحبؒ سے ہی شروع کیا، اور تمام معقول کی کتابیں، یعنی منطق، فلسفہ و دیگر درس نظامیہ دہلی ہی میں مولانا مملوک العلی صاحب سے پڑھی ہیں۔ جیسا کہ یہ جملہ بتاتا ہے کہ ''میرے سامنے طالب علم بے سمجھے چل نہیں سکتا''؛ البتہ حدیث شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے پوری کی۔

دہلی کے سرکاری مدرسۂ عربی میں داخلہ:

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''والد مرحوم نے مولوی (محمد قاسم) صاحبؒ کو مدرسۂ عربی سرکاری میں داخل کیا، اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ: ان کے حال سے متعرض نہ ہوجیو، میں ان کو پڑھالوں گا، اور فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو، اور قواعد حساب کی مشق کرلو۔ چند روز میں چرچا ہوا کہ مولوی صاحبؒ سب معمولی مقالے دیکھ چکے اور حساب پورا کرلیا۔ از بس کہ یہ واقعہ نہایت تعجب انگیز تھا۔ طلبہ نے پوچھ پاچھ شروع کی۔ یہ کب عاری تھے، ہر بات کا جواب باصواب تھا۔ آخر منشی ذکاء اللہ چند سوال نئے کسی ماسٹر کے بھیجے ہوئے لائے، اور وہ نہایت مشکل سوال تھے، ان کے حل کر لینے پر مولانا کی نہایت شہرت ہوئی، اور حساب میں کچھ ایسا ہی حال تھا۔ جب امتحان سالانہ کے دن ہوئے مولوی صاحبؒ امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا۔ سب اہل مدرسہ کو علی الخصوص ہیڈ صاحب کو کہ اس وقت میں مدرس اول انگریزی تھے، نہایت افسوس ہوا''[۲]۔

---

(۱) سوانح قاسمی، ص:۷۔

(۲) ایضاً، ص:۸۔

مذکورہ بالا عبارت سے تعلیم کی ترتیب میں گنجلک پیدا ہوگئی ہے؛ کیوں کہ اس عبارت کے متصل ذرا اوپر کی عبارت میں جیسا کہ ابھی گزری کہ ''مولانا محمد قاسم صاحبؒ صدرا، شمس بازغہ وغیرہ معقول کی مشکل کتابوں کو ایسا پڑھتے تھے، جیسے حافظ منزل سناتا ہے'' سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا معقول کی بڑی بڑی کتابیں پڑھنے کے بعد سرکاری مدرسے میں داخل کیے گئے ہیں؛ لیکن مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے سرکاری مدرسے کو چھوڑنے کے فوراً بعد متصل لکھا ہے:

''مولوی صاحبؒ امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا۔ سب اہل مدرسہ کو علی الخصوص ہیڈ صاحب کو کہ اس وقت میں مدرس اول انگریزی تھے، نہایت افسوس ہوا۔ پھر مولوی صاحبؒ نے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی کچھ مزدوری کر لی اور کتابیں معمولی تمام کر چکے تھے۔ حدیث شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی خدمت میں پوری کی۔ اس عرصہ میں والد مرحوم (مولانا مملوک العلی صاحبؒ) کا گیارھویں ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو بہ مرض یرقان قبل السابع انتقال ہوگیا''۔

اس عبارت سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ ۲؍محرم ۱۲۶۰؍ہجری کو مولانا مملوک العلی صاحبؒ کی معیت میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ دہلی پہنچے۔ ۴؍محرم سے کافیہ سے تعلیم کا آغاز فرماتے ہیں۔ مولانا مملوکؒ سے فنون کی آخری کتابیں تک پڑھ چکے ہیں، اور ۱۲۶۷ھ (اکتوبر ۱۸۵۱ء) میں مولانا مملوک العلیؒ کا انتقال ہوجاتا ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو مولانا مملوک العلی صاحبؒ کے انتقال تک آٹھ سال کا پورا عرصہ ان کی معیت میں نصیب ہوتا ہے؛ لہٰذا واقعات تعلیم کی ترتیب بعد تنقیح حسب ذیل ہے:

ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی، کچھ عرصہ کے بعد اپنے نانا کے یہاں چلے گئے، وہاں مولوی محمد نوازؒ سے فارسی کتابیں پڑھیں۔ سہارن پور سے دیوبند پہنچے، اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تایا بزرگوار مولانا مہتاب علیؒ سے عربی تعلیم کی ابتدا کی، پھر وطن واپس ہوئے، والد کا انتقال دس سال کی عمر سے پہلے ہی ہوچکا تھا [۲]؛

---

(۱) سوانح قاسمی، ص:۸۔

(۲) مضمون نگار سے حضرت نانوتویؒ کے والد کی وفات کے سلسلہ میں تسامح ہوا ہے، حضرت نانوتویؒ کے والد ماجد شیخ اسد علیؒ کی وفات ۷؍ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ/دوشنبہ (پیر) (۲۱؍مارچ ۱۸۷۵ء) کو دیوبند ہوئی، تکیہ دیوان لطف اللہ میں دفن کیے گئے۔ یہ وہ جگہ ہے جو دارالعلوم کی نئی مسجد جامع رشیدؒ صدر دروازے کے سامنے واقع ہے۔ اس کے صحن کے مائل بہ جنوب مشرقی گوشے میں شیخ اسد علیؒ کا مدفن ہے۔ چند سال پہلے تک اس قبر پر کتبہ نصب تھا، جس کو راقم سطور نے بھی بارہا دیکھا ہے، اور نامور مؤرخ پروفیسر محمد اسلم صاحب نے بھی اپنے مضامین اور ''سفر نامہ ہند'' میں اس کا ذکر کیا ہے، اور اس کتبے کی عبارت بھی نقل کی ہے، جو یہ تھی:

''مزار اقدس: حضرت شیخ اسد علی رحمۃ اللہ علیہ، والد ماجد حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ، التوفی ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء''

(سفر نامہ ہند: ص ۳۰۰، لاہور، ۱۹۹۵ء)

مگر کتبے پر سن وفات کندہ کرنے میں سہو ہوا، صحیح تاریخ وہ ہے، جو اوپر گزری۔ یہ تاریخ حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے خطوط میں درج ہے؛ اس لیے یہی صحیح اور درست ہے۔ (نور)

اس لیے مولانا مملوک العلی صاحب کے فرمانے پر والدہ کی اجازت سے ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ (جنوری ۱۸۴۴ء) کے آخیر میں نانوتہ سے روانہ ہو کر ۲ محرم ۱۲۶۰ھ (۲۳ جنوری ۱۸۴۴ء) کو دہلی پہنچے۔ ۴ محرم سے دہلی میں مولانا مملوک العلی صاحبؒ سے علوم وفنون کی کتابیں شروع کیں۔ علوم وفنون کے بعد حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے جو شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلویؒ کے جانشین تھے، حدیث کی تعلیم کی تکمیل کر کے فضیلت کو مکمل کیا، اور بعد ازاں مولانا مملوک العلی صاحبؒ نے دنیاوی علوم سے روشناس کرانے کے لیے سرکاری مدرسے میں دیگر علوم ریاضی، اقلیدس وغیرہ حاصل کرنے کے لیے داخل کیا؛ لیکن قدرت نے آپ کو ایک اور ہی اعلیٰ مقصد کے لیے عالم ارواح سے عالم اجساد میں بھیجا تھا؛ اس لیے ان دنیاوی علوم کو یہ دکھا کر خیر باد کہہ دیا کہ ہم ان علوم میں بھی کسی سے پیچھے اور ہیٹے نہیں۔ ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ دورانِ تعلیم دہلی میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے مفتی صدر الدین صاحب (غالباً غالب کے دوست) کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔

تعلیم کے اس سلسلے میں مولانا محمد قاسمؒ کو علم حدیث کے ذریعے خاندان ولی اللہی سے جو رشتہ اور علمی سلسلہ حاصل ہوا، وہ ایک سنہری سلسلہ ہے۔ مولانا کا نسبی شجرہ مذکورہ سطور میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اب علم حدیث کے ذریعے مولانا کا علمی شجرہ معلومات میں اضافے کے لیے پیش کرتا ہوں، جو یہ بتاتا ہے کہ خاندان ولی اللہی کے ایک علمی فرد ہیں۔ یہ سلسلہ شاہ وجیہ الدین صاحبؒ فاروقی رحمۃ اللہ علیہ (۱) سے شروع ہوتا ہے۔

---

(۱) اس مذکورۂ بالا شجرے کا تجزیہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ حضرت شاہ وجیہ الدین صاحبؒ خاندان ولی اللہی کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ان سے لے کر شاہ محمد اسحاقؒ، شاہ محمد یعقوبؒ، شاہ عبدالقیومؒ، شاہ محمد عمرؒ تک نسبی وحسبی سلسلہ ہے؛ مگر حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے بعد شاہ عبدالغنی صاحبؒ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے حدیث اور اسماء الرجال کے استاد ہیں۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے بعد کا شجرہ ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کا ہے، گویا یہ سب شجرہ ولی اللہی کے برگ و بار ہیں۔ حضرت شاہ وجیہ الدین صاحبؒ جیسا کہ ان کے تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے: سلطان اورنگ زیبؒ کی فوج میں تھے اور بھائیوں کی باہمی جنگ میں شاہ اورنگ زیبؒ کی طرف سے لڑے تھے۔ حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ نے حدیث شاہ عبدالعزیزؒ سے پڑھی۔ (انوار)

شجرۂ علمی

شاہ عبدالرحیمؒ

شاہ اہل اللہؒ	شاہ ولی اللہؒ

شاہ ولی اللہؒ

شاہ عبدالعزیزؒ	شاہ رفیع الدینؒ	شاہ عبدالقادرؒ	شاہ عبدالغنیؒ
دختر، زوجہ شاہ محمد افضلؒ/ دختر، زوجہ مولانا عبدالحیؒ	شاہ مخصوص اللہؒ		شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ
			شاہ محمد عمرؒ

دخترِ (عبدالعزیزؒ)، زوجہ شاہ محمد افضلؒ

شاہ محمد اسحاقؒ	شاہ محمد یعقوبؒ
شاہ عبدالغنیؒ	

شاہ عبدالغنی

	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ	مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	

مولانا مملوک العلیؒ

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ	مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ
		مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ

	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ	
مولانا محمود حسن دیوبندیؒ	مولانا احمد حسن امروہویؒ	مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ
مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ	مولانا عبدالرحمٰن امروہویؒ	مولانا اشرف علی تھانویؒ

مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ	مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ	مولانا اشرف علی تھانویؒ
مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ	مفتی کفایت اللہ دہلویؒ	مولانا عبیداللہ سندھیؒ
مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	مولانا سید مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ	مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

مولانا احمد علی لاہوریؒ	مولانا محمد صادق سندھیؒ	مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ
مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ	حافظ محمد احمدؒ (بن امام نانوتویؒ)	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ

قاری محمد طیب قاسمی	مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی	مولانا فخر الدین مرادآبادی
مولانا مناظر احسن گیلانیؒ	مفتی محمد شفیع عثمانی	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
مولانا سید محمد میاں دیوبندی	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ	مولانا بدر عالم میرٹھیؒ
مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ	مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ	مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ
مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ	مولانا غلام اللہ خانؒ	

مولانا سید حسین احمد مدنی

مولانا عبد الحق مدنیؒ	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ	مولانا جلیل احمد کیرانویؒ
مفتی حفیظ الرحمٰن واصفؒ	مولانا محمد علی جوہرؒ	مولانا سید فخر الحسن مرادآبادیؒ
مولانا معراج الحق دیوبندیؒ	مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ	مولانا احتشام الحق تھانویؒ
مولانا اصلح الحسینیؒ	مولانا عبید اللہ انورؒ	مولانا سید اخلاق حسین قاسمیؒ
مولانا نصیر احمد خاںؒ	مولانا عبید اللہ اشرفی مدظلہٗ	مولانا سید اسعد مدنیؒ
مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہٗ	مولانا عبد الحقؒ (اکوڑہ خٹک)	مولانا سید حامد میاںؒ
مولانا سلیم اللہ خاں مدظلہٗ	مولانا مجاہد الحسینی مدظلہٗ	مفتی سید محمد اکمل الحسینیؒ
مولانا جمشید علی خاںؒ	مفتی رشید احمد لدھیانویؒ	مفتی ولی حسن ٹونکیؒ

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ	مفتی محمد شفیع عثمانیؒ	مولانا محمد یوسف بنوریؒ
مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ	مولانا احتشام الحق تھانویؒ	مولانا قاری شریف احمدؒ
مولانا محمد شریف جالندھری (۱)		

ایں سلسلۂ طلائے ناب است

ایں خانہ تمام آفتاب است

(۱) پروفیسر محمد انوار الحسن صاحب علیہ الرحمہ نے یہ شجرہ مرتب کیا تھا؛ لیکن اس پر راقم الحروف نے نظر ثانی کر کے اضافات کیے ہیں۔ پروفیسر صاحبؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کے بعض شاگردوں کے نام دے کر مکمل کر دیا تھا۔ میں نے اسے آگے بڑھا دیا۔ اسی طرح پروفیسر صاحبؒ نے حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کو حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ کے شاگردوں میں شمار کیا تھا، جو غلط تھا، میں نے وہ نام حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں کر دیا ہے۔ اس شجرے میں مزید اضافے کی گنجائش ہے۔ (نعمان)

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے نہ صرف حدیث کی تکمیل کی؛ بلکہ تفسیر جلالین بھی حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے پڑھی تھی۔ ملاحظہ ہو حسب ذیل سند حدیث جو شاہ صاحبؒ نے مولانا کو لکھ کر عطا فرمائی تھی۔ یہ سند ''بیاض یعقوبی'' کے صفحہ ۱۶۳؍ پر درج ہے:

''الحمد لله أولا و آخرًا، والصلاة والسلام على نبيه وصفيه دائما وسرمدا وعلى آله وأصحابه أبدا أبدا. أما بعد! فأقول وبعون الله أصول وأحول وأنا أضعف عباد الله القوي عبدالغني بن أبى سعيد المجددي الدهلوي: ان الأخ الصالح الكاظم محمد قاسم أصلح الله شانه وأكمل ايمانه قد قرأ عليّ[1] الصحيح لأبي الحسين مسلم بن حجاج القشيري النيسابوري وجامع أبي عيسى الترمذي الا القليل من الكتابين؛ فانه سماع غيره والثلث الأخر من صحيح البخارى بالقرأة والسماع ومؤطا مالک بن أنس سمع بعضه بقرأة[2] ابن أخي المولوي مظهر وتفسير الجلالين قرأ عليَّ؛ فلما رأيت تأهله لدراسة الحديث لكمال فطانته وتمام ذهانته مع صلاحية الحال في الاعمال والاقوال والافعال أجزت لي ما تيسر لي من حصول الاجازة من والدي ومرشدي عن الشيخ عبدالعزيز المحدث ــ رحمة الله عليهما ــ وكذلک حصل لي الاجازة من محدث دار الهجرة الشيخ عابد السندي؛ فانى قرأت عليه البخارى وسمعت[3] منه الى كتاب الغسل وأجازني ببقية الكتب وسمعت على الناسک المهاجر الشيخ محمد اسحق ــ رحمة الله تعالى ــ البخاري والترمذي وغيرهما''.

صورة الخاتم:

والله الغني وأنتم الفقراء

---

(۱) حدیث کے حصول کی دو شکلیں ہیں: ایک یہ کہ شاگرد حدیث پڑھے اور شیخ سنے، اس کو ''قرأت علی الشیخ'' کہا جاتا ہے۔ (انوار)

(۲) لیکن اگر کوئی شیخ استاد کے سامنے حدیث پڑھ کر سنا رہا ہے اور دوسرے تلامیذ بھی سن رہے ہیں، تو پھر ''بقراءۃ فلاں'' استعمال کیا جاتا ہے۔ (انوار)

(۳) اگر شیخ حدیث کو شاگردوں کے سامنے سنائے، یا پڑھے، تو شاگرد کے لیے سماع کی صورت ہوگی۔ اس موقع پر شاگرد ''سمعت'' کہتا ہے۔ (انوار)

''اوّل وآخر حمد اللہ کے لیے ہے اور درود وسلام اس کے نبی صفی پر ہمیشہ ہمیشہ اور ان کی آل اور اصحاب پر ہمیشہ ہمیشہ ہو۔ حمد وصلاۃ کے بعد: پس میں کہتا ہوں اور اللہ کی مدد سے نصرت وقوت چاہتا ہوں۔ درآں حالے کہ میں قوی خداوند کے بندوں میں سب سے ضعیف عبدالغنی ابن ابوسعید المجد دی دہلوی ہوں۔ یہ صابر وصالح بھائی محمد قاسم، اللہ تعالیٰ ان کے حال کی اصلاح کرے اور ان کے ایمان کو مکمل بنائے، نے مجھ پر ابوالحسین مسلم ابن حجاج قشیری نیساپوریؒ کی صحیح (مسلم) اور ابوعیسیٰ ترمذیؒ کی جامع (ترمذی) قرأت کی، بجز دونوں (مذکورہ) کتابوں کے تھوڑے سے حصے کے کہ وہ کسی اور سے سنا ہے اور صحیح بخاری کا آخری ثلث مجھ پر پڑھا بھی اور سنا بھی۔ مؤطا مالک ابن انسؒ میرے بھتیجے مولوی مظہر کی قرأت کے ساتھ پڑھا اور تفسیر جلالین بھی مجھ پر پڑھی، جب میں نے حدیث پڑھنے کی اہلیت ان کی پوری فطانت اور ذکاوت نیز اعمال واقوال وافعال میں ان کی صلاحیت پائی، تو ان کے لیے حدیث کی اجازت جو کچھ مجھے اپنے والد اور مرشد سے اور ان کو شیخ عبدالعزیز محدث رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل ہے، دی۔ اسی طرح مجھے محدث دار الہجرت شیخ عابد سندھیؒ سے اجازت حدیث حاصل ہے؛ کیوں کہ میں نے ان پر بخاری پڑھی ہے اور کتاب الغسل تک سنی بھی ہے، انہوں نے مجھے بقیہ کتب حدیث کی بھی اجازت دی، اور میں نے حدیث ناسک مہاجر شیخ محمد اسحاقؒ سے بھی بخاری اور ترمذی اور ان دونوں کے علاوہ کتب حدیث پڑھیں۔

شاہ عبدالغنی کی مہر کی شکل:

''واللہ الغني وأنتم الفقراء''

شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی سند حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے بعض کتب حدیث اور بخاری کے دو ثلث حصے، نیز مسلم اور ترمذی کے قلیل حصے کو کسی اور شیخ سے پڑھا ہے۔ تحقیق بتلاتی ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے حدیث مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوریؒ محشی بخاری سے بھی پڑھی ہے، جیسا کہ دوسری سند حدیث سے واضح ہے۔ اس وقت میرے سامنے مولانا خیر محمد صاحب مہتمم مدرسۂ خیر المدارس ومرید حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ کی سند حدیث ہے، اس میں سند اس طرح بھی ہے:

''مولانا محمود حسن الديوبندي، عن شمس الاسلام قاسم العلوم والحكم مولانا محمد قاسم النانوتويؒ، عن المحدث العارف بالله الغني

الشاہ عبدالغني المجددي الدهلويؒ وعن مظهر الخفي و الجلي الشيخ أحمد علي سهارن پوري، عن الشيخ المشتهر في الآفاق الشيخ محمد اسحٰق الدهلويؒ".

غرض مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے انیس سال کی عمر میں علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغت حاصل کر کے مجتہدانہ شان پیدا کر لی، اوراونچے درجے کے علما میں اپنا مقام حاصل کیا۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۷۷ھ (جنوری ۱۸۶۱ء) میں زیارت حرمین کے لیے روانہ ہوئے۔ اس رمضان میں قرآن کریم کے حفظ کو تا اختتام پہنچایا۔ آپ کے قرآن کریم کے حفظ کرنے کی کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوئی۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

"مولوی صاحبؒ فرماتے تھے کہ فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا ہے، اور جب یاد کیا، پاؤ سپارے کی قدر، یا کچھ اس سے زیادہ یاد کر لیا، اور جب سنایا، ایسا صاف سنایا، جیسے اچھے پرانے حافظ۔ پھر تو اکثر بہت بہت پڑھتے۔ ایک بار یاد ہے کہ ستائیس پارے ایک رکعت میں پڑھے"۔

گویا مولانا نے انتیس سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کیا۔

حاجی امداداللہ صاحبؒ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ:

فارسی کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بہ ما کنند

مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے علوم ظاہری کے سمندر اپنے سینے میں سمو لیے؛ مگر علم روح کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ سر کی نگاہیں محدود ہیں؛ مگر دل کی دوربین نگاہیں عرش سے اوپر کی بلندی کی سیر کرتی ہیں۔ "مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى" کے اشارے دل کی رویت کو صحیح بصارت اور بصیرت تصور کرتے ہیں: ؎

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

مولانا رومؒ نے ایک گہری حقیقت کا مذکورہ شعر میں پردہ چاک کیا ہے۔ ظاہری علم جسم پر چوٹ مارنے کے مرادف ہے، اور باطنی علم دل پر چوٹ لگاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علما اور اولیا کی صحبتیں لمحوں میں وہ جادو کرتی ہیں کہ برسوں میں بے صحبتی سے وہ اکسیر میسر نہیں آتی۔ اسی لیے "يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ"

کے ساتھ ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "یُزَکِّیْھِمْ" کی دعا مانگی۔ تزکیۂ قلوب اولیا کی صحبت سے ہی نصیب ہوتا ہے۔ بہ قول مولانا رومؒ: ؂

یک زمانہ صحبتِ بہ اولیا
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

مولاناؒ کے اندر درویشی کا جوہر بچپن سے تھا اور استعداد قابل تھی۔ آئینۂ دل پر آفتاب کی ضیاباری کی ضرورت تھی۔ آفتاب امداد الٰہی نے ضوفشانی کی اور ماہ تاب قاسمی نور سے جلوہ گر ہوگیا۔ اس باطنی تعلق کی قدریں کہاں سے ابھرتی ہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے قلم کی زبانی سنیے۔ بچپن کے زمانے کی بات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جناب مخدوم العالم حاجی امداد اللہ صاحب سے جو ربط نسب کا تھا، حضرت مخدوم کی نانہال ہمارے خاندان میں تھی اور بہن ان کی یہاں بیاہی تھیں۔ اکثر نانوتہ تشریف لاتے تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نہایت محبت و اخلاص فرماتے۔ جزو بندی کتاب کی حضرت سے ہم دونوں نے سیکھی اور اپنی لکھی ہوئی کتابوں کی جلدیں باندھیں"(۱)۔

تھانہ بھون سے نانوتہ کا قدرتی ٹیلی فون ایک روحانی رسل و رسائل کا سامان پیدا کر رہا تھا۔ آخر جب علوم شرعی سے فراغت ہوئی، تو مولانا نے اس رہبر کامل کو اپنا مرشد بنایا اور قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تینوں نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے دست مبارک پر بیعت کی اور ریاضت و مجاہدے، ذکر و شغل، عبادت و زہد، تقویٰ و علم سے یہ تینوں شمعیں جگ مگا اٹھیں۔

حاجی امداد اللہ صاحبؒ رسالہ "وحدۃ الوجود" میں تحریر فرماتے ہیں:

"مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم و مولوی رشید احمد صاحب و مولوی محمد یعقوب صاحب و مولوی احمد حسن صاحب وغیر ہم از عزیزانِ فقیر ان و تعلق بافقیری دارند"۔

حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فقر و مقام ولایت کا اجمالی تذکرہ اس سے پہلے قسط میں ہو چکا ہے(۲)۔ مختصر یہاں پر اتنا کہہ دوں کہ مولانا اشرف علی صاحبؒ نے "امداد المشتاق" میں تحریر فرمایا ہے:

(۱) سوانح قاسمی، ص:۵۔
(۲) جیسا کہ اس مضمون کے تعارف میں لکھا گیا ہے کہ زیر نظر مضمون کا ایک حصہ یہاں شامل کیا گیا ہے، جو حضرت نانوتویؒ سے متعلق ہے۔ حضرت حاجی صاحبؒ پر پروفیسر صاحبؒ نے لکھا ہے، یہاں اس کی طرف اشارہ ہے۔ (نعمان)

”حاجی صاحب بہ ظاہر تو میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانویؒ کے مرید تھے؛ لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں حاجی صاحبؒ کو بیعت کے لیے اپنا ہاتھ بڑھانے کے لیے فرمایا اور حاجی صاحبؒ کی براہِ راست بیعت لی۔ حاجی صاحبؒ سے عرب وعجم دونوں کو روحانی فیض پہنچا“۔

اس مقام پر مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا روحانی شجرہ پیش کرنا اگرچہ مضمون کو طول کی طرف مائل کر رہا ہے؛ لیکن مولانا کی ذات کی صحیح قدروں کا اندازہ اور صحیح صلاحیتوں کی اصلیت کا پتہ چلانے کے لیے راقم الحروف کو بسط سے ہی لکھنے کی طرف مجبور کر رہا ہے۔

شجرہ:

حسب ذیل شجرۂ سلوک ملاحظہ ہو:

مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فارسی زبان میں اپنا شجرہ خود تحریر فرمایا ہے، جو ”قصائد قاسمی“ کے آخر میں مطبوعہ موجود ہے۔ از راہِ طوالت چھوڑتا ہوں؛ البتہ مولانا کی خود دستاویزی سند کے لیے چند شعر اوّل وآخر کے پیش کرتا ہوا پورا شجرہ اپنی عبارت میں لکھتا ہوں:

الٰہی غرق دریائے گناہم	تو می دانی وخود ہستی گواہم
بہ حقِ مقتدائے عشق بازاں	رئیس وپیشوائے جاں گدازاں
شہِ والا گہر امداد اللہ	کہ بہ ہر عالم است امداد اللہ
شہِ نور محمد، نور مطلق	امامِ اولیا صدیق بر حق

مولانا محمد قاسم صاحب - حاجی امداد اللہ - میاں جی نور محمد (۱) - حاجی عبد الرحیم - شیخ عبد الباری - شاہ عبد الہادی - شاہ عضد الدین - شاہ محمد - شاہ محمدی - شاہ محبّ اللہ - بوسعید - شاہ نظام الدین - شاہ جلال الدین - شاہ عبد القدوس - شیخ محمد - شیخ احمد عارف - شہ احمد عبد الحق - شاہ جلال الدین - شیخ شمس الدین ترک - شیخ علاؤ الدین صابر کلیری - شیخ فرید الدین شکر گنج - خواجہ قطب الدین مقتول - شاہ معین الدین سنجری - خواجہ عثمانی - شاہ شریف ژندنی - خواجہ مودود چشتی - شاہ ابو یوسف - شاہ ابو محمد - ابو احمد ابدال چشتی - شیخ ابو اسحاق شامی - خواجہ شمشاد علوی - شاہ بوہبیرہ بصری - شیخ حذیفہ مرعشی - شیخ ابراہیم ادہم - شاہ فضیل - خواجہ عبد الواحد - شیخ حسن بصری - حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ۔

---

(۱) میاں جی نور محمدؒ کے پیر حاجی عبد الرحیم صاحب مشہور صاحب ولایت ہیں، انہوں نے باوجود مسند ارشاد پر ہونے کے حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی خود بھی بیعت کی تھی اور اپنے خلیفہ نور محمد صاحب جھنجھانویؒ اور دوسرے مریدوں کی بھی بیعت کرائی۔ (سیرۃ سید احمد شہید، ص: ۲۵۴) (انوار)

بہ حق آں کہ مداحش خدا شد	رسول پاک او را رہنما شد
علی ابن ابی طالبؓ کہ خورشید	ہنوز خاک پائے او درخشید
بہ حق آں کہ او جان جہانست	فدائے روضہ اش ہفت آسماں ست
بہ حق سرور عالم محمدؐ	بہ حق برتر عالم محمدؐ
بہ چشم لطف اے حکم تو بر سر	بہ حالِ قاسم بے چارہ بہ نگر

شجرۂ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے اول وآخر کے چند اشعار اور حسب مقصد مختلف جگہ سے اشعار نوٹ کیے ہیں اور درمیان میں سلسلے کے تمام نام شجرۂ منظومہ میں سے نوٹ کردیے گئے ہیں۔

مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا مقام سلوک:

بیعت ہونے کے بعد مولانا نے سلوک کی منزلوں کے طے کرنے میں جو جدوجہد کی، وہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی زبانی سنیے!

''مولوی محمد قاسم صاحبؒ نے ریاضتیں ایسی کی ہیں کہ کیا کوئی کرے گا؟ اشغال دشوار، جیسے حبس دم اور سہ پایہ مدت تک کیے ہیں، اور بارہ تسبیح اور ذکر ارہ کا دوام تھا ہی، سر کے بال شدت حرارت سے اڑ گئے تھے۔ حرارت مزاج میں ایسی آ گئی تھی کہ کسی صورت سے بھی فرو نہ ہوتی تھی؛ کیوں کہ یہ حرارت قلب کی تھی، اور اس کے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوئی۔ یہی آخر مرض کا باعث ہوئی اور اسی میں آخر انتقال کیا''(۱)۔

عشق نے پھونک دیا خرمن ہستی انور
کس گھڑی آگ لگی تھی کہ بھڑکتی ہی رہی

ایک اور جگہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ لکھتے ہیں:

''باوجودے کہ کشف تمام تھا؛ مگر کبھی زبان سے کچھ نہ فرماتے۔ ادنیٰ ادنیٰ اہل نسبت کے پاس بیٹھنے سے اثر ہوتا ہے، مولانا کو یہ ضبط تھا کہ کبھی کچھ اثر ظاہر نہ ہوتا تھا۔ ایک بار مولوی صاحبؒ نے میرٹھ میں مثنوی مولانا رومؒ پڑھانا شروع کی، دو چار شعر ہوتے اور عجیب وغریب مضمون بیان ہوتے۔ ایک صاحب کچھ رنگ باطنی رکھتے تھے، سن کر یہ سمجھے کہ یہ اثر تبحر علمی کا ہے، اور چاہا کہ کچھ مولانا کو فیض باطنی دیا جائے۔ درخواست کی کہ کبھی تنہا ملیے۔ آپ نے فرمایا مجھے کار چھاپہ خانے کا اور پڑھانا طلبا کا رہتا ہے، تنہائی کہاں؟ آپ جب چاہیں تشریف لائیں۔

(۱) سوانح قاسمی، ص:۱۶۔

وہ صاحب ایک روز تشریف لائے، اور کہا کہ آپ ذرا میری طرف متوجہ ہوں، اور خود آنکھ بند کر کر مراقب ہوئے۔ مولانا سبق پڑھا رہے تھے؛ البتہ موقوف کر دیا؛ مگر کبھی آنکھ کھلی اور کبھی قدرے بند۔ ان کی طرف متوجہ ہوئے، ان کا یہ حال ہوتا تھا کہ کبھی قریب گرنے کے ہو جاتے تھے اور پھر سنبھل بیٹھتے تھے۔ کچھ دیر یہ معاملہ رہا، پھر وہ اٹھ کر نیچی نگاہ کیے چلے گئے۔ پھر بہت معذرت کی"[1]۔

اللہ اللہ! کیا خوب روحانی جنگ تھی۔ اس نقشے سے دل چٹخارے لینے لگا۔ اس واقعہ سے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے کمال روحانیت اور اس پر ضبط ولایت کا طرّہ نور علیٰ نور ہے۔ میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے مقام معرفت پر زیادہ کیا لکھوں؟ یہ تو "ولی را ولی می شناسد" کا معاملہ ہے۔ لہٰذا حاجی امداد اللہ صاحبؒ جو مولانا کے مرشد ورہبر ہیں، انہیں کی زبانی ان کے مرید کامل کا حال سنیے۔ حاجی صاحبؒ "ضیاء القلوب" کے آخر میں لکھتے ہیں:

"مولوی رشید احمد صاحب سلمہٗ ومولوی محمد قاسم صاحب سلمہٗ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند بجائے من فقیر راقم اوراق؛ بلکہ بہ مدارج فوق ازمن شمارند، اگر چہ بہ ظاہر معاملہ برعکس شد کہ اوشاں بجائے من ومن بہ مقام اوشاں شدم وصحبت اوشاں را غنیمت دانند کہ ایں چنیں کہ ان دریں زمانہ نایاب اند واز خدمت بابرکت ایشاں فیض یاب بودہ باشند وطریق سلوک کہ درایں رسالہ نوشتہ شد درنظر شاں تحصیل نمایند ان شاء اللہ تعالیٰ بے بہرہ نہ خواہند ماند۔ اللہ تعالیٰ درعمر شاں برکت دہاد"[2]۔

ترجمہ از فارسی: "مولوی رشید احمد صاحب سلمہٗ اور مولوی محمد قاسم صاحب سلمہٗ کو، جو کہ ظاہری اور باطنی علوم کے کمالات کے مجموعہ ہیں، مجھ راقم الحروف فقیر کے قائم مقام جانیں؛ بلکہ مدارج (سلوک) میں وہ مجھ سے زیادہ ہیں، اگر چہ بہ ظاہر معاملہ اُلٹا ہو گیا کہ وہ میرے مقام پر اور میں ان کے مقام پر ہو گیا۔ ان کی صحبت کو غنیمت جانیں کہ ان جیسے لوگ اس زمانے میں نایاب ہیں۔ ان کی خدمت بابرکت سے فیض یاب ہوں اور جو فقیر کے طریقے اس رسالے (ضیاء القلوب) میں لکھے گئے ہیں، ان کے زیر نظر حاصل کریں، ان شاء اللہ تعالیٰ! بے بہرہ نہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے"۔

---

(۱) سوانح قاسمی، ص: ۷-۱۶۔

(۲) ضیاء القلوب، ص: ۶۰۔

حاجی صاحبؒ کی اس عبارت کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ کے مقام معرفت کے متعلق اور کچھ کہنا مناسب نہیں۔ انہوں نے ایک جملہ یعنی ''معاملہ برعکس شد کہ اوشاں بجائے من و من بہ مقام اوشاں شدم'' میں جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ انکسار ہے یا واقعیت؟ اہل نظر کے لمحات فکر یہ پر چھوڑتا ہوں۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے حضرت سید احمد بریلویؒ کے متعلق فرمایا تھا، جس کا حوالہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' میں دیا ہے، لکھتے ہیں:

''مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی کے الفاظ ہیں:

مجھ کو حضرت سید احمد صاحبؒ کے ساتھ محبت و عقیدت اعلیٰ درجے کی ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے پیر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے بڑھ کر ہیں، باقی خدا جانے کون بڑھ کر ہے؛ لیکن میرے دل میں ہمیشہ یہی آتا ہے۔ میں اپنے قلب کا مختار نہیں ہوں''[1]۔

یہ ہیں مولانا محمد قاسم صاحبؒ کہ جو نہ صرف عالم و فاضل تھے؛ بلکہ ایک عارف کامل بھی تھے، جن کے لیے میں اپنے قلب کا مختار نہیں ہوں:

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بہ ما کنند

اجازت خلافت یا تکمیل روحانیت:

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ظاہری اور باطنی تحصیل علوم و تکمیل کا ایک خاکہ آپ کے سامنے گزشتہ اوراق میں آچکا ہے۔ ظاہری علوم کی تحصیل کا دور انیس بیس سال کی عمر تک چلا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ عمر کے ان لمحات تک علوم ظاہری سے فارغ ہو چکے تھے؛ لیکن باطنی علوم اور روحانی واردات کا عرصہ ایک ایسا عرصہ ہے، جو تمام عمر بھی ختم نہیں ہوتا۔ ظاہری علوم بھی مہد سے لحد تک ختم ہونے والے کہاں ہیں، تاہم روحانی اور ظاہری علوم کی تکمیل اس خیال کا ثمرہ ہوتا ہے کہ مرشد ظاہر و باطن اپنے شاگرد یا مرید کو قوت علمیہ یا باطنیہ کے ذریعے معلوم کر کے اس کو بھی پڑھانے یا بیعت لینے کی اجازت دے دے۔ بہ ظاہر یہی ظاہر باطن کی تکمیل کی سند متصور ہوگی۔

چناں چہ ظاہری علوم کی سند کے گزشتہ اوراق میں حوالے دیے جا چکے ہیں، اور باطنی علوم کی تکمیل کے لیے بھی ایک تحریر ''ضیاء القلوب'' مصنفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ مرشد و رہبر حضرت حجۃ الاسلامؒ کی

(۱) سیرت سید احمد شہید، ص: ۲۳۷۔

پیش کی جا چکی ہے، لیکن یہ تکمیل تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہے کہ مولانا نانوتویؒ کو ان کے مرشد کی طرف سے دوسروں کو بیعت کرنے یا روحانی تعلیم دینے کی اجازت کب ملی؟ افسوس کہ کوئی صاف صاف اس سلسلے میں جو سن کو متعین کر سکے نہ مل سکی۔

یہ حقیقت کتنی حسین ہے کہ یہ حضرات ظاہری علوم ہوں، یا باطنی؛ اس لیے نہیں حاصل کرتے تھے کہ ان کو پیر و مرشد بننے یا عالم کہلانے کا شوق تھا، یا ریاکاری اور تزویر ان کا مقصد تھا۔ یہ تو وہ خدا رسیدہ اللہ کے پیارے بندے تھے، جن کے دامنوں پر فرشتے نماز پڑھنا فخر سمجھتے تھے؛ اس لیے اپنی روحانی تشنگی کے بجھانے کے لیے ان برگزیدہ ہستیوں نے اپنے آپ کو اللہ کی رضا میں فنا کر دیا تھا۔ بہر حال حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی باطنی علوم کی فراغت کے متعلق تحقیق کا رشتہ حسب ذیل امور سے ملے گا:

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سوانح قاسمی میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی زمانۂ طالب علمی کی ذکاوت و ذہانت کی تعریف کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''یہی حال جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی سلمہٗ اللہ تعالیٰ کا تھا۔ مولوی (محمد قاسم) صاحبؒ سے اسی زمانے سے دوستی اور ہم سبقی رہی۔ آخر حدیث جناب شاہ عبدالغنی صاحب مرحوم کی خدمت میں پڑھی، اور اسی زمانے میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب دام ظلہٗ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا''[۱]۔

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ منزلِ سلوک میں دونوں نے ظاہری علوم سے فراغت کے بعد ایک ہی زمانے میں قدم رکھا ہے؛ لیکن اسی زمانے سے دنوں کا ایک ہی دن میں، یا بالکل ساتھ بیعت ہونا مراد نہیں ہے؛ کیوں کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ ''جمیل الکلام'' کے ملفوظ نمبر ۲۱۶ر میں فرماتے ہیں:

> ''مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو (حاجی صاحب نے) اس کے قبل بیعت کر لیا تھا؛ مگر مولانا (رشید احمد صاحب) گنگوہیؒ نے کئی روز بعد درخواست کی؛ اس لیے ان کی بیعت کئی دن بعد ہوئی''[۲]۔

اس عبارت سے زمانے کا اتحاد؛ مگر چند دن کا تقدم و تاخر صاف ثابت ہو گیا، اور یہ بھی تاریخ کی روشنی میں واضح ہو گیا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ علیہ انیس سال کی عمر میں ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) میں تعلیم سے فارغ ہوئے ہیں، اور وہی زمانہ بیعت کا ہے، جب کہ حضرتؒ کی پیدائش ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) کی ہے۔

---

(۱) سوانح قاسمی، ص: ۷۔

(۲) جمیل الکلام، ص: ۷۷۔

بہر حال! دونوں حضرات چند روز کے آگے پیچھے ایک ہی زمانے میں بیعت ہوئے۔ حضرت گنگوہیؒ نے بیعت کا انکشاف اس طرح فرمایا ہے:

''میں نے ایک بار خواب میں دیکھا تھا کہ مولوی محمد قاسم صاحب عروس کی صورت میں ہیں اور میرا ان سے نکاح ہوا ہے، سو جس طرح زن وشوہر میں ایک دوسرے سے فائدہ پہنچتا ہے، اسی طرح مجھے ان سے اور انہیں مجھ سے فائدہ پہنچا ہے۔ انہوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف کر کے ہمیں مرید کرایا اور ہم نے حضرت سے سفارش کر کے انہیں مرید کرا دیا''(۱)۔

اب ''تذکرۃ الرشید'' کی حسب ذیل تاریخی تحقیق مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی باطنی و روحانی تکمیل کے متعلق پڑھیے:

''امام ربانی حضرت مرشدنا و مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ انہیں فرشتہ خصلت خوش نصیب جماعت میں ہیں، جن کی باطنی تعلیم کا زمانہ بہت ہی قلیل تھا۔ چناں چہ حصۂ اول میں بیان ہو چکا ہے کہ آپ اپنے مرشد اعلیٰ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں صرف چالیس روز رہے، اور اکتالیس ویں دن جب کہ آپ وطن کو روانہ ہوئے، تو مرشد العرب والعجم نے کام یابی کا پروانہ آپ کو عطا فرما دیا اور بیعت لینے کی اجازت دے دی تھی''(۱)۔

اس عبارت سے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی روحانی تکمیل کا ایک چلے، یعنی چالیس دن میں مکمل ہونا معلوم ہوتا ہے، اور یہ کہ روحانی تکمیل کی سند کے بعد ان کو دوسروں کی اصلاح کرنے اور بیعت لینے کی اجازت دے دی تھی؛ لیکن یہ عمر کا کون سا زمانہ تھا؟ اس کی تحقیق حسب ذیل عبارت سے معلوم ہوتی ہے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ ''تذکرۃ الرشید'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''امام ربانی قدس سرہٗ کو اس مشعل کی روشنی میں جو آپ کو مشائخ کے معمول و متداول طریق سے پچیس سال کی عمر میں عطا ہوئی تھی، جھلکتا ہوا صاف نظر آ رہا تھا کہ شہنشاہ کی پیشی کے وقت سب سے پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ نمونے کے موافق مہذب بن کر آئے ہو یا نہیں''؟(۲)۔

اس عبارت نے تاریخی حقیقت کے قریب لا کر کھڑا کر دیا کہ حضرت گنگوہیؒ نے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے تعلیم و رشد میں شریک رہے ہیں، پچیس سال کی عمر میں منزل سلوک طے کر لی تھی، اور اسی

---

(۱) تذکرۃ الرشید، ج:۲،ص:۲۸۹۔

(۲) ایضاً، ج:۲،ص:۷۔

(۳) ایضاً، ج:۲،ص:۱۴۔

سال پچیس کی عمر میں آپ نے تعلیم سے فراغت پالی تھی، نیز کہ حضرت گنگوہیؒ ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۹ء) میں پیدا ہوئے تھے۔ چناں چہ تذکرۃ الرشید: جلد دوم، صفحہ ۲۸۲ ر میں حسب ذیل الفاظ میں آپ کا سن پیدائش آپ ہی کی زبانی تحریر فرمایا گیا ہے:

''حضرت (حاجی صاحب) کی عمر اب پچاسی یا چھیاسی سال کی ہے، اور میری بہتر سال کی۔ میری پیدائش ۱۲۴۴ھ ر کی ہے۔ حضرت (حاجی صاحب) میں اور مجھ میں تیرہ یا چودہ سال کی کمی بیشی ہے''۔

بہر حال! یہ مسلّم ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا گنگوہیؒ دونوں حضرات حاجی صاحبؒ کے سب سے زیادہ مقرب اور چہیتے مرید تھے اور دونوں پر حاجی صاحبؒ کو بہت ناز تھا۔ دونوں صاحبِ علم وعمل، ظاہر و باطن میں درویش صفت تھے، اور علمِ شریعت وطریقت کے انوار ان کی ناصیۂ پر از تجلیات سے روشن تھے۔ اندریں حالات ان دونوں حضرات کی آتشِ عشقِ الٰہی کو صرف ہوا دینے کی ضرورت تھی۔ چناں چہ آفتاب امدادی کی ادھر ضیا باری ہوئی، اور ادھر آئینۂ قلب قاسمی ورشیدی جگ مگا اٹھا؛ اس لیے تحقیق اس امر کے قریب لاکر کھڑا کر دیتی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے بھی اجازت وخلافت ۱۲۶۷ھ ر یا ۱۲۶۸ھ (۵۲-۱۸۵۱ء) میں حاصل کر کے روحانیت وسلوک کی وہ منزل طے کر لی تھی، جس میں وہ دوسروں کو شمع ہدایت وروحانیت دکھا سکتے تھے۔

روحانیتِ قاسمی کا اعلیٰ مقام اور من تو شدم تو من شدی کا مظاہرہ:

منزلِ سلوک میں مبتدی، متوسط، اور متوسط بن کر سالک درجات طے کرتا ہے، جن کے معنی یہ ہیں:

۱- مبتدی وہ ہوتا ہے، جس کے دل میں راہِ سلوک کی طلب جوش مارنے لگتی ہے، اور اس راہ کا ذوق وجذبہ پیدا ہوتا ہے۔

۲- دوسرا مقام متوسط کا ہے۔ اس مقام میں طلب وذوق غالب آجاتے ہیں، اور پرانی عادات کو انسان بدل ڈالتا ہے۔ چناں چہ اس کے افعال، حرکات وسکنات میں ایک خاص تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، جن کی محبت پہلے تھی نکل جاتی یا دھیمی پڑ جاتی ہے۔

۳- تیسرا مقام منتہی کا ہے۔ منتہی اس کو کہا جاتا ہے کہ یادِ الٰہی کے سوا اس کا دل سب سے خالی ہو جائے۔ یہ مقام فنا کا ہے؛ البتہ اگر اس میں کچھ کمی رہ جائے، تو گاہے گاہے کسی کی یاد آکر ایسا اثر دکھاتی ہے، جس طرح تنکا ہوا سے ہل جاتا ہے۔ اس مقام میں غیروں کی یاد اور محبت فنا ہو جاتی ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی روحانی زندگی کے مختلف آثار دیکھے جائیں،تو آپ کا مقام ۱۲۸۱ھ/ (۱۸۶۴ء) میں منتہی کا مقام تھا۔ یہ وہ وقت تھا، جب کہ آپ روحانی امامت کے درجے پر فائز ہو چکے تھے؛ حتی کہ آپ کے شیخ نے (جیسا کہ ضیاء القلوب مصنفہ حاجی امداداللہ صاحبؒ کی عبارت سے واضح ہے)، آپ کے لیے شیخ کامل کی سند سے نوازا تھا۔ یہ وہ مقام ہے، جس میں شیخ و مرشد، یعنی حضرت حاجی صاحبؒ اور مرید کامل مولانا محمد قاسم صاحبؒ ''من تو شدم تو من شدی'' ہو چکے ہیں۔ مکرر حاجی صاحبؒ کی ضیاء القلوب والی سند'' پھر پیش کرتا ہوں، جس میں حضرت مولاناؒ کو امامت کا مرتبہ اور سند دی گئی ہے۔ حاجی صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''و نیز ہر کس کہ ازیں فقیر محبت وعقیدت دارد مولوی رشید احمد صاحب سلمہٗ و مولوی محمد قاسم صاحب سلمہٗ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند بجائے من فقیر راقم الاوراق؛ بلکہ بہ مدارج فوق از من شمارند''۔
>
> **ترجمہ از فارسی:** ''اور نیز جو شخص کہ اس فقیر سے محبت وعقیدت رکھتا ہے، مولوی رشید احمد صاحب سلمہٗ اور مولوی محمد قاسم سلمہٗ کو جو کہ ظاہری و باطنی کمالات کے جامع ہیں، مجھ فقیر کی جگہ بلکہ مدارج میں مجھ سے بھی اوپر خیال کریں''۔

اس عبارت سے مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور حضرت گنگوہیؒ دنوں کا منتہی مقام پر پہنچنا، جامع کمالات ظاہری و باطنی ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے، جس میں شیخ ہر دو حضرات کو نہ صرف اپنے مقام پر؛ بلکہ اپنے سے بھی فوق ہونے کا سرٹیفکیٹ دے رہے ہیں؛ بلکہ اس مقام کا سرٹیفکیٹ حضرت حاجی صاحبؒ نے اپنے الہام کی بنا پر دیا ہے۔ چناں چہ مولانا اشرف علی صاحبؒ کی زبانی حضرت حاجی صاحبؒ نے مکۂ معظّمہ سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو حسب ذیل پیغام بھیجا تھا:

> ''مولانا رشید احمد صاحب سے کہہ دینا کہ گو آپ کے مخالف لوگ یہاں آ کر طرح طرح کی باتیں لگاتے ہیں؛ مگر آپ اطمینان رکھیں، یہاں ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ہماری آپ کی محبت اللہ کے واسطے ہے، اور جب اللہ باقی ہے، اسی طرح جو محبت اللہ کے لیے ہوتی ہے، وہ بھی باقی ہوتی ہے، اور میں نے جو کچھ 'ضیاء القلوب' میں آپ کی نسبت لکھا ہے، وہ الہام سے لکھا ہے۔ کیا میرا وہ علم اب بدل جائے گا''؟ (یادیاراں)

اس عبارت کا پیغام اگر چہ حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ کو خطاب کر کے ہے؛ لیکن اس الہام میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ

کا مقام امامت روحانیت الہام امدادی سے مستند ہو چکا تھا، اور مولانا گنگوہیؒ کے تذکرے میں حاجی صاحبؒ کے تعلق کا ان کے ساتھ یہ حال ہو گیا تھا جیسا کہ مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا:

''میرا حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ برسوں یہ تعلق رہا ہے کہ بغیر آپ کے مشورے کے میری نشست و برخاست نہیں ہوئی۔ حال آں کہ حاجی صاحبؒ مکہ میں تھے، اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی تعلق برسوں رہا ہے''(۱)۔

گزشتہ اسی فارسی عبارت کے حاشیہ پر حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک تحریر اور بڑھائی ہے، جس سے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ وغیرہ کو مجاز خلافت قرار دیا ہے؛ چناں چہ تحریر فرماتے ہیں:

''وہم چناں عزیزم مولوی یعقوب صاحب نانوتوی وحافظ محمد یوسف تھانوی ومولوی کرامت علی صاحب ساکن ضلع انبالہ و مولوی محمد ابراہیم ساکن موضع اجراور را دانند کہ اوشان نیز مجاز ند......الخ''(۲)۔

ترجمہ از فارسی: ''اور اسی طرح عزیزم مولوی یعقوب صاحب نانوتوی اور حافظ محمد یوسف تھانوی اور مولوی کرامت علی صاحب ساکن ضلع انبالہ اور مولوی محمد ابراہیم ساکن موضع اجراور کو بھی کہ وہ بھی مجاز ہیں......''۔

اوپر کی عبارت سے حضرت نانوتویؒ وحضرت گنگوہیؒ کی امامت اور حاشیے کی عبارت سے دیگر حضرات کی خلافت کا ثبوت ملتا ہے؛ لیکن حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو یہ امامت کا مقام کب ملا؟ اس کی تحقیق ''ضیاء القلوب'' کی تصنیف کے سن پر موقوف ہے۔ چناں چہ بحمد اللہ تحقیق سے ''ضیاء القلوب'' کے تصنیف کا سن بھی مل گیا۔ حضرت حاجی صاحبؒ مذکورہ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''نام ایں رسالہ 'ضیاء القلوب' نہادہ شد''۔

پھر اسی فارسی عبارت کے حاشیے پر حاجی صاحبؒ بہ قلم خود تحریر فرماتے ہیں:

''واسم تاریخی ایں رسالہ 'مرغوب اہل دل است''۔

یعنی ''ضیاء القلوب'' کا تاریخی نام ''مرغوب دل'' ہے، جس کے اعداد ۱۲۸۱ھ نکلتے ہیں۔ لہٰذا مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی روحانی امامت کی تکمیل ۱۲۸۱ھ (۶۵-۱۸۶۴ء) میں ہونا واضح ہو جاتی ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک! گویا کہ ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) ابتدائے بیعت سے ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) مقام امامت تک چودہ سال کا عرصہ چلا گیا ہے۔

---

(۱) تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۱۹۷۔
(۲) حاشیہ ضیاء القلوب۔

حضرت کی زندگی کے تین حصے:

حضرت قاسم العلومؒ کے لحاتِ زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کرنا مناسب ہوگا:

۱- پہلا دور پیدائش ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء سے ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۰ء تحصیل علم تک۔

۲- دوسرا دور ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۰ء سے ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء تاسیس دار العلوم تک۔

۳- تیسرا دور ۱۲۸۳ ہجری/ ۱۸۶۶ء سے ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء وفات تک۔

یہ ہیں حضرت قاسم العلومؒ کی حیات طیبہ کے انچاس سال کے مختصر عرصے کے ادوار۔ حجۃ الاسلامؒ کی پیدائش اور وفات کا عیسوی سن میں نے خود قیاساً متعین کیا ہے، اور اس عیسوی سال کے تعین کا ماخذ چاندا پور ضلع شاہ جہاں پور کے مناظروں کی تاریخیں اور عیسوی سن ہیں (۱)۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب علیہ الرحمہ جو حضرت مولاناؒ کے شاگرد عزیز ہیں، ''حجۃ الاسلام'' مطبوعہ قاسمی پریس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''بندہ محمود حمد وصلاۃ کے بعد طالبانِ معارف الٰہیہ اور دل دادگان اسرار ملت حنفیہ کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ: ۱۸۷۶ء میں پادری نولس صاحب اور منشی پیارے لال صاحب ساکن چاندا پور، متعلقہ شاہ جہانپور نے بہ اتفاق رائے جب ایک میلہ بہ نام میلۂ خدا شناسی موضع چاندا پور میں مقرر کیا، تو اس وقت معدن الحقائق، مخزن الدقائق، مجمع المعارف، مظہر اللطیف، جامع الفیوض والبرکات، قاسم العلوم والخیرات سیدی ومولائی حضرت مولانا مولوی محمد قاسم، متعنا اللہ تعالیٰ بعلومہ ومعارفہ نے اہل علم کی طلب پر میلۂ مذکورہ کی شرکت کا ارادہ ایسے وقت مقرر فرمایا کہ تاریخ مباحثہ، یعنی ۷/ مئی سر پر آ گئی تھی'' (۲)۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ عبارت سے مناظرۂ شاہ جہاں پور کا سن عیسوی و تاریخ ۷/ مئی ۱۸۷۶ء متعین ہو جاتی ہے۔ اسی قسم کا مذہبی میلہ اگلے سال ۱۹/ ۲۰/ مارچ ۱۸۷۷ء کو منعقد ہوا۔ حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ تلمیذ رشید مولانا نانوتویؒ لکھتے ہیں:

''اس جلسے (میلۂ خدا شناسی منعقدہ ۱۸۷۶ء) کے لطف نے ایسا خدا شناسی کا شائق بنایا کہ یہ میلہ ہر سال موسم بہار میں مقرر ہوا؛ چناں چہ اب کے ۱۹/ ۲۰/ مارچ کو اس کا انعقاد تجویز ہو کر منشی پیارے لال نے اشتہار جابہ جا بھیجے'' (۳)۔

---

(۱) یہ تحریر دیکھ کر کوئی بدعتی یہ الزام نہ لگا دے کہ حضرت گنگوہیؒ (نعوذ باللہ) ہم جنس پرست تھے۔ خواب میں ہر طرح ہر چیز دیکھی جا سکتی ہے۔ تعبیر کچھ اور ہوتی ہے؛ اس کے لیے ملکہ زبیدہ مرحومہ کا خواب اور اس کی تعبیر ذہن میں رہے۔ (نعمان)

(۲) حجۃ الاسلام، ص: ۱/۲۔

(۳) مباحثۂ شاہ جہاں پور، ص: ۴۔

اس عبارت سے ۱۹/۲۰/ مارچ ۱۸۷۷ء/ کو میلۂ خدا شناسی کا منعقد ہونا متحقق ہو گیا۔ اس مباحثہ میں بھی حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے شرکت فرمائی تھی۔

پہلے سال یعنی ۱۸۷۶ء/ کے مباحثہ کے حالات حضرت مولانا فخر الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ مولوی محمد ہاشم علی صاحبؒ مہتمم مطبع ہاشمی اور منشی محمد حیات صاحبؒ مہتمم مطبع ضیائی نے بھی تحریر فرمائے ہیں، جس میں مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ کی تمام تقریر اور وہاں کے اثرات کا مفصل ذکر کیا ہے۔ ان دونوں حضرات نے اس مباحثہ پر مشتمل کتاب کا نام ''گفتگوئے مذہبی'' اور ''میلۂ خدا شناسی'' رکھا ہے۔ یہ دونوں نام تاریخی ہیں، جن سے ۱۲۹۳ھ/ کے عدد نکلتے ہیں؛ لہٰذا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ نے عیسوی ۱۸۷۶ء/ ظاہر فرما کر اور مولوی محمد ہاشم علی صاحبؒ نے تاریخی نام رکھ کر جن سے ۱۲۹۳ھ/ عدد نکلتے ہیں، عیسوی اور ہجری سن میں مطابقت پیدا کر دی۔

ان تحریروں کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء/ کے مطابق تھا۔ حضرت مولانا کا انتقال جیسا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے سوانح قاسمی، مکاتیب یعقوبی میں تحریر فرمایا ہے ۱۲۹۷ھ/ ہے۔ لہٰذا عیسوی ۱۸۸۰ء/ متحقق ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں حضرتؒ کی عمر چوں کہ انچاس سال کی ہوئی ہے، اور یہ چاند کے حساب سے ہے، اور شمسی سال سے قمری سال دس دن چھوٹا ہے، شمسی سال کے حساب سے سولہ ماہ دس دن کم کر کے حضرت مولانا کی شمسی سال کی عمر سینتالیس سال کچھ ماہ متعین ہوتی ہے، اور آپ کی پیدائش تقریباً ۱۸۳۲ء/ کی متحقق معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے اثنائے تحقیقات میں کہیں سن عیسوی کی تصریح مل سکے۔ افسوس کہ دوامی جنتری لاہور میں مل نہ سکی[۱]۔

برسرِ مطلب:

میں اپنے خیال کی ترتیب میں کہاں سے کہاں نکل گیا، اور سن عیسوی کی تحقیق نے مضمون کو طوالت کی طرف مائل کر دیا۔ میں تو یہ لکھ رہا تھا کہ حضرت مولانا نانوتویؒ کی زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے۔ پہلے دور کا مختصر خاکہ ختم ہو چکا۔ اب راقم الحروف دوسرے دور کے مختصر

(۱) اللہ اکبر! پروفیسر صاحبؒ نے کتنی وضاحت سے لکھ دیا ہے کہ مجھے تقویم کی جنتری نہ مل سکی؛ لیکن قیاس پھر بھی درست ہوا۔ آج کل ''بعض لکھاری'' صرف ہجری تاریخ اور سن پر اکتفا کرتے ہیں، جو اصولِ تحریر کے خلاف ہے۔ یہ تحریرات صرف مولوی نہیں پڑھتے؛ بلکہ آج کا مولوی تو پڑھتا ہی نہیں، اور جس کو اللہ نے ذوق مطالعہ دیا ہے، وہ بہت ہی قلیل ہیں۔ آج ہمارے اکثر اہل علم کا یہ حال ہے کہ درس و تدریس کی کتب کے علاوہ کوئی اور کتاب پڑھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہجری تاریخ و سن کے ساتھ عیسوی تاریخ بھی لکھا کریں، تاکہ عوام الناس کو بھی سہولت رہے۔

حالات پیش کرنا چاہتا ہے۔ بہ حیثیت مقالہ نگار زندگی کے واقعات کو سن وار بیان کرنا میرا نہیں یہ سوانح نگار کا فریضہ ہوتا ہے۔ میرا موضوع ''تذکرہ ادبائے دار العلوم دیوبند'' ہے؛ لیکن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند کے بانی اور انیسویں صدی عیسوی، یا تیرھویں صدی ہجری کے زبردست اسلامی نمائندے اور ہماری نشأۃ ثانیہ کے مصلح ہیں؛ اس لیے باوجود عنوان کے محدود ہونے کی حضرت حجۃ الاسلامؒ کے محض ادب پر خامہ فرسائی کرنا بھی ان کی ذات والا صفات کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے؛ اس لیے سوانح نگاری کے مقام سے نیچے اتر کر؛ مگر صرف ادب کے تذکرے سے بلند ہو کر مولانا کی شخصیت کو آپ کے سامنے پیش کروں گا، جس میں ان کی دنیائے علم وعمل کا ایک منظر آپ کے سامنے آسکے گا۔

مآخذ سوانح حجۃ الاسلام:

حضرت حجۃ الاسلام قدس اللہ سرہٗ کی زندگی کے حالات معلوم کرنے کے لیے جو ذرائع ہو سکتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱-حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مؤلفہ ''سوانح قاسمی'' اور ان کے مختلف مکاتیب بہ نام ''مکتوبات یعقوبی''، نیز ''بیاض یعقوبی''۔

۲-حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ کی لکھی ہوئی سوانح حیات۔

۳-''امیر الروایات'' کی مختلف روایتیں۔

۴-''تذکرۃ الرشید'' کے ضمن میں مختلف واقعات۔

۵-حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ کے ''ملفوظات'' و''امداد المشتاق''۔

۶-اکابر ومتوسلین دار العلوم دیوبند کی سینہ بہ سینہ روایات یا تحریریں۔

۷-دار العلوم دیوبند کی روئدادیں۔

۸-حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب اور تصانیف۔

۱-حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب علیہ الرحمہ نے ''سوانح قاسمی'' میں وہ حالات درج فرمائے ہیں، جو ان کی معیت میں حضرت نانوتویؒ کے حالات اور واقعات مشاہدہ فرمائے تھے۔ اس وقت میرے پیش نظر ''سوانح عمری'' مولانا محمد قاسم صاحب مطبع مجتبائی مطبوعہ ۱۸۹۴ء/مطابق ذی قعدہ ۱۳۱۱ھ/ ہے۔ یہ کل ۳۲/صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ سوانح مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے مولانا نانوتویؒ کی وفات کے بعد تحریر فرمائی تھی، جو ۱۲۹۷ھ/اور ۱۳۰۲ھ/ کے درمیان میں لکھی گئی ہے۔ چناں چہ مؤلف مرحوم ''سوانح عمری'' کے

آخر میں لکھتے ہیں:

''بعد انتقال جناب مولوی صاحبؒ بہت سی تاریخیں اکثر صاحبوں نے نکالیں، سب یہاں ذکر کرنا طول ہے''(۱)۔

اس جملے سے اس سوانح کا وقت تحریر بعد وفات صاف ظاہر جاتا ہے۔

بہر حال یہ سوانح نہایت مختصر ہے، جیسا کہ دیباچے میں فرماتے ہیں:

''آپ لوگوں کے امر کی اجابت واجب سمجھ کر باوجود قلت فرصت مختصر مختصر جو یاد آتا ہے، لکھتا ہوں''۔

کسی نامعلوم مصحح نے سوانح کے آخر میں صفحہ ۳۲ پر لکھا ہے:

''واضح ہو کہ یہ جو کچھ حالات مولوی محمد یعقوب صاحب نے تحریر فرمائے ہیں، اور اپنی معیت اور ہم راہی کے زمانے کے لکھے ہیں، باقی اور حالات اور آپ کی کرامات بہت ہیں، جن کو کسی وقت میں بہ طور ضمیمہ اس کتاب کے آخر میں شائع کیا جائے گا''۔

لیکن اس کے بعد ضمیمہ کے ساتھ سوانح چھپی یا نہیں؟ میری تحقیق میں نہ آسکی(۲)۔ کاش کہ مولانا دوسروں سے حالات معلوم فرما کر بھی مفصل سوانح تحریر فرماتے؟

۲-حضرت مولانا فخر الحسن صاحب مرحوم نے اپنے شیخ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری کے متعلق حسب ذیل سطور ''انتصار الاسلام'' کے دیباچے میں سپردِ قلم کی ہیں۔

''بندہ نے جناب مولانا مرحوم کی سوانح لکھی ہے، اور جو عجائب واقعات گزرے ہیں، جو جو کارنمایاں مولانا مرحوم نے کیے ہیں، ان کا مفصل حال بیان کیا ہے، اور بہت سے متفرق واقعات علمی و عملی، جن سے جناب مولانا کا یک تائے روزگار ہونا علوم ظاہری و باطنی میں ظاہر ہوتا ہے، مشرح مرقوم کیے ہیں، اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ جناب مولانا مغفور کیا کیا چیزیں اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ یہ سوانح عمری لائق دید ہے۔ شاید ایسی عجیب چیز بھی اس زمانے میں اور کوئی ہو؟ یہ سوانح عمری چوں کہ ایک کتاب ہوگئی ہے؛ اس لیے بالفعل شائع ہونا اس کا ذرا دشوار ہے، اگر خدا کو منظور ہے، تو اس کا بھی وار آجائے گا''(۳)۔

(سوانح عمری، ص:۳۲۔

(۲) اس نمبر میں ہم نے کوشش کر کے اس کا اہتمام کیا ہے۔ اس زمانے میں اس کی بہت ضرورت ہے۔ جس وقت صرف ہجری تاریخ وسن خواص وعوام یاد رکھتے تھے، اس وقت ہجری تاریخ وسن کافی تھا۔ (نعمان)

(۳) انتصار الاسلام، ص:۹۔

مذکورہ بالا مآخذ میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی اور عملی زندگی کے حالات درج ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ ان سے زندگی کے مختصر مختصر واقعات پیش کرتا جاؤں؛ لیکن ایک اہم اور نہایت ہی اہم مرحلہ جو حضرت حجۃ الاسلامؒ کے علوم پر عبارتیں پیش کر کے تبصرہ کا ہے، وہ قریب قریب سب ماخذوں میں مفقود ہے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمہ جو ''قاسم ثانی'' کے لقب سے ملقب ہیں، جس قدر علومِ قاسمی سے انہوں نے استفادہ فرمایا ہے، غالباً کسی نے کم کیا ہوگا۔ موصوف علامہ عثمانیؒ نے ''فتح الملہم شرح مسلم''، تفسیر اور دیگر تصانیف میں مولانا حجۃ الاسلامؒ کے مضامین کی جا بہ جا تشریح و توضیح فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں راقم الحروف نے ''تجلیاتِ عثمانی'' میں مولانا عثمانیؒ کے علم کلام کے عنوان کے ماتحت سیر حاصل کلام کیا ہے؛ کیوں کہ اس ریسرچ کے سلسلے میں راقم الحروف کو حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم کی تمام کتابوں کا بہ امعان نظر مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا۔

تحصیل علم کے بعد:

۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۰ء سے ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء تک حضرت حجۃ الاسلامؒ نے تعلیم سے فراغت کے بعد مطبع احمدی دہلی میں سب سے پہلی ملازمت کی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''مولوی صاحبؒ امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا۔ سب اہل مدرسہ کو علی الخصوص ہیڈ صاحب کو کہ اس وقت میں مدرس اول انگریزی کے تھے، نہایت افسوس ہوا۔ پھر مولوی صاحبؒ نے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی کچھ مزدوری کر لی''(۱)۔

مذکورہ عبارت میں مدرسۂ دہلی سرکاری کے چھوڑنے کا ذکر ہے، درآں حالے کہ دینی تعلیم آں مخدوم پوری کر چکے تھے، اور ترک تعلیم کے بعد مطبع احمدی کی ملازمت مولانا کی سب سے پہلی ملازمت تھی۔ یہ مطبع دہلی میں حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوریؒ کا مطبع تھا، جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے استاد و شیخ حدیث تھے، جیسا کہ گزشتہ اوراق میں گزرا۔ اس ملازمت کا سلسلہ ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۴ھ کے غدر سے پہلے پہلے ختم ہو چکا تھا؛ کیوں کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے مولانا اپنے وطن میں قیام پذیر نظر آتے ہیں۔ کم و بیش ملازمت کا یہ عرصہ چھ سال کچھ ماہ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب علیہ الرحمہ کی حسب ذیل عبارتیں مطالعہ فرمائیے:

> ''بعضے احباب کی زبانی سنا ہے کہ چھاپہ خانے میں جناب مولوی احمد علی صاحب کے جب

(۱) سوانح عمری، ص:۸۔

مولوی صاحب کام کیا کرتے تھے، تو مدتوں یہ لطیفہ رہا کہ لوگ مولوی کہہ کر پکارتے ہیں اور آپ بولتے نہیں۔ کوئی نام لے کر پکارتا خوش ہوتے۔ تعظیم سے بے حد گھبراتے''(۱)۔

مذکورہ عبارت میں ''مدتوں یہ لطیفہ رہا'' اور وہ بھی جب کہ ''چھاپہ خانے میں جناب مولوی احمد علی صاحبؒ کے جب مولوی صاحبؒ کام کیا کرتے تھے''۔ ان دونوں جملوں سے مولوی احمد علی صاحبؒ کے چھاپے خانے کی ملازمت کا ایک خاص عرصہ معلوم ہوتا ہے، جو کئی سالوں پر مشتمل ہوگا؛ لیکن وہ عرصہ کتنا تھا؟ حسب ذیل تحریر پڑھیے!

''غدر میں دہلی کا تو سب کارخانہ درہم برہم ہو گیا تھا۔ مولوی احمد علی صاحب کا مطبع گیا گزرا تھا۔ اس زمانے میں سوائے وطن اور کوئی جگہ جانے کی نہ تھی۔ کبھی وطن کبھی دیوبند رہتے تھے''(۲)۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کا تعلق مطبع احمدی سے غدر ۱۸۵۷ء تک رہا۔ حالات سے پتہ چلتا ہے کہ علما کے لیے عربی مدارس میں پڑھانے، مطابع میں عربی اور فارسی وغیرہ کی مذہبی کتابوں کی تصحیح کرنے کے سوا اور کیا شغل ہوسکتا تھا اور وہ بھی چند ٹکوں پر۔ چناں چہ حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ فرماتے ہیں:

''مولانا مطبع مجتبائی میں دس روپیہ کے ملازم تھے، اور اصل میں یہ بات تھی کہ مالک مطبع مولانا کی کچھ خدمت کرنا چاہتے تھے، مولانا نے ویسے تو منظور نہ فرمایا اور یہ فرمایا کہ کچھ کام لو، اور یہ بھی فرمایا کہ کاموں میں تو لیاقت کی ضرورت ہے، میں اس قابل نہیں ہوں۔ ہاں! قرآن شریف کو منقول عنہ سے مقابلہ کرسکتا ہوں، اس میں لیاقت کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے زیادہ پیش کرنا چاہا؛ مگر مولانا نے انکار فرمادیا''(۳)۔

مذکورہ عبارت نے چند تاریخی امور پر روشنی ڈالی ہے۔ اول یہ کہ مطبع مجتبائی کی ملازمت اور وہ بھی دس روپے پر۔ صاحب مطبع کا از راہ خدمت تعلق قائم کرنا۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے بغیر خدمت کچھ نہ لینے کا عزم۔ دس روپے سے زیادہ لینے پر انکار۔ توکل کی طرف رغبت اور طلب دنیا سے نفرت۔ اب اس سے اندازہ لگائیے کہ مطبع احمدی میں حضرتؒ کی تنخواہ بھی لے دے کے دس روپے، یا اس سے کچھ کم ہی ہوگی، اور اس سے زیادہ انکساری کیا ہوگی کہ اپنے آپ کو قرآن شریف کے کسی اصل نسخے سے تصحیح کے قابل ظاہر کرنا اور کسی لائق نہ سمجھنا۔ اللہ اکبر! دریا کو اپنا وجود قطرہ معلوم ہوتا ہے، جو علم کی بلندی پر دال ہے۔

(۱) سوانح عمری، ص:۱۰۔ (۲) ایضاً، ص:۲۰۔
(۳) جمیل الکلام، ص:۲۱۔

جہادِ آزادی:

میں اپنے مضمون کو مطبع احمدی کی ملازمت سے پھر وابستہ کرتا ہوں۔ ملازمت کی ترتیب میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے فترت اور خلا پیدا کر دیا۔ اس ہنگامے کو "غدر" کہنا غلط ہے؛ بلکہ جذبۂ آزادی کے ہنگاموں نے نئے نظامِ حکومت کو جب درہم برہم کر دیا، تو اس عبوری دور میں مولانا کبھی دیوبند، کبھی نانوتہ رہتے، اور چوں کہ بعض بدخواہ اس ہنگامی نازک صورت حالات سے مولانا کو زک بھی پہنچانا چاہتے تھے؛ اس لیے انہوں نے یہ خبر اڑادی تھی کہ مولانا تھانہ بھون کے ہنگامے میں شریک تھے؛ اس لیے کمپنی کی زیادتیوں سے جان بچانا اور محفوظ رکھنا بھی ضروری تھا۔ چناں مختلف مواضع، یعنی املیا، بوڑیہ، کمتھلہ، لاڈوہ اور پنج لاسہ وغیرہ رہے۔ جمنا پار بھی کئی دفعہ آئے گئے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو کہ مولانا کے پیر ومرشد تھے، وہ بھی ان دنوں بعض خودغرض بدخواہوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث محتاط اور روپوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ بھی مختلف آبادیوں اور قصبات میں قیام پذیر رہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت حاجی صاحبؒ کے ہمراہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اس عبوری دور میں گاہ بے گاہ رہے ہیں۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ مؤلف "تذکرۃ الرشید" لکھتے ہیں:

> "حضرت مولانا (رشید احمد صاحب گنگوہیؒ) نے خود ارشاد فرمایا کہ: جس زمانے میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پنج لاسہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، راؤ سراج الدین خاں، نبیرہ راؤ عبداللہ خاں ایک دن گنگوہ آئے، میں نے حضرتؒ کی زیارت کے لیے ان کے ہم راہ پنج لاسہ کا قصد کر دیا"[1]۔

"تذکرۃ الرشید" کی مذکورہ عبارت سے حاجی صاحبؒ کا پنج لاسہ میں قیام صاف ظاہر ہے، اور اس سے اوپر مولانا محمد قاسم صاحبؒ پنج لاسہ میں رہنے کا تذکرہ ایامِ غدر کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے، اور حضرت گنگوہیؒ کا وہاں پہنچنا بھی مذکورہ عبارت سے معلوم ہے۔ ایک اور قصہ حضرت گنگوہیؒ کی زبانی "تذکرۃ الرشید" میں اس طرح درج ہے:

> "جب ہمارے حضرت (حاجی صاحب) پنج لاسہ پنجاب میں مقیم تھے اور باغیانِ غدر کی دار وگیر ہو رہی تھی، تو ایک شب کسی نے مخبری کر دی کہ حضرت ایک شخص کے اصطبل میں مقیم ہیں۔

---

(۱) تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۳۵۔

کلکٹر ضلع خود سوار ہوکر شب کو قریب نیم شب دروازۂ اصطبل پر آموجود ہوا، اور کواڑ کھلوانے چاہے۔ بڑے بھائی نے جو مالک مکان تھے، انگریز سے کہا کہ: آپ نے اس وقت کیوں تکلیف فرمائی؟ انگریز نے گھوڑا دیکھنے کا بہانہ کرکے کہا کہ کواڑ کھولو۔ چناں چہ کواڑ کھولے گئے، دیکھا تو بستر لگا ہوا تھا اور سب سامان لیٹنے کا درست تھا؛ لیکن حضرت نہ تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھا: کہیں پتہ نہیں۔ مالک مکان سے پوچھا کہ یہ بستر کس کا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے چھوٹے بھائی کا ہے۔ خوف کے مارے پیشاب خطا ہوگیا؛ لیکن انگریز نے اور کچھ نہیں پوچھا اور گھوڑے کو دیکھتے ہوئے واپس ہوگیا۔ غالبًا حضرت کو کشف سے یہ حال آمدِ انگریز کا معلوم ہوگیا ہوگا کہ پہلے تشریف لے گئے''(۱)۔

''تذکرۃ الرشید'' اور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات، نیز مولانا حجۃ الاسلامؒ کے حالات سے ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت پر ایک تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔ ریسرچ اور تحقیقات کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ ہر دو حضرات- حاجی صاحبؒ قبلۂ محترم کے دست و بازو بن کر جہادِ حریت میں خصوصی حکمت سے حصہ لے رہے تھے۔ صحیح معنی میں انہوں نے جو حصہ لیا، اس سے نہ کبھی گھبرائے اور نہ اس کی وجہ سے روپوش ہوئے۔ روپوشی کی وجہ اگر کچھ ہوئی ہے، تو وہ اعدائے نا ملائم اور بدخواہان بداندیش کی جھوٹی خبروں کی مخبری ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ان ایام میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی جرأت و ہمت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں، جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا روپوش ہونا نہیں چاہتے تھے۔

مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی جرأت و بے خوفی:

''......اسی عرصے میں غدر ہوگیا، بعد رمضان احقر کو سہارن پور لینے کو تشریف لائے، چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے، اس وقت راہ چلنا بدون (بلا) ہتھیار دشوار تھا۔ جب احقر وطن پہنچا، چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے، جس میں مولانا کی کمال جرأت و ہمت ظاہر ہوئی''(۲)۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''اس (غدر کے) طوفان بے تمیزی سے سب لوگ گھبراتے تھے، ہم نے کبھی مولانا کو گھبراتے نہ دیکھا۔ خبروں کا اس وقت میں چرچا تھا۔ جھوٹی سچی ہزاروں گپ شپ اڑا کرتی تھیں؛

(۱) تذکرۃ الرشید، جلد:۲، ص:۳۸۲۔

(۲) سوانح عمری، ص:۱۷۔

مگر مولوی صاحبؒ اپنے معمولی کام بہ دستور انجام فرماتے تھے۔ چند بار مفسدوں سے نوبت مقابلے کی آ گئی۔ اللہ رے! مولوی صاحبؒ ایسے ثابت قدم تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں کا مقابلہ''[1]۔

اس ہنگامے کے سلسلے میں مولانا کے متعلق حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحبؒ بھی ایسے ہی باعث (لوگوں کی مخبریوں) سے روپوش ہو گئے تھے۔ ایام روپوشی میں ایک روز (مولانا محمد قاسم صاحب) دیوبند تھے۔ زنانہ مکان کے کوٹھے پر مردوں میں سے کوئی تھا نہیں۔ زینے میں آ کر فرمایا: پردہ کرلو، میں باہر جاتا ہوں۔ عورتوں سے رک نہ سکے، باہر چلے گئے۔ بعضے مرد بازار میں تھے، ان کو اطلاع کی، وہ اتنے میں مکان پر پہنچے، دوڑ سرکاری آدمیوں کی پہنچ گئی تھی، انہوں نے آ کر تلاشی لی، ہر چند بہ ظاہر مولوی صاحب کی تلاش نہ تھی؛ مگر پھر خوف کی جگہ تھی۔ اس کے بعد سے (مولانا محمد قاسم صاحب) مسجد میں رہتے، پھر کسی نے تعرض نہ کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے چند بچایا''[2]۔

ادبیاتِ قاسمی:

فصاحت و بلاغت سے آراستہ خطابت، یعنی تقریر ادب کا مایۂ ناز سرمایہ ہے۔ خطابت اور شعر سے مشاہیر ادب نے جس قدر نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں، ان سے تاریخی صفحات بھرے پڑے ہیں۔ بہترین خطیب اور لیکچرار کسی ملک کا قابل فخر سرمایہ ہوتے ہیں۔ جس طرح شعر کی تاریخ بتلائی ہے کہ اس نے قوموں اور سلطنتوں کو پستی سے بلندیوں اور ان کی شکستوں کو فتوحات سے بدل کر تمدن و سیاست کی بڑی خدمات انجام دی ہیں، جیسا کہ حالی پانی پتی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں مثالیں پیش کی ہیں، اسی طرح شعلہ مقال مقرروں نے بھی عظیم الشان کارنامے اور انقلاب انگیز طوفان برپا کیے ہیں۔ دنیا کے تمام ممالک میں ہر دور میں بہترین خطیب اور مقررین پیدا ہوتے رہے ہیں، جنہوں نے قوموں کے نقشے پلٹ کر رکھ دیے ہیں۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''بعض شعر حکمت ہوتے ہیں، اور بعض بیان جادو''۔

یہ قول اتنا جامع و مانع ہے کہ ایک جملے میں ہی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر و بیان کی وضاحت اور تفصیل بیان فرمادی ہے۔ شعر اور بیان کے متعلق فصیح، حکیمانہ اور مختصر الفاظ میں تبصرہ فرمادینا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا کام ہے؛ ورنہ بڑے بڑے شعرا اور ادبائے فن نے محض ''شعر'' پر ضخیم سے ضخیم کتابیں تصنیف کی ہیں۔

---

(۱) سوانح عمری، ص:۱۸۔ (۲) ایضاً، ص:۱۹۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق بہترین شعرا اور بہترین بیان حکمت اور تاثیر پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر شعر و بیان میں حکمت و تاثیر نہیں، تو شعر اور بیان اصلی جوہر سے خالی ہے۔ اسی لیے ادبا اور شعرا نے شعر کی تاثیر پر مقالے سپرد قلم کرتے ہوئے کہا ہے کہ شعر کی تاثیر مسلّم ہے، اور اس کی بہت سی مثالیں ہر زبان کے شعرا مثلاً: بائرن، اعشیٰ، رودکی وغیرہم نے پیش کی ہیں۔

سحبان ابن وائل دنیائے خطابت اور وسعت لسانی میں مشہور انسان ہے، جس کے متعلق شیخ سعدی رحمہ اللہ بھی فرما گئے:

تو آں در بلاغت بہ سحباں رسید
نہ در کنہ بے چوں یزداں رسید

بہر حال! عنوان مضمون یہ ہے کہ خطابت و تقریر کی تاثیر اور اس کی جادوگری ہر دور میں ملکی، سیاسی، مذہبی خیالات میں جاری رہی ہے، اور سیاسی و مذہبی امور میں اس سے بڑے بڑے دور میں نتائج وثمرات حاصل کیے گئے ہیں۔

میرے نزدیک شاعری اتنی حقیقت پر مبنی نہیں، جتنی کہ خطابت۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے قرآن اور شعر میں جہاں فرق قائم بتایا گیا ہے، وہیں اس کی امتیازی شان، حقیقت اور مبالغے کے درمیان خط قائم کر دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کے اثر نے جب دلوں کو مسخر کرنا شروع کر دیا، تو کفار عرب نے قرآن کریم کو سحر، جادو اور شعر کہنا شروع کر دیا، اور اس دور میں ہر بلند معیار کلام اور مؤثر نثر کو بھی شعر کہتے تھے۔ اسی لیے کفار کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہ قرآن شعر ہے، متکلم قرآن یعنی خدائے قدوس نے فرمایا:

﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ﴾[1]

”ہم نے نبی کو شعر کی تعلیم نہیں دی اور یہ ان کی تعلیم کے لائق بھی نہ تھا۔ وہ قرآن تو ذکر (نصیحت) کے سوا کچھ نہیں اور وہ قرآن مبین ہے“۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا کہ بیان و خطابت کی بنیادیں جس قدر حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں، اس قدر شعر و شاعری کی نہیں ہوتیں؛ اس لیے شعر کی مخالفت کرتے ہوئے رب کریم نے قرآن کریم کی شعری حیثیت سے نکال کر اور ذکر فرما کر شاعری اور قرآن میں خط امتیازی قائم کر دیا۔

بہر حال! فن خطابت اپنی جگہ انسانی خصائص اور صفات میں اعلیٰ خصوصیت اور بہترین انعام ہے؛ اسی لیے فصاحت و بلاغت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی کتاب، یعنی قرآن الٰہی میں انسان کی پیدائش اور تخلیق کے ساتھ بیان کی تعلیم کا خصوصیت سے ان الفاظ میں اظہار کیا گیا ہے:

(۱) سورۂ یٰسٓ: ۶۹۔

﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾[1]۔

''اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان کی تعلیم دی''۔

یعنی اس کو اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کی قدرت عطا کی۔ لہٰذا فنِ خطابت، جو بیان کے مترادف ہے، اگر بہترین اسلوب و پیرائے خطابت کے صحیح اصول اور فصاحت و بلاغت کے اوصاف سے متصف ہو، تو وہ انسان کے لیے سرمایۂ انسانیت ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ ہستیاں، جن کو قوتِ گویائی، لسانی فصاحت اور حُسنِ بیان عطا ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی؛ اسی لیے اس وصف سے محرومی کے باعث انہوں نے عرض کیا کہ: اے خداوندا! آپ نے مجھے نبوت سے سرفراز فرمایا؛ اس لیے:

''وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِسَانِي يَفْقَهُوْ قَوْلِيْ''۔

''میری زبان کی گرہ کھول دیجیے، تاکہ وہ لوگ میری بات سمجھ سکیں''۔

اسی لیے حضرت ہارون علیہ السلام اپنے بھائی کو اپنے لیے مدد و معاون بنانے کی دعا کی۔

بہر حال! بیان و خطابت انسانی صفات کا اعلیٰ جوہر ہے۔ یہ جوہر بنی نوع انسان کی نسلوں میں ہر دور میں لوگوں کو نصیب ہوتا رہا۔

راقم الحروف اپنے اس مقالے میں جو ''ادبیات قاسمی'' کے نام سے معنون ہے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانیٔ دار العلوم دیوبند کی خطابت، نثر و نظم، انشائے اردو و فارسی اور عربی پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ سب سے پہلے حضرت مولانا کی خطابت، یعنی تقریر سے ادبیات کا سلسلہ شروع کرتا ہوں۔

میں نے ابھی مذکورہ سطور میں یہ حقیقت حوالۂ قلم کی ہے کہ فصیح و بلیغ تقریر یا خطابت ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔ حضرت مولاناؒ کی ادبیات میں آپ کی تقریر اور خطابت خاص صفات سے متصف تھی۔

حضرت اکبر الہ آبادیؒ نے فنِ خطابت کے متعلق جو اصول اپنی رباعی میں ظاہر کیا ہے، وہ میرے نزدیک بہترین خطابت کا زریں اصول ہے، وہ کہتے ہیں:

کہنے سننے کی گرم بازاری ہے
مشکل ہے؛ مگر اثر پرائے دل میں
ایسا سنیے کہ کہنے والا ابھرے
ایسا کہیے کہ بیٹھ جائے دل میں

(۱) سورۂ رحمٰن: ۳، ۴۔

شاعر حکیم نے سننے والوں اور خطیبوں کے لیے دو اصول پیش کیے ہیں اور کہا ہے کہ جو تقریر یا خطاب دل میں بیٹھ جائے، وہی اصل میں تقریر و خطابت ہوتی ہے؛ کیوں کہ تقریر کا اصل مدعا اہل مجلس اور سامعین پر اثر ڈالنا ہوتا ہے، تاکہ مؤثر تقریر ان کے دلوں کو گرما کر ان کے لیے محرک اعضا ہو سکے، اور وہ عمل کی طرف مائل ہو جائیں۔ چناں چہ شاعر نے کہا ہے کہ: سننے اور سنانے کی دنیا میں کثرت ہے؛ لیکن ایسے سننے سنانے کا کیا فائدہ، جس کو سن کر سننے والا نہ ابھرے، اور جس کو کہہ کر کہنے والا سامعین کے دل میں نہ بٹھا دے؟

میرے نزدیک فن خطابت کی قدروں میں اکبرؒ نے جس قدر کا ذکر کیا ہے، وہ تمام اصول خطابت کا خلاصہ ہے۔ اب اس اصول پر ہمیں مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہ کی خطابی قدروں کا کتابوں سے پڑھ کر جائزہ لینا ہے۔

حقیقت میں کسی کی تقریر سن کر فیصلہ کرنے اور سنی ہوئی باتوں کا نقشہ کھینچنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے؛ کیوں کہ مشہور مثل ہے: ''شنیدہ کہ بود مانند دیدہ''؛ مگر پھر بھی واقعات کی صحیح تاریخی روشنی میں- میں مولانا کی تقریر کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کروں گا۔

بات یہ ہے کہ مقرر جس انداز سے تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے، ایک ایکٹر جس طرح اپنے جسم کو حرکت دیتا ہے، ایک لیکچرار جس انداز میں ہاتھ، سر سے اشارہ کرتا ہے، اور یہ کہ بہ وقت تقریر اس کی پوزیشن کیا ہے؟ یہ سارے ہی امور خطابت کی کشش سے وابستہ ہیں۔ تاہم اثرات سے مؤثر کا پتہ چلانا آسان ہو جاتا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ ہم نے اگر چہ حجۃ الاسلامؒ اور ''لسان حکمت'' کی تقریریں نہیں سنیں؛ لیکن جن کانوں نے وہ وجد آفریں خطبے اور سحر آفریں تقریریں سن کر ''آہ'' اور ''واہ'' کے نعرے لگائے ہیں، ان کے بیانات تو سنے ہیں، میں ان کی طرف آپ کو لیے چلتا ہوں؛ لیکن اس سے پہلے یہ بتادوں کہ اس فرشتہ صورت و سیرت انسان کی تقریریں جادو کا اثر ان کی روحانیت اور قلبی کیفیت کا ثمرہ تھا۔ انھیں نہ تقریر میں ریاکاری اور نمود کی ضرورت تھی، اور نہ تحسین و آفرین کے ولولہ انگیز نعروں کی۔ بس بات یہ تھی کہ ان کے الفاظ معانی سے ہم کنار اور ان کے معانی حقیقت سے ہم آہنگ ہوتے تھے۔ بہ قول اقبالؒ: ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

مولانا کی پہلی تقریر اور اس کا اثر:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کی سب سے پہلی تقریر جس کو تاریخی تقریر کہنا

چاہیے، وہ ہے، جس کا انکشاف مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے ''سوانح عمری'' میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''(مولانا محمد قاسم صاحبؒ) فتوے پر نام لکھنا اور مہر کرنا تو درکنار، اول امامت سے بھی گھبراتے تھے۔ آخر کو اتنا ہوا کہ وطن (نانوتہ ضلع سہارن پور) میں نماز پڑھادیتے تھے۔ وعظ بھی نہ کہتے تھے۔ جناب مولوی مظفر حسین صاحب مرحوم کاندھلوی نے اول وعظ کہلوایا اور خود بھی بیٹھ کر سنا اور بہت خوش ہوئے''(۱)۔

اس عبارت سے حضرت مولاناؒ کی سب سے پہلی تقریر کا پتہ چلتا ہے، تاریخ وسن کا نشان معلوم نہیں ہوتا، تاہم تحصیل علم کے بعد ابتدائی دور کی یہ اولین تقریر یا وعظ ہوگا۔ پھر بھی یہ ضرور معلوم ہوا کہ اس پہلی ہی تقریر کا سامعین پر اچھا اثر ہوا تھا، اور مولوی مظفر حسین صاحبؒ بھی جنہوں نے مولانا کا وعظ کرایا اور جو اس زمانے میں قدما کے نمونہ تھے، وہ مولانا کی تقریر سن کر خوش ہوئے تھے۔

یہ تو درمیان میں مولانا کی اولین تقریر کا ذکر آ گیا؛ لیکن جیسا کہ میں لکھتا آ رہا تھا کہ مولانا کی تقریر کا دوسروں پر کیا اثر ہوتا رہا تھا؟ اس کی تفصیل اب پیش کروں گا۔ مناسب ہے کہ سب سے پہلے مولانا ابوالحسن صاحب ندوی مصنف ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' کی ایک تحریر ان کی مذکورہ کتاب سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے متعلق پیش کروں۔ ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' کے مصنف-شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کے حالات اور ان کے وعظ اور وعظ کی تاثیر پر تبصرہ کرتے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تقریر اور وعظ کے متعلق لکھتے ہیں:

''سب سے بڑھ کر آپ کا اخلاص، حرص ہدایت اور نیک نیتی تھی، اور حقیقت میں سب تاثیر اسی کی تھی۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی (بانی دار العلوم دیوبند) جو خلقاً و خلقاً شاہ (محمد اسماعیل) صاحبؒ سے بہت مشابہ تھے، اور اپنے زمانے کے نہایت خوش بیان واعظ وخطیب تھے۔ سید صاحبؒ کے دیکھنے والوں نے انقراض صحبت کے بعد پھر کسی کا وعظ نہیں سنا؛ البتہ اگر کبھی اتفاق ہوا، تو مولوی صاحب مرحوم کا وعظ سنا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ان کا وعظ مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ کے وعظ سے بہت ملتا ہے''۔

مولانا محمد قاسم صاحبؒ بہت کم وعظ فرماتے تھے۔ اگر کوئی بہت اصرار کرتا، تو کہہ دیتے۔ ایک مرتبہ کسی نے اصرار کیا تو فرمایا:

''وعظ ہم لوگوں کا کام نہیں، اور نہ ہمارا وعظ کچھ مؤثر ہوسکتا ہے۔ وعظ کام تھا مولانا اسماعیل صاحب شہیدؒ کا اور انہیں کا وعظ مؤثر بھی تھا۔ دیکھو! اگر کسی کو پاخانہ، پیشاب کی حاجت ہو، تو اس

(۱) سوانح عمری، ص:۱۱۔

کے قلب میں اس وقت تک بے چینی رہتی ہے، جب تک وہ ان سے فراغت حاصل نہ کر لے، اور اگر وہ کسی سے باتوں میں بھی مشغول ہوتا ہے، یا کسی ضروری کام میں لگا ہوتا ہے، تو اس وقت بھی اس کے قلب میں پاخانہ، پیشاب ہی کا تقاضہ ہوتا ہے، اور طبیعت اس کی اسی طرف متوجہ ہوتی ہے، اور وہ چاہتا ہے کہ جلد سے جلد اس کام سے فراغت پا کر قضائے حاجت کے لیے جاؤں، سو واعظ اور اس کے وعظ کی تاثیر کے لیے کم از کم اتنا تقاضائے ہدایت تو ضرور ہونا چاہیے، جتنا کہ پاخانے پیشاب کا۔ اگر اتنا بھی نہ ہو، تو واعظ وعظ کا اہل ہے، اور نہ اس کا وعظ مؤثر ہوسکتا ہے۔ ہم لوگوں کے قلوب میں ہدایت کا اتنا تقاضا ہی نہیں، جتنا کہ پاخانہ، پیشاب کا؛ اس لیے نہ ہم وعظ کے اہل ہیں، نہ ہمارا وعظ مؤثر ہوسکتا ہے۔ ہاں یہ تقاضا مولوی اسماعیل صاحبؒ کے دل میں پورے طور پر موجود تھا، اور جب تک وہ ہدایت نہ کر لیتے تھے، ان کو چین نہ آتا تھا۔ چناں چہ وہ ایک ایک دن میں بیس بیس جگہ وعظ کہتے تھے؛ اس لیے وہ وعظ کے اہل تھے، اور ان کا وعظ مؤثر بھی ہوتا تھا''(۱)۔

مذکورہ بالا عبارت میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو حضرت مولانا اسماعیل صاحب شہیدؒ سے عادت واخلاق اور صورت وسیرت میں تشبیہہ دی گئی ہے، یعنی مولانا بہ اعتبار مجاہدات، عبادات، ریاضات، جہاد لسانی، خطابت وتقریر میں حضرت شہیدؒ سے مشابہت تامہ رکھتے تھے، اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جن دنوں حضرت شہیدؒ کے مواعظ کا سلسلہ دہلی میں شروع ہوا، تو مولانا محمد اسماعیل صاحب شہیدؒ کی تمام دہلی میں دھوم مچ گئی، اور حق یہ ہے کہ اس بدعت ورسوم کے دور میں حضرت شہیدؒ نے ہوئی پرستوں کی مخالفت کے باوجود وہ کام کیا ہے، جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ اسی جہاد لسانی کا نتیجہ تھا کہ آپ کی پر اثر تقریر سے دہلی کی رنڈیاں تائب ہو کر مجاہدین کے گھوڑوں کو دانہ ڈالتی رہی ہیں۔ کہاں وہ ان کی پہلی زندگی جس کے چاروں طرف ناپاکیوں کے ڈھیر تھے، اور کہاں اب وہ توبہ کے بعد کی زندگی جس میں وہ مجاہدات بن کر مجاہدین کی فہرست کا عنوان بن گئی تھیں۔

حضرت قاسم العلومؒ بھی حضرت شہیدؒ کے قائم مقام تھے۔ چناں چہ آپ نے بھی اپنی زندگی کا ایک خاص حصہ جہاد لسانی اور اعدائے اسلام سے مناظروں اور مباحثوں میں گزارا۔ قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ جو مولانا کے ہم سبق اور وقت کی برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے، اپنے مرید مولوی محمد حسین بریلویؒ کو ان کے ایک خط کے جواب میں- جب کہ مرید موصوف نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو خواب میں دیکھنے کا بھی ذکر کیا ہے، لکھا ہے:

(۱) سیرت سید احمد شہیدؒ، ص: ۴۱-۳۳۹، بہ حوالہ ارمغان احباب وامیر الروایات)

''مولوی (محمد قاسم) صاحب مرحوم کی زیارت رویائے صالحہ موجب قبولیت عمل و آثار اصلاح و رشد ہیں اور ان کی توجہ کی علامت ہے۔ شکر کی بات ہے، رقت اس کا اثر ہے۔ مولانا مرحوم حیات میں جہادلسانی میں سرگرم تھے، اس کا ظہور ہے، اور تم کو اس حلیہ میں نظر آنا بھی یہی مقصد ہے کہ راہِ حق میں دلیرانہ کام کرو اور سعی کرو''(۱)۔

حضرت گنگوہیؒ کے مکتوب بہ نام مولوی محمود حسین بریلویؒ سے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے جہادلسانی کی حقیقت کا پورا انکشاف ہوجاتا ہے، اور یہی صفت من جملہ دیگر کمالات کے حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب شہیدؒ کی صفت تھی۔ یہ بات قابل وضاحت ہے کہ مولانا گنگوہیؒ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ صرف جہادلسانی میں ہی سرگرم رہے؛ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ صفت امتیازی صفت تھی؛ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بانیٔ دارالعلوم کی ہر ایک صفت قابل صفت تھی، وہ نہ صرف جہادلسانی کے مالک تھے؛ بلکہ وہ قلم اور تلوار کے بھی دھنی تھے۔ حضرت اسماعیل شہیدؒ کی پوری جانشینی کا مظاہرہ انہوں نے ۱۸۵۷ء کے جہادحریت میں دکھایا، جب کہ انہوں نے اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کو اس زمانے میں نہایت جرأت اور ہمت واستقلال سے جاری رکھا، جب کہ مسلمانوں کی عظمت کو سنبھالا دینے کی کوشش کی جارہی تھی۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ اپنے عہد کے مشہور باکمال خطیب ومقرر تھے۔

مباحثۂ شاہ جہاں پور میں تقاریر اور اپنوں، پرایوں کے تاثرات:

مئی ۱۸۷۶ء کی بات ہے، جب کہ پادری نولس اور منشی پیارے لال نے موضع چاندا پور ضلع شاہ جہان پور میں مختلف مذاہب کے علما کو جمع کرکے اپنے اپنے مذہب کی سچائی پر تقریریں کرنے کی دعوت دی، تو مولانا محمد قاسم صاحبؒ بھی تشریف لے گئے تھے۔ اس موقع پر حضرت حجۃ الاسلامؒ نے جو مناظرے اور تقریریں فرمائی ہیں، ان میں سے ایک تقریر کا مختصر سا حصہ پیش کرتا ہوں:

انسان کی پیدائش کا مقصد:

''علی ہذا القیاس پانی نہ ہوتا، تو کیا پیتے؟ اور نہ پیتے، تو کیوں کر جیتے؟ کاہے سے آٹا گوندھتے اور کاہے سے سالن پکاتے؟ کاہے سے کپڑے وغیرہ دھوتے؟ کاہے سے نہاتے؟ غرض پانی نہ ہوتا، تو انسان کی زندگی دشوار تھی، اور اگر انسان نہ ہو، تا تو پانی کا کیا نقصان تھا؟ ہوا نہ ہوتی تو سانس کیوں کر چلتا؟ کھیتی وغیرہ کا کام کیوں کر نکلتا؟ یہ ٹھنڈی ہوائیں روح افزا کہاں سے

(۱) مکاتیب رشیدیہ، ص:۸۹۔

آتیں؟ غرض ہوا نہ ہوتی تو جان ہوا ہو جاتی۔ ہم نہ ہوتے، تو ہوا کو کیا دقت پیش آتی؟ اسی طرح اوپر تک چلے چلو! سورج، چاند، ستارے اگر نہ ہوتے، تو دیکھنا بھالنا، چلنا پھرنا ایک امر محال تھا۔ انسان نہ ہوتا، تو نہ سورج کا نقصان تھا، نہ چاند اور سورج کو کوئی دشواری تھی۔ آسمان اور اس کی گردشیں نہ ہوتیں، تو یہ سائے بانی کون کرتا؟ اور یہ جاڑے گرمی کے موسم کیوں کر آتے؟ اور انسان نہ ہوتا، تو نہ آسمان کا نقصان تھا، نہ گردشوں میں کوئی دقت تھی۔ الغرض انسان کو دیکھیے تو زمین وآسمان میں سے کسی کے کام کا نہیں، پر سوائے اس کے جو چیز ہے، سب انسان کے کام کی ہے۔ اس صورت میں اگر انسان خدا کے کام کا بھی نہ ہو، تو یوں کہو کہ انسان سے زیادہ کوئی نکما ہی نہیں؛ مگر تمہیں فرماؤ کہ اس دانش و کمال اور اس حسن و جمال پر انسان کو کون نکما کہہ دے گا؟ اگر انسان اس افضیلت مسلمہ اور مشہور پر بھی نکما ہے، تو یوں کہو: اس سے زیادہ برا ہی کوئی نہیں؛ اس لیے چار و ناچار یہی کہنا پڑے گا کہ انسان خالق دو جہاں کے کام کا ہے۔ ایسی خوبی اور اس خوش اسلوبی پر ایسے ہی بڑے کام کے لیے ہوگا؛ مگر ظاہر ہے کہ خداوند عالم کسی بات میں کسی کا محتاج نہیں، پھر انسان جیسے محتاج کا تو کیا محتاج ہوگا؟ جس کی سب سے زیادہ محتاج گی اسی سے ظاہر ہے کہ زمین سے لے کر آسمان تک تمام عالم کی اس کو ضرورت ہے؟ اس لیے یہی کہنا پڑے گا کہ اس کو بندگی اور عجز و نیاز کے لیے بنایا ہے؛ کیوں کہ یہی ایک ایسی چیز ہے، جو خدا کے خزانے میں نہیں؛ مگر چوں کہ یہ عجز و نیاز خدا کے مقابلے میں موافق تقریر بالا ایسا ہوگا، جیسا کہ طبیب کے سامنے بیمار کی منت و سماجت۔ تو جیسے بیمار کی منت و سماجت کا یہ ثمرہ ہوتا ہے کہ طبیب اس کے حال زار پر مہربان ہوکر چارہ گری کرتا ہے، ایسے ہی انسان کی بندگی، یعنی عجز و نیاز کی یہ دولت خداوند عالم اس پر مہربان ہوکر اس کی چارہ گری کیوں کر نہ کرے گا؟ بہر حال تمام عالم انسان کے لیے ہے اور انسان عبادت کے لیے"(۱)۔

اسی مباحثے کو مولوی محمد ہاشم علی مہتمم مطبع ہاشمی میرٹھ اور محمد حیات صاحب مہتمم مطبع ضیائی نے "میلۂ خدا شناسی" کے نام سے شائع کیا ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی ایک تقریر کا بعض حصہ اس میں سے پیش کرتا ہوں:

"بہ جز اخلاق اور کیا چیز تھی، جس نے یہ تسخیر کی اور برابر کے بھائیوں (مکہ کے لوگوں) کو ایسا مسخر کرلیا کہ جہاں آپ کا پسینہ گرے، وہاں خون گرائیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہ ایک دو روز کا ولولہ تھا، ہو چکا۔ عمر بھر یہی کیفیت رہی۔ آپ ہی کے پیچھے گھر سے بے گھر ہوئے۔

---

(۱) مباحثۂ شاہ جہاں پور، ص: ۹-۵۸۔

زن وفرزند کو چھوڑا۔ گھر بار سب پر خاک ڈالی۔ خویش واقربا سے لڑے۔ ان کو مارایا ان کے ہاتھوں سے (رسول اللہ کی محبت میں) مارے گئے۔ یہ آپ کا اخلاق اورآپ کی محبت نہ تھی، تو اور کیا تھا؟ غرض کہ ملکِ عرب جیسے خودسروں کوایسا مٹھی میں لیا کہ کسی نرم مزاج غریب طبیعت کے لوگوں کے کسی گروہ کی نسبت بھی ایسی تسخیر آج تک کسی نے نہ سنی ہوگی۔ ایسے اخلاق کوئی بتائے تو سہی"(۱)۔

مذکورہ عبارت حضرت قاسم العلومؒ کی تقریر کا ایک مختصر سا حصہ ہے۔ تقریر کی زبان نہایت سادہ اور صاف ہے۔ بیان کے ٹکڑے اپنے اندر ایک خاص جذب واثر رکھتے ہیں؛ لیکن اصل کیفیت اس سحر انگیز طرز بیان کی کیا ہوگی؟ جس کا پتہ ان اثرات سے ہوتا ہے۔ چناں چہ "میلۂ خداشناسی" کے مرتب مذکور تقریر کولکھ کرمولانا کی تقریر کے اثرات کا نقشہ حسب ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"یہی تقریر ہورہی تھی اورلوگوں پر ایک کیفیت تھی، ہر کوئی ہمہ تن گوش ہوکے مولوی صاحب کی جانب تک رہا تھا۔ کسی کی آنکھ میں آنسو، کسی کی آنکھوں میں حیرت! پادریوں کی یہ حالت کہ ششدر بےحس وحرکت، کہ پادری صاحب نے اطلاع دی کہ آپ کا وقت ختم ہوچکا۔ سننے والوں کوارمان رہ گیا"(۲)۔

"میلۂ خداشناسی" کے مرتب اسی مناظرے کی ایک اورتقریر کے اثر کے متعلق لکھتے ہیں:

"قصہ کوتاہ مولوی محمد قاسم صاحب کی خوش بیانی اور پادری صاحب کی افسردگی اس وقت قابل دید تھی"(۳)۔

اسی مناظرہ کے اختتام اور "لسان الحجۃ" کی فتح کا حال "میلۂ خداشناسی" میں ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"قصہ مختصر! میلہ برخاست ہوا۔ باہر آتے ہی مولوی صاحب کے گرد ایک ہجوم تھا۔ ہندو مسلمان سب گھیرے کھڑے تھے۔ مسلمانوں کی جو اس وقت کیفیت تھی، سوتھی؛ مگر ہنود بھی بہت خوش تھے، آپس کہتے تھے: نیلی لنگی والے مولوی صاحب نے پادریوں کوخوب مات دی"(۴)۔

"میلۂ خداشناسی" یا "مباحثۂ شاہ جہان پور" کے ختم ہونے پر حضرت لسان الحکمت مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ کی تقریر پر ایک پادری نے بہ وقت ملاقات جن الفاظ میں تنقید کی ہے، وہ یہ ہیں:

"بعد اختتام جلسہ جو پادری صاحب پہلو تہی کا طعنہ دیتے تھے، قریب عصر مولوی محمد قاسم صاحبؒ کے پاس آئے، اور یہ فرمایا کہ: میں ملنے آیا ہوں، اور میں اب رخصت ہوتا ہوں،

(۱) مباحثۂ شاہ جہاں پور، ص:۲۶-۲۵۔
(۲) ایضاً ص:۲۶-۲۵۔
(۳) ایضاً ص:۲۵۔ (۴) ایضاً ص:۳۷۔

اب جاؤں گا۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے کہا: آپ نے بڑا کرم کیا۔ نام ونشان طرفین سے پوچھے گئے۔ اس کے بعد پادری صاحب نے فرمایا: 'مولوی صاحب! آپ کی تقریر نہایت عمدہ ہے۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے فرمایا:

گاہ باشد کہ کودکِ ناداں
بہ غلط بر ہدف زند تیرے(۱)

جانکی داس جوگی کے الفاظ میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تقریر اور علمیت پر حسب ذیل تنقید مطالعہ کیجیے اور غور فرمایئے:

''تھوڑی دور چلے تھے کہ گاڑی کی قطار سے بیس قدم پر ایک جوگی جا رہا تھا، پاؤں میں کھڑاؤن، سر پر لمبے لمبے بال، برہنہ سر، ہاتھ میں دست پناہ (چمٹا)، دو چار معتقد اس کے ساتھ، مولوی محمد قاسم صاحبؒ کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: 'جے مولبی ہے'۔ اتفاقاً مولوی محمد قاسم صاحب نے التفات سے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ اس نے جو دیکھا مولوی التفات سے جواب دیتا ہے، تو وہاں سے دوڑا، اور گاڑی کا ڈنڈا پکڑ کر گاڑی بان سے کہا: تھام دے۔ اس نے اوروں کو آواز دے کر کہا تھم جاؤ۔ القصہ گاڑیاں تھم گئیں۔ جوگی صاحب بولے: ''تم نے بڑا کام کیا''۔ مولوی محمد قاسم نے کہا: 'میں نے کیا کیا، پرمیشر نے کیا'۔ اس نے کہا: 'سچ کہتے ہو'۔ پھر جوگی مذکور نے ہاتھ اٹھا کر چار انگشت سے اشارہ کر کے کہا: 'جب تم نے بولی ماری (تقریر کی)، تو ہم نے دیکھا اس کا یعنی پادری کا اتنا سریر (جسم) سوکھ گیا تھا''(۱)۔

مذکورہ عبارت میں جوگی کی عقیدت کے علاوہ اس کا یہ جملہ مولانا کی تقریر پر کتنا غضب کا ریمارک ہے، یعنی ''جب تم نے بولی ماری، تو ہم نے دیکھا اس کا اتنا سریر سوکھ گیا تھا''، اور ''جے مولبی'' کہہ کر تو جوگی نے مولانا کے جید عالم ہونے پر نقد ونظر کو ختم کر دیا ہے۔

پادری اینک جو مباحثۂ شاہ جہاں پور میں حصہ لے رہا تھا، اس نے مولوی عبدالوہاب صاحب بریلوی کو اپنے انٹرویو میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تقریر کے متعلق حسب ذیل الفاظ میں یاد کیا ہے:

''بعد مباحثہ مولوی عبدالوہاب صاحب اور اس پادری یعنی (اینک) کا اتفاق ملاقات ہوا، تو مولوی صاحب نے پادری صاحب سے کیفیت جلسہ پوچھی۔ پادری صاحب نے فرمایا: کیا پوچھتے ہو، ہم کو بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا، اور بہت سے

---
(۱) میلۂ خداشناسی، ص: ۳۹۔
(۲) ایضاً، ص: ۳۹۔

علمائے اسلام سے اتفاق گفتگو ہوا، پر نہ یہ تقریریں سنیں نہ ایسا عالم دیکھا۔ ایک پتلا دبلا سا آدمی، میلے سے کپڑے، یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ عالم ہیں۔ ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا بیان کریں گے؟ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ حق کہتے تھے، پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے''(۱)۔

اب شاہ جہاں پور کے کھتریوں کی زبانی جو اس مباحثے اور مولانا کی تقریروں میں شریک تھے، تاثیر تقریر اور کمال خطابت کا حال سنیے!

''مسلمانوں کی طرف سے ایک پتلا سا آدمی، میلے سے کپڑے، نیلی لنگی بغل میں دبی ہوئی، بیان کرنے کھڑا ہوا۔ ایسی تقریریں بیان کیں کہ پادریوں کو بھی جواب نہ آیا۔ کوئی اوتار ہوں، تو ہوں''(۲)۔

مذکورہ عبارتوں اور تنقیدوں کے ٹکڑوں سے حضرت لسان الحکمت کی وضع، لباس، شکل و ہیئت، سادگی کے علاوہ حضرت مولاناؒ کی تقریر اور فن خطابت پر زبردست روشنی پڑتی ہے، جس میں نہ صرف مسلم؛ بلکہ غیر مسلم اور بھی زیادہ پیش پیش ہیں، اور تعریف تقریر میں رطب اللسان ہیں۔ بالخصوص جانکی داس کے یہ جملے کہ ''جے مولبی ہے'' اور ''جب تم نے بولی ماردی تو پادری کا سر پر سوکھ گیا''۔

میلۂ خداشناسی کے علاوہ اس مناظرے کے حالات کا نقشہ حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ نے ''مباحثۂ شاہ جہاں پور'' کے نام سے معنون رسالے میں، جس انداز سے پیش کیا ہے، اب میں قارئین کو اس طرف لیے چلتا ہوں۔ واضح رہے کہ مولانا فخر الحسنؒ حضرت لسان الحکمتؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ وہ اور حضرت شیخ الہند رحمہما اللہ تعالیٰ دونوں اس مباحثے میں شریک تھے۔ حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ ۷؍مئی ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲؍ربیع الثانی ۱۲۹۳ھ کے مناظروں اور تقریروں کے اثرات کے متعلق لکھتے ہیں:

''عام ہنود کی یہ کیفیت ہوئی کہ جس گلی کوچے میں مولوی (محمد قاسم) صاحب نکلتے تھے، تو اشارہ کرکے لوگ کہتے تھے کہ: وہ مولوی یہ ہے، جس نے پادریوں کو بند کردیا تھا اور پھسلتے کو تھام لیا تھا، اور مولوی کیا ہے، اوتار ہے''(۳)۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''یہ کہہ کر مولانا (محمد قاسم صاحب) نماز پڑھ آئے اور کھڑے ہوکر ایسا زور شور کا وعظ کہا کہ تمام جلسہ حیران رہ گیا اور ہر شخص پر سکتے کا عالم تھا''(۴)۔

(۱) میلۂ خداشناسی، ص:۴۰۔ (۲) ایضاً، ص:۴۰۔
(۳) مباحثۂ شاہ جہاں پور، ص:۸۔ (۴) ایضاً، ص:۹۔

موتی میاں آنریری مجسٹریٹ نے جو مباحثۂ شاہ جہان پور کے انتظام میں حصہ لے رہے تھے، کہا:

''پنڈت دیانند سرسوتی اور منشی اندرمن آپ کی اور مولوی منصور علی صاحب کی بہت تعریف کرتے تھے، اور آپ دونوں صاحبوں کی تقریر اور علم کے بہت مداح تھے''(۱)۔

ایک اور جگہ مولانا فخر الحسن صاحب رسالہ ''مباحثہ شاہ جہان پور'' کے آخر میں حضرت شیخ الہندؒ کے والد مولانا ذوالفقار علی صاحب مرحوم کی زبانی لکھتے ہیں:

''ایک صاحب لیکھ راج نام ساکن سہارن پور ہیں، منشی پیارے لال صاحب سے ان کی خط و کتابت بھی تھی اور اس دفعہ وہ خود بھی اس میلے (۱۸۷۷ء/۱۲۹۴ھ) میں تشریف لے گئے تھے، بعد مراجعت میری ان کی ملاقات ہوئی، تو انہوں نے بھی ویسا ہی بیان کیا، جیسا اہل اسلام نے آ کر بیان کیا تھا؛ بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ ایک مولوی صاحب قاسم علی نام اسی طرف یعنی (نانوتہ سہارن پور) کے تھے، ان کا حال کیا بیان کیجیے، ان کے دل پر تو ''سرسوتی'' بول رہی تھی۔ مولوی صاحب کے فرمانے سے معلوم ہوا کہ ''سرستی'' زبان سنسکرت میں علم کی دیبی کو کہتے ہیں''(۲)۔

مذکورہ عبارت میں لیکھ راج کی تنقید کس قدر حیرت انگیز ہے کہ اس سے بہت مختصر الفاظ میں حضرت قاسم العلومؒ کے تبحر علمی اور آمد مضامین پر روشنی ڈالی نہیں جا سکتی۔ ''ان کے دل پر سرسوتی بول رہی تھی'' یہ جملہ بھی حقیقت میں حضرت قاسم العلومؒ کی تقریر کے حق میں غیبی الفاظ ہیں، جن سے لیکھ راج کی زبانی ترجمانی کرائی گئی ہے۔

۱۲۹۵ھ/اوائلِ شعبان، یعنی (اگست) ۱۸۷۸ء کا ذکر ہے، جب کہ دیانند سرسوتی نے حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو مناظرے کا رڑکی میں چیلنج دیا تھا۔ یہ چیلنج مولانا شیخ الہندؒ، مولانا فخر الحسن صاحبؒ کی زبانی، جو قاسم العلوم کے فرستادہ تھے کہ رڑکی کے حالات دیکھ کر آئیں اور دیانند سے مناظرہ کریں، پہنچا۔ مذکورہ دونوں حضرات سے دیانند سرستی کے الفاظ یہ ہیں:

''اگر جناب مولانا (محمد قاسم) صاحب ممدوح تشریف لے آئیں، تو مباحثے کے لیے آمادہ ہوں، اور کسی سے تو مباحثہ ہرگز نہ کروں گا۔ وجہ اس تخصیص کی پوچھی، تو کہا کہ: میں تمام یورپ میں پھرا، اب تمام پنجاب میں پھر کر آیا ہوں، ہر اہل کمال سے مولانا کی تعریف سنی ہے۔

---

(۱) مباحثۂ شاہ جہان پور، ص:۴۹۔

(۲) ایضاً، ص:۸۸۔

ہر کوئی مولانا کو یکتائے روزگار کہتا ہے، اور میں نے بھی مولانا کو شاہ جہان پور کے جلسے میں دیکھا ہے، ان کی تقریر دل آویز سنی ہے۔ اگر انسان مباحثہ کرے، تو ایسے کامل و یکتا سے تو کرے، جس سے کچھ فائدہ ہو، کچھ نتیجہ نکلے''(۱)۔

محولہ بالا عبارت میں دیانند کے مولانا کو کامل و یکتائے روزگار ہونے کے علاوہ ان کی تقریر کی تعریف دل آویز کی صفت کے ساتھ کی ہے۔ حضرت مولانا قاسم العلوم جب دیانند کے چیلنج پر رڑکی پہنچے، تو پھر کیا ہوا؟ وہاں کا حال مولانا فخر الحسنؒ کی زبانی سنیے!

''پنڈت جی وعظ میں تو کیا آتے، رڑکی سے بھی چل دیے، اور ایسے گئے کہ پتہ بھی نہ ملا کہ کدھر گئے۔ آخرش مولانا نے بہ نفس نفیس برسر بازار تین روز تک وعظ فرمایا۔ مسلمان، ہندو، عیسائی اور سب بڑے چھوٹے انگریز جو رڑکی (ضلع سہارن پور) میں تھے، ان وعظوں میں شامل تھے۔ ہر قسم کے لوگوں کا ہجوم تھا۔ مولانا نے وہ وہ دلائل مذہب اسلام کے حق ہونے پر بیان فرمائے کہ سب حیران تھے۔ اہل جلسہ پر عالم سکتے کا سا تھا۔ ہر شخص متأثر معلوم ہوتا تھا۔ توحید و رسالت کے بیان میں تو وہ سماں بندھا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ جو لوگ اہل اسلام میں سے اس جلسے میں اہلِ دل تھے، وہ تو نیم بسمل ہو گئے تھے۔ مرغ بسمل کی طرح تڑپتے تھے:۔

''حوریاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زدند''(۱)

حضرت مولانا کی تقریر اور اس کا خاص اثر:

حسب ذیل واقعے کا ذکر حضرت لسان الحکمت مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ کی تاثیر تقریر اور حسن خطابت پر روشنی ڈالنے کے لیے نہایت اہم اور ضروری ہے، جس کو حضرت مولانا امام الخطباء کی خطابت کا اصل کمال کہا جانا چاہیے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ ''تذکرۃ الرشید'' حصۂ دوم میں فرماتے ہیں:

''مولوی نظر محمد خاں آبھہ کے رہنے والے ہیں، ان کے والد بے چارے دین دار شخص تھے؛ مگر یہ سن کر کہ دیوبندی مولوی وہابی ہیں، ان حضرات کی صورت دیکھنے سے بے زار تھے۔ ایک مرتبہ حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ)، مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے ہمراہ نانوتہ تشریف لائے۔ جمعہ کا دن تھا۔ آبھہ سے بھی چند آدمی نماز جمعہ کے لیے نانوتہ چلے۔ نظر محمد خاں صاحب اس وقت بچے تھے؛ مگر سمجھ دار،؛ اس لیے باپ سے

(۱) انتصار الاسلام، ص:۳۰/۴۔
(۲) ایضاً، ص:۶/۷۔

کہنے لگے کہ میں بھی نانوتہ جاؤں گا، سنا ہے کئی مولوی آئے ہوئے ہیں۔ باپ نے منع کیا اور کہا 'نا بھائی! وہ تو وہابی ہیں، وہابیوں کی صحبت سے بچنا چاہیے'۔ انہوں نے کہا: 'ہاں وہابی تو ہیں؛ مگر میں نے کبھی وہابی دیکھے نہیں، جی چاہتا ہے دیکھوں، وہابی کیسی صورت کے ہوتے ہیں'۔ باپ نے صاحبزادے کو غیروں کے ساتھ بھیجنا پسند نہ کیا، آخر خود ساتھ ہو لیے کہ میں نے بھی کبھی نہیں دیکھا، چلو دیکھ لیں۔

غرض جس وقت جامع مسجد میں قدم رکھا، تو سب سے پہلے مولانا محمد یعقوبؒ صاحب پر نظر پڑی۔ مولانا غسل فرما کر باہر کھڑے بال سکھا رہے تھے۔ اوّل تو حسین تھے ہی، اس پر طرّہ انوار وتجلیات کا؛ اس لیے متحیر ہو کر دیر تک کھڑے تکتے رہے کہ وہابیوں کی صورت تو شیعہ سے زیادہ مسخ ہونی چاہیے اور یہ تو سرتا پا نور کے ٹکڑے ہیں۔ وہاں سے چلے، تو امام ربانی (حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ) کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہاں اندر ہی اندر دلوں پر کچھ اور اثر پڑا اور محبت کا مضمون پیدا ہو گیا۔ بعد نماز جمعہ اعلان ہوا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا وعظ ہوگا۔ حضرت مولانا (محمد قاسم صاحبؒ) چوں کہ امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہیؒ) کا ادب بہت فرماتے تھے؛ اس لیے انکار فرمایا؛ مگر جب حضرت ہی فرمانے لگے کہ نہیں! مولانا ہی وعظ فرمائیں گے، تو مولانا قاسم العلومؒ نے فیضان چھڑکنا شروع کیا۔ مولوی نظر محمد خاں خود فرماتے تھے: ہمارے کانوں میں یہ بات ڈالی گئی تھی کہ یہ دیوبندی گروہ رسول کا منکر اور بے ادب وہابی گروہ ہے۔ حضرت مولانا (محمد قاسم صاحبؒ) کی کرامت تھی کہ وعظ شروع کیا، تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب ہی بیان فرمائے۔ خوش بیانی تو مولانا کی ظاہر ہی ہے؛ مگر اس وعظ میں تو وہ نکات بیان فرمائے کہ میں نے والد صاحب سے کہا کہ اگر جناب! وہابی ایسے ہی ہوتے ہیں، تو میں تو وہابی بن گیا۔ والد نے جواب دیا: ہاں بھئی! بڑی غلطی میں پڑے رہے، اگر یہ لوگ وہابی ہیں، تو میں بھی پکا وہابی ہوں۔ ان کا ساتھ مجھ سے نہیں چھوڑا جاتا۔

خلاصہ یہ کہ آئے تھے معترض ہو کر تماشہ دیکھنے اور اٹھے غلام وخادم محو جمال، معتقد بن کر۔ اس کے بعد اخلاص وللّٰہیت کے جوثمرات پیدا ہوئے، وہ دن بہ دن بڑھتے اور پھلتے پھلتے ہی رہے''(۱)۔

یہ ہے ''تذکرۃ الرشید'' کی عبارت، جس سے حضرت قاسم العلومؒ کے جادو بیان ہونے اور دلوں کو مسخر کرنے کا پتہ چلتا ہے، اور بے ساختہ زبان پر تنقیدی طور پر یہ شعر آتا ہے: ؎

(۱) تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۳۹-۱۳۸۔

اثر لبھانے کا پیارے ترے بیان میں ہے
کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے

راقم الحروف نے اس زمانے کے واقعہ نگاروں کے عینی اور سمعی تاثرات اور مشاہدات جو کچھ پیش کیے ہیں، ان سے قاری کے دل و دماغ پر حضرت قاسم العلومؒ کی خطابت یا تقریر کے بلند پایہ اور فصیح و بلیغ ہونے کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے، اور مذکورہ تمام تحریریں قاری کے ذہن کو مولانا کے فن خطابت کے کمال کو سمجھانے میں آسانی بہم پہنچاتی ہیں۔ میں نے خطابت کو حضرت مولانا کی ادبیات کے سلسلے میں پیش کیا ہے، جس پر ابتدا میں ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی گئی، اور بتایا گیا ہے کہ فصیح و بلیغ خطبے اور تقریریں ادب کا بہترین سرمایہ ہوتے ہیں۔

پروفیسر محی الدین زورؔ اپنی کتاب ''روح تنقید'' میں ادب اور اس کی قسموں کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''ایسی تحریریں (بھی ادب کا جز ہیں) جو انسان کی فطرت کی تہذیب و تزکیہ میں مدد دیتی ہیں، مثلاً: (الف)- وہ تحریریں جن کا مقصد درستیٔ اخلاق ہوتا ہے۔ (ب)- وہ تحریریں جن کا مقصد تبلیغ مذہب ہوتا ہے''۔

اس بنا پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے مذہبی خطبے، تقریریں اور تحریریں بھی جو تزکیۂ نفوس اور تبلیغِ مذہب پر شامل ہیں، ادب کی بہترین کڑیاں ہیں''۔

یہ ہیں حضرت قاسم العلوم بہ حیثیت خطیب!

حضرت مولانا نانوتویؒ کی اردو انشا نگاری:

سطور بالا میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانیٔ دار العلوم دیوبند کی ادبیات کے سلسلے میں آپ کی تقریر پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے، جس میں آں موصوف کے فن خطابت پر نہ صرف مسلمانوں؛ بلکہ غیر مسلم افراد کے تبصروں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ادبیات قاسمی کے سلسلے کی کڑیوں میں حضرت قاسم العلوم کی اُردو نثر نگاری پر راقم الحروف کو قارئین کے سامنے چند حقائق پیش کرنے ہیں، جن سے آپ کی نثر نگاری کا پورا خاکہ ادب کی دُنیا میں کھنچ سکے گا۔

مولانا کی نثر نگاری کو اگر دو حصوں میں تقسیم کیا جائے، تو نہایت مناسب ہوگا:

پہلا حصہ نثر کے ان جواہر پاروں سے وابستہ ہے، جو مولانا کے مکتوبات میں چمکتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ان نثری تحریروں سے حضرت امام الامتؒ کے اُس کمال پر روشنی پڑتی ہے، جس کی طرف ادب نواز

طبیعتوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ حال آں کہ حضرت قاسم العلوم کی عالمانہ اور مصلحانہ شان سے علاحدہ ہٹ کر آپ کے مکتوبات اور خطوط کی ادبی قدروں کو دیکھا جائے، تو ان میں ادب کے وہ خاص خاص تابناک اور روشن جواہر پارے ملیں گے، جن کو دیکھ کر آنکھیں منور ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ ادبی قدریں ہیں، جنہوں نے غالب کو اُدبائے اردو کی نظروں میں بلند مقام بخشا ہے، یعنی غالبؔ کے اُردو خطوط کا وہ انفرادی رنگ جس کا وہ خود موجد تھا اور جس کو دنیا سے وہ اپنے ساتھ لے گیا۔

حضرت قاسم العلومؒ کے رُوحانی وعلمی کمالات کا غالب سے تقابل کرنا تو کوئی معنی ہی نہیں رکھتا اور نہ ان اوصاف میں قدروں کا اشتراک ہی ہے؛ البتہ ادبی کمالات کا غالب سے انکار دشوار ہی نہیں؛ بلکہ ناممکن ہے۔ وہ اُردو نثر و نظم، انشا نگاری اور فارسی نثر و نظم کا امام تھا۔ اس کی نثر و نظم اُردو نیز فارسی پر بیسیوں دماغوں نے تنقید کی ہے، بالخصوص حالی نے ''یادگارِ غالب'' لکھ کر اوّلین کوشش کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ پانی پت کے اس مصنف نے غالب کے خطوط اور اس کے صفات پر جو روشنی ڈالی ہے، اس میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ بیان کی ہے کہ مرزا کے خطوط کی طرز ایسی ہے، گویا کوئی شخص سامنے بیٹھا ہے اور رُوبہ رُو باتیں ہو رہی ہیں۔ ان کے خطوط میں ڈرامائی انداز بھی ہے اور ظرافت بھی۔ وہ آداب والقاب کو مختصر الفاظ میں پیش کرتے ہیں اور قدیم انداز طولانی سے بے زار ہیں؛ بلکہ بعض اوقات القاب وآداب کو بھی بالائے طاق رکھ کر اظہارِ مدعا پر قلم اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ مکتوب الیہ کو غائب فرض کر لیتے ہیں، اور سب سے بڑی خوبی ان کے اندازِ تحریر میں سادگی اور بے تکلفی ہے۔ جو دل میں آتا ہے، بے ساختہ لکھتے جاتے ہیں، اور الفاظ بے تکلفی کے سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔

خطوط میں بے ساختگی:

مکتوبات میں ایک سب سے بڑی خوبی جو ان کی روح ہوتی ہے، وہ بے تکلفی اور سادگی ہے، جس کا ابھی ذکر ہوا ہے۔ اس سادگی اور بے ساختگی کی وجہ صرف یہ ہے کہ مراسلہ نگار خط لکھتے وقت اپنے ماحول سے فراموشی اختیار کر کے مکتوب الیہ کے تعلقات اور خیالات میں- درآں حالے کہ وہ مکتوب الیہ بے تکلف دوست یا عزیز ہو، ایسا گم ہوتا ہے کہ اپنی زندگی اور اس کی کیفیت کا نقشہ نہایت بے ساختگی میں کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ مکتوب نگار کو یہ قطعاً علم نہیں ہوتا کہ اس کے یہ ذاتی خطوط اوروں کی نظروں کے سامنے بھی گزریں گے۔ اگر مکتوب نگار کو یہ علم ہو جائے، تو یقیناً اس کی خطوط نویسی میں ایک احتیاط کا جذبہ کارفرما نظر آئے گا، اور جب احتیاط پیش نظر ہو گی، تو تحریر میں بے ساختگی کی بجائے تکلف اور جھجک پیدا ہو جائے گی، اور ایسی احتیاط

خطوط نویسی کی اصل سادگی اور بے تکلفی کو برباد کرکے رکھ دے گی، یعنی مکتوب نگار کی طبیعت کا وہ اصلی جوہر ماند پڑ جائے گا، جو اسی عالمِ بے خودی میں ظہور پذیر ہوتا ہے، اور اس خیال کے ماتحت جلوہ نما ہوتا ہے کہ اس کے یہ خطوط نجی خطوط ہیں اور ان پر کسی دوسرے کی نگاہ نہیں پڑے گی۔ ان دونوں خیالات کا واضح اثر خط نویسی پر آپ دیکھ سکتے ہیں۔

تنقید اور بدگمانی برطرف! مولانا شبلیؒ ایک انسان تھے، جن کے سینے میں یقیناً ایک حساس دل تھا۔ اُن کے وہ خطوط، جو انہوں نے اپنے شاگرد رشیدہ ''عطیہ فیضی'' کو لکھے ہیں، ان خطوط سے یقیناً مختلف ہیں، جو شبلی مرحوم نے اپنے دیگر تلامذہ، یا احباب اور معاصرین کو لکھے ہیں۔ اگر شبلی کو یہ علم ہو جاتا کہ میرے یہ خطوط طبع ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوں گے اور خلائق کی ضیافتِ طبع کا سامان بنیں گے، تو شبلی کبھی وہ رنگ اختیار نہ کرتے، اور اُن کی طبیعت کا اصلی جوہر کبھی نہ کھلتا۔ غالب نے اپنے شعر میں اسی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے:

کھلتا کسی پہ کیوں کے دِل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

مولانا ابوالکلام آزاد انشا نگاری میں یقیناً اپنے رنگ میں فرد ہیں، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد دونوں حضرات نے اردو انشا نگاری میں وہ گل مہکائے ہیں کہ جن کی خوش بو دماغوں سے کبھی نکل نہ سکے گی۔ اوّل الذکر مولانا آزاد نے جو خطوط احمد آباد کی جیل سے لکھے ہیں، اور جو ''غبارِ خاطر'' کتاب کی شکل میں مفرّح دل و دماغ ہیں، وہ بے ساختگی اور آمد کا بہترین مرقع ہیں، اور آزاد کے دل کی گہرائیوں کے آئینہ دار ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کے خطوط:

بہر حال! اس حقیقت کے باوجود کہ غالب نے خط نویسی کا جو انداز اختیار کیا ہے، وہ ان کا بلا شرکت غیرے انفرادی اور امتیازی رنگ ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی ہے کہ حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ خط نگاری، یا مکتوب نویسی بلا تصنع و تکلف غالب سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ غالب کے اندازِ نگارش کا عکس حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے نہ صرف اُردو خطوط میں؛ بلکہ فارسی نثروں میں بھی جھلکتا نظر آتا ہے، اور اگر قاری غور کرے، تو اُس کو میرے ساتھ اتفاق کرنے کا خیال پیدا ہو جائے؛ بلکہ یقین کے قریب آ جائے کہ واقعی اب تک یہ حقیقت آنکھوں سے اوجھل رہی۔

حیرت پر حیرت اور افسوس پر افسوس ہوتا ہے کہ علمائے دیو بند نے نہ صرف شریعت اسلامیہ کی خدمت

کی ہے؛ بلکہ اگر ریسرچ اور تحقیق کی دنیا میں آ کر سوچا جائے ،تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے اردو ادب کی شان دار خدمات انجام دی ہیں؛ لیکن آج جب کہ اردو ادب کے ایک ایک گوشے پر نظر ڈالی گئی ہے، اور تحقیقات کی دنیا کو کھنگال کر رکھ دیا گیا ہے، علمائے دیو بند کی اُردو خدمات سے اہل نقد ونظر کا چشم پوشی اختیار کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

غالباً جنوری ۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ راقم الحروف نے ''حلقۂ ارباب علم لاہور'' کے ایک اجلاس منعقدہ وائی. ایم. سی میں جدید تعلیم یافتہ طبقے کے سامنے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ پر مقالہ پڑھتے ہوئے ان کی اردو خطوط نویسی کے سلسلے میں غالب کے انداز نگارش سے آہنگی کا ذکر کیا تھا، اور حضرت قاسم العلوم کے بعض خطوط کی عبارتوں کو نمونے میں پیش کیا تھا۔ چناں چہ اس تنقیدی مجلسِ علم وادب میں میرے اس خیال کی کسی نے تردید نہیں کی تھی۔ میں نے اس خاموشی کا یقیناً یہ نتیجہ نکالا تھا کہ حلقۂ ارباب علم کے ادب پسند طبقے نے مولانا کے خطوط کی طرزِ نگارش میں غالب کا رنگ جھلکتا دیکھا ہے، جو یقیناً اُردو ادب کا بہترین سرمایہ سمجھا گیا ہے۔ میں قاری کو زیادہ دیر تک انتظار میں رکھنا پسند نہیں کرتا؛ بلکہ ان کے اُردو خطوط پیش کر کے غالب سے ہم آہنگی پر سیر حاصل تبصرہ کرتا ہوں۔اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دارالعلوم دیو بند کا یہ مؤسس، بوریا نشین درویش کس بلا کا فصیح و بلیغ انشا پرداز تھا؛ لیکن حضرتؒ کے خطوط سے قدرے تعارف کراؤں، تو پھر آگے چلوں۔

حضرت قاسم العلومؒ کے مکاتیب:

یوں تو حضرت قاسم العلومؒ کے مکاتیب مختلف تصنیفی شکلوں میں جدا جدا ملیں گے، جن کو یک جا کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً: سرسید کے نام بہ وساطت پیر جی محمد عارف صاحب ایک خط ہے، اور دوسرا خط بلا واسطہ ہے۔ یہ دونوں خطوط ''تصفیۃ العقائد'' کے نام سے ستائیس صفحات تک چلے گئے ہیں، اور رسالے کی شکل میں ہیں۔

اسی طرح مولوی جمال الدین صاحب دہلوی کے نام تحقیق مسئلہ ''وحدۃ الوجود'' پر ایک خط ہے، اور دوسرا مکتوب ''سماع موتی'' کے متعلق ہے، یہ دونوں مکتوب بھی سترہ صفحات میں ''جمال قاسمی'' کے نام سے طبع شدہ ہیں۔

بعض اور خطوط بھی ہیں، جو رسالوں کی شکل میں چھپے ہوئے ہیں اور جو جامعہ ملیہ دہلی کے کتب خانے میں موجود ہیں، جن میں بعض احادیث وآثار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیقات کی گئی ہیں، مثلاً: مولوی محی

الدین احمد خاں صاحب کو ایک فارسی خط میں جو پورا ایک رسالہ اور جو مفتی حسین احمد صاحب کے پیام پر لکھا گیا ہے۔

حدیث رزین:

"قَالَ: قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ أَیْنَ کَانَ رَبُّنَا قَبْلَ أَنْ یَّخْلُقَ خَلْقَهُ؟ قَالَ: کَانَ فِي الْمَاءِ مَا تَحْتَهُ هَوَاءٌ وَمَا فَوْقَهُ هَوَاءٌ، وَخَلَقَ عَرْشَهُ عَلَی الْمَاءِ".

کی شرح اور وضاحت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے تحریر فرمائی ہے۔ اصل میں مولانا کے اور کئی مکتوبات ہیں، جو "قاسم العلوم" میں درج ہیں، جس کے چار نمبر ہیں، اور سب ایک ہی جلد میں یک جا ہیں، اور جو جامعہ ملیہ کے کتب خانے میں ہیں، جس کا نمبر قاسم العلوم ۲۸۲/۲۵۴ رق ہے۔ ان نمبروں میں سے پہلا قاسم نمبر بیت الحکمت جامعہ نگر دہلی نے ۲۱/اگست ۱۹۴۱ء/مطابق ۲۷/رجب ۱۳۶۰ھ/ میں مطبع مجتبائی دہلی کے ایک نسخہ مطبوعہ ۱۵/ربیع الاوّل ۱۲۹۲ھ (۲۱/اپریل ۱۸۷۵ء) سے نقل کر کے چھاپا ہے، جس میں ترمذی کی مذکورہ حدیث ابی رزین کی شرح ہے۔

علاوہ ازیں حضرت نانوتویؒ کے پندرہ خطوط یک جا چھپے ہوئے ہیں، جو "فیوض قاسمیہ" کے نام سے معنون ہیں۔ اس مجموعے میں نو فارسی خطوط ہیں، اور چھ اُردو کے خط ہیں؛ لیکن دل کے لیے یہ امر حسرت انگیز ہے کہ حضرتؒ کے کتنے ایک خطوط لوگوں کی غفلت سے ضائع ہو گئے، مثلاً: مولوی جمال الدین صاحب دہلوی "جمال قاسمی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"اخلاص آئین فقیر مسکین محمد جمال الدین دہلوی علوی، تجاوز اللہ تعالیٰ عن ذنبہ الجلی والخفی عرض کرتا ہے کہ: طالب علمی کے زمانے میں ایک مخلص محبّ بزرگ مشفق برگزیدہ مولوی حافظ حاجی محمد قاسم صاحب صدیقی نانوتوی چشتیؒ مرحوم زمانے کے امام حدیث ہونے کے سوا تصوف میں صوفی صافی فقیر کے نام جو خطوط ان کے لکھے ہوئے تھے، ان کی موجودگی کی استغنا سے بے احتیاطی نے تلف کر دیے"[1]۔

اس عبارت کے آخری جملے سے معلوم ہوا کہ حضرت قاسم العلومؒ کے کتنے ایک خطوط ان کی بے احتیاطی کا شکار ہو گئے۔ "جمال قاسمی" کے دیباچے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام شریعت نے علم ہندسہ، ہیئت، فلاحت، جبر و مقابلہ، جرِّ ثقیل جیسے علوم پر بھی قلم اٹھانے کا ارادہ فرمایا تھا؛ مگر مولوی جمال الدین صاحب نے

(۱) جمال قاسمی، ص:۱۔

ہر مضمون پر ایک ایک ورق لکھنے کی قید لگا دی، اور حضرت قدس سرہٗ نے اس قید سے گھبراہٹ اور اضطراب کا اظہار فرمایا۔ چناں چہ مولوی جمال الدین صاحب لکھتے ہیں:

''آخر سو رسائل: ہندسہ، ہیئت، فلاحت، طبعی، جبر و مقابلہ، جرثقیل وغیرہا علوم میں ایک ایک ورق میں لکھنے کی فرمائش کی۔ بار بار تقریباً مہینے بھر تک مولوی صاحب اصرار کیے گئے کہ ہر رسالے کی ایک ایک ورق کی قید نہ لگائیے؛ کیوں کہ میں قلم کے ہاتھ سے لاچار ہوں۔ فقیر نے اس سبب سے کہ یہ یادگار ضرور کم از کم سو جز سے بڑھ جائے گی، تو بہ وجہ اپنی بے سروسامانی کے چھپنے سے رہ جائے گی، قلم کے اختیار کی رخصت نہ دی، اس باعث یہ کام ناتمام رہا''(۱)۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قاسم العلومؒ کا ارادہ ان تمام مذکورہ علوم پر سیر حاصل بحث کرنے کا تھا؛ لیکن مولوی جمال الدین صاحبؒ نے اپنے عذر کے باعث امتِ مسلمہ پر ظلم کیا ہے کہ حضرتؒ کے قلم سے مذکورہ علوم کی تحقیقات کا خزانہ ہم تک پہنچنے سے ضائع کر دیا۔ خدا جانے کیا کیا تحقیقات کے دریا ان خطوط میں امام ملت بہاتے، جن سے قلوب ملت کی کھیتیاں لہلہا اٹھتیں؛ مگر افسوس ان علوم کی تحقیقات سے ہماری قسمت میں محرومی لکھی تھی۔ دراں حالے کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وہ الفاظ جو حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ نے سوانح قاسمی میں درج فرمائے ہیں، ابھی تک ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں:

''حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ: مولوی (محمد قاسم) صاحبؒ کی تحریر و تقریر کو محفوظ رکھا کرو، اور غنیمت جانو''(۲)۔

اور یہ جملہ بھی حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ:

''ایسے لوگ (یعنی مولانا محمد قاسم صاحبؒ جیسے) کبھی پہلے زمانے میں ہوا کرتے تھے، اب مدتوں سے نہیں ہوتے''(۳)۔

حاجی صاحبؒ کی اس آگاہی کے باوجود امام ملت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ کی بہت سی تحریریں، تقریریں اور خطوط یقیناً ضائع ہو گئے ہیں۔ آخر وہ خطوط کہاں گئے ہوں گے، جو مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ، حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوریؒ ایسے ارشد تلامذہ کو لکھے گئے ہوں گے؟ دوسری طرف حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط کا مجموعہ ''مکاتیب رشید'' کے نام سے طبع ہو کر آج تک محفوظ چلا آ رہا ہے، جس سے اہل علم کو آج بھی فیض پہنچ رہا ہے۔

---

(۱) جمال قاسمی، ص: ۱۔ (۲) ایضاً، ص: ۵-۱۴۔ (۳) ایضاً، ص: ۱۴۔

اسی طرح سے حضرت حافظ محمد یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مکاتیب جو حضرتؒ نے منشی محمد قاسم صاحب نیانگریؒ کے نام ارسال فرمائے، چھپ کر برکات کا باعث بنے ہوئے ہیں؛ لیکن افسوس صد افسوس! حضرت قاسم العلوم والخیراتؒ کے چند مکاتیب کے سوائے سب گوشۂ خمول وگم نامی میں پڑ کر ہماری محرومیٔ قسمت کا باعث بن گئے۔ یہ ہے حضرت مرحوم کے خطوط کا تاریخی پسِ منظر!

بہر حال! حضرت نانوتویؒ کے جن خطوط کا اوپر تذکرہ ہوا ہے، میں اب اُن ہی خطوط میں سے قاری کے سامنے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

۱-مکتوب بہ نام حکیم عبد الصمد صاحب:

ٹونک کی ریاست کے عہدے دار حکیم عبد الصمد صاحبؒ کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"سراپا عنایت حکیم عبد الصمد صاحب

السلام علیکم

ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ آپ کا عنایت نامہ پہنچا تھا؛ مگر امراض خفیفہ کے آمد وشد میں جو اس سال کسی قدر ناتوانی اکثر رہتی ہے، کاہلی کے لیے تازہ بہانہ ہوگیا۔ اس وجہ سے اس دفعہ خطوط کے جواب دشوار معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی ہمت کرتا ہوں، تو ہفتے دو ہفتے کے بعد ایک دو خط کا جواب لکھ دیا؛ ورنہ خیر! آج کچھ ہمت کر کے بیٹھا ہوں، آپ کے عنایت نامے کا جواب بھی یاد آ گیا۔

میری اس کیفیت سے جو عرض کر چکا ہوں، خود ظاہر ہے کہ کہیں کے جانے آنے میں اگر طبعی دشواری نہ ہوتی، تب بھی اس حال میں دشوار تھا۔ مدت سے احبابِ دہلی متقاضی ہیں، اِدھر اپنا شوق بھی اُدھر کھینچتا ہے؛ اس لیے یہ ارادہ تھا کہ دیوبند پہنچا، تو اُدھر سے اُدھر دہلی بھی ہو آؤں گا؛ مگر تواترِ امراض کے باعث یہ ارادہ ملتوی رہا۔ اب گو اچھا ہوں؛ مگر کاہلی کے لیے یہ خفیف سی نقاہت کافی ہے۔ غرض ٹونک تک اپنی رسائی کی توقع نہیں، آپ بھی اس خیال کو جانے دیجیے، یہیں سے عرض کیے دیتا ہوں کہ اس زمانے میں یہ توقع بے جا ہے کہ اختلاف اٹھ جائے اور اتفاق پیدا ہو جائے۔ ہاں بالعموم ابنائے روزگار میں فہم وانصاف ہوتا، تو بعد فہمائش ممکن تھا کہ یہ اختلاف اٹھ جاتے؛ مگر آپ جانتے ہیں کہ آج کل یہ دونوں باتیں نصیب اعدا ہیں۔ یہ اختلاف ہی موجب عداوت ہے، اور یہ باہمی عداوت موجب تنفر دیگر ہے؛ اس لیے کوئی کسی کی نہیں سنتا، اور بے سمجھے دوسروں کی رسم وراہ کو غلط سمجھتا ہے۔ پھر آپ ہی فرمائیں یہ حال ہو تو کیا حال ہوگا؟ اس صورت میں توقع فہم وانصاف ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں؛ بلکہ ہر کسی کی خود رائی ہے۔

مرشدوں کی نسبت یہ خیال غلط ہے کہ وہ ہر دم ساتھ رہتے ہیں اور ہر دم آگاہ رہتے ہیں۔ یہ خدا ہی کی شان ہے۔ گاہ و بے گاہ بہ طور خرق عادت بعض اکابر سے ایسے معاملات ظاہر ہوئے ہیں، اُس سے جاہلوں کو یہ دھوکا پڑا ہے۔ تصور میں صورت کا خیال امر فضول ہے، جیسے کسی کے تذکرے کے وقت کسی کا خیال آتا ہے، ایسا ہی تصور شیخ میں؛ مگر تصور کرو تو اپنے آپ کو اپنی جگہ اور شیخ کو اپنے وطن میں، اور اس کے ساتھ یہ خیال رہے کہ اُدھر سے کچھ فیض آتا ہے۔ ''اللہ الصمد'' اور ''بسم اللہ'' کو برائے چندے موقوف رکھو، اور ''الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول'' بہت مختصر ہے؛ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر نہ سمجھنا چاہیے؛ ورنہ اسلام کیا ہوگا، کفر ہوگا؛ بلکہ یوں سمجھئے! یہ پیام فرشتے پہنچاتے ہیں۔ والسلام۔ محمد قاسم''(۱)۔

مذکورہ بالا خط غور سے پڑھیے اور دیکھیے کہ مکتوب میں:

۱-کس قدر سادگی اور بے ساختگی ہے۔

۲-غالب کی طرح حضرت قاسم العلومؒ کے مذکورہ مکتوب میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ سامنے ہے، اور اس سے بالمشافہ باتیں ہو رہی ہیں۔

۳-القاب وآداب بالکل مختصر اور غالب کی طرح مختصر ہیں۔

۴-اردو زبان فصیح، صاف اور شگفتہ ہے۔

۵-دل میں جو کچھ ہے، وہی زبان قلم پر صاف صاف آرہا ہے۔

مذکورہ صفات کے باعث قاسم العلوم علیہ الرحمہ اپنے مکتوب میں غالب کے ہم رنگ نظر آتے ہیں، اور حالی کے تبصرے کی تردید ہوتی ہے، جو انہوں نے ''یادگارِ غالب'' میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں:

> ''مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا، اور نہ اُن کے بعد کسی سے اس کی پوری پوری تقلید ہوسکی''(۲)۔

یہی خواجہ حالیؒ دوسری جگہ غالب کے اُردو خطوط کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مرزا کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں، یہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ اور لوگ اس کی پیروی نہ کرسکیں؛ مگر وہ چیز جس نے ان کی مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دل چسپ بنادیا ہے، وہ شوخیِ تحریر ہے، جو اکتساب مشق ومہارت، یا پیروی وتقلید سے حاصل نہیں ہوسکتی''(۳)۔

---

(۱) فیوض قاسمیہ، ص:۹-۴۸۔

(۲) یادگارِ غالب، ص:۱۹۰۔ (۳) ایضاً، ص:۱۹۵۔

خواجہ حالیؔ کی اس دوسری عبارت سے مجھے اتفاق ہے کہ اُردو خطوط نویسی میں غالب کی پیروی ممکن ہے؛ لیکن غالب کی شوخیِ تحریر کو انہوں نے اپنی تحریر میں اس کا امتیازی نا قابلِ تقلید طرز ٹھہرایا ہے۔ یہ ایک درجے تک ٹھیک ہے۔

راقم الحروف نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کو اُردو خطوط نویسی میں جن اوصاف کے باعث غالب کا شریک ٹھہرایا ہے، اُن میں شوخیِ تحریر کا ذکر کیا گیا؛ کیوں کہ جس قسم کی شوخیِ تحریر غالب کے یہاں موجود ہے، وہ یقیناً قاسم العلوم کے یہاں ہونی ناممکن ہے؛ کیوں کہ آپ کے خطوط کا اکثر موضوع علمی حقائق ہیں، وہاں شوخی کو دخل کہاں؟ ورنہ حقیقت، مجاز، اور متانت، شوخی کے رنگ میں بدل کر رہ جائے گی۔ تاہم مولانا کے مکاتیب میں بھی ہلکی ظرافت اور ہلکی سی شوخی کی چاشنی موجود ہے، جس کو آپ کے فارسی خطوط میں ان شاء اللہ! پیش کروں گا۔

قاسم العلوم کی خط نویسی میں غالب کا رنگ دیکھنے کے لیے اب میں مرزا کا ایک خط پیش کرتا ہوں، جس سے باہمی قدروں کے اشتراک کا انداہ آسان ہوجائے گا۔ اُردوئے معلیٰ میں مرزا باقر علی خاں صاحب کامل کے نام غالب کا حسب ذیل خط موجود ہے۔ مختصر القاب کے بعد لکھتے ہیں:

> ’’تمہارا خط آیا۔ تمہارے روزگار کی درستی آگے سن چکا تھا، اب تمہارے لکھنے سے دیکھ بھی لی۔ دل میرا خوش ہوا، اور تم خاطر جمع رکھو، جیسا کہ مہاراج نے تم سے کہا ہے، تمہاری ترقی ان شاء اللہ تعالیٰ! جلد ہوگی۔ مجھ سے جو تم گلہ کرتے ہو خط کے نہ بھیجنے کا، بھائی اب میری انگلیاں نکمی ہوگئی ہیں اور بصارت میں بھی ضعف آگیا ہے۔ دو سطریں بھی نہیں لکھ سکتا۔ اطراف و جوانب کے خطوط آئے ہوئے دھرے رہتے ہیں۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے، میں اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ پرسوں کا تمہارا خط آیا ہوا دھرا تھا۔ اب اس وقت مرزا یوسف علی خاں آگئے، میں نے اُن سے یہ خط لکھوا دیا۔ تمہاری دادی اچھی طرح ہے، تمہارا بھائی اچھی طرح ہے، تمہارے گھر میں سب طرح خیر و عافیت۔ تمہاری لڑکی اچھی طرح ہے۔ کبھی روز کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آجاتی ہے‘‘(۱)۔

مرزا کے مذکورہ خط کے مقابلے میں دوسرا خط جو اس کی صفاتِ خط نویسی کا نمونہ ہو، پیش کیا جاسکتا ہے؛ مگر غالب کے اس خط میں اپنی بیماری اور نقاہت کا حال مذکور ہے۔ بس اسی لیے میں نے اس خط کو منتخب کیا ہے۔ ادھر حضرت قاسم العلوم علیہ الرحمہ کے مکتوب میں اپنی علالت و نقاہت کا ذکر ہے۔

(۱) اردوئے معلیٰ، ص: ۹۰-۱۸۹۔

نیز لوگوں کے طبعی حالات وشکر رنجیوں، نیز علمی تحقیقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مختصراً ہر دوخطوط کے بعض حصے مضمون کے اعتبار سے ملتے ہیں۔ان دونوں خطوط میں سادگی، بات چیت کا سا لطف، عبارت میں صفائی اور شستگی، حقیقتِ حال کی ترجمانی اور بے ساختگی ہے۔

اب میں حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اور خطوط پیش کرتا ہوں، جن سے میرے خیال کی مزید تائید حاصل ہونے میں آسانی ہو سکے گی۔حضرت حکیم نصر اللہ خاں صاحب کو آداب والقاب کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

> ''آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔یہ عنایت میرے سر پر؟ مگر میں حیران ہوں، نہ میں ایسا عالم، نہ ایسا محقق، مجھ کو آپ نے کیوں اس کام کے لیے تجویز کیا؟ مجھ کو تو کبھی فتویٰ لکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا، اور نہ میرے پاس اس کام کا سامان، نہ کتابیں، نہ متقدمین ومتاخرین کی بیاضیں، جو میں اس کام کو سنبھالوں۔اس پر مولانا محمد یعقوب صاحب آج کل اپنے وطن کو گئے ہوئے ہیں۔پھر ایسے مسائل کے جواب لکھے، تو کون لکھے؟ ہاں اپنی سمجھ اور خیال کی بات کہیے تو میں لکھ دوں''[1]۔

مذکورہ بالا عبارت مولانا کے مکتوب کا ابتدائی حصہ ہے۔یہ خط پورے کا پورا نقل کرنا طوالت سے خالی نہ تھا، محض نمونے کے طور پر اتنا حصہ نقل کرنا کافی سمجھا گیا۔خط کی اس نثری تحریر کو غور کی نظر سے دیکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ گزشتہ انیسویں اور بیسویں صدی کے مکتوب نگاروں کی زبان اور بیان کے اعتبار سے حضرت قاسم العلومؒ کی یہ نثری تحریر بھی سادہ اور دل کش، مسلسل اور پر لطف ہے۔عبارت میں بے ساختہ پن اور طرزِ تکلم کا سا رنگ ہے۔کیا غالب کے مکاتیب کا یہی رنگ نہیں؟ تھوڑی دیر کے لیے غالب کی شوخی اور ضرورت سے زیادہ بے تکلفی کو چھوڑ یے، صرف یہ دیکھیے کہ خط کی عبارت میں فصاحت، شستگی، روانی اور رنگ خطابت کس درجے اُبھرتا نظر آتا ہے۔

مولوی عبداللہ صاحبؒ کو ایک خط میں کہ اُنہوں نے پانی پر دَم اور دل کے لیے بائیں جانب ہونے کے متعلق حکمت دریافت کی ہے، حضرت قاسم العلومؒ اس طرح لکھتے ہیں:

> ''عزیز القدر مولوی عبداللہ
>
> السلام علیکم
>
> قلت فرصت کے سبب جواب خط کی نوبت نہیں آئی؛ مگر خیال رہتا تھا۔آج لکھنے بیٹھا ہوں۔سنیے! پانی میں دم کی ممانعت کی وجہ خاصی ہے، اور ناک پکڑنے کی توجیہ بھی اندازِ ظرافت

---

(۱) فیوضِ قاسمیہ، ص:۳۰-۳۲۔

وحکمت پر اچھی ہے؛ البتہ عالمانہ طور پر نہیں۔ باقی قلب کے بائیں جانب رکھنے میں یہ حکمت ہے کہ قلب کے دائیں جانب فرشتہ رہتا ہے اور بائیں جانب شیطان۔ اس صورت میں فرشتے کو زیادہ گنجائش ملے گی، اور وہ اس وجہ سے زیادہ مداخلت کر سکے گا۔ باقی سینہ ایک محلِ قیام ہے۔ اس کا دایاں، بایاں کسی معتد بہ شئی سے مقرر کرنا چاہیے اور اسی کا اعتبار رکھنا چاہیے؛ البتہ مکان یا محفل میں یمین و یسار کے لیے مکین و میر محفل پر نظر ہوتی ہے۔ سو یہاں بھی میر محفل سینہ کہو، یا مکین مکانِ سینہ "قلب" کہو؛ اس لیے فرشتے کو دائیں طرف جگہ دی اور شیطان کو بائیں طرف جا ملی۔

اور عورت کے پہلوئے مرد سے پیدا ہونے میں یہ حکمت ہے کہ بہ اشارۂ آیت:

"أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً".

رشتۂ قرابتِ زوجیت سے محبت والفت مطلوب ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ بات اسی صورت میں خوب حاصل ہو سکتی تھی۔

منشی صاحب کو سلام کے بعد مبارک بادِ تولدِ دختر کہہ دینا۔ خداوند کریم عمر دراز کرے اور سعادت مند کرے۔ فقط (محمد قاسم)"۔

مذکورہ خط کتنا سادہ اور سلیس ہے، یہ ظاہر ہے؛ البتہ بعض الفاظ مثلاً "معتد بہ، یمین و یسار" ایسے ہیں کہ جن کو قدرے خط کی زبان کے لیے عوام میں مشکل سمجھا جائے گا؛ مگر اس قسم کے بہت سے الفاظ غالب اور دوسرے انشاپردازوں کے یہاں بھی بہ کثرت ملیں گے، بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں تو ان کی بھر مار ہے۔ بہر حال! اس مکتوبِ قاسمی کی لسانی اہمیت اپنی جگہ خوب ہے۔

سادگی کے علاوہ خطابی طرز اپنے تمام نقش ونگار کے ساتھ نمایاں ہے۔ القاب مختصر اور آداب بالکل نہیں۔ مضمون کے لیے زیادہ انتظار کی ضرورت نہیں۔ مکتوب کو جلد ہی شروع کر دیا گیا ہے۔ مولانا اپنے خطوط میں قدیم طرزِ نگارش کے مطابق یہ نہیں لکھتے کہ "میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت و عافیت کا خدائے قدیر سے طلب گار ہوں"۔ بلکہ بغیر تمہید کے مضمون شروع فرما دیتے ہیں۔

فیوض قاسمیہ کا تیسرا خط حضرت قاسم العلومؒ نے کسی صاحب کے بعض علمی مسائل کے سوالات کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔ یہ خط چار صفحات تک چلا گیا ہے؛ اس لیے پورے کے پورے خط کو لکھنا دشوار ہے؛ البتہ اس کے بعض اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ مولانا لکھتے ہیں:

"بھائی صاحب! آپ کا عنایت نامہ تو پہنچا؛ مگر بڑا افسوس یہ ہے کہ آپ نے کتب کے

حوالے اور صفحے، جلد اور فصل اور باب کا نشان نہ لکھا۔ یہ مضامین آپ نے کسی اور ہی سے لکھوائے ہوں گے۔ جہاں اتنا لکھوایا تھا، وہاں اتنا اور بھی لکھوانا تھا۔

آپ جانتے ہیں میں خود ذی علم نہیں اور یہاں کوئی ایسا ذی علم نہیں؛ البتہ بعض کتب یہاں میسر آسکتی ہیں، اگر آپ نشان بھی لکھ دیتے، تو مقامات مذکورہ کتابوں سے بہ شرط دست یابی نکال کر کسی عالم کی خدمت میں بھیجتا اور ان سے جواب منگاتا۔ اب فقط آپ کے اطمینان پر موافق بیان بعض احباب کچھ عرض کرتا ہوں: سنیے! آیت:

''فَمَا بَکَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا کَانُوْا مُنْظَرِیْنَ''.

کفار یعنی قومِ فرعون کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اس صورت میں اہل اسلام اس سے مستثنیٰ ہوں گے؛ کیوں کہ کفار کی تخصیص اس پر شاہد ہے کہ اہل اسلام پر آسمان و زمین دونوں روتے ہیں؛ ورنہ کفار کی کیا خصوصیت رہی؟

اب ایک دو باتیں عقلی بھی سن لیجیے! گو وہ بھی تعلق نقلیات سے خالی نہیں۔ جنابِ عالی! اعلیٰ درجے کی رفاقت تو کسی کے ساتھ یہ ہے کہ کسی کی بلا اپنے ذمے لے لے، یا اس کے لیے سفارش کردے، یا اس کے عوض کچھ دے کر چھڑالے، یا اس کی مدد کر کے اس کو بچالے۔ چناں چہ آیت:

''وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَاتَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ''.

میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

اور ادنیٰ درجے کی رفاقت یہ ہے کہ اس کی مصیبت کو دیکھ کر رو پڑے، اور اس کا ادنیٰ درجے پر ہونا اس سے ظاہر ہے کہ کسی کا رونا کسی کو نافع نہیں۔ پس اس کی طرف سے اس آیت: ''فَمَا بَکَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ'' میں اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کو اتنی بھی رفاقت نصیب نہ ہوئی۔

جو عالم ذکر شہادتین کرتے ہیں، یا انہوں نے کیا ہے، اُن کی غرض یہ ہے کہ سامعین کو یہ معلوم ہوجائے کہ دین میں جاں بازی اور جاں نثاری و پختگی اور ثبات و استقامت چاہیے۔ حضرت (امام) حسین رضی اللہ عنہ نے جان و مال کا لحاظ کیا، نہ زن و فرزند کا خیال کیا، نہ بھوک پیاس کا دھیان کیا، نہ اپنی بے کسی اور بے سروسامانی کا۔ جان نازنین بر راہِ خدا میں کھیل گئے اور خویش و اقربا اور احباب کو قتل کرادیا، پر دین کو بٹہ نہ لگنے دیا''[1]۔

---

(۱) فیوض قاسمیہ، ص: ۷/۸۔

حضرت ''شہر بانو'' بادشاہِ یزدجرد، شاہِ فارس کی بیٹی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں غنیمت میں آئی تھیں، ان کو حضرت عمرؓ نے حضرت امام حسینؓ کے حوالے کر دیا تھا، اور دو اور جو ان کی بہنیں تھیں، ایک ''ماہ بانو'' اور ایک ''مہر بانو''، اُن میں سے ایک تو حضرت محمد ابن ابی بکرؓ کو دے دی تھی، اور ایک عبداللہ ابن عمرؓ کو ملی تھی؛ مگر جہاد کی عورتوں سے نکاح کی حاجت نہیں ہوتی؛ اس لیے نکاح کی نوبت نہیں آئی۔

اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما کے نزدیک حق تھی؛ ورنہ پھر جہاد کے صحیح ہونے اور غنیمت کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر ان کی خلافت صحیح نہ ہوتی، تو پھر سوچنے کی بات ہے کہ یہ اعتراض کہاں کہاں تک پہنچتا ہے؟ اس صورت میں یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ قاسم ابن محمد ابن ابو بکر، اور سالم ابن عبداللہ ابن عمر، یعنی ایک ابو بکرؓ کے پوتے اور ایک حضرت عمرؓ کے پوتے حضرت امام زین العابدینؓ کے خلیرے بھائی ہیں۔ پھر اس قرابت تازہ ہی کے سبب اور رشتے ہوتے رہے؛ چناں چہ حضرت قاسمؒ مذکور امام صادقؒ کے نانا بھی ہیں۔ والسلام

سید رحیم بخش صاحب رونق افروز میرٹھ ہوں، تو ان سے میرا سلام عرض کر دینا، اور ان کے فرزند سے بھی یاد رہے تو سلام کہہ دینا۔ فقط، محمد قاسم''(۱)۔

مذکورہ خط میں حضرت قاسم العلومؒ کی تحریر کے مختلف ٹکڑے ہیں۔ تمام مکتوب طوالت کے باعث قلم انداز کر دیا گیا ہے۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ پرانی وضع کا ایک عالم اور وہ بھی نانوتہ ضلع سہارن پور کے ایک قصبہ کا رہنے والا، جہاں کی زبان ثقیل، ناہموار اور غیر شستہ ہے، وہاں سے اس قسم کی سادہ، اور فصیح اور صاف زبان کا مالک ایسی اچھی زبان پیش کر رہا ہے، جس کو ادبیات میں شامل نہ کر کے تبصرہ نہ کرنا ادب کی معلومات پر گم نامی کا پردہ ڈالنا ہے۔

حضرت قاسم العلومؒ نے اس خط کو ''بھائی صاحب'' سے شروع فرمایا ہے۔ یہی القاب اور یہی آداب ہے اور پھر مضمون شروع کر دیا گیا ہے۔ یہ قدامت میں جدت ہے۔ رنگ خطابت ہر خط میں صاف نظر آتا ہے، چناں چہ یہاں بھی ہے۔ اس امر کا اظہار اس ادبی مقام پر نہ کرنا مولانا کے ادبی پس منظر پر ظلم ہو گا کہ حضرت قاسم العلومؒ نے بارہ سال کی عمر سے پچیس سال تک مسلسل دلی میں گزارے تھے؛ اس لیے عہد طفلی کے دور میں آپ کی زبان پر دلی کا یقیناً اثر پڑا تھا۔ بعد ازاں میرٹھ کے قیام نے بھی مولانا کے اُردو ادب

(۱) فیوض قاسمیہ، ص: ۷-۱۶۔

اور اُردو زبان پر اثر ڈالا ہے۔ مولانا کی عمر کا بیش تر حصہ دہلی اور میرٹھ میں گزرا ہے۔ دہلی تو زبان اُردو کی ٹکسال تھی ہی؛ مگر میرٹھ کی زبان بھی شستگی میں کچھ کم نہیں۔

مولانا نانوتویؒ اور غالب کے خطوط میں مقفّیٰ عبارتیں:

مجھے یاد نہیں آتا کہ خواجہ الطاف حسین حالی نے غالب کے خطوط کی جو خصوصیتیں بیان کی ہیں، ان میں یہ خصوصیت بھی لکھی ہے کہ غالب نے اپنے خطوط میں بہت سے مواقع پر مقفّیٰ اور مسجع عبارتیں جا بہ جا لکھی ہیں۔ حال آں کہ غالب کی خطوط نویسی میں یہ بھی ایک ممتاز اور درخشاں صفت موجود ہے۔ اس وصف کی نمائش کے لیے صرف ایک خط کی جو غالب نے مفتی سید محمد عباس کو لکھا ہے، چند سطریں لکھتا ہوں:

> ''قبلہ حضرت کا نوازش نامہ آیا، میں نے اس کو حرز بازو بنایا۔ آپ کی تحسین میرے واسطے سرمایۂ عز و افتخار ہے۔ فقیر امیدوار ہے کہ یہ دفتر بے معنی سراسر دیکھا جائے، نہ پیشِ نظر دھرا رہے؛ بلکہ اکثر دیکھا جائے۔ میں (نے) جو نسخہ بھجوایا ہے، گویا کسوٹی پر سونا چڑھایا ہے۔ نہ ہٹ دھرم ہوں، نہ مجھے اپنی کی پچ ہے، دیباچہ و خاتمہ میں جو کچھ لکھ آیا ہوں سب سچ ہے''(۱)۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اُردو خطوط میں کہیں کہیں اور فارسی خطوط میں اکثر اس قسم کی مقفّیٰ اور مسجع عبارتیں لکھتے چلے جاتے ہیں؛ لیکن فرق یہ ہے کہ غالب بہ تکلف قافیہ بندی کرتے ہیں اور حضرت قاسم العلومؒ کی قافیہ آرائی بے ساختہ قلم سے نکلتی چلی جاتی ہے۔ حضرت قاسم العلومؒ نے پیر جی محمد عارف صاحبؒ کے ذریعے سے بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ سرسید کو اپنے ایک طویل مکتوب میں حسبِ ذیل سطور تحریر فرمائی ہیں، لکھتے ہیں:

> ''جی میں یہ آتا ہے کہ قلم ہاتھ سے ڈال دیجیے؛ مگر کیا کروں آپ کا تقاضہ جدا جان کو کھائے جاتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کا ارشاد جدا ہی ڈراتا ہے۔ گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل۔ جب بے کہے نہ بنی، تو قلم کو روک روک کر کچھ مختصر مختصر عرض کر دینا مناسب جانا، اور جی میں یہ ٹھانا کہ ہر چہ بادا باد پھر قلم نہ اُٹھانا''(۲)۔

مذکورہ سطور میں ''کھائے جاتا ہے''، ''جدا ہی ڈراتا ہے''، ''مناسب جانا''، ''جی میں یہ ٹھانا''، ''پھر قلم نہ اُٹھانا'' مسجع اور مقفّیٰ ٹکڑے ہیں؛ مگر مولانا نے غالب کی طرح ان قوافی کا التزام نہیں کیا ہے۔

مکتوباتِ قاسمی کے ضمن میں حضرت قاسم العلومؒ اور سرسید کا ذکر آ گیا ہے؛ اس لیے اُنیسویں صدی کی ان دونوں ہستیوں کا اُردو ادب اور اُردو خط نویسی کے ضمن میں تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔

---

(۱) اُردوئے معلی، ص:۱۲۹۔　　(۲) تصفیۃ العقائد، ص:۵۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے بعد انگریز کے تمدن اور آزادیٔ مذہب نے ہندوستان کے لوگوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کیا۔ سرسید جو کہ اپنی ابتدائی زندگی میں مذہب میں پکے اور ٹھوس آدمی تھے، مغربیت کے رنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ملک میں ان کے خلاف ایک طوفان برپا ہو گیا، اور کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی ترقی اور اشاعت تعلیم جدید میں محدود رہ کر مذہب میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھاتے کہ ان کی ذات سے مسلمانانِ ہند کو اختلاف کی نوبت آتی۔ کتنے ایک ہمدردانِ مذہب نے سرسید کو اس سلسلے میں راہِ مستقیم دکھانے کی کوشش کی؛ لیکن بے سود رہی۔ شروع شروع میں محسن الملک وغیرہ ایسے ان کے مخلص بھی سرسید کے مخالف تھے۔ شبلی کو بھی اس قسم کا اختلاف رہا۔ ان ہی مذہبی خیالات کی بے راہ روی کا نتیجہ تھا کہ سرسید کی وفات کے بعد اُن کے مذہبی خیالات کی ترجمان کتابوں کو مسلم یونیورسٹی کے نصاب سے خارج کر دیا گیا تھا۔

بہر حال! یہاں محض تعارف مراسلات کے لیے یہ چند سطریں میں نے حوالۂ قلم کی ہیں، نہ کہ گزشتہ اختلافات کی ہنگامہ آرائی کے لیے دروازہ کھولا ہے۔ اسی اصلاح خیال کے لیے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے سرسید کے مکتوب کے جواب میں جو بہ وساطت پیر جی محمد عارف صاحب مرحوم آئے گئے، خط تحریر فرمایا ہے۔ پہلے میں سرسید کا خط نقل کرتا ہوں اور پھر قاسم العلوم کا۔ ان خطوط کے ضمن میں قاری کو دونوں ہستیوں کی انشا پردازی اور اخلاق وخیالات کا جائزہ لینے کا سامان فراہم ہو سکے گا۔

مکتوبِ سرسید بہ نام حضرت نانوتویؒ بہ وساطت پیر جی محمد عارف صاحبؒ:

''جناب پیر جی صاحب مخدوم مکرم سلامت! بعد سلام مسنون کے عرض ہے کہ بزرگانِ سہارن پور نے جو نوازش و دل سوزی میرے حالِ زار پر کی ہے، جس کا ذکر آپ نے مجھ سے فرمایا، میں دل سے ان کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لائیں، تو میری سعادت ہے، میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا؛ مگر اس وقت مرزا غالب کا ایک شعر مجھے یاد آیا۔ وہو ھذا:

حضرت ناصح جو آویں دیدہ ودل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا؟

جنابِ من! میری تمام تحریریں جن کے سبب میں ''کافر ومرتد'' ٹھہرا ہوں، اور وحدانیت ورسالت کی تصدیق کے ساتھ کفر جمع ہوا ہے، جو میرے نزدیک محالات سے ہے، چند اصول پر

مبنی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں، تو اُن اُصولوں کو بزرگانِ سہارن پور کی خدمت میں بھیج دیں۔ اگر ان میں کچھ غلطی ہے، تو بلاشبہ نصیحتِ ناصح کارگر ہوگی؛ ورنہ ایسا نہ ہو کہ ناصح ہی مجھ سے خفا ہو جائیں۔ اور وہ اُصول یہ ہیں.....................

پس اگر بزرگانِ سہارن پور ان اُصول کی غلطی سے مجھے مطلع فرماویں گے، میں دل و جان سے شکر ادا کروں گا۔ والسلام۔ سید احمد''۔

مکتوب مولانا نانوتویؒ بہ نام سرسید بہ وساطت پیر جی صاحبؒ:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجموعۂ عنایات پیر جی محمد عارف صاحب

السلام علیکم وعلیٰ من لدیکم!

آج بندہ درگاہِ دلی سے میرٹھ واپس آیا، تو مولوی محمد ہاشم صاحب نے مولانا محمد یعقوب صاحب کا عنایت نامہ جو آیا رکھا تھا عنایت فرمایا۔ کھولا تو آپ کا خط اور جناب سید احمد خاں صاحب کی ایک بڑی تحریر اندر سے نکلی۔ شاید یہ قصہ اُس گفتگو کا نتیجہ ہے، جو آخر ماہِ شوال میں بہ مقام انبیٹھہ مابین احقر و جناب ہوئی تھی۔ سید صاحب کی تحریر سے کچھ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ آپ نے میرے آنے کا کچھ تذکرہ اُن سے کیا ہوگا؛ مگر مجھ کو یاد نہیں آتا کہ آپ نے کس بات سے سمجھا ہوگا۔ اُس وقت کی عرض معروض کا ماحصل فقط اتنا ہی تھا کہ سید صاحب کی ہاں میں ہاں ملانا ہم سے جب ہی متصور ہے کہ سید صاحب اپنے اُن اقوالِ مشہورہ سے رجوع کریں، جو اُن کی نسبت ہر کوئی گاتا پھرتا ہے، اور سید صاحب اُن پر اصرار کیے جاتے ہیں۔ اور رجوع نہیں فرماتے؛ مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ گزارش میری طرف سے آپ کی اس استدعا کے جواب میں تھی، جو آپ نے دربارۂ شمولِ حالِ جناب سید صاحب اس ناکام سے کی تھی۔ بہرحال! آنے جانے کا کچھ مذکور نہ تھا''۔

۲- آپ ہی فرمائیں کہ ہم سے گرفتاروں کو اتنی رہائی کہاں کہ بنارس، غازی پور اُڑ جائیں، اور ہم سے بے چاروں کو اتنی رسائی کہاں کہ سید صاحب کے درِ دولت تک نوبت پہنچائیں۔ اپنا مبلغ پرواز میرٹھ، حدِّ نہایت دلی ہے۔ تسپر نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے؟ کیا آپ کے خیال میں یہ بات آسکتی ہے کہ صدر الصدور اعظم ایک غریب سے مزدور کے طور پر ہو جائیں؟ اجی حضرت! امیروں کے ذہن وفہم وعقل وادراک کے ہزاروں گواہ ہوتے ہیں۔ غریبوں کے فہم

وفراست کا کہیں ایک بھی نہ سنا۔ اس صورت میں کیوں کر کہہ دیجیے کہ سید صاحب ایک غریب سے شیخ زادے کی مان جائیں؟ ؎

کب وہ سنتے ہیں کہانی میری
اور وہ بھی زبانی مری

شکستہ حالوں کی باتوں پر موافق مصرعہ غالب (بلکہ شعر غالب): ؎

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
میں کہوں گا حالِ دل اور فرمائیں گے کیا

ایسے عالی مراتب، دانش مند ہرگز توجہ نہیں فرمایا کرتے۔ بہ ایں ہمہ ایسی چھیڑ چھاڑوں میں کبھی نہیں دیکھا کہ کسی ادنیٰ نے بھی کسی اعلیٰ کی مانی ہو۔ اس صورت میں ایسی بر عکسی کی کیا امید باندھیے؟

پیر جی صاحب! یہ گم نام کبھی کسی سے نہیں الجھتا، اور اُلجھے بھی تو کیوں کر اُلجھے؟ وہ کون سی خوبی ہے، جس پر کمر باندھ کر لڑنے کو تیار ہو؟ ایسی کیا ضرورت ہے کہ اپنے عمدہ مشاغل چھوڑ کر اس نفسا نفسی میں پھنسوں؟ ہاں! اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب کی اولو العزمی اور دردمندیٔ اہلِ اسلام کا معتقد ہوں، اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہارِ محبت کروں تو بجا ہے؛ مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فسادِ عقائد کو سن سن کر ان کا شاکی، اور اُن کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں۔ مجھ کو ان کے کمال دانش سے یہ امید تھی کہ میرے اس رنج کو ثمرۂ محبت سمجھ کر کرتہ دل سے اپنے اقوال میں مجھ سے استفسار کریں گے، بہ ایں خیال کہ ؎

گاہ باشد کہ کودکِ ناداں
بہ غلط بر ہدف زند تیرے

اس طرف کو دل لگائیں گے؛ مگر اُن کی اس تحریر کو دیکھ کر دل سرد ہو گیا، اور یہ یقین ہو گیا کہ کوئی کچھ کہو، وہ اپنی وہی کہے جائیں گے۔ اُن کے اندازِ تحریر سے یہ بات نمایاں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ایسا سمجھتے ہیں کہ کبھی غلط نہیں کہیں گے؛ اس لیے جی میں یہ آتا ہے کہ قلم ہاتھ سے ڈال دیجیے؛ مگر کیا کروں؟ آپ کا تقاضا جدا جان کو کھائے جاتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کا ارشاد جدا ہی ڈراتا ہے۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ جب بے کہے نہ بنی تو قلم کو روک روک کر کچھ مختصر مختصر ایک بار عرض کر دینا مناسب جانا اور جی میں یہ ٹھانا کہ ہر چہ باداباد پھر قلم نہ اُٹھانا۔

کہیں مدلل، کہیں بے دلیل۔ ایک بات تو اپنے مافی الضمیر کو لکھ کر روانہ کرائیے۔ اگر سید صاحب نے انصاف فرمایا، تو پھر بھی دیکھا جائے گا؛ ورنہ اپنے حق میں کوئی جابر نہیں، جو مجبوری کا اندیشہ ہو۔ بہر حال! بہ ترتیب اُصول مسطورۂ سید صاحب۔ یہ معروضات معروض ہیں:......

زیادہ حکمت بہ لقمان آموختن است۔ ''اَللّٰهُ يَهْدِيْنَا وَيَهْدِيْكُمْ اِلٰى سَوَاءِ الصِّرَاطِ، وَاللّٰهِ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ''۔ محمد قاسم!''

خطوط کی اخلاقی قدریں:

مذکورہ بالا دونوں خطوط پیر جی محمد عارف صاحب کے نام ہیں، اور دونوں مقتدر ہستیاں پس پردہ ہیں۔ سرسید کا یہ جملہ: ''اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں، تو میری سعادت ہے، میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا''۔ بہت ہی قابلِ قدر ہے، جس سے سرسید کے دل میں مولانا کی وقعت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، اور کیوں نہ ہو کہ دونوں حضرات مولانا مملوک العلی صاحبؒ صدر عربک کالج دہلی کے شاگرد تھے۔

حضرت قاسم العلوم کا یہ فرمانا: ''اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب کی اولوالعزمی اور درد مندیٔ اہل اسلام کا معتقد ہوں، اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہارِ محبت کروں تو بجا ہے''۔ اپنی جگہ سرسید کے متعلق منصفانہ طبیعت کا آئینہ دار ہے۔

مگر سرسید نے مذکورہ عقیدت مندانہ خیال کے بعد یہ لکھ کر کہ:؎

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ ودل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا؟

تمام عقیدت پر پانی پھیر دیا ہے؛ مگر حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ بجائے خود شاعر اور بلا کے حاضر جواب نظر آتے ہیں۔ آپ نے طنز کا جواب غالب کی اسی غزل کے حسب ذیل شعر:؎

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
میں کہوں گا حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

سے دے کر ترکی بہ ترکی کا کام کیا ہے؛ مگر اہل علم وفضل کی طنزیہ باتیں بھی دائرۂ ادب میں لطافت وملاحت سے خالی نہیں۔ حضرتؒ بے تاب ہیں کہ سرسید کے عقائد کی اصلاح فرمائیں؛ لیکن ان کا دل یہ دیکھ کر بجھ گیا کہ سرسید نے غالب کا شعر لکھ کر افہام وتفہیم کی راہیں بند کر دی ہیں۔ چناں چہ حضرت نانوتویؒ کو سرسید سے

کہنا پڑا ہے کہ ''مجھ کواُن کے کمال دانش سے یہ امید تھی کہ میرے اس رنج کوثمرۂ محبت سمجھ کر تہ دل سے اپنے اقوال میں مجھ سے استفسار کریں گے''۔ نیز مولانا نانوتویؒ کا سرسید کے رویے سے یہ معلوم کر لینا کہ وہ کسی صورت بھی ان کی بات نہ مانیں گے،تو مولانا یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ'' کی اس تحریر کو دیکھ کر دل سرد ہو گیا کہ کوئی کچھ کہو، وہ اپنی وہی کہے جائیں گے۔ ان کے اندازِ تحریر سے یہ بات نمایاں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ایسا سمجھتے ہیں کہ کبھی غلط نہ کہیں گے''۔

انصاف یہ ہے کہ یہاں سرسید کی طرف سے فرار کی شکل نظر آتی ہے۔ دراں حالے کہ مولانا نانوتویؒ نے پیر جی صاحبؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اصرار پر یہ خط تحریر فرمایا تھا؛ ورنہ انہوں نے اپنی قلبی کیفیت کا ان الفاظ میں اظہار فرمادیا ہے: ''پیر جی صاحب! یہ گم نام کبھی کسی سے نہیں اُلجھتا اور اُلجھے بھی تو کیوں کر اُلجھے؟ وہ کون سی خوبی ہے، جس پر کمر باندھ کر لڑنے کو تیار ہو؟ ایسی کیا ضرورت ہے کہ اپنے عمدہ مشاغل چھوڑ کر اسی نفسانفسی میں پھنسوں''؟

لیکن ایک طرف سرسید کی ہم دردی اور دوسری طرف تبلیغی فریضے کی بجا آوری مولانا نانوتویؒ کو محسنِ قوم کی اصلاح کے لیے میدانِ تحریر میں لے آتی ہے۔ چناں چہ تحریر فرماتے ہیں: ''کہیں مدلل اور کہیں بے دلیل۔ ایک بار تو اپنے مافی الضمیر کو لکھ کر روانہ کرائیے۔ اگر سید صاحب نے انصاف فرمایا،تو پھر بھی دیکھا جائے گا؛ ورنہ اپنے حق میں جابر نہیں، جو مجبوری کا اندیشہ ہو''۔

یہ تو مولانا نانوتویؒ اور سرسید کی اخلاقی قدروں کا جائزہ تھا؛ لیکن میرا مطمح نظر حضرت قاسم العلوم علیہ الرحمہ کی خط نویسی اور انشاء پردازی پر تبصرہ کرنا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے مذکورہ مکتوب کا ادبی جائزہ:

حضرت نانوتویؒ کے مکتوب گرامی اور سرسید کے مذکورہ خط کی اخلاقی قدروں پر تبصرہ ہو چکا؛ لیکن جہاں تک ادبی تنقید کا تعلق ہے،مولانا کے مکتوب میں حسب ذیل عبارتی ٹکڑے ادبیت کا گہرا رنگ رکھتے ہیں اور خود اپنے حسن زبان کی طرف جاذب نظر آتے ہیں۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

> ''آپ ہی فرمائیں کہ ہم سے گرفتاروں کو اتنی رہائی کہاں کہ بنارس، غازی پور اُڑ جائیں، اور ہم سے بے چاروں کو اتنی رسائی کہاں کہ سید صاحب کے درِ دولت تک نوبت پہنچائیں،تسپر نقارخانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟ اجی حضرت !امیروں کے ذہن وفہم وعقل وادراک کے ہزاروں گواہ ہوتے ہیں۔ غریبوں کے فہم وفراست کا کہیں ایک بھی نہیں سنا۔ اس صورت میں

کیوں کر کہہ دیجیے کہ سید صاحب ایک غریب سے شیخ زادے کی مان جائیں''؟

مذکورہ عبارتوں کے ٹکرے جو مسجع و مقفّٰی بھی ہیں اور جن میں پوری بہار کے ساتھ روزمرہ اور محاورہ اپنا رنگ دکھارہا ہے۔ پوری کی پوری عبارت شگفتہ، سلیس، فصیح اور بلیغ ہے۔ تُسپر غالب کے شعر کا، غالب کی اسی غزل کے شعر اور حسب ذیل شعر: ؎

کب وہ سنتے ہیں کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

سے جواب بلاغت کے تمام مقتضیات کو پورا کررہا ہے۔

اس خط کے اخلاقی اور ادبی پہلوؤں پر تبصرے کے بعد اب میں حضرت قاسم العلومؒ کے ایک مکتوب کا تھوڑا سا ابتدائی حصہ جو انہوں نے مولوی جمال الدین شاہؒ کو سماع موتی کے سلسلے میں لکھا ہے، پیش کر کے مکتوبات پر تنقید کا سلسلہ ختم کرتا ہوں۔ حضرت نانوتویؒ مولانا جمال الدین صاحبؒ کو لکھتے ہیں:

مکتوب قاسمی بہ نام مولوی جمال الدین صاحب:

''مخدوم و مخدوم زادہ آفاق جناب مولوی سید محمد جمال الدین شاہ صاحب، سلمکم اللہ تعالیٰ

یہ آپ کا نیاز مند محمد قاسم اول سلام مسنون عرض کرتا ہے، اور پھر یہ عرض کرتا ہے: چند روز ہوئے آپ کا عنایت نامہ میری سرفرازی کا باعث ہوا، اس کا شکر یہ ادا کرتا ہوں، اور اس تقصیر تاخیر جواب کا عذر پیش کرتا ہوں، ان شاء اللہ تعالیٰ! تا مقدور فی الفور جواب نامہ عرض کرتا، جواب سوال بن پڑتا، یا نہ بن پڑتا، پر کیا کروں ان دنوں یہ خستہ جاں مبتلائے بلا تھا۔ داڑھ کے درد نے ایسا بے تاب و ناتواں کر رکھا تھا کہ کیا عرض کروں۔ اس کے بعد ناتوانی نے کچھ نہ ہونے دیا۔ وہ کچھ کم ہوئی تھی تو کچھ کچھ اعضا شکنی اور خفیف سا بخار دم ساز رہنے لگا۔ ہمت تو آج بھی جواب دیتی ہے؛ مگر کب تک یہ انتظار کیجیے کہ طاقت آئے اور نقاہت جائے، اور میں جواب لکھوں؟ اپنی معلومات ہی کتنی ہے، جس کے واسطے اتنا انتظار کیجیے اور آپ سے انتظار کرائیے، جو کچھ ہے، ابھی عرض کیے دیتا ہوں۔ سماع اموات کے قصے میں اوّل تو یہ معروض ہے کہ یہ امر قدیم سے مختلف فیہ ہے، دوسرے ضروریات دینی اور عقائد ضروریہ میں سے نہیں۔ اس کی تنقیح قرار واقعی تو بعد مرگ ہی معلوم ہوگی۔ اگر بعد مرگ ہم نے اوروں کا سلام و پیام سن لیا، تو سماع نہیں''[1]۔

---

(۱) جمال قاسمی، ص:۸۔

اس خط پر ادبی حیثیت سے کوئی تنقید میرا مقصد نہیں؛ بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ قاسم العلوم کے اس مکتوب میں آداب والقاب کا طرز وہی پرانا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا اپنا اسم گرامی بعض خطوط میں کتابی طرز پر آداب والقاب کے بعد بھی تحریر فرماتے تھے، اور کتنے ایک خطوط میں خاتمہ پر نام تحریر فرماتے تھے۔ خط کے آخر میں دست خطوں کا طرز جیسا کہ جمال قاسمی کے پہلے مکتوب وحدۃ الوجود کے آخر میں اپنا نام لکھ کر حضرت نے تاریخ اس طرز میں تحریر فرمائی ہے: ''سوم ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ نبوی، روز چہار شنبہ''۔

میرا مقصد حضرت قاسم العلومؒ کی خط نویسی پر سیر حاصل تبصرے سے یہ ہے کہ فصیح خطوط جن کو ادب کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں حضرت مولانا کے خطوط کی قدریں ادب کا بہترین سرمایہ ہیں، اور یہ کہ مولانا کے خطوط فصاحت، سلامت، سادگی، بے ساختگی، طرزِ تخاطب میں بات کے سے انداز کی سی خوبیاں رکھتے ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کی دوسری تحریریں:

اب تک حضرت نانوتویؒ کے خطوط سے متعلق تحریروں پر تبصرہ کیا گیا تھا؛ لیکن دوسرا حصہ مولانا کی ان اُردو تحریرات کا ہے، جو تصنیفات میں پھیلا ہوا ہے۔ جہاں تک راقم الحروف کی ریسرچ کا تعلق ہے، اس میں یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ حضرت قاسم العلوم کو اُردو نثر اور نظم پر پوری قدرت حاصل ہے؛ البتہ تصنیفات کی نثر مکاتیب سے جدا انداز رکھتی ہے، اور اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ چوں کہ امام المتکلمین حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے علوم وفنون بہت غامض اور عمیق ہیں؛ اس لیے منطق اور فلسفے کی اصطلاحات نے عبارتوں کے معانی سمجھنے میں دشواریوں کے باعث تحریروں کو مشکل اور ادق بنادیا ہے؛ لیکن جہاں مولانا کی طبیعت پر لکھتے لکھتے امنگ آئی ہے، وہاں نثر نگاری میں سلاست وفصاحت کے دریا بہادیے ہیں، اور قلم سے آب حیات کے قطرے ٹپکائے ہیں۔ نمونے کے طور پر ''آب حیات'' کی تمہید کی چند سطریں مولانا کی مایۂ ناز تصنیف سے پیش کرتا ہوں، اس میں مولانا آبِ حیات کی کیفیت تصنیف اور سفر حج کے لیے روانگی اور بمبئی پہنچ کر تصنیف کی تکمیل اور حضرت مرشد حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی خدمت میں پیش کش کا ذکر فرما رہے ہیں۔ واضح ہو کہ امام المتکلمین نے آبِ حیات بمبئی کے پنج روزہ قیام میں تحریر فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اوراقِ مسودہ (آبِ حیات) کا پشتارہ باندھ کر جہاز پر چڑھا، اور محض بہ امداد خداوندی باوجود گم راہی اور نامہ سیاہی جس کی وجہ سے اپنی رسائی تو درکنار، ہمراہیوں کی گم گشتگی کا بھی

اندیشہ تھا، دریا پار ہوکر جدہ پہنچا، اور وہاں سے بہ سواری شتر دو روز میں دونوں قبلوں کی زیارت سے مشرف ہوا۔ بیت اللہ، زادھا اللہ شرفاً و عزۃً الی یوم القیامہ، کا طواف میسر آیا اور حضرت پیر و مرشد ادام اللہ فیوضہ کی قدم بوسی سے رتبۂ عالی پایا۔ اعنی بہ زیارت مطلع انوار سبحانی، منبع اسرار صمدانی، مورد افضال ذی الجلال والاکرام، مخدوم و مطاع خاص و عام، سرحلقۂ مخلصاں، سراپا اخلاص، سرلشکر صدیقاں، بہ اختصاص رونقِ شریعت، زیب طریقت، ذریعۂ نجات، وسیلۂ سعادات، دستاویز مغفرتِ نیاز منداں، بہانۂ واگذاشت مست منداں، ہادیٔ گم راہاں، مقتدائے دین پناہاں، زبدۂ زماں، عمدۂ دوراں، سیدنا و مرشدنا و مولانا الحاج ''امداداللہ''، لازال کاسمہ امداداً من اللہ للمسلمین واہل اللہ کی زیارت سے جو ہنگامۂ رست خیز مثال غدر ہندوستان کے بعد وطن قدیمی تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کو چھوڑ کر بہ حکم اشارات باطنی بلد اللہ الامین مکۂ معظمہ، زادہا اللہ شرفاً وعزۃً، میں مقیم ہیں، بہرہ اندوز شرف وعزت ہوا۔ بہ وجہ تہی دستی دین و دنیا اور کچھ پیش نہ کرسکا، اوراق سیاہ مسودہ مذکورہ کو پیش کر کے رسم پیش کش بجا لایا''(۱)۔

مولانا کی یہ عبارت جس کی چار پہلی سطریں سادہ اور غیر مقفیٰ ہیں، حسب طرز ہیں؛ لیکن جہاں قاسم العلوم کی زبانِ قلم پر آپ کے رہبر طریقت اور مرشد معرفت کا ذکر آیا، تو محبت کی بجلی کوندگئی اور مولانا مقفیٰ عبارت اور مسجع الفاظ نگینوں کی طرح عبارت میں جڑتے چلے گئے۔ اس عبارت سے مولانا کی مقفیٰ نویسی پر قدرت اور بے تکلف مشکل الفاظ اور ترکیب جمل کی ندرت کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے، اور اس حقیقت کو باور کرنا پڑتا ہے کہ اگر مولانا فارسی کی مشہور کتاب جو کہ ''مقامات بدیعی'' اور ''مقامات حریری'' کی طرز پر لکھی ہوئی ہے، یعنی ''مقامات حمیدی'' اگر چاہتے، تو چند دنوں میں لکھ کر داد قافیہ نویسی لے سکتے تھے، اور اُردو کی مقفیٰ کتاب ''فسانۂ عجائب'' کا جواب اسی میں لکھ سکتے تھے۔

آیئے! اب میں آپ کو اسی ''آب حیات'' کے دیباچے کی سیر کراتا ہوا ایک ایسے قطعۂ چمن کی طرف لیے چلتا ہوں، جس کے ادبی پھولوں کو آبِ حیات کے چھینٹے چھڑک چھڑک کر تازہ و شاداب کیا گیا ہے۔ حضرت مولانا دیباچۂ آبِ حیات میں آگے چل کر اس مقام پر جہاں پیر و مرشد نے آبِ حیات کے مضامین کی داد دی اور تحسین فرمائی ہے، لکھتے ہیں:

''قاسم ناداں کی تحقیق اور تنقیح، ایسی مستحسن اور صحیح:

زبان گنگ وچنیں نغمۂ خوش آیندہ

(۱) آب حیات، ص: ۳۰۲۔

میں کہاں اور یہ مضامین عالیہ کہاں؟ یہ سب اس شمس العارفین کی نور افشانی ہے۔ یہاں میں بھی مثل زبان و دست وقلم، واسطۂ ظہور مضامینِ مکنونۂ دل، عرش منزل ہوں؛ ورنہ اپنی ہیچ میدانی سے جس پر بے سروسامانی، دوسرے پریشانی؛ دوشاہد عادل گواہ ہوں، انکارنہیں کیا جاتا۔ بے سر وسامانی کا حال پوچھیے، تو اپنے گھر میں نہ کوئی عالم جو بہ وجہ قدر دانی علم کی طرف لگائے، نہ اپنے دل میں شوق جو تحصیل علم میں مزہ آئے، اوراس کام سے دل نہ گھبرائے۔ نہ گھر میں کوئی کتاب جو یہ بات ہو کہ جب دل چاہا اٹھایا دیکھ لیا، نہ روپیہ پیسے کا حساب کہ حسب دل خواہ ضروریات تحصیل میں حصہ لیا اور صرف کیا۔

پریشانی کی کیفیت پوچھیے تو کچھ نہ پوچھیے، ایک دل ہزار مقصود، پھر ہر مقصود کے لیے ہزار غم موجود۔ ایک بات ہوتو کچھ بات بھی ہے، پھر کس کس کو حاصل کیجیے، جو دل کو قرار آئے اور دل کی پریشانی جائے؟ ساری تمنائیں برآئیں، تو ہم میں اور خدا میں کیا فرق رہ جائے؟ اور سب آرزوؤں سے دست بردار ہو جیے اور خدا کے ہو رہیے، تو ایسی عقل اور ایسی ہمت کہاں سے آئے کہ بہ جز نام خدا اور کچھ نہ بھائے۔ یہ نصیب ہوتو پھر کیا بات ہے۔ نعمتِ ولایت ہم سے نابکاروں کو ہاتھ آجائے''(۱)۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ بالا عبارت ان کی تحریر کے ایک نئے انداز سے روشناس کرتی ہے۔ دل پر جذبۂ انکساری، عاجزی، بے سروسامانی، تمناؤں کا ہجوم، پریشانی کی کیفیت، خدا کے ہو رہنے کا شوق؛ مگر عقل وہمت کی کوتاہی پر منکسر المزاجی، کتابوں کا فقدان، دولت سے بے نیازی، ان سب ہی خیالات کے ہجوم میں بہ ظاہر حجۃ الاسلام گھرے نظر آتے ہیں؛ مگر سب مشکلات سے بہ باطن بے پروا اور عہدہ برآ معلوم ہوتے ہیں۔ ان تمام کیفیات قلبی کو حضرت قاسم العلومؒ نے جس مختصر عبارت، فصیح وسلیس الفاظ، دل چسپ اور پرشکوہ جملوں میں ادا کیا ہے، وہ بجائے خود نہ صرف قابلِ تحسین؛ بلکہ لائق حیرت ہے کہ ایک عہدِ قدیم کی یادگار، بوریہ نشین، زاہد بے ریا، اور یکتائے روزگار، صوفی و عالم اس دور میں جب کہ اردو زیادہ ترقی یافتہ زبان نہ سمجھی جاتی تھی، ایسی عبارت آرائی پر پوری دست رس رکھتا ہے۔

انکساری:

حضرت مولانا نانوتویؒ کے خطوط اور تصنیفات نیز سایلین کے سوالات کے جوابات جا بجا انکساری، بے سروسامانی اور کتابوں کے پاس نہ ہونے اور اپنی علمی بے مایگی کا ذکر ہے۔ غالباً کوئی دور حاضر کے

(۱) دیباچۂ آبِ حیات۔

دل دادہ اس انکساری کو تصنع پر محمول کریں؛ لیکن یہ حقیقت حقیقت بن کر دل میں آتی ہے کہ حضرت قاسم العلوم علم کا سمندر ہوتے ہوئے پھر بھی واقعی طور پر اپنے آپ کو علم سے تہی دست خیال فرماتے تھے، اور یہ بھی صحیح بات ہے کہ ''العلم حجاب الاکبر'' کے مطابق واقعیت تھی کہ علوم کے سمندر سینے میں بہتے ہوں، اور اس کے باوجود علم سے خالی دامن اپنے آپ کو تصور کرتے ہوں۔ یہ عجب بات تھی کہ حضرت مولانا کی بعینہ مثال اس چشمے کی تھی کہ جس سے پانی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہو، اور جتنا پانی نکل رہا ہو، اتنا ہی اندر سے جوش کے ساتھ ابل کر آتا ہو۔ یہی حال مولانا کے علوم کا تھا۔ ان کا سینہ کتابوں کی لائبریری اور ان کا دل علوم کا بحر بے کراں اور ان کا دماغ خلاق مضامین و معانی تھا۔ پوچھنے کی دیر ہوتی تھی کہ معقولات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے منقولات کے جوابات سامنے دست بستہ حاضر تھے۔ مولانا کو اپنے قلم پر اختیار نہ ہونے کا خود اعتراف ہے۔

غرض کہ مولانا کا علم وہبی تھا، اس پر انکساری کا یہ عالم۔ جس زمانے میں حضرت مولانا اپنے استاد حدیث مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ کے مطبع میں ملازم تھے تو حضرت شیخ بخاری شریف کا حاشیہ تحریر فرما رہے تھے۔ کثرت مشاغل کے باعث چھ آخری پاروں کی شرح یا حاشیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو لکھنے کے لیے ارشاد فرمایا، جیسا کہ سوانح قاسمی میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب علیہ الرحمہ نے ذکر فرمایا ہے۔ اس وقت حضرت بانیٔ دار العلوم دیوبن کی عمر تیس سال کی ہوگی؛ کیوں کہ انیس سال کی عمر میں تحصیل علوم سے فراغت کے فوراً بعد حضرت مطبع سے وابستہ ہو گئے تھے۔ لوگوں نے مولانا محدث سہارن پوریؒ سے کہا کہ: آپ نے ایک نو آموز آدمی کو بخاری شریف کے حاشیے کا کام سپرد فرما دیا ہے؛ لیکن حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ نے لوگوں سے فرمایا کہ: ''میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بغیر سوچے سمجھے ایسا عظیم الشان کام کسی نا اہل کے سپرد کر دیتا''۔ چناں چہ حضرت سہارن پوریؒ نے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا لکھا ہوا حاشیہ؛ بلکہ شرح لوگوں کو دکھائی اور بہت مسرت کا اظہار فرمایا۔

اس امر سے آپ کو واضح ہو جائے گا کہ حضرت قاسم العلومؒ کی علمی رفعتوں کا مقام کیا تھا کہ کم عمری میں بخاری کے آخری ان پاروں کی شرح بالکل اپنے شیخ کے انداز میں تحریر فرمائی، جس میں اہم مسائل ہیں اور جن میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اکثر مذہب حنفیہ پر طنز کیا ہے؛ لیکن اللہ رے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی انکساری کہ اپنی علمی کم مائیگی کا ہر جگہ اظہار ہے۔

ایک خواب:

گزشتہ دو سال سے راقم الحروف اپنے حضرات کی کتابوں کے مطالعے میں مصروف تھا، اور بالخصوص

حضرت قاسم العلوم والخیراتؒ کی کتابوں اور تصنیفات کو بہ امعانِ نظر پڑھ رہا تھا کہ سوانح قاسمی میں حضرت حجۃ الاسلامؒ کے حواشیٔ بخاری کا ذکر پڑھا، دل میں ان حواشی کی جستجو اور شوق پیدا ہوا، چناں چہ احتیاط کے ساتھ مقدمۂ بخاری از مولانا احمد علی صاحبؒ پڑھا۔ خاتمے پر بھی گہری نظر ڈالی، سب کچھ ملا؛ لیکن حضرت حجۃ الاسلام کا نام نہ ملنا تھا نہ ملا۔

پھر چوبیسویں پارے سے تیسویں پارے تک ہر ایک پارے کی ابتدا اور انتہا پر نظر ڈالی اور رات کے گیارہ بجے تک بخاری شریف کی ورق گردانی کرتا رہا اور بالآخر اسی فکر میں سو گیا۔ یہ ۲۴/۲۵/ جنوری ۱۹۵۳ء/ (۹/ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۲ھ) کی درمیانی شب تھی۔ رات کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ ایک بستی میں حضرت مولانا نانوتوی علیہ الرحمہ تشریف لائے ہیں۔ مجھے کسی نے اطلاع دی اور میں انتہائی مسرت میں دوڑا ہوا اس مقام پر پہنچا، جہاں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ فروکش تھے۔ برابر میں حضرت قطب الارشاد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہیں۔ میں نے جاتے ہی دونوں حضرات سے مصافحہ کیا اور حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کی دست بوسی کی۔ حضرت ایک کالی کملی اوڑھے ہوئے تھے اور سر پر پگڑی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! کیا بخاری شریف کے آخری چھ پاروں کا حاشیہ جناب نے تحریر فرمایا ہے؟ ارشاد فرمایا: کہ بھائی کیا ہے؟ یعنی مناسب الفاظ میں ٹالنے والے الفاظ ارشاد فرمائے۔ جب میرا مدعا پورا ہوتا ہوا نظر نہ آیا، تو میں نے عرض کیا حضرت! یہ تو بتائے ہی بنے گی۔ اس پر مولانا نے صاف الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ: ہاں! میں نے ہی لکھے ہیں۔ صبح کو جب آنکھ کھلی، تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ چناں چہ میں نے یہ خواب اپنی یادداشت میں نوٹ کر لیا۔

اب جب کہ خواب کا ذکر آ گیا، تو دوسرا خواب بھی ذکر کر دوں۔ ۱۰/۱۱/ فروری ۱۹۵۳ء/ (۲۶/ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۲ھ) کی درمیانی شب میں نے حضرت مولانا کو دوسری مرتبہ خواب میں دیکھا۔ آپ ایک لکڑی کے تابوت میں تشریف فرما ہیں اور اس کے نیچے پانی کی ایک نہر بہ رہی ہے۔ حضرت اس میں اٹھ کر بیٹھ گئے ہیں۔ میں قریب پہنچا اور بالکل سر کے نزدیک داہنے بازو کے پاس ہوں۔ اتنے میں اس صندوق سے نکل کر حضرت ایک مکان کے کمرے میں فروکش ہو گئے۔ اس مکان کے دو کمرے تھے، جس کمرے میں حضرت قاسم العلومؒ فروکش ہوئے، اس میں استاذی مولانا محمد طیب صاحب بھی ہیں اور میں بھی۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد میں دوسرے کمرے میں گیا، تو حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو وہاں آرام کرتے پایا۔ آپ نے مجھے بیٹھنے کے لیے فرمایا۔ چناں چہ میں حضرت کی خدمت میں بیٹھ گیا۔ خواب اسی حالت میں

ختم ہو گیا۔

تو بات کہاں سے کہاں جا نکلی۔ میں نے حضرت حجۃ الاسلامؒ کی آبِ حیات کے دیباچے کی عبارت پیش کی تھی، اور اس میں آں مخدوم نے اپنے ذاتی حالات جس انداز میں پیش کیے، اسی میں اپنی بے سروسامانی اور کتابوں کے پاس نہ ہونے کا ذکر تھا؛ لیکن میں یہ حقیقت پیش کررہا تھا کہ حضرت باوجود اس کے کہ علوم کے بحرِ بےکراں تھے، انتہادرجے کے منکسر المزاج واقع ہوئے تھے:

الناس يحتاج أهل العلم قاطبة
وأكثر الناس يستغني عن الدول
كم من غني جميع الناس بجهلة
وعالم صيته في السهل والجبل

''تمام انسان عالموں کے محتاج ہیں، حال آں کہ اکثر لوگ دولتوں سے بے نیاز ہیں، اوران کو دولت والوں کی پروا بھی نہیں ہوتی۔ کتنے ایک مال دار ہیں کہ انہیں کوئی جانتا بھی نہیں، اور کتنے عالم ہیں کہ پہاڑوں اور میدانوں میں ان کی شہرت پھیل چکی ہے''۔

میں اپنے مرکز سے دور جارہا ہوں، حال آں کہ مجھے حضرت مولانا کی تحریروں کے چند اور ٹکڑے پیش کرنے تھے۔

حسب ذیل عبارت ''تقریر دل پذیر'' کی لکھتا ہوں، جو حضرت مولانا کی مشہور اور مایۂ ناز تصنیف ہے، اور علم الکلام کا بصیرت افروز سرمایہ ہے۔ اس تصنیف کو محتاط اور غائر نظر سے پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے اندر قدرت نے ایک موجودہ دور کے لیے علم کلام کی اجتہادی قوت عطا فرمائی تھی، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر مولانا کے امام المتکلمین ہونے میں شک نہیں رہتا۔ مولانا عقل کی حقیقت اور اس کے مراتب بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ایسے ہی ہماری تمہاری عقل سے بھلائی اور برائی کی کمی بیشی وہیں معلوم ہوتی ہے، جہاں بہت فرق ہو، تھوڑے تھوڑے فرق اور ان کی مقدار اس سے ہرگز دریافت نہیں ہوسکتی۔ یہ بات بہ جز علم خداوندی کے اور کسی کا کام نہیں۔ عقل بھی اسی درگاہ کی دریوزہ گر ہے؛ کیوں کہ عقل کی حقیقت بعد غور کے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ دفتر علم الٰہی کا ایک محافظ دفتر ہے؛ کیوں کہ کوئی بات ایسی نہیں کہ جس میں عقل سے مشورہ نہ کرلیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے پاس ہر بات کی کچھ نہ کچھ خبر ہے؛ بلکہ سب خبر ہے۔ بہر حال! بعد غور کے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ دفتر علم

الٰہی کا ایک محافظ دفتر ہے؛ بلکہ اس دفتر کے حروف اور نقوش دریافت کرنے کے لیے نظر ہے، جیسے دفتر مبصرات، یعنی دیکھنے کی چیزوں کے لیے چشم ظاہری عنایت ہوئی ہے، ایسے ہی اس دفتر پنہانی کی سیر کے لیے عقل جو ایک چشم پنہانی ہے، مرحمت ہوئی ہے، اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جس آنکھ سے چھوٹی بڑی سب چیز کو مبصرات میں سے دیکھ سکتے ہیں، ایسے ہی عقل سے بھی اس دفتر کے تمام حروف اور نقوش کو دریافت کر سکتے ہیں، یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جس میں عقل سے مشورہ نہ کر سکیں، اور جیسے سیاہ و سفید کا فرق، مثلاً آنکھ سے معلوم ہو سکتا ہے، ایسے ہی نیک و بد کا فرق دیدۂ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے؛ لیکن جیسے آنکھوں آنکھوں میں بھی فرق ہے، سب سے یک ساں فرق معلوم نہیں ہوتا؛ بلکہ بسا اوقات الٹا معلوم ہونے لگتا ہے۔ احول یعنی بھینگے کو ایک کے دو معلوم ہوتے ہیں اور یرقان والے کو سفید چیز بھی زرد نظر آتی ہے۔ ایسے ہی ہر عقل سے نیک و بد کا فرق صحیح نہیں معلوم ہو سکتا، اور جیسے کم نظروں کو بعضے رنگ مثلاً ملکوئی، عنابی، سیاہ سب ایک ہی نظر آتے ہیں، ایسے ہی کم عقلوں کو بہت سے اُمور نیک و بد سب یک ساں معلوم ہوتے ہیں''(۱)۔

اس عبارت سے رئیس المتکلمین نے عقل کی تعریف اور اس کے درجات کا ذکر فرمایا ہے۔ نثر میں گو کہ علمی مسئلہ مذکور ہے؛ مگر عبارت میں سادگی موجود ہے؛ لیکن چستی مفقود ہے۔ جملوں کی باہم جکڑ بندی اور گرفت میں ڈھیلا پن ہے۔ خطوط کی نثروں کی سی باہمی ترتیب و تسلسل یہاں نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ بہ ظاہر اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتی کہ حجۃ الاسلام مضامین کی آمد اور ہجوم معانی میں ایسے گھر جاتے تھے کہ الفاظ کی طرف سے توجہ قطعاً ہٹ جاتی تھی۔ ان کی تصانیف اور خطوط کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوالات کے جوابات اور تحقیقات کے لیے حجۃ الاسلام کے پاس ہر چیز نقد تھی۔ ان کو تصنیفات کے لیے کتابوں کے کھنگالنے اور تحقیقات کی ضرورت نہ تھی، ہر چیز کا دفتر سینے میں بند تھا۔ اسی مضامین کی آمد اور اژدہام کے متعلق سالک و مجذوب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ قاسم العلوم کی سوانح میں لکھتے ہیں:

''آمد معانی اور مضامین کی (مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو) ایسی تھی، یوں فرماتے تھے کہ بعض بار حیران ہو جاتا ہوں کہ کیا کیا بیان کروں''۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ ''حجۃ الاسلام'' مصنفہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے متعلق دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) تقریر دل پذیر، مطبع قاسمی، ص: ۵-۴۷۔

(۲) سوانح قاسمی، ص: ۱۶۔

''سیدی و مولائی حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب، متعنا اللہ بعلومہ و معارفہ نے اہل اسلام کی طلب پر میلۂ مذکور کی شرکت کا ارادہ ایسے وقت مصمم فرمایا کہ: تاریخ مباحثہ، یعنی ۷رمئی سر پر آ گئی۔ چوں کہ وقت بہت تنگ تھا؛ اس لیے نہایت عجلت کے ساتھ غالبًا ایک روز کامل اور کسی قدر شب میں بیٹھ کر ایک تحریر جامع تحریر فرمائی۔ جلسۂ مذکورہ میں تو مضامین مندرجہ تحریر مذکورہ کو زبانی ہی بیان فرمایا''(۱)۔

اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ''حجۃ الاسلام'' حضرت مولانا نے ایک دن اور رات کے بعض حصے میں نہایت عجلت میں تحریر فرمائی تھی؛ اس لیے مولانا عبارت کا زیادہ اہتمام نہ فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تصنیفات کی اردو زبان مکتوبات کی زبان سے مختلف نظر آتی ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مکاتیب کی زبان میں تصانیف کی زبان سے تفاوت اور فرق بھی ہوتا ہے۔ چناں چہ غالب کے خطوط اور اس کی دوسری انشا نگاری میں یقیناً فرق ہے؛ بلکہ قریب قریب یہ حال تمام مصنفین کی تصانیف اور ان کے مکتوبات میں صاف نظر آتا ہے۔ چناں چہ شبلی، اکبرالہ آبادی، امیر مینائی، غالب، عبدالماجد دریابادی، سرسید کے خطوط اور تصانیف میں آپ یہ فرق واضح طور پر پائیں گے۔

حضرت مولانا کی ایک اردو عبارت اور ملاحظہ فرمایئے، جس میں امتیوں کے سلام کا آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پہنچنے اور آپ کا سلام دینے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''حاصل معنی حدیث شریف کے یہ ہوں گے کہ جب کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجتا ہے، تو خداوند کریم آپ کی روح پرفتوح کو اس حالت استغراق فی ذات اللہ تعالیٰ وتجلیات اللہ سے جو بہ وجہ محبوبیت ومحبیت تامہ آپ کو حاصل رہتی ہے، متوجہ فرما دیتا ہے، یعنی مبداء انکشاف نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو انبساط الی اللہ حاصل تھا مبدل بہ انقباض ہو جاتا ہے، اور اس وجہ سے ارتداد علی النفس حاصل ہوتا ہے، اور اپنی ذات وصفات اور کیفیات اور واقعات متعلقہ ذات وصفات سے اطلاع حاصل ہو جاتی ہے۔ سو چوں کہ سلام امتیاں بھی من جملہ وقائع متعلقہ ذات خود ہیں؛ اس لیے اس سے مطلع ہو کر بہ وجہ حسن اخلاق ذاتی جواب سے مشرف فرماتے ہیں۔ اس صورت میں اثبات حیات اور دفع مظنۂ ممات بہ معنی انقطاع تعلق حیات کے لیے جواب میں اور تکلفات کی حاجت نہ رہے گی۔ قطع نظر تصدیق وجدانی کے جو واقفان حقیقت مبداء انکشاف کو حاصل ہے۔ لفظ ردّ جو خود حدیث میں موجود ہے، اس پر شاہد ہے''(۲)۔

(۱) حجۃ الاسلام قاسمی، ص:۲۔
(۲) آبِ حیات، ص:۲۸-۲۲۷۔

یہ عبارت سراپا اصطلاحات سے لبریز ہے۔ تصوف اور منطق کے متعین الفاظ، مضامین کی وسعت اور الفاظ کی قلت نے عبارت کو مغلق بنا دیا ہے، اور دراں حالے کہ مضمون کے پرے کے پرے مولانا کے سامنے سربہ سجود ہیں، اور ان کو باندھنے کے لیے اس کیفیت قلبی کے ساتھ جو حضرت قاسم العلومؒ پر طاری ہے اور وہ والہانہ انداز جو رگ رگ میں نشۂ معرفت کا سمایا ہوا ہے، جو الفاظ سامنے آئے، انہیں میں مضمون کو سمو دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابوداود شرف کی اس حدیث یعنی:

”مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُسَلِّمُ عَلَيَّ؛ إِلَّا رَدَّ اللّٰهُ عَلَىَّ رُوْحِي حَتّٰى أُسَلِّمَ عَلَيْهِ“. أو كما قال عليه الصلاة و السلام.

”جو مسلمان بھی مجھ پر سلام بھیجتا ہے، تو اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح واپس کر دیتے ہیں، تا آں کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں“۔

کی توجیہ جس نور بصیرت سے حضرت رئیس الاصفیاء نے فرمائی ہے، وہ خاکم بدہن امام رازی رحمہ اللہ کو بھی نہ سوجھی ہوگی۔

حضرت قاسم العلومؒ کے دل پر یہ مضامین کا توارد آپ کی ریاضت جلائے قلب، صفائے روح اور انکسار نفس کا نتیجہ ہے۔ یہاں وہ روح نہیں جو بوعلی سینا یا ابن مسکویہ کے اندر کام کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ استدلالی اور منطقیانہ جواب میں وہ سکون نہیں ملتا، جو آئینۂ قلب پُر تجلیات سے نکلے ہوئے انوار کی شعاعوں میں ملتا ہے۔ بہ قول مولانا رومؒ ؎

فہم خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می نہ گیرد فضل شاہ
ہر کجا پستی است آب آں جا رود ہر کجا مشکل جواب آں جا رود
ہر کجا دردے دوا آں جا رود ہر کجا رنجے شفا آں جا رود

بہر حال! حضرت مولانا نے جس عالمانہ انداز اور مختصر عبارت میں اس حدیث مذکور کی توجیہ فرمائی، وہ یہ ہے کہ رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا مقام عشق اور مقام محویت وفنا و استغراق اس درجے پر ہے کہ روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سوائے محویت احدیت کے اور سب باتوں سے بے خودی ہوتی ہے، اور کسی چیز کا ہوش نہیں ہوتا۔ اسی کیفیت کو صوفیا کے یہاں ”انبساط“ کہا جاتا ہے، اور جب امتی سلام پیش کرتے ہیں، تو از رہِ رحمت و کرم اللہ تعالیٰ آپ کو ہوش میں لا کر سلام دلانے کی کیفیت اور ہوش دے دیتے ہیں، اور اسی کیفیت کو صوفیا کے یہاں قبض یا انقباض کہا جاتا ہے۔ یہ غیبی مضامین دراصل حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے اس استغراق کا نتیجہ ہیں، جس میں وہ اکثر بے ہوش رہتے تھے۔ اس مذکورہ عبارت کے لیے لفظوں کی قطع و برید،

اُردو زبان کی تہذیب اور جملوں کی ترکیب کا مولانا کو ہوش کہاں رہتا تھا، اور یہی وہ مضامین عالیہ اور نوادر ہیں، جن کو دیکھ کر اور پڑھ کر حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ کے ملفوظات، حصۂ چہارم ملفوظ نمبر ۱۷۱، ص: ۱۵۷ پر یہ حقیقت الفاظ کا جامہ پہن کر بہ روئے کار آئی ہے، فرماتے ہیں:

''ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ: اب رازی غزالی نہیں پیدا ہوتے۔ میں نے کہا کہ: تمہارا خیال غلط ہے، بفضلہٖ تعالیٰ ان سے بڑھ کر اس وقت موجود ہیں۔ ان حضرات کی تحقیقات دیکھ لی جائیں اور اس وقت کے بعض محققین کی بھی تحقیقات دیکھ لی جائیں، معلوم ہو جائے گا کہ اب بھی رازی اور غزالی؛ بلکہ ان سے اکمل موجود ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ زمانہ غلبۂ خیر کا تھا، اب غلبۂ شر کا ہے؛ مگر یہ نہیں کہ اس وقت علوم اور کمالات کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ سو بفضلہٖ تعالیٰ رازی اور غزالی اب بھی موجود ہیں''۔

بہر حال! یہی وہ رنگ قاسمی تھا، جس کی تفسیر علامہ عثمانیؒ نے اپنے قلم وزبان سے کی اور جن کو قاسم ثانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور یہی اس خواب کی تعبیر ہے جو اوپر گزرا کہ ایک کمرے میں حضرت مولانا نانوتویؒ اور دوسرے میں حضرت عثمانیؒ تھے۔

بہر حال! مضامین عالیہ بیان کرتے وقت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی اردو زبان میں علمی اصطلاحات، کلامی مسائل صوفیا کے علوم کے باعث اشکال اور عبارت میں اغلاق پیدا ہوا۔ دراں حالے کہ حضرت کی اکثر تصانیف بہت عجلت میں لکھی گئی ہیں؛ ورنہ مولانا سلیس، شگفتہ اور مسلسل اردو لکھنے پر بہ خوبی قادر تھے اور کہا جا سکتا ہے کہ مکتوبات کے رنگ میں اپنے دیگر معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے تھے۔

علمی مسائل میں ادب کا رنگ:

اوپر آبِ حیات کی عبارت میں جس علمی مسئلے کو پیش کیا گیا ہے، اس میں مولانا کی عجلت کو بہت کچھ دخل ہے۔ چناں چہ اِس امر کی دلیل میں کہ حضرت قاسم العلومؒ کے علمی مسائل میں بھی عبارت کی چستی و ربط اور اصطلاحی الفاظ کے علاوہ تمام عبارت میں تسلسل موجود ہے۔ حضرت قاسم العلومؒ کی معرکۃ الآراء تصنیف ''تحذیر الناس'' کی حسبِ ذیل اُردو نثر اہل ذوق کے غور وفکر کے لیے پیش کرتا ہوں۔ قاسم العلوم ختم نبوت کے عقیدے کو پیش فرما رہے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ موصوف بالعرض کا قصہ موصوف بالذات پر ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے موصوف بالعرض کا وصف موصوف بالذات سے مکتسب ہوتا ہے۔ موصوف بالذات کا

وصف جس کا ذاتی ہونا اور غیر مکتسب من الغیر ہونا لفظ بالذات ہی سے مفہوم ہوتا ہے، کسی غیر سے مکتسب اور مستعار نہیں ہوتا۔ مثال درکار ہو تو لیجیے: زمین و کہسار اور در و دیوار کا نور اگر آفتاب کا فیض ہے، تو آفتاب کا نور کسی اور کا فیض نہیں، اور ہماری غرض وصف ذاتی ہونے سے اتنی ہی تھی۔ بہ ایں ہمہ اگر یہ وصف آفتاب کا ذاتی نہیں تو جس کا تم کہو وہی موصوف بالذات ہوگا اور اس کا نور ذاتی ہوگا، کسی اور سے مکتسب اور کسی اور کا فیض نہ ہوگا۔

الغرض یہ بات بدیہی ہے کہ موصوف بالذات سے آگے سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ چناں چہ خدا کے لیے کسی اور خدا کے نہ ہونے کی وجہ اگر ہے تو یہی، یعنی ممکنات کا وجود اور کمالات وجود سب عرضی بہ معنی بالعرض ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ کبھی موجود، کبھی معدوم، کبھی صاحب کمال اور کبھی بے کمال رہتے ہیں۔ اگر یہ امور مذکورہ ممکنات کے حق میں ذاتی ہوتے، تو یہ اتصال اور انفصال نہ ہوا کرتا۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کو تصور فرمائیے، یعنی آپ موصوف بہ وصف نبوت بالذات ہیں اور آپ کے سوا اور نبی موصوف بہ وصف نبوت بالعرض اوروں کی نبوت آپ کا فیض ہے، پر آپ کی نبوت کسی اور کا فیض نہیں۔ آپ پر سلسلۂ نبوت مختتم ہو جاتا ہے۔ غرض جیسے آپ نبی اللہ ہیں، ویسے نبی الانبیاء بھی ہیں، اور یہی وجہ ہوئی کہ بہ شہادت:

"وَاِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيِّيْنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَّحِكْمَةٍ، ثُمَّ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ".

"اور انبیائے کرام علیہ وعلیہم السلام سے آپ پر ایمان لانے اور آپ کے اتباع اور اقتدا کا عہد لیا گیا۔ اُدھر آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اگر موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو میرا ہی اتباع کرتے"[1]۔

ختم نبوت کے اس مضمون پر حضرت قاسم العلومؒ کی اُردو نثر کے تبصرے کو میں بھی ختم کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت مولانا نانوتویؒ بہ قول حکیم الامت تھانویؒ: "علم لدنی سے بہرہ یاب تھے"۔ ان کے دل و دماغ قدرتی علوم کے ایسے چشمے تھے، جن سے برابر مختلف قسم کے علوم و فنون کے سوت اُبلتے رہتے تھے۔ علوم اسلامی اور درس نظامی کے علاوہ دیگر فنون مثلاً: ریاضی، اقلیدس، جرثقیل وغیرہ میں مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ یدطولیٰ رکھتے تھے۔ چناں چہ علم ادب اور فنون شاعری سے بھی آپ کو خاص نسبت تھی۔

مولانا کی اُردو نثر پر جیسا کہ مجلّہ دارالعلوم میں میرے شائع شدہ مقالے کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہو سکے گا، ایک سیر حاصل تبصرہ کیا جا چکا ہے، جس سے ان کی ہر قسم کی سادہ مقفّٰی، مشکل اور دقیق تحریروں کا

(۱) تحذیر الناس، ص:۳۰۔

اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ نثریں مولانا کی ادبی طبیعت کا اندازہ بتاتی ہیں۔ ان نثری قدروں کی روانی میں مولانا کی شاعرانہ طبیعت کا رنگ بھی مضمر نظر آتا ہے۔ غالبًا آپ کو یہاں حیرت ہوگی کہ نثر سے کسی طرح کسی کی شاعرانہ افتاد کا پتہ چل سکتا ہے؛ مگر ذوقِ سلیم کسی نثر میں بے ساختہ قافیوں کے ملتے چلے جانے سے شعری ذوق کا نشان لگا ہی لیتا ہے۔ جب سے راقم الحروف کو مولانا کی تصنیفات کا مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے درآں حالے کہ مجھے آپ کی شاعری کے متعلق کچھ معلومات حاصل نہ تھیں، میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اس نثر کا لکھنے والا قلم شعر و شاعری کے موتی ضرور پروتا ہوگا؛ لیکن مجھے اس پر اصرار نہیں کہ ہر مقفّٰی عبارتیں لکھنے والا ناثر شاعر بھی ہوا کرے۔ بہر حال! مولانا کی حسب ذیل اردو نثر کے مقفّٰی ٹکرے پیش کرتا ہوں، جن سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے۔ تقریر دل پذیر میں لکھتے ہیں:

''جب اس گرداب میں بہت چکر کھایا اور اس فکر نے خوب دیوانہ بنایا، غیب سے امداد ہوئی اور یہ بات خیال میں آئی کہ خدائے کریم سے التجا کیے بغیر نہیں بنتی۔ الغرض سب طرف سے پھر پھرا کر اور چاروں طرف سے دھکے کھا کر خدائے کریم کی طرف رجوع کیا۔ دل ہی دل میں یہ عرض کرتا تھا کہ الٰہی! بے تری امداد کے کام نہیں چلتا۔ اس بے کس کی تو تو ہی دست گیری کرے گا۔ کوئی ایسی سبیل کر جس سے میں گم گشتہ رستے سر لگوں ؎

قطرۂ دانش کہ دادستی ز پیش
متصل گرداں بہ دریا ہائے خویش

سو قربان جایئے اپنے خدائے بے نیاز کے کہ مجھ سے ناکارہ کی دعا قبول فرمائی اور بات سجھائی کہ جس سے یہ گرہ کھلنے کو آئی''[1]۔

دیکھیے! مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی مذکورہ عبارت میں ''چکر کھایا''، ''دیوانہ بنایا''، ''پھر پھرا کر''، ''دھکے کھا کر''، ''قبول فرمائی''، بات سجھائی''، ''کھلنے کو آئی''۔ یہ تمام ٹکرے طبیعت کی موزونیت واضح کر رہے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ مولانا کی شاعرانہ طبیعت کی سراغ رسانی مذکورہ عبارت کے چند ٹکڑوں سے ہوتی ہے، جو نثر میں صاف بے ساختہ مصرعے بن گئے ہیں، مثلاً خط کشیدہ جملوں پر غور کیجیے، جو ہر ایک موزوں مصرعہ ہے، یعنی:

۱- اور یہ بات خیال میں آئی،
۲- دل ہی دل میں یہ عرض کرتا تھا،

(۱) تقریر دل پذیر، ص: ۱۲۵۔

۳-کوئی ایسی سبیل کرجس سے،
۴-جس سے یہ گرہ کھلنے کو آئی۔

مولانا کی زبان قلم سے اس مختصر سی عبارت میں چار موزوں مصرعے نکلے ہیں، جن سے مجھے ان کی طبعی شاعری کا یقین سا ہو گیا، اور یہ بھی کسی کے شاعرانہ ذوق کی دلیل کیا کم ہے کہ کوئی مقرر یا مضمون نگار اپنی خطابت یا انشا میں برمحل اشعار چست کرتا نظر آئے۔ مولانا کی مذکورہ تحریر میں غالباً مثنوی کا یہ شعر:۔

قطرۂ دانش کہ دادستی ز پیش
متصل گرداں بہ دریا ہائے خویش

بجائے خود ان کے ذوقِ سخن پر شاہد ہے۔ اس شعر کے انتخاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ اس قطرۂ دانش کا از رہِ تشکر اظہار فرما رہے ہیں، جس کی روشنی میں مولانا کا دل اور دماغ مضامین عالیہ کے جواہر تولتا اور موتی رولتا رہا ہے۔ ''تقریر دل پزیر'' جو مولانا کے جدید اجتہادی علم کلام کا شاہ کار ہے، اور ''آبِ حیات'' جو قاسم العلومؒ کے غیبی مضامین اسرار و حکمت کا انبار ہے، اسی قطرۂ دانش کا نتیجہ ہیں۔ حضرت قاسم العلومؒ میں اقبال کی کہی ہوئی دانش نورانی اور دانش برہانی کے دو دھارے ساتھ ساتھ بہتے نظر آتے ہیں، جس کا اظہار ڈاکٹر اقبالؒ نے اس شعر میں کیا ہے:۔

اِک دانش نورانی ایک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی ''تقریر دل پذیر'' میرے نزدیک دانش برہانی ہے؛ مگر مولانا کی عقل سلیم فلسفی کی عقل سے جو حیرت کی فراوانی رکھتی ہو، علاحدہ ہے؛ مگر ''آبِ حیات'' دانش نورانی کا ثمرہ ہے۔ یہ دونوں دانشیں اکتسابی نہیں؛ بلکہ وہبی ہیں، جو مولانا کو حاصل تھیں۔ اس دانش برہانی و نورانی کا مرکز انوار

''شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِنْ رَّبِّهٖ''.

یعنی اللہ جس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے کہ وہ اس میں آ کر سما جائے، تو ایسا سینہ اپنے رب کی طرف سے روشنی کا لائٹ ہاؤس یا نور کا مینار بن جاتا ہے، اور پھر اس سے حقیقت کے پردے آنکھوں سے اٹھتے نظر آتے ہیں۔ عجب نہیں کہ اقبال نے مثنوی کے اسی ''قطرۂ دانش'' والے شعر کے مصرع:

متصل گرداں بہ دریا ہائے خویش

سے یہ مضمون لیا ہو، جو اس شعر میں پیش کیا گیا ہے:۔

تو ہے محیط بے کراں، میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہم کنار کر، یا مجھے بے کنار کر

الحاصل مولانا محمد قاسم صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے نثری انداز نے مجھے ان کی شاعری کا پتہ دیا، اور بالآخر مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی نوشتہ ''سوانح قاسمی'' کے مطالعے کے وقت میری نظر سے یہ عبارت گزری:

''جناب مولوی (محمد قاسم) صاحب لڑکپن سے ذہین، طبّاع، بلند ہمت، تیز، وسیع حوصلہ، جفاکش، جری، چست وچالاک تھے۔ مکتب میں سب ساتھیوں سے ہمیشہ اول رہتے تھے۔ قرآن شریف بہت جلد ختم کرلیا۔ خط اس وقت سب سے اچھا تھا۔ نظم کا شوق اور حوصلہ تھا۔ اپنے کھیل اور بعض قصے نظم فرماتے اور لکھ لیتے''(۱)۔

اس عبارت کے آخری جملے نے مولاناؒ کے شاعر ہونے پر مہر فیصلہ ثبت کردی۔

شاعری کی ابتدا:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی شاعری کی ابتدا کب سے ہوئی؟ اس کا ثبوت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی مذکورہ عبارت سے ملتا ہے کہ مولانا لڑکپن سے ہی فطری شاعر تھے اور جب کہ محلے اور شہر کے بچے اپنے شہری کھیل کھیلا کرتے تھے اور اس وقت طفلی میں مولانا کے لیے اس کم سنی میں لہو ولعب معیوب نہ تھا۔ مولانا اس وقت اپنے کھیلوں کو اور بعض قصوں کو نظم میں لکھ لیا کرتے تھے۔

عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کھیل کود کی باتیں اس وقت کی ہیں جب کہ مولانا مکتب میں پڑھتے تھے۔ اگر زمانے کا تجزیہ کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ کی عمر اُس وقت آٹھ نو سال کی ہوگی؛ کیوں کہ آپ ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے، اور جب آپ حضرت مولانا مملوک العلی صاحب نانوتویؒ صدر مدرس دہلی کالج اور حضرت والا محترم مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے ہم راہ برائے تحصیل علوم دہلی تشریف لے گئے ہیں، تو وہ ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ (جنوری ۱۸۴۴ء) کے اواخر ایام ہیں۔ محرم ۱۲۶۰ھ (فروری ۱۸۴۴ء) میں پہنچ کر مولانا نے علم نحو کی مشہور اور معرکۃ الآراء کتاب ''کافیہ'' سے اپنی تعلیم شروع فرمائی ہے۔ یہ تمام عرصہ گیارہ سال کا بہ مشکل بنتا ہے، اور گمان غالب یہ ہے کہ مولانا نے عربی تعلیم کے بعد کھیل کود کے میدان کو چھوڑ دیا ہوگا؛ اس لیے مولانا کی شاعری کی ابتدا کا دور آٹھ، نو سال کی عمر سے متعین کرنا غلط نہ ہوگا، اور یہ دور وہی مکتب کا دور ہے، جب کہ آپ اپنے ہم عصروں کے ساتھ کھیلنے میں دل چسپی لیا کرتے تھے۔

بہر حال! اس کے لیے انکار کی گنجائش نہیں کہ مولاناؒ دس سال کی عمر تک طبع آزمائی اور فکر سخن میں دل چسپی لینے لگے تھے۔ غالب کے متعلق تو گیارہ بارہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز مانا گیا ہے؛ مگر قاسم العلوم اس سے بھی آغاز میں سابق ہیں۔

---

(۱) سوانح قاسمی، ص:۵۔

شاعری کا ماحول اور ابتدائی دور:

فطری رجحانات انسان کی شاعری کے اصلی پس منظر ہوتے ہیں۔شعر وسخن کی استعداد اندر ہی اندر شیرۂ انگور کی طرح قوام اختیار کرتی رہتی ہے، اور جب کوئی خارجی محرک پیش آتا ہے، تو شاعر کے جذبات کو ٹھیس لگ اکراس کو گنگنانے پر مجبور کردیتا ہے۔جہاں تک میرا تحقیقی وجدان کام کرتا ہے، مولانا کی شاعری کا ماحول آپ کے ننھیال کے یہاں پیدا ہوا ہے؛ کیوں کہ والد صاحب تو ایک سیدھے سادھے خدا پرست آدمی تھے، جن کو علم وفن سے کوئی خاص شغل نہ تھا؛ البتہ مولانا کے نانا مولوی وجیہ الدین صاحبؒ اردو کے شاعر تھے، اور مولانا اکثر اپنے نانا کے یہاں بچپن میں قیام پذیر رہا کرتے تھے۔بچپن میں شاعری کا چسکا غالبًا یہیں سے لگا ہے۔چناں چہ مولانا محمد یعقوب صاحب علیہ الرحمہ ''سوانح قاسمی'' میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''مولوی صاحب کے نانا مولوی وجیہ الدین صاحب نانوتویؒ فارسی بہت عمدہ جانتے تھے، اردو کے شاعر تھے اور کچھ کچھ عربی سے بھی آگاہ تھے۔بڑے تجربہ کار اور پرانے آدمی تھے۔ہنگام آمدن حکومت انگریزی سہارن پور میں وکیل ہوئے اور نہایت عزت واحترام اور تموّل سے گزران کی۔نہایت طبّاع اور خوش فہم تھے''(۱)۔

اس عبارت میں مولانا کے نانا کی اردو شاعری سے دل چسپی اور مادۂ شعر وسخن نیز طباعی وخوش فہمی کا ذکر کیا گیا ہے۔یہیں سے مولانا کی شاعری کے ڈانڈے ملتے نظر آتے ہیں۔

اس کم سنی میں نہ صرف یہ کہ آپ نے شاعری میں ابتدائی قدم رکھا؛ بلکہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے اس جملے سے کہ ''اپنے کھیل اور بعض قصے نظم فرماتے'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اپنے بچپن کے زمانے میں شعر وسخن پر قدرت سی ہوگئی تھی؛ کیوں کہ کھیلوں اور قصوں کا نظم میں ڈھالنا قدرت سخن سے خالی نہیں؛ لیکن افسوس ہے تو یہ کہ آپ کی بچپن کی شاعری کا نمونہ دست یاب ہونا ناممکن ہے۔کاش کہ ہم عصر سوانح نگار مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کچھ قوتِ حافظہ سے کام لے کر کوئی نمونہ پیش فرماتے، تو خلف کے لیے نقد ونظر کا سامان فراہم ہوتا۔

فضائے دہلی کے اثرات:

بارہ سال کی عمر سے مولانا دہلی کی اس زمین پر قیام پذیر ہیں، جہاں کے ذرے ذرے میں شعر وشاعری کا ہنگامہ گرم رہتا ہے۔یہ دور غالب، ذوق اور مومن ایسے اہل کمال کا دور ہے۔قلعۂ معلیٰ میں شعر وسخن

(۱) سوانح قاسمی، ص:۴۰۔

کا چرچا رہتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر خود شستہ گو شاعر ہے۔ شہزادوں کو فکرِ سخن حاصل ہے۔ قلعے کے اندر اور باہر شہر میں مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ خود مولانا مملوک العلی صاحب مرحوم کو جن کی سرپرستی میں مولانا تعلیم حاصل فرمارہے تھے؛ بلکہ مولانا ان کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، شعروسخن پر قدرت حاصل تھی۔ وہ درباری مشاعروں میں شرکت فرماتے رہتے تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ کو دہلی میں محرم ۱۲۶۰ھ/ہجری تقریباً مطابق (فروری) ۱۸۴۴ء/ سے ۱۲۶۷ھ/ مطابق ۱۸۵۱ء/ تک مولانا مملوک العلی صاحب نانوتویؒ کی زیرسرپرستی پاس رہنے اور علوم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے؛ اس لیے شفیق رشتہ دار، شاعر وادیب، ہم وطن استاد کے فیضِ صحبت نے بھی مولانا کے جذبات کو ہوا دینے میں حصہ لیا ہوگا۔ اس پر طرّہ یہ کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے ایک استاد مفتی صدر الدینؒ بھی تھے، جو غالب کے معاصر تھے۔ وہ اپنے زمانے کے شعرا اور اہل ادب کے نہ صرف قدرداں تھے؛ بلکہ ادب کے اچھے نقادوں میں سے تھے اور اپنے عہد کے بہترین شعرا میں سے شمار کیے جاتے تھے۔ آزردہ تخلص فرماتے تھے۔ مولانا نے آزردہ سے ادب کی کتابیں پڑھی تھیں۔ علاوہ ازایں مولانا کے پیر ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اردو فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے، جن کے حالات شاعری سے راقم الحروف نے تذکرۂ ادبائے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی ہے(۱)۔

کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کی شاعری کو حضرت حاجی صاحبؒ کے اثرت نے بھی تائید وتقویت بخشی ہے، اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی زندگی پر سب سے زیادہ حاجی صاحبؒ ہی کا اثر رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء/ کے ہنگامۂ حریت آزادی میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ حضرت حاجی صاحبؒ کے شریک جہاد رہے ہیں۔

تجزیہ:

ان سب مذکورہ اثرات پر قیاس آرائی کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ مولانا فطری شاعر تھے، اور اگر ابتدائی رنگ مولانا پر شعروشاعری کا ہوا ہوگا، تو وہ ان کے نانا مرحوم مولوی وجیہہ الدین صاحبؒ کا ہوگا۔ باقی اساتذہ اور شیوخ کے اثرات مولانا کی شاعری میں ترقی کا سبب ہوئے ہوں گے۔

تلمذ اور طرزِ شاعری:

مولانا کی شاعری پر مفصل تبصرہ آئندہ سطور میں پیش کیا جارہا ہے؛ لیکن مذکورہ بالا اساتذہ میں سے

(۱) زیرنظر مقالہ کا حصۂ اوّل حضرت حاجی صاحبؒ کے ادبی ذوق پر مشتمل ہے، جو کتابی صورت میں ان شاءاللہ جلد شائع ہوگا۔ (نعمان)

آپ نے شاعری میں کس کی شاگردی اختیار فرمائی؟ یہ حقیقت پردۂ خفا میں ہے۔ جس طرح بعض تلامذہ اپنے کلام میں اپنے اساتذہ کا نام لے کر شعر و شاعری کو ان کے فیض سے تعبیر کرتے ہیں، یا فخریہ انداز میں پیش کر کے اپنے استاذ کا نام ظاہر کرتے ہیں، بہ ظاہر ایسا کوئی ثبوت پیش کرنا اسی وقت ہوسکتا ہے، جب کہ مولانا کا تمام کلام پیش نظر ہو؛ لیکن جہاں تک مولانا کی ان تصانیف یا خطوط کا تعلق ہے، جو مطبوعہ ہمارے سامنے ہیں، ان سے آپ کے استادِ سخن کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ حال آں کہ روحانیات میں بارہا جگہ مولانا نے اپنے مرشد کامل حاجی امداداللہ صاحبؒ کا نام لیا ہے۔

بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شعر و سخن کے لیے اپنا کوئی استاذ منتخب نہیں فرمایا؛ بلکہ خداداد لیاقت اور شاعرانہ فطرت ہی آپ کی استادانہ قوتوں کو ترقی کی راہ پر لے جارہی تھی؛ اس لیے یہ بھی کہنا آسان ہے کہ آپ کے کلام پر مذکورہ حضرات سے میں سے کسی کا کوئی خاص شاعرانہ رنگ نہ تھا؛ بلکہ آپ کے طرزِ شاعری پر اس دور کے بعض شعرا مثلاً ذوق کا رنگ اور قصائد میں سودا کا اثر نظر آتا ہے، جس پر آئندہ بحث کی جارہی ہے۔

نام نامی اور تخلص:

کون نہیں جانتا کہ حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات کا نام نامی ''محمد قاسم'' تھا۔ آپ نانوتہ ضلع سہارن پور کے رہنے والے تھے۔ تاریخی نام مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے آپ کی سوانح میں ''خورشید حسین'' تحریر فرمایا ہے۔ خود مولانا نے اپنے مکتوب بہ نام حکیم ضیاء الدین صاحب ساکن رام پور منہیاراں میں مولوی حامد حسین شیعہ عالم سے گفتگو کے موقع پر ان سے اپنا تاریخی نام ''خورشید حسین'' ظاہر فرمایا ہے۔ چناں چہ ''فیوض قاسمیہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''پس از گفتار خورشید حسین گفتم''۔

ایک جگہ اپنی مشہور کتاب ''ہدیۃ الشیعہ'' میں اپنا تخلص:

> ''کم نام محمد قاسم تخلص بہ خاک پا''۔

کے جملے میں ''خاک پا'' ظاہر فرمایا ہے؛ لیکن جہاں تک آپ کے قصائد اور غزلیات کا مطالعہ کیا گیا، ان میں آپ نے اپنے نام نامی یعنی ''قاسم'' کو تخلص کی جگہ استعمال فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو تخلص بدل لیا، بہ شرطے کہ تمام کلام ''ہدیۃ الشیعہ'' کی تصنیف کے بعد کا ثابت ہو سکے، اور یا ''خاک پا'' کو استعمال ہی نہیں فرمایا؛ البتہ آپ کے مجموعۂ غزلیات کے مطالعے سے مزید تحقیقات کا پتہ چل سکے گا کہ آیا آپ نے

یہ تخلص کہیں غزل یا قصیدے میں اختیار بھی کیا ہے یا نہیں؟ تاہم اس سے مولانا کے ذوق کی داد دینی پڑتی ہے، کیوں کہ ''خاک پا'' سے لفظ ''قاسم'' اپنی جگہ زیادہ فصاحت اور روحانیت رکھتا ہے۔

مقدارِ کلام:

حضرت مولانا کے کلام کی مقدار کس قدر ہے؟ یہ سوال میرے لیے عرصے سے حیران کن تھا۔ میں سوچتا تھا کہ اس قدر تیز، رواں اور قلم برداشتہ مسلسل اشعار لکھنے والی شخصیت کا کلام کیا صرف اسی قدر ہو سکتا ہے، جو ''قصائد قاسمی'' کے نام سے مشہور ہے؟ جس کی تفصیل پیش ذیل ہے:

۱- ان قصاید میں پہلا ''قصیدہ بہاریہ'' ہے، جو سرکار دو عالم، تاج دارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں نہایت والہانہ اور عاشقانہ انداز میں لکھا ہوا ہے، اور جو عشقِ رسول میں سر تا پا محویت کا منظر پیش کرتا ہے۔ اس نعتیہ قصیدے کے ایک سو اکیاون اردو اشعار ہیں۔

۲- دوسرا قصیدہ اردو زبان میں سلطان عبدالحمیدؒ خلیفۃ المسلمین کی شان میں لکھا گیا ہے۔ اس قصیدے میں چھپن اشعار ہیں۔

۳- تیسرا قصیدہ فارسی زبان میں ہے، یہ بھی سلطان مذکور عبدالحمیدؒ کی مدح میں ہے۔ اس قصیدے کے انچاس اشعار ہیں۔

۴- چوتھا ایک اور قصیدہ ہے، جو عربی زبان میں ہے، یہ بھی سلطان مذکور کی توصیف میں ہے اور چونسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔

۵- ایک شجرۂ خاندان چشتیہ صابریہ ہے، جو فارسی اشعار میں حضرت مولانا نے لکھا ہے، اور جس کے اول اور آخر میں دعائیہ اشعار ہیں۔ یہ منظوم شجرہ بہتّر اشعار تک پھیلا ہوا ہے۔

ان تمام اردو، فارسی اور عربی اشعار کا مجموعہ اعداد جو ''قصائد قاسمی'' میں درج ہیں، تین سو بانوے ہوتا ہے۔ یہ ہے کل مقدارِ شعر و سخن جو قاسم العلوم کی زندگی کا مختصر سا سرمایہ ہے۔

میں نے ابھی اوپر عرض کیا ہے کہ مولانا کی افتادِ طبع اور پر گوئی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف ان کے مضامین، خطوط اور تقاریر کا ذخیرہ زیادہ ہونا چاہیے؛ بلکہ شعر و سخن کا مجموعہ بھی یا تو کہیں گوشۂ گم نامی میں کسی معتقد کے پاس محفوظ رکھا ہوگا کہ کہیں ہوا نہ لگ جائے اور یا کسی کی ناقدریوں کا شکار ہو کر عالم برزخ کی حدود میں چلا گیا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے جیسا کہ راقم الحروف نے مولانا کے مکتوبات اور نثر کے ضمن میں ظاہر کیا ہے کہ مولانا کے علوم و معارف کا کافی ذخیرہ عقیدت نہیں بلکہ عقیدت مندوں کی تغافل شعاری کی نذر ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے مایۂ ناز، روشن دل بزرگوں کو دنیاوی شہرت، ریا اور شعر سے نفرت تھی؛ مگر خلف کے لیے ان کے علوم وفنون کی اشاعت سے گریز کہاں کی انکساری اور کون سی بے ریائی تھی؟ ہمیں اپنے بزرگوں سے عقیدت اور محبت اس قدر تھی اور ہے کہ ان کی مفید تحریروں کو کسی بٹوے میں بند کر کے تبرک کے طور پر رکھ چھوڑنا ہی اپنی سعادت مندی سمجھتے رہے، اور کبھی کبھار ان تبرکات کو نکال کر آنکھوں سے لگا کر اور چوم کر اسی طرح لپیٹ کر رکھتے رہے:

بہ سوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بو العجبی است

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھلاودی شاگرد مولانا محمد قاسم صاحب علیہما الرحمہ کے تذکرے کے ضمن میں رسالہ دار العلوم ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ (جنوری ۱۹۵۲ء) میں حسبِ ذیل سطور سپردِ قلم کی ہیں:

> ''پھلاودہ (ضلع میرٹھ) میں مولانا نانوتوی (یعنی مولانا محمد قاسم صاحبؒ) کے بھی بہت سے خطوط نہایت حفاظت وصیانت کے ساتھ ایک جزودان میں رکھے ہوئے ہیں۔ حضرت نانوتویؒ اپنے اس صوفی منش شاگرد کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اچھے اچھے القاب سے یاد فرماتے ہیں۔ پھلاودی شاگرد کو اپنے شیخ کے قلم سے نکلے ہوئی تکریمی القاب سے کچھ ندامت محسوس ہوتی ہے اور اس ندامت کا ذکر کر کے حذفِ القاب کی درخواست کرتا ہے۔ حضرت نانوتویؒ القاب میں اختصار کرنے پر تیار ہیں؛ لیکن ان کو بالکل ترک کرنے پر راضی نہیں ہیں۔ بہت سے خطوط ایسے بھی مولانا پھلاودیؒ نے جمع کر لیے ہیں، جو حضرت نانوتویؒ نے اپنے مایۂ ناز شاگرد مولانا امروہی کو روانہ کیے ہیں اور ان میں خاص خاص علمی مضامین مکتوب الیہ کی استعداد کے پیشِ نظر بیان فرمائے ہیں۔ مولانا پھلاودیؒ کے ابن الابن (پوتے) مولوی سید عبدالغنی صاحب نے مجھے بتلایا کہ مولانا عبدالغنی صاحب پھلاودیؒ سفر میں بھی مولانا نانوتویؒ کے ساتھ رہے ہیں اور ان کی تقاریر کو ضبط کیا ہے''۔

مولانا نسیم احمد صاحب کی مذکورہ عبارت اور تحقیق نے مجھے ایک اور ہی دنیا میں پہنچا دیا ہے۔ خوشی ہے تو اس بات کی کہ مولانا کی علمی دولت کا ایک گنج گراں مایہ ہاتھ لگا، اور غم ہے تو اس بات کا کہ یہ خزانہ نہایت احتیاط، حفاظت اور صیانت سے جزدان میں رکھا ہوا ہے۔ معلوم نہیں اسے دھوپ اور ہوا بھی لگائی گئی ہے یا نہیں؟ اللہ رے حفاظت!

اور وہ القاب وآداب کیا ہیں جن سے حضرت نانوتویؒ نے اپنے شاگرد کو یاد فرمایا ہے اور تلمیذ رشید نادم

ہوئے جاتے ہیں؟ وہ خطوط کی تہوں میں ہی لپٹے رکھے ہیں، اور حضرت مولانا کی وہ تقریریں کیا ہیں جو حضرت پھلاودیؒ نے رفاقتِ سفر میں لکھی ہیں؟ کاش میرے پر ہوتے اور میں ہندوستان کے پرمٹ بغیر اڑ کر پھلاودہ کی فضا پر پہنچتا اور وہاں اتر کر اس تمام سرمایۂ دین ودل وایمان کو اپنے سینے سے باندھ کر لے اڑتا اور ترتیب دے کر سرمۂ چشم اہل بصیرت اور سویدائے قلب اہل معرفت بناتا اور دنیائے اسلام کے سامنے پیش کرتا۔ وہ تو خدا بھلا کرے مولوی عبدالاحد صاحبؒ مالک مطبع مجتبائی دہلی کا جنہوں نے مولانا کی تصانیف بادامی کاغذوں پر چھپوادی تھیں، جن کا کاغذ آج اپنی خستگی میں اتنا پختہ ہے، جیسا دیسی پان کہ زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہے۔ میرے سامنے اس وقت جو ''قصائد قاسمی'' مطبوعہ مجتبائی رکھے ہیں، باوجود سخت احتیاط کے اس کے اوراق پُرزہ پُرزہ ہوکر زبان حال سے پکار رہے ہیں: ؎

لختے بُرد از دل گزرد ہر کہ ز پیشم
من قاش فروشِ دل صد پارۂ خویشم

حضرت مولانا کی سوانح عمری آپ کے ارشد تلامذہ مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہی مرحوم نے لکھی تھی، جیسا کہ موصوف نے ''انتصار الاسلام'' میں حوالہ دیا ہے؛ لیکن وہ کہاں ہے؟ بعض سے معلوم ہوا ہے کہ ہم نے مدتیں گزریں جب دیکھی تھی۔ بعض حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دارالعلوم دیوبند کے خزانے میں تبرکات کے ساتھ منسلک ہے۔ اس کا جو حشر بھی ہوہو؛ مگر اب سنا ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے ایک صدی کے بعد حضرت قاسم العلوم کی سوانح کا قرضہ اتارا ہے اور جو غالباً حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کی کاوشوں اور تقاضوں کے بعد لکھی جاچکی ہے۔

اُدھر دیکھیے! مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے استاذ علامہ شبلیؒ کی سوانح تقریباً نوسو صفحات میں لکھ کر کبھی کی ملک میں شائع کردی، اور سرسید کی ''حیاتِ جاوید'' حالی نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلادی۔

میں کیا لکھ رہا تھا؛ لیکن کہاں سے کہاں پہنچ گیا؟ ہاں تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا بس اتنا ہی کلام ہوگا؟ نہیں! آخر پتہ چلا کہ، اور قیاس نے اس میں ہرگز غلطی نہیں کھائی کہ آپ کے کلام کا مجموعہ آخر پھلاودہ ضلع میرٹھ کے مذکور الصدر بزرگ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے شاگرد مولانا عبدالغنی صاحب کے کتب خانے سے تحقیق کی روشنی میں آیا ہے۔ چناں چہ مولانا نسیم احمد امروہی کے قلم کی زبانی ان کے مضمون کی حسب ذیل سطور سے مژدۂ جاں بخش پڑھیے، جو انہوں نے ''حضرت مولانا نانوتویؒ کی شاعری'' کے عنوان

کے تحت تحریر کیا ہے:

اب میں حضرت والا کا غیر مطبوعہ کلام پیش کرتا ہوں۔ اس کی دو نقلیں کتب خانہ پھلاودہ میں ہیں۔ تیسری نقل میرے پاس ہے۔ مجھے مولوی سید عبدالغنی سلمہٗ سے معلوم ہوا کہ مولانا (محمد قاسم صاحبؒ) کے کلام کی ایک ضخیم بیاض ان کے پاس اور تھی جس کو انہوں نے ایک صاحب کو عاریتاً دے دیا ہے، اگر وہ بیاض بھی میرے سامنے ہوتی، تو میں اس سے زیادہ کلام پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا۔ اس موجودہ مختصر مجموعے میں چھ غزلیں اردو کی، دو فارسی کی اور آٹھ عربی کی نظمیں ہیں"(۱)۔

اب اس عبارت کو پڑھنے کے بعد خوشی کی انتہا نہیں رہتی، جس سے یہ معلوم ہوا کہ مولانا کا مجموعۂ کلام صحیح بیاض کی شکل میں غیر مطبوعہ موجود ہے، جو کسی صاحب کو عاریتاً مولانا عبدالغنی صاحبؒ کے فرزند کے بیٹے نے دیا ہوا ہے۔ خدا نہ کرے کہ وہ اسے ضائع کر دیں۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ اس کو جلد لے کر اپنی یا مدرسے کی تحویل میں لے لیں؛ کیوں کہ وہ یا مدرسہ کا سرمایہ ہے، اور یا خاندانِ قاسمی کا اور یا تمام ادبائے اردو کا۔

بہر حال! اس ضخیم مجموعے کے سوائے چھ اردو کی غزلیں، دو فارسی کی اور آٹھ عربی کی نظمیں مولانا کی شعری قدروں میں اور اضافہ رکھتی ہیں، اور "قصائد قاسمی" جن کا اس عنوان کے ماتحت ابتدا میں ذکر ہوا وہ ان کے علاوہ ہیں۔

یہ تو تھا مژدۂ جاں فزا کہ حضرت حجۃ الاسلامؒ کا مجموعۂ کلام اس عالم آب و گل میں کسی کے پاس موجود ہے؛ لیکن ایک جگر شق کرنے والی خبر بھی سنیے، جو مولانا نسیم احمد صاحب نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے شاگردِ جلیل القدر مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ علیہ الرحمہ مشہور مفسر کی زبانی رسالۂ دارالعلوم کے اسی نمبر اور اسی مضمون میں پیش کی ہے، لکھتے ہیں:

"حضرت حافظ صاحب (مولانا عبدالرحمٰن صاحب مفسرؒ) جو کہ اکابر دیوبند خصوصاً مولانا نانوتویؒ کے آخری چند سال کی ایک جیتی جاگتی تاریخ تھے، فرماتے تھے کہ مولانا نانوتویؒ نے 'دیوان اللہ دیا' کی فرمائش پر ایک مثنوی لکھی تھی، جو پانچ سو اشعار پر مشتمل تھی۔ اُس کا ایک شعر یہ ہے:

ضعف سے ہوگیا دمِ رفتار
تن کو سائے کا تھامنا دُشوار

(۱) رسالہ دارالعلوم دیوبند، ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ، ص: ۲۶۔

اس کے قریب ہی زمانے میں مولانا (رشید احمد صاحب) گنگوہیؒ نے ''ہدایت الشیعہ'' تصنیف فرمائی، اُس کو ملاحظہ کر کے فرمایا کہ: مولانا گنگوہی دین کا یہ کام کر رہے ہیں اور میں نے مثنوی لکھی ہے؟ فوراً ہی وہ مثنوی منگوائی اور جلادی''(۱)۔

اس دل سوز اور جگر دوز خبر سے جس قدر حلقۂ ادبائے اُردو میں صف ماتم بچھ جائے وہ کم ہے۔ آہ صنفِ شعر میں مثنوی ایسی عظیم الشان اور اہم صنف کا اس طرح جلا دینا حضرت مولانا جیسے برگزیدہ اور پرہیز گار، سالک و عارف ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ ذرا سوچیے کہ پانچ سو اشعار جو خونِ جگر جلا کر لکھے ہوں، ان کے جلانے میں کتنی دیر لگی ہوگی؟ بس یہ کہنے ہی کی بات ہے اور جگر تھامنے کی۔

صنفِ مثنوی جس پر فردوسی اور نظامی نے دنیا سے اپنی شاعری کا سکہ منوایا اور اردو کی مثنویوں میں میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' اور دیا شنکر نسیم کی ''گل بکاؤلی'' اپنا جواب نہیں رکھتیں، اور ناقدین کے لیے سرمایۂ عز و افتخار اور اُردو زبان کے لیے مایۂ ناز مثنویاں ہیں۔ اس جیسی صنف کو مولانا نے یوں جلا کر خاک کر دیا، جس طرح مٹی کے گھروندے یا کھلونے بنا کر بچے بگاڑ دیتے ہیں۔ یاللعجب، یاللعجب!

کوئی بھی اس وقت ایسا من چلا پاس نہ تھا کہ بے ادبی کا گناہ سر پر لے کر اس مثنوی کو مولانا کے دستِ مبارک سے لے لیتا؟

جس مثنوی کا شعر یہ ہو ؎

ضعف سے ہوگیا دمِ رفتار
تن کو سائے کا تھامنا دشوار

اس مثنوی کے خدا جانے اور اشعار کیسے بولتے اور ہنستے ہوئے ہوں گے؟: ؎

سالے کہ نکو است از بہارش پیدا

بہر حال! جو سرمایہ ضائع ہوگیا، اس پر کفِ افسوس ملنے سے کیا ہوتا ہے؛ مگر نتیجے پر پہنچنے اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی شاعری کا تجزیہ کرنے کے لیے ہم اس مقام پر تاریخی طور پر پہنچ چکے ہیں کہ مولانا صنف شعر میں ہر ایک صنف کے کہنے پر قدرت تامہ رکھتے تھے، یعنی نظم، غزل، قصیدہ، مثنوی، نعت وغیرہ میں آپ کو پوری مہارت حاصل تھی۔ نہ صرف مہارت بلکہ بلا تکلف فی البدیہہ نظموں کی نظمیں لکھ ڈالنے میں یدطولیٰ رکھتے تھے (۲)۔

---

(۱) مجلّہ دارالعلوم، ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ، ص: ۲۶۔

(۲) (ماخوذ از): ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند، شعبان ۱۳۷۲ھ/مئی ۱۹۵۳ء تا رمضان ۱۳۷۳ھ/مئی ۱۹۵۴ء گیارہ اقساط۔

برصغیر ہند میں دینی نظام تعلیم کے مجدد اور خلافت عثمانیہ ترکی

حضرت اقدس مولانا سید ارشد صاحب مدنی مدظلہم العالی ✿

عنوانات:

تنویر احمد شریفی عفی عنہ

مخدومی ومرشدی حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی دامت برکاتہم کا یہ مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد ہے۔ حضرت مخدومی مدظلہم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ (والد گرامی) اور فدائے ملت امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی قدس سرہٗ (برادر اکبر) کے جانشین ہیں۔ موصوف نے یہ مقالہ ترکی میں ہونے والے ایک سیمینار میں پڑھا تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ زیر نظر نمبر کے سلسلے میں میری یہ خدمت میرے مرشد کی توجہ کا اثر ہے، تو غلط نہ ہوگا۔ (نعمان)

تمہید:

تاریخ عالم میں بارہا ہوا ہے کہ کسی قوم یا ملک کے زوال پذیر معاشرے؛ بلکہ کئی مرتبہ ایسے سخت حالات اور وقت میں جب اس قوم کے باشندوں اور اس ملک میں ملت کے افراد کے لیے امید کی کوئی کرن، مستقبل کی کوئی امنگ اور نوید باقی نہیں رہتی، اچانک کوئی ایک شخص نمودار ہوتا ہے، جو اپنی بے لوث خدمت، بے پناہ صلاحیت، مستقبل بینی اور دور اندیشی کی غیر معمولی فطری صلاحیتوں کے ذریعے سے آنے والے وقت کے بگاڑ وزوال کا ادراک واندازہ کرلیتا ہے، اور دیکھ لیتا ہے کہ یہ جو جہالت وبے راہ روی اور دین سے بے زاری کی فضا بنی ہے، اگر ابھی سے اس کے مقابلے کا منصوبہ نہ بنایا گیا اور آنے والے متوقع طوفان کے لیے اگر

✿ استاذ الحدیث دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیت علمائے ہند

ابھی سے فکر وکوشش نہ کی گئی، ابھی سے باندھ نہ بنایا گیا، تو آنے والے وقت میں حالات کا یہ بہاؤ، بگاڑ کے یہ سامان اور زوال کے یہ روش، قوم وملت اور ملک کے باشندوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جائے گی، اور ہوسکتا ہے کہ پھر اس درخت کی جڑیں جمانا اور اس سے نئی پود، نئی نسل تیار کرنا دشوار ہو جائے۔ ایسے وقت میں یہ غیر معمولی (عبقری) افراد، کوئی ایسی تدبیر، ایسا راستہ اور ایسا نظام تلاش کر لیتے ہیں، جس کے ذریعے سے قوم وملت کو راہ نجات تلاش کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے، اور پھر یہی طریقہ، یہی نظام آہستہ آہستہ مقبول ہو کر قوم وملت کے مستقبل کی حفاظت کے پشتے اور باندھ کا کام کرتا ہے، اور اسی سے وابستہ رہ کر ملت صدیوں تک اپنی دینی علمی، اصلاحی سیاسی سفر پورے عزم وحوصلے، ثبات واستقلال کے ساتھ طے کرتی رہتی ہے۔

برصغیر ہند وپاکستان کے ایسے ہی نہایت منتخب روزگار اور برگزیدہ افراد میں سے ایک بہت ممتاز نام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعہ کا ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسمؒ، ہندوستان کے ایک ممتاز باعزت صدیقی خاندان کے فرد، جلیل القدر عالم، حدیث وفقہ کے عالی مرتبہ ماہر، تصوف کے رمز شناس، علوم اسلامی کے شناور، اسرار شریعت کے راز داں، زوال ملت کے نبض شناس، میدان جنگ کے حوصلہ مند سپاہی اور مجاہد، نیز مغلیہ دور حکومت کے بعد ہند وپاکستان کے سب سے بڑے معروف، سب سے بافیض دینی علمی ادارے؛ بلکہ ملت اسلامیہ کی آبرو ''دارالعلوم'' دیوبند کے قافلۂ سالار تھے۔

خاندان ونسب:

حضرت مولانا محمد قاسمؒ کا ایک قدیم صدیقی خاندان سے رشتہ ہے، جو اہل خاندان کی روایت واطلاع کے مطابق ہندوستان کے لودھی خاندان کے بادشاہ سکندر لودھی کے دور حکومت میں ۸۷۸ھ/ (۷۴-۱۴۷۳ء) میں ہندوستان آیا تھا۔ اس خاندان کے ہندوستان آنے والے پہلے شخص شیخ مظہر الدین صدیقیؒ تھے۔ صدیقیانِ نانوتہ کی خداندانی روایت ہے کہ سکندر لودھی نے ان کے علم وکمالات کی شہرت سنی، تو ان کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی، جس کو قبول کرتے ہوئے وہ ہندوستان آ گئے تھے(۱)۔

ان کے فرزند، قاضی میراں بڑےؒ نے سہارن پور کی ایک نواحی بستی نانوتہ کو اپنا مسکن بنایا، (جو اب ایک ضلع سہارن پور اتر پردیش میں شامل ہے) قاضی میران بڑےؒ کی نانوتہ میں رجب ۹۰۲ھ/ (مارچ ۱۴۹۷ء) کو وفات ہوئی۔ ان کی اولاد میں شیخ محمد ہاشمؒ ایک عالم تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے بہت نوازا،

(۱) استاذ الکل مولانا مملوک العلیؒ ص:۶۵۔

ان کی اولاد کی تمام شاخوں میں بڑے بڑے علما، مصنفین اور اہل کمال پیدا ہوئے۔ وہ علما مصنفین اور اہل کمال جو بعد میں برصغیر ہند کی دینی علمی تاریخ کے ماہ و انجم ثابت ہوئے اور جن کی خدمات برصغیر کی تاریخ کے صفحات پر اس طرح مرقوم و مرتسم ہیں کہ اب ان کے تذکرے کے بغیر نہ ہندوستان کی کسی علمی تحریک کا تذکرہ مکمل ہوسکتا ہے، نہ کاروانِ علم و اخلاص کا۔ یقیناً یہ حضرات ایسے لوگوں میں شامل ہیں، جن کو یہ کہنے کا حق ہے ۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اس خاندان اور اس بستی کے اس علمی کارواں نے آخر میں ایک کہکشاں کی صورت اختیار کر لی تھی، جس میں کئی ایک آفتاب و ماہ تاب گردش کررہے تھے۔ ان میں سب سے پہلا اور ممتاز ترین نام، حضرت مولانا محمد مملوک العلی نانوتویؒ (ولادت: ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء، وفات: ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) کا ہے۔ جنہوں نے ہندوستان میں خاندان حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد ایک نئے علمی دبستان کی راہ نمائی وسربراہی کی۔ مسلمانوں کو عصر حاضر کی ضروریات اور دین پر ثبات و استقامت دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کا ایسا متوازن سبق دیا کہ اس کے اثرات آج تک ہندوستان کے ہر ایک تعلیمی ادارے پر گویا نقش ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت و نظام کے خلاف برپا ایک بڑی جدوجہد (تحریک ۱۸۵۷ء) کے بعد سے ہمارے اس ملک میں مسلمانوں نے جو بھی تعلیمی ادارے، دار العلوم، مدرسے اور کالج قائم کیے، وہ تمام مولانا مملوک العلیؒ کی تربیت کا اثر، ان کے عالی مرتبہ شاگردوں کی کوششوں کا ثمرہ اور یادگار ہیں۔

حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ:

حضرت مولانا مملوک العلیؒ کے ایک اور قریبی عزیز مولانا محمد مظہر نانوتویؒ تھے، جو اس عہد کے ایک اور بہت برگزیدہ عالم اور محدث حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلویؒ مہاجر مدنی، نواسۂ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ابن حضرت شاہ ولی اللہؒ (ولادت: ۴رشوال ۱۱۱۴ھ/ ۱۰رمارچ ۱۷۰۳ء، چہار شنبہ، وفات: ۲۹رمحرم الحرام ۱۱۷۶ھ/ ۱۹رستمبر ۱۷۶۲ء، شنبہ) کے عزیز شاگرد اور خدمت و درس حدیث میں اپنے دور میں بہت مشہور و ممتاز تھے، اور ہندوستان کا ایک بڑا دینی ادارہ مدرسۂ مظاہر علوم سہارن پور گویا مولاناؒ کی محنتوں، محبوبیت اور وسیع حلقۂ درس کا ہی ایک مظہر ہے۔ حضرت مولانا محمد مظہرؒ کی بڑی علمی درسی خدمات ہیں۔ ان کے بڑے بڑے عالی مرتبہ شاگرد ہیں، جو ہندستان کی دینی علمی تاریخ کا فخر شمار کیے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا کی علمی خدمات میں سے ایک دو بڑی اہم خدمات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مولاناؒ نے ''احیاء العلوم'' امام غزالیؒ کا کئی قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے صحیح متن مرتب کیا۔ اس پر مختصر

حاشیہ لکھا اور اس کو شائع کرایا۔ مولاناؒ کی ایسی ہی ایک اور بڑی خدمت ''مجمع البحار'' علامہ محمد طاہر پٹنیؒ کی تصحیح واشاعت ہے، اور مولانا محمد مظہرؒ ۱۲۳۷ھ (۲۲-۱۸۲۱ء) میں پیدا ہوئے تھے۔ ''محمد مظہر'' تاریخی نام ہے۔ ۲۴/ذی الحجہ ۱۳۰۳ھ (۲۳/ستمبر ۱۸۸۶ء) کو وفات ہوئی، سہارن پور میں دفن کیے گئے۔

مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ:

مولانا مملوک العلیؒ کے فرزند، ۱۳/صفر ۱۲۴۹ھ (۲/جولائی ۱۸۳۳ء) کو پیدا ہوئے، مولانا محمد یعقوبؒ بھی اسی کاروانِ علم و عمل کا ایک دمکتا ہوا ستارہ تھے، جو اپنے فخر اقران والد کے شاگرد، ممتاز عالم، دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے۔ ان کی صحبت سے فیض یافتہ اصحاب نوید صبح اور خوش بو کی طرح پورے ملک میں پھیل گئے اور اس برصغیر میں جگہ جگہ درس کے حلقے، مدرسے اور علم وافادہ کے مراکز قائم کر لیے، جن میں سے بہت سے اب تک بھی زندہ اور سرگرم کار ہیں۔

ولادت اور تعلیم:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اسی خاندان اور ماحول میں (شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ/ فروری ۱۸۳۳ء) پیدا ہوئے، جب اس خاندان میں بڑے بڑے علما موجود تھے، اور ہر طرف علم اور تعلیم کا چرچا رہتا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے فارسی وعربی کی ابتدائی درسی کتابیں مولانا مہتاب علی دیوبندیؒ (وفات ۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء) اور مولوی محمد نواز سہارن پوریؒ سے پڑھیں۔

محرم ۱۲۶۱ھ (جنوری ۱۸۴۵ء) میں اپنے خاندان کے عالم اور دہلی کالج کے صدر مدرس مولانا مملوک العلی نانوتویؒ کی سرپرستی اور نگرانی میں مزید تعلیم کے لیے دہلی پہنچے، دہلی میں کافیہ ابن حاجب سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ مولانا محمد قاسمؒ اپنی فطری لیاقت وصلاحیت کی وجہ سے تعلیم میں اپنے ہم سبق ساتھیوں اور ہم عمر طلبہ سے بھی آگے رہتے تھے۔ جب کسی ساتھی یا کسی اور مدرسے کے طالب علم سے بحث وگفتگو ہوتی، تو اکثر اس مقابل (طالب علم) کو مولانا سے بحث ومباحثے کی سوجھتی، مولانا سے شرمندہ ہونا پڑتا تھا، اسی طرح تیز رفتار، مگر اعلیٰ درجے کی تفہیم وتعلیم اور لیاقت سے تعلیم مکمل کی۔ مولانا کے استاد زادے اور عزیز، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے لکھا ہے:

> ''پھر تو مولوی صاحب ایسا چلے کہ کسی کو ساتھ ہونے کی گنجائش نہ رہی۔ معقول کی مشکل کتابیں زواہد (میر زاہد کی تصانیف) قاضی (مبارک کی شرح قطبی از میر زاہد) صدرا (صدر الدین شیرازی) اور شمس بازغہ (ملا محمود جون پوری) ایسا پڑھا کرتے تھے، جیسے حافظ منزل سناتا ہے'' (۲)۔

(۱) حالات طیب، مشمولہ قاسم العلوم والخیرات، ص: ۸۰-۱۷۹۔

عقلی علوم، خصوصاً ہندسہ (Geometry) کو استاذ کے بغیر خود ہی دیکھ کر پڑھ لیا تھا۔ فقہ، منطق وکلام اور جملہ درسی کتابوں کو مکمل کرنے اور ان علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی مہاجر مدنیؒ (ولادت: ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء، وفات: ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء) سے حدیث شریف خصوصاً صحاح ستہ پڑھیں۔

علمی تدریسی زندگی کا آغاز:

حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے اس وقت کی عملی روایت کے مطابق پڑھنے کے زمانے میں ہی ابتدائی کتابیں پڑھانی شروع کردی تھیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس دور میں علما کا عام معمول مطالعے سے اعلیٰ علمی کتابوں کے متون کی تصحیح، ان پر حاشیہ لکھنے اور ان کی عمدہ طباعت کی نگرانی کرنے کا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ بھی درس کی ذمے داریوں کے ساتھ اپنے استاذ حدیث حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ (صحیح بخاری کے محشی اور ہندوستان کے نام ور محدث اور خادم حدیث) کے مطبع احمدی سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اس مطبع میں مولانا نے قیمتی خدمات انجام دیں، اور اس کی حیثیت ایک بڑے مرکز علمی اور تحقیقی تصنیفی اکیڈمی کی تھی۔ مشہور ہے کہ حضرت مولاناؒ نے اور علمی کاموں کے علاوہ اپنے استاذ محترم حضرت مولانا احمد علی کی فرمائش پر حاشیہ صحیح بخاری کی تکمیل میں بھی کچھ حصہ لیا تھا۔

حضرت مولاناؒ نے مولانا احمد علیؒ کے مطبع احمدی کے علاوہ ہندوستان کے ایک بڑے ناشر کتب منشی ممتاز علی صاحبؒ کے مطبع مجتبائی اور پھر مطبع ہاشمی میرٹھ میں تصحیح کتب کی خدمت انجام دی اور اپنی زندگی کے آخری دنوں تک اسی کام میں مشغول رہے۔

سلوک ومعرفت:

ہندوستان کے علما میں خداطلبی کا ذوق اور سلوک ومعرفت کی چاشنی حاصل کرنے کا جو معمول اور اہتمام صدیوں سے چلا آرہا تھا، حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے اپنے اساتذہ اور رفقا کی طرح اس پر بھی پورا عمل کیا اور اس کے لیے اپنے زمانے کے ایک بڑے مرشد، معرفت وسلوک کے امام اور طریقۂ سلوک کے کامل رہنما حضرت حاجی امداداللہ فاروقی تھانویؒ کا ہاتھ پکڑا۔ حضرت حاجی صاحبؒ جملہ سلاسل تصوف کے عالی مرتبہ شیخ تھے۔ حضرت مولاناؒ نے حضرت حاجی صاحبؒ کی سرپرستی میں تصوف کے سبق لیے اور مرشد کامل کی تعلیمات وہدایات سے روشنی حاصل کرکے ایسے منور وتابناک بنے کہ شیخ امداداللہؒ نے مولانا کو اجازت وخلافت سے نوازا، اور اپنے متوسلین کو مولانا سے استفادے کی ہدایت کی۔ پیر ومرشد (حضرت حاجی امداد

اللہؒ) کی نگاہ میں حضرت مولانا محمد قاسمؒ کا کیا مقام ومرتبہ تھا؟ اس کا حضرت حاجی امداد اللہؒ کی تحریروں اور مکتوبات سے اندازہ ہوتا ہے۔ حاجی صاحبؒ نے مولانا محمد قاسمؒ کے والد ماجد شیخ اسد علی نانوتویؒ کو ایک خط میں لکھا تھا، اور اپنی ایک اہم تصنیف ''ضیاء القلوب'' میں یہاں تک لکھ دیا:

''بہ خدمت بھائی صاحب مکرم معظم جناب شیخ اسد علی صاحب سلمہٗ! بعد سلام نیاز مبارک باد، واللہ تعالیٰ آں جناب را توفیق اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم داد، امید قوی ست کہ ہمیں عمل خیر ومسئلہ نجات جناب شود، عجب نیست، وشکر کنند کہ خدا تعالیٰ شمارا یک ولی کامل عطا فرمودہ، کہ بہ برکت انفاس او ایں چنیں اعمال نیک ورضامندی اللہ ورسول بہ ظہور آمد، والا ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند''(۱)۔

''نیز ہر کس کہ ازیں فقیر محبت وعقیدت وارادت دارد مولوی رشید احمد صاحب سلّمہٗ ومولوی محمد قاسم صاحب سلّمہٗ را کہ جامع جمیع کمالات ظاہری وباطنی اند بجائے من فقیر راقم اوراق؛ بلکہ بہ مدارج فوق از من شمارند۔ اگر چہ بہ ظاہر معاملہ برعکس شد کہ اوشان بجائے من، ومن بہ مقام اوشان شدم، وصحبت اوشان را غنیمت دانند، کہ ایں چنیں کساں دریں زمان نایاب اند، واز خدمت بابرکت ایشاں فیض یاب بودہ باشند''(۲)۔

مگر اپنے تمام کمالات سلوک وتصوف میں اختصاص کے باوصف، حضرت مولانا نے خود کو چھپانے کی ہمیشہ اور آخری حد تک کوشش کی۔ حضرت مولانا نہیں چاہتے تھے کہ مولانا کے فضل وکمال اور روحانی نسبت وپرواز کا کسی کو پتہ چلے اور لوگ ان سے رجوع کریں۔ حضرت مولانا پر تواضع اور خود شکنی کا اس قدر غلبہ تھا کہ کسی کو بیعت کرنا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ چند علما اور اہل کمال بہ صد اصرار بیعت ہوئے اور انہوں نے حضرت مولانا سے امکان بھر استفادہ بھی کیا، بالآخر ایک وقت آیا کہ یہ متوسلین اس لائق ہو گئے کہ ان کو حصول نسبت کی بشارت دی جائے اور اجازت وخلافت سے نوازا جائے؛ مگر حضرت مولانا اس مرحلے پر بھی اپنی ذات کو پیچھے رکھنا اور ان متوسلین اور سالکان راہ طریقت کا ہاتھ اپنے شیخ ومرشد حضرت حاجی امداد اللہؒ کے ہاتھ میں ہی دے دینا چاہتے تھے، اور چاہتے تھے کہ میں خود کسی کو اجازت وخلافت نہ دوں۔ جس کے لیے بھی اس نعمت ودولت کا فیصلہ ہو، وہ حضرت پیر ومرشد کی زبان سے ہو؛ اس لیے حضرت مولانا کے جس متوسل کی سیر سلوک مکمل ہو جاتی، اس کو ہدایت فرماتے کہ وہ مکۂ مکرمہ حاضر ہو کر حضرت حاجی امداد اللہؒ کی

(۱) مرقوماتِ امدادیہ، ص: ۹-۴۸۔

(۲) ضیاء القلوب، مشمولہ کلیات امدادیہ، ص: ۶۰۔

خدمت میں اپنی کیفیت عرض کرے، اور خود حضرت کولکھ دیتے تھے کہ میں ان صاحب کواس لائق سمجھتا ہوں؛ مگر فیصلہ آں جناب کی صواب دیداور رائے عالی پر ہے، اگر اطمینان ہو، تو ان کو اجازت وخلافت سے سرفراز فرمائیں۔

حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے تقریباً تمام خلفائے کرام اسی طرح کے ہیں کہ اگر چہ ان کی تربیت واصلاح باطن حضرت مولانا کے زیر دامن ہوئی؛ مگر ان کو خلافت واجازت وبیعت کا پروانہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے ملا۔

انگریزوں کے خلاف برپا جدوجہد ۱۸۵۷ء میں شرکت:

ابھی مولانا کو تعلیم سے فارغ ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا کہ ہندوستان پر مسلط انگریزی حکومت واقتدار کے خلاف وہ جذبہ جو تقریباً پچاس برس سے عوام خواص کے دلوں میں پرورش پا رہا تھا، یک لخت شعلۂ جوالہ بن کر پھوٹ پڑا اور پورے ملک میں ۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ میں انگریزوں کی حکومت اور سیاست واقتدار کو اکھاڑ پھینکنے کے خلاف ایک پرزور جدوجہد شروع ہوگئی۔ اس موقع پر علما اور اہل باطن کے لیے دین وشریعت کی ذمے داری، مسلمانوں کی عام دینی ملی ضرورت اور وقت کے تقاضے سے غفلت ناممکن تھی؛ اس لیے اس ضمن میں ایک بڑی اور منظم آواز حضرت مولانا کے پیرومرشد حضرت حاجی امداد اللہؒ کے وطن تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) سے بھی اٹھی، جس میں حضرت حاجی امداد اللہؒ قائدانہ شریک تھے، اور حضرت حاجی صاحبؒ کے علاوہ حضرتؒ کے خاص خلفائے کرام اور متوسلین بھی ان کے دست وبازو بنے ہوئے تھے۔

یہ تحریک پوری منصوبہ بندی اور مستقبل کے مقاصد کو سامنے رکھ کر بلند حوصلے کے ساتھ برپا کی گئی تھی۔ اس تحریک کا اثر دہلی سے ملحق دریائے جمنا کے کنارے سے بڑھتا ہوا ہمالیہ کے دامن تک پہنچا، اور دہلی کے شمال مشرق کا تقریباً ساڑھے تین سو چار سو کلومیٹر علاقہ اس جدوجہد کا میدان بنا، جس میں ان مجاہدین نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے اور بہت اہم کامیابیاں بھی حاصل کیں۔

یہ تحریک جو پوری طاقت اور بڑے تدبر سے چلائی اور آگے بڑھائی گئی تھی، اور کیوں کہ عوام علما کی آواز پر لبیک کہتے تھے اس لیے ہر طبقے کے لوگوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا، اور اس کے زیر اثر مجاہدین کا انگریز افسران اور فوجوں سے ایسا پر پیچ اور کام یاب مقابلہ ہوا جس کی بعد میں خود دشمن افسران نے داد دی۔ اس فوج یا کمان کے ذمے دار کمانڈروں میں حضرت مولانا محمد قاسمؒ بھی شامل تھے۔ ان حضرات نے تھانہ بھون کے قریب ایک انگریزی فوج کے ایک نسبتاً چھوٹے کیمپ اور خزانے کو اپنا نشانہ بنایا، وہاں کام یاب

حملہ کیا، انگریز دستے کو شکست ہوئی اور اس پورے علاقے پر انگریزوں کا قبضہ اور اقتدار ختم کر کے مجاہدین کا پرچم لہرا دیا گیا۔ انگریز فوج کے سو سے زیادہ سپاہی اور افسر مارے گئے۔ ان کے اسلحہ خانے اور خزانے پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا، اور میدان جنگ کے ساتھ ہی یہ پورا علاقہ مجاہدین کے انتظام میں آ گیا تھا۔ اس جنگ میں حضرت حاجی امداد اللہؒ کے ایک پیر بھائی حافظ محمد ضامن تھانویؒ اور مسلمانوں کی ایک جماعت شہید ہوئی؛ مگر کچھ دنوں کے بعد انگریزوں نے تازہ دم فوج اور بڑی تیاری سے دوسرا حملہ کیا، جس میں مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا، یہاں تک کہ وہ تھانہ بھون کو بھی جوان کا مرکز تھا چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اس تمام معرکہ آرائی میں شروع سے آخر تک حضرت مولانا محمد قاسمؒ بھی برابر شریک رہے۔ جنگ کے دوران حضرت مولاناؒ کی ناک پر گولی لگی تھی، آخر عمر تک اس کا نشان موجود تھا۔

۱۸۵۷ء کی یہ جد وجہد اور تحریک ایک بڑی انقلابی اور نہایت دور رس تحریک تھی، جس نے اس وقت کے ہندوستان کے مزاج خصوصاً ہندی ملت اسلامیہ کو اس شدت، قوت اور گہرائی سے متاثر کیا کہ اب تک اس کے اثرات موجود ہیں۔ ہند و پاکستان و بنگلہ دیش کی ہر ایک دینی، علمی، سیاسی جد وجہد میں خصوصاً مسلمان اور دینی طبقہ ۱۸۵۷ء کی تحریک اور اس کے راہ نماؤں کے طریقۂ کار، تعلیمات اور اصولوں سے روشنی لے کر چلتے اور آگے بڑھتے ہیں، اور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک اور اس کے بعد سے آج تک مسلم سیاست اسی محور پر رقص کرتی رہی ہے۔

دارالعلوم اور مدارس اسلامیہ کا قیام اور ہندی ملت اسلامیہ کے دینی، علمی مستقبل کی تعمیر و تشکیل:

۱۸۵۷ء کی تحریک پسپا ہونے کے نتیجے میں انگریزوں کا دوبارہ تسلط قائم ہو گیا تھا، جو ان کی پہلی حکومت سے بہت زیادہ جابرانہ قاہرانہ تھا۔ اس کا ایک بہت بڑا اثر یہ ہوا تھا کہ اس تحریک میں شرکت کی سزا اور الزام میں لاکھوں علما اور اہل کمال پھانسیوں پر لٹکائے گئے، ہزاروں جلاوطن ہوئے، بے شمار لوگوں کو مختلف سزائیں دی گئیں اور ہزاروں حالات کی سختیوں سے مجبور ہو کر ہندوستان سے حرمین شریفین ہجرت کر گئے تھے، جس کی وجہ سے اکثر خانقاہیں برباد، مسجدیں ویران اور مدرسے بے نام و نشان ہو گئے تھے۔ حالات ایسے سخت اور ناقابل بیان تھے کہ کہنا مشکل ہے، نہ کسی کو زبان کھولنے کی اجازت تھی نہ آہ و فغاں کرنے کی۔ چوں کہ علمائے کرام اور دینی طبقے نے ۱۸۵۷ء میں انگریز کے خلاف معرکہ آرائی میں بڑا اور سرگرم حصہ لیا تھا؛ اس لیے اس تحریک کے ناکام ہونے کے بعد انگریزوں کے مظالم اور سزاؤں کا نشانہ بھی یہی بنے؛ لیکن حالات کی پکڑ کیسی ہی سخت کیوں نہ ہو، ملت کو بہر صورت اپنا راستہ خود متعین کرنا اور چلنے کے

لیے ایک طریقہ اور شاہ راہ عمل مقرر کرنی ضروری تھی۔ علمائے کرام سوچتے تھے کہ ملت ایک ایسے حادثے کا شکار ہوئی ہے کہ اگر فوراً اس کا بڑا، دیرپا مضبوط علاج اور مستقبل کی اکثر ضرورتوں میں راہ نمائی کرنے والی تدبیر اور طریقۂ کار وضع نہ کیا گیا، تو اس ملک؛ بلکہ پورے برصغیر میں مسلمانوں کا اور دینی اقدار و معاملات کا باقی رہنا مشکل ہو جائے گا۔ ان مشکل حالات میں جب کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقائے کرام نے اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے ملت ہندیہ کے لیے ایک ایسا نسخۂ صحت تجویز کیا، جس نے زخم خوردہ؛ بلکہ نیم جاں ملت اسلامیہ کو بڑی حد تک شفا بخشی اور اس کے زخموں سے چور چور جسم میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

یہ کام دیوبند میں ایک ایسے بڑے کثیر المقاصد اور خود کفالت پر مبنی مدرسے (دارالعلوم) کا آغاز تھا، جس نے اس ملک میں رہنے بسنے والے تمام مسلمانوں میں امید کی ایک شمع روشن کر دی تھی۔ عام مسلمانوں نے دیوبند سے اٹھنے والی اس آواز، اس تحریک، اس جدوجہد کی بھرپور آبیاری کی اور حضرت مولانا محمد قاسمؒ اور ان کے عالی مرتبت رفقا کے منصوبوں کو پورے حوصلے، جذبے اور اخلاص و دردمندی کے ساتھ آگے بڑھایا اور پروان چڑھایا۔ یہاں تک کہ وہ ایسا گھنا اور بافیض سایہ بن گیا کہ اب ہندوپاکستان کے مسلمان ہی نہیں؛ بلکہ پوری دنیا میں امت مسلمہ کا ایک حصہ اسی کے زیر سایہ اتباع شریعت وسنت، تعلیم قرآن و حدیث اور پیروئ دین کا سفر طے کر رہا ہے، اور یہ بات بلا تکلف کہی جا سکتی ہے کہ عصر حاضر میں کم سے کم ہند و پاکستان اور بنگلہ دیش میں کوئی بڑا دینی علمی ادارہ اور فکر صحیح اور عمل قرآن وسنت کا مرکز ایسا نہیں ہے، جس کا رشتہ دارالعلوم سے جڑا ہوا نہ ہو۔

اس مدرسے اور دارالعلوم کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دینی خدمت اور ایسے افراد و علما تیار کرنا تھا، جو آگے چل کر ملت کی زمام سنبھالیں اور ہندوستان کے سیاسی حالات میں اس کی ڈوبتی کشتی کو طوفان سے سلامت نکال کر دریا کے کنارے پر لانے کی جدوجہد کے لیے اپنی زندگی اور دوسرے تمام مقاصد فنا کر دیں، اور قال اللہ و قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بھولا ہوا سبق پوری ملت اسلامیہ کے کانوں اور دل میں پوری طرح اتار دیں۔

اس مدرسۂ دیوبند (دار العلوم) کا ۱۵رمحرم الحرام ۱۲۸۳ھ/ (۳۰رمئی ۱۸۶۶ء/جمعرات) کو بے سروسامانی کی حالت میں آغاز ہوا تھا۔ افتتاح کے وقت اس میں صرف ایک استاذ تھے، اور ان کے سامنے بیٹھنے والے دو تین طالب علم تھے۔ مدرسے کی کوئی عمارت تھی، نہ کچھ اور سامان۔ دیوبند کی ایک کئی سو سال

پرانی مسجد (چھتہ) کے صحن میں موجود انار کے ایک درخت کے نیچے اس کی ابتداً ہوئی تھی (۱)، مگر حق تعالیٰ شانہ کو اس مکتب و مدرسے کے بانیوں کا اخلاص، ان کی حسن نیت اور سادگی کا عمل کچھ ایسا پسند آیا کہ یہی چھوٹا سا مکتب اور مدرسہ آگے بڑھ کر ایک بڑا دار العلوم، ایک ممتاز عالمی درس گاہ، ایک بہت بڑی بہت کثیر المقاصد، بہت ہمہ جہت اور بہت دور اندیش تحریک ثابت ہوئی۔ اس مدرسے کے قیام نے برصغیر (ہند و پاکستان، بنگلہ دیش) کے دینی ماحول میں امیدوں کے چراغ روشن کر دیے، اور پوری ملت اسلامیہ کو ایک واضح طریقۂ عمل اور ایسی شاہ راہ مستقیم عنایت کر دی کہ برصغیر کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی باشعور اور دین دار اکثریت اس کے سائے میں سفر کر رہی ہے۔

دیوبند کے مدرسے کے قیام اور دینی تعلیم جاری ہونے اور اس کے باقاعدہ عمدہ انتظام کی اس قدر پذیرائی، تحسین اور پر جوش تعاون ہوا کہ مدرسۂ دیوبند کے بلند مرتبہ راہ نماؤں میں سب سے ممتاز شخصیت حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے مختلف مقامات پر اسی قسم کے پانچ مدرسے اور قائم کیے۔ ان سے بھی اس طرح علم اور دین پر عمل کا چرچا شروع ہوا، اور ان میں ہر ایک مدرسے نے دار العلوم دیوبند کے مقاصد، طریقۂ تعلیم اور دینی عقیدہ و نظریات کو اپنا راہ نما قرار دیا، اور پھر یہ مدرسے بھی بڑھتے بڑھتے گھنے درخت بن گئے اور اب ان مدرسوں کے تعلیم و تربیت یافتہ لاکھوں افراد، خصوصاً ہندوستان اور عموماً دنیا کے گوشے گوشے میں دینی، اصلاحی، تبلیغی، ملی خدمات پورے اطمینان اور توجہ سے انجام دے رہے ہیں۔

دار العلوم صرف ایک مدرسہ ہی نہیں؛ بلکہ علمی و عملی تحریک بھی تھی:

دار العلوم دیوبند جس کی ابتدا مسلمانوں کو دین و شریعت سے جوڑنے اور علوم نبوی کے احیا کے لیے ہوئی تھی، بعد میں ایک بڑی، بہت بافیض، بہت طاقتور اور کثیر الجہت تحریک بن گئی تھی۔ جس نے اس برصغیر میں مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ دینی فکر و مزاج، اتباع شریعت و سنت، علوم اسلامیہ کی خدمت و آب یاری، وعظ و ارشاد، اصلاح و تربیت، تذکیر و تصنیف، حکومت و سیاست، اختلاف نظریات و عقائد، کلام و معقولات، یعنی برصغیر کی ملت اسلامیہ کی عمومی زندگی اور شعور کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے، جس کو دار العلوم دیوبند کی تحریک نے متاثر نہ کیا ہو، اور آج جب دار العلوم کو قائم ہوئے تقریباً ڈیڑھ سو سال ہو چکے ہیں، دار العلوم کی آواز، اس کا پیغام اور اس کے نظریات و تعلیمات دنیا کے کونے کونے میں پہنچ چکے ہیں۔ دنیا کا شاید کوئی ملک اور خطہ ایسا نہیں ہے، جہاں دار العلوم دیوبند سے استفادہ کرنے والے، وہاں کے فارغ

(۱) دار العلوم دیوبند کی تاریخ اردو، عربی اور انگریزی میں بارہ تیرہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ تفصیلات ان میں درج ہیں۔ (ارشد)

طلبہ، علما اور دار العلوم سے وابستہ ارباب فضل وکمال نہ پہنچے ہوں، اور اس خطے کی دینی، علمی، اصلاحی فضاؤں پر اپنے گہرے نقوش نہ ثبت کیے ہوں۔

دار العلوم اب ایک ادارہ نہیں، ایک عالم گیر دعوت ہے، ایک تحریک ہے، ایک جدوجہد ہے، ایک نصب العین ہے، جس کے ساتھ مقاصد و مستقبل کی تعمیر کا ایک بامعنی خوب تجربہ کیا ہوا، اور ایسا طریقۂ عمل ہے کہ اس کی ایسی جامع، مؤثر، دیرپا اور عالم گیر اثر انداز مثال تلاش کر لینا آسان نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دار العلوم کی اس آفاقیت، ہمہ گیریت، مقاصد کے تنوع اور بلند نگہی اور تاثیر و نفع میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا بہت بڑا اور خاص حصہ ہے۔ اگر مدرسۂ دیوبند کو اول دن سے حضرت مولانا کی سرپرستی اور رفاقت حاصل نہ ہوتی، تو ممکن تھا کہ یہ بہت اچھا مدرسہ بن جاتا؛ مگر اس کا ملت اسلامیہ کا ''حصن حصین'' اور ہر طرح کے مصائب و مسائل میں ملت کی پناہ گاہ اور امیدوں کا مرکز بننا مشکل تھا۔

دیگر دینی خدمات:

حضرت مولانا محمد قاسمؒ دینی ملی معاملات میں اعلیٰ درجے کے صاحبِ فکر، حساس اور دردمند عالم تھے۔ حضرت مولاناؒ کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی اہم دینی ملی معاملہ سامنے آئے اور وہ خاموش بیٹھے رہیں۔ درس و تعلیم کی مسند ہو، خانقاہ و ارشاد کی تعلیمات ہوں، وعظ و اصلاح کا میدان ہو، تصنیف و تالیف کی جلوہ فرمائی ہو، مناظرہ و مباحثہ کی ضرورت ہو، یا دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کے اسلام و شریعت پر سوالات و اعتراضات کا جواب، حضرت مولاناؒ ہر ایک میں نمایاں اور پیش پیش رہتے تھے۔ جہاں جس طرح کی ضرورت ہو، اس کا بروقت احساس اور اس کا ویسا ہی علاج اور دفاع فرماتے تھے، جیسی ضرورت و تقاضہ ہو۔ مسلمانوں کے وہ طبقات ہوں، جو عقائد و کلام کے معاملات میں راہ سے بے راہ ہو گئے تھے، یا بدعات و رسوم کے خوگر افراد ہوں، اہل تشیع یا کوئی اور! دینی معاملہ، عقیدۂ سلف و اہل سنت سے انحراف کی بات ہو، یا دین و شریعت کے مسائل و مباحث اور عقائد کے کلام کی گفتگو ان کو قرآن و سنت سے حل کرنے اور ان کی عقلی توجیہ کی ضرورت، حضرت مولاناؒ کا ہر ایک میں سرگرم اور بڑا حصہ رہتا تھا۔

اس دور میں خصوصاً عیسائیوں اور ہندوؤں کی ایک نوزائیدہ جماعت ''آریہ سماج'' نے خصوصاً اسلام کے خلاف ایک پرزور محاذ کھولا ہوا تھا، ان کے پادری اور پنڈت جگہ جگہ عیسائیت اور ہندو مذہب کی منادی کرتے، مسلمان علما کو مناظرے کا چیلنج دیتے اور عیسائیت و اسلام کے مسائل و موضوعات پر بحث و گفتگو کے لیے چھیڑتے تھے۔ حضرت مولاناؒ ان کا مقابلہ کرنے، جواب دینے اور ان کے اعتراضات کی حقیقت واضح

کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ جہاں علی الاعلان بحث و مقابلے کی بات ہوتی، وہاں اس کا اہتمام کرتے۔ جہاں لکھنے اور گلی کوچوں میں اطلاعات کا کام ہوتا، وہاں اس کا انتظام فرماتے تھے۔

حضرت مولاناؒ کے عیسائی پادریوں اور ہندو پنڈتوں سے کئی نہایت کامیاب مناظرے بھی ہوئے، جس میں عیسائیوں سے ''مباحثۂ شاہ جہان پور'' اور مشہور ہندو سماجی مصلح اور مذہبی پیشوا سوامی دیانند سرسوتی سے گفتگو اور جوابات کی ملک بھر میں شہرت ہوئی، بعد میں حضرت مولاناؒ نے ان مباحث میں پیش آنے والے، سوالات پر کتابی صورت میں لکھا، ان میں سے ہر ایک تصنیف اپنی جگہ جوئے رواں اور علم وبصیرت کا شاہ کار ہے۔

حضرت مولاناؒ نے اپنی کتابوں میں قرآن مجید، حدیث، سنت وشریعت کی جو گرہ کشائی فرمائی ہے، کہا جاسکتا ہے کہ وہ حضرتؒ کا ایک منفرد حصہ ہے۔ خصوصاً شریعت اور عقائد واعمال کی حکمتوں اور اسرار وحکم پر حضرت مولاناؒ کے افادات وتحریرات ایک نئے اور مستقل علم کلام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان سب کا جامع مطالعہ کرکے ایک لڑی میں پروکرامت کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس سے نہ صرف ہمارے عقلی کلامی ذخیرے میں ایک وقیع اضافہ ہوگا؛ بلکہ اس کی اساس پر اور بھی کئی مشکل مباحث حل کیے جاسکیں گے۔

حضرت مولانا کی تصانیف اور مکتوبات:

جیسا کہ میں نے عرض کیا، حضرت مولانا کے علوم اور تحقیقات وتحریرات کا دائرہ خاصا وسیع اور مختلف موضوعات ومضامین پر مشتمل ہے۔ اگرچہ حضرت مولاناؒ کی تصانیف شمار میں بہت زیادہ نہیں ہیں؛ مگر جس قدر بھی ہیں، ان میں سے ہر ایک دریا بہ کوزہ کی عمدہ مثال ہے۔ یہ کتابیں زیادہ تر اردو میں ہیں؛ لیکن چند فارسی میں بھی ہیں۔ یہاں ان کے مفصل تعارف کا موقع نہیں؛ لیکن ان کے نام اور موضوعات کا مختصر تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ تصانیف یہ ہیں:

(۱) قرآن مجید اور علوم القرآن:

۱- تصحیح قرآن شریف (برائے طباعت) مطبع مجتبائی میرٹھ، ۱۲۸۱ھ/ ۶۵-۱۸۶۴ء۔

۲- تصحیح حمائل شریف مع موضح قرآن، مطبع مجتبائی میرٹھ۔

۳- اسرار قرآنی، گلزار احمدی مرادآباد، ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء۔

(۲) حدیث اور متعلقات:

۴- بخاری شریف، شرکت در تصحیح وحواشی حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ، مطبع سید الاخبار،

دہلی و مطبع احمدی دہلی، ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء، ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء۔

۵-رسالۂ تقریر حدیث: **فضل العالم كفضلي على ادناكم**

(۳) فقہ واسرار شریعت:

۶-احکام الجمعہ، رام پریس میرٹھ، ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء۔

۷-اسرار الطہارۃ، مطبع قاسمی دیوبند۔

(۴) عقائد وکلام:

۸-تحذیر الناس، مطبع صدیقی بریلی، تقریباً ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء۔

۹-حجۃ الاسلام، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء۔

۱۰-گفتگوئے مذہبی، مطبع ضیائی میرٹھ، ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء۔

۱۱-مناظرۂ عجیبہ، گلزار ابراہیم مرادآباد۔

(۵) غیر مقلدین کے نظریات ودلائل کی تردید:

۱۲-**ألاجوبة الكاملة في الاسولة الخاملة**، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء۔

۱۳-**الدليل المحكم على قراءة الفاتحة للمؤتم**، گلزار احمدی مرادآباد، ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء۔

۱۴-**توثيق الكلام فى الانصات خلف الامام**، مطبع ہاشمی میرٹھ، ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء۔

۱۵-**حق الصريح فى اثبات التراويح**، مطبع عین الاخبار مرادآباد۔

۱۶-**مصباح التراويح**، مطبع ضیائی میرٹھ، ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء۔

(۶) شیعیت کے جواب میں:

۱۷-اجوبۂ اربعین، مطبع ضیائی میرٹھ، ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء۔

۱۸-ہدیۃ الشیعہ، مطبع ہاشمی میرٹھ، ۱۲۸۴ھ/ ۶۸-۱۸۶۷ء۔

۱۹-انتباہ المؤمنین، مطبع احمدی میرٹھ، ۱۲۸۴ھ/ ۸-۱۸۶۷ء۔

(۷) عیسائیت کی حقیقت:

۲۰-تقریر دل پذیر، مطبع احمد دہلی، ۱۲۹۹ھ/۱۲۲۳ء۔

۲۱-مباحثۂ شاہ جہان پور، مطبع احمد دہلی، ۱۲۹۹/ ھ۱۸۸۲ء،

(۸)ہندوؤں کے اسلام پر اعتراضات کا جواب:

۲۲-آب حیات، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء۔

۲۳-انتصار الاسلام، اکمل المطابع دہلی، ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء۔

۲۴-تحفۂ لحمیہ، مطبع صدیقی بریلی۔

۲۵-جواب ترکی بہ ترکی، مطبع ہاشمی میرٹھ، ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء۔

۲۶-قبلہ نما، اکمل المطابع دہلی، ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء۔

(۹)شعروادب:

۲۷-قصائد قاسمی، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۰۹ھ/ ۹۲-۱۸۹۱ء۔

(۱۰)فلسفہ:

۲۸-تقریر ابطال جزولا یتجزی، مطبع مجتبائی دہلی۔

(۱۱)عقلیت پسندوں کا جواب:

۲۹-تصفیہ العقائد، مطبع ضیائی، ہاشمی میرٹھ، ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء۔

(۱۲)مکتوبات:

۳۰-قاسم العلوم، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء۔

۳۱-لطایف قاسمیہ، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ھ۔

۳۲-جمال قاسمی، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۰۹ھ/ ۹۲-۱۸۹۱ء۔

۳۳-فرائد قاسمیہ، ادارۂ ادبیات دہلی، ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء۔

۳۴-فیوض قاسمیہ، مطبع ہاشمی میرٹھ، ۱۳۰۴ھ/ ۸۷-۱۸۸۶ء۔

خلافت اسلامیہ ترکی اور خلیفۃ المسلمین سے گہرا تعلق:

خلیفۃ المسلمین اور باب عالی ترکی سے ہندوستانی مسلمانوں کے عوام وخواص کی مغل دور حکومت سے گہری وابستگی اور خلافت اسلامیہ سے اپنی نیازمندی کا اظہار ہندوستانی مسلمانوں کے احوال وتاریخ سے واقف اصحاب پر مخفی نہیں۔ باب عالی نے بھی ہندوستان کے جلیل القدر علما کی قدردانی اور عزت افزائی میں

کمی نہیں کی، خصوصاً آخری دور میں جب عالم اسلام پر مغرب کی یلغار ہوئی اور مغربی طاقتوں نے ترکی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو نقصان پہنچانے اور اس کی سرحدوں میں مداخلت شروع کی اس وقت ہندی مسلمانوں پر عجیب اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ وہ کسی بھی طرح سلطان ترکی کی مدد کرنا چاہتے تھے اور خلافت اسلامیہ کو درپیش خطرات اور فوجوں سے مقابلے کے لیے اپنی ہر طرح کی جانی مالی قربانی پیش کرنے کی آرزو رکھتے تھے۔ ایسے موقعے کئی مرتبہ پیش آئے، ہر مرتبہ مسلمانوں کا اجتماعی تأثر اور ردِّعمل یہی ہوا۔

ایسا ہی ایک نازک موقع اس وقت سامنے آگیا تھا، جب ۱۸۷۴ء/(۱۲۹۴ھ) میں روس نے ترکی پر حملہ شروع کر دیا تھا اور بلقان کے علاقے میں پُرزور جنگ شروع ہوگئی تھی، اور خلافت عثمانیہ کے کئی علاقے اس کے قبضے سے نکل کر روس کے ہاتھ میں چلے گئے تھے۔

بلقان کی جنگ روس کی ترکی کے ساتھ اپنے معاہدوں کی صاف خلاف ورزی کر کے ترکی کے علاقوں پر حملہ اور فوج کشی سے شروع ہوئی تھی۔

روس کی حکومت سے خلافت ترکی کا مارچ ۱۸۵۶ء/(رجب ۱۲۷۲ھ) میں پیرس میں معاہدۂ امن ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے حکومت ترکی روس کی طرف سے کسی لڑائی سے مطمئن تھی؛ مگر روس کی حکومت نے کھلی معاہدہ شکنی کی اور ۱۸۷۴ء/(۱۲۹۱ھ) میں خلافت عثمانیہ کی ریاستوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ چوں کہ حکومت ترکی اپنے معاہدے کی وجہ سے روس کی طرف سے مطمئن تھی اور یہ حملہ نہایت بے خبری میں ہوا تھا؛ اس لیے ترکی حکومت کا نقصان ہوا، اور اس کے کئی علاقے ایک کے بعد ایک اس کے ہاتھ سے نکلتے چلے گئے۔

یہ حادثہ اور نقصانات ایسے نہیں تھے کہ ہندوستانی مسلمان اس سے بے خبر رہتے اور متاثر نہ ہوتے، جیسے ہی یہ خبر ہندوستان پہنچی، تمام مسلمان اور خصوصاً علمائے کرام، وہ علما جو ملی درد رکھتے تھے، خصوصاً مدرسۂ دیوبند کے بانیان کرام اور علما پر اس کا غیر معمولی اثر ہوا۔ ان حضرات نے حکومت ترکی کے تعاون کے لیے کئی منصوبے بنائے، جس میں سب سے پہلے مالی تعاون کی فکر تھی۔ اس کے لیے حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے کوشش فرمائی، لشکر عثمانی کے زخمیوں کے لیے ''چار ہزار روپے'' چندہ کر کے روانہ کیے۔ یہ رقم کئی قسطوں میں بمبئی میں مقیم دولت عثمانیہ کے قونصلر جنرل (Counsellor General) حسین حسیب آفندی صاحب کو بھجوائی گئی۔ قونصلر جنرل صاحب نے اس کی رسید بھجوائی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور علمائے کرام کو شکریے کا مفصل خط لکھا، جس کے الفاظ یہ تھے:

''جناب فضل مآب حاجی محمد عابد صاحب و جناب مولوی محمد یعقوب صاحب و مولوی محمد

قاسم، مولوی محمد رفیع الدین صاحب۔ مہتمانِ مدرسۂ عربی دیوبند سلّمۂ اللہ تعالیٰ!

بعد سلام مسنون الاسلام! موضوح باد کہ مکتوب بہجت اسلوب آں حضرات مع مبلغ ایک ہزار دوصد روپیہ نوٹ بنگالی، کہ بہ مراد ارسال آں بہ باب عالی برائے مجروحین وایتام دار اہل عسا کرہ منصورہ صرف شود، مرسول بود، موصول گردید۔

حقیقتاً مساعی جمیلہ آں حضرات کہ بہ مقتضائے حمیت دینیہ بہ ظہور آمدہ، مستحق ممنونیت مشکوریت ہست، و بہ حول اللہ تعالیٰ مبلغ مذکور حسب خواہش بہ باب عالی تبلیغ می کنم، ورسیدی کہ از آں جامی رسد، درعقب موصول آں حضرات خواہد شد و در جوائب ہم نشر خواہد گردید۔ وہم چنیں ہر مبلغے کہ حسب تحریر ایشاں رسیدہ باشد، ان شاء اللہ تعالیٰ! مع الافتخار در تبلیغ آں دریغ نہ خواہد وداد۔ زیادہ!

والسلام

مورخہ ۱۰ محرم الحرام ۱۲۹۴ھ (۲۵ جنوری ۱۸۷۷ء)

حسین حسیب

سر شہ بندر، دولت عثمانیہ علیہ۔ در بمبئی"

حسین حسیب آفندی کو دوسری مرتبہ رقم پہونچی، تو انہوں نے ان الفاظ میں شکریہ ادا کیا:

"جناب فضائل مآب مولوی محمد قاسم صاحب و مولوی محمد یعقوب صاحب و مولوی محمد رفیع الدین صاحب و محمد عابد صاحب، مہتمان مدرسۂ عربی دیوبند، سلمہم اللہ تعالیٰ!

بعد سلام مسنون الاسلام! مشہود باد کہ مبلغ دوصد روپیہ بابت اعانت عسا کر، قسط دوم کہ ارسال فرمودند، موصول گردید، وروانہ کردہ شد، خاطر شریف جمع دارند۔ وآں چہ از اظہار مہربانی ہا کہ بہ نسبت من فرمودہ اند، گویا بہ لسان حال من اظہار بزرگی و شرف خود فرمودہ اند، ایزد تعالیٰ توفیق خیر مزید گرداند۔

والسلام

سر شہ بندر، دولت علیہ عثمانیہ، در بمبئی

۱۶ صفر الخیر ۱۲۹۴ھ (۲ مارچ ۱۸۷۷ء)"

اس کے بعد حضرت مولانا موقع بہ موقع رقومات اکٹھی کر کے بمبئی عثمانی قونصل خانے بھیجتے رہے اور وہاں سے رسیدیں اور شکریے کے خطوط موصول ہوتے رہے(۱)، اس طرح کے کئی اور خطوط بھی معلوم ہیں، مثلاً:

مکتوب: ۱۵؍ جمادی الاول ۱۲۹۴ھ/ ۱۴؍ مئی ۱۸۷۷ء۔
مکتوب: یکم جمادی الاخری ۱۲۹۴ھ/ ۱۳؍ جون ۱۸۷۷ء۔
مکتوب: یکم جمادی الاخری ۱۲۹۴ھ/ ۱۳؍ جون ۱۸۷۷ء (مکرر)
مکتوب: ۲؍ رجب ۱۲۹۴ھ/ ۱۳؍ جولائی ۱۸۷۷ء۔
مکتوب: ۳؍ رجب ۱۲۹۴ھ/ ۱۴؍ جولائی ۱۸۷۷ء۔

ان رقومات کے ملنے کی باب عالی سے بھی اطاعات آئیں۔ آخر میں خلافت عثمانیہ کے وزیر اعظم ابراہیم ادہم کا ذاتی خط موصول ہوا، جس میں حضرت مولانا، ان کے رفقا اور معاونین و چندہ دینے والوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا خط یہاں نقل کر دیا جائے۔

وزیر اعظم خلافت عثمانیہ کا شکریے کا خط:

واضح ہو کہ دفتر خاص باب عالی، شہنشاہ، ظل الٰہی، سلطان دوم، خلد اللہ ملکہ سے بھی رسیدات آئیں، چوں کہ وہ زبان ترکی میں ہیں، ان کا تلفظ اور تفہیم دشوار ہے؛ اس لیے انہیں نقل نہیں کیا؛ مگر شکریہ وزیر اعظم سلطنت روم باب عالی سے بہ عبارت فارسی عز ورود دلایا اور باعث افتخار ہندوستان ہے۔ نقل کرتے ہیں:

''شکریہ از جانب دستور معظم، صدر اعظم، جناب ابراہیم ادہم صاحب بہادر، لازوال ظل کرمہٗ جناب مدرسانِ مدرسۂ دیوبند، ضلع سہارن پور، فضیلت مآبان صاحب!

اعانت نقدیہ بہ جہت اولاد وعیال عساکر شاہانہ، کہ در جنگ سربستان شربت شہادت نوشیدہ بودند، پیش ازیں فراہم آوردہ ارسال فرمودہ بودید، بہ تمامی واصل گردید۔ برائے توزیع آں باب استحقاق بہ انجمن مخصوص تسلیم نمودہ شد، و ازیں ہمت فتوت مندانہ کہ مجرد از غیرت دینیہ وحمیت اسلامیہ شما بہ وقوع آمدہ است، ہمہ وکلائے دولت علیہ عثمانیہ فرحناک گشتہ، وعلی الخصوص بہ درجۂ کمال ہادی خوش نودیت ایں مخلص بے ریا گردیدہ است۔

مبلغ مرسول علاوہ برآں کہ بہ اضطراب محتاجین تخفیفے بہم رسانیدہ، کسانے کہ ازیں اعانت حصہ دار شدند بہ ملاحظہ آں کہ در ممالک بعیدہ و ہندوستان برادران دینی ہستند کہ بر حال پر ملال

(۱) ان عطیات و رقومات کی تفصیل خلافت ترکی کے سرکاری ترجمان روزنامہ ''الجوائب'' میں چھپتی رہی، جس کا حسین حسیب صاحب قونصلر کے خطوط میں بھی اشارہ ہے، اور ان تمام رقوم کی مفصل روداد ترکی کے قونصل خانے نے کتابی صورت میں بھی شائع کی تھی، جس پر ''دفتر اعانت ہندیہ'' چھپا ہوا تھا۔ (ارشد)

بہ چشم تاسف نگاہ می کنند، و بر زخم ہائے کہ از دشمنان دیں خوردہ ایم، مرہم تسلیت می نہند، اظہار مزید شکرانیت کردند و اشک رقت ریختہ حصہ خود شاں را گرفتند، بنا بریں از جناب رب مستعان کہ نصیر وظہیر یگانہ گویان است، التماس آں دارم کہ سعی جمیل شما عنداللہ مشکور گشتہ، در دنیاو عقبیٰ مظہر اجر جزیل باشید۔

والسلام

۹ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۴ھ (۲۲ر جون ۱۸۷۷ء)

عن دار الخلافۃ العلیہ العثمانیہ(۱)

وزیر اعظم ابراہیم ادہم

حضرت مولانا قاسمؒ اور ان کے رفیق علما نے اس وقت وزیر اعظم حکومت عثمانیہ (ابراہیم ادہم) کے خط کا جو مفصل جواب لکھا تھا اور اظہار ممنونیت کیا تھا، اس کی سطر سطر سے علمائے ہند خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسمؒ اور ان کے ہم نوا علما کی عثمانی حکومت اور خلافت اسلامیہ سے گہری محبت وانسیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ خط مفصل ہے؛ اس لیے یہاں اس کا ایک اقتباس پیش ہے، اسی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ اور ہندوستان کے عام مسلمانوں کی نگاہوں میں خلافت اسلامیہ کا کیا بلند مرتبہ ہے اور وہ اس سے کس قدر گہری وابستگی رکھتے تھے۔ حضرت مولاناؒ نے لکھا تھا:

''روز جمعہ پانزدہم رجب ۱۲۹۴ر ہجری علی صاحبہا الف الف صلاۃ وسلام، فرمان والاشان کہ ہم چو نامۂ اعمال اصحاب الیمن، تسلی بخش دل ہائے اندوہ گیں بود، نزول اجلال بہ سر وچشم ذلیلان پراگندہ حال فرمودہ۔ ذرہائے بےمقدار را از خاک ذلت بہ آسمان عزت رسانید وخاک نشینان تیرہ بخت را رشک خورشید جہاں تاب گردانید۔ شکر ایں منت علیا از زبان از کجا آریم کہ اول متاع قلیل ہماں، یگان ذلیل راز یرنگاہ قبول جاداند، وسپاس ایں عنایت عظمیٰ چہ گونہ گزاریم، کہ باز بہ ارسال فرمان جلی لمتضمن قبول آں مایہ قلیل، افتادگان خاک ذلت را بر چرخ نشانند:

زقدر وشوکت سلطان نگشت چیزے کم
کلاہ گوشۂ دہقان بہ آسمان رسید

(مسرت) عید بہ ایں روز مبارک نرسد، کہ طراز رشک ہلال نور افزائی دل و دیدہ ہندیاں خوار گردید، و بخت ہمایوں بہ ایں طالع نکو پہلو نزند، کہ ہمارے اوجِ سعادت بال بسر بےسروسامان زارونزار کشید:

(۱) یہ تمام تفصیلات اور متعلقہ خطوط، تفصیل ''روداد چندہ بلقان'' کے نام سے اسی وقت مطبع ہاشمی میرٹھ سے ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء میں چھپ گئی تھیں، اس کا نسخہ موجود ہے۔ (ارشد)

در ہر ذرہ آفتاب آمد بحر در خانہ حباب آمد
گرد بودیم رشک نور شدیم بر در قرب ذرہ دور شدیم؟
قطرۂ زار شد در نایاب ذرہ خوار شد خور و مہتاب

افسوس نہ خزانہ قارون است کہ بریں سرفراز نامہ نثار سازیم ونہ بخت ہمایوں است تا بہ مدحش بجائے جان درسینہ نہیم، واز جان پرداز یم۔از بے خبری قطرہ بہ دریا سپردیم؛ مگرز ہے عنایت کہ ہم چو دریا باغوشش کشیدند، واز ے بے عقلی ذرہ پیش آفتاب بہ رویم؛ مگرز ہے کرم کہ بہ نورنظر عنایت رشک ماہ وکواکب گردانیدند''۔

جنگ بلقان کے لیے حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقا کا سفر حجاز:

حضرت مولانا محمد قاسمؒ اور ان کے اصحاب کو خلافت عثمانیہ سے جو وابستگی تھی، اس کا حق اور تقاضا تھا کہ خلافت سے وابستگی اور دینی وملی درد رکھنے والے اصحاب چندہ مالی اور تعاون سے آگے بڑھ کر کوئی اقدام کریں۔علمائے دیوبند اور حضرت مولانا محمد قاسمؒ اس میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ جب جنگ کی خبریں کثرت سے آتی رہیں، تو ان حضرات نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں خود جا کر دیکھنا ہے، اور اگر ضرورت ہو، تو جہاد میں عثمانیہ لشکر کے ساتھ شریک ہونا ہے۔

اس مقصد کے لیے سب سے پہلے سفر حج (حجاز) کا ارادہ کیا گیا، اس کارواں میں جو اس مقصد کے لیے تیار ہوا تھا، علمائے کبار کی ایک بڑی جماعت شامل تھی، جس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفیق ومعاون حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی شریک تھے۔اس سفر کا پورے ملک میں چرچا ہو گیا تھا، اور عام طور پر یہی سمجھا جا رہا تھا کہ یہ حضرات سفر حج کے پردے میں بلقان کی جنگ میں شرکت اور سلطان ترکی کی مدد کے لیے جا رہے ہیں۔مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے لکھا ہے:

''عام اہل اسلام نے جب دیکھا کہ دفعتاً خلاصۂ ہندوستان بہ جانب حجاز جا رہا ہے، (اس لیے) جس سے بھی ہوسکا، وہ معیت وہم رکابی کے لیے تیار ہو گیا؛ اس لیے کہ بہ طور خود لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ حضرات دینی معاونت کے لیے بہ حیلۂ سفر حجاز حقیقت میں ملک روم کا سفر کر رہے ہیں۔ترکی سلطنت کی طرف سے والنٹیر جماعت میں شامل ہو کر مجاہد فی سبیل اللہ بنیں گے، اور جس کے نصیب میں مقدر ہے جام شہادت پی کر حیات ابدی حاصل کرے گا''(۱)۔

(۱) تذکرۃ الرشید، طبع اوّل۔

حضرت مولانا محمد قاسم کے ایک بڑے شاگرد اور علمی وعملی جانشین شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے شاگرد اور سوانح نگار مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ نے بھی تقریباً یہی ظاہر کیا ہے:

''۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں بھی جب علمائے ہندوستان کا مشہور قافلہ جنگ روم وروس کے زمانے میں روانہ ہوا تو لوگوں نے خود بہ خود ایسی ہی توجیہات شروع کر دی تھیں''[1]۔

ابھی یہ حضرات مکۂ مکرمہ میں تھے کہ پلونا پر روس کے قبضے کی خبر پہنچی، جس سے سب کو بہت افسوس ہوا؛ مگر مکۂ مکرمہ میں اخبارات کا سلسلہ بند تھا، اس خبر کی تصدیق باقی تھی؛ اس لیے حضرت حاجی امداد اللہؒ کی ہدایت ومشورے کے مطابق مجبوراً واپسی کا ارادہ کرلیا۔ بہ ظاہر ان حضرات کے سفر کی صورت نہیں ہوئی، اگر ہوتی تو یہ حضرات مکۂ مکرمہ سے ترکی جاتے اور وہاں سے محاذ جنگ (بلقان) پہنچنے کی کوشش فرماتے۔

سلطان عبدالحمید خاں کی شان میں قصیدہ:

حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی خلافت عثمانیہ سے محبت وارادت مندی کا ایک بڑا مظہر حضرت مولاناؒ کا ایک قصیدہ ہے، جو اس وقت لکھا گیا تھا، جب بلقان کی جنگ ہو رہی تھی، اور یہ سب علما ترک حکومت کے لیے مالی تعاون اور رقوم کی فراہمی میں دل وجان سے مشغول تھے۔

یہ قصیدہ حضرت مولاناؒ اور ہندی مسلمانوں کی خلافت عثمانیہ سے وابستگی کی ایک علامت اور ایک بڑا خراج تحسین اور اظہار نیاز مندی بھی ہے۔ کہنا چاہیے کہ حضرت مولاناؒ کے الفاظ میں پوری قوم کے جذبات جھلک رہے ہیں، ملاحظہ ہو:

---

(۱) حیات شیخ الہندؒ ص: ۴۰۔

قصيدة الإمام محمد قاسم النانوتویؒ
في مديح السلطان عبدالحميد خان

نفسي وما بيدي فدى لجمالكم	إن متُّ دونكم فمَن لدلالكم
أنسيتم أيام حسن خصالكم	أيام كان حياتنا بوصالكم
إذا أنت دون النفس و هي بعيدة	متنا مرارًا بالسرور هنالكم
أيام تغنون العيون من الذُّكا	وتراودن الطرف مذ إظلالكم
شوقي يسوق إليكم ثم يعوقني	عذل العواذل واحتمالُ ملامكم
ما في غير الاسم إلا أنني	لأسير سير الظل خلف جمالكم
صرنا كآثار الخطى أو دوننا	أفما بلغنا منتهى آمالكم
صرنا كآثار الخطى وهم لو	لم نرض إلى منتهى آمالكم
قتلتنا قتل العدو فقل لنا	هذا دلال أم جزاء خلالكم
مذغبتَ عن عينيّ طالت ليلتي	أم أظلم الأيام دون جمالكم
فسواد ظلك فاق أنوارًا كما	عكس الذّكاء يُرى كدورة خالكم
هذا الجمال ولا جمال يفوقه	عبد الحميد أظن في تمثالكم
سِرُّ الكرام البيض وابن صميمهم	و سلالة الأشراف زبدة آمالكم
لو كنت فيه بمسمع أو منظر	لعرضت يا من شاع صيت نوالكم
الناس أطوار ولكن أين ما	بجمالكم وجلالكم وكمالكم
لا تسلون وقد فننت بهجركم	أفما فرغتم بعد من إدلالكم
دعنا نموت تحسّرًا فإلى متى	إدلالكم والخبر عن إقبالكم
لله دركم بني عثمان لو	هذا دليل جمالكم وجلالكم
شمس الضحىٰ بحر الندىٰ أسد الوغىٰ	لا فضل إلا وهو في أفضالكم
قد غرّ طاغوت النصارى حلمكم	ومكارم الإخلاق دون نزالكم

لو لاه ما طمع النصارى فيكم	فأروا بسالتكم و حد نضالكم
فسيندمون و لات حين ندانة	إذ قد تبدي ناجذا أهوالكم
ربما سبقتم موتهم فلو أنهم	ماتوا فما يغني من استقبالكم
الخيل خيلكم اعزن وما استوىٰ	نقع أثارتها إلى أذيالكم
فاتت حقول جنودهم فرسانكم	فوت المحال عقولكم و مثالكم
طارت إليهم خيلكم فعقولهم	طارت كمثل المال من أفضالكم
قد أوقدوا نار الوغىٰ حتى إذا	حمى الوطيس و لا برق نضالكم
برود كما قتلوا بها فاستدفؤوا	بالنار أم هانت بجنب نكالكم
لا يهربون من المنايا إن أتت	و إذا أتيتم أدبروا كنبالكم
لجاؤا إلى النيران لما عاينوا	بأسًا شديدًا من وراء نضالكم
خذهم أمير المؤمنين فإنهم	بدأ واو قد غدروا على إمهالكم
فإلى متى هذا التلطف و الأسىٰ	و إلى متى إصلاحهم بمقالكم
يا خادم الحرمين حامي ملة	بيضاء فوق وجوهكم و بخالكم
قو أعزة الحرمين شر جماعة	ليس مذل لهم سوى أبطالكم
قر أعزة الدين القويم و أهله	بالهمة العليا كذِرْوَةِ خالكم
هذا أوان قيامكم بدفاعهم	لا زال عزتكم و عزة آلكم
الله ناصركم فبدد جمعهم	شرد بهم من خلفهم لقتالهم
لو لا مهالک في مهالک دونکم	من دونها أخرىٰ و هن كذالكم
و موانع و علائق و عوائق	عاقت مني عرض المنى بحيالكم
لرايتنا و نحورنا كسيوفكم	من دون نحركم عصمة لآثالكم
نعدو إليهم موجعين نقول يا	أعداء أنفسكم عداة عيالكم
إن كان بغيتكم ببغيكم	فرماحنا تعلى رؤس رجالكم
تعصون من طاعت منايا كم له	وتماطلون معجلى آجالكم
هو رأسكم و به البقا ان يعتزل	فالموت أدنى من شراک نعالكم
شمس و ما شمس فهل من مظلم	هاتوا بظلمة غيكم وضلالكم
إياكم وجنوده فسيوفهم	خطافة الأرواح من أمثالكم

يا حبذا عبدالكريم أميرهم	قد قطع الأسباب قطع حبالكم
ففررتم عن أمهاتكم وعن	أبنائكم وعن ذوات حجالكم
فيكاد يبري سيفه الأشكال من	أجسامكم واللون أشكالكم
جبل إذا زاحمتم، برق إذا	أجفلتم، سيلٌ لدن استقلالكم
برق و ما برق فهل من دافع	ليدك أرضكم و ضم جبالكم
ليث وما ليث أوان قتالكم	غيث وما غيث لدى إمحالكم
قسم السيوف فأن قوائمها لهم	وصدروها لكم إلى أجفالكم
عبد الكريم ابن الكريم ابو الكريم	قاتل الكرماء من اقبالكم
أسرد الضرب انتهوا خيرا لكم	لا ترجعون صلاحكم بخبالكم
أفلا ترون مصائبا ترب الردىٰ	أحلللن أهو إلا محل
لا رأس فيه حجىٰ ولا قلب به	صبر فهل سلبا مع أموالكم
هذي ديارکم فلا داع ولا	فيها مجيب دعائكم وسؤالكم
قد اظلمت كوجوهكم وحظوظكم	هل سودتها ظلمة من بالكم
أم طال ليلتكم فذاك ظلامها	أم أظلمت أيامكم بفعالكم
أم آن شدكم الرحال إلى لظى	فالله أخرها لشدّ رحالكم
لي لا تضلوا عن طريق جهنم	لضلالكم و ظلام سوء مآلكم
بي أظلمت؟ من دون ظل الله من	في ظلي نور الهدى لمنالكم
الله ينصره ويخذلكم به	ويزيد في العز من إذلالكم[1]

(۱) یہ قصیدہ قصائد قاسمیہ (جو حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے فارسی عربی کلام کا مجموعہ ہے) میں شامل ہے، اور اس کی اصل جو خود حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے قلم سے ہے، مفتی الٰہی بخشؒ اکیڈمی کاندھلہ ضلع مظفر نگر، یو. پی میں محفوظ ہے؛ مگر نہایت غلط چھپا ہے، اور اس کی ترتیب بھی نسخۂ مصنف کے مطابق نہیں۔ (ص:۱۹ ر تا ص:۲۲، رمطبوعہ عین الاخبار مراد آباد: بلا سنہ طباعت)؛ اس لیے یہاں نسخۂ مصنف پر اعتماد کیا گیا، ترتیب اسی کے مطابق ہے۔ یہاں یہ بات بھی ضروری اور قابل ذکر ہے کہ اسی مجموعے میں سلطان عبدالحمید کی شان میں مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ [وفات:۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء]، ہندوستان کے عربی زبان کے مایہ ناز ادیب، مصنف اور شاعر، مولانا فیض الحسن سہارن پوریؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ [صدر مدرس دار العلوم دیوبند] کا ایک قصیدہ بھی شامل ہے۔ ص:۳۳ ر تا ۴۳۔

(۲) حضرت مولاناؒ کے احوال وخدمات پر حضرت مولاناؒ کے رفقا اور شاگردوں نے کئی عمدہ کتابیں لکھیں، بعد میں کئی اور کتابیں چھپیں، جن میں:

۱- احوال طیب مولانا محمد قاسمؒ از مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ ۲- سوانح قاسمی، از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ (تین جلدیں)

۳- قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تالیف: مولانا سید نور الحسن راشد کاندھلویؒ ۴- الامام محمد قاسم النانوتویؒ - حیات، افکار، خدمات [مجموعۂ مقالات سیمینار حضرت مولانا محمد قاسمؒ، دہلی] لائقِ مطالعہ واستفادہ ہیں۔ (ارشد)

وفات:

حضرت سفر حج کے بعد سے برابر بیمار چلے آرہے تھے؛ مگر سخت بیماری اور ضعف کے باوجود دینی خدمات کا تسلسل جاری تھا۔ بیماری اور سخت کھانسی میں ایک مشہور ہندو مبلغ اور پیشوا سوامی دیانند سرسوتی کے اسلام پر اعتراضات اور مسلمانوں کو علی الاعلان چیلنج کرنے کی وجہ سے دیوبند سے سفر کر کے رڑکی گئے، سوامی دیانند کے اعتراضات کے جواب دیے اور ان پر دو کتابیں تحریر کیں۔ بیماری میں سفر اور محنت کی وجہ سے مرض بڑھتا چلا گیا، دو تین دن بہت نازک کیفیت رہی، اسی میں ۴/ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ/ پنج شنبہ (۱۵/ اپریل ۱۸۸۰ء) کو دیوبند میں وفات ہوئی، وہیں دفن کیے گئے[۱]۔

(۱) (ماخوذ از): ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند، نومبر، دسمبر ۲۰۱۰ء)

حضرت نانوتویؒ اور ان کی تصانیف

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتیؒ ✿

حضرت سواتیؒ نے زیرِ نظر تحریر ''اجوبۂ اربعین'' کے مقدمے کے طور پر تحریر فرمائی تھی۔ اس میں چوں کہ حضرت نانوتویؒ کی تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے؛ اس لیے یہ زیرِ نظر نمبر میں شامل کی جارہی ہے۔ (نعمان)

انیسویں صدی عیسوی (تیرھویں صدی ہجری) میں امام ولی اللہ دہلویؒ کی جماعت کے پس ماندہ لوگوں میں برصغیر (ہند و پاک) میں ایک حکیم عالم پیدا ہوا، جن کا نام ''مولانا محمد قاسم نانوتویؒ'' تھا۔ یہ عالم مجدد دین ومجدد علوم وفنون تھا۔ یہی عالم دار العلوم دیو بند کا بانی مبانی اور علوم اسلامیہ کی از سرِ نو اشاعت کرنے والا عظیم المرتبت عالم دین اور کامل درجے کا ولی اور خدا پرست تھا۔ آج کے برصغیر میں دینی، مذہبی، اخلاقی اور علمی قوت کا سب سے اچھا سرمایہ وہی لوگ ہیں، جو مولانا محمد قاسمؒ اور ان کی جماعت کے توسط سے امام ولی اللہؒ سے مربوط ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ گزشتہ پوری صدی میں اس پائے کا کوئی حکیم عالم پیدا نہیں ہوا، تو یقیناً مبالغہ نہ ہوگا۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کس پائے کے عالم تھے؟ یہ بات ان کی تصنیفات سے ظاہر ہوتی ہے، اور ان کے تلامذہ اور مدارس ومکاتب کا علمی نظام اور وہ تحریکات اور اصلاحات جو برصغیر کے کونے کونے پر پھیلے ہوئے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس طرح ہم امام ولی اللہؒ کے تجدیدی اور تحقیقی کارنامے ان کی کتابوں سے معلوم کر سکتے ہیں، اور ان وسیع وعریض اثرات سے جو برصغیر میں بالخصوص اور تمام عالم میں بالعموم پھیلے ہوئے ہیں، ان سے دریافت کر سکتے ہیں، اسی طرح حضرت نانوتویؒ کی کتب ورسائل کا مطالعہ کرنے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عقلی اور ذہنی طور پر کتنے بلند مرتبہ عالم دین تھے۔

آپ کے رفیق حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نے جو آپ کی ایک مختصر سی سوانح عمری لکھی ہے، اسی میں درج بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا نانوتویؒ کو ابتدا سے ہی غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ مثلاً حضرت نانوتویؒ نے ایامِ طفلی میں ایک خواب دیکھا کہ: ''گویا میں اللہ جل شانہ کی گود میں

✿ بانی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

بیٹھا ہوں''۔حضرت نانوتویؒ کے دادا نے اس خواب کی یہ تعبیر بیان کی کہ تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا اور تم بہت بڑے عالم ہو گے۔

اسی طرح ایام طالب علمی میں حضرت نانوتویؒ نے خواب میں دیکھا کہ ''میں خانۂ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور مجھ سے نکل کر ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں''۔حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کے والد گرامی اور حضرت نانوتویؒ کے استاذ مکرم مولانا مملوک العلیؒ سے جب اس خواب کا ذکر کیا،تو انہوں نے فرمایا کہ: ''تم سے علم دین کا فیض بہ کثرت جاری ہوگا''۔

حضرت نانوتویؒ جب سفر حج پر گئے تھے،تو آپ کے پیر و مرشد حضرت مولانا حاجی محمد امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے مولانا محمد قاسمؒ کے متعلق فرمایا تھا:

''ایسے لوگ کبھی پہلے زمانے میں ہوا کرتے تھے،اب مدتوں سے نہیں ہوئے''(۱)۔

اور پھر حضرت حاجی صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا تھا:

''مولوی صاحب کی تحریر و تقریر کو محفوظ رکھا کرو اور غنیمت جانو''(۲)۔

اور حضرت حاجی صاحبؒ نے مولانا نانوتویؒ کے والد جناب اسد علی صدیقیؒ سے بھی فرمایا تھا کہ: بھائی اسد علی! مبارک ہو،خدا تعالیٰ نے تمہیں ایسا فرزند عطا فرمایا ہے،جو ولیٔ کامل ہے۔

مولانا نانوتویؒ کے کمال حافظہ کا حال یہ تھا کہ تراویح میں قرآن کریم سنانے کے بعد فرمایا: ''فقط دو سال صرف رمضان کے مہینے میں قرآن کریم یاد کیا ہے''۔

عبادت کا حال یہ تھا کہ اکثر تمام رات تنہا نوافل میں قرآن کریم پڑھتے رہتے تھے۔ایک رات ایک رکعت میں ستائیس پارے پڑھے تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ماہ شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ(۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے تھے۔تاریخی نام ''خورشید حسین'' ہے،اور آپ کی وفات ۴؍جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ/ ۱۵؍اپریل ۱۸۸۰ء؍بعد نماز ظہر بہ روز جمعرات واقع ہوئی۔حضرت مولانا سید فخر الحسن گنگوہیؒ نے ''انتصار الاسلام'' کے مقدمے میں جو کلمات تحریر فرمائے ہیں،ان کا نقل کرنا شاید حضرتؒ کے متعلقین و معتقدین کے لیے باعث تسلی بن سکے۔مولانا سید فخر الحسنؒ فرماتے ہیں:

---

(۱)سوانح عمری۔

(۲)ایضاً۔

''حیف صد ہزار حیف کہ زمانہ ایسے عالم ربانی سے جو اپنے زمانے میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا، خالی ہوگیا۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ حامیٔ شریعت جو نہ فقط اپنی جان؛ بلکہ پڑوسیوں کی بھی جانیں شریعت کی حمایت میں جھونک دے، اس وقت دنیا سے اٹھ جائے۔ ہائے وہ باغِ اسلام کا باغ بان کہاں گیا، جو اس باغ کی حفاظت کرتا تھا؟ جس سے اس کو رونق تھی۔ ہائے! اب اس باغ کی خدمت کون کرے گا؟ اس کی روشیں کون درست کرے گا؟ خس و خاشاک سے صحن چمن دین کس طرح صاف ہوگا؟ ہائے وہ نخل بند گلستان اسلام کدھر گیا، جو سرو اسلام، یعنی صراط مستقیم کی درستی و موروثی کی فکر رکھتا تھا؟ ہائے! وہ جاروب کش باغ دین کہاں گیا؟ جس کی تقریر خس وخاشاک اوہام کے لیے جاروب تھی؟ اب سوائے حسرت و افسوس کے کچھ نہیں ہوسکتا۔ اِنَّـا لِلّٰـہِ وَاِنَّـا اِلَیْـہِ رَاجِعُوْنَ! نہ کوئی رہا ہے، نہ کوئی رہے گا؛ البتہ ایک ذات وحدہٗ لاشریک جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

جناب مولانا مرحوم نے شاگرد و معتقد بہت چھوڑے، اب ان کو چاہیے کہ جناب مولانا مرحوم کی طرح جان و مال و عزت و آبرو کا کچھ خیال نہ کریں۔ آپس کے جھگڑوں میں نہ پڑیں۔ خدا و رسول کے دشمنوں سے لڑیں، حتی الوسع دین اسلام کی حمایت کریں''۔

حضرتؒ کے سوانح حیات اور تاریک حالات مکمل طور پر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے ''سوانح قاسمی'' کے تین مجلدات میں مدون کیے ہیں، جن کے ساتھ ان کے حالات کے لیے مزید وقائع اور استشہادات حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم، شیخ المعقول والمنقول استاذ العلماء و سابق صدر المدرس دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ، اور مولانا اشتیاق احمد دیوبندیؒ کاتب نے بھی حصہ لیا ہے۔

ان کے علاوہ مولانا انوار الحسن شیرکوٹیؒ ایم.اے فاضل دیوبند نے بھی ''انوار قاسمی'' میں حضرتؒ کی سیرت کا بڑا حصہ مدون کردیا ہے۔

اور حضرت مولانا سرفراز خان صفدر صاحب شیخ الحدیث و صدر مدرس مدرسۂ نصرۃ العلوم گوجراں والہ نے بھی ایک عمدہ رسالہ ''بانیٔ دارالعلوم' مرتب کیا ہے، جو اپنی زبان اور استناد کے اعتبار سے معیاری ہے۔

اسی رسالے کا ایک حصہ مکمل طور پر ''بیس بڑے مسلمان'' کے مصنف نے اپنی کتاب میں نقل کرلیا ہے۔ ان کے علاوہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی مختصر سوانح حیات بھی بہت عمدہ کتاب ہے، جس میں حضرت نانوتویؒ کی زندگی کے تمام اہم واقعات کی طرف اشارات ملتے ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''علمائے ہند کا شان دار ماضی'' میں بھی ایک بڑا حصہ ذکر کردیا ہے۔

''طبقات الحنفیہ'' کے مصنف مولانا فقیر محمد جہلمیؒ نے بھی حضرتؒ کی تاریخ ذکر کی ہے، اور مولوی رحمان علی صاحبؒ نے بھی ''تاریخ علمائے ہند'' فارسی میں بھی حضرتؒ کا ذکر کیا ہے۔

''موج کوثر'' کے مصنف شیخ اکرام مرحوم نے بھی حضرت نانوتویؒ کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔

مولانا کے شاگرد مولانا منصور علی خاں صاحبؒ نے اپنی کتاب ''مذہب منصور'' میں حضرتؒ کی زندگی کے کئی حیرت انگیز واقعات ذکر کیے ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کی سب سے بڑی مفصل سوانح حیات اور آپ کے ملفوظات و حکایات ولطائف حیات اور علمی تقریرات وغیرہ آپ کے قدیم شاگرد و خادم مولانا سید فخر الحسن گنگوہیؒ (محشی ابی داؤد و ابن ماجہ) نے مرتب کی تھی، جس کی ضخامت ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل تھی؛ مگر افسوس کہ وہ کتاب طبع نہ ہو سکی اور زمانے کے دست برد سے ضائع ہو گئی۔

حضرت نانوتویؒ کے ایک خادم مولانا امیر شاہ خاںؒ نے بھی اپنی حکایات کی کتاب ''امیر الروایات'' میں حضرت نانوتویؒ کے بہت سے واقعات ذکر کیے ہیں۔

لیکن سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ کے علوم ومعارف کی تسہیل اور آپ کی کتابوں کی تبویب، جو مولانا مناظر احسن صاحبؒ کرنا چاہتے تھے، اس پر کوئی کام نہ ہو سکا۔ مولانا اس سے قبل ہی رحلت فرما گئے، اور اسی طرح مولانا انوار الحسن شیر کوٹیؒ کا بھی خیال تھا کہ ''انوار قاسمی'' کی دوسری جلد میں علوم قاسم سے بحث کی جائے گی، غالباً وہ بھی یہ کام نہیں کر سکے۔ مولانا نانوتویؒ کے علوم ومعارف کی تحقیق وتشریح وتسہیل وتفہیم کی اشد ضرورت ہے۔ خدا کرے کہ کوئی عالم اس کو انجام دے، جو اس کی صلاحیت بھی رکھتا ہو؛ کیوں کہ عام اہل علم؛ بلکہ بہت سے خواص کے بس کا بھی یہ کام نہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ جس کو خاص توفیق عنایت فرمائے اور اس کام کو اس کے لیے آسان کر دے۔

حکمت قاسمیہ:

احکامِ اسلام کی عقلی ونقلی تائید، قدیم وجدید فلاسفی کی تردید اور شرائع اسلامیہ کے غامض اسرار وحکم، دلائل کا عجیب وغریب سلسلہ، قدیم وجدید فلسفے کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کا کافی شافی رد، نظام اسلام کو مربوط شکل میں پیش کرنا یہ سب ''حکمت قاسمیہ'' کے اہم مقاصد میں شامل ہیں؛ لیکن حضرت نانوتویؒ کی کتابوں کا صحیح معنوں میں وہی شخص مطالعہ کر سکتا ہے اور ان سے مستفید ہو سکتا ہے، جو علوم عقلیہ میں کافی بصیرت رکھتا ہو۔ دین کی اعانت کے لیے عقلیات کا حصول بھی اسی طرح باعث اجر وثواب ہوگا، جس طرح

نقلیات کا؛ بلکہ بعض اوقات دین پر قائم رہنا معقولات حاصل کیے بغیر بہت دشوار ہوتا ہے۔ اسی لیے عقلیات ''دیوبندی نظام تعلیم'' کا ہمیشہ ایک اہم حصہ رہا ہے۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے لکھا ہے:

''علما کو چاہیے کہ عقلیات کے حصے کو اسی طرح ذوق وشوق سے حاصل کریں، جس طرح نقلیات کو حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بغیر وہ 'حجۃ اللہ البالغۃ' جیسی کتابوں کے سمجھنے سے عاری رہیں گے، اور اگر ایسا ہوا، تو انہیں آسانی سے بہکانے والے بہکاتے رہیں گے؛ کیوں کہ جس کا اپنا کوئی فلسفہ نہ ہو، اس کو اسی طرح دوسرے لوگ گم راہ کرتے رہتے ہیں''۔

حضرت نانوتویؒ کے حکیمانہ آرا وافکار اور خاص نظریات اور دین کی محققانہ اور عارفانہ تشریحات کو جاننا اشد ضروری ہے۔ حضرت نانوتویؒ کو اللہ تعالیٰ نے کمال درجے کا حافظہ اور ذہانت عطا فرمائی تھی۔ جب کوئی بات یا اشکال آپ کے سامنے پیش کیا جاتا تھا، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام دلایل آپ کے ذہن میں بہ یک وقت مجتمع ہیں، اور ان میں سے آپ مخاطب کے حالات کی مناسبت سے دلیل منتخب فرما کر بیان کرتے ہیں۔ کمال درجے کا تبحر علمی قدرت نے عطا فرمایا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نانوتویؒ نقلیات وعقلیات کے بہت بڑے ماہر امام تھے۔ علم عقائد میں آپ نے ''حجۃ الاسلام'' اور ''تقریر دل پذیر'' جیسی ادق؛ لیکن بہت گراں قدر کتابیں تصنیف فرمائیں ہیں۔ مابعد الطبیعات اور ملکوت، جبروت، عالم مثال، لاہوت، برزخ اور امور آخرت کو بالکل عقلی براہین کے انداز میں افہام کے قریب کر دیا ہے۔ مولانا سندھیؒ کا قول بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ حقائق ومعارف اپنے لوگوں کو، یعنی اہل اسلام کو سمجھا دیتے ہیں؛ لیکن مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اسلام کے حقائق غامضہ غیر مسلموں، عیسائی، یہود، ہنود، بدھ، مجوس وغیرہ کو اسی طرح سمجھا سکتے ہیں، جس طرح اہل اسلام کو۔ چوں کہ حضرت نانوتویؒ زیادہ تر علم منطق، فلسفہ اور ریاضی اور طبعی فلسفہ وغیرہ سے کام لیتے ہیں۔ ذرایع تفہیم میں بالکل عقل عامہ سے بات کرتے ہیں اور مشاہداتی دلائل، جو موجودہ دور میں ہر اہل خرد وتمیز اور اصحاب عقول کے ذہن میں فٹ بیٹھ جاتے ہیں ان سے کام لیتے ہیں۔ زبان اردو آپ کی نہایت دقیق ہوتی ہے۔ کچھ تو اس لیے کہ حضرتؒ کے زمانے تک بھی اردو زبان نے اتنی ترقی نہیں کی تھی، جتنی آج ہے، اور کچھ اصطلاحات وغیرہ کی دقت کی وجہ سے مشکل پیدا ہو جاتی ہے؛ لیکن علمی ذوق والے حضرات محنت سے اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔ جس طرح امام ولی اللہؒ کا کلام ہر ایک صاحب علم کے بس کا روگ نہیں کہ وہ اس کو آسانی سے سمجھ سکے؛ اس کے لیے کافی محنت کی ضرورت ہے، اسی طرح مولانا نانوتویؒ کے کلام کے لیے بھی کافی محنت کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ کا مقولہ ہے:

''جب تک حضرت نانوتویؒ ہم میں موجود تھے، ہم منطق کو تازہ کرتے رہتے تھے، تاکہ حضرتؒ کے کلام کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ان کی وفات کے بعد اس سے دل سرد ہو گیا ہے''۔

''اجوبۂ اربعین'' کے بارے میں عرض ہے کہ احقر عبدالحمید سواتی تقریباً پینتیس سال سے اس کتاب کا متلاشی تھا۔حضرت نانوتویؒ کی باقی کتب ورسائل نظر سے گزرے تھے، اور کچھ بہ قدر فہم ان سے استفادہ بھی کیا؛ لیکن ''اجوبۂ اربعین'' کہیں سے دست یاب نہ ہو سکی۔اس کے مطالعے کا انتہائی شوق تھا۔اس کی تلاش جاری تھی۔ایک دفعہ اتفاق سے سید الخطاطین حضرت سید انور حسین شاہ صاحب مدظلہٗ نفیس رقم (جن کو اللہ تعالیٰ نے کمال ظاہر و باطن عطا فرمایا ہے، آپ صاحب نسبت اور بلند روحانیت کے مالک بزرگ ہیں) کسی کتاب کی تلاش میں مدرسۂ نصرۃ العلوم گوجراں والہ تشریف لائے،تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ: آپ کے پاس ''اجوبۂ اربعین'' ہے؟تو شاہ صاحب نے فرمایا: ہے۔میں نے عرض کیا کہ: مطالعے کے لیے عنایت فرمائیں۔انہوں نے از راہِ عنایت بڑی خوشی سے کتاب مطالعے کے عنایت فرمائی۔کتاب کے مطالعے کے دوران یہ بات ظاہر ہوئی کہ موضوع کے لحاظ سے اس کتاب کی اشاعت ضروری ہے؛ لیکن کتاب غالباً صرف ایک مرتبہ ہی طبع ہوئی ہے، دوبارہ اس کی طباعت کی نوبت نہیں آئی، اور ابتدائی طباعت بھی غالباً بڑی عجلت سے ہوئی ہے۔اس میں کتابت کی بہت سے غلطیاں رہ گئی ہیں۔ان کی اصلاح ضروری ہے۔عربی عبارات بھی بہت سی غلط ہی طبع ہوئی ہیں۔احقر کے پاس اتنی وقت وفرصت نہ تھی؛ چناں چہ اس کام کے لیے فاضل نوجوان مولانا حافظ مہر محمد صاحب فاضل مدرسۂ نصرۃ العلوم اور فاضل تخصص فی علوم الحدیث جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، جو بڑے صاحب استعداد نوجوان ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، مذہب رفض وتشیع سے انہیں خصوصی مناسبت ہے، احقر نے ان کو اس کام کی طرف متوجہ کیا۔انہوں نے اس کو قبول کیا اور کتاب کی تصحیح شروع کر دی، اور ساتھ ہی ساتھ بعض عنوانات کا اضافہ بھی کیا اور کہیں کہیں کچھ حواشی بھی لکھے، تاکہ کتاب کی افادیت میں اضافہ اور آسانی بھی ہو۔کتاب کی جلد اول کی تصحیح کے بعد اس کی خواندگی کے لیے احقر نے مولانا مفتی حافظ محمد عیسیٰ خان صاحب گورمانی، جو کئی سال سے مدرسۂ نصرۃ العلوم میں افتا کا کام کرتے ہیں، ساتھ تدریس بھی،موصوف خود بھی مدرسۂ نصرۃ العلوم کے قدیم فضلا میں سے ہیں، اور ان کو فتوی نویسی میں کافی وسیع تجربہ اور درک ہے، اور دوسرے صاحب مولوی محمد اشرف صاحب فاضل نصرۃ العلوم کو اس کام کے لیے مقرر کیا، جو محنتی اور مستعد نوجوان ہیں۔ان حضرات نے اس کی

خواندگی مکمل کی۔ چناں چہ جلد اوّل اس قابل ہوسکی کہ اس کی کتابت کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ کتاب کی طباعت ادارۂ نشر واشاعت مدرسۂ نصرۃ العلوم کی طرف سے ہورہی ہے۔ عنوانات کا اضافہ بعض احادیث کے الفاظ اور صفحات کتب، ان سب کو قوسین کے اندر رکھا گیا ہے، تاکہ اصل کتاب کے ساتھ امتیاز قایم رہے۔ اکثر حواشی اور عنوانات مولانا حافظ مہر محمد صاحب نے کیے ہیں، اور حوالہ جات اور صفحات کی تلاش میں مولانا حافظ مفتی محمد عیسیٰ صاحب اور مولوی محمد اشرف صاحب شریک ہیں، اور بعض مقامات میں احقر عبدالحمید سواتی بھی ان کے ساتھ شریک رہا ہے۔

کتاب کے لیے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا نام نامی اس بات کی ضمانت کے لیے کافی ہے کہ کتاب علوم ومعارف حقائق ودقائق کا مجموعہ ہے۔

''اجوبۂ اربعین'' بھی ان کتب میں سے ہے، جن میں حضرت نانوتویؒ کے علوم و فیوض، مناظرانہ وتنقیدانہ مضامین کا وقیع سرمایہ موجود ہے۔ یہ کتاب اہل رفض وتشیع کے رد میں ہے۔ برصغیر (پاک وہند) میں نویں اور دسویں صدی ہجری سے تشیع ورفض کا فتنہ بڑے پیانے پر پھیلا ہوا ہے۔ قدیم ادوار میں بھی علمائے اہل سنت والجماعت کے جید اور محقق حضرات اس فتنے کا اپنے اپنے دور میں رد کرتے رہے ہیں۔ چناں چہ امام ابن تیمیہؒ نے اس فرقۂ ضالہ کا اپنی معروف ومشہور کتاب ''منہاج السنۃ'' میں بڑی قوت وشدت کے ساتھ رد کیا ہے۔ امام مجدد الف ثانیؒ نے بھی اس سلسلے میں عظیم کام کیا ہے، اور پھر ان کے بعد امام ولی اللہؒ نے اس فتنے کی بہت سرکوبی کی ہے، پھر آپ کے فرزند امام عبدالعزیزؒ نے ایک ایسی عمدہ کتاب فارسی زبان میں لکھی ہے، جس کے بارے میں ہمارے استاذ محترم امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ فرماتے تھے کہ: ''تحفۂ اثناعشریہ'' کا جواب اہل تشیع قیامت تک نہیں دے سکتے۔ ہمارے اکابر میں سے حضرت نانوتویؒ نے بھی اس فتنے کے رد میں متعدد کتابیں، رسائل اور مکاتیب لکھے ہیں۔ چناں چہ ''ہدیۃ الشیعہ'' جیسی گراں قدر کتاب جو عمدہ اور سہل عام فہم زبان میں تحریر فرمائی ہے، پھر ''اجوبۂ اربعین'' کا نمبر ہے۔ اس کے علاوہ ''انتباہ المؤمنین'' بہ زبان فارسی اور ''فیوضات قاسمیہ'' کے کئی مکاتیب اور دیگر متعدد مکاتیب میں اس فتنے کا پورا تعاقب کیا گیا ہے۔ کتاب ''آب حیات'' کا ایک بڑا حصہ بھی اس فتنے کے رد پر مشتمل ہے۔ وراثت نبوی اور حیات نبوی کی دقیق بحث بھی کی گئی ہے۔

''اجوبۂ اربعین'' کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس کتاب میں اہل رفض وتشیع کی طرف سے چالیس اعتراضات اہل سنت والجماعت پر کیے گئے ہیں، ان کے دنداں شکن اور مسکت جوابات دیے گئے ہیں۔

اس کا پہلا حصہ حضرت نانوتویؒ نے ایک دن رات میں مکمل کیا ہے، اور اس میں اٹھائیس اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں، اور حضرت نانوتویؒ کے ساتھ مولانا عبداللہ انصاریؒ (سابق ناظم دینیات مدرسۃ علی گڑھ) بھی شریک تھے۔ یہ مولانا عبداللہ صاحبؒ حضرت نانوتویؒ کے داماد تھے، اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ کے چچازاد بھائی۔ دیوبند کے قدیم فضلا میں سے تھے۔ بڑے نیک وصالح انسان تھے۔ یہ مولانا محمد میاں عرف منصور انصاریؒ کے والد محترم تھے۔ منصور انصاریؒ مولانا شیخ الہندؒ کے شاگرد اور مولانا سندھیؒ کے رفیق اور برصغیر ہندو پاک کی آزادی کے عظیم راہ نما تھے۔ یہ بڑے عرصے تک جلاوطن رہے اور جلاوطنی کی حالت میں کابل میں ۱۹۴۶ء کو وفات پائی۔ ان کے فرزند مولانا حامد انصاری غازی ہیں، جو فاضل دیوبند اور بہت سی کتابوں کے مصنف اور ہندوستان کے مشہور صحافی ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کے ساتھ ہر ایک اعتراض کا ایک ایک جواب مولانا عبداللہ انصاریؒ نے بھی تحریر فرمایا ہے۔ پہلا جواب حضرت نانوتویؒ کا اور دوسرا جواب مولانا عبداللہ انصاریؒ کا ہے۔ بعض جوابات نہایت مختصر ہیں اور بعض کافی طویل ہیں۔ زبان اردو قدیم ہے۔ علم عمیق اور فہم دقیق ہے۔ جوابات لاجواب ہیں، جن کے پڑھنے اور ان میں غور وفکر اور تدبر کرنے کی ضرورت ہے، اور انصاف شرط ہے۔

پہلے حصے میں زیادہ تر بحث مسئلۂ خلافت کے بارے میں تحقیقات پر مشتمل ہے۔ یہ مسئلہ ایک اہم اور اصولی مسئلہ ہے اور خلفائے راشدینؓ اربعہ کی خلافت علی منہاج النبوۃ ہے، اور علی الترتیب ان کے مراتب بھی اسی طرح ہیں۔ جب تک اس اصولی مسئلے پر یقین نہ ہو دیگر شرائع اور احکام کا ثبوت بڑا مشکل ہے۔ چناں چہ امام ولی اللہؒ "ازالۃ الخفاء" کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:

> "واکثر اہل ایں اقلیم در اثبات خلافت خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین شکوک بہم رسانیدند، لاجرم نور توفیق الٰہی در دل ایں بندۂ ضعیف علمے را مشروح ومبسوط گردانید، تا آں کہ بہ علم الیقین دانستہ شد کہ اثبات خلافت ایں بزرگواراں اصلے است از اصول دین، تا وقتے کہ ایں اصل را محکم نہ گیرند، ہیچ مسئلہ از مسائل شریعت محکم نہ شود، زیرا کہ اکثر احکامے کہ در قرآن عظیم مذکور شدہ مجمل است بہ دون تفسیر سلف صالح بہ حل آں نتواں رسید، واکثر احادیث خبر واحد محتاج بیان بغیر روایت جماعۃ از سلف آں را واستنباط مجتہداں از آن متمسک بہ نہ گردد، وتطبیق احادیث متعارضہ بدون سعی ایں بزرگ واراں صورت نہ گیرد، وہم چنیں جمیع فنون دینیہ مثل علم قرأۃ وتفسیر وعقائد وعلم سلوک بغیر آثار ایں بزرگ واراں متاصل نہ شود، وقدوہ سلف در ایں امور بہ خلفائے راشدینؓ است تمسک ایشاں بہ اذیال خلفائے جمع قرآن ومعرفت قرأۃ متواترہ از شاذہ مبنی بر

سعی خلفائے است وقضا یا وحدود واحکام فقہ وغیر آن ہمہ مترتب بہ تحقیق ایشاں ہر کہ در شکستن ایں اصل سعی می کند بہ حقیقت ہدم جمیع فنون دینیہ می خواہد''[1]۔

ترجمہ از فارسی: ''اس زمانے میں بدعت تشیع آشکارا ہوگئی اور عام لوگوں کے دل ان کے شکوک وشبہات سے متاثر ہونے لگے، اوراس ملک کے اکثر لوگ خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی خلافت کے ثبوت میں شک کرنے لگے؛ لہٰذا توفیق الٰہی کے نور نے اس بندۂ ضعیف (امام ولی اللہ) کے دل میں ایک علم پیدا کیا، جس سے یقین کے ساتھ معلوم ہوا کہ خلافت ان بزرگوں (خلفائے اربعہؓ) کی ایک اصل ہے اصول دین سے، جب تک لوگ اس اصل کو مضبوط نہ پکڑیں گے،تو کوئی مسئلہ مسائل شریعت میں سے مضبوط نہ ہوگا؛ کیوں کہ اکثر احکام جو قرآن عظیم میں مذکور ہیں وہ مجمل ہیں،بغیر سلف صالحین کی تفسیر کے ان احکام کا حل نہیں ہوسکتا،اوراکثر حدیثیں خبر واحد ہیں،شرح کی محتاج ہیں۔بغیر اس کے کہ سلف کی ایک جماعت ان کو روایت کرے اور مجتہدین ان سے استنباط کریں قابل تمسک نہیں ہوسکتیں،اور نہ بدون ان بزرگوں کی کوشش کے متعارض احادیث میں تطبیق کی کوئی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔اسی طرح تمام فنون دینیہ مثل علم قرأت وتفسیر وعقائد وسلوک بغیر ان بزرگوں کے اقوال کے کسی اصل پر قائم نہیں رہ سکتے،اور سلف صالحین نے ان امور میں خلفائے راشدینؓ ہی کی پیروی کی ہے اورانہیں کے دامن کو مضبوط پکڑا ہے۔قرآن کا جمع ہونا اور قرأت شاذہ سے قرأۃ متواترہ کا امتیاز پانا خلفائے راشدینؓ ہی کی کوشش پر مبنی ہے،اوراسی طرح قضا کے فرائض اور حدود اور احکام فقہ وغیرہ ان ہی خلفا کی تحقیق پر مترتب ہیں؛لہٰذا جو شخص اس اصل کے توڑنے کی کوشش کرتا ہے،وہ فی الحقیقت تمام فنون دینیہ کو مٹانا چاہتا ہے''۔

''اجوبۂ اربعین'' کا دوسرا حصہ جو بارہ اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہے،اور یہ صرف حضرت نانوتویؒ کے قلم حق رقم کا مرہون منت ہے،اس میں دقت نظر،زیرکی،عمیق حقایق و معارف، لطائف وظرائف کا گنج گراں مایہ موجود ہے۔حضرت نانوتویؒ نے اس میں متعہ کا مسئلہ،فدک وراثت جیسے اہم مسائل کے علاوہ مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی روشنی ڈالی ہے۔یہ حصہ زیادہ دقیق،صعب اور بہت سے اہم علمی نکات پر مشتمل ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی کتابوں کا اجمالی تذکرہ:

مناسب معلوم ہوتا ہے حضرتؒ کی تمام کتابیں جو اس وقت تک طبع ہوچکی ہیں ان کا اجمالی تعارف

(۱) ازالۃ الخفاء، ج۱ص:۱۔

کرادیا جائے۔بعض کتابیں نایاب بھی ہیں،بعض صرف ایک دفعہ یا دو دفعہ ہی طبع ہوئی ہیں۔حضرتؒ کی تحریرات کے بعض حصے ابھی تک طبع بھی نہ ہو سکے اور وہ دست یاب بھی نہیں۔حضرتؒ کی تمام کتب ورسائل و مکاتیب کی جدید طباعت کی اشد ضرورت ہے۔

۱-حجۃ الاسلام:

یہ بڑے سائز کے پچاس صفحات پر مشتمل رسالہ ہے۔اردو زبان کے اس رسالے میں اسلام کے تمام ضروری عقائد حضرت نانوتویؒ نے اپنے حکیمانہ طرز بیان میں ذکر کیے ہیں،اور اس انداز میں ان کی تبیین وتشریح کی ہے کہ عقل سلیم رکھنے والے حضرات اس کو پڑھ کر اسلام کے عقائد کے بارے میں اطمینان حاصل کر سکتے ہیں،اور غیر مسلم حضرات بھی ان کو سمجھ سکتے ہیں۔یہ رسالہ بارہا طبع ہوا ہے اور بہت سے خوش بخت لوگوں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔اس کے عنوانات حضرت شیخ الہندؒ نے قائم کیے ہیں۔یہ رسالہ بھی حضرت نانوتویؒ نے ایک دن رات میں لکھا ہے۔اس رسالے کا نام ''حجۃ الاسلام'' حضرت مولانا سید فخر الحسن گنگوہیؒ نے تجویز فرمایا ہے۔یہ رسالہ حکمت قاسمیہ کا ایک اہم جز ہے۔حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''میں نے مولانا محمد قاسمؒ کا رسالہ حجۃ الاسلام مولانا شیخ الہندؒ سے سبقاً سبقاً پڑھا''۔

۲-تقریر دل پذیر:

یہ کتاب حضرت نانوتویؒ کی بے مثال اور عجیب وغریب کتاب ہے۔افسوس کہ یہ کتاب حضرت مکمل نہیں کر سکے۔یہ اردو زبان میں ہے۔تمام عقائد دینیہ اصولیہ وفروعیہ کو عقلی استدلال سے قریب الفہم کر دیا ہے۔اس طرح کہ اگر کوئی غیر متعصب غیر مسلم بھی اس کو پڑھے گا،تو اسلام کے نظام عقائد کو برحق ہی سمجھے گا، اور اس کو بھی بہت کم اشکالات واقع ہوں گے۔یہ کتاب بھی بارہا طبع ہو کر خراج عقیدت وصول کر چکی ہے۔ اس کتاب کی تبویب غالباً مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ نے کی ہے۔کتاب کے دیباچے یا حواشی میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔نیز کہیں کہیں مختصر حواشی بھی تحریر کیے گئے ہیں۔اس میں بعض حواشی حضرت مولانا سید فخر الحسنؒ کے ہیں۔اس کتاب کی ابتدا میں حضرت نانوتویؒ بہ نظرِ خیر خواہی خلائق سب اہل مذاہب: خواہ وہ مسلمان ہوں،یا ہندو،یہود،نصاریٰ،مجوس،آتش پرست وغیرہ سب کی خدمت میں دین اسلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے،اور عقل سلیم رکھنے والے سب حضرات سے درخواست کی ہے کہ تعصب کو بر طرف رکھتے ہوئے ایک بار اس کتاب کو اوّل سے آخر تک پڑھیں۔اگر حق وباطل کی تمیز ہو جائے،تو اس کو

قبول کریں، نہیں تو اصلاح کریں۔

پھر وجود صانع، توحید، صفات سے لے کر تمام اعتقادی مسائل کا عقلی ثبوت اور عمدہ تمثیلات سے بیان فرمایا ہے، اور عقلیات کے اماموں کے باطل نظریات کی پرزور تردید فرمائی ہے۔

۳-انتصار الاسلام:

اس رسالۂ مبارکہ میں آریہ سماجیوں کے دس سوالات کے جوابات لکھے ہیں۔ ہر اعتراض کے دو دو جواب حضرت نانوتویؒ نے دیے ہیں۔ ایک جواب الزامی ہے، جس سے معترض کو خاموش کر دیا ہے، اور دوسرا جواب تحقیقی۔ آریہ سماجیوں اور اس قسم کے دیگر معترضین حضرات کو ایسے دندان شکن جوابات دیے ہیں کہ ہمیشہ ان لوگوں کو اس قسم کے اعتراضات کرنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ کمال درجے کی تحقیقات پر مشتمل ہے۔ اس رسالے کی تبویب اور عنوانات کا قائم کرنا اور بعض جگہ مفید حواشی تحریر کرنے کا کام مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ نے کیا ہے۔ رسالہ بارہا طبع ہوا ہے اور ہزارہا لوگوں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس رسالے کا مقدمہ حضرت نانوتویؒ کے تلمیذ حضرت مولانا سید فخر الحسن گنگوہیؒ نے تحریر فرمایا ہے۔

۴-قبلہ نما:

یہ حضرت نانوتویؒ کی ایک اہم اور معرکۃ الآراء کتاب ہے۔ یہ دراصل ''انتصار الاسلام'' کا دوسرا حصہ ہے۔ یہ کتاب آریہ سماج کے پنڈت دیانند سرسوتی کے ایک اعتراض کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ دیانند سرسوتی نے ۱۲۹۵ھ/ (۱۸۷۸ء) میں مسلمانوں پر اعتراض کیا تھا کہ مسلمان اہل ہنود پر بت پرستی کا الزام لگاتے ہیں، حال آں کہ وہ خود بھی ایک مکان ''کعبہ'' کی طرف سجدہ کرتے ہیں، جو بہت سے پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے اس اعتراض کے اوّلاً سات جوابات دیے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک جواب کافی شافی ہے۔ پھر اس کے بعد آٹھواں جواب دیا ہے، جس کی دو تقریریں کی ہیں: ایک مجمل، دوسری مفصل۔ یہ کتاب نہایت باریک حروف کی کتابت سے چھیانوے صفحات پر مشتمل ہے۔ اکثر حصہ اس کتاب کا مفصل جواب پر حاوی ہے۔ اس میں حقیقتِ کعبہ، حقیقتِ صلاۃ، سجدے کی حقیقت، استقبال کی شرح، عابدیت ومعبودیت اور تجلی الٰہی اور خانۂ کعبہ کا مورد ومہبط تجلی ہونا اور یہ کہ جسم کی مسامتت مکان (کعبہ) کی طرف ہوتی ہے، اور روح کی تجلی الٰہی کی طرف، اور یہ کہ مسلمان اس تجلیٔ الٰہی کی طرف ہی سجدہ کرتے ہیں، اور وہ تجلیٔ الٰہی گویا عین معبود ہوتی ہے۔ تجلی کا ورود خانۂ کعبہ پر کس طرح ہوتا ہے؟ اس کی حقیقت واضح فرمائی ہے، اور اس کے ساتھ نہایت ہی غامض حقائق کا ذکر کیا ہے، اور ایسی عجیب علمی بحث فرمائی ہے کہ بلا مبالغہ کسی

کان نے سنی ہوگی اور نہ کسی آنکھ نے کسی کتاب میں دیکھی پڑھی ہوگی۔ حقیقتِ کعبہ، حقیقتِ محمدیہ، حقیقتِ صلاۃ وغیرہ جیسے دقیق اور عسیر الفہم مسائل کا تذکرہ کمال متانت ورزانت اور عقلی انداز میں کردیا ہے۔ عبادت کی حقیقت اور تجلیٔ الٰہی کے ساتھ مصلّی کی توجہ اور مسامتت کی دقیق وعمیق بحث، پھر آخر میں بُعد مجرد (بُعد موہوم) پر بڑا دقیق تبصرہ کیا ہے۔ اس کتاب کی تبویب وتبیین مضامین بھی نہیں کی گئی، حال آں کہ یہ بارہا طبع ہوئی ہے؛ لیکن دقیق ہونے کی وجہ سے اہل علم نے ادھر توجہ نہیں فرمائی؛ لیکن علوم قاسمیہ کا ایک بڑا حصہ اس کتاب میں آ گیا ہے۔ سنا تھا کہ مولانا سید احمد رضا بجنوری صاحب (انوار الباری شرح بخاری کے مصنف) نے قبلہ نما کی ایک ہزار عنوانات سے تبویب وتسہیل کی ہے؛ لیکن ابھی تک وہ منظر عام پر نہیں آئی۔ یہ رسالہ نادر تحقیقات کا عجیب وغریب مجموعہ ہے، اور اس میں جس طرح عقلی استدلال کیے گئے ہیں، ان سے حضرت نانوتویؒ کی بلندیٔ مرتبت نمایاں ہے۔

مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری ''توثیق الکلام'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحبؒ نے اس کی قابلِ قدر خدمت کی ہے؛ مگر اس سے کماحقہٗ کتاب حل نہیں ہوگی۔ حضرت الاستاذ مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ نے بھی ایک خاص نہج پر اس کی شرح تحریر فرمائی تھی؛ مگر وہ ضائع ہوگئی''۔

۵- آبِ حیات:

حضرت نانوتویؒ کی معرکۃ الآراء کتاب ایسی دقیق، عمیق اور صعب؛ بلکہ اصعب کتاب ہے، حال آں کہ اردو زبان میں ہے۔ اپنی دقت کی بنا پر شاید ہی کوئی کتاب اس کی مثال ہو۔ ہم نے اپنے استاذ وشیخ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمہ اللہ کے ترمذی اور بخاری شریف کے درس کے دوران بارہا سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ:

> ''حضرت نانوتویؒ نے یہ کتاب علما کے امتحان کے لیے لکھی ہے''۔

اس کو دیکھنا اور اس کے مطالب کا حل کرنا اور اس کو پوری طرح سمجھنا معرکہ کی چیز ہے۔ ہر ایک عالم کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اس کتاب کو کماحقہٗ سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں حضرت نانوتویؒ نے خود لکھا ہے کہ: جس طرح ''ہدیۃ الشیعہ'' کی تصنیف کا محرک حضرت مولانا گنگوہیؒ تھے، اسی طرح آبِ حیات کی تصنیف کا محرک حضرت پیر ومرشد مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ تھے۔ ان کے ایما پر ''مسئلۂ حیات النبی'' پر اس کتاب کو ''ہدیۃ الشیعہ'' سے الگ مستقل کتاب کی شکل میں تصنیف کیا ہے، اور

اس کتاب کے وجدانی اور الہامی حقائق کی تصدیق حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمائی ہے۔ اس کتاب میں نقلیات، یعنی قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کا بھی ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ بعض حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ کتاب صرف منطق پر مشتمل ہے، ان کا خیال غلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نقلیات کے ساتھ عقلیات کا ایک معتد بہ حصہ اس میں پایا جاتا ہے، جو شخص عقائد حقہ سے پوری طرح باخبر ہو، اور ان دلائل سے بھی آگاہ ہو، جن سے ان عقائد کی توثیق کے لیے استدلال کیا جاتا ہے، اور مذہب شیعہ سے اچھی طرح آگاہ ہو، پھر عام علوم وفنون کے علاوہ عقلیات بالخصوص علم منطق اور فلسفے اور ریاضی اور علم کلام وغیرہ میں کمال درجے کا درک رکھتا ہو، اور اس کے ساتھ مستقل مزاج بھی ہو، جو مطالعہ کرنے کا عادی ہو اور ذہن بھی وقاد طبع ذکی اور مزاج سیال رکھتا ہو، اور اس میں کسی حد تک للّٰہیت وروحانیت بھی پائی جاتی ہو، اور کشف سے بھی فی الجملہ مناسبت رکھتا ہو، وہ اس کتاب کو سمجھنے کا اہل ہوگا۔ اس کتاب کے دو تین صفحات مطالعہ کرنے کے بعد ذہن درماندہ ہو جاتا ہے، اور اس پر بے حد تھکاوٹ اور بوجھ پڑتا ہے، اور اس وقت اس کو ترک کر دینا پڑتا ہے، تا کہ پھر کسی دوسرے وقت تازہ دم ہو کر اس کا مطالعہ کیا جا سکے۔ امام ولی اللہؒ کی کتابوں کا حال بھی قریب قریب ایسا ہی ہوتا ہے۔

بہر حال! یہ کتاب حضرت نانوتویؒ نے ۱۲۸۶ھ/ (۱۸۶۹ء) میں لکھی ہے، اور پھر حج کے موقع پر حضرت حاجی امداد اللہؒ نے اس کو پڑھ کر اس کی تصدیق وتصویب فرمائی ہے، اور اس کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حضرتؒ خود مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس لیے یہ ہیچ مداں، بدترین گناہ گاراں، زبان ودل سے اس بات کا معترف ہے کہ میرے کلام پریشان میں اگر کوئی سخن دل نشین اہل دل اور کوئی تحقیق لائق تصدیق اہل حق ہے، تو وہ حضرت مرشد برحق ادام اللہ فیوضہ کے انتساب وتوسل کا پھل ہے، اور اگر اختلاط اغلاط اور آمیزش خرافات ہو، تو یہ تیرہ دروں خود قائل ہے کہ اپنی عقل نارسا ہے اور اپنے دماغ میں خلل ہے۔ یہی وجہ ہوئی حضرت پیرومرشد ادام اللہ فیوضہ کے سنانے کی ضرورت ہوئی؛ مگر جب زبانِ فیضِ ترجمان سے آفرین وتحسین سن لی، تو اصل مضامین کی حقیقت تو اپنے نزدیک محقق ہوگئی۔
> یوں کوئی منکر نہ مانے تو وہ جانے، منکروں کا کام یہی ہے''۔

اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں؛ لیکن اب تک کسی صاحبِ علم نے اس کتاب کی تبویب وتسہیل کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ میرے پیش نظر مطبع مجتبائی دہلی کا طبع شدہ نسخہ ہے، جو ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء/ کا مطبوعہ ہے، اور بڑے سائز کے دوصد ساٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کتاب میں حضرت نانوتویؒ نے

''مسئلۂ حیات النبی'' پر نہایت نفیس بحث کی ہے۔ کتاب کے جملہ مضامین اور علوم ومعارف پر بحث کرنا مجھ جیسے کم فہم طالب علم کا کام نہیں ہے۔

مولوی سعید احمد صاحب پالن پوری ''توثیق الکلام'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''آبِ حیات'' (اردو) اثباتِ حیاتِ انبیا علیہم السلام اس کتاب کا موضوع ہے۔ آپ کی تمام کتابوں میں یہ سب سے زیادہ مشکل کتاب سمجھی گئی ہے۔ اگر چہ اس میں سے ایک معتد بہ حصہ، جس کے بارے میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ (اوّلین صدر مدرس دارالعلوم دیوبند) کی رائے یہ تھی کہ: ''اسے کوئی نہیں سمجھ سکتا''، اس کو نکال دیا گیا ہے، اور یہ اوراق متخرجہ آبِ حیات پھلاودہ (بھارت میں ایک مقام کا نام ہے) میں ہیں۔ غرض اس کی شرح کی بھی خاص ضرورت ہے۔ ''وَلَعَلَّ اللّٰہَ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالیٰ یُوَفِّقُنِي لِذَالِکَ وَمَا ذَالِکَ عَلَیْہِ بِعَزِیْزٍ''۔

احقر عبدالحمید سواتی عرض کرتا ہے کہ: اوّلاً یہ روایت جو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی طرف منسوب کی گئی ہے، منکر معلوم ہوتی ہے کہ کچھ حصہ کتاب کا محض اس لیے نکال دیا جائے کہ وہ ادق، اصعب یا عسیر الفہم ہے۔ یہ حق صرف مصنف کا ہے کہ وہ خود اپنی کتاب میں سے نکال دے۔ دوسرے حضرات یا ناشرین وغیرہ کو اس کا حق حاصل نہیں۔ اگر خود مصنف نے ان اوراق کے استخراج کی اجازت دی ہے، تو اس کا ثبوت قطعی ہونا چاہیے۔ اگر یہ اوراق مصنف کی اجازت کے بغیر نکالے گئے ہیں، تو اس کو دوبارہ کتاب کے ساتھ شامل کرنا از حد ضروری ہے؛ ورنہ یہ علمی دیانت کے خلاف ہے۔

ثانیاً عرض ہے کہ اگر کتاب کے ادق ہونے کی وجہ سے اس کے حصوں کو الگ کرنا عام ناشرین یا شارحین کے لیے جائز ہوتا، تو پھر تمام ادق قسم کی کتابوں میں وہ حصے جو عام فہم نہیں ہیں، وہ نکال دیے جاتے؛ لیکن ایسا کرنا روا نہیں۔

ثالثاً عرض ہے کہ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کی بہت سی کتابیں اسی قسم کی ہیں، مثلاً ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے بعض مقامات، ''الخیر الکثیر''، ''تفہیمات الٰہیۃ'' کے بہت سے حصے، ''بدورِ بازغہ'' کے کئی مقامات، ''الہوامع'' کے کچھ حصے، ''سطعات'' کے بعض سطعات، ''لمعات'' کے کئی مقامات، ''الفوز الکبیر'' کے بعض مقامات؛ بلکہ شاہ ولی اللہؒ کی بہت سی کتابوں کے کئی مقامات ایسے ہیں؛ لیکن ان کو کسی شارح یا ناشر نے کتاب سے نکال دینے کی جرأت نہیں کی، اور نہ یہ مشورہ دیا ہے کہ ان کو عسیر الفہم ہونے کی وجہ سے نکال دیا جائے [1]۔

(۱) مضمون نگار سے اس موقع پر تسامح یہ ہوگیا ہے کہ: آبِ حیات کے صفحات کس نے نکالے، اور کیوں؟ تو یہ بات موافق واقعہ ہے کہ آبِ حیات کے کچھ صفحات عسیر الفہم ہونے کے سبب نکال دیے گئے؛ لیکن نکالا کس نے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود مصنف نانوتویؒ ہی نے نکالا ہے حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ کے مشورہ پر، نہ کہ مولانا یعقوب صاحبؒ نے۔

۶-تحذیر الناس من انکار اثر ابن عباس رضی اللہ عنہما:

یہ مختصر سا رسالہ حضرت نانوتویؒ کا ایک معرکتہ الآراء اور علمی رسالہ ہے۔ ایک استفتا کے جواب میں حضرتؒ نے تحریر فرمایا ہے۔ رسالہ اپنے استدلال اور علمی نکات کی دقت کی وجہ سے مشکل ہے۔ بعض لوگوں نے کم فہمی یا اپنی شقاوت کی وجہ سے عبارتوں میں قطع برید وتقدیم وتاخیر کر کے کچھ کا کچھ بنا کر حضرت نانوتویؒ پر تکفیر بازی بھی کی ہے۔ دراصل رسالے میں حضرتؒ نے آیتِ ختم نبوت (خاتم النبیین) کی ایسی عالی تحقیق فرمائی ہے، جس کی مثال علمی لٹریچر میں نہیں مل سکتی۔ ختم نبوت زمانی، مکانی اور رتبی ہر طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہے۔ آخر میں استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ (لکھنوی) اور دیگر علمائے کرام کی تصویب وتصدیق بھی شامل ہے۔

۷-مناظرۂ عجیبہ:

یہ کتاب بھی حضرت نانوتویؒ کے مکتوبات کے سلسلے کی کتاب ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ حصۂ اوّل میں محذوراتِ عشرہ جو ''تحذیر الناس'' کی عبارتوں پر کیے گئے ہیں، اور ان کے جوابات ہیں، اور دوسرے حصے میں وہ خط وکتابت ہے، جو حضرت نانوتویؒ کے ایک ہم عصر عالم مولانا عبدالعزیز صاحبؒ نے تحذیر الناس پر جو اعتراضات کیے تھے اور جانبین سے چار چار خطوط میں مولانا عبدالعزیز صاحبؒ اعتراضات لکھتے رہے، حضرت نانوتویؒ ان کے جوابات تحریر فرماتے رہے، بالآخر مولانا عبدالعزیز صاحبؒ نے حضرت نانوتویؒ کے موقف کو تسلیم کرلیا، جو اہل حق کا شیوہ ہوتا ہے۔

اس کتاب کے مکتوب ثالث میں حضرت نانوتویؒ لکھتے ہیں:

> ''اپنا دین وایمان ہے، بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں، جو اس میں تامل کرے، اس کو کافر سمجھتا ہوں''[۱]۔

اتنی واضح بات کے بعد بھی جو لوگ حضرت کی طرف غلط بات منسوب کرتے ہیں، ان کے بارے میں اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ ''لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ''. ایسے بدنیتوں کے لیے خداتعالیٰ کے ہاں روز قیامت میں روسیاہی کے سوا کیا ہوگا؟

۸-مکاتیب حضرت نانوتویؒ:

جدید طباعت میں اس مجموعے کا نام ''قاسم العلوم مع اردو ترجمہ انوار النجوم'' ہے۔ یہ فارسی زبان میں

(۱) مناظرۂ عجیبہ، ص:۱۰۳، (طبع قدیم)

دس مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ اس کی ترتیب وتبویب وتسہیل وتحشیہ وترجمہ حضرت مولانا پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹیؒ (فاضل دیوبند) فیصل آبادی نے کیا ہے، اور لاہور سے طبع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ پہلی طباعتوں میں چار حصوں پر مشتمل تھا؛ لیکن اب اس کی ایک ہی جگہ مترجم شکل میں جمع کر کے طباعت کرائی گئی ہے۔

اس میں بعض مکتوبات بہت اہم ہیں، مثلاً: مکتوب شرح حدیث ابی رزین رضی اللہ عنہ بہت مشکل اور اہم مکتوب ہے۔ اس کا ترجمہ اور تفہیم ابھی بہت کچھ ناکافی ہے۔ یہ حدیث محدثین کے نزدیک بھی بہت مشکل حدیث مانی جاتی ہے۔ محققین نے اس حدیث کی شرح اپنے اپنے انداز سے لکھی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ، امام عبدالکریم جیلیؒ نے ''الانسان الکامل'' میں اور امام ولی اللہ دہلویؒ نے ''فیوض الحرمین''، ''الدر الثمین'' اور ''تفہیمات الٰہیہ'' وغیرہ کتب میں اس کو بیان کیا ہے۔ امام بیہقیؒ نے کتاب ''الاسماء والصفات'' میں اور شیخ ابن عربیؒ نے ''فتوحات مکیہ'' میں اس حدیث پر بحث کی ہے۔ اس میں عماء کا مفہوم متعین کرنا اور نیز فوقیت، تحتیت، مکان ظرفیت وغیرہ کی وجہ سے اشکالات پیدا ہوتے ہیں، اور مسئلہ بھی اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور تجلیات کی بحث۔ یہ مکتوب بھی فارسی زبان میں ہے۔ علوم قاسمیہ کی دقت اس میں نمایاں ہے۔ مکتوب صعب بلکہ اصعب ہے۔ اس پر بہت زیادہ وقت اور محنت کی ضرورت اور اس کی تبویب وتسہیل ارباب حکمت قاسمیہ کے لیے اہم مقاصد میں سے ہے۔

اسی طرح عصمت انبیا کا مکتوب بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے عمدہ طریق پر عصمت انبیا کا مسئلہ حضرت نانوتویؒ نے بیان فرمایا ہے۔ اختصار وجامعیت کے ساتھ ہزاروں صفحات سے بے نیاز کرنے والا ہے۔ جن جن حضرات نے اس مسئلے پر کلام کیا ہے، ان سب سے دلائل کی قوت کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے۔ متکلمین کی عام کتابوں میں ایسی عمدہ بحث اس مسئلے پر کہیں نظر نہیں آئی۔ اسی طرح ''مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ'' کے موضوع پر جو مکتوب ہے، وہ بھی اپنی نظیر آپ ہے۔ اس مکتوب کا اردو ترجمہ اور تبویب وتسہیل حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی مفتی مدرسۂ نصرۃ العلوم نے کی ہے، جو بہت عمدہ ہے۔ اگر طبع ہو جائے، تو بہت مفید ہوگی۔ امید ہے کہ عن قریب یہ بھی طبع ہو جائے گی۔

باقی مکاتیب بھی علمی نکات سے لب ریز ہیں اور ہر ایک مکتوب اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسلام کے بہت سے شرائع وقوانین، احکام کی علل ومصالح، اسباب خفیہ اور حکم غامضۃ جس طرح ان مکاتیب سے سمجھ میں آتی ہیں از حد اہم اور لاجواب ہیں۔

۹۔تصفیۃ العقائد:

اس رسالے میں جو اردو زبان میں ہے، سر سید احمد خاں، بانی علی گڑھ کالج کے پندرہ سوالوں کے

جوابات ہیں، جن میں حضرت نانوتویؒ نے سر سید احمد خاں صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات کی نیچریت کا نہایت لطیف انداز میں رد فرمایا ہے اور سب کولا جواب کر دیا ہے، اور ضمناً علم وحکمت کے بے شمار حقائق آ گئے ہیں۔ آخر میں حضرت نانوتویؒ کا ایک مکتوب ہے سر سید احمد خاں صاحب کے نام، جو ناصحانہ اور مبلغانہ انداز میں احقاقِ حق کے لیے لکھا گیا ہے۔

۱۰-اسرار قرآنی:

یہ مختصر سا رسالہ ہے، فارسی زبان میں ہے، جس میں مختلف آیات قرآنیہ کے بارے میں مولانا محمد صدیق صاحب مراد آبادیؒ نے سوالات حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں لکھ کر بھیجے تھے۔ جن کے جوابات حضرتؒ نے تحریر فرمائے ہیں اور بہت سے اشکالات کو رفع کیا ہے۔ آخر میں معوذتین کی حکیمانہ تفسیر ہے، اور مثنوئ رومی کے ایک مشکل شعر کی شرح ہے۔ درحقیقت یہ بھی مکاتیب کے سلسلے میں شامل ہے۔

۱۱-تحفۂ لحمیہ:

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے، جس میں حضرت نانوتویؒ نے ہنود کے اس وہم باطل کا رد لکھا ہے کہ جانوروں کا ذبح کرنا ظلم ہے اور ان کا گوشت کھانا تعدی ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ حلال جانوروں کا گوشت کھانا اور ان کا ذبح کرنا بالکل فطرت کے مطابق ہے۔ عقل سلیم بھی اس کو تسلیم کرتی ہے۔ عقلی دلائل سے اس مسئلے کو حضرتؒ نے بین طور پر ثابت کر دیا ہے۔ اگر ان کا گوشت کھانا ظلم ہے، تو ان کی کھال کا جوتا پہننا اور ان کی ہڈیاں اور دیگر اجزا کا استعمال کرنا اور ان سے سواری وغیرہ کی خدمت لینا کون سا انصاف ہے؟

۱۲-انتباہ المؤمنین:

یہ مختصر سا رسالہ فارسی زبان میں ہے، اور ترمذی شریف کی اس حدیث کی شرح ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفائے راشدینؓ کا ذکر فرمایا ہے، اور ہر ایک کی ایک فضیلت کی خاص وجہ بیان فرمائی ہے۔ بے مثال تحقیق پر مشتمل ہے۔ رسالے کے آخر میں مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کا ایک مکتوب عربی زبان میں ہے، جو انہوں نے شیخ عبداللہ بغدادیؒ کے نام لکھا تھا، اور ''تقویۃ الایمان'' کے بارے میں اٹھائے گئے اعتراضات کے جوابات ہیں۔

۱۳-میلۂ خداشناسی:

اس رسالہ میں اس مذہبی مناظرہ اور بحث ومباحثہ کی روداد مذکور ہے، جو ۱۲۹۳ھ/(۱۸۷۶ء) میں

شاہجہاں پور میں ہوا تھا، جس میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں نے حصہ لیا تھا۔ ہندو، عیسائی اور مسلمان سب ہی اس میں شریک ہوئے تھے اور اہل اسلام کو اس میں فتح حاصل ہوئی تھی۔ اس بحث میں حضرت نانوتویؒ نے سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ حضرتؒ کی تقاریر اور جوابات اس میں درج ہیں۔

۱۴- مباحثۂ شاہ جہاں پور:

اس مجموعہ میں حضرت نانوتویؒ کی وہ تقاریر ہیں، جو آپ نے ۱۲۹۴ھ/(۱۸۷۷ء) میں مختلف عیسائی پادریوں اور ہندو پنڈتوں کے اعتراضات کے جوابات میں کی تھیں۔ پنڈت دیانند سرسوتی، پنڈت اندرمن، پادری اسکاٹ جو انجیل کا مفسر مانا جاتا تھا، اور پادری نولس وغیرہ معترضین نے جو مختلف اعتراضات اٹھائے تھے کہ خدا تعالیٰ نے دنیا کو کس چیز سے پیدا کیا ہے اور ذات باری تعالیٰ محیط کل کس طرح ہے؟ اور خدا تعالیٰ اگر عادل ہے، تو پھر رحیم کس طرح ہوسکتا ہے؟ قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے؟ اور بائبل کیوں الہامی نہیں اور وید کے الہامی ہونے میں کیا چیز مانع ہے؟ نجات کس چیز میں حاصل ہوسکتی ہے؟ وغیرہ۔ حضرت نانوتویؒ نے اپنی تقاریر میں ان سب اعتراضات کے جوابات بہ احسن طریق ذکر کیے ہیں، اور اسلام کی حقانیت کے عقلی و نقلی قوی دلائل بیان فرمائے ہیں، جو تمام اہل عقل وخرد کے لے سامان طمانیت پیدا کرتے ہیں اور اہل اسلام کے ہاتھ مخالفین کے رد کے لیے بے مثال قوی دلائل کا ذخیرہ آتا ہے۔

۱۵- توثیق الکلام فی الانصات خلف الامام:

یہ اردو زبان کا ایک مختصر رسالہ ہے، جس میں حضرت نانوتویؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرأت کرنی ممنوع ہے۔ نقلی دلائل کے ساتھ زیادہ تر عقلی انداز میں یہ مسئلہ سمجھا دیا ہے، انصاف شرط ہے۔

۱۶- الدلیل المحکم:

اس رسالہ میں بھی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے کی تحقیق بیان فرمائی۔ ''توثیق الکلام'' اور'' الدلیل المحکم'' درحقیقت ایک ہی کتاب کے دو نام ہیں؛ البتہ ''توثیق الکلام'' میں چند سطریں زائد ہیں۔ ان دونوں کی شرح وتسہیل واضافۂ عنوانات، تمہید، مقدمات وغیرہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا سعید احمد پالن پوری نے کی ہے، اور اس کا نام ''کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے''؟ تجویز کیا ہے، اور مکتبۂ وحیدیہ دیوبند سے شائع ہوئی ہے۔

۱۷- لطائف قاسمی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور تراویح کا مسئلہ اس میں ذکر کیا گیا ہے۔

۱۸- جمال قاسمی:

اس رسالہ میں حضرت نانوتویؒ کے دو مکتوب ہیں، جو حضرت مولانا سید جمال الدین دہلویؒ کے خطوط کے جواب میں حضرتؒ نے تحریر فرمائے ہیں۔ ایک مکتوب میں وحدت وجود کی تشریح ہے، اور دوسرے میں سماع موتی کا مسئلہ ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا سید جمال الدین دہلویؒ وہی بزرگ ہیں، جنہوں نے اپنی بعض تحریروں میں لکھا ہے کہ حضرت نانوتویؒ سے ہم نے ''سو رسائل ہندسہ، ہیئت، فلاحت طبعی، جبر و مقابلہ، جبر ثقیل وغیرھا علوم میں ایک ایک ورق لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ واللہ اعلم کہ حضرت نانوتویؒ کو ان رسائل کے لکھنے کا موقع پیش آیا، یا نہیں، اور یہ کہ یہ رسائل کس کے پاس ہیں؟ اسی طرح حضرت مولانا سید فخر الحسن گنگوہیؒ ''انتصار الاسلام'' کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''اور جناب مولانا کی وہ تحریریں، جو زیر طبع اب تک نہیں آئیں اور وہ کوئی سو جز ہوں گے، ان کے شائع کرنے پر بندے نے کمر ہمت باندھی تو ہے، خداوند کریم مدد کرے''۔ آمین!

۱۹- فیوض قاسمیہ:

یہ مجموعہ حضرت نانوتویؒ کے کچھ مکاتیب پر مشتمل ہے، جو مختلف حضرات نے آپ سے دریافت کیے تھے۔ بعض میں شیعہ حضرات کے اعتراضات کے جوابات ہیں، اور کچھ اعتراضات وہ ہیں، جو حضرتؒ کی کتاب ''ہدیۃ الشیعہ'' پر اٹھائے گئے تھے، ان کے جوابات دیے ہیں۔ ایک مکتوب جمعہ کی تحقیق پر مشتمل ہے۔ یزید کے ایمان اور عدم ایمان کی بحث، نذر لغیر اللہ کی تحقیق، علم غیب مختص ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ سری وجہری قرأۃ کی حکمت، بدعت وسنت کی تحقیق، تصور شیخ کا مسئلہ اور نفس کی تحقیق وغیرہ پر مشتمل ہے۔

۲۰- مصابیح التراویح:

بہ زبان فارسی بڑے سائز کے ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مسئلۂ تراویح کی وضاحت ہے، اور احادیث جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں، ان کی تشریح اور بیس عدد رکعات تراویح کا ثبوت شرعی وعقلی دلائل سے، اور یہ کہ بیس تراویح پڑھنا سنت کی فرد ہے، یہ بدعت نہیں۔ اس کو بدعت شمار کرنے والے حضرات غلو وتعدی کا شکار ہیں اور زیادتی کے مرتکب ہیں، اور حدیث: ''عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ'' کی تشریح بیان کی گئی ہے۔

ہمارے پیش نظر جو نسخہ ہے، یہ غیر مترجم ہے، اس کو ادارۂ نشر واشاعت دار العلوم دیوبند نے طبع کرایا

ہے۔ یہ کتاب حضرت نانوتویؒ نے اپنے تلمیذ رشید مولانا سید احمد حسن امروہیؒ جو دارالعلوم دیوبند کے قدیم فضلا میں تھے، ان کے ایک استفتا پر جو انہوں نے حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں بھیجا تھا، اس کے جواب میں لکھی ہے۔ نہایت اعلیٰ تحقیقات پر مشتمل ہے۔ مولانا سعید احمد پالن پوری لکھتے ہیں:

''اس کتاب کا ترجمہ مولانا اشتیاق احمد صاحب دیوبندیؒ نے کیا ہے، جو'انوارالمصابیح' کے نام سے شائع ہوا ہے؛ مگر اس سے کتاب کما حقہ حل نہیں ہوتی ہے۔ ابھی مزید کام کی ضرورت ہے''۔

۲۱-الحق الصریح فی اثبات التراویح:

یہ رسالہ بھی فارسی زبان میں مصابیح التراویح کی طرح بیس تراویح کے اثبات میں لکھا گیا ہے۔ یہ بھی ایک صاحب جناب عبدالرحیم خاں صاحب کے مکتوب کے جواب میں حضرت نانوتویؒ نے لکھا ہے، اور اس میں بیس رکعات کی مخالفت کرنے والے حضرات کے تعصب و ہٹ دھرمی کو ظاہر کیا ہے، اور اس سلسلے میں حضرت سائب ابن یزید رضی اللہ عنہ کی روایت پر جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ روایت مرسل ہے، اس کا جواب حضرت نانوتویؒ نے دیا ہے، اور متعصبین کی افسوس ناک حالت کو خوب آشکارا فرمایا ہے۔

۲۲-اسرار الطہارۃ:

یہ بھی مختصر سا رسالہ ہے اور اس کو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے حضرت نانوتویؒ کی تحریرات حاصل کر کے ان سے مرتب کیا ہے۔ اس میں طہارۃ کے اسرار حکم اور عجیب وغریب نکات بیان کیے گئے ہیں۔ قہقہے اور خروج ریح کیسے ناقض وضو ہوتے ہیں؟ اس کی حیرت انگیز تشریح بیان فرمائی ہے، اور ایسے حکیمانہ افکار بیان کیے ہیں، جن میں حضرتؒ منفرد معلوم ہوتے ہیں۔

۲۳-قصائد قاسمی:

اس رسالے میں حضرت نانوتویؒ کے چند قصائد ہیں۔ ایک قصیدۂ بہاریہ جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں زبان اردو میں ہے، جس کے ایک ایک شعر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق ومحبت، لگاؤ وتعظیم ظاہر ہوتی ہے۔ ایک قصیدہ عربی زبان میں ہے، جو ترکی خلافت کے خلیفۂ وقت سلطان عبدالحمید کے بارے میں لکھا ہے۔ بڑا معیاری قصیدہ ہے۔ زبان کے اعتبار سے کسی متقدم شاعر کی فصاحت وبلاغت سے کم نہیں۔ اس طرح ایک قصیدہ فارسی زبان میں ترکی خلافت کے متعلق ہے۔ اس دور میں علمائے دیوبند کا ایک بنیادی نظریہ خلافت اسلامیہ کے ساتھ اتصال تھا، جس کے نمائندے ترکی تھے۔ ایک قصیدے میں اپنے رفیق شہید حضرت حافظ ضامنؒ کا مرثیہ لکھا ہے، اور شجرۂ منظومہ بھی فارسی زبان میں ہے، اور مجموعے

میں کچھ قصائد دوسرے اکابر کے بھی ہیں، مثلاً مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ، مولانا فیض الحسنؒ، مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا بھی ایک ایک قصیدہ اس مجموعے میں شامل ہے۔

۲۴-حاشیہ بخاری شریف:

آخری پانچ پاروں کا حاشیہ حضرت نانوتویؒ نے اپنے استاذ محترم مولانا احمد علی سہارن پوریؒ کے حکم سے بالکل اسی انداز میں جس طرح حضرت سہارن پوریؒ نے لکھا ہے، تحریر کیا ہے، اور آخری حصے کے مشکل مسائل کا خوب حل کیا ہے۔

۲۵-فتوی متعلقہ اجرت تعلیم:

جس میں حضرت نانوتویؒ نے دینی تعلیم پر اجرت لینے کے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر محققانہ طریق پر بحث کی ہے۔

۲۶-جواب ترکی بہ ترکی:

یہ رسالہ دراصل حضرت نانوتویؒ کا لکھا ہوا نہیں ہے؛ بلکہ یہ آپ کے اشارے اور حکم سے آپ کے تلمیذ حضرت مولانا عبدالعلیؒ نے حضرت نانوتویؒ کے افادات سے اور آپ کے طرز استدلال سے آریہ سماجیوں کے ایک رسالے کے رد میں لکھا ہے۔ رسالہ ''آریہ سماچار'' بابت ماہ اساڑھ ۱۹۳۶ء/ بکرمی/ ۱۲۹۶ھ/ (۱۸۷۹ء) میں لالہ انندلال آریہ سماجی نے اسلام کے متعلق بعض غلط قسم کے اعتراضات کیے تھے، ان کا جواب اسی کی زبان اور محاورے میں دیا گیا ہے۔ یہ قدیم طباعت میں ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ بھی بہت سے علمی افادت پر مشتمل ہے، اور اس کے عنوانات وغیرہ کا اضافہ اور تسہیل مولانا اشتیاق احمد دیوبندیؒ مدرس دارالعلوم نے کی ہے، اور ''براہین قاسمیہ'' کے نام سے مجلس معارف القرآن کی طرف سے عمدہ کاغذ و کتابت کے ساتھ دیوبند سے طبع ہوئی ہے۔

۲۶-ہدیۃ الشیعہ:

۱۲۸۳ھ (۶۷-۱۸۶۶ء) میں شیعوں کے کچھ اعتراضات کے بارے میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ایک خط حضرت نانوتویؒ کی طرف لکھا تھا کہ ان اعتراضات کے جوابات لکھ کر روانہ فرمائیں۔ حضرت مولانا نانوتویؒ نے متفرق اوقات میں ان اعتراضات کے جوابات لکھ کر ماہ صفر ۱۲۸۴ھ (جون ۱۸۶۷ء)، یعنی چند ماہ میں اس کو مکمل کیا اور اس کا نام ''ہدیۃ الشیعہ'' رکھا۔ اس کتاب میں شیعہ حضرات کے

تمام اور مابہ الامتیاز مسائل کا ذکر آ گیا ہے۔ خلافت، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان و مقام، شیعوں کا عقیدہ و تقیہ، مباحث فدک، وراثت وغیرہ۔ حضرت نانوتویؒ نے قرآن کریم اور وہ احادیث جو اہل سنت والجماعت کی مسلمہ ہیں اور پھر ان روایات سے بھی جو مسلم عند الشیعہ ہیں، تمام اعتراضات کے ایسے مسکت جوابات دیے ہیں کہ ان کے جواب سے ان شاء اللہ! شیعہ ہمیشہ عاجز رہیں گے۔ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ عام فہم اردو زبان میں لکھی گئی ہے، اور اس میں منطقی اصطلاحات وغیرہ کا ذکر بھی کم ہے۔ اس سے عام تعلیم یافتہ حضرات بہ خوبی استفادہ کر سکتے ہیں، اور اس کتاب میں ضمناً ایسے عجیب و غریب علمی نکات بیان کیے گئے ہیں، جن سے اہل علم کو ایقان و اذعان نصیب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عالم برحق کو دین قیم کے بارے میں کتنی عظیم سمجھ عطا فرمائی تھی؟ یہ کتاب اس پر دلیل بیّن ہے۔

یہ کتاب پاکستان میں دوبار طبع ہوئی ہے: پہلی دفعہ کراچی میں۔ پہلی طباعت کے وقت حضرت مولانا محمد اسلم صاحب (سابق خطیب مسجد ہیڈ کوارٹرز کراچی) نے کتاب میں جا بجا عمدہ مفید عنوانات قائم کیے ہیں، جس سے کتاب کی اچھی تبویب و تسہیل سے اس کتاب کے مضامین و مسائل زیادہ قریب الفہم ہو گئے ہیں۔ ساتھ کتاب کی فہرست بھی مرتب کی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے، اور اس کی دوسری طباعت لاہور میں مکتبۂ نعمانیہ والوں نے کرائی ہے۔ بہر حال! جو حضرات فرقۂ شیعہ کے ساتھ مبتلا ہوتے ہیں، ان کے لیے بالخصوص اور عام اہل علم کے لیے بالعموم اس کتاب کا مطالعہ از حد ضروری ہے اور غایت درجے مفید۔

۲۸- اجوبۂ اربعین:

یہ اردو زبان میں پہلی طباعت سے دو حصوں میں تقریباً ڈھائی صد صفحات پر مشتمل ہے، اور اس کتاب میں شیعہ حضرات کے چالیس اعتراضات کے جوابات ہیں۔

مولانا سعید احمد صاحب مدرس دار العلوم دیو بند نے ’’توثیق الکلام‘‘ کے مقدمے میں حضرت نانوتویؒ کی کتابوں کا تعارف بھی مختصر طور پر کرایا ہے، اسی ضمن میں حضرت نانوتویؒ کی چند مزید کتابوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

۲۹- اجوبۃ الکاملۃ فی الاسولۃ الخاملۃ (اردو):

کسی شیعہ کے پانچ لغو قسم کے اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہے۔

۳۰- مکاتیب قاسمی (فارسی):

یہ مسائل سلوک پر چند مکاتیب ہیں۔

۳۱-الحظ المقسوم من قاسم العلوم (عربی):

یہ ”جزء الذي لا يتجزى“ کا اثبات اور سماع وغنا کی تحقیق پر مشتمل ہے۔ حضرت نانوتویؒ کے تلمیذ مولانا محمد رحیم اللہ بجنوریؒ کے نام یہ دو مکتوب ہیں، جو فصیح عربی زبان میں ہیں [1]۔

واللہ اعلم

احقر عبدالحمید سواتی

خادم مدرسۂ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

شعبان المعظم ۱۴۰۱ھ

جون ۱۹۸۱ء

(۱)(ماخوذ از): اجوبۂ اربعین، ص:۲۰ تا ۴۵، مطبوعہ گوجرانوالہ)

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور تحریک ولی اللّٰہی

جناب عبدالوحید صدیقیؒ ✿

اُنیسویں صدی میں برصغیر پاک و ہند نے بعض بڑی بڑی علمی و مذہبی شخصیات اور فکری و تعلیمی تحریکات کو جنم دیا۔ یہ وہ صدی ہے، جس میں برصغیر مکمل طور پر برطانوی تسلط میں آ گیا۔ جس کے نتیجے میں یورپ کی جدید تہذیب کے اثرات زندگی کے ہر شعبے میں محسوس کیے جانے لگے۔ ان اثرات میں سے بعض کو بغیر کسی حسّی مزاحمت کے تسلیم کرلیا گیا؛ لیکن بعض ایسے بھی تھے، جو یہاں کے مذہبی طبقے کو کانٹے کی طرح چبھنے لگے۔ سب سے بڑی چیز جس نے یہاں کی مسلم آبادی کو برافروختہ کیا، وہ ایک غیر قوم کا سیاسی تسلط اور مذہبی غلبہ تھا۔ اگر چہ یہ کوئی ایسی ان ہونی بات نہ تھی، اور اس کے اسباب وعلل ان سیاسی، معاشی و معاشرتی حالات میں موجود تھے، جو اورنگ زیب عالم گیرؒ کے دور کے بعد اس سرزمین میں آہستہ آہستہ ظہور پذیر ہو رہے تھے، اور جن کی طرف شاہ ولی اللّٰہؒ نے اپنی کتابوں میں اشارات کیے ہیں۔

برطانوی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے انیسویں صدی کے نصف اول میں مختلف تحریکوں نے جنم لیا۔ اس سلسلے میں مختلف سیاسی، مذہبی اور علمی طریقوں کو آزمایا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریز کا کھلم کھلا مقابلہ کیا گیا؛ لیکن چوں کہ اصل سماجی، معاشی، سیاسی اور مذہبی کم زوریوں کی طرف توجہ مبذول نہ کی گئی؛ لہٰذا یہ ساری کوششیں ناکام ہوئیں؛ البتہ انیسویں صدی کے نصف ثانی میں کچھ ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں، جو زوال اور ناکامی کے اصل اسباب کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ انہوں نے خود اپنے حالات ومسائل سے واقفیت پیدا کرنے کے علاوہ یورپ کے علم فلسفہ، فن اور تہذیب سے بھی استفادہ کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ چناں چہ ان ہی ہستیوں کی کوششیں دیرپا ثابت ہوئیں اور انہیں کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں علمی و فکری ارتقا کے ساتھ ساتھ سیاسی و معاشرتی شعور بھی پیدا ہوا۔ بہ قول شیخ محمد اکرام:

> ''تیرھویں صدی ہجری ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اہم کش مکش کی حامل تھی۔ ان کے سیاسی تنزل کی تکمیل اسی صدی میں ہوئی؛ لیکن ان کے مذہبی احیا اور معاشرتی اصلاح کے آغاز کا زمانہ بھی یہی تھا''۔

✿ جناب عبدالوحید صاحب صدیقی، ایم.اے، سابق استاذ سندھ یونی ورسٹی، شعبۂ اسلامی کلچر و تقابلِ ادیان۔

تیرھویں صدی ہجری کی ان علمی و مذہبی ہستیوں نے الگ الگ طریقوں سے دین وملت کے احیا اور سیاسی قیادت کی تجدید کی کوششیں کیں، گوان سب کا مقصد واحد تھا؛ لیکن طریق ہائے کار مختلف تھے۔ سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا عبدالحی، مولانا نصیر الدین منگلوری اور مولوی نصیر الدین دہلوی وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم نے ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۹ء تک سلسلۂ جہاد جاری رکھا؛ لیکن کامیابی نہ ہوسکی، اوران میں سے اکثر حضرات کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جن حضرات نے حصہ لیا، ان کا ذکر اس مضمون کے مقصد سے خارج ہے۔ ان حضرات میں سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی ایک تھے۔ اس جنگ آزادی کی ناکامی کی بعد کچھ اہل بصیرت نے مسلمانوں کی خالص دینی تعلیم اوران میں جو بدعات پھیلی ہوئی تھیں، ان کے استیصال کی طرف توجہ کی، جن میں ہمیں مولانا نانوتویؒ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اسی زمانے میں مسیحی وآریہ سماجی مشنریوں کی طرف سے اسلام پر جو اعتراضات کی بوچھاڑ ہورہی تھی، اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کا جدید ذہن کم از کم تشکیک کی سرحد تک پہنچ جاتا تھا۔ اس کی روک تھام کے لیے ڈاکٹر وزیر خاںؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، مولوی آلِ حسنؒ اور مولوی سید ناصر الدینؒ کے ساتھ ساتھ مولانا نانوتویؒ نے بھی تقریری مناظروں اور تحریری جوابات کا سلسلہ شروع کیا، اوراس طرح ہمارے ہاں ''جدید علم کلام'' کی بنیاد رکھی گئی۔

جدید یورپی فلسفہ حصولِ علم کے استخراجی طرق سے زیادہ استقرائی وتجرباتی طریقوں کو بہ روئے کار لاتا ہے، اور یہی جدید سائنس اور علم کی بنیاد ہے۔ لارڈ میکالے کی ۱۸۳۳ء کی تعلیمی رپورٹ کے بعد پرانے مدارس سے زیادہ جدید اسکولوں اور کالجوں کی طرف توجہ دی جانے لگی، جن میں قدرتی طور پر استقرا اور تجربات ومشاہدات کو فوقیت دی جاتی تھی۔ مولانا نانوتویؒ نے اس امر کو محسوس کرتے ہوئے اپنی مناظروں کی تقریروں اور تصنیفات میں استخراج سے زیادہ تمثیلات، محسوسات، تجربات اور مشاہدات کو اساسی استدلال بنایا، اوراس طرح مولانا قاری طیب کے الفاظ میں:

> ''اثباتِ مذہب حق کے لیے فلسفیانہ علوم اور ایک نئی اور اچھوتی حکمت کی بنیاد ڈالی، جس میں عقلی ہی نہیں، حسی انداز میں اصول وفروعِ اسلام کو مضبوط اور مدلل طریق پر پیش کیا گیا، اور فکر ونظر کو اسی انداز میں ڈھال دینے کا عمومی راستہ ہموار کردیا گیا''[1]۔

آپ کا یہ طرز فکر، نیز مدرسۂ دیوبند جیسے عظیم الشان تعلیمی وروایتی مرکز کی تاسیس آپ کے ایسے کام ہیں،

---

(۱) سوانح قاسمی، (مقدمہ) ص: ۶۔

جن کی بہ دولت آپ کو سرزمینِ ہند کے مسلمانوں کے دلوں میں بہت بڑا مقام حاصل ہے۔ بہ قول مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم:

''آپ چودھویں صدی ہجری کے مجدّ دین میں سے تھے، اور آپ نے ولی اللّٰہی حکمت و معارف کو اہلِ ہند کے لیے زمانۂ حاضر کے لباس میں پیش کیا''۔

مولانا نانوتویؒ کی ان علمی، فکری، سیاسی اور مذہبی کوششوں کی تفصیلی اور اس سلسلے میں ان کے ذہنی ارتقا پر بحث کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ضلع سہارن پور، یو. پی کے ایک چھوٹے سے تاریخی قصبہ ''نانوتہ'' میں ۱۲۴۸ھ/(۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے۔ یہ قصبہ دہلی سے شمال کی جانب تقریباً ایک سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ مولانا محمد قاسمؒ کا سلسلۂ نسب حضرت قاسم ابن محمد ابن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ مولوی محمد ہاشمؒ کو شاہ جہاں بادشاہ کا تقرب حاصل تھا۔ بادشاہ نے آپ کو نانوتہ کے اطراف میں چند دیہات جاگیر میں دیے۔ آپ نے نانوتہ کو اپنا مستقل مسکن بنایا اور ان کے بعد ان کا خاندان یہاں رہنے لگا۔

آپ کے والد شیخ اسد علی صدیقیؒ اگر چہ فارسی کے مشہور شاعر فردوسی کے ''شاہ نامہ'' تک پڑھے ہوئے تھے؛ لیکن علم سے انہیں کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ ان کی ساری عمر کھیتی باڑی میں گزری؛ البتہ آپ کے دوسرے عزیزوں میں کچھ ایسے لوگ ضرور تھے، جو علوم مروجہ سے کما حقہ واقف تھے۔ ان میں آپ کے چچا مولانا مملوک العلیؒ کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ انیسویں صدی کے نصف آخر کے کئی مشہور علما مثلاً: ذکاء اللہ، نذیر احمد، سر سید احمد خاں، عبدالرحمٰن پانی پتی، احمد علی سہارن پوری، محمد مظہر نانوتوی، رشید احمد گنگوہی اور محمد یعقوب نانوتوی کے استاذ تھے[1]۔

ان کی علمی لیاقت کے متعلق سر سید احمد خاں لکھتے ہیں:

''جناب مولوی مملوک العلیؒ شاگرد مولوی رشید الدین خاںؒ معقول و منقول میں استعدادِ کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استقصا ہے کہ فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے، تو ان کی نقل ممکن ہے''۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بچپن سے ہی علمی رجحانات رکھتے تھے۔ آپ کے عربی کے سب سے پہلے

(۱) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص:۲۱۶۔

استاد اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے تایا مولانا مہتاب علیؒ نے ظریفانہ طور پر آپ کا نام ''علم کی بکری'' تجویز کیا تھا۔ آپ بڑے ذہین، طبّاع، بلند ہمت، تیز، وسیع الحوصلہ، جفاکش، جری، چست اور چالاک تھے(۱)۔

ابتدائی تعلیم نانوتہ میں حاصل کرنے کے بعد آپ نے دیوبند میں مولانا مہتاب علیؒ کے مکتب میں عربی پڑھنی شروع کی۔ بعد ازاں آپ سہارن پور میں اپنے نانا کے پاس چلے گئے، جو یہاں وکالت کرتے تھے اور نہایت عزت واحترام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ وہاں مولانا محمد قاسمؒ کو علمی وادبی ماحول میسر آیا۔ آپ کے نانا فارسی ادب میں اچھی مہارت رکھنے کے علاوہ اردو کے شاعر بھی تھے۔ سہارن پور میں آپ کو مولوی محمد نوازؒ کے سپرد کیا گیا اور ان کے پاس آپ نے کافیہ تک کتب پڑھیں۔ اس کے بعد آپ کو کوئی ایک سال تک دینی تعلیم چھوڑنی پڑی؛ کیوں کہ سہارن پور میں ہولناک وبائی بخار پھیل گیا، جس میں آپ کے نانا کا انتقال ہو گیا اور مجبوراً آپ کو سہارن پور کی رہائش ترک کرنی پڑی۔

اتفاق سے ۱۲۵۹ھ/ (۱۸۴۳ء) میں مولانا مملوک العلی صاحبؒ اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے نانوتہ آئے، اس وقت موصوف دلی کے مشہور اینگلو عربک کالج میں پروفیسر تھے، آپ نے مولانا نانوتویؒ کی ذہانت اور علمی استعداد کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ وہ آپ کو اپنے ساتھ دہلی لے جائیں۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا، مولانا نانوتویؒ کی اصل تعلیم وتربیت کا زمانہ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

دہلی میں آپ نے سب سے پہلے مولانا مملوک العلیؒ سے کافیہ پڑھنا شروع کیا۔ ایک سال بعد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی مولانا مملوک العلیؒ کے یہاں بہ حیثیت ایک طالب علم کے آئے اور جلد ہی مولانا نانوتویؒ کے ہم سبق ہو گئے۔ یہاں ان دونوں بزرگوں کی نہ صرف ظاہری تعلیم ہوئی؛ بلکہ انہیں ۱۸۵۷ء/ کے اس محاربۂ آزادی کے لیے بھی تیار کیا گیا، جس میں تحریک ولی اللّٰہی کے قائدین کو حصہ لینا تھا۔ بات یہ ہے کہ جیسا کہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے لکھا ہے کہ: ان کے استاد مولانا مملوک العلیؒ ایک باکمال استاد ہونے کے علاوہ ۱۸۴۱ء/ سے ۱۸۴۶ء/ تک تحریک ولی اللّٰہی کے دورِ ثانی کے امام اور مولانا محمد اسحاقؒ کے نائب بھی تھے۔ ظاہراً وہ انگریزی حکومت کے ملازم تھے؛ لیکن فی الحقیقت وہ شاہ ولی اللہؒ کی اس دینی، علمی، سیاسی وسماجی تحریک کے کارکنوں میں تھے، جسے ایک سو برس قبل شاہ صاحبؒ احیائے ملت کے لیے وجود میں لائے تھے۔

---

(۱) سیدنا الامام الکبیر، ص: ۲۶۔

ظاہری تعلیم کے سلسلے میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اکثر درسی کتب مولانا مملوک العلیؒ سے پڑھیں۔ آپ کا معقولات کی طرف خاص رجحان تھا۔ معقول کی مشکل سے مشکل کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ میر زاہد، قاضی، صدرا، شمس بازغہ وغیرہ اس طرح پڑھتے تھے جیسے حافظِ قرآن منزل سناتا ہے(1)۔

دوسرے طالب علموں کی طرح آپ ان کتب کا ترجمہ نہیں کرتے تھے، اور نہ سبق پڑھنے سے پہلے مطالعہ کرتے؛ بلکہ ایسا پڑھتے تھے، جیسے تلاوت ہو رہی ہے۔

علوم مروّجہ کی تقریباً سب کتب ختم کرنے کے بعد مولانا نانوتویؒ نے شاہ عبدالغنیؒ اور مولانا احمد علی سہارن پوریؒ سے حدیث پڑھی۔ معقولات کی طرح منقولات میں بھی آپ دوسرے طلبا سے ممتاز تھے۔ حدیث پڑھتے وقت بالعموم آپ یہ سوچا کرتے تھے کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں فرمائی؟

درس نظامی سے فراغت کے بعد آپ کچھ عرصے تک دہلی کے اینگلو عربک کالج میں پڑھتے رہے اور اس سلسلے میں آپ نے حساب، اقلیدس وغیرہ میں اپنی غیر معمولی قابلیت دکھائی؛ لیکن آپ کالج کے امتحان میں شریک نہ ہوئے۔

اس زمانے میں مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ حدیث کی قلمی کتب کی تصحیح، تحشیہ اور اشاعت میں مصروف تھے۔ مولانا نانوتویؒ نے ان کے یہاں ملازمت کر لی اور اس دوران میں صحیح بخاری کے آخری پانچ اجزا پر حاشیہ لکھا۔ ان اجزا کے وہ مقامات خاص طور پر مشکل تھے، جن میں امام بخاریؒ نے امام ابوحنیفہؒ پر اعتراضات کیے ہیں۔ مولانا نانوتویؒ نے ان اجزا کی تصحیح و تحشیہ میں غیر معمولی کاوش سے کام لیا۔ حنفی مذہب کی تائید میں مستند دلائل دیے۔

اس زمانے میں مختلف چھاپہ خانوں میں دینی کتابوں کی تصحیح و تحشیہ کا کام آپ کا ذریعۂ معاش تھا۔ یہ بھی گویا ایک طرح سے ان کا حصولِ علم ہی کا زمانہ تھا۔ دورۂ حدیث کے اثنا میں ہی مولانا نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے مل کر حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت کر لی تھی۔ آپ نے کچھ عرصے شیخ کی خدمت میں رہ کر منازلِ سلوک طے کیں۔ اس دوران آپ نے وعظ و فتوے سے الگ رہ کر زیادہ وقت ذکر و مراقبے میں گزارا، اور بڑی سادگی اور تقشّف سے زندگی بسر کر لی۔ بالآخر حاجی صاحبؒ نے یہ کہتے ہوئے آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا:

---

(1) دیکھیے: قصص الاکابر، ص: ۲۹۔

''قاسم کے زہد وتقویٰ کی مثال پہلے زمانے میں ملے تو ملے؛ لیکن ہمیں اس زمانے میں نہیں ملتی''۔

شیخ مظفر حسین کاندھلویؒ کے اصرار پر آپ نے منبر سے پہلی بار وعظ فرمایا اور پھر رفتہ رفتہ آپ کو وعظ میں کمال حاصل ہوگیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ یہ کہنے لگ گئے کہ مولانا کی خوش بیانی اور پُر گوئی یا تو وعظ میں ہوتی ہے، یا سبق پڑھانے میں۔ باقی آپ کی معمولی گفتگو قصباتی ہے[1]۔

وعظ پر اس قدر قدرت ہونے کے باوجود آپ عام طور پر وعظ نہ کہتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے اصرار کیا تو فرمایا:

''وعظ ہم لوگوں کا کام نہیں اور نہ ہمارا وعظ کچھ مؤثر ہوسکتا ہے۔ وعظ کا کام تھا مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا اور انہیں کا وعظ مؤثر بھی تھا''[2]۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مولانا نانوتویؒ کے حصہ لینے کے متعلق اختلاف آرا ہے۔ آپ کے سب سے قریبی رشتے دار اور دوست مولانا محمد یعقوبؒ ولد مولانا مملوک العلیؒ کے بیان کے مطابق آپ فسادوں سے کوسوں دور تھے۔ یہ آپ کے دشمنوں کی پھیلائی ہوئی بات تھی کہ آپ تھانہ بھون اور شاملی کے فساد میں شریک تھے۔ اسی بنا پر آپ کچھ عرصے تک روپوش رہے، پھر پنجاب اور سندھ ہوتے ہوئے کراچی سے حج کرنے چلے گئے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور مولانا محمد میاں ناظم جمعیت علمائے ہند نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آپ کی شرکت کی نوعیت کی وضاحت ہوتی ہے۔ مولانا سندھیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے تقریباً سولہ سال قبل ہندوستان کے حالات کو ناسازگار پا کر مولانا محمد اسحاقؒ نے تحریک ولی اللّٰہی کا مرکز دہلی سے مکۂ معظمہ منتقل کردیا، اور دہلی میں ایک نمایندہ بورڈ مقرر کیا جو ہندوستان میں ان کی نیابت کرتا تھا۔ اس بورڈ کے صدر مولانا مملوک العلی صاحبؒ تھے۔ ان کے بعد اس کی صدارت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے سپرد کی گئی۔ مولانا نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی اس جماعت میں شامل تھے۔ اس جماعت کا براہ راست ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے کوئی تعلق نہ تھا؛ لیکن چوں کہ جنگِ آزادی شروع ہوگئی تھی؛ اس لیے قدرتاً اس ولی اللّٰہی جماعت کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ آیا وہ اس محاربے میں شریک ہو، یا اس سے بے تعلق رہے؟ چناں چہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے جماعت کے سربرآوردہ حضرات کا اجتماع ہوا، اور اس میں یہ طے پایا کہ بجائے ''فسادیوں'' کے ساتھ شامل ہونے کے یہ جماعت الگ سے جہاد کرے۔

---

(۱) حکایاتِ اولیا، ص:۲۲۹۔ (۲) ایضاً، ص:۲۲۷۔

اس سلسلے میں حاجی امداد اللہ صاحبؒ امیر مقرر کیے گئے اور مولانا نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حافظ ضامنؒ اور مولانا محمد منیرؒ وغیرہ کو دوسرے انتظامات دیے گئے۔ اس جماعت کا بڑی آسانی سے تھانہ بھون پر قبضہ ہوگیا۔ وہاں سے شاملی کی طرف کوچ کیا گیا۔ ان کا نصب العین دہلی تھا(۱)۔

راستے میں کئی مقامات پر معرکے ہوئے۔ مولانا نانوتویؒ کے متعلق حضرت حاجی صاحبؒ نے مولانا محمد منیر صاحبؒ سے کہا:

''محمد قاسم بالکل آزاد اور جری ہیں، ہر صف میں بے محابا گھس جاتے ہیں''(۲)۔

مولانا عاشق الٰہی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحبؒ، مولانا گنگوہیؒ، مولانا نانوتویؒ اور حافظ ضامن صاحبؒ کا مقابلہ بندوقچیوں سے ہوگیا۔ پھر کیا تھا:

''یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا؛ اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہوگیا۔ اللہ رے شجاعت و جواں مردی کہ جس ہول ناک منظر سے شیر کا پتا پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہوجائے، وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے، گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چناں چہ آپ پر فائر ہوئے، اور حضرت حافظ ضامنؒ زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے''(۳)۔

ان معرکوں کے بعد شاملی پر ۱۴؍ستمبر ۱۸۵۷ء کو مجاہدین کا قبضہ ہوگیا؛ لیکن ان ہی دنوں انگریزوں نے دہلی فتح کر لی اور جنگِ آزادی کا مرکز ان کے ہاتھ آگیا۔ اس سے لوگوں کی ہمتیں پست ہوگئیں اور سب اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ دہلی فتح کرنے کے بعد انگریزی فوجیں تھانہ بھون کی طرف بڑھیں، باوجود اس کے کہ مجاہدین بڑی بہادری سے لڑے؛ لیکن بالآخر شکست کھائی۔ حاجی امداد اللہؒ، مولانا عبد الغنیؒ اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ تو بچ کر نکل گئے اور بہ سلامت مکۂ معظمہ پہنچ گئے؛ لیکن مولانا نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ہندوستان ہی میں رہے۔

اوپر کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں تک اس فتنہ وفساد کا تعلق ہے، جو ۱۸۵۷ء کے محاربۂ آزادی کے سلسلے میں ہوا، یہ بزرگ اس سے بے تعلق رہے، اور اس کو انہوں نے اچھا نہیں سمجھا؛ لیکن وہ اس

(۱) سوانح قاسمی، ج:۲، ص:۱۲۹۔
(۲) ایضاً، ج:۲، ص:۱۳۷۔
(۳) تذکرۃ الرشید، ج:۱، ص:۷۴۔

موقع پر انگریزوں کے خلاف لڑے ضرور اور خود اپنی کمان بنا کر لڑے۔ گویا وہ ''فسادیوں'' کے ساتھ شریک نہیں تھے؛ لیکن جنگِ آزادی میں انہوں نے اپنا فرض لازماً ادا کیا۔ انہوں نے جہاد کیا اور جہاد فساد نہیں ہوتا؛ بلکہ قاطع فساد ہوتا ہے[1]۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے فرو ہونے کے بعد مولانا محمد قاسمؒ کے نام وارنٹ جاری کیے گئے اور ان کی گرفتاری کے لیے انعام کا اعلان بھی ہوا۔ اس پر آپ روپوش ہو گئے اور دو سال تک گاؤں گاؤں اور شہر شہر پھرتے رہے اور گرفتار نہیں ہوئے۔ اس اثنا میں حاجی امداد اللہ صاحبؒ مکۂ معظّمہ پہنچ چکے تھے۔ مولانا نانوتویؒ نے بھی مکۂ معظّمہ کا قصد فرمایا۔ وہ پنجاب سے ہوتے ہوئے سندھ پہنچے اور وہاں سے ۱۲۷۷ھ/(۱۸۶۰ء) کو جہاز میں بیٹھ کر حجاز مقدس کو روانہ ہوئے۔ آپ نے ایک سال حجاز مقدس میں گزارا، پھر واپس وطن لوٹے اور دہلی میں منشی ممتاز علیؒ کے مطبع مجتبائی میں ملازمت کر لی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی یہ کوشش بھی جاری رہی کہ کسی طرح شاہ محمد اسحاقؒ کے اس کام کو جسے وہ حجاز جاتے ہوئے ایک نمائندہ بورڈ کے سپرد کر گئے تھے، شروع کر سکیں، یعنی امام عبدالعزیزؒ کے مدرسۂ دہلی کے نمونے پر ایک مدرسہ قائم ہو، جو آگے چل کر ولی اللہی تحریک کا مرکز بن سکے۔

ولی اللہی تحریک کے قائدین نے مناسب سمجھا کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد منیرؒ اور مولانا محمد مظہرؒ ہندوستان میں رہ کر تحریک کو نئے سرے سے ایسے انداز میں شروع کریں کہ حکومتِ برطانیہ کو اس پر کسی قسم کا شک وشبہ نہ ہو۔ چناں چہ اس کی بہترین صورت یہی تھی کہ ملک کے اندر دینی مدارس قائم کیے جائیں، جہاں سے ایسے علما فارغ التحصیل ہوں، جو معاشرتی و دینی اصلاح کے ساتھ ساتھ سیاسی جدو جہد میں بھی حصہ لے سکیں۔ اس مقصد کے پیش نظر دار العلوم دیوبند، جامعۂ قاسمیہ، مدرسۂ شاہی مراد آباد اور مظاہر العلوم سہارن پور قائم ہوئے اور انہیں سیاسیات سے علاحدہ رکھنے کا اعلان کیا گیا۔

دار العلوم دیوبند کی ابتدا، ۱۵؍محرم ۱۲۸۳ھ/(۳۰؍مئی ۱۸۶۶ء) کو دیوبند کی چھتہ کی تاریخی مسجد میں ایک طالب علم محمود (جو آگے چل کر شیخ الہند مولانا محمود حسن کے نام سے مشہور ہوئے) اور ایک استاد ملا محمود سے ہوئی[2]۔

---

(۱) علمائے ہند کا شان دار ماضی۔

(۲) تاریخ دار العلوم دیوبند۔

اسی سال مولانا مملوک العلیؒ کے فرزند مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے محکمۂ تعلیم میں اپنی ملازمت سے استعفا دے دیا اور وہ مدرسے کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ پہلے سال کے اختتام تک طلبہ کی تعداد اٹھتر تک پہنچ گئی۔ اس تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ مسجد چھتہ ناکافی ثابت ہوئی، اور ۱۸۷۶ء میں دار العلوم کی موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس موقع پر ایک بہت بڑا مجمع تھا، جسے مخاطب کرتے ہوئے مولانا نانوتویؒ نے فرمایا:

''عالم مثال میں اس مدرسہ کی شکل ایک معلق ہانڈی کی مانند ہے، جب تک اس کا مدار توکل علی اللہ پر رہے گا، یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا''(۱)۔

مولانا محمد قاسمؒ اگرچہ علم وفضل میں اپنے دور میں یک تائے روزگار تھے؛ لیکن عام لوگوں میں آپ کی شہرت زیادہ تر ان مناظروں اور مباحثوں کی وجہ سے ہوئی، جو آپ کے اور آریہ ساجیوں اور عیسائیوں کے درمیان ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جس میں اس سرزمین میں انگریزی حکومت کے پاؤں جم چکے تھے اور اس نے ہر فرقے کو جو مذہبی آزادی دی تھی، اس کی وجہ سے عیسائیوں اور آریہ ساجیوں کی طرف سے اسلام پر عام اعتراضات کیے جارہے تھے، اور اس طرح اسلام کے خلاف غیر مسلموں کا تقریری وتحریری محاذ قائم ہو گیا تھا۔

۱۲۹۳ھ/(۱۸۷۶ء) کا ذکر ہے، ضلع شاہ جہاں پور کے ایک ذی مقدور اور صاحب جائداد شخص منشی پیارے لال کبیر پنتھی نے عیسائیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک مذہبی مناظرہ کا انتظام کیا اور اس کا نام ''میلۂ خدا شناسی'' رکھا۔ اس میلے میں عیسائیوں کی طرف سے پادری نولس اور مسلمانوں کی طرف سے مولانا محمد قاسمؒ اور مولوی سید ابو المنصور دہلویؒ شریک ہوئے۔ مولانا محمد قاسمؒ نے ابطالِ تثلیث وشرک اور اثباتِ توحید پر تقریر فرمائی۔ اس ضمن میں اتنے پختہ، مؤثر اور وزنی دلائل دیے کہ کسی سے ان کا جواب بن نہ پڑا، اور مناظرے کی کامیابی کا سہرا مولانا محمد قاسمؒ کے سر رہا۔ قرب وجوار کے لوگوں میں مولانا کی یہ کامیابی ''نیلی لنگی'' کی کامیابی کہی گئی اور یہ مناظرہ اس نام سے مشہور ہوا۔ یہ اس لیے کہ مولانا محمد قاسمؒ اس مناظرے میں نیلی لنگی پہنے ہوئے تھے۔

اگلے سال ایک اور مباحثہ ہوا، جس میں ہندوؤں کی طرف سے آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی اور منشی اندرمن اور عیسائیوں کی طرف سے پادری اسکاٹ، پادری نولس اور پادری واکر وغیرہ شریک ہوئے۔ مولانا محمد قاسمؒ کے علاوہ مولانا محمد علیؒ جو مذہب ہنود پر بڑا عبور رکھتے تھے، مسلمانوں کی اس مباحثے میں

(۱) تاریخ دار العلوم دیوبند۔

نمائندگی کر رہے تھے۔ ضلع شاہ جہاں پور کے منشی پیارے لال کبیر پنتھی بانی میلۂ خدا شناسی نے اہل مباحثہ کے سامنے پانچ سوالات کیے تھے، جن کے جوابات مولانا محمد قاسمؒ نے اس قدر مدلل اور مثبت طریقے سے دیے کہ گزشتہ سال والے مباحثے کا سماں بندھ گیا، اور حاضرین مولاناؒ کے علم وفضل پر عش عش کر اٹھے۔ یہ سولات حسب ذیل تھے:

۱- دنیا کو خدا نے کس چیز سے بنایا اور کس وقت اور کس واسطے؟

۲- خدا کی ذات محیط کل ہے یا نہیں؟

۳- خدا عادل بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ دونوں کس طرح؟

۴- وید، بائبل اور قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے؟

۵- نجات کیا ہے اور وہ کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟[1]۔

شاہ جہاں پور کے اس دوسرے میلے کے بعد رڑکی میں آریہ ساجیوں کی طرف سے اسلام کے خلاف ایک بڑا ہنگامہ کھڑا کیا گیا۔ ہوا یہ کہ پنڈت دیانند سرسوتی نے رڑکی پہنچ کر وہاں ایک اجتماع میں برسرعام اسلام پر طرح طرح کے فلسفیانہ اعتراضات کیے۔ جب مسلمانوں نے ان کا جواب دینا چاہا اور پنڈت دیانند سرسوتی سے اس بارے میں مباحثہ کرنے کا کہا، تو اس نے جواب دیا کہ میں مولانا محمد قاسمؒ کے سوا کسی سے مباحثہ کرنے کو تیار نہیں۔ ان دنوں مولانا نانوتویؒ بیمار تھے؛ لیکن اس کے باوجود آپ رڑکی پہنچے اور پنڈت دیانند سرسوتی کو مباحثہ کرنے کی دعوت دی؛ لیکن وہ ٹال مٹول کرنے لگے اور رات رڑکی سے چپکے سے چلے گئے۔ اس پر مولانا نانوتویؒ کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ جس طرح پنڈت دیانند نے برسرعام اسلام پر اعتراضات کیے تھے، وہ ان کا اسی طرح برسرعام جواب دیں اور اسلام کی حقانیت ثابت کریں۔ چناں چہ مولانا محمد قاسمؒ نے مسلسل تین دن تک رڑکی میں عام جلسے میں تقریر کی اور اس میں پنڈت دیانند کے ایک ایک اعتراض کا جواب دیا۔

پنڈت دیانند نے اسلام پر گیارہ اعتراضات کیے تھے، جن میں ایک اعتراض خانۂ کعبہ کی طرف منہ کر کے مسلمانوں کے نماز پڑھنے پر تھا۔ مولانا محمد قاسمؒ نے نہ صرف اپنی تقریر میں اس کا جواب دیا؛ بلکہ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی، جس کا نام ''قبلہ نما'' ہے۔ باقی کے جو دس اعتراضات تھے، ان کا رد ایک اور کتاب ''انتصار الاسلام'' میں کیا ہے۔ اس کتاب میں مولانا نانوتویؒ نے صرف پنڈت دیانند سرسوتی کے

(۱) مباحثۂ شاہ جہان پور۔

اعتراضات کا جواب نہیں دیا؛ بلکہ سرسید احمد خاں نے فرشتوں، جنوں، شیطان اور اس قسم کی دوسری مابعد الطبیعی مخلوقات کی جو تشریحات کی ہیں، ان کا محاکمہ بھی کیا۔

ان تقریری وتحریری مباحثوں کے علاوہ مولانا محمد قاسمؒ کے اور بھی متعدد رسائل اور کتابیں ہیں، جن میں سے مندرجۂ ذیل خاص طور پر مشہور ہیں:

(۱) گفتگوئے مذہبی	(۲) مباحثۂ شاہ جہاں پور	(۳) انتصار الاسلام
(۴) حجۃ الاسلام	(۵) قبلہ نما	(۶) تحذیر الناس
(۷) مناظرۂ عجیبہ	(۸) آبِ حیات	(۹) قصائد قاسمیہ
(۱۰) تقریر دل پذیر	(۱۱) فیوضِ قاسمیہ	(۱۲) اسرارِ قرآنی
(۱۳) دلیلِ محکم	(۱۴) ہدیۃ الشیعہ	(۱۵) الحق الصریح فی بیان التراویح
(۱۶) تصفیۃ العقائد	(۱۷) تحفۂ لحمیہ	(۱۸) لطایف قاسمیہ
(۱۹) قاسم العلوم		

افسوس ہے مولانا محمد قاسمؒ نے بہت کم عمر پائی۔ ابھی بہ مشکل پچاس برس کے بھی نہیں تھے کہ داعیٔ اجل کا بلاوا آ گیا، اور ۱۲۹۷ھ/(۱۸۸۰ء) کو ضیق النفس کی بیماری میں دیو بند میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی بے وقت موت [۱] کا صرف آپ کے عقیدت مندوں اور ہم خیالوں ہی کو سخت صدمہ نہیں ہوا؛ بلکہ جو لوگ آپ سے فکری اعتبار سے اختلاف رکھتے تھے، انہوں نے بھی آپ کا بڑے سوز وگداز سے ماتم کیا، اور آپ کی موت کو ایک بہت بڑا نقصان بتایا۔ سچ ہے: اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ.

مثال کے طور پر اس حادثے کا ذکر کرتے ہوئے سرسید احمد خاں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۲۴/اپریل ۱۸۸۰ء کے شمارے میں جو لکھا ہے، اسے یہاں درج کیا جاتا ہے:

> ''زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا؛ لیکن ایسے شخص کے لیے رونا، جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آئے، نہایت رنج وغم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔...... لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی اسحاقؒ کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے؛ مگر مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی، دین داری، تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس ولی کی تعلیم وتربیت کی بہ دولت مولوی محمد اسحاق صاحبؒ کی مثل ایک اور شخص

(۱) ''بے وقت موت'' کا جملہ درست نہیں ہے۔ اس سے تو اللہ رب العزت کی حکمت وانتظام پر حرف آتا ہے۔ موت کبھی بے وقت نہیں آتی۔ قرآن کریم یہی بتاتا ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ اسے خوب سمجھ لیا جائے۔ (نعمان)

کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے؛ بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ ہے۔......مسائل خلافیہ میں بعض ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے؛ مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے، ہم مولوی محمد قاسمؒ کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو، خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفس یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے، بلاشبہ للّٰہیت اور ثوابِ آخرت کی نظر سے تھے"(۱)۔

(۱) مقالاتِ سرسید، حصہ ہفتم؛ ماہ نامہ الرحیم حیدرآباد، فروری ۱۹۶۴ء، ص: ۴۴ تا ۵۷۔

حکمتِ قاسمیہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی علیہ الرحمہ

عنوانات:

مولانا مدثر جمال

حضرت حکیم الاسلامؒ کا ایک نایاب مقالہ، جو ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء کا تحریر کردہ ہے۔اس میں حضرت حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ کے علوم کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ یہ مقالہ مجلس معارف القرآن کی ابتدا کے وقت لکھا گیا تھا۔ (نعمان)

''دین'' عقیدہ وعمل کا مجموعہ ہے:

دین عقیدہ وعمل کے مجموعے کا نام ہے۔عقیدے سے عمل کا وجود ہوتا ہے، اور عمل سے عقیدے کا رسوخ ہوتا ہے، جیسے درخت کے بیج سے شاخوں اور برگ وبار کا وجود ہوتا ہے، اور پھر شاخیں جوں جوں پھیلتی اور بڑھتی ہیں، جڑ کا رسوخ اور اندرونی پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے۔مجموعۂ عقائد کا نام ایمان ہے اور مجموعۂ عمل کا نام اسلام، اور ان دونوں کے مجموعے کا نام ''دین'' ہے۔ایمان تخم کی طرح دل کی گہرائیوں میں مخفی رہتا ہے، جسے عقل وبصیرت کی آنکھ دیکھتی ہے، اور اسلام برگ وبار طرح فضا میں پھیلا ہوا ہوتا ہے، جو سر کی آنکھ سے نظر آتا ہے۔حدیث نبوی میں اس حقیقت کو اس طرح واشگاف فرمایا گیا ہے:

''اَلْاِیْمَانُ سِرٌّ وَالْاِسْلَامُ عَلَانِیَۃٌ''۔

''ایمان (دل میں) چھپی ہوئی چیز ہے، اور اسلام (ہاتھ پیر پر) کھلی ہوئی چیز ہے''۔

مذاہب کے ردّ وقبول کا حقیقی معیار عقائد ہیں:

ایمانی عقائد اعمال کے ردّ وقبول کا بھی معیار ہیں کہ ان کے بغیر بڑے سے بڑا عمل بھی ردّ، نا قابل قبول اور اکارت ہے، اور یہی کسی مذہب کے حق وباطل کے پہچاننے کا بھی معیار ہیں؛ کیوں کہ اساسی عقائد ہر مذہب میں گنے چنے چند ہی ہوتے ہیں، لمبا چوڑا قصہ نہیں ہوتا، جس کی تحقیق دشوار ہو؛ اس لیے کسی دین

کے سمجھنے یا قبول کرنے کا مختصر راستہ اس کے عقائد ہی کا دیکھنا ہے کہ وہ مخالف عقل تو نہیں ہیں؟ نیز صاحب شریعت تک ان کی سند بھی متصل ہے یا نہیں؟ اس لیے کم سے کم یہ ناگزیر اور ضروری ہے کہ عقائد اور ایمان میں ان کے ماننے والے کو بصیرت حاصل ہو، اور دین اور شریعت پر خواہ اصول کا حصہ ہو، یا کلیات کا، سمجھ بوجھ کر جھکے اور ان پر دلائل اور حقیقت شناسی کے ساتھ جمے۔ اگر عقائد کا معاملہ محض سنے سنائے پر مبنی ہو، خود اپنی تحقیق یا سمجھ بوجھ کو اس میں دخل نہ ہو، تو اسے ''صورت ایمان'' تو کہا جا سکتا ہے؛ لیکن ''حقیقت ایمان'' باور نہیں کیا جا سکتا۔

ایمانِ تحقیقی اور ایمانِ تقلیدی پر ایک نظر:

اسی بنا پر محقق علما میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہوا ہے کہ ایمانِ تقلیدی، جس میں حجت و برہان اور بصیرت کا دخل نہ ہو؛ بلکہ محض باپ دادا سے سنی سنائی ایک نقل ہو، معتبر بھی ہے یا نہیں؟ ایک جماعت ادھر گئی ہے کہ ایمان تقلیدی معتبر ہی نہیں، جب تک کہ وہ دلائل و براہین سے تحقیقی نہ بن جائے۔

اسی بنا پر قرآن حکیم نے دین و ایمان کے بارے میں تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، جس کی جیتی جاگتی تصویر حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا وجود با جود اور ان کا مثالی ایمان ہے، جو صاحب شریعت کے سامنے حاضر رہ کر بھی اپنے ایمان کو تحقیقی بنا کر ہی دل میں جگہ دیے ہوئے تھے۔ قرآن حکیم نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا:

> قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ[1].

> ''بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے، اور اللہ پاک ہے، اور میں نہیں شریک بتانے والوں میں سے''۔

پھر صحابۂ کرامؓ کے بارے میں اولیت کے ساتھ اور ان کے مابعد کے لوگوں کے بارے میں تبعیت کے ساتھ ارشاد فرمایا گیا ہے:

> وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا[2].

> ''اور وہ لوگ کہ جب ان کو سمجھایئے ان کے رب کی باتیں، نہ پڑیں ان پر بہرے اندھے ہو کر''۔

اس کلام خداوندی سے ظاہر ہے کہ ایمان خواہ اجمالی ہو یا تفصیلی، اس کی بنیاد بصیرت و تحقیق پر ہوتی ہے،

---

(۱) سورۂ یوسف: ۱۰۸۔　　(۲) سورۂ فرقان: ۷۳۔

گو اس کے درجات حسب استعداد متفاوت اور مختلف ہوں، جس کا ثمرہ فراست ایمانی ہے، جو ہر مومن کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے۔ اسی لیے حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا:

''اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ؛ فَاِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ''.

''مومن کی فراست سے ڈرتے رہو؛ کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے''۔

جس سے صاف واضح ہے کہ ایمان دار میں بہ قدر ایمان بصیرت وفراست اور نورِ حق کا وجود لازمی طور پر ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ جس حقیقت کا ثمرہ بصیرت ہو وہ بے بصیرت حقیقت نہیں ہوسکتی، کہ بے بصیرتی سے بصیرت پیدا نہیں ہوسکتی، جس کا حاصل وہی ایمان تحقیقی ہے، نہ کہ سنا سنایا ایمان۔ اسی لیے اس دین میں عقل وبصیرت کی عظمت وفضیلت بیان فرما کر گویا اس کی دعوت دی گئی ہے، اور اسی لیے قرآن حکیم نے جگہ جگہ آیات الٰہی میں غور وفکر اور تدبر وتذکر اور حجۃ طلبی کی طرف بلایا ہے، جو دوسرے عنوان سے اسی بصیرت ویقین کے پیدا کیے جانے کا امر ہے۔ اسی ایمانی حقیقت کو جو عقل وبصیرت اور تحقیقی حجت لیے ہوئے ہو، آیات وروایات میں کہیں حلاوت ایمان سے، کہیں بشاشت ایمان سے، کہیں طعم ایمان سے، کہیں تفقہ فی الدین سے اور کہیں فہم سلیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی وہ قوت یقین واطمینان اور تحقیقی ایمان ہے (خواہ وہ ظاہری دلائل سے قائم ہو، یا باطنی حجتوں سے)، جس کے ہوتے ہوئے ایک انسان ایمان کے بارے میں ریب وشک سے بالاتر، محفوظ، اور ضلالت وگم راہی سے مامون ہوسکتا ہے، پھر دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلاسکتی۔ پہاڑ کا اپنی جگہ سے سرکا دیا جانا ممکن ہے؛ لیکن اس مردِ مومن کو ایمان سے ڈگمگا دینا یا کسی خلاف ایمان بات پر اسے پھسلا دیا جانا ممکن نہیں ہے۔ ایک حقیقی اور مبصر مومن اس قسم کی ساری ترغیبی اور تخویفی قوتوں کو اپنی ایمانی طاقت سے پرِ کاہ کی طرح پھونک مار کر اڑا دیتا ہے، اور اس کے ایمان پر یہ بیرونی شکوک واوہام ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہوسکتے۔

صحابۂ کرامؓ اور اسلاف صالحین کی مثالی استقامت:

صحابۂ کرامؓ اور اسلاف صالحین کی پاک زندگیاں اس پر شاہد ہیں کہ قرن اول میں انہیں ایمان لانے کے جرم میں کیا کیا ایذائیں نہیں دی گئیں اور کیا کیا سختیاں ان پر نہیں کی گئیں۔ انہیں ننگے بدن دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا گیا، کوڑوں کی ماریں دی گئیں، پابہ جولاں (پیروں میں بیڑیاں ڈال) کرکے حبس وقید کی سزائیں انہیں بھگتنی پڑیں، دانہ پانی بند کرکے انہیں بھوکا پیاسا رکھا گیا؛ لیکن ان کے سچے اور پاک قلوب جن میں ایمانی بصیرت اور وعدہ ہائے الٰہی پر یقین واطمینان کی طاقت گھر کر چکی تھی، رتی برابر ان آزمائشوں سے

متاثر یا دل تنگ نہیں ہوئے، اور اپنے ایمان کو دنیا و مافیہا سے بڑھ کر عزیز متاع جان کر اس سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں سرکے۔

''وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا، وَاللهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ''(۱)۔

''اور وہ نہ سست ہوئے ہیں اور نہ دب گئے ہیں، اور اللہ محبت کرتا ہے ثابت قدم رہنے والوں سے''۔

اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا تھی کہ ان کا ایمان محض تقلیدی، یا سنی سنائی بات نہ تھی؛ بلکہ علی وجہ البصیرۃ دلائل و براہین کی اساس پر قائم شدہ حقیقت تھی، جس نے ایمان کو ان کے حق میں غیب محض نہیں؛ بلکہ مثل مشاہدہ کے آنکھوں دیکھا بنا دیا تھا، جس سے دنیا کی ساری شک اندازی اور وحشت انگیزی کی طاقتیں تھک کر بیٹھ رہیں؛ لیکن ان کے بینا قلوب پر اثر انداز نہ ہوسکیں۔ اگر عیاذاً باللہ! یہ ایمان افواہی یا محض سنی سنائی بات ہوتی، جس میں قوتِ بصیرت وشہود نہ ہوتی، تو اس کا ڈھل مُل ہو جانا غیر یقینی نہ ہوتا۔

عقلی براہین و دلائل کی ضرورت کیوں پڑی؟

یہ فرق ضرور ہے کہ اسلام کے ابتدائی قرن خیر کے یہ لوگ (صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین) اپنے صفا ذہن، سلامتیِ عقل و فطرت، قربِ عہد نبوت، فیضانِ صحبت نبوی، قلتِ اختلاف اور بہ راہِ راست صاحب نبوت سے کلام نبوت سننے کی وجہ سے اول مرحلے ہی میں نور بصیرت کے بلند مقام پر پہنچ جاتے تھے، جو سارے دلائل اور بصیرتوں کا نچوڑ تھا۔ انہیں ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی کہ وہ نقل کے ساتھ مستقلاً عقلی دلائل کی تفتیش میں پڑ کر منقول کو معقول پر منطبق کرنے کی فکر میں پڑیں، جب کہ وہ نقل و وحی ہی فیضان صحبت نبوی سے ان پر عقل و معرفت کے سارے دروازے کھول دیتی تھی، جس سے ان کا ایمان تحقیقی اور عقل و نقل کے صحیح امتزاج سے جامع اور حقیقی ایمان بن جاتا تھا؛ لیکن زمانۂ نبوت سے جوں جوں بُعد ہوتا گیا اور فلسفیانہ موشگافیوں سے فتنۂ شبہات نے عقل نارسا کو آگے رکھ کر وحی الٰہی کے راستوں میں مداخلت شروع کی، جس سے سادہ لوح قلوب کی قوت یقین و اذعان میں فرق آنے لگا، تو ضرورت پڑی کہ ایمانوں میں بصیرت پیدا کرنے کے لیے عقلی دلائل و براہین کا ذخیرہ بھی مہیا کیا جائے، اور دین کے جاں باز سپاہیوں کو نقل کے ساتھ عقل صافی کے ہتھیاروں سے بھی مسلح کیا جائے، جس سے وہ شک اندازوں کی مدافعت کرسکیں اور ان بندگان عقل پر حجت تمام کی جاسکے اور ساتھ ہی ارباب نقل و روایت کے لیے بھی ان عقلی حجتوں سے مبطلوں (باطل پرستوں) کے مقابلے میں تسکین و تسلی کا سامان بہم پہنچایا جاسکے۔

---

(۱) سورۂ آل عمران: ۱۴۶۔

فرق باطلہ کے وجود کا آغاز اور متکلمین اسلام کی کاوشیں:

ابتداً فتنۂ تشکیک نے اُمہاتِ عقائد اور اُصول وکلیاتِ دین کو فلسفیانہ اختراعات کی آماج گاہ بنایا اور ان کی اصولیت وکلیت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے مزعومات کے رنگ میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ وہ عقل جو خادم وحی ونقل بنا کر دنیا میں اتاری گئی تھی، اسے اصل قرار دے کر وحی الٰہی کی مرادوں میں ناجائز تصرفات ہونے لگے، جس سے اس باغی عقل کی بہ دولت مختلف فرق باطلہ روافض، خوارج، قدریہ، جبریہ اور معتزلہ نے جنم لیا اور دین کے نام پر کتنی ہی پارٹیاں بن گئیں، جنہوں نے فتنۂ شکوک وشبہات کے بندسوت کھول دیے اور امت کو جدال ونزاع کا شکار بنا دیا؛ اس لیے اکابر سلف نے قدم بڑھایا اور اصول دین کی گہرائیوں پر تا بہ حدِ ضرورت حکمت کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالنے کی راہیں ہموار کردیں، جو دین میں پہلے سے مرکوز تھیں؛ لیکن زیغ آور قلوب کی وجہ سے یہ فتنہ اسی حد پر نہیں رہا؛ بلکہ آگے بڑھا اور جدید پارٹیوں نے امہات عقاید وکلیات سے گزر کر امہات مسائل میں بھی، جنہیں فروعی عقائد کہنا چاہیے، وحی کی متوارث مفہومات سے الگ ہو کر اسی سرکش عقل کے بل بوتے پر رخنہ اندازی جاری رکھی، جس سے اور بھی بہت سے اسلامی مسائل ان کے فلسفیانہ مطاعن کی زد میں آ گئے، تو ارباب کلام کا طبقہ پیدا ہوا۔ شیخ ابو الحسن اشعریؒ اور شیخ ابومنصور ماتریدیؒ جیسے ائمۂ کلام آگے آئے اور انہوں نے وحی الٰہی کی روشنی میں فلسفے کا بھرپور مقابلہ کرتے ہوئے عقائد ومسائل کو عقلی لباس میں دنیا کے آگے رکھا، جس سے عقل کے مدعیوں کی شک انداز راہیں بہت حد تک مسدود ہو گئیں، اور منقول دین رکھنے والوں کے مقابلے میں مبطلوں کے یہ عقلی ہتھیار بے کار ہو کر رہ گئے۔ گو یہ فرقے نہیں مٹے؛ مگر فرقے ہی سمجھے گئے اور انہیں اصل جماعت کا کٹا ہوا حصہ ہی شمار کیا گیا، پس جس طرح علمائے حق نے نقل و روایت کے میدان میں وضاعین حدیث، تلبیس کنندگانِ روایات کی روایتی دسیسہ کاریوں کے پردے چاک کر کے رکھ دیے تھے، اسی طرح درایتی میدان میں ان مدعیان عقل کی معنوی تحریفات، جاہلانہ تاویلات اور دروغ بافیوں کی قلعی بھی کھول کر رکھ دی، اور ان کی نارسا عقلوں کے وہمیات کو عقل مصفا کی حقیقی روشنی سے شکست دی، جس سے ایک طرف اگر یہ تخریبی جماعتیں تھک کر مایوس ہو گئیں، تو دوسری طرف عقائد ومسائل کے ان حکیمانہ عقلی دلائل سے ایمان والوں کے ایمان کی بصیرت میں ترقی اور اضافہ ہوتا گیا۔

لیکن فتنۂ شبہات کی جڑیں بہر حال قائم ہو چکی تھیں، جو قائم رہیں۔ مختلف فرقوں اور پارٹیوں کی زیر سرپرستی ان فتنوں نے اصلیت کی صورت پیدا کر لی اور یہ مختلف مکاتب خیال نئے روپ کے مکاتب ومدارس

میں مستقلاً زیرِ بحث لائے جانے لگے؛ اس لیے فلسفہ مزاج پارٹیوں نے یہ سوچ کر کہ اب وہ اہل حق کے مقابلے میں کون ساحربہ استعمال کریں؟ خالص اصولی عقاید کا میدان چھوڑ کر اسلام کے عمومی مسائل میں ان فتنوں کا گدلا پانی پھیلانا شروع کر دیا، یعنی عام دینی مسائل میں اس عقل تگ وتاز سے انکار وتشکیک کے فتنے کا آغاز ہو گیا، تا کہ اہل حق کو نفس دین ہی سے بدظن بنادیا جائے، اور وہ بالآخر ان ہی نوخیز پارٹیوں کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں، تو اربابِ حکمت ومعرفت اور مفکر قسم کے اربابِ فضل وکمال آگے آئے، اور انہوں نے اسلام کے تمام امہات مسائل پر حکیمانہ اسلوب اور عاقلانہ انداز سے کلام کیا۔ عام اسلامی مسائل کے اسرار ونکات پر عقلی دلائل سے بحث کی اور مسائل کی حقیقت کھول کر فلسفے کا تار و پود بکھیر دیا۔

حکمائے اسلام کی خدمات کا اجمالی جائزہ:

امام رازیؒ، امام غزالیؒ، امام خطابیؒ، ملک العلماء شیخ عزالدین ابن عبدالسلامؒ اور ابن عربیؒ جیسے عرفا اور دانشورانِ حکمتِ دین کھڑے ہوئے، اور انہوں نے دین کی حقائق ومصالح کو عقلی براہین سے پیش کر کے نہ صرف دین کی حدود ہی کو مضبوط کیا، اور نہ صرف دین کے ہزار ہا مخفی اسرار ومستور گوشے ہی اپنی دور بین عقلوں سے کھول کر دنیا کے سامنے رکھ دیے؛ بلکہ عقلی مباحث کے لیے مستقل بنیادیں ہموار کر دیں۔ امام رازیؒ نے اپنی مستقل تفسیر کا موضوع ہی تفسیر بالدرایت اور تفسیر بالمعقول رکھا، اور قرآنی آیات کے عقلی پہلوؤں کو واشگاف کرنا قرار دیا۔ امام غزالیؒ نے ''تہافت الفلاسفہ'' لکھ کر اصولی طور پر سرے سے فلسفے ہی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا، جس سے شک اندازوں کے گروہ پر کاری ضرب پڑی، اور اسے سوچ پیدا ہوئی کہ وہ اب اہل حق کے مقابلے میں کون ساحربہ اختیار کرے؟ انہیں حیرانی تھی کہ امہات عقائد، امہات مسائل آیات قرآن اور روایات حدیث کے تمام دائروں میں تو عقل معاد، عقل معاش کو شکست فاش دے چکی ہے، تو آخر اب ان مایوسانِ عقل ودین کے بقا کی کیا تدبیر ہے؟

بندگانِ عقل کی جزئیات مسائل میں تگ وتاز:

اس لیے آخر کار انہوں نے امہاتِ مسائل کا میدان چھوڑ کر فروعی مسائل میں اپنے وہم وشک کا گدلا پانی بہانا شروع کر دیا، جس سے مسائلِ فقہیہ میں انکار وتشکیک کے فتنے کا آغاز ہو گیا۔ مسائل فرعیہ کی غیر معقولیت، انفرادی استبداد، یا ائمۂ تفقہ کے فروعی اختلاف کو تخریب دین دکھلانے کے اتہامات سے اسلامی فقہ کو بے اعتبار بنانے کی مہم شروع کر دی، تا کہ اہل حق اگر اصول سے نہیں ہٹتے، تو کم از کم اس حیلے سے عملی فروعات ہی پر سے ہٹ جائیں؛ حتی کہ فقہی مسالک کے اختلافات کو بہ صورت نزاعات اجاگر کر کے جدال

وقتال کے فتنے کھڑے کیے، تا کہ امت کم زور پڑ جائے اور اہل حق مغلوب ہو جائیں۔ بنیاد وہی ایک تھی کہ انہوں نے عقل کو نقل پر حاکم مان کر مسائل کا فیصلہ اپنی جزوی عقلوں کے تحت رکھا، تا کہ اگر اصول کو مضمحل کرنے میں وہ کام یاب نہیں ہوئے، تو کم از کم فروعاتِ فقہیہ ہی کو ناقابل التفات بنا دیں، تا کہ اہل حق پر یہ الزام عائد کیا جا سکے کہ وہ خلاف عقل اور خلاف قیاس راہوں پر چل رہے ہیں، اور ان کا پورا دین معاذ اللہ! غیر معقول اور ناقابل قبول ہے۔

فقہائے کرام کی خدمات سے جزئیاتِ دین کا دائمی تحفظ:

لیکن انہیں اس کا پتہ نہیں تھا کہ اس پورے دین فطرت میں عقل کلی بہ طور روح کے دوڑی ہوئی ہے، اور جیسے وہ بے ریب طریقے پر نقل صحیح کے ساتھ دنیا میں آیا ہے، ایسے ہی عقل سلیم کی روشنی بھی ساتھ لے کر آیا ہے، اور اس میں فہم وبصیرت اور عقل وفراست کے ایسے جوہر فرد موجود رہتے آ رہے ہیں، جو اس دین کی معقولیت سے نمائشی عقلوں اور فرضی دینوں کی قلعی کھول سکتے ہیں۔ چناں چہ فقہی مسائل پر زد پڑتے دیکھ کر اربابِ فقہ آگے بڑھے، اور انہوں نے فقہی فروعات اور استنباطی مسائل میں جہاں نقول کے مآخذ پیش کیے، وہیں عقلی دلائل کو بھی ان کے دوش بہ دوش لا کھڑا کر دیا۔ ''ہدایہ'' اور ''بدائع الصنائع'' جیسی لطیف کتابیں معرض وجود میں آئیں، جن میں ہر ہر فقہی مسئلے کے لیے دلائل نقلیہ کے ساتھ دلائل عقلیہ کا عظیم ذخیرہ بھی فراہم کر دیا گیا، جس سے فقہی فروعات اور استنباطی مسائل میں بھی نصوص فقہیہ کے ساتھ عقلی براہین کی تدوین کا آغاز ہو گیا۔ اربابِ دین میں علی الاطلاق نقول کے ساتھ عقلی استدلال کی راہیں ہموار ہو گئیں؛ حتی کہ رفتہ رفتہ دین میں عقلی مصالح اور اسرار دین نے ایک مستقل موضوع کی شکل اختیار کر لی، جس سے معاندین اور فرق باطلہ کا یہ خیال کلیتًا غلط ثابت ہو گیا کہ دین عقلی مصالح سے خالی، یا عقلی استدلال سے عاری ہے۔ ساتھ ہی وہ اس سے بھی مایوس ہو گئے کہ محض اپنی عقلی وسوسہ اندازیوں سے وہ بابصیرت ایمان داروں کے ایمان پر کوئی ڈاکہ ڈال سکیں گے، جس سے وہ تردد میں پڑ کر اپنے ایمانی موقف سے ہٹ جائیں؛ لیکن یہ تمام عقلی براہین ابھی تک اپنے اپنے مسائل کے ضمن میں منتشر تھے، اور جس فن کا جو مسئلہ بھی مدعیانِ عقل کے یہاں ہدف بنا اسی فن میں اربابِ فن نے اس مسئلے کو دلائل عقلیہ کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے مخالف اتہامات کو رد کر دیا، جس سے یہ معقول دلائل مختلف فنون میں بہ ذیل مسایل بکھرے ہوئے تھے اور اپنے اپنے متعلقہ مسائل کے سلسلے سے مختلف فنون میں جمع ہوتے رہے۔ خود ان کا اپنا کوئی مستقل فن نہ تھا کہ اس میں اپنے اصول وقواعد کے ساتھ مرتب طریق پر جمع ہوں، اور ایک منظم فن کی صورت اختیار کر کے

انضباط کے ساتھ مدافعت یا حملہ کر سکیں۔

جس کی وجہ یہ تھی کہ وسوسہ اندازوں نے بھی وسوسہ اندازی کو کسی مستقل فن کی حیثیت نہیں دی تھی، وہ صرف اپنے مزعومات کے ضمن میں اپنے مفہوم کو حق بہ جانب ثابت کرنے کے لیے اہل حق کے مفہوم کو غیر معقول ثابت کرنے ہی پر اپنی ہمت صرف کرتے رہے؛ اس لیے اہل حق بھی ان کے جواب میں ان ہی مسائل کی حد تک عقلی دلائل دیتے رہے، جو مختلف فنون میں بہ ذیل مسائل جمع ہوتے رہے، اور انہوں نے اسرار دین یا حکمت اسلام کو کسی مستقل فن کی صورت میں لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی؛ اس لیے اسرار دین موضوع تو بن گیا؛ مگر فن نہیں بنا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ”تدوینِ اسرارِ دین“:

آخر کار متاخر طبقے میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ کا ظہور ہوا، جب کہ یورپ اپنے الحادی ہتھ کنڈوں کے ساتھ اُبھرنے کے مقام پر آ رہا تھا، ہندوستان کے لیل ونہار بدل رہے تھے، دینی لائنوں میں خود رائی اور عقل پرستی کی گھٹائیں دلوں پر چھا رہی تھیں، اور وقت آ رہا تھا کہ یہ سیاہ بادل برس پڑیں اور دنیا کو سیلِ الحاد و دہریت میں بہا لے جائیں، تو آپ نے اپنی فراست باطنی سے ان مقدمات کو سامنے رکھ کر آخری نتیجہ سمجھ لیا اور دیکھا کہ فلسفیت کی داغ بیل پڑ چکی ہے۔ نہ صرف یہی کہ اس ملک کی دنیا دین کی استدلالی لائنوں میں نقلی دلائل پر قناعت کرنے کے لیے تیار نہیں؛ بلکہ اسلام پر شکوک وشبہات کا وار کرنے کے لیے یہ عقلی سفسطے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں، جن کے آثار کم وبیش نمایاں بھی ہو چکے ہیں؛ اس لیے انہوں نے اپنے قلب صافی کی مخفی آواز بلند کرتے ہوئے فرمایا:

وَاِنَّ الشَّـرِيْعَةَ الْمُصْطَفَوِيَّةَ أَشْرَقَتْ فِي هٰذَا الزَّمَانِ عَلٰى أَنْ تَبْرُزَ فِي قُمُصٍ سَابِغَةٍ مِّنَ الْبُرْهَانِ(۱).

”اور شریعت مصطفوی اس زمانے میں اس پر اُبھر رہی ہے کہ وہ (عقلی) حجت وبرہان کی مکمل اور مطابقِ بدن قمیصوں میں نمایاں ہو“۔

آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں میں ایک طبقہ معتزلہ کا خلفِ رشید بن کر سامنے آ رہا ہے، جو وحی پر عقل کی حکمرانی کا قائل ہے، اور نصوص شرعیہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر ماننے کے لیے تیار نہیں، اور نہ ان پر ایمان لانا ہی ضروری سمجھتا ہے۔ بالخصوص دین کے ان غیبی حقائق پر، جو عقول سے بالاتر اور مشاہدے سے ماورا بھی ہیں؛ اس لیے آپ نے اس فتنے کے دفعیہ اور استیصال کے طریقوں پر غور کرتے ہوئے فرمایا:

(۱) حجۃ اللہ البالغہ، ص:۳۔

وَلَا سَبِيلَ إِلَى دَفْعِ هٰذِهِ الْمَفْسَدَةِ؛ إِلَّا بِأَنْ تَبَيَّنَ الْمَصَالِحُ وَتُؤَسَّسَ لَهَا الْقَوَاعِدُ، كَمَا فُعِلَ نَحْوٌ مِّنْ ذٰلِكَ فِي مُخَاصَمَاتِ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى وَالدَّهْرِيَّةِ وَأَمْثَالِهِمْ[1]۔

''اور (اب) اس مفسدہ کے دفعیہ کی اس کے سوا صورت نہیں کہ دین کے (عقائد واعمال) کی (عقلی) مصلحتیں بیان کی جائیں، اوران کے لیے (بہ طور فن کے) قواعد وضع کیے جائیں، جیسا کہ یہود ونصاریٰ، دہریہ اوران جیسے دوسرے فرقوں کے مقابلے میں ایسا ہی کچھ کیا جا چکا ہے''۔

اس لیے آپ نے دین کے سلسلے میں عقلی دلائل و براہین کو ایک فن کی سورت سے مدوّن فرمایا، اس کے اصول ومقاصد وضع فرمائے، اور اسے فن کی صورت دیتے ہوئے اس فن میں جلیل القدر کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' تصنیف فرمائی، جس میں ابواب وفصول کے تحت فنِ اسرار کے قواعد وضوابط اور اصول وقوانین وضع فرما کر ہر باب میں اس کے مناسب عقلی دلائل و براہین کا ایک عظیم ذخیرہ مہیا فرمایا۔

اس مقدس کتاب نے حقیقت یہ ہے کہ بندگانِ عقل کی کمر توڑ دی، اوران کے لیے بندگانِ عقل بننے کے بجائے بندگانِ خدا بننے کا راستہ ایسے موثر انداز سے کھول دیا کہ یا وہ اس پر چلیں یا سکوت عجز کے ساتھ اپنے غم وغصے کو دبائے بیٹھے رہیں اور ختم ہو جائیں۔ آپ نے فنی طور پر ابواب دین میں عقل ونقل کا صحیح مقام واضح فرماتے ہوئے ان دونوں کی باہمی نسبت اور حقیقی توازن کی صورت واضح فرمائی۔ آپ نے عقل سے کسی عقیدے کا استفادہ کرنے کے بجائے اسے عقائد واحکامِ شرعیہ کے لیے مؤید مثبت اور دشمنانِ حق پر الزام قائم کرنے کا ایک وسیلہ قرار دیا، جس سے نقل کی عظمت وحکومت اور عقل کی اس کے حق میں خدمت گاری پوری طرح واشگاف ہوگئی۔ انھوں نے مدعیانِ عقل کو یہ تاثر دیا کہ جو چیز ان کے یہاں خدائی کا درجہ رکھتی ہے، یعنی عقل، وہ ان کے یہاں بہ حق دین محض ایک خدمت گار اور چاکر کی حیثیت رکھتی ہے، اور پھر اس کے تحت مسائل میں اس کے نمونے ظاہر فرمائے، جس سے بہت سی جزوی عقلوں کو ندامت کے ساتھ پیچھے ہٹنا پڑا؛ لیکن اس کے بعد تیرھویں صدی میں جب کہ یورپین قوتیں ہندوستان میں برسرِ اقتدار آ گئیں اور اپنے ساتھ فلسفۂ جدیدہ اور سائنس کی ترقیات لے کر نمایاں ہوئیں، مشینی دور کا آغاز ہوا، مشینری نے دنیا کے دل ودماغ پر قبضہ کر لیا، کھانا، پینا، دینا لینا، لباس اور وسائل معاش، سفر اور حضر، سواری اور مراکب، تجارت وزراعت، صنعت وحرفت، جنگ وصلح؛ حتی کہ مکانوں کی ہوا اور پانی، دوا اور غذا، آوازوں کا سننا، تقریر اور خطابت، غرض ساری زندگی اور وسائل زندگی مشینی لائنوں پر رواں دواں ہونے لگی، تار اور فون پر

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ، ص: ۷۔

خبریں دوڑنے لگیں، ریل، موٹر اور اسٹیمر میں بحر و بر کی مسافتیں طے ہونے لگیں، وسائل حیات فیکٹریوں اور ملوں میں ڈھلنے لگے، دور دراز کے انسان ٹیلی ویژن کے برقی پردوں پر نمایاں نظر آنے لگے، ہزار ہا میل کی مسافت کے باوجود ایک ملک دوسرے ملک کے آمنے سامنے آ کھڑا ہوا۔

خلاصہ یہ کہ بحر و بر اور خلا و فضا سب ہی مشینوں کی زد میں آ گئے، پھر ساتھ ہی سائنس نے مادے کے ہزار ہا سربستہ راز دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دیے، جس سے دنیا مخفی اور پنہاں چیزوں کا مشاہدہ کرنے کی عادی ہو گئی۔ بہ الفاظِ دیگر فلسفۂ جدید اور سائنس کے نئے نئے انکشافات سے جن کی بنیاد مشاہدات پر تھی، دنیا عقلی نظریات اور معقولات سے گزر کر محسوسات کی گرفت میں آ گئی، تو قدرتی طور پر پرانے نظریات میں انقلاب رونما ہوا۔

سائنس کو اسلام کے برخلاف طبعیاتی محاذ بنانے کی سعی:

اس لیے اب وہی عقل پرست طبقہ، حس پرستی کا شکار ہوا، اور اس دور کی دنیا نظریاتی استدلال سے زیادہ حسیاتی استدلال کی لائنوں پر آ گئی۔ اب اس کے یہاں کوئی شرعی دعویٰ اس وقت تک قابل سماعت نہیں رہا، جب تک وہ معقولات کے ساتھ محسوس کر کے نہ پیش کیا جائے اور روحانی معتقدات کی پشت پر مشاہداتی حجتیں نہ ہوں۔

بنا بریں اسی خوگرِ محسوس طبقے نے اسلامی حصار پر عقلی نظریات کے بجائے حسی مشاہدات اور طبعیاتی افکار سے حملے کرنے شروع کر دیے؛ اس لیے ضرورت تھی کہ اب اسلامی مسائل کو نظریاتی لباس سے ملبوس کرنے سے زیادہ طبعیاتی رنگ کی قمیصوں میں ملبوس کر کے پیش کیا جائے، اور طبعیاتی شکوک وشبہات کا جواب ان ہی طبعیاتی اکتشافات کے اصول سے دیا جائے۔

سائنس کا فکری بگاڑ اور حکمت قاسمیہ کا اس سے مقابلہ:

تو اس صدی کے اوائل میں حق تعالیٰ کی فیاض قدرت نے شمس الاسلام، حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، قدس سرہٗ، بانئ دار العلوم دیوبند کو اس دور کے طبعیاتی رنگ کے امراض اور جراثیم کے معالجے کے لیے بہ طور طبیب اور مصلح امت کے نمایاں فرمایا، اور آپ نے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعے ان بندگانِ سائنس ومشاہدات کے دماغوں کو ان ہی کے مسلمات سے جھنجھوڑا، اور ان کے دماغوں کا تنقیہ (صفائی) شروع فرمایا۔

حکمت قاسمیہ میں فطری طرز استدلال:

حکمتِ قاسمیہ کے تمام اجزا نے (جو حضرت والاؒ کی تصانیف میں موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں) جہاں اسلامی حقائق پر گہری لِمّیاتی اور خالص عقلی دلائل کی روشنی ڈالی، وہیں وہ پورے زور اور قوت کے ساتھ ان حقائق کو آج کے محسوسات اور دورِ حاضر کے حسی شواہد و نظائر سے بھی مدلل کر کے اس طرح پیش کیا کہ اسلام کے غیبی امور، شریعت کے بنیادی مقاصد اور دینِ فطرت کے مبانی واصول اس حسیاتی رنگ استدلال سے بالکل طبعی اور محسوس و مشاہد نظر آنے لگے۔ ذات وصفات خداوندی، مبدا و معاد، توحید و رسالت، عقائد و شرائع، برزخ اور قیامت، سزا، جزا، حشر ونشر، وزن اعمال، میزان عمل، جنت و نار، ملائکہ و جنات، عرش و کرسی، لوح وقلم وغیرہ ان عقائد اور ان سے متعلقہ اعمال کا صفات خداوندی سے ربط وعلاقہ، کلیات دین کے ساتھ فرعیات کا ارتباط، پھر شرائع وعقائد کی عقلی اور طبعی مصالح اس طبعیاتی طرز استدلال سے کچھ اس طرح واشگاف فرمائے کہ یہ سب امور فطرت اور طبیعت کا مقتضا محسوس ہونے لگ گئے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والاؒ ان حقائق کو محض نظری دلائل کے زور سے جبری طور پر دل میں ٹھونسنا نہیں چاہتے؛ بلکہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ دین کے یہ تمام عقائد واحکام فطرت اور طبعیت کا تقاضا ہیں، جن کا وجود اسی طرح قابلِ تسلیم ہے، جیسے چمکتے ہوئے سورج کا وجود۔ جس سے ایک فہیم انسان جبری انداز سے نہیں؛ بلکہ طبعی تقاضوں سے انہیں ماننے اور تسلیم کرنے کے لیے بہ طوع و رغبت جھکنے کے لیے تیار ہو جائے۔ حضرت والاؒ کے اس نئے طرزِ اثبات سے اس پورے دین کا محض دین عقلی ہونا ہی نہیں؛ بلکہ دین فطرت ہونا نمایاں ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت والاؒ کی کتابوں میں ان کی تقریراتِ استدلال سے واضح ہوگا۔

ساتھ ہی حیرت ناک بات یہ ہے کہ حضرت والاؒ کا یہ علم بلاشبہ لدنی ہے، درسی یا کتابی نہیں۔ الہامی اور وجدانی ہے، جس کا بہ ظاہر دوسرے کے وجدان کے لیے حجت ہونا ضروری نہیں تھا؛ لیکن آپ کا طرز بیان خالص استدلالی اور منطقی ہوتا ہے، جو مطیع و منکر دونوں کے لیے یک ساں حجت ہو۔

حقائق سب کی سب منقول؛ لیکن پیرایۂ بیان بلاحوالۂ نقل خالص معقول اور اس کے ساتھ فلسفیانہ اور سائنٹفک۔ گویا عقل وطبع دونوں کی صحیح معنی میں حضرتؒ نے دین کا ایک خدمت گار بنا کر دکھلا دیا ہے کہ فلسفہ اور سائنس کا کان پکڑا اور دین کے جس گوشے کی چاہی ان سے خدمت لے لی، جس سے دین کی نسبت سے عقل وطبع دونوں کا موقف بھی خود بہ خود کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے عمیق علم کی ایک نادر خصوصیت:

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ مضامین نہایت بلند پایہ، بہت گہرے اور علوم نہایت دقیق اور

غامض ہیں؛ لیکن طرز بیان نہایت شگفتہ اور سہل ہی نہیں؛ بلکہ سہلِ ممتنع۔ مقدمات کی ترتیب طبعی کہ اہم سے اہم نتائج گویا خود بہ خود نکلنے کے لیے اُبھر رہے ہیں۔ تقریر استدلالی نہایت مرتب، جو ذہن کو اپیل کرتی ہوئی اس کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے، اور ساتھ ہی حضرت والاؒ کا شاخ در شاخ بیان مسئلے کے تمام شقوق وجوانب پر اتنا حاوی اور اس کے تمام گوشوں کا اس درجے واشگاف کنندہ ہوتا ہے کہ اس سے صرف وہی ایک زیر بحث مسئلہ حل نہیں ہوتا؛ بلکہ اس کے سیکڑوں امثال، جو اس کی زد میں آ جائیں، خواہ وہ کسی دوسرے ہی باب کے ہوں، اس اصولی طرز بیان سے حل ہوتے چلے جاتے ہیں؛ بلکہ قلوب پر کتنے ہی علوم ومعارف کے دروازے کھلتے جاتے ہیں، جن سے نئے نئے مسائل کا راستہ ہموار ہوتا جاتا ہے۔

اس صورت حال سے آدمی یہ ماننے پر مجبور ہوتا ہے کہ شریعت کے اس جزیے کی پشت پر کلیات کی کس قدر کمک موجود ہے، اور کتنے کلیے اور عقلی اصول اس ایک جزیے میں اپنا عمل کر رہے ہیں، جس سے وہ عقلی ہی نہیں، طبعی نظر آنے لگتا ہے۔

مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کا ارشاد:

بہ قول حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اوّلین صدر مدرس دار العلوم دیوبند:

> ''حضرت والاؒ کے دماغ کی ساخت ہی خلقی طور پر حکیمانہ واقع ہوئی تھی؛ اس لیے بلا اختیار ان کے دماغ میں حکمت ہی کی باتیں آ سکتی تھیں، جس سے ان کے یہاں جزوی مسائل کا کلام بھی کلیاتی رنگ اختیار کر کے ایک کلیہ بن جاتا تھا، اور اس سے وہی ایک جزیہ نہیں؛ بلکہ اس جیسے سیکڑوں جزیئے حل ہو جاتے تھے، اور اوپر سے ان کا وہ کلی اصول کھل جاتا تھا، جس سے اس جزیئے کا نشو ونما ہوا ہے''۔

بعض ایسے جزوی مسائل، جنہیں فقہائے امت خلاف قیاس امر تعبدی کہہ کر گزر گئے ہیں، حضرت والاؒ کے یہاں وہ بھی قیاس جلی سے پیدا شدہ عقلیاتی ہیں۔ چوں کہ آپ کے نزدیک شریعت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور جزوی سے جزوی مسئلہ بھی غیر قیاسی، یا مخالف عقل تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً: قہقہہ ناقض وضو ہونا تمام فقہا کے نزدیک ایک خلاف قیاس اور بہ الفاظِ دیگر غیر عقلی ہے؛ اس لیے وہ اس کی کوئی عقلی دلیل نہ پا کر اسے تعبدی کہتے گئے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ عقل کے خلاف محض ایک امر شرعی ہے، جسے صرف بہ وجہ ایمان ہی تسلیم کیا جائے گا؛ لیکن حضرت والاؒ نے اسے بھی عقلی قرار دے کر اس پر عقلی دلائل پیش فرمائے ہیں، اور بتلایا ہے کہ جس کلیہ سے یہ جزیہ پیدا ہوا ہے، جب وہ عقلی ہے، تو جزیئے کے غیر معقول ہونے کے

کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ اپنے موقع پر اس کا تفصیلی بیان آئے گا۔

بہر حال! شرعی جزئیات کو ان کے عقلی کلیات کی طرف راجع کرنا اور کلیات سے نادر جزئیات اور مقاصد دین کا استخراج کر لینا، یا متعدد جزئیات کے تتبع واستقرا سے ایک کلی اصول قائم کر کے ہزاروں جزئیات کا اس سے فیصلہ کر دینا آپ کا خاص علم اور علم کا خاص امتیازی مقام ہے۔

ہر منقول جزئی کی معقول تطبیق اور اس کی مثالیں:

اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت ناک یہ ہے کہ عامتاً قیاس واستنباط کا تعلق احکام سے ہوتا ہے، نہ کہ اخبار اور واقعات سے۔ عقلی طور پر یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکم معقول ہے؛ لیکن عقلی استدلال سے یہ کہنا مشکل ہے کہ واقعہ معقول اور عقلی ہے، اور اسے عقلاً بھی یوں ہی ہونا چاہیے تھا؛ لیکن حضرت والاؒ کے یہاں شرعی واقعات بھی اصول عقلیہ سے باہر نہیں ہیں، اور آپ کا خداداد علم اور فراست اخبار اور واقعات کی عقلی لمّیات میں بھی اسی طرح کام کرتا ہے، جس طرح وہ احکام اور اَوامر ونواہی کی حقائق بیانی میں کارفرما ہے۔

ظاہر ہے کہ واقعات اور حوادث کو کسی عقلی اصول سے جوڑ کر یہ دعویٰ کرنا کہ یہ واقعہ عقلاً بھی یوں ہی پیش آنا چاہیے تھا، جس طرح کہ وہ واقعہ پیش آیا، بلاشبہ علم وفراست اور قلبی ذکاوت کی ایک نادر مثال ہے۔

دنیا میں کعبۂ معظّمہ (بیت اللہ) کا وجود ان کے یہاں محض تکوینی نہیں؛ بلکہ عقلی بھی ہے، یعنی بیت اللہ عقلاً بھی اسی محل میں ہونا چاہیے تھا، جس میں وہ واقع ہے، پھر بیت اللہ کا اوّل بیت ہونا، جو قرآنی دعوی ہے، اُن کے یہاں محض تاریخی نہیں؛ بلکہ عقلی بھی ہے کہ اسے عقلاً بھی اول بیت ہی ہونا چاہیے تھا، جیسا کہ وہ ہے؛ حتیٰ کہ بیت اللہ کے چالیس سال بعد مسجد اقصیٰ کی بنیاد رکھے جانے کی یہ اربعینی مدت بھی عقلی ہے، اقصیٰ کی تاسیس عقلاً بھی کعبے کے چالیس ہی سال بعد ہونی چاہیے تھی۔ اس سے بھی عجیب تر یہ کہ کعبۂ محترمہ اور مسجد اقصیٰ کا درمیانی فاصلہ جو تقریباً ڈھائی تین سو میل ہے، یہ بھی ان کے اصول پر محض تاریخی یا جغرافیائی نہیں، صرف اس لیے کہ وہ شرعی دعویٰ ہے، اور ان کے اصول حکمت میں شریعت کا کوئی دعویٰ مخالف عقل وقیاس نہیں ہو سکتا۔ چناں چہ ''قبلہ نما'' میں اس کی تفاصیل دیکھی جا سکتی ہیں۔

قرآن حکیم کے پنہاں معقول حقائق کا حکمتِ قاسمیہ میں انکشاف:

قرآن حکیم نے کائنات کے مشاہدات: زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، دریا، پہاڑ، جمادات، نباتات اور ہواؤں کی شمالی، جنوبی رفتاروں سے بہت سے غیبی حقائق پر استدلال کیا ہے، جو بلاشبہ فطری اور طبعی طرز استدلال ہے۔ حضرتؒ نے ان مکوّنات کے اندرونی مکونات کی گہرائیاں طبعی انداز میں کھول کر ان

استدلالات کوعقلی سے زیادہ طبعی بنا دیا ہے، اس اصول پر کہ یہ خدا کے افعال ہیں، اور اس کے افعال سے زیادہ اور کس کے افعال فطری ہو سکتے ہیں؟ آپ نے بہ دلائل واضح کیا ہے کہ قرآن کے یہ استدلالی مقدمات کن کن گہری اور فطری حقائق کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں، جن سے یہ مسائل ثابت ہو رہے ہیں؛ اس لیے قرآن کے یہ سب مسائل محض عقلی ہی نہیں؛ بلکہ سائنٹفک بھی ہیں۔ مثلاً: قرآن حکیم نے عالم کے جزئیاتی تغیرات سے قیامت کے ثبوت پر استدلال کیا ہے، جو اس کا مخصوص شرعی انداز ہے۔ حضرتؒ نے اسے کھولتے ہوئے کہا ہے کہ: جب عالم کے یہ جزئیاتی تغیرات طبع اور سائنٹفک ہیں، جو سائنس کا دعویٰ ہے، تو عالم کا کلی تغیر، یعنی مجموعۂ عالم کی موت بھی طبعی ہے، جسے ''قیامت'' کہتے ہیں۔ پس قیامت کو عقلی دلائل سے الگ ثابت کیا ہے، جو فلسفے کا موضوع ہے اور طبعی، اور مادی شواہد سے الگ نمایاں کر دیا ہے، جو سائنس کا موضوع ہے۔

اس طرزِ استدلال سے جہاں تکوین وتشریع کے مسائل طبعی انداز میں ثابت ہوتے ہیں، وہیں ان حقائق اور دقائق سے قرآن حکیم کا معجزہ ہونا بھی نمایاں ہوتا ہے کہ خدا ہی کے کلام میں ایسی گہرائیاں ہو سکتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ اس سے بلاشبہ مومن کا قرآن حکیم پر ایمان نہ صرف تازہ بہ تازہ؛ بلکہ علی وجہ البصیرۃ ہو جاتا ہے، جو مقصود اصلی ہے، اور ان عقلی اور طبعی حقائق کے کھولنے سے ہی ممکن ہے۔

اس سے واضح ہے کہ قرآنی حقائق جب اس عقلی اور طبعی انداز سے سامنے آئیں، اور جب کہ وہ کسی دور میں بھی خلاف واقعہ نہیں ثابت ہوں گے اور نہ ہو سکتے ہیں، تو یہ محض اعجازِ قرآن ہی کی بین دلیل نہ ہوگی؛ بلکہ اس پر لائے ہوئے ایمان کی مضبوطی کی بھی ایک مستقل حجت ہوگی، جو حقائق بیانی کا ایک زبردست اور عظیم مفاد ہے کہ ایمان علی وجہ البصیرۃ ہو جائے، جو حقیقتاً ایمان تحقیقی ہو جانے کی صورت ہے۔ اب اگر یہی حقائق اغیار کے سامنے آ جائیں، تو عقلاً کوئی وجہ نہیں رہتی کہ وہ ایمان لانے کی طرف نہ جھکیں؛ البتہ تعصب وعناد دوسری بات ہے، جو زیر بحث نہیں ہے۔

بہر حال! حکمتِ قاسمیہ میں بہ یک وقت عقلی اور طبعی دلائل ساتھ ساتھ چلتے ہیں، تاکہ ایک طرف اگر دینی مقاصد کا اثبات فطری طور پر عقلی رنگ میں ہو، تو دوسری طرف ان کا ثبوت حسی اور مشاہداتی طور پر طبعی رنگ میں بھی ہو، اور اس طرح آپ نے دین کے اثبات میں نظریاتی اور حسیاتی دونوں طریقے اختیار فرمائے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر مبانیٔ فلسفہ اور مبادیٔ سائنس دونوں ہی سے خدمت لی ہے، تاکہ ایک طرف تفلسف مزاج لوگوں کے شبہات اور اشکالات فلسفیانہ انداز سے حل ہوں، اور دوسری طرف مادہ پرستوں کے سائنسی شکوک

وشبہات حسیاتی انداز سے مرتفع ہوں، کہ اس کے بغیر اس دور کے مادہ پرستوں کی اصلاح کا دوسرا راستہ نہیں تھا؛ اس لیے بے جھجک کہا جاتا ہے کہ اس قرن کے یہ عرفاً اور حکماً اور بالخصوص حضرت والاؒ اس دور کے مجدد تھے، جنہوں نے اپنے اپنے وقت پر اپنے اپنے دایروں میں وقت کے تقاضوں کے مطابق تجدید دین اور اصلاح امت کے فرائض انجام دیے۔

منقول حقائق اور معقول دلائل کے ساتھ فصاحت بیانی:

اس پر بیان کی بلاغت وفصاحت کا یہ عالم ہے کہ آج سے سو برس پہلے کی اردو کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے، حضرت والاؒ کے حکیمانہ بیانات کی اردو آج سو برس بعد کی اردو سے دور نہیں محسوس ہوتی۔ محاورات کا فرق جداگانہ چیز ہے، جو حسب تقاضائے وقت بدلتے رہتے ہیں؛ لیکن طرز ادا اور اسلوب بیان آج کے معیار ادب کے لحاظ سے بھی اونچے درجے کی فصاحت اور بلاغت سے گراہوا نہیں، جس سے آج کا ادیب بھی نہیں اُکتا سکتا۔

مضمون کی بلندی اور حقائق کی گہرائیوں کی وجہ سے اگر کسی قلیل المناسبت یا کم استعداد کو ان عالی مضامین کے سمجھنے میں دشواری پیش آئے، تو وہ بیان حکمت کا قصور نہیں ہے؛ بلکہ ناظر ومستمع کی علمی استعداد کا قصور ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے مسلم اور غیر مسلم اُدبا اور اردو داں حضرات کے سامنے حکمت قاسمیہ کے ادیبانہ اور بلیغ بیانات نفسِ بیان وتقریر کے لحاظ سے بھی اک مثالی درجہ رکھتے تھے، جس کا اپنوں اور پرایوں؛ بلکہ دشمنوں کو بھی اعتراف تھا۔

حکمتِ قاسمیہ کی اعجاز بیانی کا اعتراف:

چناں چہ مباحثۂ شاہ جہاں پور میں جو عیسائی پادری عیسائیت کے عمومی فروغ کے منصوبے لے کر شریک مباحثہ ہوئے، یا جو ہندو اپنے مذہب کی ترویج عام کے جذبات لے کر مجلس بحث میں حاضر تھے، انہیں حضرت والاؒ کے یہ اعجازی بیانات اور فلسفیانہ اور حکیمانہ تقریرات استدلال سن کر سکوتِ عجز کے ساتھ ان بیانات کی تاثیر وتصرف کا لوہا بھی ماننا پڑا۔ انقیاد وطاعت جداگانہ بات ہے، جو توفیقِ الٰہی پر موقوف ہے۔

پادری اینک نے کہا، جو مباحثۂ شاہ جہان پور میں شریک اجلاس تھے:

> ”کیا پوچھتے ہو؟ ہم کو بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا، اور بہت سے علمائے اسلام سے اتفاق گفتگو ہوا، پر نہ یہ تقریریں سنیں، نہ ایسا عالم دیکھا۔ ایک دبلا پتلا سا آدمی، میلے سے کپڑے، یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ عالم ہیں، ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا

بیان کریں گے؟ یہ تو ہم نہیں کہتے کہ وہ حق کہتے تھے، (گو اس حق کا جواب دینے اور اپنا مفروضۂ حق واضح کرنے سے عاجز بھی رہے، جیسا کہ انہیں خود بھی دوسرے مواقع پر اس کا اعتراف کرنا پڑا) پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے، تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے''[۱]۔

اسی پادری اینک نے مباحثہ کے آغاز میں علمائے اسلام کو پہلو تہی کا طعنہ دیا تھا؛ لیکن حضرت والاؒ کی تقریر سن کر اس طعنہ کے خلاف رطب اللسان تھے۔

مولوی عبدالوہاب صاحب بریلویؒ نے حضرتؒ سے عرض کیا کہ: یہ پادری (اینک) بعد اختتام مباحثہ ملنے آیا تھا، اور حضرت کی تقریروں کی تعریفیں کرتا تھا، جیسا کہ میلۂ خداشناسی میں یہ تفصیل مرقوم ہے۔

ماسٹر جویل نے جو شاہ جہانپور کالج میں مدرس (پروفیسر) تھے، کہا:

''مسلمانوں میں ایک ہی عالم دیکھا''[۲]۔

ایک اور پادری سے سید ظہورالدین صاحب شاہ جہانپوری نے پوچھا: تم اس دن (یوم مباحثہ) میں کچھ نہ بولے؟ انہوں نے کہا کہ

''ہم کیا کہتے؟ مولوی صاحب (حضرت نانوتویؒ) نے کوئی بات چھوڑ دی تھی، جو ہم بولتے؟ ہمارے پادری نولس (جو یوم مباحثہ میں پادریوں کے سربراہ اور قائد تھے) ہی کو جواب نہ آیا''[۳]۔

جانکی داس جوگی (جو اس مباحثہ میں شریک جلسہ تھا) نے خود حضرت والاؒ سے کہا:

''جب تم نے بولی ماری (تقریر کی)، تو ہم نے دیکھا کہ اس کا (پادری نولس) کا اتنا سر یہ سوکھ گیا تھا (یعنی روح ہوا ہوگئی تھی)''[۴]۔

اسی طرح دوسرے ہندوؤں کے مقولے بھی اس کتاب میں اسی قسم کے نقل کیے گئے ہیں، کہا گیا کہ:

''جب میلہ برخاست ہونے لگا اور سب اہل اسلام وہاں سے روانہ ہوئے، میلے کے ہندوؤں وغیرہ (ان) مناظرانِ اسلام (میں سے حضرت والاؒ) کی طرف اشارہ کرکے اوروں کو بتلاتے تھے کہ یہ ہیں، یعنی (حضرت والاؒ)، جنہوں نے پادریوں کو عاجز کیا اور شکست دی''[۵]۔

جانکی داس جوگی نے کہا:

''جے ہے مولبی (یعنی یہی حضرت والاؒ)، جنہوں نے آج سب سے اپنا لوہا منوالیا''[۶]۔

ختم مباحثہ پر حضرت والاؒ نولس کے خیمہ میں خود ملنے تشریف لے گئے اور نصائح فرمائیں۔ فرمایا کہ:

---

(۱) میلۂ خداشناسی۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔
(۴) ایضاً۔ (۵) ایضاً۔ (۶) ایضاً۔

دینِ عیسوی سے توبہ کیجیے اور دینِ محمدی اختیار کیجیے۔ دنیا چند روزہ ہے، عذاب آخرت بہت سخت ہے۔
پادری صاحب نے کہا: بے شک! اور چپ ہو رہے، اور آخر میں پادری نولس نے کہا کہ:

''میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے حق میں اتنا فکر کیا اور میں آپ کی اس بات کو یاد رکھوں گا''(۱)۔

بہر حال! حضرت والاؒ کی صداقت کمال لیاقت اور بیان کی بلاغت غیر مسلموں پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتی تھی۔ حکیمانہ دلائل اور فلسفیانہ براہین جداگانہ چیز ہے۔ یہی تقریر و بیان کے تاثرات تھے کہ اگر یہ سننے والے غیر مسلم اگر اسلام نہیں بھی قبول کرتے تھے، تو معترف ضرور ہو جاتے تھے، اور اس طرح ان پر خدا کی حجت قائم ہو جاتی تھی۔

حکمتِ قاسمیہ اور دورِ حاضر کے ہمہ گیر اعتقادی فتنوں کا سد باب:

یہ تو اغیار کا قصہ ہے، جو عرض کیا گیا؛ لیکن خود مسلمان کہلانے والے ایسے فضلا بھی، جن کی آنکھوں کو فلسفۂ جدید اور سائنس نے خیرہ کر دیا تھا، وہ بھی جب یہ بیانات سنتے تھے، یا آج علمائے دیوبند سے ان کی ترجمانی کو سنتے ہیں، تو وہ نہ صرف مرعوب ہی ہوتے ہیں؛ بلکہ ان کے خیالات کی دنیا میں انقلاب بپا ہو جاتا ہے، اور وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ ان دلائل قاہرہ کے بعد عقائد و افکار دین کے بارے میں آخر وہ کس طرح اپنے اس طبعیاتی یا سائنسی موقف کو قائم رکھیں اور کیوں کر نہ اعتراف حق کریں؟

اس حقیر ناکارہ کو خود بھی بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ اس قسم کی جس مجلس میں بھی قابل گریجویٹوں سے خطاب ہوا، اور مناسبِ موقع حضرت والاؒ کے علوم کی ترجمانی کی نوبت آئی، تو بارہا یہی اعتراف و اقرار کا منظر دیکھنے میں آیا۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آج کے دور کے انکار و الحاد اور دہریت و زندقہ کا قرار واقعی استیصال یا دفاع اگر ممکن ہے، تو اسی حکمت قاسمیہ کی علمی روشنی سے ممکن ہے، جو آج کی فلسفے و سائنس کے مسلّمات اور نئے نئے انکشافات ہی کے اصول سامنے لا کر اسلام کی صداقت کا لوہا منوا سکتی ہے اور جس میں حقیقی طور پر اِتمام حجت کی شان موجود ہے۔

یہ حکمت گو اپنی معقولیت اور شیوہ بیانی کے لحاظ سے واضح سلیس اور دلوں میں اتر جانے والی حقیقت ہے، اور اس کی تاثیرات و تصرفات گو آفتاب سے زیادہ روشن اور اغیار اور اغیار نما اپنوں تک پر اثر انداز ثابت ہوئی؛ لیکن پھر بھی مضامین کی دقت اور مستفیدین کی استعدادوں کی قلت بالخصوص جب کہ بے توجہی

(۱) میلۂ خداشناسی۔

سے اس کی اغلاط آمیز طباعت نے اس کی دقت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہو، کچھ علمی حلقے اس سے دہشت زدہ نظر آتے ہیں؛ بلکہ ان بلند پایہ اور گہری حقائق کی نسبت سے بعض قلیل المناسبت علما بھی اس سے بھاگتے ہوئے محسوس ہوئے؛ لیکن حکمت بہر حال حکمت ہے، اور مسائل کی نسبت سے گو دلائل مشکل بھی ہوتے ہیں، بالخصوص جب کہ وہ فلسفیانہ اور گہرے حقائق پر مشتمل ہوں؛ لیکن سطح پسند لوگوں کی وحشت سے اہل فہم نہ کبھی متاثر ہوئے نہ ہوں گے، اور نہ ہی ان کی طلب حکمت کی دوڑ کسی دور میں بھی ختم ہوگی۔ کلام کی دقت یا رفعت مقام کا تقاضہ اسے حل کرنا ہے، نہ کہ اس سے بھاگنا۔ دنیا جانتی ہے کہ اس دقت کے باوجود اس سے کام یاب ہونے والے کام یاب ہوئے اور انہوں نے ہزاروں کو کام یابی کی منزل تک پہنچایا۔

حکمتِ قاسمیہ کے مستند ترجمان:

جماعت دار العلوم اور علما میں ہزاروں ہزار نکلیں گے، جنہوں نے اس حکمت سے سبق لیا؛ لیکن خصوصیت سے جن حضرات کو اس حکمت سے خاص مناسبت اور گرویدگی تھی، ان میں پہلے طبقے میں حضرت اقدس مرشدی و مرشدِ عالم شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کے درس حدیث کا طرۂ امتیاز ہی یہ علوم قاسمیہ تھے۔ آپ اس حکمت کا ایک نہایت گہرا ظرف اور اس کے اوّلین ترجمان تھے۔ انہیں ان علوم و معارف کے لحاظ سے ''قاسم ثانی'' کہا جانا ایک واقعی حقیقت ہے۔ حسبِ روایت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ: آپ نے حضرت والاؒ کی بعض ادق کتابیں، جیسے: ''آب حیات'' وغیرہ حضرت والاؒ سے درساً پڑھی تھیں؛ اس لیے ان بدیہیات قاسمیہ کی جو ترجمانی آپ فرما سکتے تھے، وہ اوروں سے ممکن نہ تھی۔

دوسرے ترجمان حکمت اس طبقے کے ایک فرد کامل حضرت اقدس مولانا سید احمد حسن امروہی رحمہ اللہ تھے، جن کی درسی اور غیر درسی تقریریں اسی حکمت سے مملو ہوتی تھیں۔ پھر اسی طبقے میں تیسرے ترجمان میرے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، جنہیں اس حکمت کے مضامین پر اس درجے عبور حاصل تھا کہ وہ حضرت والاؒ کی کتب کے صفحے اور سطر تک کے حوالے سے یہ مضامین ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ جلالین شریف، مشکوٰۃ شریف اور مسلم شریف میں جو آخر میں ان کے درس کی خاص کتابیں تھیں، اکثر و بیش تر موقع بہ موقع ان علوم کی ترجمانی فرماتے رہتے تھے۔ راقم الحروف کو جو تھوڑی بہت مناسبت حکمتِ قاسمیہ سے پیدا ہوئی، وہ انہیں کے درس کا طفیل ہے، جب کہ مشکاۃ و مسلم احقر نے ان ہی سے پڑھی ہیں، اور ان میں حضرت مرحوم آیات و احادیث کے مضامین کے اثبات میں اسی حکمت کے اجزا سے کام لیتے تھے، جس کا اثر شرح صدر کی صورت سے سینوں پر پڑتا تھا۔

ان کے بعد دوسرے طبقے میں حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ چوتھے ترجمان تھے، جنہیں اس حکمت پر پورا عبور حاصل تھا اور انہوں نے یہ علم اوّل کے دو بزرگوں کے درس سے حاصل کر کے اپنے دل کی گہرائیوں تک پہنچایا اور پھر تصانیف قاسمیہ کا گہرا مطالعہ فرمایا۔ ان کا مقولہ تھا، جس کے سننے والوں میں یہ حقیر راقم الحروف بھی شامل ہے کہ اگر میری نظر ان کتابوں پر نہ ہوتی، تو نہ معلوم میں اعتزال کے کس گڑھے میں پڑا ہوا ہوتا؟ حضرت ممدوحؒ کے درس حدیث وتفسیر کا طغرائے امتیاز یہی علوم قاسمیہ تھے، جنہیں وہ احادیث کے سلسلے سے درسی تقریروں، نیز اپنے مواعظ وخطبات میں بیان فرمایا کرتے تھے، اور یہی ان کی تقریروں میں جاذبیت کا ایک بنیادی سبب تھا۔ آپ نے اپنی شرح مسلم ''فتح الملہم'' میں بالخصوص کتاب الایمان میں اپنی تقریرات استدلال کو ان ہی علوم سے آراستہ کیا اور ان علوم کو خاص طور پر اس کتاب میں سمویا ہے اور جگہ جگہ حضرت والاؒ کے حوالے دیے ہیں۔

آخر میں حضرت الاستاذ الاکبر علامہ انور شاہ قدس سرۂ سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند بھی اس حکمت کی طرف متوجہ ہوئے، اور ان حقائق کی ترجمانی شروع فرمائی؛ حتیٰ کہ آپ نے طلبہ کی ایک مخصوص جماعت کو خارج اوقات میں ''شفا'' شروع کرائی، جس میں یہ ناکارہ بھی شامل تھا۔ اس میں جگہ جگہ کلامی مسائل کے ضمن میں حضرت والاؒ کی تقریریں نقل فرماتے تھے، اور ان ہی کے اصول سے فلاسفہ کا رد بھی کرتے جاتے تھے۔ اسی دوران میں حضرت ممدوحؒ نے ایک کلامی قصیدہ بہ نام ''ضرب الخاتم فی حدوث العالم'' بھی موزوں فرمایا، جس کے حاشیہ میں جا بہ جا حضرت والاؒ کے حوالوں سے حضرت کے یہ کلامی علوم نقل فرمائے ہیں۔

حکمتِ ولی اللہی اور حکمتِ قاسمیہ پر مولانا سندھیؒ کا التفات:

اس طبقۂ ثانی میں خصوصیت سے حضرت علامہ مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے تو حکمت ولی اللہی اور حکمت قاسمی ہی کو اپنا موضوع زندگی ٹھہرالیا تھا۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں کا کما حقہٗ فہم اور شعور تصانیف قاسمیہ کے مطالعے کے بغیر میسر ہی نہیں آسکتا، اور اسی بنا پر انہوں نے لاہور میں ''محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی'' کی بنیاد ڈالی، جس کے ذریعے انہوں نے ان علوم کی اشاعت وترویج میں پوری ہمت صرف فرمادی۔ مولانا ممدوح نے احقر کی عرض داشت پر دارالعلوم میں اس ناکارہ کو ''حجۃ اللہ البالغۃ'' بھی پڑھانی شروع کی، اور مختلف اوقات میں احقر کے سوالات پر حکمت قاسمیہ اور حکمت ولی اللہی کے اصول وحقائق تشریح کے ساتھ نقل فرمائے تھے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دار العلوم میں پہنچ کر اپنے اوائل ایام میں حضرت والاؒ کی تصانیف میں سے ''تقریر دل پذیر'' کا درس شروع کرایا تھا؛ لیکن سیاسی مشاغل کے غلبے کے سبب وہ نبھ نہیں سکا اور چند ہی اسباق کے بعد ختم ہو گیا۔

آج دار العلوم کے قدیم اساتذہ میں استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدظلہ العالی اس حکمت کے امین ہیں، جو حکمت قاسمیہ پر کافی نظر رکھتے ہیں اور درس حدیث میں موقع بہ موقع ان کو طلبہ کے ذہنوں تک پہنچاتے رہتے ہیں، جس سے دار العلوم کے علمی حلقے میں اک حد تک یہ ذوق موجود ہے۔

حاصل یہ ہے کہ حکمت قاسمیہ کتنی ہی دقیق سہی؛ مگر آج کے دورِ الحاد کے گہرے شبہات کا علمی حل بھی اس کے سوا دوسرا نہیں؛ اس لیے اس کے دقیق ہونے کا ثمرہ یہ نہیں ہوسکتا کہ ان جواہر ریزوں سے روگردانی یا بے توجہی برتی جائے؛ ورنہ یہ ذکر کردہ طبقہ، جو اس حکمت کا حامل تھا، پیدا ہی نہ ہوتا؛ بلکہ یہ ہے کہ ان غامض اور نادر علوم سے آج کے دور کی سطحیت اور سطح پسندی کا علاج کیا جائے، جس کی وجہ سے ذہن اس غامض حکمت سے بعید ہوتے چلے جارہے ہیں۔

حکمت قاسمیہ پر تسہیلی انداز سے خدمت کی ضرورت:

آج اس کی ضرورت ہے کہ اس حکمت کو نہ صرف یہ کہ اچھے اسلوب سے مرتب اور منضبط کر کے محفوظ ہی کر دیا جائے؛ بلکہ ضروری حد تک تشریح و توضیح اور امکانی حد تک تسہیل و تیسیر سے اسے دنیا کے ذہنوں سے قریب کرنے کی بھی سعی کی جائے، تا کہ یہ دقت و غموض وغیرہ کے عذرات بارده لوگوں کے لیے اس سے ترک استفادہ کا حیلہ نہ بن سکیں، پھر بھی اگر کوئی اس فطری قرابادین سے اپنا یا دوسروں کا علاج نہ چاہے، تو یہ اس کی قسمت کی بات ہوگی، قاسمی حکمت کی بات نہ ہوگی۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر مجلس معارف القرآن (اکیڈمی قرآن عظیم) دار العلوم دیوبند نے بہ نام خدا اس حکمت کو اعلیٰ کتابت و طباعت، خوش اسلوب تسہیل اور عمدہ ترتیب کے ساتھ علمی حلقوں کے سامنے پیش کرنے کا عزم باندھا اور علمی قدم اٹھایا ہے۔ اس کا عزم اور منصوبہ ہے کہ نوادر اسرار قرآنی پر مشتمل حکمت قاسمیہ اور حضرت والاؒ کی تصانیف کو ایک خاص ترتیب و تشکیل سے ایک ہی سائز پر سلسلے کے ساتھ پیش کیا جائے، اور ساتھ ہی حضرت والاؒ کی تصانیف کے اصل متن کو بحالہ قائم رکھ کر درمیان میں تشریحی نوٹ کے ذریعے اجمالات کی تفصیل اور اصطلاحی الفاظ کی توضیح کی جائے۔ نیز ہر کتاب کے دقیق مضامین میں حضرتؒ کے بیان سے پہلے اوّلاً انہیں سہل تعبیر میں سمجھا دیا جائے، جس میں اصطلاحی الفاظ نہ ہوں، اور پھر

حضرت والاؒ کے کتابی متن کی اصل عبارت لکھی جائے، تاکہ ایک ناظرِ کتاب نفس مسئلہ اور مدعا کو پہلے سے سمجھ کر جب حضرت والاؒ کا بیان اور اس کے دلائل و براہین پڑھے گا، تو نہ صرف یہ کہ پہلے سے حل شدہ مضمون حضرت والاؒ کی عبارت سے بھی اس کے ذہن میں آجائے گا؛ بلکہ حضرتؒ کی بلیغ اور جامع تعبیرات سے اس کی حقائق فہمی کا لطف بھی دوبالا ہو جائے گا، اور وہ ان حقائق و معارف تک پہنچ سکے گا، جہاں حضرت والاؒ اسے پہنچانا چاہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ تجزیۂ مضامین کے نقطۂ نظر سے ہر مضمون پر جامع عنوانات قائم کیے جانے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، تاکہ بلند مضامین کے الگ الگ ٹکڑے متمیز ہو کر بہ تدریج ذہن میں بیٹھتے چلے جائیں، اور پھر ان عنوانوں سے کتاب کی فہرست بھی سہولت کے ساتھ بنائی جاسکے، جو کتاب کے مضامین کا آئینہ ہو۔

مولانا اشتیاق احمد صاحب اور خدمت حکمت قاسمیہ:

اس عظیم و جلیل مہم کے لیے ''مجلس معارف القرآن'' کی نگاہ انتخاب حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب دام مجدہ استاذ دار العلوم پر پڑی، جو دار العلوم کے قدیم فضلا میں سے ہیں، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے شاگردِ رشید ہیں، ذی استعداد عالم اور اک صاحب ذوق علمی مفکر ہیں۔ حضرت شمس الاسلام نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں سے خاص مناسبت رکھتے ہیں۔ چناں چہ حضرت والاؒ کی معرکۃ الآراء کتاب ''مصابیح التراویح'' پر جامع عنوانات لگا کر اس کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں، جو دار العلوم کے شعبۂ نشر واشاعت کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

نیز آپ ہی نے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ کی تصنیف لطیف ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' کے ترجمے کی تکمیل فرمائی ہے، جسے حضرت اقدس مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے شروع فرمایا تھا؛ مگر ایک ہی جلد کا ترجمہ ہونے پایا تھا کہ وفات ہوگئی۔ مولانا موصوف نے اس کی تکمیل فرمائی، جس کی تین ضخیم جلدیں تکمیل ہو کر ایک جز و شائع بھی ہو چکا ہے اور دوسرا زیر کتابت ہے[1]۔

نیز اور بھی بعض تاریخی اور ادبی کتب کے آپ مترجم ہیں۔ اس طرح حکمت ولی اللہی اور حکمت قاسمیہ دونوں سے آپ کی نگاہیں آشنا ہیں۔ ساتھ ہی آپ سلسلۂ نقش بندیہ کے مجاز طریقت اور صاحب سلسلہ بزرگ بھی ہیں، اور علم کے ساتھ باطنی اور عرفانی ذوق بھی بہم ہے، جو ان ہی صفات وحسنات کے پیش نظر حکمتِ قاسمیہ کی خدمت کے لیے آپ کا انتخاب عمل میں لایا گیا، جو الحمد للہ صحیح ثابت ہوا، اور آپ نے

---

(۱) بعد میں مکمل بھی شایع ہوگیا۔ پاکستان میں دست یاب ہے۔ (نعمان)

اس چھ سات ماہ کی مختصر سی مدت میں حضرت شمس الاسلامؒ کی تین کتابیں ''حجۃ الاسلام''، ''جواب ترکی بہ ترکی'' اور ''انتصار الاسلام'' بہ طرز مذکور مکمل فرمائیں، جو پریس کو جا چکی ہیں اور عن قریب ہدیۂ ناظرین ہونے والی ہیں، اور چوتھی کتاب کا آغاز فرما رہے ہیں۔

ان کتابوں میں مولانا موصوف کے قلم سے جو خدمت انجام پائی ہے، اس میں اہم چیز یہ ہے کہ آپ نے ان تینوں کتابوں کا تاریخی پس منظر، ان کی تصنیف کے وجود و اسباب اور وقت کے متقضیات، ان میں باہمی تقدم تاخر کی نوعیت اور ان کے اجزائے مسائل کی ترتیب سے متعلق قابل قدر تاریخی معلومات بھی فراہم فرما کر ان کتابوں کے مقدمہ و تمہید میں درج کر دی ہیں، جس سے ان کتابوں کے علوم کی عظمت کے ساتھ اس دور کے تاریخی ماحول پر خاصی روشنی پڑ جاتی ہے، جس سے ان کتابوں کی افادیت دوبالا ہو گئی ہے۔ سابق میں ''حجۃ الاسلام'' کے مضمون کے دو ٹکڑے الگ الگ اور بے ربط و ترتیب شائع شدہ تھے، آپ نے انہیں یک جا کر کے ''حجۃ الاسلام'' کو مکمل فرما دیا ہے؛ اس لیے ٹائٹل پر بھی اس کا عنوان ''حجۃ الاسلام مکمل'' ہی رکھا گیا ہے، دوسرا نمبر ترتیب مضامین کے لحاظ سے ''براہین قاسمیہ'' کا رکھا گیا ہے، جس کی وجہ ممدوح نے مقدمے میں ہی ظاہر فرمائی ہے، اور تیسرا نمبر اسی علمی ترتیب پر ''انتصار الاسلام'' کا ہے، بقیہ سلسلوں میں بھی اسی طرح علمی ترتیب ان شاء اللہ ملحوظ رہے گی۔

علوم قاسمیہ کی دیگر زبانوں میں ترجمانی:

اسی کے ساتھ حکمت قاسمیہ کی اس علمی اور تاریخی اہمیت نے کہ وہ روایت و درایت کے ایک جامع مکتبِ فکر کی اساس ہے، عالم اسلام کے غیر اردو داں علمی طبقات کو بھی غیر معمولی طور پر اس کا مشتاق بنا دیا ہے، جس کا دار العلوم میں تشریف لانے والے ممتاز علمائے عرب و عجم نے اظہار فرمایا۔ ''مجلس معارف القرآن'' نے علمائے ملت کی اس آرزو کا کما حقہ احترام کرتے ہوئے حکمت قاسمیہ کے ان بیش قیمت شہ پاروں کو عربی اور انگریزی زبانوں میں منتقل کرنے کو مقصدی درجہ دیا ہے، جس کا آغاز حضرت اقدس نانوتویؒ کی بیش قرار قرآنی تحقیق ''تفسیر المعوذتین'' (عربی) سے کیا جا چکا ہے، جو ٹائپ کے حروف میں نہایت مزین انداز سے شائع ہو چکی ہے، اور دیگر کتب کی تعریب بھی پروگرام میں شامل کر لی گئی ہے۔

ضرورت ہے کہ ارباب علم و فضل اور بالخصوص فرزندان دار العلوم دیوبند ان جواہر ریزوں سے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور اپنے اپنے حلقۂ اثر میں ان نادر علوم کی اشاعت کریں کہ اس دور کے فلسفیانہ الحاد کا زہر اسی تریاق سے دفع ہو سکتا ہے۔

اس لیے ان علوم کی اشاعت نہ صرف ان کے لیے نافع ہی ہے؛ بلکہ بہ تقاضائے وقت ان کا فریضہ بھی ہے؛ کیوں کہ دارالعلوم دیوبند محض ایک درس گاہ ہی نہیں؛ بلکہ ایک مستقل مکتبِ فکر بھی ہے، اور وہ فکر یہی ہے، جو ان سفینوں اور ساتھ ہی مستفیض سینوں میں متوارث طریق پر منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔

دیوبندی طرزِ فکر کے دو امام:

اس طرزِ فکر کے حقیقتاً دو امام ہیں: ایک ابتدائی اور ایک انتہائی۔ ابتدائی سرے پر حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور انتہائی سرے پر حضرت شمس الاسلام نانوتویؒ ہیں، جنھوں نے اس دور کے الحاد اور اسلامی سینوں کی سردمہری کے دفعیہ کا مکمل سامان بہم پہنچا دیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ولی اللہی حکمت میں جو امور کشف و وجدان کے انداز سے ظاہر فرمائے گئے ہیں، وہی اُمور حکمت قاسمیہ میں بہ رنگ استدلال و برہان پیش کیے گئے ہیں، جو اغیار پر بھی حجت بن سکتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ولی اللہی فکر نے نظری طور پر تجدیدِ دین کے اسلحے کا میگزین تیار کیا اور قاسمی فکر نے برہانی اور مشاہداتی طور پر اسے ترتیب دے کر مجاہدانہ اسپرٹ سے لشکر سازی کی۔ اگر ان دونوں نقاطِ فکر کے یہ اسلحے سینوں میں سجا کر دل والے میدان میں آتے رہیں گے، تو بہ قول حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ: اس صدی کا فلسفہ کتنے ہی روپ بدل بدل کر میدان میں آئے، یہ قاسمی فکر فوراً ہی اس کا اندازِ قد پہچان کر دم کے دم میں اس کی قلعی کھول دے گا اور فلسفے کی ساری ملمع سازیاں کافور ہوتی رہیں گی: ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت رامی شناسم

محمد طیب غفرلہٗ
صدر مجلس معارف القرآن
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۲۸ر محرم الحرام ۱۳۸۷ھ
۸ر مئی ۱۹۶۷ء

شاعری

حضرت مولانا نانوتویؒ کی اردو شاعری

حضرت مولانا پروفیسر محمد انوار الحسن انور شیر کوٹیؒ

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی شاعری کو دیکھ کر یہ نظریہ صحیح ثابت ہوتا ہے کہ شعر کے لیے کسی ایسے جذبۂ دروں کی ضرورت ہے، جو شاعر کا دل گرم کر کے متحرک کر سکے۔ آپ اپنے زمانے کے اولیائے کرام میں سے تھے، جن کا دل سوز حقیقت سے گرم تھا، اور بہ قول مجذوب و سالک حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر مدرس دار العلوم دیوبند: مولانا محمد قاسم صاحبؒ آتشِ خاموش کی طرح عشق میں سوختہ سامان ہو کر اپنے محبوب سے جا ملے، اور مرتے وقت تک وہ گرمیٔ عشق نہ گئی، جو رگ رگ میں پھیل چکی تھی (۱)۔ بہ قول غالب:

دل میرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

چناں چہ نعتیہ قصیدہ جو محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں آپ نے لکھا ہے، اس میں شعلۂ محبت کا التہاب و تپش موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

اُڑا کے باد میری مشتِ خاک کو پس مرگ		کرے حضور کے روضے کے آس پاس نثار
ولے یہ رُتبہ کہاں مشتِ خاکِ قاسم کا		کہ جائے کوچۂ اطہر میں تیرے، بن کے غبار
اُمیدیں لاکھوں ہیں؛ لیکن بڑی امید ہے یہ		کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا نام شمار
جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں		مروں تو کھائیں مدینے کے مجھ کو مرغ و مار
جو یہ نصیب نہ ہو، پھر کہاں نصیب مرے		کہ میں ہوں سگانِ حرم کی تیرے قطار

(۱) یہاں اس واقعہ کا ذکر بے محل نہیں ہوگا، جو ہم نے مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ سے سنا کہ مرض الموت میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ پر شدید حدت اور گرمی کا غلبہ تھا۔ خدام و متوسلین قریب و بعید سے برف مہیا کرتے، اس کا استعمال بھی ہوتا؛ مگر دل و جگر کی تپش سکون نہ پاتی۔ حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ عیادت کے لیے تشریف لائے، یہ حال دیکھا، تو فرمایا: یہ جسم کی حرارت نہیں، محبت خداوندی کا سوز اور لقائے محبوبِ حقیقی کے شوق بے پایاں کی آگ ہے، طائر روح قیدِ تن و بدن سے نجات پا کر ہی اور اپنے مقام اصلی پر پہنچ کر ہی سکون پا سکے گا۔ (سید محمد ازہر شاہ قیصر)

مذکورہ اشعار میں عشق حقیقی کی آتش پنہاں کا دل قاسمی میں شعلہ زن ہونا معلوم ہوتا ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس نعتیہ قصیدے میں جو ایک سو اکیاون اشعار پر مشتمل ہے، محبت نبوی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہتا چلا جارہا ہے، اور بے ساختہ اشعار سانچے میں ڈھلتے چلے جارہے ہیں۔ یہی جذبۂ عشق قصیدے میں جاری ہے۔

اسی قصیدۂ بہاریہ میں امید شفاعت کا خیال جب شاعر کے دل میں ابھرا ہے، تو اس خیال نے ان اشعار کی صورت اختیار کرلی ہے۔ لکھتے ہیں: ؎

یہ سن کے آپ شفیعِ گناہ گاران ہیں		کیے ہیں میں نے اکٹھے گناہ کے انبار
گناہ کیا ہے، اگر کچھ گناہ کیے میں نے		تجھے شفیع کہے کون، گر نہ ہوں بد کا

شاعر کے دل میں خیالات کا ہجوم ہے، جو الفاظ کی شکل میں بے ساختہ باہر نکلنے پر مجبور ہے؛ چناں چہ عشق مصطفوی کے باعث تصورات کے ہجوم میں گم ہوکر شاعر بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے: ؎

بہت دنوں سے تمنا ہے عرضِ حال کروں		اگر ہو اپنا کسی طرح تیرے در تک بار
وہ آرزوئیں جو ہیں مدتوں سے دل میں بھری		کہوں میں کھول کے دل اور نکالوں دل کا بخار

شاعر کے دل میں دریار تک پہنچنے اور حرارتِ دل نکالنے کی تڑپ ہے۔ جذبۂ عشق کا اظہار محبوب کے سامنے فطری امر ہے۔ عاشق کوئی صورت ایسی نکالنے کی کوشش کرتا ہے کہ جس سے دریار تک پہنچ سکے؛ لیکن چاروں طرف سے مایوسی ہوتی ہے، تو پھر وہ ناامیدیوں کے ہجوم میں گھر کر چلا اٹھتا ہے: ؎

مگر جہاں ہو فلک، آستاں سے بھی نیچا
وہاں ہو قاسمِ بے بال وپر کا کیسے گزارا

شاعر نے اپنی بے کسی اور مجبوری کا کتنا اچھا نقشہ کھینچا ہے، اور کہا ہے کہ: محبوب کی بارگاہ اور اس کا آستانہ اس قدر اونچا ہے کہ آسمان بھی اس کے آستانے سے نیچا نظر آتا ہے، تو پھر رسائی کس طرح ہوسکتی ہے؟ ایسی بلندی پر جانے کے لیے بال وپر کی ضرورت ہے؛ لیکن قاسم بے بال وپر ہوتے ہوئے وہاں کیسے پہنچ سکتا ہے؟ اور اگر بال وپر ہوں بھی، تو اتنی بلندی پر جانے کے لیے تو بالِ جبریل یا براق کی ضرورت ہے۔

چناں چہ شاعر کا جذبۂ دل کس طرح ترتیب وار کام کررہا ہے اور کہتا ہے: ؎

نہ جبرئیل کے پر ہیں، نہ ہے بُراق کوئی
جو اُڑ کے در تئیں پہنچوں تمہارے یا کہ سوار

جب چاروں طرف مایوسی کا عالم ہے، تو پھر عاشق محبوب سے خود مدد کا طالب ہوا کرتا ہے؛ چناں چہ شاعر نے یہاں محبوب کے لطف وکرم سے اپیل کی ہے، اور اپنی بے کسی کا منظر پیش کرکے اس کے رحم کو اپنی

طرف مائل کیا ہے:؎

مدد کر اے کرمِ احمدی کہ تیرے سوا
نہیں ہے قاسمِ بے کس کا کوئی حامیٔ کار

میرے نزدیک خیالات میں یہ باہمی ترتیب، جذبات میں یہ مدوجزر، زبان میں یہ صفائی اور سلاست مولانا کی قدرتِ کلام اور ترتیب خیالات کا واضح ثبوت دیتی ہیں۔ مذکورۂ بالا اشعار میں جو شاعرانہ جوش اور تخیل ہے، وہ مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ کی شاعرانہ صلاحیت کے انداز کا کامیاب اور صاف نقشہ پیش کر رہا ہے، جس سے ہم شاعر کے بہت قریب پہنچ کر اس کی دنیا کی سیر کر سکتے ہیں۔

اوپر جو بارہ اشعار اب تک پیش کیے گئے ہیں، زبان کے اعتبار سے بالکل صاف ہیں، جس میں کوئی تعقید یا گنجلک نظر نہیں آتی؛ البتہ گیارھویں شعر میں ''تیئں'' کا لفظ متورک کہا جاسکتا ہے؛ لیکن سلیم طبیعت ہر متروک لفظ کو غیر فصیح قرار نہیں دے سکتی۔ ٹک کا لفظ ہر چند کہ متروک ہے؛ لیکن جہاں میر تقی کہتا ہے:؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

تو اس وقت ''ٹک'' کے لفظ کے سامنے (اگرچہ یہ متروک ہو چکا ہے) سارے مترادف الفاظ پھسپھسے نظر آنے لگتے ہیں۔ اسی طرح ''تیئں'' کا لفظ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے شعر میں لطف سے خالی نہیں؛ بلکہ ''تک'' کا لفظ یہاں استعمال کر کے دیکھیے تو وہ لطف ہی ختم ہو جائے گا۔ علم فصاحت میں یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ بعض مواقع پر الفاظ کا باہم تناسب دو مترادف فصیح الفاظ میں سے ایک لفظ کو اپنے ساتھ لینے کے لیے تیار ہوتا ہے اور دوسرے کو نہیں۔ مثلاً: علامہ شبلی مرحوم نے موازنہ انیس و دبیر میں اس بحث پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''شبنم'' اور ''اوس'' دونوں فصیح لفظ ہیں؛ لیکن حسب ذیل شعر میں:؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

''اوس'' کے بجائے اگر ''شبنم'' کا لفظ رکھ دیا جائے، تو سارا شعر خراب ہو کر رہ جائے گا، اور تمام حسن مٹی میں مل کر رہ جائے گا۔

بہرحال! قصیدے کے مذکورہ اشعار مولانا کی فن شاعری سے مناسبت کی غمازی کر رہے ہیں۔

سودا کا ایک قصیدہ:

مولانا کا یہ قصیدہ جو ''بہاریہ'' کے نام سے معنون ہے، اس کے ابتدا میں تشبیب کے اشعار ہیں، جو

اڑتالیس کی تعداد میں ہیں، اور ان سب اشعار میں بہار اور اس کے متعلقات، یعنی چمن، بلبل، نغمہ سرائی، بادِصبا، برگ، گل، غنچہ، شجر، طوبیٰ، قوت نامیہ، سبزہ، صحن چمن، لالہ، داغ، نسیم، شبنم، آب، جوئے بار، سایہ، یاسمین، مہدی خار وغیرہ وغیرہ کا ذکر ہے۔ ایک سو اکیاون اشعار میں اڑتالیس اشعار کی تشبیب مولاناؒ کی قدرتِ تامہ کا پتہ دیتی ہے۔ اس تشبیب میں بالکل مرزا رفیع سودا کے بہاریہ قصیدے کا رنگ ہے، جس کے پہلے دو شعر یہ ہیں:

اُٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستان سے عمل		تیغ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل
قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض		ڈال سے پات تلک پھول سے لے کرتا پھل

''رنگ'' سے میری مراد طرزِ شاعری ہے؛ ورنہ دونوں کے خیالات جدا جدا ہیں۔ مولاناؒ کے قصیدے کے تشبیب کے اشعار حسبِ ذیل ہیں، جن کی زمین اور قافیہ بھی سودا سے مختلف ہے:

نہ ہوئے نغمۂ سرا کس طرح سے بلبلِ زار		کہ آئی ہے نئے سر سے چمن چمن میں بہار
ہر اک کو حسب لیاقت بہار دیتی ہے		کسی کو برگ کسی کو گل اور کسی کو بار
شرار دانۂ بارود کو ہیں لگتے پھول		عموم فیضِ بہاری سے آگ ہے گل زار

قوت نامیہ کی تعریف میں شاعر کی ندرتِ تخیل ملاحظہ ہو:

یہ فیض عام ہے سر پر ہرن کے ہیں شاخیں
بدن پر شیر کے گل اور دم میں سیہ کے خار

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں شیر کی جلد پر قدرتی پتیوں اور نقوش کو شاعر نے ''گل'' ثابت کر کے اور سِیہ (بہ کسر سین وسکون ی)، جو مرغی سے بڑا جنگلی سا کانٹوں دار جانور ہوتا ہے، اس کی دُم میں خاروں کو ثابت کر کے معنی میں جدت پیدا کی ہے۔ پہلے مصرعے میں ہرن کے سینگوں کو شاخیں کہہ کر قوت نامیہ سے وابستہ کرنے کا مضمون جدید نہیں۔ سودا نے بھی ''شاخ میں گاوزمیں کے بھی جو پھوٹے کونپل'' کہہ کر ادا کیا ہے۔

تشبیہ مرکب واستعارہ:

مولانا کی تشبیب کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

بساط سبز مشجر بنا ہے صحنِ چمن
پڑا جو سطح پہ سبزے کے سایۂ اشجار

شاعر نے صحنِ چمن کو سبز مشجر سے استعارہ کیا ہے، اور سبزے کی سطح پر دھوپ چھاؤں کی سیاہی اور چمک کے سائے سے ایک مرکب تشبیہ کا سماں باندھا ہے۔

تلازم وجدّتِ خیال:

گل وبلبل کی طرح گل اور بو کا تلازم پیش کرتے ہیں: ؎

یہ ربط ہے گل وبُو میں اگر جُدا ہو بُو
تو جان کھونے کو ہو اپنی گل وہیں تیار

شاعر نے نئی بات یہ پیدا کی ہے کہ جس طرح بُلبُل پھول سے جدا ہونے پر مرنے کی قریب ہوجاتی ہے، اور گل بے نیازی کا ثبوت دیتا ہے۔ اسی طرح گل بھی بو کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ گل جس میں بو نہیں، مردہ ہے۔

تجنیس زائد:

شاعر نے حسب ذیل شعر میں گل اور گل دم میں کیسی عمدہ مناسبت پیدا کی ہے کہ لفظی اور معنوی رعایتیں خوب ہم آہنگ نظر آتی ہیں: ؎

لگائے منہ بھی نہ گل دم، خدا کی قدرت ہے
اور اس کی دُم سے لگا یوں پھرے ہے گل بے خار

گل دم ہمارے دیس کی بلبل ہے، اگرچہ اس کو بلبل کہنا غلط ہے، تاہم اس کی دُم کے نیچے سرخی ہوتی ہے، جس کو پھول کہہ دیتے ہیں، اور اسی وجہ سے اس کا نام ''گل دم'' ہے۔ اب شاعر نے جو لفظی اور معنوی مناسبتیں پیدا کی ہیں، قابلِ غور ہیں، یعنی گل دم کا پھول کو منہ نہ لگانا اور اس کی دُم سے گل بے خار کا ہر وقت ساتھ رہنا، یہ بہار کا تازہ کرشمہ ہے، پھر گل اور گل دم میں صنعت تجنیس زائد بھی ہے۔ شاعر نے ''لگا یوں پھرے ہے'' کی ترکیب جو متروک ہو چکی تھی، استعمال کی ہے؛ لیکن انیسویں صدی کے اس دور میں، جس میں مولاناؒ کی شاعری جاری ہے، بعض شعرا بے تکلف استعمال کرتے تھے۔ مثلاً غالب کہتا ہے: ؎

گر یہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در ودیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

دیکھیے: غالب کے اس شعر میں ''چاہے ہے'' اور ''ٹپکے ہے'' بجائے ''چاہتا ہے'' اور ''ٹپکتا ہے'' کے استعمال کیے گئے ہیں۔

تشبیہ واستعارہ:

استعارے کی ندرت میں مولاناؒ کا یہ شعر اپنی نظیر آپ ہے۔ لکھتے ہیں:

بنا شعاعوں کی جاروب تیرے کوچے سے مہر
کرے ہے دور اندھیرے کا روز گرد وغبار

جب شعاعیں سورج کے چشمے سے نکلتی نظر آتی ہیں، تو مخزن پر اکٹھی معلوم ہوتی ہیں؛ لیکن آگے چل کر جاروب کی طرح منفصل اور منتشر نظر آتی ہیں، جو بالکل جھاڑو کی شکل کی سی کی معلوم ہوتی ہیں۔ شاعر نے شعاعوں کو جھاڑو سے استعارہ کیا ہے، اور پھر سورج اس جاروب سے اندھیرے کا گردوغبار صاف کرتا ہے۔ یہ بھی استعارے کی شکل ہے، گو اس شعر کی بندش چست نہیں؛ لیکن تخیل کی بلندی اور نزاکت قابلِ غور ہے، پھر کوچۂ معشوق کی صفائی کے لیے شعاعوں کی جاروب بھی خوب خیال ہے۔

ایہام:

اب میں اس قصیدے کے کچھ اور اشعار نقل کرتا ہوں، تاکہ شاعر کے وسعتِ خیال کا اندازہ ہوسکے: ـ

سمجھ کے غنچۂ لالہ کرے ہے گل ورنہ	نسیم تیز کو کچھ شمع سے نہیں ہے کار
اسی لیے چمنستان میں رنگ مہدی نے	کیا ظہور ورق ہائے سبز میں ناچار
خوشی سے مُرغِ چمن ناچ ناچ گاتے ہیں	کفِ ورق سے بجاتے ہیں تالیاں اشجار
زمین و چرخ میں ہو کیوں نہ فرق چرخ وزمیں	یہ سب کا بار اٹھائے وہ سب کے سر پر بار

مخلص:

تشبیب کے ان اشعار کے بعد شاعر گریز کرتا ہے، اور کہتا ہے: ـ

کرے ہے ذرۂ کوئے محمد سے تجلی	فلک کے شمس وقمر زمین لیل ونہار
ثنا کر اس کی فقط اور سب کو قاسم چھوڑ	کہاں کا سبزہ، کہاں کا چمن، کہاں کی بہار

ان سب اشعار پر ایک طایرانہ نظر ڈال کر دیکھیے، تو سلاست، روانی، آمد، تخیل، جوش، نُدرتِ خیال اور بعض اشعار میں سادگی اور بعض میں رنگینی کے ملے جلے دھارے بہہ رہے ہیں۔ شمع کو غنچۂ لالہ سمجھ کر نسیم تیز کا گل کرنا ایہام کی خوب صورت مثال ہے۔ اُدھر گل لالہ کو چراغ سے تشبیہ دینا عام ہے؛ لیکن شاعر نے غنچہ سے یہاں گل کھلایا ہے، جس پر نسیم تیز کا عمل ہوا ہے۔ علاوہ ازیں مرغ چمن کا ناچ ناچ کر گانا اور اشجار کا کفِ ورق سے تالیاں بجانا بھی خوب رعایتیں ہیں۔

یہ قصیدۂ نعتیہ بہاریہ اپنے تسلسل، قدرتِ الفاظ اور معانی کے لحاظ سے اپنی جگہ آپ ایک شعری نمونہ ہے؛ لیکن اس کے علاوہ مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ کا وہ قصیدہ بھی مولانا کی قدرتِ شاعری کا

شاہ کار ہے، جوانہوں نے سلطان عبدالحمید خاں مرحوم خلیفہ عثمانی کی شان میں لکھا ہے، جو ’’قصائد قاسمی‘‘ میں مطبوعہ ہے۔

قصیدہ درمدح سلطان عبدالحمید خاںؒ:

یہ قصیدہ - جیسا کہ حضرت مولاناؒ کے فارسی اور اردو قصیدوں سے بھی واضح ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان عبدالحمید خاںؒ اور روس کے درمیان جنگ کے موقع پر اسلامی جوش اور مسلمانانِ عالم کی غیرت ایمانی کے عمومی ہیجان کی فضا میں لکھا گیا ہے۔ خود ’’قصائد قاسمی‘‘ کے مرتب نے اس جنگ کا پس منظر عربی زبان میں اس طرح بیان کیا ہے:

> **وقد بلغنا أن بعض الفجار من أهل الضرب والجبل الأسود والبلغار وكانوا من تبعة الدولة العلية سلكوا في هذا العصر سبيل العصيان واختاروا الطريق البغي والطغيان؛ فندب اليهم السطان طائفة من عساكره رجالا. وكان عظيم الجيش عبدالكريم، فلم يزل الحرب على حالها؛ حتى أرسل الله رياح النصر لأولياء السلطان، ففتحت قلاعهم.**
>
> ’’اور ہمیں یہ بات پہنچی کہ بعض فجار اہل ضرب جبل اسود اور بلغار نے جو کہ سلطنت عثمانیہ کے ماتحت تھے، اس دور میں بغاوت اختیار کی اور انہوں نے بغاوت اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا؛ اس لیے سلطان نے اپنا فوجی دستہ روانہ کیا، جس کے کمانڈر عبدالکریم تھے۔ جنگ علی حالہ جاری رہی، یہاں تک کہ سلطان کے مددگاروں پر اللہ تعالیٰ نے مدد کی ہوائیں چلائیں اور ان کے قلعے فتح کر لیے‘‘۔

مرتب قصائد کی مذکورہ عبارت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جبل اسود اور بلغار وغیرہ کے باشندے اس وقت ترکوں کے ماتحت تھے، جنہوں نے ان کے خلاف بغاوت کی اور ان کی سرکوبی کے لیے ترکوں نے عبدالکریم کی کمان میں فوج بھیج کر ان کا قلع قمع کر دیا۔ پھر روسی اور ترکی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں؛ اس لیے روسیوں سے بھی سلطان کی جنگ اس موقع پر ہوئی۔ مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ اردو قصیدے میں تحریر فرماتے ہیں:ـــ

فرار سے نہ ملی جب نجات دنیا میں
تو بھاگنے لگے روسی سوئے حصار سعیر

یہ شعر صاف روسیوں سے جنگ کا نشان دے رہا ہے۔ آگے چل کر سلطان عبدالحمیدؒ کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں:؎

جو آرزو ہے تو یہ کہ سر پر ہو سلطان		وہ بادشاہ ہو یہ ان کے آگے حکم پذیر
ہو کون قیصر عالی گہر کرم گستر		وہ کون حضرت عبدالحمید خاں خبیر

اسی قصیدے میں شاعر نے فوج کے سردار عبدالکریم کا بھی ذکر فرمایا ہے، لکھتے ہیں:؎

فلک پہ اس کے لیے مہر ماہ نور افشاں
تو ہے زمیں پر عبدالکریم عالم گیر

مرتب کی عربی عبارت اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے اشعار سے تاریخی پس منظر ہمارے سامنے واضح طور پر آ گیا ہے؛ لیکن یہ جنگ کب ہوئی؟ اس کا ذکر نہ تو مجموعۂ قصائد میں ہی کہیں ہے، اور نہ ہی نا معلوم الاسم مرتب نے ہی کہیں ذکر کیا ہے؛ اس لیے مولاناؒ کے قصیدے کا تاریخی تعین جنگ کی تاریخوں سے ہوسکتا ہے؛ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ قصیدۂ بہاریہ سلطان عبدالحمیدؒ کے قصیدے سے پہلے کی کوشش ہے۔

الغرض سلطان عبدالحمیدؒ کے قصیدے کا تاریخی پس منظر پیش کرنے کے بعد میں اس قصیدے کے اشعار پیش کرتا ہوں:؎ مولانا لکھتے ہیں:

قصیدۂ اردو در مدح سلطان عبدالحمید خاںؒ

نگاہِ ناز کا کسی کی لگا ہے میرے تیر		کمندِ زلف سے کس نے کیا ہے مجھ کو اسیر
خجل ہے زخمِ جگر پر مرے گلِ خنداں		فدا ہے حلقۂ گیسو پہ گردشِ تقدیر
نگاہِ شوق کے صدمے کے داغ کا تل نام		غبارِ راہ ہے نورِ قمر دمِ تنویر
ستم میں ہیں وہ کرم، جس پر ہوں وہی جانے		جفا میں ہیں وہ مزے، جان دیں امیر وفقیر
جو دل دکھائے تو وہ راحتیں کہ مت پوچھو		جو منہ چھپائے تو کھل جائے راز زاہد پیر
جو مارے ہاتھ سے اپنے تو جان آجائے		رہے نہ لذتِ آب بقا کی کچھ توقیر

معنی آفرینی اور نزاکت:

مذکورہ اشعار قصیدے کی تشبیب کے اشعار ہیں۔ ان اشعار میں بندشیں چست اور الفاظ میں قصیدے کی طرح کا شکوہ ہے۔ گلِ خنداں کا زخمِ جگر کے سامنے خجل ہونا، حلقۂ گیسو پر گردشِ تقدیر کا فدا ہونا، نگاہ شوق کے

صدمے کا تل بن جانا، دمِ تنویرِ غبارِ راہ کا نورِ قمر بننا، یہ سب تخیلات شاعر کی نزاکت تخیل کا انداز بتا رہے ہیں۔

درد:

دل کے دکھنے میں راحتوں کا تخیل، ہاتھوں سے مار کر زندہ کر دینا اور لذتِ آبِ بقا کی توقیر نہ رہنا، یہ سب واردات شاعر کے لیے دردِ دل اور دلچسپی کا سامان ہیں۔

ترکوں کی بہادری کا نقشہ:

شاعر ترکوں کی بہادری کا نقشہ کس طرح کھینچتا ہے؟ ملاحظہ فرمائیے: ؎

وہ ایک کھیل سمجھتے ہیں جنگِ اعدا کو		نظر میں ان کی برابر غریب ہو کہ فقیر
ہلائیں ہاتھ تو ہل جائیں دشمنوں کے دل		جو ماریں ہاتھ تو پھر سر سے پاؤں تک دیں چیر
لگائیں تیر تو تیرِ قضا کا کام کرے		چلائیں تیغ تو ہو سر پہ آفت تقدیر
وہ آب تیغ کہ آب بقا کی ہے بجلی		وہ زورِ دست کہ پہنچائیں یاں سے تا بہ سعیر
حیات و موت برابر ہے ان کی آنکھوں میں		کہ آبِ تیغ عدو ان کے آگے شکر و شیر

رنگ تغزّل:

مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی شاعری کا وہ رنگ جو قصیدے میں نمایاں ہے، آپ کے سامنے آ چکا ہے؛ لیکن شعر و شاعری میں جس طرح قصیدہ خاص اہمیت رکھتا ہے، اس سے کہیں زیادہ غزل شاعر کے فن اور کمال سخن وری کے لیے ایک کسوٹی ہے۔ حضرت مولانا کا مجموعۂ کلام جیسا کہ اب تحقیق میں آ چکا ہے اور مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی نے اپنے مضمون مطبوعہ رسالۂ ''دار العلوم''، ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ (جنوری ۱۹۵۲ء) میں لکھا ہے:

> ''مجھے مولوی سید عبدالغنی صاحب سلمہٗ سے معلوم ہوا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے کلام کی ایک ضخیم بیاض ان کے پاس اور تھی، جس کو انہوں نے ایک صاحب کو عاریتاً دے دیا ہے''۔

مولانا کا یہ تمام کلام اور دیگر بعض اردو، فارسی، عربی کی غیر مطبوعہ غزلیں حضرتؒ کے شاگرد مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ پھلاودہ ضلع میرٹھ کے کتب خانے میں موجود ہیں، اور وہیں سے مولانا نسیم احمد صاحب نے بعض غزلوں کی نقلیں حاصل کی ہیں، جو میں پیش کرتا ہوں۔

مجاز:

جیسا کہ میں نے آغاز مضمون میں تحریر کیا ہے کہ مولاناؒ اپنے زمانے کے اولیائے کرام میں تھے، اور

عشق حقیقی کی آگ دل میں شعلہ زن تھی، اسی کا اثر شان رسالت سے عقیدت مندی کی صورت میں ''قصیدۂ بہاریہ'' میں جلوہ گر ہوا ہے؛ لیکن مولاناؒ کی غزلیات میں یقیناً رنگ مجاز بھی موجود ہے۔ حال آں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس مجاز کے لیے مولاناؒ کی بارگاہِ تخیل میں کہیں بھی خارجی حقیقت موجود نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر رنگ مجاز میں بھی اپنے فطری جذبات شعری سے متاثر ہوکر بہت کچھ لکھ سکتا ہے؛ اس لیے یہ کہنا کہ شاعری کے لیے کوئی مجازی حقیقت مطلوب ہے، غلط اور بالکل غلط ہے۔ بہر حال! مولانا کا رنگِ تغزل ملاحظہ کیجیے۔ غالب اور ذوق و مومن کی مشہور طرحی غزل کی زمین میں مولاناؒ نے جو غزل لکھی ہے، وہ حاضر ہے۔ مولاناؒ لکھتے ہیں:ـ

رقیب مہر کے قابل، عدو وفا کے لیے	بنے تھے ہم ہی فقط آپ کی جفا کے لیے
ہمیں تو صبر کو کہتے ہیں شیخ وواعظ سب	انہیں تو کوئی بھی کہتا نہیں وفا کے لیے
وہ بات کیا ہے کہ مر کر بھی قاتل بے رحم	قتیل تیرے تڑپتے رہے جفا کے لیے
جفا بجائے وفا اور ستم بجائے کرم	ہوا کہیں بھی کسی کے یہ آشنا کے لیے
کھڑے کھڑے گہ و بے گاہ کا ترا آنا	بلائے تازہ ہے اک جان مبتلا کے لیے
تفقد اس کا تمہیں اپنے آپ لازم ہے	زبان ہل نہ سکے جس کی التجا کے لیے
جفائیں کیجیے، پر تم کو زیب دیتا ہے	جفا بھی ہووے تو قاسم سے باوفا کے لیے

ہوسکتا ہے کہ یہ غزل مولاناؒ نے اسی دور میں لکھی ہو، جس میں غالبؔ وغیرہ نے طبع آزمائی کی تھی؛ کیوں کہ مولاناؒ کا زمانہ ۱۸۳۲ء سے شروع ہوکر ۱۸۸۰ء تک چلا گیا ہے، اور غالب کا سن وفات ۱۸۶۸ء ہے۔ غالب انقلاب ۱۸۵۷ء سے دس سال بعد تک زندہ رہے ہیں۔

مولاناؒ کی حسب ذیل غزلیات میں سے کچھ منتخب اشعار پیش کرتا ہوں، اس سے قاری کے سامنے مولاناؒ کا رنگ تغزل واضح ہوسکے گا:ـ

اگر مشقِ ستم کو واں نشانہ چاہیے کوئی	تو مرجانے کو ہم کو بھی بہانہ چاہیے کوئی
کسی کا حال کچھ ہو اور کسی پر کچھ گزر جائے	مگر زلفوں کے سلجھانے کو شانہ چاہیے کوئی
یہ مانا قاسم آزاد وحشی ہے؛ مگر سنیے	وحوش دشت وصحرا کو بھی خانہ چاہیے کوئی
پڑے نقشِ پا کی طرح پر جہاں ہم	وہیں مر مٹے ناتوانی تو دیکھو
نہ آنکھوں سے نکلی، نہ دل ہی میں ٹھہری	خدنگ نگہ کی روانی تو دیکھو
نہ ہو دل کو تسکیں، نہ کچھ آس ٹوٹے	ذرا آپ کی خوش بیانی تو دیکھو

مری تلخ کامی میں لذت سی لذت	ستم گر کا لطفِ نہانی تو دیکھو
تمہاری تو شیرینیٔ لب نہ دیکھی	پہ قاسم کی شیریں بیانی تو دیکھو

اس غزل کے آخری شعر میں شاعر نے اپنی شیریں بیانی کا اظہار کیا ہے۔ مذکورہ غزل نہایت فصیح، صاف وشستہ اور مسلسل ہے۔ شاعر نے عشق کی تلخ کامی میں لذت اور ستم گر کے لطف نہانی کی کیفیت کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ نقش پا کی طرح پڑنا اور وہیں کا ہو کر رہ جانا عاشق کی ناتوانی کا خوب منظر ہے۔ انشا نے بھی کیا خوب کہا ہے: ؎

بسانِ نقش پائے رہرواں کوئے تمنا وہیں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

مولاناؒ نے چھوٹی بحر میں جو اشعار نکالے ہیں، وہ نہ صرف تغزل کا بہترین نمونہ ہیں؛ بلکہ اس سے مضمون کو مختصر الفاظ میں سمونے کی قدرت کا پتہ بھی چلتا ہے۔

شاعر نے معشوق کے عاشق سے خفا رہنے اور شکوۂ بے داد کا عام مضمون حسب ذیل شعر میں اس طرح ادا کیا ہے: ؎

عاشقوں سے وہ صنم کیا شاد ہو
گر کسی کو شکوۂ بے داد ہو

شاعر معشوق کے قتل عاشق کے پرانے انداز کے سوائے کسی اور نئی طرز ستم کا خواہش مند ہے، اور کہتا ہے: ؎

قتلِ عاشق اک پرانی بات ہے	ہاں ستم گر کچھ نئی ایجاد ہو
آرزوئیں ہوگئیں سینے میں خاک	دل لگا کر خاک کوئی شاد ہو

شاعر کا یہ تخیل خوب ہے کہ ہمیں دل لگا کر بھی خوش ہونے کا موقع نہ ملا کہ آرزوئیں بر آتیں۔ پھر آرزوؤں کے سینے میں خاک ہونے اور دل لگا کر خاک شاد ہونے کا محاورہ اور رعایتیں تناسب لفظی کی اچھی مثالیں ہیں۔ آگے چل کر شاعر نے ایک نئے اور فصیح انداز میں کوچۂ یار میں خاک کے اڑتے پھرنے کا کس انداز میں ذکر کیا ہے: ؎

اپنی مشتِ خاک اور یہ آرزو
کوچۂ دل دار میں برباد ہو

اور ہائے کیا غضب کا شعر نکالا ہے اور انتقام لینے کا ایک اچھوتا مضمون معشوق کے بھول جانے میں پیش کیا ہے؛ لیکن ساتھ ہی معشوق کو فراموش کر دینے کا ارادہ (اگر چہ بہ طور انتقام ہی کیوں نہ ہو) عاشق کے

لیے مشکل ہے؛ اس لیے شاعر نے اس تخیل کو عجیب پیرائے میں بیان کیا ہے۔ نیز دوسرے شعر میں بے نیازی کے لطف اور کشتۂ غم ہو کر غم ہی میں شاد رہنے کا ذکر کیا گیا ہے: ؎

بھول کر دیکھیں کہو تو ہم اگر	بھول جانا انتقام یاد ہو
بے نیازی کا مزہ جانے وہی	جس کے سینے میں دلِ ناشاد ہو
قاسمِ دیوانے میں دیکھی یہ بات	کشتۂ غم ہو کے غم میں شاد ہو

مولانا ؒ کی غزلیات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو صنف غزل میں بھی اچھی خاصی مشق و مہارت تھی۔ قصیدہ اور غزل کے بعد صنف مثنوی کا حال مولانا ؒ کی اس مثنوی سے ہی چل سکتا تھا، جو آپ نے نذرِ آتش کردی، اور جو دیوان ''اللہ دیا'' کی فرمائش پر پانچ سو اشعار میں لکھی تھی، اس کا ایک شعر حاضر ہے، جو مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب امروہیؒ شاگرد رشید حضرت مولانا قاسم العلومؒ کی زبانی پہنچا ہے: ؎

ضعف سے ہوگیا دمِ رفتار
تن کو سائے کا تھامنا دُشوار

''سالے کہ نہ کوست از بہارش پیداست'' مثنوی کے مذکورہ شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ باقی تمام مثنوی میں کیا کچھ ہوگا۔

''دمِ رفتار جسم کو سائے کا تھامنا ضعف کی وجہ سے دشوار ہووے گا''، اس مضمون میں کتنی جدت اور تخیل میں کس قدر ندرت ہے۔ شعر میں روانی ہے۔

مولانا ؒ کے لیے مشکل سے مشکل زمین میں شعر لکھنا آسان تھا۔ مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب مفسر امروہیؒ کی زبانی مولانا کی اس غزل کا پتہ چلا ہے، جو ذوق کی غزل پر اسی ردیف اور قافیے میں مولانا ؒ نے لکھی تھی۔ ذوق کی غزل کا مطلع ہے: ؎

بلبُل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

''باغ'' اور ''شکستہ پر'' کے قافیے اور ردیف کتنے کٹھن ہیں کہ ان میں مضمون نبھانا کتنا دشوار ہے؛ لیکن مولانا ؒ کی غزل کا صرف ایک شعر مولانا عبدالرحمٰنؒ کی زبانی ہمیں پہنچا ہے، جو ان کو یاد رہ گیا تھا:

میں کیا کروں کہ پر ترے ناوک کا جل گیا
رکھنا تھا اس کو داغ سے دور اور شکستہ پر[1]

(۱) (مضمون ماخوذ از): ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند، ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ/ اگست ۱۹۵۴ء، ص: ۲۰ تا ۲۷۔

حضرت مولانا نانوتویؒ کا نایاب کلام

حضرت مولانا نسیم احمد فریدی امروہیؒ

امسال وسط شوال (۱۳۷۰ھ/ جولائی ۱۹۵۱ء) میں پھلاودہ ضلع میرٹھ جانا ہوا۔ مدت سے اشتیاق تھا کہ اس قصبے کی زیارت کروں، جس میں مولانا شاہ عبدالغنی پھلاودیؒ جیسا درویش صفت عالم پیدا ہوا تھا۔ اتفاق سے ۱۲/نومبر ۱۹۵۰ء کو جمعیت علما صوبۂ یو. پی کے اجلاس میرٹھ میں مولوی سید عبدالمغنی صاحب نبیرۂ حضرت موصوف سے ملاقات ہوئی، انہوں نے مجھے اس کتب خانے کا گرویدہ بنادیا، جو مولانا پھلاودیؒ کا جمع کیا ہوا ہے، اور جس کو باوجود مختصر ہونے کے علوم قاسمیہ کا مخزن کہنا چاہیے۔ مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ اب سے اٹھارہ سال پیش تر اس دنیا میں موجود تھے۔ احقر نے ان کی زندگی میں ایک عریضہ مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ کے حالات وسوانح کے سلسلے میں پھلاودہ روانہ کیا تھا۔ مولانا اس وقت سخت علیل اور صاحب فراش تھے، جواب دوسرے کے قلم کا لکھا ہوا آیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ پھلاودہ میں حضرت نانوتویؒ اور حضرت امروہیؒ کے خطوط وتصانیف کا اس قدر غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہوگا، جو کسی دوسری جگہ غالباً نہیں ہے۔ خیر اس عنوان پر مستقل طور پر پھر لکھوں گا کہ میں نے کتب خانہ پھلاودہ میں کیا کیا دیکھا۔ اس وقت مجھے حضرت مولانا نانوتویؒ کے غیر مطبوعہ کلام کو پیش کرنا ہے، جو اس کتب خانے سے حاصل ہوا ہے۔

سب سے پہلے میں مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ کا تعارف کرادوں، تاکہ ناظرین کو معلوم ہوجائے کہ اس گم نام قطب الوقت نے پھلاودہ کے ایک گوشے میں بیٹھ کر کس طرح سے مولانا نانوتویؒ کی ایک ایک ادا کو اپنے آئینۂ بیاض میں اتارلیا تھا، اوران کو اپنے باکمال استاد کے ساتھ کتنا ربط اور تعلق خاطر تھا؟

مولانا شاہ عبدالغنی پھلاودیؒ:

پھلاودہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے اور نسلاً سادات کرام سے تھے۔ حضرت مولانا نانوتویؒ اور حضرت مولانا امروہیؒ سے تلمذ حاصل تھا۔ سند فراغ حضرت مولانا امروہیؒ سے حاصل کی۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت تھے۔ مدرسۂ شاہی مراد آباد میں مدرس تھے۔ حضرت محدث امروہیؒ جب مدرسۂ شاہی

سے ۱۳۰۴ھ/(۱۸۸۷ء) میں امروہہ آئے، تو یہ بھی ان کے دیگر رفقا کے ساتھ امروہہ آ گئے تھے۔ یہاں مدرسۂ اسلامیہ جامع مسجد میں کئی سال مدرس رہے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے امروہہ کے مدرسہ سے جسمانی تعلق منقطع کرلیا؛ مگر پھلاودہ میں بیٹھے ہوئے امروہہ کو اور امروہہ کے محدث کو نہیں بھولتے، برابر خط وکتابت جاری رہتی ہے۔ محدث امروہیؒ کے کثیر التعداد خطوط دیگر اکابر کے مکاتیب کے ساتھ اس احتیاط اور حفاظت سے رکھے ہیں کہ آج بھی چالیس پچاس سال کا عرصہ گزرنے پر نئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں مدرسۂ اسلامیہ امروہہ کی تدریجی ترقی کا حال، تحریک قادیانیت کے خلاف اپنی سرگرمیوں کا تذکرہ، مناظرۂ رام پور (جو اہل سنت اور قادیانیوں کے درمیان ہوا تھا) کی مختصر روداد، ہر ضروری بات کا ذکر اور نئے واقعے کی اطلاع موجود ہے۔ ۱۳۱۷ھ/(۱۸۹۹ء) میں حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کے وصال کی خبر امروہہ سے پھلاودہ روانہ کی جاتی ہے، ساتھ ہی ساتھ تاکید ہے کہ اس واقعۂ جان کاہ کو سن کر دامن صبر ہاتھ سے نہ چھوڑ دینا۔

مولانا پھلاودیؒ کا اپنے استاذ حضرت امروہیؒ سے عشق ومحبت کا یہ عالم ہے کہ بار بار اپنے وطن میں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دیتے ہیں، اور یہ دعوت اس وقت اور قوی ہوجاتی ہے، جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا امروہیؒ میرٹھ یا دیوبند تشریف لا رہے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت مولاناؒ میرٹھ سے بالا ہی بالا دیوبند تشریف لے گئے، جب حضرت پھلاودیؒ کو معلوم ہوا، تو یہ شعر لکھ کر امروہہ روانہ کیا: ؎

تو بہ دیوبند رسیدۂ دل ما رخت کشیدہ
بہ نگاہ لطف ندیدہ؛ مگر ایں چو شیوہ دل بریست

مولانا پھلاودیؒ کو حضرت قاسم العلومؒ سے بھی نسبت خاص حاصل تھی۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ مولانا نانوتویؒ سے کس مقام پر اور کب تک تعلیم حاصل کی؟ غالباً ۱۲۹۷ھ/(۱۸۸۰ء) تک یہ پھلاودہ کا درویش مولانا نانوتویؒ کے دامن سے وابستہ رہا ہے۔ بعدۂ مولانا امروہیؒ کے پاس مراد آباد آ کر تکمیل کرتا ہے۔ پھلاودہ میں مولانا نانوتویؒ کے بھی بہت سے خطوط نہایت حفاظت وصیانت کے ساتھ ایک جزدان میں رکھے ہوئے ہیں۔ حضرت نانوتویؒ اپنے اس صوفی منش شاگرد کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اچھے اچھے القاب سے یاد فرماتے ہیں۔ پھلاودی شاگرد کو اپنے شیخ کے قلم سے نکلے ہوئے تکریمی القاب سے کچھ ندامت محسوس ہوتی ہے، اور اس ندامت کا ذکر کر کے حذف القاب کی درخواست کرتا ہے۔ حضرت نانوتویؒ القاب میں اختصار کرنے پر تیار ہیں؛ لیکن ان کو بالکل ترک کرنے پر راضی نہیں ہیں۔

بہت سے خطوط ایسے بھی مولانا پھلاودیؒ نے جمع کر لیے ہیں، جو حضرت نانوتویؒ نے اپنے مایۂ ناز

شاگرد مولانا امروہیؒ کو روانہ کیے ہیں، اور ان میں خاص خاص علمی مضامین مکتوب الیہ کی ستعداد کے پیش نظر بیان فرمائے ہیں۔ مولانا پھلاودیؒ کے ابن الابن مولوی سید عبدالمغنی صاحب نے مجھے بتلایا کہ مولانا عبدالغنی صاحب پھلاودیؒ سفر میں بھی مولانا نانوتویؒ کے ساتھ رہے ہیں اور ان کی تقاریر کو ضبط کیا ہے۔

شاہ محمد عاشق پھلتیؒ نے جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے علوم ومعارف کو محفوظ رکھنے اور ان کو رائج کرنے کی کوشش کی اسی طرح مولانا پھلاودیؒ نے حضرت نانوتویؒ اور ان کے تلمیذ رشید حضرت امروہیؒ کی علمی دستاویزوں کو دست وبرد زمانہ سے محفوظ رکھا، اور برابر قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے معارف وعلوم کو سیکھنے اور سکھانے کی تلقین فرماتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے کتب خانے میں حضرت نانوتویؒ کے کیا کیا نایاب اور کم یاب علمی آثار ہیں؟ اس کو پھر لکھوں گا، اس وقت تو مجھے صرف تعارف کرانا تھا۔

مولانا پھلاودی بلند پایہ درویش، بڑے جید عالم، بہترین ادیب، اردو، فارسی، عربی کے باکمال شاعر تھے۔ حافظ کلام اللہ ہونے کی رعایت سے حافظ تخلص تھا۔ تاریخ گوئی میں خاص مہارت تھی۔ خط نہایت پاکیزہ اور اپنے دونوں استادوں سے ملتا جلتا تھا۔ ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) میں انتقال فرمایا۔ انتقال سے قبل ایک وصیت نامہ لکھا جو شائع ہو چکا ہے۔

مولانا نانوتویؒ کا ذوق شعر:

دنیائے علم واقف ہے کہ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مفسر، محدث، متکلم، صوفی اور زبردست مناظر تھے۔ ان کی تقریر وتحریر کے بہت سے نمونے علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں۔ ان کی محققانہ کاوشیں رہتی دنیا تک ان کا نام قائم رکھیں گی۔ ان کے تلامذہ اقصائے عالم میں آفتاب وماہ تاب بن کر چمکے۔ اسلام کی حمایت میں ان کے مناظرے ملت بیضا کی تقویت کا باعث ہوئے۔ ان کے ذریعے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی حکمت ومعرفت دار العلوم دیوبند کے بام ودر پر جلوہ گر ہوئی اور آج بھی جلوہ گر ہے۔ یہ تمام خصوصیات اظہر من الشمس ہیں؛ لیکن مولاناؒ کا ایک باکمال اور قادر الکلام شاعر ہونا قریب قریب نظروں سے اوجھل ہے۔ گو شعر وشاعری ان امتیازات کے ہوتے ہوئے مولانا کے لیے کچھ زیادہ موجب عزت نہ ہو؛ لیکن پھر بھی ایک فن ہے اور بہت سے بزرگوں نے اس فن میں اپنی جولانئ طبع کی کرشمہ سازیاں دکھائی ہیں۔ مولاناؒ کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ ''قصائد قاسمی'' کے نام سے چھپ چکا ہے، جس میں ایک نعتیہ قصیدہ شاہ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر بھی ذوق شعر کا پتہ چلانے کے لیے یہ مجموعہ کافی

نہیں ہے۔

ایک طرف حضرت نانوتویؒ نے اردو نثر کو علمی وفنی اصطلاحات کے خزانے عطا فرمائے، اس کو معارف لدنیہ کا عامل بنایا۔ ''قبلہ نما'' بہ طور تحفہ پیش کیا۔ ''آب حیات'' کے جرعہ ہائے حیات بخش پلائے۔ اس زبان میں اونچے اور مشکل مضامین کے علاوہ اپنی سادہ کلامی کے عمدہ نمونے پیش کیے۔ دوسری طرف اردو نظم کے دامن کو اعلیٰ تخیل اور بلند جذبات سے زینت بخشی۔ اگر مولانا نانوتویؒ کا پورا مجموعہ کلام دست یاب ہو جاتا، تو میں اپنے اس دعوے میں کام یاب ہو جاتا کہ وہ اپنے زمانے کے دہلی کے بڑے بڑے شعرا سے قادر الکلامی میں کسی طرح کم نہیں (۱)۔ آخر وہ مولانا مملوک العلی صاحب نانوتویؒ جیسے ادیب وقت کے شاگرد رشید تھے، جنہوں نے دیگر علوم کے علاوہ علم ادب بھی شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے ایک ذہین شاگرد مولانا رشید الدین دہلویؒ سے حاصل کیا تھا۔ مولانا مملوک العلیؒ دہلی کے بعض ان مشاعروں میں شریک ہوئے ہیں، جو بادشاہ دہلی کی سرپرستی میں دہلی میں منعقد ہوتے رہتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ''اطیب النغم'' اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے عربی اشعار سے ان کے ذوق ادب کی فراوانی کا پتہ چلتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے مولانا فضل حق خیرآبادیؒ کے عربی اشعار پر اصلاح دی ہے، اسی کا اثر ہے کہ ''ثورۃ الہندیہ'' کی نظم ونثر عربی انتہائی مؤثر ہے، اور اہل فہم کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ خاندان ولی اللہی کے فیض یافتہ ہونے اور خداداد صلاحت کے باعث حضرت مولانا نانوتویؒ کا کلام عربی بھی نہایت پرتاثیر اور پرکیف ہے۔ ۱۸۵۷ء سے کچھ عرصہ بعد تک فارسی علمی حلقوں میں کافی رائج تھی، شعروسخن میں اس زبان کے جوہر دکھائے جاتے تھے۔ اسی لیے مولاناؒ نے نثر کے علاوہ نظم کو بھی قند پارس سے لذت یاب فرمایا ہے۔ رہی اردو وہ ان کے زمانے میں ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ ملک کی عام فہم زبان تھی۔ دہلی جو اردو زبان کا عظیم الشان مرکز ہے، مولاناؒ تعلیم کے زمانے میں وہاں برسوں رہے ہیں، پھر وہ کس طرح اس زبان کو اپنی شیریں کلامی سے فیض یابی کا موقع نہ دیتے؟

حضرت مولانا نانوتویؒ کے ایک اور شاگرد جو بعد کو حضرت امروہیؒ کے یہاں مدرسۂ شاہی مرادآباد میں فارغ التحصیل ہوئے، حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب صدیقی مفسر امروہیؒ سے بھی حضرت قاسم العلومؒ کے

---

(۱) حضرت مولانا نانوتویؒ کی اردو شاعری کے متعلق ابھی چند دن ہوئے احقر- حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ سے گفتگو کر رہا تھا، مولانا نے فرمایا کہ: میں نے متعدد بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت مولانا نانوتویؒ نے ایک دفعہ فرمایا کہ: بعض وقت شاعرانہ مضامین اور کیفیت کی اس قدر آمد ہوتی ہے کہ مجھے خیال ہوتا ہے کہ پورا وعظ برجستہ نظم میں کہہ دوں؛ مگر چوں کہ یہ خلاف سنت ہے؛ اس لیے اس سے پرہیز کرتا ہوں۔ (فریدی)

ذوق شعر وادب کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ حضرت حافظ صاحبؒ جو کہ اکابر دیوبند خصوصاً مولانا نانوتویؒ کے آخری چند سال کی ایک جیتی جاگتی تاریخ تھے، فرماتے تھے کہ مولانا نانوتویؒ نے دیوان اللہ دیا کی فرمائش پر ایک مثنوی لکھی تھی جو پانچ سو اشعار پر مشتمل تھی، اس کا ایک شعر یہ ہے: ؎

ضعف سے ہوگیا دم رفتار
تن کو سائے کا تھامنا دشوار

اس کے قریب ہی زمانے میں مولانا گنگوہیؒ نے "ہدایۃ الشیعہ" تصنیف فرمائی، اس کو ملاحظہ کر کے فرمایا کہ مولانا گنگوہیؒ دین کا یہ کام کر رہے ہیں اور میں نے مثنوی لکھی ہے، فوراً وہ مثنوی منگوائی اور جلادی۔

ایک مرتبہ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: میں حضرت مولانا نانوتویؒ کے ساتھ مظفر نگر گیا تھا، جیل خانے کے قریب ایک مکان میں مولانا فروکش تھے، ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں دوپہر کو سو رہا تھا، آنکھ کھلی تو دیکھا کہ مولانا کے کاغذات رکھے ہیں اور خود کسی ضرورت سے کہیں گئے ہیں۔ میں نے کاغذات کو دیکھا، تو دو غزلیں تھیں، جو مختلف ردیف وقافیے کی تھیں۔

ایک مرتبہ حافظ صاحبؒ نے مولانا نانوتویؒ کے چند اشعار سنائے، جو ان پیش کردہ غزلوں میں موجود ہیں، علاوہ ازیں مولاناؒ کی ایک غزل کا (جو ذوق کی غزل پر لکھی تھی) ایک شعر سنایا۔ ذوق کی غزل کا مطلع یہ ہے: ؎

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر
(ذوق دہلویؒ)

اس زمین میں حضرت مولانا نانوتویؒ کا صرف ایک شعر جو حضرت حافظ صاحبؒ کو یاد رہ گیا تھا یہ ہے: ؎

میں کیا کروں کہ پر ترے ناوک کا جل گیا
رکھنا تھا اس کو داغ سے دور اور شکستہ پر
(مولانا نانوتویؒ)

اب میں حضرت والاؒ کا غیر مطبوعہ کلام پیش کرتا ہوں، اس کی دو نقلیں کتب خانہ پھلاودہ میں ہیں، تیسری نقل میرے پاس ہے۔ مجھے مولوی سید عبدالمغنی سلمہ سے معلوم ہوا کہ مولانا کے کلام کی ایک ضخیم بیاض ان کے پاس اور تھی، جس کو انہوں نے ایک صاحب کو عاریتاً دے دیا ہے، اگر وہ بیاض بھی میرے سامنے ہوتی، تو میں اس سے زیادہ کلام پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا۔

اس موجودہ مختصر مجموعے میں چھ غزلیں اردو کی، دو فارسی کی اور آٹھ عربی کی نظمیں ہیں۔ اس میں

سے اردو کی سب غزلیں چند اشعار کے حذف کے بعد، فارسی کی دونوں غزلیں اور عربی کلام کا اقتباس پیش کروں گا۔

عربی کے اشعار کافی تعداد میں موجود ہونے کے باوجود کم پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ناقلین و کاتبین سے کتابت میں بہت سے اغلاط واقع ہو گئے ہیں، اور وہ اغلاط کافی غور وخوض کے بعد رفع ہو سکتے ہیں۔ پھر عربی اشعار کا سلیس اردو ترجمہ بھی متوسط طبقے کے لیے ضروری تھا، بنابریں تمام حاصل کردہ کلام عربی پیش نہیں کیا گیا۔

ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ مولانا حافظ سید عبدالغنی صاحبؒ پھلاودی کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں کہ ان کی کوشش کے نتیجے میں مولانا نانوتویؒ کے بہت سے علمی آثار محفوظ رہے۔ یہ اشعار بھی انہیں کی بہ دولت ہمارے ہاتھ لگے جو تبرک کے طور پر ہدیۂ ناظرین کیے جا رہے ہیں۔

کلام اردو

(۱)

جما کر تیری صورت رو بہ رو ہم	کیا کرتے ہیں پہروں گفتگو ہم
کیا کرتے ہیں کہنا نامہ بر یاد	رخِ گل فام وزلف مشک بو ہم
اگر یوں ہی کٹی یہ زندگانی	تو لے جائیں گے کیا کیا آرزو ہم
نگاہِ لطف کے ہیں زخم دل میں	کریں اے چارہ گر کیوں کر رفو ہم
پڑا رہنے دے اے شوقِ دل آرام	ابھی بیٹھے ہیں پھر کر چار سو ہم
بس اتنا تنگ مت کر وحشتِ دل	لیے بیٹھے ہیں اپنی آبرو ہم
لب شیریں سے خود کامی تو معلوم	پییں گے ہم دم اب اپنا لہو ہم
نہ جاناں ہے نہ جان ہے اور نہ دل ہے	کریں کس کس کی یارب جستجو ہم
نہیں ساقی تو ہم دم چھوڑ دیں گے	کسی پتھر پہ ساغر اور سبو ہم
پئے تشہیر مشتِ خاکِ قاسم	اڑائیں گے کہیں بھی، کو بہ کو ہم

(۲)

اگر مشق ستم کو واں نشانہ چاہیے کوئی	تو مرجانے کو ہم کو بھی نشانہ چاہیے کوئی

کسی کا حال کچھ ہو، اور کسی پر کچھ گزر جائے	مگر زلفوں کے سلجھانے کو شانہ چاہیے کوئی
ہمارا غم غلط ہو یا نہ ہو ہم دم سے پر تم کو	تغافل کے لیے ہم سے بہانہ چاہیے کوئی
یہ مانا قاسمِ آزاد وحشی ہے؛ مگر سنیے	وحوش دشت وصحرا کو بھی خانہ چاہیے کوئی

(۳)

یوں حسن میں ہیں اور بھی کم اور زیادہ	پر آپ میں ہے طرزِ ستم اور زیادہ
جوں سایہ نمود اپنی تمھیں سے ہے وگر نہ	کچھ ہم میں نہیں غیر عدم اور زیادہ
وہ پیار کی باتوں میں خفا ہوگیا یارب	تھی ہم کو تو امیدِ کرم اور زیادہ
ہے عمر رواں راہ عدم جتنے بڑھے ہم	اتنے ہی بڑھے سوئے عدم اور زیادہ
اے چارہ گر عشق نہ کر وصل کی تدبیر	کھودیں گے مجھے لطفِ صنم اور زیادہ
کچھ ناز کا دعویٰ ہے اگر اپنا سمجھ کر	تو ہاں تمھیں اپنی ہی قسم اور زیادہ
کیا کر کے رہے دیکھیے قاسم یہ محبت	زندہ رہے ہم گر کوئی دم اور زیادہ

(۴)

عاشقوں سے وہ صنم کیا شاد ہو	گر کسی کو شکوۂ بے داد ہو
قتل عاشق ایک پرانی بات ہے	ہاں ستم گر کچھ نئی ایجاد ہو
آرزوئیں ہوگئیں سینے میں خاک	دل لگا کر خاک کوئی شاد ہو
اپنی مشتِ خاک اور یہ آرزو	کوچۂ دل دار میں برباد ہو
بھول کر دیکھیں کہو تو ہم اگر	بھول جانا انتقام یاد ہو
بے نیازی کا مزہ جانے وہی	جس کے سینے میں دل ناشاد ہو
قاسم دیوانے میں دیکھی یہ بات	کشتۂ غم ہو کے غم میں شاد ہو

(۵)

مروں ہوں مری ناتوانی تو دیکھو	سر مرگ ہے شادمانی تو دیکھو
پڑے نقش پا کی طرح پر جہاں ہم	وہیں مر مٹے ناتوانی تو دیکھو

ستم گر کی زلف ونگہ سے ہمیشہ	نبٹتے ہیں ہم سخت جانی تو دیکھو
نہ آنکھوں سے نکلی نہ دل ہی میں ٹھہری	خدنگِ نگہ کی روانی تو دیکھو
نہ ہو دل کو تسکین نہ کچھ آس ٹوٹے	ذرا آپ کی خوش بیانی تو دیکھو
اِدھر سے اُدھر سایہ وش ضعف میں بھی	طلب میں پھرا جان فشانی تو دیکھو
مری تلخ کامی میں لذت سی لذت	ستم گر کا لطف نہانی تو دیکھو
اجل کی تمنا تھی مرکر بھی، وہ ہی	رہا غم غمِ جاودانی تو دیکھو
تمہاری تو شیرینیٔ لب نہ دیکھی	پہ قاسم کی شیریں بیانی تو دیکھو

(۶)

رقیب مہر کے قابل عدو وفا کے لیے	بنے تھے ہم ہی فقط آپ کی جفا کے لیے
کھڑے کھڑے گہ وبے گاہ کا ترا آنا	بلائے تازہ ہے اک جان مبتلا کے لیے
تفقد اس کا تمہیں اپنے آپ لازم ہے	زبان ہل نہ سکے جس کی التجا کے لیے
ہمیں تو صبر کو کہتے ہیں شیخ و واعظ سب	انہیں تو کوئی بھی کہتا نہیں وفا کے لیے
وہ بات کیا ہے کہ مرکر بھی قاتلِ بے رحم	قتیل تیر سے تڑپتے رہے جفا کے لیے
جفا بجائے وفا اور ستم بجائے کرم	ہوا کہیں بھی کسی کے یہ آشنا کے لیے
جفائیں کیجیے پر تم کو زیب دیتا ہے	جفا بھی ہووے تو قاسم سے باوفا کے لیے

کلام فارسی

(۱)

ساقیا سیرم زمے خاکِ درِ مے خانہ ام	از لبِ شیریں بدہ لذت بہ یک پیمانہ ام
جان یا جاناں بہ گو خوانم ترا یا جانِ جاں	اصطلاحِ شوق بسیار است ومن دیونہ ام
آتشِ عشق تو افتاد است در جان وتنم	سوختی یک سر فدایت جان من کاشانہ ام
از منِ خستہ چہ می پرسی کہ قاسم کیستی	گر گلی من بلبلم در شمع من پروانہ ام

(۲)

از جنوں دست دگر گریبانست		خارِ صحرا بہ شوقِ دامانست
گردش بخت ودورۂ گردوں		فتنۂ کاکلِ پریشانست
سینۂ چاک چاک وخندۂ ناز		دلِ بے تاب ونوکِ مژگانست
دلِ بے تاب من مبارک باد		کہ بہ کارِ تو چشم فتانست
جاں بہ لب آمد واجل بر سر		واں مسیحا بہ کار دگرانست
نیم جاں کرد ورفت باز ندید		باز زاں شوخ چشمِ درمانست
ہم نفس! در عدم چہ دولت بود		کشتۂ ناز بازشا دانست
گر رمیدی زختہ ات چہ عجب		بوئے گل ہم ز گل گریز انست
شکوۂ رنجش چرا اے دل		رفتن از تن چو کارِ ہر جانست
مرض عشق ویار دور ودراز		نہ مسیحا نہ آب حیوانست
کشتۂ ناز را شکایت نیست		آں پریوش چرا پشیمانست
قاسم از کوچہ اش چہ کار ترا		مسکن وحشیاں بیا بانست

کلام عربی

(۱)

من لم يسخر بالبكاء حبيبهٔ		لالتفات فقد أضاع نحيبهٔ
يا نفس مالكِ تجزعين تجملي		ذا کان منه نصيبنا ونصيبهٔ
دع عنک ويلک ذکره وحديثهٔ		واترک رجاک بعيده وقريبهٔ
فرجاک مقطوع وشوقک ضائع		والصبر ان صابرت ليس مصيبهٔ
ان جاء جاء مجهزًا لذهابه		کالبدر يطلع يستميل مغيبهٔ
بأبي وأُمي لا تزور لنا فهل		أبقيت شيئا تشتهي تخريبهٔ

فــالـمـوت مـن شوق الوصــال أخف من		عيـــــشٍ بـــالآم الــفــراق عــقيبـــهٔ

(۲)

أغـرت عـلـى عيشـي فـلـو عدت عـاديـا		ذهبـت بـمـا غـادرتـه مـنـه بـاديـا
ذهبــت بـعـقـلـي واصـطـبـاري وراحتـي		وقـلـبـي فـلـو آثـرتـنـي بـفـواديـا
تـقـول تـذكـرنـي اذا سـرت فـارغـا		عـن الـغيـر تـكـنـي بـانتهـا وواديـا
فهـل أنسيـن اليـوم مـن كـان وجهـه		بـعيـنـي أحـلـىٰ قبـل ذا مـن رقـاديـا
أ أشـغـل بـالأحبـاب مـنـک وأنـت في		فـوادي سـويـدائـي وعيـنـي سـواديـا
نـعـم قـد شـغـلـتـم بـالأحبة دونـنـا		ومـن قـد غـدا فـي ودكـم لـي معـاديـا
اذا شـئـت ان أنسـاک لا أسـتـطيـعـه		و أنـسـى كثيـرا مبـديـا ومعـاديـا

(۳)

يـا مـن بـقـلبـي لـه ذكـر فـأنسـانـي		روحـي وشـوقـي اليـه منـذ أزمـان
رمـانـي الـدهـر مـن داري وأقـصـانـي		والـلـه قـربـنـي مـنـكـم وأدنـانـي
دنـوت مـنـكـم ولـكـن مـا دنـوت متـى		مـا لـم تـحـل بـعينـي بيـن أجـفـانـي
حـلـلـت منهـا فـمـا لـي لا أراک بهـا		لـم تـات أم بـرق نـور مـنـک أعـمـانـي

(۴)

جـاء الـكـتـاب ومـا الـكتـاب صحيفةٌ		عـربية مـن فـاضـلٍ متبـحـر
متـكـلـم متـفـطـن ومـحـدث		متـفـقـه ومـفـسـر متـدبـر
حـاوي الـعـلـوم أصـولهـا وفـروعهـا		مـعـقـولهـا مـنـقـولهـا ومـنـاظـر
يـجـلـو بـصـائـر نـاظـريـه جـميعهـم		ويـزيـد نـورا فـوقـه فـي نـاظـري
سـكـن الـفـواد وكـان قبـل حـلـولـه		يـرجـو ميـامـنـكـم ويخشـى طـائـري

(۱) (ماخوذ از): ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ/جنوری ۱۹۵۲ء/ص: ۲۳ تا ۳۰۔

اہل بدعت کا حضرت نانوتویؒ کی شاعری پر اعتراض اور اس کا جواب

مولانا سید طاہر حسین گیاوی

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نعتیہ کلام کے ایک شعر:

جو چھو بھی دیوے سگ کوچہ تیرا اس کی نعش
تو پھر تو خلد میں ابلیس کا بنائیں مزار

> اس پر اہل بدعت نے بہت اعتراضات کیے ہیں۔ یہاں تک کہ اس شعر کی وجہ سے حضرتؒ پر کفر تک کا فتویٰ لگاتے ہیں۔ مندرجہ بالا شعر پر اعتراض کا جواب مولانا سید طاہر حسین گیاوی صاحب نے اپنی کتاب ''بریلویت کا شیش محل'' میں دیا ہے۔ افاداتِ عامہ کے لیے وہ جواب یہاں معمولی رد و بدل کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے اوّلین مخاطب بریلوی۔مکتبِ فکر کے افراد ہیں۔ (نعمان)

ابلیس کا بہ حکم قرآن جنت میں نہ جانا مسلّم ہے؛ لیکن شعر میں لفظ ''جو'' کلمۂ شرط ہے، اور وہ بہ طور فرض محال ہے؛ اس لیے معنی غلط اور کفر کے نہیں ہوں گے۔

بریلوی حضرات کی خدمت میں عرض کروں گا کہ کلمہ ''جو'' اردو زبان میں شرط کے معنی میں صرف مولانا نانوتویؒ ہی کے شعر میں استعمال نہیں ہوا ہے؛ بلکہ مولوی احمد رضا خان صاحب بھی اس کلمے کو ''اگر'' اور ''فرضی شرط'' کے معنی میں لینے اور استعمال کرنے کو درست سمجھتے ہیں۔

خان صاحب نے اپنے ایک بزرگ عالم کی شاعری پر فتویٰ لگایا:

چناں چہ خان صاحب بریلوی نے بھی اپنے ایک مسلّم بزرگ اور نامور عالم دین کے شعر پر شرعاً ناروا اور بے جا ہونے کا حکم نافذ کرنے کے بعد پھر اس کی تاویل بھی خود ہی کر ڈالی ہے۔ مولانا نانوتویؒ اور مفتیانِ دیوبند کے معاملے کو آپ ہمارے کہنے سے نہیں؛ بلکہ اپنے امام اکبر اور بانیٔ فرقہ مولوی احمد رضا خان

صاحب کے حکم کی روشنی میں قیاس فرمالیجیے۔میری ان باتوں کا اگر حوالہ درکار ہو،تو وہ بھی پیش کیے دیتا ہوں؛ کیوں کہ آپ لوگوں کی طرح بے پر کی اڑانے کی عادت سے اللہ نے ہماری جماعت کو محفوظ رکھا ہے۔
''ملفوظات اعلیٰ حضرت'' کے معتمد و مستند مرتب،صاحبزادۂ اعلیٰ حضرت مولوی مصطفیٰ رضا خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:

ایک صاحب شاہ نیاز احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عرس میں بریلی تشریف لائے تھے۔اعلیٰ حضرت مدظلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ اشعار نعت شریف سنانے کی درخواست کی۔ استفسار فرمایا کہ:کس کا کلام ہے؟ انہوں نے بتایا۔اس پر ارشاد فرمایا:سوائے دو کے کسی کا کلام میں قصداً نہیں سنتا۔مولانا کافی اور حسن میاں کا کلام اول سے آخر تک شریعت کے دائرے میں ہے؛ البتہ مولانا کافی کے یہاں لفظ رعنا کا اطلاق جا بہ جا ہے اور یہ شرعاً محض ناروا اور بے جا ہے۔مولانا کو اس پر اطلاع نہ ہوئی؛ ورنہ ضرور احتراز فرماتے۔

حسن میاں مرحوم کے یہاں بہ فضلہٖ تعالیٰ یہ بھی نہیں۔ان کو میں نے نعت گوئی کے اصول بتا دیے تھے۔ان کی طبیعت میں ان کا ایسا رنگ رچا کہ کلام ہمیشہ اسی معیار اعتدال پر صادر ہوتا۔ جہاں شبہے میں ہوتے تھے،مجھ سے دریافت کر لیتے۔ایک غزل میں یہ شعر خیال میں آیا:ـ

خدا کرنا ہوتا جو تحت مشیت
خدا ہو کے آتا یہ بندہ خدا کا

میں نے کہا ٹھیک ہے۔یہ شرطیہ جس کے لیے مقدم اور تالی کا امکان ضرور نہیں۔اللہ عزوجل فرماتا ہے:

'اے محبوب!تم فرمادو کہ:اگر رحمٰن کے لیے کوئی بچہ ہوتا،تو اسے سب سے پہلے میں پوجتا'۔ ہاں شرط جزا میں علاقہ چاہیے،وہ آیت کریمہ کی طرح یہاں بھی بروجہ حسن حاصل ہے''[1]۔

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

مولانا نانوتویؒ کا شعر اعلیٰ حضرت کے فتوے سے درست اور صحیح ثابت ہوا،اور اسی طرح دونوں باتوں کے بالکل درست ہونے کی توجیہ وتاویل بھی اعلیٰ حضرت کے ہی فتوے میں مل گئی:ـ

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

(۱)الملفوظ،ج:۲،ص:۱۴۳۔

ابلیس کے جنت میں جانے کا امکان عقلی ہے:

مولانا حسن میاں اور مولانا نانوتویؒ کے شعر میں ایک بہت واضح فرق بھی ہے؛ لیکن اس کو سمجھنے کے لیے بریلوی حضرات کو اپنی نگاہ سے تعصب اور غفلت کا پردہ ہٹانا ہوگا۔ کسی مخلوق کا خدا ہونا یا بنایا جانا عقلاً اور شرعاً دونوں محال ہیں؛ مگر ابلیس کا جنت میں جانا شریعت کے محکم فیصلے کی روشنی میں اگرچہ محال ہے؛ لیکن عقلاً ممکن ہے۔ اسی لیے حدیث میں وارد ہے کہ اگر ابلیس ایک شرط پوری کرے، تو جنت میں جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس حدیث کا سندی مقام جو بھی ہو، بریلوی حضرات کے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہیں؛ اس لیے کہ وہ ان کی نہایت معتبر اور قابل قدر تفسیر ''روح البیان'' میں ہے، اور ان کے مطلب کی بھی ہے:

''وفي الخبر قيل له: من قبل الحق اسجد لقبر آدم أقبل توبتک وأغفر معصيتک، فقال: ما سجدت لقالبه وجسده فكيف أسجد لقبره وميته، وفي الخبر ان الله تعالىٰ يخرجه على رأس مأة ألف سنة من النار ويخرج آدم من الجنة ويأمره لسجود آدم فيأبى، ثم رد الى النار''[1]۔

''حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابلیس کو حکم ہوا: آدم کی قبر کو سجدہ کر لے، تیری توبہ قبول اور تیرا گناہ معاف کر دوں گا۔ اس نے کہا: میں نے آدم کے جسمے اور زندہ جسم کو سجدہ نہ کیا، تو اس کی قبر اور مردہ جسم کو کیسے سجدہ کر سکتا ہوں؟ اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ابلیس کو ہر لاکھ سال کے بعد دوزخ سے نکالتے ہیں اور آدم کو جنت سے نکالتے ہیں، پھر اس کو آدم کے سجدہ کرنے کا حکم دیتے ہیں؛ مگر رد کر دیتا ہے، اور پھر جہنم رسید کر دیا جاتا ہے''۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے بھی ابن ابی الدنیا سے ایک لمبی روایت کے تحت جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ابلیس کا قصہ نقل فرمایا ہے، لکھتے ہیں:

''از جناب الٰہی فرمان رسید کہ حق تعالیٰ توبہ او را قبول کرد، تو او را بہ گو کہ بہ سوئے قبر حضرت آدم سجدہ نماید، تا عفو تقصیر کم او را حضرت موسیٰ ایں ماجرا را بہ ابلیس گفتند، ابلیس گفت کہ: من زندہ او را سجدہ نہ کردم، مردہ را چرا سجدہ کنم''[2]۔

ترجمہ از فارسی: ''اللہ کی بارگاہ سے حضرت موسیٰ کو حکم ہوا، اس کی توبہ آپ کی سفارش سے قبول کر لی جائے گی۔ آپ اس سے کہیے کہ: حضرت آدم کی قبر کو سجدہ کر لے، تاکہ اس کے گناہ

(۱) حاشیہ جلالین، ص: ۸۰، بہ حوالہ روح البیان۔
(۲) تفسیر فتح العزیز، ص: ۲-۱۲۱۔

معاف کردوں۔ حضرت موسیٰ نے یہ قصہ ابلیس سے کہا، ابلیس نے جواب دیا: میں نے جس کو زندہ میں سجدہ نہ کیا، اس کے مرنے کے بعد اس کو سجدہ کیسے کروں گا''؟

ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد قارئین خود سمجھ سکتے ہیں کہ مولانا نانوتویؒ پر کوئی مواخذہ درست نہ ہوگا؛ البتہ مولانا حسن میاں صاحب جو اعلیٰ حضرت کے اپنے بھائی ہوتے ہیں، ان پر بریلوی مفتیوں کے فتوے کی روشنی میں کیا حکم شرعی نافذ ہوگا؟ یہ قابل غور مسئلہ بن جاتا ہے۔

مولانا کافی کے شعر میں کثرت سے ''رعنا'' کا استعمال، جو بہ قول خان صاحب بریلوی از روئے شرع ناجائز، ناروا اور بے جا ہے۔ اس کے باوجود مولانا کافی معذور سمجھے گئے ہیں، اور ان پر رضا خانی علما نے اس ناجائز عمل کی وجہ سے کافر یا فاسق ہونے کا کوئی فتویٰ نہیں لگایا ہے؛ بلکہ اس کے لیے خان صاحب نے ایک عذر تحریر فرما دیا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ مولانا نانوتویؒ کے مذکور الصدر شعر پر بریلوی حضرات وہی عذر ہوتے ہوئے فتوائے کفر اور تفسیق و تضلیل سے کم پر راضی ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں؟ بریلوی مفتیوں ہی کے لیے کسی شاعر نے کہا ہے:

دو رنگی چھوڑ دے، یک رنگ ہو جا
سرا سر موم ہو، یا سنگ ہو جا[1]

(۱) (ماخوذ از): بریلویت کا شیش محل، ص ۴۸ تا ۵۶

عقائد اور ردِ فرق باطلہ

تبرک حجۃ الاسلام

مخالفانِ قاسم (نانوتوی رحمہ اللہ) کو قلمِ قاسم سے جواب

محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ

''تحذیر الناس'' پر اعتراضات کی بارش کے بعد حضرت نانوتویؒ نے ذیل کا مکتوب منشی ممتاز علی میرٹھیؒ کو لکھا تھا۔ یہ حضرت مولانا نسیم احمد فریدیؒ کی عنایت سے ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند (ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ/ اگست ۱۹۵۴ء) میں چھپ گیا تھا۔ اس مکتوب کو حضرتؒ نے کس اعتماد سے تحریر فرمایا ہے؟ آپ بھی پڑھیے اور ایمان تازہ کیجیے۔ (نعمان)

حضرت نانوتویؒ کا مکتوب بہ نام منشی محمد ممتاز علی میرٹھی مرحوم:

سراپا عنایات وکرم منشی محمد ممتاز علی صاحب سلمکم اللہ

محمد قاسم کا سلام قبول فرمایئے، اور پھر سنیئے کہ! آپ کا نامہ مورخہ ۴/ رجمادی الثانیہ دیوبند ہو کر نانوتہ آیا نہ تھا کہ میں بہ تقاضائے چند در چند انبیٹھہ چلا گیا۔ کل سولہویں دن وطن آیا، تو آپ کا عنایت نامہ ملا، آج تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔

تین جواباتِ استفسارات ڈاک میں بھیجتا ہوں اور ایک ورق اور جس پر ہندسہ مرقوم نہیں اور شروع میں موٹے قلم سے لفظ ''تنبیہ'' لکھا ہوا ہے، ساتھ ملفوف ہے۔ اس ورق کو علاحدہ نکال کر منشی عبدالرزاق صاحب کے سپرد کر دینا، شاید کسی وقت کام آئے اور کسی نیم ملا کے اعتراض کا جواب ہو جائے، اور باقی اجزائے جوابات کو مولانا محمد علی صاحب کے حوالے کر دینا، اور یہ عرض کر دینا کہ بعدِ مطالعہ ان اوراق پر بہ

شرط پسند مہر کر کے واپس فرمایئے، میرے پاس اس کا مثنیٰ (نقل) نہیں۔ اگر مثنیٰ ہوتا، تو کچھ ضرورت نہ تھی، اور اگر پسند نہ آئے، تب بھی اس اصل کا لوٹا دینا ضرور ہے۔ اگر کسی صاحب کو خیالِ جواب الجواب ہو، تو نقل کر لینے کا اختیار ہے۔ میں نے دو روز میں تمہید اور چھتیس جواب لکھے ہیں، اور صاحب چار روز میں نقل کر لیں، حد نہایت ہفتے میں نقل کر کے واپس فرمائیں؛ مگر مولانا کی انصاف پرستی سے مجھ کو امید تسلیم ہے اندیشۂ تعصب نہیں۔ اگر اس پر بھی مولانا محمد علی صاحب کا وہی اصرار رہا تو یوں کہو قیامت آ گئی۔ جب ایسے بھولے بھالے بے شر عالم بھی شاگردوں کے کہنے سننے سے ایسی چال چلنے لگے تو ہم کو کون رو کنے والا ہے؟

منشی صاحب! اگر نفسانیت عند اللہ مذموم نہ ہوتی اور بحث مباحثے کا انجام خراب نظر نہ آتا، اور نزاعِ اہلِ اسلام خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار نہ ہوتا، تو آپ بھی ایک تماشہ دیکھ لیتے، ان شاء اللہ! مخالفانِ احقر کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔ سب کے نشے ان شاء اللہ! ڈھیلے ہو جاتے۔ مدعیانِ روزگار اپنے کیے کو پہنچ جاتے۔ پر کیا کروں "اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ" اس گرفتارِ ہوئی وہوس کے ذمے خدا کی طرف سے بھی در بارۂ مناظرہ سیکڑوں قید و قیود لگی ہوئی ہیں۔ وہاں کی باز پرس کا کھٹکا ایسے کام کرنے نہیں دیتا؛ ورنہ اس نفس کافر کیش کو کیا کیا کچھ لہریں نہیں آتیں؛ مگر لاچار ہو کر اس شعر کو پڑھ کر اپنے آپ کو سمجھا لیتا ہوں: ؎

جنگ ہفتاد ودو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

اور اسی لیے تحریرِ جواب سے گھبراتا رہا، اور لکھ لیا تو ارسال میں اتنا توقف کیا اور سو طرح کے حیلے و حجت نکالتا رہا؛ مگر جب دیکھا سب اہلِ مشورہ اسی طرف ہیں، اِدھر آپ کا عنایت نامہ بھی بہ طلبِ جواباتِ معلومہ پہنچا، ناچار ہو کر روانہ کرتا ہوں، پر "شورِ مکروہ" سے ڈرتا ہوں؛ اس لیے پھر بھی یہی آرزو ہے کہ جانے دیجیے، مخالفوں کے راہ پر آنے کی امید نہیں، جو موافق ہیں، ان سے اندیشۂ برگشتگی نہیں، اور اگر کوئی برگشتہ بخت پھر بھی گیا، تو معتقدوں کا بندہ شائق نہیں۔ تسپر جوابِ اعتراض؟ جواب ہوتا ہے، آدابِ نیاز نہیں ہوتا۔

ناظرانِ اوراق کو میری "تیز قلمیاں" جو باوجود عزمِ ادب بہ مقابلۂ تعریضاتِ مخالفاں بے اختیارانہ سرزد ہو گئی ہیں، ناگوار ہوں گی اور اس وجہ سے کیا کیا کچھ برا بھلا نہ کہیں گے؟ مگر خدا تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ میں کس کو کہتا ہوں، اور مولوی محمد علی صاحب کو کیسا سمجھتا ہوں۔

میں اول ہی خط میں لکھ چکا ہوں کہ یہ استفسارات مولوی محمد علی صاحب کی طرف سے معلوم نہیں ہوتے، کسی طالب علم کا ہذیان ہے، مولوی محمد علی صاحب کے نام لگا دیے ہیں، اور مولوی محمد علی صاحب نے

بہ وجہ تسلیم طبع زاد اس کے نشیب وفراز پر غور ولحاظ نہیں فرمایا؛ بلکہ اوروں کے اعتماد پر آپ ''بررو'' ہو بیٹھے ہیں؛ ورنہ ان کی وہ سلامت روی اور کم گوئی اور ان کی وہ یک سوئی اور ''معصوم وشی'' جو سراسر ایسی باتوں کی مخالف ہے، ان سے ایسی حرکت اور وہ بھی میرے مقابلے میں ہرگز کرنے نہ دیتی۔

اس لیے ان جوابوں کے پیش کرنے میں اوّل تو ان سے شرماتا ہوں، اور ''آخر کار'' سے خائف ہوں، مبادا ''ملا زمانِ شب وروز'' اس قصے کو دور پہنچائیں اور مولانا کو آمادۂ جواب کریں، اور اِدھر بھی نفس بدکیش ''لپٹیوں'' پر آجائے اور وہ محبت اور ملاقات سب خاک میں رل جائے، اور میں سنتا ہوں کہ کہیں کہیں اور بھی ''استفسارات مولانا'' کا فکر ہے، سو کہیں اور سے اگر کوئی جواب آگیا ہو، یا آج کل میں آجائے، تو پھر کا ہے کو ان جوابوں کو پیش کیجیے؟ بلکہ ''بہ نظر مصلحت ہائے دیگر'' پھر تو پیش نہ کرنا ہی مناسب ہے۔ اگر پیش ہی کرنا ہوگا، تو جب پیش کریں گے، جب کہ ''مخالفانِ احقر'' اوروں کے جواب کے جواب سے فارغ ہولیں گے۔ تس پر بھی اگر آپ کی یہی رائے ہو کہ ''جوابات مرسلہ'' پیش ہی کرنے چاہئیں، تو بعدِ استخارہ اختیار ہے۔

خاص آپ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ مولوی محمد علی صاحب کے یہاں سے اس تحریر کا واپس آنا معلوم، جس طرح ہو سکے، اس کی نقل کرا کر ان کی خدمت میں بھیجیے گا۔

منشی عبدالرزاق بیگ صاحب کی خدمت میں بعد سلام ضرور یہ کہہ دینا کہ آپ بھی مضمون واحد تصور فرمائیں۔ مولانا محمد علی صاحب کی خدمت میں بعد سلام ونیاز میری طرف سے یہ عرض کر دینا کہ: اب آپ کو انصاف فرمانا ضرور ہے۔ میں نہیں کہتا کہ آپ میری رو رعایت کریں، اور کہوں ہی تو کیا ہوتا ہے۔ اگر میری رعایت ہوتی، تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟ پر حق کی طرف داری کے لیے خدا کی طرف سے جس قدر تاکیدیں ہیں، سب آپ کو معلوم ہیں، اور اس باب میں جس قدر وعدہ وعید ہیں، آپ خوب جانتے ہیں۔ خدا کو یاد کر کے ''محاکمہ'' فرمایئے گا۔ زیادہ کیا عرض کروں؟ والسلام فقط

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ علیہ الرحمہ
اور
ختم نبوت

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز

حضرت نانوتویؒ پر بریلوی حضرات ایک الزام یہ گھڑتے ہیں کہ: ختم نبوت کے منکر ہیں (العیاذ باللہ)۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے نقشِ حیات میں بڑی صفائی کے ساتھ تحریر فرمایا کہ: مولانا احمد رضا خان صاحب نے ''تحذیر الناس'' کی عبارات الگ الگ صفحات سے لے کر ایک بنادی اور اس پر کفر کا فتوی جڑ دیا۔ یہ ان کی عادتِ جاہلیہ تھی۔ زیر نظر تحریر ایک مکتوب کی صورت میں ہے، جو یہاں شامل اشاعت ہے۔ اس میں ''جہالت بریلویہ'' کا رد کیا گیا ہے۔ (نعمان)

بانئ دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی طرف جو مضمون انکار ختم نبوت زمانی کا نسبت کیا گیا ہے، بالکل جھوٹ اور افترا ہے۔ حضرت مولانا مرحوم تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تین قسم کی خاتمیت ثابت کرتے ہیں: ''خاتمیت ذاتی'' (مرتبی)، ''خاتمیت مکانی'' اور ''خاتمیت زمانی'' کو قطعی ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: جو اس کا منکر ہے، وہ کافر ہے، دایرۂ اسلام سے خارج ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ نبوت تمام انبیا سے آخر میں واقع ہوا ہے۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ جو شخص اس کو نہ مانے اور انکار کرے، وہ مسلمان نہیں ہے۔ حضرت مولانا مرحوم (تحذیر الناس کے) صفحہ ۸ر سے ''خاتمیت زمانی'' کے عقلی دلائل شروع فرما کر صفحہ ۱۰ر میں بہ طور نتیجہ ارشاد فرماتے ہیں۔ تحذیر الناس صفحہ ۱۰ر میں مندرجۂ ذیل عبارت ہے:

''سو اگر استغراق اور عموم ہے، (یعنی لفظ خاتم النبیین مذکورہ آیت میں) تب تو ثبوت خاتمیت زمانی ظاہر ہے؛ ورنہ لزوم خاتمیت زمانی بہ دلالت التزام ضرور ثابت ہے۔ اِدھر تصریحات نبوی مثل ''أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى؛ إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ'' أو كما قال عليه السلام، جو بہ ظاہر بہ طرز مذکور اسی خاتم النبیین سے ماخوذ ہے، اس بات میں کافی رہا؛ کیوں کہ یہ مضمون درجۂ تواتر کو پہنچ گیا ہے۔ پھر اس پر اجماع بھی منعقد ہو گیا، گو الفاظ مذکور بہ سند متواتر منقول نہ ہوں، اور یہ عدم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی یہاں ایسا ہی ہوگا، جیسا تواتر اعداد رکعت فرائض و وتر وغیرہ، باوجود یہ کہ الفاظ احادیث مشعر تعداد رکعت متواتر نہیں، جیسا اس کا منکر کافر ہے، ایسا ہی اس کا منکر بھی کافر ہوگا''(۱)۔

صفحہ ۲۱ میں فرماتے ہیں:

''ہر حادث زمانی کے لیے ایک عمر کہ جس کی وجہ سے محققان صوفیۂ کرام ہر حادث میں قائل تجدد امثال ہوئے ہیں؛ کیوں کہ زمانہ ایک حرکت ہے؛ چناں چہ اس کا متجدد غیر قار الذات ہونا بھی اس کا مؤید ہے، اس صورت میں مسافات متعددہ اور حرکات متعددہ من جملہ حرکات سلسلۂ نبوت بھی تھی، سو بہ وجہ حصول مقصود اعظم ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم مبدل بہ سکون ہوئی، اور حرکتیں ابھی باقی ہیں، اور زمانۂ آخر میں آپ کے ظہور کی ایک یہ بھی وجہ ہے''۔

مندرجۂ بالا عبارت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ جب کہ حرکت سلسلۂ نبوت ختم ہو کر مبدل بہ سکون ہوگئی، تو پھر کوئی نبی کیوں کر آ سکتا ہے؟ حضرت مولاناؒ کی تحریرات میں متعدد مقامات پر آپ کی خاتمیت زمانی کا زور وشور سے اقرار کیا گیا اور آپ کے بعد کسی نبی کے آنے کے امکان کا سختی سے انکار موجود ہے۔ دیکھو: ''مناظرۂ عجیبہ'' اور ''ہدیۃ الشیعہ'' وغیرہ۔ رسالہ ''تحذیر الناس'' میں عقلی ونقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ تمام انبیا سے اونچا اور آخری ہے۔ آپ سے اوپر کسی نبی کا مرتبہ نہیں اور آپ کا زمانہ سب سے آخر ہے، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں، اور اسی طرح آپ کا مکان اور وہ زمین جس میں آپ مبعوث ہوئے۔

احادیث صحیحہ قویہ دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور آخر زمانے میں اتریں گے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے متبع ہو کر قیام فرمائیں گے۔

---

(۱) تحذیر الناس، ص: ۱۰ر، (مطبوعہ قاسمی پریس)۔
(۲) مکتوبات شیخ الاسلامؒ، ج: ۲، مکتوب نمبر: ۱۲۱۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ پر اہل بدعت کی تہمتیں اور ان کا جواب

محقق اہل سنت حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود مدظلہ ✿

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی پیدا نہ ہوگا۔ یہ بات ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی نہیں جانا، وہ مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں؛ کیوں کہ آپ کے خاتم الانبیاء ہونے پر ایمان رکھنا ضروریاتِ دین میں سے ہے۔

علمائے راسخین نہ صرف مسائل جانتے ہیں؛ بلکہ ان کے اصول وعلل اور اسباب بھی پہچانتے ہیں۔ حکیم کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ہوتی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کی بنیاد اور حکمت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہنوز اسلام کے عالموں کے ذمے تھا۔ عوام صرف اتنا جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تمام انبیا کے بعد ہے، اور آپ سب سے آخری نبی ہیں، اور بس! اس کی وجہ کہ آپ کو سب سے آخر میں کیوں بھیجا گیا؟ اس میں کیا حکمت تھی؟ یہ بات محتاج تفصیل تھی۔

جن علمائے کرام نے شریعت کے اسرار وحکم کھول کھول کر بیان فرمائے، ان میں امام غزالیؒ، حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا نام سرفہرست ہے۔ حضرت مولانا نانوتویؒ نے آپ کی ختم نبوت کی بنیاد اور حکمت سے بحث کی ہے، اور حق یہ ہے کہ آپ نے اس انتہائی لائقِ احترام موضوع کا حق کر دیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے اسرار ووجوہ:

آیئے! پہلے اس پر غور کریں کہ حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین کہنے کی کیا وجہ ہوسکتی تھی؟ آیئے! ان اسرار و وجوہ کو معلوم کریں کہ کس وجہ سے آپ کو آخری نبی بنایا گیا اور اس کی کیا کیا وجوہ ہوسکتی ہیں؟

✿ صاحب ''مطالعۂ بریلویت'')

۱-چوں کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب (یعنی قرآن مجید) کی ابدی حفاظت کا وعدہ تھا؛ اس لیے آئندہ کسی نئے نبی کی ضرورت نہ تھی۔ نبوت کا دروازہ اب اس لیے بند کر دیا کہ اب اس کی ضرورت نہ رہی تھی۔

۲-اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ آپ کے بعد کوئی نیا نبی مبعوث نہ ہو۔ آخر یہ سلسلہ کہیں ختم بھی تو کرنا تھا؛ اس لیے آپ کو آخری نبی کہا۔ اعلان کی وجہ یہ تھی کہ ان مدعیانِ نبوت کا دروازہ بند کر دیا جائے، جو آپ کے بعد جھوٹے دعوے کر کے خلائق کو گم راہ کریں گے۔

۳-آپ کا دین ہر لحاظ سے کامل اور مکمل تھا؛ اس لیے آپ کے بعد کسی اور پیغمبر کی ضرورت نہ ہو سکتی تھی۔ جب ضرورت ہی باقی نہ رہی، تو آپ کو آخری نبی بنا دیا گیا۔

۴-علم الٰہی میں مقدر تھا کہ آپ کی تیار کردہ جماعتِ صحابۂ کرامؓ اس دین کے آخر تک وفادار رہیں گے، اور علمائے امت کا ایک طبقہ آخر دنیا تک حق پر قائم رہے گا؛ اس لیے بعد نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا؛ کیوں کہ نبوت کا کام ورثۃ الانبیاء کے ذریعے تا قیامت قائم رہ سکتا ہے۔

یہ وجوہ بے شک برحق ہیں؛ لیکن علت العلل نہیں۔ بنیادی وجہ ایسی ہونی چاہیے، جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی شان کا بیان ہو۔ جب ختم نبوت کا تاج آپ کے سر مبارک پر رکھا گیا، تو آپ کی شان اور مقام (ختم نبوت میں) لازمی طور پر ملحوظ ومرعی ہونا چاہیے۔ یہ چار وجوہ جو ذکر کی گئی ہیں، ان میں سے پہلی وجہ میں قرآن کریم کی شان کا بیان ہے، دوسری میں امت کے فتنوں سے حفاظت ہے، تیسری میں دین کی شان ملحوظ ہے، اور چوتھی میں اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور علمائے امتؒ کی وفاداری مذکور ہے؛ لیکن ان کمالات کا دائرہ جس مرکز کے گرد کھنچ رہا ہے، اس کی اپنی شان کہیں ان میں مذکور نہیں، حال آں کہ اصل بات جو علت العلل ہو، وہ ہونی چاہیے، وہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی شان ہو، اور اس پہلو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا بیان ہو۔

یہ وجوہ اپنی جگہ درست ہیں؛ لیکن یہ آپ کی شان خاتمیت کے آثار ہیں، ان کے پیچھے علت العلل وہ درکار ہے، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے متعلق ہو۔

شانِ خاتمیت کی علت العلل:

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اس علت العلل کی طرف راہ نمائی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ علت العلل آپ کے الفاظ میں یہ ہے:

''بالجملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصف نبوت میں موصوف بالذات ہیں، اور سوائے آپ

کے اور انبیا موصوف بالعرض''۔

حضرت مولاناؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ باقی سب انبیا کی نبوت آپ کی نبوت کا فیض اور اثر ہے، جیسے آفتاب سے چاندکو روشنی ملتی ہے، اسی طرح پر ہر پیغمبر نے اس آفتابِ نبوت (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) سے روشنی پائی۔ آپ صرف اس امت کے نبی نہیں، آفتاب نبوت کی حیثیت سے نبی الانبیاء بھی ہیں، اور باقی سب انبیا اپنی امتوں سمیت آپ کی مرکزی سیادت کے ماتحت ہیں، جس طرح موصوف بالذات پر موصوف بالعرض کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے، آپ کی تشریف آوری پر اس سلسلے کا ختم ضرور تھا؛ اس لیے آپ نبیوں کے ختم پر تشریف لائے۔

بنائے خاتمیت بس یہی ہے، اس کے آثار ونتائج میں سے تھا کہ آپ کو سب سے آخر میں رکھتے، یہ ''ختم نبوت زمانی'' اس بنائے خاتمیت کو لازم تھی۔

ہاں! آپ کی خاتمیت کی جو نسبت انبیائے سابقین کے ساتھ تھی، وہ خاتمیت مرتبی ہے، جس میں موصوف بالعرض موصوف بالذات سے مستفیض ہوتا ہے، جیسے چاند سورج سے مستنیر (روشن) ہوتا ہے۔ اس ختم نبوت مرتبی کے ساتھ زمانے کی قید نہیں۔ آپ انبیائے سابقین کے بھی مرکز ہیں۔ آپ کی شانِ مرتبی کا یہ پہلو انبیائے سابقین سے ہی خاص نہیں؛ بلکہ اگر بالفرض آپ کے بعد بھی کوئی نبی ہوتا، تو بھی آپ کی اس معنی کی خاتمیت میں فرق نہ آتا۔ خاتمیت مرتبی بہر حال قائم رہتی۔

لیکن حکمتِ خداوندی اس بات کی متقاضی ہوئی کہ آپ کے تشریف لانے کے بعد اس بنائے خاتمیت کے ساتھ ختم نبوت زمانی بھی لازم کی جائے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ کا زمانہ آخری زمانہ ہو، اور آپ کے بعد کوئی نبی پیدا نہ ہو، اور یہی عقیدہ اسلام کا ہے کہ دونوں طرح کی ختم نبوت تسلیم کر لی جائے، آپ کے بعد بھی کوئی نبی نہ ہو، اور آپ کے برابر بھی کوئی نبی نہ ہوا ہو۔

لزوم ختم نبوت زمانی پر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تقریر:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ العزیز لکھتے ہیں:

''بالجملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصف نبوت میں موصوف بالذات اور سوائے آپ کے اور انبیا موصوف بالعرض۔ اس صورت میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اوّل یا اوسط میں رکھتے، تو انبیائے متاخرین کا دین اگر مخالف دین محمدی ہوتا، تو اعلیٰ کا ادنیٰ سے منسوخ ہونا لازم

آ تا، اور انبیائے متاخرین کا دین اگر مخالف نہ ہوتا، تو یہ بات ضرور ہے کہ انبیائے متاخرین پر وحی آتی اور افاضۂ علوم کیا جاتا؛ ورنہ نبوت کے پھر کیا معنی؟ سو اس صورت میں اگر وہی علوم محمدی ہوتے، تو بعد وعدۂ محکم ''اِنَّـا لَـهٗ لَحٰـافِظُوْنَ'' ان کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر علوم انبیائے متاخرین علوم محمدی کے علاوہ ہوتے، تو اس کتاب کا ''تِبْیَانًا لِکُلِّ شَیْءٍ'' ہونا غلط ہو جاتا۔ ایسے ہی ختمِ نبوت بہ معنی معروض کو تاخر زمانی لازم ہے''[۱]۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ہاں بنائے خاتمیت تو یہ ہے کہ آپ وصف نبوت سے موصوف بالذات ہیں؛ لیکن آپ فرماتے ہیں کہ: اس بنائے خاتمیت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالفعل تشریف لے آنے پر تاخر زمانی بھی لازم ہے۔ آپ ''تحذیر الناس'' میں ہی اس کی تصریح فرما چکے ہیں، اسی میں آپ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''خاتمیت بھی بہ وجہ احسن ثابت ہوتی ہے، اور خاتمیت زمانی بھی ہاتھ سے نہیں جاتی''[۲]۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ دونوں طرح کی ختم نبوت کے قائل تھے۔ جہاں حضرت مولاناؒ نے یہ کہا تھا کہ: عوام کے خیال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم ہونا بہ ایں معنی ہے کہ آپ سب سے آخری نبی ہیں، اس سے مراد اس عقیدے کی تردید نہ تھی۔ لفظ خاتم کو صرف اس معنی میں محدود کرنے کو آپ نے عوام کا خیال کہا تھا۔ آپ کے عقیدے میں بنائے خاتمیت کو تاخر زمانی (کہ آپ کا زمانہ آخری مانا جائے) بہر حال! لازم تھی، اور اس میں آئندہ آنے والے مدعیانِ نبوت کا بھی پورا سد باب تھا۔ مولانا مرحوم لکھتے ہیں:

''عوام کے خیال میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم ہونا بہ ایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیائے سابقین کے زمانے کے بعد ہے اور آپ سب میں آخری نبی ہیں؛ مگر اہل فہم پر روشن ہوگا کہ تقدیم یا تاخر زمانی میں بالذات کچھ فضیلت نہیں، پھر مقام مدح میں ''وَلٰـــکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰـهِ وَخَـاتَمَ النَّبِیّٖنَ'' فرمانا اس صورت میں کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟ بلکہ بنائے خاتمیت اور بات ہے، جس سے تاخر زمانی اور سد باب مذکور ہے[۳]، خود بہ خود لازم آ جاتا ہے اور فضیلت نبوی دوبالا ہو جاتی ہے''[۴]۔

---

(۱) تحذیر الناس۔ (۲) ایضاً۔

(۳) مولانا لکھتے ہیں: ''یہ احتمال کہ یہ آخری دین تھا؛ اس لیے سد باب مدعیانِ نبوت کیا، جو کل جھوٹے دعوے کر کے خلائق کو گم راہ کریں گے؛ البتہ فی حد ذاتہ قابل لحاظ ہے''۔ (تحذیر الناس، ص:۳)۔

(۴) ایضاً، ص: ۳،۴۔

یہاں اس عبارت کو دیکھیے اور بار بار دیکھیے۔ آپ عوام کے عقیدے کی تردید نہیں کر رہے ہیں، اسے صرف ایک معنی میں محدود کرنے کی اصلاح کر رہے ہیں، اور آپ جس بات کو بنائے خاتمیت قرار دیتے ہیں، اسے آپ کا سب سے آخری زمانے میں ہونا خود بہ خود لازم فرما رہے ہیں۔

ہاں خاتمیت مرتبی کا وہ پہلو، جس کے تحت انبیائے سابقین کو آپ کا فیض ملا، اور انہوں نے آپ سے اس طرح روشنی پائی، جس طرح چاند سورج سے روشنی پاتا ہے، انبیاء کے افراد خارجیہ (جو دنیا میں تشریف لائے) سے ہی خاص نہیں، ان کے افراد مقدرہ (جو صرف فرض کیے جائیں) بھی اس میں شامل ہیں کہ بالفرض آپ کے بعد کوئی نبی مقدر ہوتا، تو بھی آپ کی خاتمیت مرتبی بے شک قائم رہتی۔ وہ آپ کے ماتحت ہوتا، اس کے بالفعل آنے سے ختم نبوت زمانی قائم نہ رہتی، اور یہ خلاف عقیدۂ اسلام ہونا؛ کیوں کہ اسلام میں ختم نبوت زمانی پر ایمان لانا بھی ضروریات دین میں سے ہے؛ البتہ یہ ضرور ہے کہ ختم نبوت مرتبی کا پہلو بہرصورت قائم رہتا ہے، گو عقیدۂ ختم نبوت کے لیے صرف اتنی بات کافی نہ تھی۔

خاتمیت مرتبی کا بیان:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم ہونا اگر وصف نبوت سے موصوف بالذات ہونے کے معنی میں لیا جائے، تو بالفرض آپ کے زمانے میں بھی کوئی نبی ہوتا، تو اس کے باوجود آپ کی خاتمیت مرتبی قائم رہتی۔ مولاناؒ فرماتے ہیں:

> ''غرض اختتام اگر بہ ایں معنی تجویز کیا جائے، جو میں نے عرض کیا، تو آپ کا خاتم ہونا انبیائے گزشتہ ہی کی نسبت خاص نہ ہوگا؛ بلکہ اگر بالفرض آپ کے زمانے میں بھی کہیں نبی ہو، جب بھی آپ کا خاتم ہونا بہ دستور باقی رہتا ہے؛ مگر جیسے اطلاق خاتم النبیین اس بات کا مقتضی ہے کہ اس لفظ میں کچھ تاویل نہ کیجیے اور علی العموم تمام ابنیا کا خاتم کہیے، اسی طرح.... الخ''(۱)۔

یہ ساری بات اس شرط پر کہی جا رہی ہے: ''اگر بہ ایں معنی تجویز کیا جائے''۔ آگے اس کی جزا مذکور ہے۔ وہ معنی کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف نبوت سے موصوف بالذات ہونا۔ ظاہر ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے آپ کے زمانے میں بھی کہیں نبی ہو، تو آپ کا خاتم ہونا ختم نبوت مرتبی کے لحاظ سے بہ دستور قائم رہے گا۔

اس عبارت کو اس شرط (اگر بہ ایں معنی تجویز کیا جائے) سے کاٹ کر بیان کرنا اور خاتمیت سے

---

(۱) تحذیر الناس، ص:۱۱۔

ختم نبوت مرتبی مراد نہ لینا ایک بڑا جھوٹ اور ایک بڑا بہتان ہے، اور اس عبارت پر ایک بڑا ظلم ہے۔ گو اسلام کے مجموعی عقیدے کے لیے ختم نبوت مرتبی اور ختم نبوت زمانی دونوں کو ماننا ضروری ہے؛ لیکن یہاں تو صرف ختم نبوت مرتبی کا ذکر ہو رہا تھا، اسے ختم نبوت مرتبی سے ہٹا کر ختم نبوت زمانی پر لگا دینا ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟

> ''ہاں! اگر خاتمیت بہ معنی اتصاف ذاتی بہ وصف ثبوت لیجیے، جیسا اس ہیچ مداں (مولانا نانوتویؒ) نے عرض کیا ہے، تو پھر سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی کو افراد مقصودہ بالخلق میں سے مماثل نبوی نہیں کہہ سکتے؛ بلکہ اس صورت میں فقط انبیا کے افراد خارجی (جو عملاً دنیا میں تشریف لائے) ہی پر آپ کی افضلیت ثابت نہ ہوگی، افراد مقدرہ (جو صرف فرض کیے جائیں) پر بھی آپ کی افضلیت ثابت ہو جائے گی؛ بلکہ اگر بالفرض بعد زمانۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نبی پیدا ہو، تو پھر بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا''۔

یہاں بھی بات شرط کے ساتھ کہی جا رہی ہے کہ اگر خاتمیت بہ معنی اتصاف ذاتی کے لی جائے اور موضوع ختم نبوت مرتبی کا بیان ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی مقدر مانا جائے، تو اسے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آفتابِ نبوت سے مستنیر (روشن) ہونے والا مانا جائے گا، اور اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت مرتبی میں واقعی کچھ فرق نہ آئے گا۔

شرط کے بغیر جزا کو نقل کرنا خیانت ہے:

اس بات کو اس شرط سے کاٹ کر بیان کرنا اور خصوصاً آخری الفاظ ''خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا'' سے ختم نبوت مرتبی مراد نہ لینا اور اسے اس طرح بیان کرنا گویا یہ ختم نبوت زمانی کا بیان ہے، اس عبارت پر ظلم اور حضرت مولانا محمد قاسمؒ پر بہت بڑا بہتان ہے؛ کیوں کہ اسلام کے مجموعی عقیدے میں ختم نبوت مرتبی اور ختم نبوت زمانی دونوں کو ماننا ضروری تھا اور یہاں ختم نبوت مرتبی کی بحث ہے۔

مولانا احمد رضا خان کے ہاتھ کی صفائی:

مولانا احمد رضا خان نے (حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کی کتاب ''تحذیر الناس'' کے) صفحہ ۱۴ر کی عبارت سے شرط کو حذف کر کے جزا کا صرف دوسرا حصہ لے لیا، پھر اسی کے ساتھ صفحہ ۲۸ر کی مذکور عبارت میں سے شرط کو حذف کر کے اور جزا کے بھی پہلے اور دوسرے حصے کو چھوڑ کر صرف تیسرے حصے کو اس سے جوڑ دیا ہے، اور اس کے بعد اسی کتاب کے صفحہ ۳ر سے ایک عبارت اس کے اِضراب کو (جو صفحہ ۱۴ر پر: بلکہ سے

شروع ہو رہا ہے) چھوڑ کر اسی کے ساتھ جوڑ دی ہے۔ اسی طرح مولانا احمد رضا خان نے ''تحذیر الناس'' کے ص ۱۴ر، ۲۸ر، اور ۳ر کی عبارتیں جوڑ کر (ہر ہر عبارت کی شرطیں اور اضراب حذف کر کے) ایک مسلسل عبارت بنادی ہے۔

تین جگہوں سے عبارتیں لے کر ایک عبارت بنانا:

اس نئی مسلسل عبارت کو پڑھنے سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ مولانا محمد قاسم ختم نبوت زمانی کے منکر تھے، اور یہ عبارت ختم نبوت زمانی کے انکار کے لیے ہی آپ نے تحریر فرمائی ہے؛ حال آں کہ آپ نے اس کتاب میں جگہ جگہ ختم نبوت زمانی کا اثبات فرمایا ہے۔

تحذیر الناس میں ختم نبوت زمانی کا بیان:

حضرت مولانا محمد قاسمؒ اسی کتاب ''تحذیر الناس'' میں لکھتے ہیں:

> ''من جملہ حرکات حرکت سلسلۂ نبوت بھی تھی، سو بہ وجہ حصول مقصود اعظم ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم وہ حرکت مبدل بہ سکون ہوئی؛ البتہ اور حرکتیں ابھی باقی ہیں، اور زمانۂ آخر میں آپ کے ظہور کی ایک وجہ یہ بھی تھی''(۱)۔

ختم نبوت زمانی کا انکار کفر ہے:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کا عقیدہ اتنا اہم اور ضروری ہے کہ آپ نے اسی ''تحذیر الناس'' میں اس کے منکر کو کافر بتلایا ہے۔ کیا اب بھی شک رہ جاتا ہے کہ آپ ختم نبوت کے قائل نہ تھے؟ آپ فرماتے ہیں:

> ''سو اگر اطلاق اور عموم ہے، تب تو ثبوت خاتمیتِ زمانی ظاہر ہے؛ ورنہ تسلیم لزوم خاتمیت زمانی بہ دلالت التزامی ضرور ثابت ہے۔ اِدھر تصریحات نبویہ مثل ''أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی؛ اِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ''. أو كما قال عليه الصلاة والسلام''. بہ ظاہر بہ طرز مذکور اسی لفظ خاتم النبیین سے ماخوذ ہے، اس باب میں کافی؛ کیوں کہ یہ مضمون درجۂ تواتر کو پہنچ گیا ہے، پھر اس پر اجماع بھی منعقد ہو گیا ہے۔ گو الفاظ مذکور بہ سند متواتر منقول نہ ہوں۔ سو یہ عدم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی یہاں بھی ایسا ہی ہوگا، جیسا تواتر اعداد رکعات فرائض و وتر وغیرہ، باوجودے کہ الفاظ حدیث مشعر تعداد رکعات متواتر نہیں، جیسا کہ ان کا منکر کافر ہوگا، ایسا

(۱) تحذیر الناس، ص:۱۹۔

ہی اس کا منکر بھی کافر ہوگا۔ اب دیکھیے کہ اس صورت میں عطف بین الجملتین اور استدراک اور استثنائے مذکور بھی بہ غایت درجہ چسپاں نظر آتا ہے، اور خاتمیت بھی بہ وجہ احسن ثابت ہوتی ہے، اور خاتمیت زمانی بھی ہاتھ سے نہیں جاتی"(۱)۔

حضرت مولانا مرحوم ایک دوسری کتاب میں بھی اپنا یہی عقیدہ لکھتے ہیں:

"اپنا دین و ایمان ہے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں، جو اس میں تاویل کرے، اسے کافر سمجھتا ہوں"(۲)۔

حضرت مولانا مرحوم نے ایک اور جگہ تحریر فرمایا:

"اس لیے یہ ضرور ہے کہ وہ خاتم زمانی بھی ہو؛ کیوں کہ اوپر کے حاکم تک نوبت سبھی کے بعد آتی ہے، اور اس لیے اس کا حکم اخیر حکم ہے۔ چناں چہ ظاہر ہے کہ پارلیمنٹ تک مرافعہ کی نوبت سبھی کے بعد آتی ہے۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ کسی اور نبی نے دعوائے خاتمیت نہ کیا، کیا تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ چناں چہ قرآن وحدیث میں یہ مضمون بہ تصریح موجود ہے، سوائے آپ کے اور آپ سے پہلے اگر دعوائے خاتمیت کرتے، تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کرتے؛ مگر دعوائے خاتمیت تو درکنار، انہوں نے فرمایا کہ: میرے بعد جہاں کا سردار آنے والا ہے"(۳)۔

آپ دیکھیں کہ مولانا مرحوم کس طرح جگہ جگہ خاتمیت زمانی کا اقرار کررہے ہیں، اور ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھیں کہ مولانا احمد رضا خان کس ہوشیاری سے اور خوفِ خدا سے بالکل بے پرواہو کر مولانا مرحوم کی کتاب "تحذیر الناس" کے صفحہ ۱۴ر، ۲۸ر، اور ۳ر سے عبارتوں کے نامکمل ٹکڑے جوڑ رہے ہیں، اور انہیں جوڑ کر ایک مسلسل عبارت بنانے میں محنت کر رہے ہیں۔ مولانا احمد رضا خان یہاں اپنی من گھڑت بات مولانا محمد قاسمؒ کے ذمے لگانے اور اس پر علمائے حرمین سے کفر کا فتویٰ حاصل کرنے میں کتنی چابک دستی دکھا رہے ہیں۔ یہ بات ازخود واضح ہے۔ مولانا احمد رضا خان کے پھیلائے ہوئے تفریق کے کانٹوں سے امت کے پاؤں اب تک زخمی ہیں، اور مولوی احمد رضا خان نے ہاتھ کی صفائی سے جو عبارت ترتیب دی، وہ مولانا احمد رضا خان کی شرم ناک خیانت کی تاریک ترین مثال ہے۔

---

(۱) تحذیر الناس، ص:۹۔

(۲) جوابات محذورات، ص:۵۰۔

(۳) مباحثۂ شاہ جہان پور۔

مولانا احمد رضا خان نے حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے نام سے جو عبارت گھڑی اسے ہم یہاں ''حسام الحرمین'' سے نقل کرتے ہیں، اس عبارت کو بھی دیکھیے اور ''تحذیر الناس'' کے ان گہرے اور علمی مضامین پر بھی غور کیجیے، جنہیں ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ اصل کتاب ''تحذیر الناس'' کا مطالعہ کیجیے اور ظالموں اور خائنوں کے ظلم اور خیانت کی پھر جی کھول کر داد دیجیے۔

مولانا احمد رضا خان نے ''حسام الحرمین'' میں عبارت کو اس طرح بنا کر اسے حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے نام سے پیش کیا ہے، حال آں کہ یہ مسلسل عبارت مولانا محمد قاسمؒ کی قطعاً نہیں۔

حسام الحرمین میں درج شدہ عبارت:

''گو بالفرض آپ کے زمانے میں بھی کہیں اور کوئی نبی ہو، جب بھی آپ کا خاتم ہونا بہ دستور باقی رہتا ہے؛ بلکہ اگر بالفرض بعد زمانۂ نبوی بھی کوئی نبی پیدا ہو، تو بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا۔ عوام کے خیال میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ سب میں آخری نبی ہیں؛ مگر اہل فہم پر روشن کہ تقدم یا تاخر زمانہ میں بالذات کچھ فضیلت نہیں''(۱)۔

آخری فقرہ جو ''عوام کے خیال'' سے شروع ہوتا ہے، وہ تحذیر الناس کے صفحہ ۳/ پر تھا۔ شروع کا جملہ صفحہ ۱۴/ کا تھا۔ درمیانہ جملہ صفحہ ۲۸ پر تھا۔ مولانا احمد رضا خان نے انہیں اس حسن وترتیب سے جوڑا ہے کہ یہ مسلسل عبارت ''تحذیر الناس'' کی ان عبارات سے، جن میں خاتمیت زمانی کا صریح اقرار ہے، صریح طور پر ٹکراتی دکھائی دیتی ہے۔ اسے مولانا احمد رضا خان کے ہاتھ کی صفائی کہیے، یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خبر کی تصدیق کہ: اس امت میں وہ لوگ بھی ہوں گے، جو یہود کی راہوں پر چلیں گے:

''شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعاً بِذِرَاعٍ''. أو كما قال عليه الصلاة والسلام.

برطانوی فکر ونظر کو ایک طرف رکھیے، اس وقت صرف علمی حیثیت سے ذرا صورت حال کا جائزہ لیجیے۔ مولانا احمد رضا خان کی امانت ودیانت کو جانچنے کا یہ ایک بڑا موقع ہے۔ اس تفصیل میں حضرت مولانا نانوتویؒ کی ذات گرامی زیادہ ملحوظ نظر نہیں، زیادہ توجہ مولانا احمد رضا خان کی امانت ودیانت کو جانچنے پر ملحوظ ہے؛ کیوں کہ اس وقت وہی موضوعِ سخن ہیں۔

عربی عبارات میں لفظ بالذات کو نکال دیا:

آخری الفاظ میں سے لفظ بالذات پر غور کیجیے۔ اطلاقات بالذات اور بالعرض اہل علم پر مخفی نہیں۔

(۱) حسام الحرمین، ص: ۱۰۱۔

حضرت مولانا قاسم صاحبؒ کی مراد یہ تھی کہ تقدم یا تاخر زمانی میں بالذات فضیلت نہیں، بالعرض ہے کہ سب سے آخر میں وہی ہونا چاہیے، جو سب سے عالی مرتبہ بھی ہو۔

علمائے عرب کے سامنے مولانا احمد رضا خان نے جب اس خود ساختہ عبارت کو پیش کیا، تو آخری فقرے کا جو عربی ترجمہ کیا، اسے ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ مولانا احمد رضا خان صاحب جب یہ ترجمہ کر رہے ہوں گے، تو ان کا ضمیر اگر واقعی زندہ تھا، تو یقیناً انہیں ملامت کر رہا ہوگا۔ بہر حال! مولانا احمد رضا خان نے اس کا ترجمہ یوں کیا:

''مَعَ أَنَّهُ لَا فَضْلَ فِيْهِ أَصْلًا''[1].

''حال آں کہ اس میں بالکل ہی کوئی فضیلت نہیں''۔

اور یہ بات حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ہرگز نہ کہی تھی۔ وہاں صرف بالذات کی نفی تھی؛ مگر مولانا احمد رضا خان نے اصلاً کے لفظ سے ہر دو کی نفی کر دی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ!

جب مدح براہِ راست ہو، تو اس کے لیے وہی دلیل لائی جاتی ہے، جو بہ راہِ راست اس خوبی پر دلالت کرے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ہاں ایسے مواقع پر وہ دلیل نہیں لائی جاتی، جو ضمناً یا التزاماً اس مدح پر مشتمل ہو، پس مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا یہ کہنا کہ جس دلیل سے ختم نبوت زمانی بالفرض ثابت ہو، اسے حضور کے شان خاتمیت کے بیان میں مقام مدح پر لانا، جیسا کہ آپ کے استدراک سے معلوم ہوتا ہے، صرف اسی صورت میں درست ہوسکتا تھا کہ آپ کی خاتمیت میں براہ راست آپ کے کسی کمال کا بیان ہو، اور خاتمیتِ زمانی صرف اسے لازم ہو۔

مولانا احمد سعید کاظمی نے مولانا احمد رضا خان کی اس خیانت پر پردہ ڈالنے کے لیے کہ انہوں نے ''تحذیر الناس'' کی اصل عبارت سے بالذات کا لفظ کیوں اڑادیا ہے؟ کتنی کمزور بات لکھی ہے۔

گویا ناقل کو کسی عبارت کے نقل کرنے میں یہ حق بھی حاصل ہے کہ اپنی طرف سے جس لفظ کو چاہے زائد سمجھ کر نکال دے۔ کسی مضمون پر اعتراض کرنا ہو، تو اس مضمون کو پورا نقل کرنا چاہیے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جس عبارت پر اعتراض کرنا ہو، اس کی بعض قیود ناحق خود حذف کرتا جائے کہ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ!

مولانا احمد سعید کاظمی نے مولانا احمد رضا خان کی خیانت پر پردہ ڈالنے کے لیے جو بات کہی ہے، تصنیف وتنقید کی دنیا میں ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کی اس سے بدتر مثال کیا ہوگی۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ!

---

(۱) حسام الحرمین، ص: ۱۰۰۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پر تہمت کی ایک اور مثال:

مولانا امجد علی صاحب، خلیفہ مولانا احمد رضا خان نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ پر یہ بہتان بھی باندھا ہے کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو اس طرح قدیم سمجھتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات قدیم ہیں، تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اس طرح قدیم ہوئی، تو آپ ضرور قائم بالذات ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص صفات الٰہیہ کے سوا کسی کو قدیم مانے، وہ کافر ہے۔ مولانا امجد علی نے اس طرح حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ پر فتوائے کفر چسپاں کیا ہے:

> ''قائل صاحب (مولانا محمد قاسم صاحبؒ) نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو قدیم اور دیگر انبیا کو حادث بتایا۔ صفحہ ۷ رمیں ہے: 'کیوں کہ فرق قدم نبوت اور حدوث نبوت باوجود اتحاد نوعی خوب جب ہی چسپاں ہوسکتا ہے'۔ کیا ذات وصفات کے سوا مسلمانوں کے نزدیک کوئی چیز بھی قدیم ہے؟ نبوت صفت ہے اور صفت کا وجود بے موصوف محال۔ جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی حادث نہ ہوئے؛ بلکہ ازلی ٹھہرے، اور جو اللہ وصفات الٰہیہ کے سوا کسی کو قدیم مانے بہ اجماع مسلمین کافر ہے''(۱)۔

کسی دانشور نے ایسے ہی کسی معترض کے لیے کہا تھا: ''اَلْمُعْتَرِضُ كَالْأَعْمٰى'' اندھا یہ نہیں دیکھتا کہ آگے پیچھے کیا ہے، یوں ہی لاٹھی چلائے جاتا ہے۔ قدیم کا لفظ کیا صرف ازلی کے معنی میں ہی آتا ہے؟ محکمۂ آثار قدیمہ کیا ازلیات کی ہی نگرانی کرتا ہے؟ امجد علی صاحب نے کچھ تو سوچا ہوتا کہ کیا کہہ رہا ہوں؟ افسوس کہ بریلویوں کے لیے ''شریعت کی بہار'' یہی ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اس خط کشیدہ عبارت میں لفظ قدم کو ازلی کے معنی میں استعمال نہ کیا تھا، اسے صرف مقدم کے معنی میں استعمال کیا تھا۔ اسی طرح حدوث نبوت کے الفاظ آپ نے صرف مؤخر کے معنی میں استعمال کیے ہیں۔ آپ کی مراد اس سے یہ ہے کہ اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی آئی، پھر آپ کے افاضہ اور ملائکہ کے واسطے سے دیگر انبیا تک پہنچی۔ لفظ قدم سے آپ کی مراد بس اتنی ہی تھی، یہ نہیں کہ آپ کی وحی ازلی ہے، اور کسی وقت سے اس کا آغاز نہیں ہوا، (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)۔ ازلی ذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف نبوت سے موصوف بالذات ہونا:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مقدسہ کو اللہ تعالیٰ نے جب سے پیدا فرمایا شان نبوت سے متصف رکھا،

---
(۱) بہار شریعت، حصۂ اول، ص: ۵۶۔

سو آپ کی نبوت دوامی رہی، اور دیگر انبیائے کرام کی عرضی، اور آپ کے ہی فیض سے اس کا عروض ان پر ہوتا رہا۔ سو آپ کی نبوت اور ان کی نبوت میں اتحاد نوعی کے ساتھ ساتھ مقدم اور موخر ہونے کا فرق ضرور قائم رہا۔

اس سے یہ بات ہرگز نہیں نکلتی کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ معاذ اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذات قدیم ہونے کے قائل تھے۔ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو باقی انبیائے کرام کی نسبت سے اضافی طور پر قدیم کہا ہے، نہ کہ حقیقی اور ذاتی طور پر ازلی مانا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے، جیسے آفتاب باقی روشن چیزوں کی نسبت قدیم ہے کہ وصفِ نور سے موصوف بالذات ہے، اور باقی روشن اجسام اس کے فیض سے روشن ہوئے ہیں۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے موصوف بالذات ہیں کہ آپ کی ذات گرامی شروع سے ہی نبوت سے متصف رہی ہے۔ آپ اس وقت بھی نبی تھے، جب ابھی حضرت آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ بھی نہ بنا تھا؛ دیگر سب انبیا کو آپ کے افاضے سے نبوت ملی۔ سو آپ نبی الانبیاء بھی ہوئے۔ ظاہر ہے کہ آفتاب کو کوئی حقیقی طور پر قدیم نہیں کہتا، محض اضافی طور پر اسے قدیم کہتے ہیں کہ باقی سب چیزوں نے اس سے روشنی پائی۔

تحذیرالناس میں قدیم بہ معنی مقدم ہونے کی شہادتیں:

اب آیئے ''تحذیر الناس'' میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی مختلف عبارات دیکھیں، اور مولانا امجد علی کے اعتراض کا جائزہ لیں کہ حضرت مولانا مرحوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو کیا واقعی قدیم کہہ رہے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آنا کس وقت سے مانتے ہیں؟ اور یہ بھی دیکھیں کہ آپ کس معنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ذاتی کہتے ہیں؟ اس معنے میں کہ آپ کی ذات متصف بالنبوۃ تھی، یا یہ کہ آپ نبوت کی صفت سے بعد میں موصوف ہوئے؟ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ لکھتے ہیں:

> ''مضمون "عُلِّمْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْآخِرِیْنَ" بہ نسبت انبیائے ماتحت اس طرح سے راست ہو کہ اول آپ کو وحی آئی اور پھر ملائکہ کے واسطے سے ان کو پہنچی''۔

کیا اس میں صریح طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کا نقطۂ آغاز نہیں بتلایا گیا کہ باقی سب انبیا سے پہلے حضور پر وحی الٰہی ہوئی؟ اس تصریح کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ مولانا مرحوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی نبوت کو صفات الٰہیہ کی طرح ازلی اور قدیم مانتے ہیں، بہتان اور افترا اور خیانت نہیں تو اور کیا ہے؟

اب وہ پوری عبارت بھی ملاحظہ کیجیے، جس کا ایک ٹکڑا مولانا امجد علی نے لے کر حضرت مرحوم پر فتوائے

کفر چسپاں کر دیا:

''عہد[1] کا لینا، جس سے آپ کا نبی الانبیاء ہونا ثابت ہوتا ہے، پہلے ہی معروض ہو چکا ہے۔ علاوہ بریں حدیث: ''کُنْتُ نَبِیًّا وَآدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ''[2] بھی اسی جانب مشیر ہے؛ کیوں کہ فرق قدم نبوت اور حدوث نبوت باوجود اتحاد نوعی خوب جب ہی چسپاں ہو سکتا ہے کہ ایک جا یہ وصف ذاتی ہو، اور دوسری جا عرضی، اور فرق قدم وحدوث اور دوام وعروض فہم ہو۔ تو اس حدیث سے ظاہر ہے ہر کوئی سمجھتا ہے کہ اگر نبوت کا ایسا قدیم ہونا کچھ آپ ہی کے ساتھ مخصوص نہ ہوتا، تو آپ مقام اختصاص میں یوں نہ فرماتے''[3]۔

کیا اس عبارت میں تصریح نہیں کہ یہاں قدم وحدوث کے الفاظ دوم وعروض اور ذاتی اور عرضی کے معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں، ازلی اور حقیقی طور پر قدیم ہونے کے معنوں میں نہیں ہیں؟ پھر ان الفاظ سے مولانا پر فتوائے کفر چسپاں کرنا کس طرح قرینِ انصاف ہو سکتا ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ذاتی ہونے کا معنی:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ خود ہی لکھتے ہیں:

''مثال درکار ہو، تو لیجیے! زمین وکہسار اور در ودیوار کا نور اگر آفتاب کا فیض ہے، تو آفتاب کا نور کسی اور کا فیض ہے، اور ہماری غرض وصف ذاتی ہونے سے اتنی ہی تھی''[4]۔

یعنی جس طرح آفتاب کا نور کسی اور جرم سماوی کا فیض نہیں، جب سے اسے خدا نے بنایا یہ دائماً نورانی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بھی کسی اور نبی کا فیضان نہیں، جب سے خدا نے آپ کی روح مقدسہ کو پیدا فرمایا، موصوف بالنبوۃ فرمایا۔ مولانا مرحوم لکھتے ہیں:

''آپ موصوف بوصف النبوۃ بالذات ہیں، اور سوا آپ کے اور نبی موصوف بوصف نبوت بالعرض۔ اوروں کی نبوت آپ کا فیض ہے، اور آپ کی نبوت کسی اور (نبی) کا فیض نہیں۔ آپ پر سلسلۂ نبوت ختم ہو جاتا ہے۔ غرض آپ جیسے نبی الامت ہیں، ویسے ہی نبی الانبیاء بھی ہیں''[5]۔

ان تصریحات اور مثالوں سے واضح ہے کہ حضرت مولانا مرحوم کی لفظ قدم سے مراد کیا تھی؟ آپ اسے پہلے کے معنوں میں استعمال فرما رہے تھے، ازلی کے معنوں میں نہیں۔ سو مولانا امجد علی کا اس عبارت کو

---

(۱) یہ عہد قرآن کریم میں سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۹ میں مذکور ہے۔ (خالد)

(۲) قالوا: یا رسول اللہ! متی وجبت لک النبوۃ؟ قال: وآدم بین الروح والجسد. (ترمذی، ج:۲، ص:۲۰۱۔

(۳) تحذیر الناس۔ (۴) ایضاً۔ (۵) ایضاً۔

کفر کا جامہ پہنانا اور پھر تیزی سے مولانا پر کفر کا فتویٰ چسپاں کر دینا اگر مولانا احمد رضا خان کے ایصالِ ثواب کے لیے نہیں، تو کیا انگریزوں کے کھاتے میں ڈالنے کے لیے تھا؟ کیا حقیقی ذات قدیم کا بھی کسی سے اتحاد نوعی ہوسکتا ہے؟ دوسروں کی بات میں اپنے معنی ڈالنے کی اس شرم ناک حرکت پر شیطان بھی انگشت بہ لب ہوگا۔ ہاں! مولانا مرحوم کے ذمے اگر یہ جرم لگاتے ہو کہ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی الانبیاء کیوں کہا؟ کیوں کہ نبوت کے اعتبار سے سب انبیا ایک جیسے ہوتے ہیں، تو اس باب میں خود اپنی ہی تحریر دیکھ لیجیے!

> ''سب سے پہلے مرتبۂ نبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا۔ روز میثاق تمام انبیا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور حضور کی نصرت کرنے کا عہد لیا گیا اور اسی شرط پر یہ منصب اعظم ان کو دیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی الانبیاء ہیں اور تمام انبیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی۔ سب نے اپنے اپنے عہدِ کریم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں کام کیا''[1]۔

نبوت کے اعتبار سے اگر سب انبیا ایک جیسے ہوتے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نبوت میں نبی الانبیاء کیسے ہوتے؟ اور دیگر انبیا اپنے اپنے وقتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں کیسے کام کرتے؟ یہ تو تب ہی ہوسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وصف نبوت سے موصوف بالذات ہوں اور باقی انبیائے کرام موصوف بالعرض، کہ وہ سب نفوس قدسیہ نبوت سے حقیقتاً موصوف ہوئے؛ لیکن حضور کے فیض سے آفتابِ نبوت نے ایسی چمک پائی تھی کہ اس سے کئی آئینے منور ہو گئے۔ مولانا امجد علی کی یہ عبارت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی عبارت کی ہی ترجمان ہے؛ لیکن افسوس کہ مولانا احمد سعید کاظمی نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ضد میں اپنے بزرگ مولانا امجد علی پر بھی ہاتھ صاف کر لیے۔

بعض بریلوی علما حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حقیقی داعی کا لفظ دیکھ کر گمان کرنے لگتے ہیں کہ شاید دوسرے انبیائے کرام کو حقیقی نبی نہ مانا ہو؟ حاشا وکلا! یہ مراد ہرگز نہیں۔ تمام انبیائے کرام حقیقتاً نبوت سرفراز ہوئے؛ لیکن یہ بھی درست ہے کہ ان سب کو نبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے ملی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو سلسلۂ نبوت ختم ہو، اوہ یہی تھا کہ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی فیض سے کسی کو نبوت نہ ملے گی۔ آئندہ آنے والے مقربین ایزدی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے صرف ولایت پائیں گے، نبوت کا دروازہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بند فرما دیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی جماعت اسی نبوت کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے کسی کو نبوت ملے، حال آں کہ یہی ختم نبوت کا باب تھا۔ مسلمانوں کے ذہن میں اگر یہی بات جمتی، جو حضرت مولانا محمد قاسمؒ جمانا چاہتے تھے، تو کوئی شخص قادیانی دعوت کا شکار نہ ہوتا۔

(۱) بہارِ شریعت، حصۂ اول، ص: ۱۸۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے پہلے کسی عالم ربانی نے یہ تعبیر اختیار نہیں کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی حقیقی داعی الی اللہ تھے، اور باقی سب مقربین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے دعوت الی اللہ اور نبوت کا منصب ملا۔ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ باقی سب انبیائے کرام حقیقتاً داعی الی اللہ نہ تھے (معاذ اللہ)۔

حضرت علامہ فاسیؒ ”مطالع المسرات“ میں لکھتے ہیں:

”فَلَمْ يَكُنْ دَاعٍ حَقِيْقِيٌّ مِّنَ الْإِبْتِدَاءِ إِلَى الْإِنْتِهَاءِ؛ إِلَّا هٰذِهِ الْحَقِيْقَةُ الْأَحْمَدِيَّةُ الَّتِي“[1].

”سو حقیقی داعی شروع سے لے کر اب تک کوئی نہیں ہوا؛ مگر یہی حقیقت احمدیہ جو......“ الخ

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مقدسہ جب عالم ارواح میں تھی، اس وقت بھی اس کا فیضان ملائکہ پر جاری تھا، جب یہ روح تسبیح کرتی، تو تمام فرشتے اس کے فیضان میں تسبیح پڑھتے[2]۔

آپ کی روح اسی جہاں میں گویا تمام انبیا کی روحوں کی استاد تھی[3]، اور علوم الٰہیہ کا ان کا فیضان اسی روح کے واسطے سے ہوتا تھا۔ قرآن کریم کی آیتِ میثاق بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے خلعت بشری پہننے سے پہلے عالم ارواح اور عالم ملائکہ میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کریمہ مرکزی حیثیت رکھتی تھی، اور اس سے وفاداری کا اقرار سب انبیا سے لیا گیا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حقیقی داعی ہونے کے الفاظ صرف علامہ فاسیؒ نے ہی نہیں اختیار کیے، شیخ سعدیؒ بھی اپنے اس شعر میں یہی بات کہہ گئے ہیں:

تو اصل وجود آمدی از نخست
دگر ہر چہ موجود شد فرع تست[4]

شرح: دائرۂ ایجاد میں آپ اول سے مخلوق بالاصل ہیں۔ آپ کے سوا جس نے بھی خلعتِ وجود پہنا، وہ آپ کے وجود کی ایک شاخ ہے۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

(۱) علامہ فاسی، مطالع المسرات، ص:۱۰۲۔
(۲) دیکھیے: الشفاء، ج:۱، ص:۶۱۔
(۳) کما فی مدارج النبوۃ للشیخ عبدالحق محدث دھلویؒ، مطبوعہ مصر۔
(۴) بوستان۔

بلند آسماں پیش قدمت خجل
تو مخلوق وآدم ہنوز آب وگل

شرح: یہ آسمان بلند آپ کی اولیت کے سامنے شرمندہ ہے، آدم ابھی مٹی اور گارے میں بنے تھے کہ آپ پیدا ہو چکے تھے۔

شارح بوستاں اس مقام پر لکھتے ہیں:

''پس ذات آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بہ سبب تقدم وجود روحانی صدر نشین ممکنات است''۔

شیخ سعدیؒ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولیت کے لیے اگر لفظ قدم استعمال کر سکتے ہیں، تو حضرت مولانا محمد قاسم کو یہ لفظ ان معنی میں لانے کا کیوں حق نہیں؟ شیخ سعدیؒ نے حقیقت محمدیہ کو یہاں مخلوق بتایا ہے، اہل حق اسے کبھی ازلی نہیں کہتے؛ لیکن یہ کہنے میں بھی وہ کوئی باک نہیں سمجھتے کہ ہر پیغمبر کو پیغمبری آپ کے فیضان سے ملی۔ آپ جس طرح اپنی امت کے نبی ہیں، آپ سب گزشتہ انبیا کے بھی نبی تھے۔

علامہ قسطلانیؒ شارح صحیح بخاری اپنی کتاب ''المواہب اللدنیہ'' میں آپ کے نبی الانبیاء ہونے کی تصریح کر چکے ہیں، اور علامہ زرقانیؒ ''شرح مواہب'' میں اسے امت کا بڑا اعزاز سمجھتے ہیں کہ اس کا نبی گزشتہ انبیا کے لیے بھی نبی الانبیا ٹھہرے:

''لِأَنَّهُ نَبِيُّ الْأَنْبِيَاءِ وَكَفٰى بِهٰذَا شَرَفًا لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ الْمُحَمَّدِيَّةِ، زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا''[۱]۔

سو آپ کا سب انبیا سے پہلے ہونا کسی اسلامی اصل کے خلاف نہیں، جو بات حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے کہی، وہ کسی نہ کسی انداز میں پہلے بزرگانِ کرام بھی کہہ چکے ہیں۔

ختم نبوت مرتبی کے اقرار میں بھی مولانا محمد قاسمؒ متفرد نہیں:

حضرت مولانا رومؒ نے بھی تصریح کی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا بہ ایں معنی ہے کہ آپ کے مرتبے کا پیغمبر نہ کوئی پہلے ہوا، نہ آئندہ ہوگا۔ جب کوئی شخص کسی صفت میں آگے بڑھ جائے، تو کیا تم نہیں کہتے کہ اس پر یہ صفت ختم ہوگئی؟ مولانا لکھتے ہیں:

بہر ایں خاتم شد است او کہ بہ جود
مثل او نے بود ونے خواہند بود

(۱) علامہ قسطلانی، مواہب لدنیہ، ج:۵، ص:۳۵۴۔

چوں کہ در صفتے برو استاد دست
نے تو گوئی ختم صفت بر تو است[۱]

ختم نبوت مرتبی کے اس اقرار سے یہ نہ سمجھا جائے کہ مولانا رومؒ ختم نبوت زمانی کے قائل نہ تھے۔ ایک معنی کا بیان دوسرے معنی کی نفی نہیں کرتا۔

آپ ختم نبوت زمانی کے بارے میں لکھتے ہیں: ؎

یا رسول اللہ رسالت را تمام
تو نمودی ہم چو شمس بے غمام[۲]

''اے اللہ کے رسول! آپ نے رسالت کو اس طرح شرف تمام بخشا ہے، جیسے بادل کے بغیر سورج چمک رہا ہو''۔

پھر ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: ؎

سکہ شاہاں ہمے گردد دگر	سکہ احمد ببیں تا مستقر
ایں ہمہ انکار کفر آں زاد شاں	چو در سید آخر زماں[۳]

''اور بادشاہوں کے سکے بدلتے رہتے ہیں، احمد کے سکے کو دیکھو یہ اس وقت تک قایم رہے گا جب تک یہ دنیا ہے''۔

اگلے شعر میں صریح طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سید آخرالزماں کہا ہے۔ زمانے کے لحاظ سے آخری یہ تصریح ہے کہ مولانا رومؒ مولانا محمد قاسمؒ کی طرح ختم نبوت زمانی کے ساتھ ختم نبوت مرتبی کے بھی قائل تھے۔

مولانا رومؒ کا بھی عقیدہ تھا کہ پچھلے انبیا کو نبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان سے ملی، پس اس پہلو سے لفظ خاتم مہر لگانے کے لیے نہیں، مہریں کھولنے کے معنی میں بھی لیا جائے گا۔ مولاناؒ اس کی تصریح کرتے ہیں: ؎

در کشاد ختم ہا تو خاتمی
در جہاں روح بخشاں خاتمی[۴]

''آپ مہروں کے کھولنے میں خاتم ہیں۔ روح بخشوں کی دنیا میں آپ ہی خاتم ہیں''۔

مولانا رومؒ ہی نہیں مولانا احمد رضا خان بھی آخرالنبیین کے یہی معنی کر گئے کہ آپ مرتبۂ کمالات میں سب سے آگے ہیں۔ یہ اسی اولیت کا اظہار تھا کہ اسرا کی رات سب پیغمبروں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی۔ مولانا احمد رضا خان لکھتے ہیں: ؎

(۱) مثنوی شریف، دفتر: ۶، ص: ۴۹۶۔
(۲) ایضاً، دفتر: ۵، ص: ۳۹۸۔ (۳) ایضاً۔ (۴) ایضاً۔

نمازِ اقصیٰ میں تھا یہی سر		عیاں ہوں معنی اوّل و آخر
کہ دست بستہ ہیں پیچھے حاضر		جو سلطنت پہلے کر گئے تھے[(۱)]

مولانا احمد رضا خان آخر کے معنی اوّل کرنے میں اگر مجرم نہیں، تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو کیا انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے مجرم گردانا جارہا ہے؟

بریلوی دوستو! کچھ سوچو!! آخر ایک دن خدا کے حضور پیش ہونا ہے، اس وقت کیا جواب دو گے؟ بزرگوں کے ذمے اپنی من گھڑت باتیں لگانا کہاں کی دیانت اور کس دولت کی یہ دولت ہے؟

مولانا محمد قاسمؒ قدم نوعی کے اس دعوے میں اکیلے نہیں، پہلے کئی بزرگ بھی یہ بات کہہ چکے ہیں، سو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا نظریہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وصفِ نبوت سے موصوف بالذات ہیں، اور آپ کی نبوت باقی انبیا سے ممتاز اور منفرد ہے، بالکل صحیح ہے، اور بریلوی حضرات کا یہ کہنا کہ: آپ کی نبوت اور دوسرے انبیا کی نبوت میں کوئی فرق نہیں، صحیح نہیں ہے۔ اللہ جسے شان دے، اسے کون مٹا سکتا ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پر ایک اور الزام:

ان لوگوں نے جب دیکھا کہ انکارِ ختم نبوت کا الزام مولاناؒ پر چسپاں نہیں ہوتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ذاتی ہونے کا معنی بھی اپنی جگہ قابل اعتراض نہ ٹھہرا، تو انہوں نے ایک اور الزام تراشا کہ مولاناؒ کا عقیدہ تھا کہ امتی عمل میں بسا اوقات نبی سے بھی بڑھ جاتے ہیں:

> ''ایک ان کے ادارے کے بانی (مولانا محمد قاسمؒ) نے عمل کی پیائش کی، تو امتی کو نبی سے بڑھا دیا''[(۲)]۔

جب ہم نے اصل کتاب ''تحذیر الناس'' کو کھول کر دیکھا، تو اس میں ایک ایسا لفظ موجود پایا، جو اس سارے شبہے کو زائل کر دیتا تھا؛ مگر معترض حضرات نے اسے ساتھ نقل نہ کیا تھا۔ مولانا محمد قاسمؒ کی اصل عبارت یہ تھی:

> ''انبیا اپنی امت سے اگر ممتاز ہوتے، تو علوم ہی میں ممتاز ہوتے ہیں، باقی رہا عمل؟ اس میں بسا اوقات بہ ظاہر امتی مساوی ہو جاتے ہیں؛ بلکہ بڑھ جاتے ہیں''[(۳)]۔

اس عبارت میں ''بہ ظاہر'' کا لفظ فیصلہ کن تھا کہ ایسا صرف ظاہر کے لحاظ سے ہوتا ہے، حقیقت کے

(۱) احمد رضا خان بریلوی، **حدائق بخشش**، حصۂ اوّل، ص:۱۱۰۔
(۲) المیزان احمد رضا نمبر، ص:۲۴۶۔
(۳) تحذیر الناس۔

اعتبار سے نہیں، اور ''بہ ظاہر'' کا لفظ ان معنوں کے لحاظ سے عام ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے مولانا احمد رضا خان کا یہ فتویٰ بھی سامنے رکھیے:

''عرض: شیخ سے بہ ظاہر کوئی ایسی بات معلوم ہو، جو خلافِ سنت ہے، تو اس سے پھر جانا کیسا ہے؟
ارشاد: محرومی اور انتہائی گم راہی ہے''(۱)۔

یہاں ''بہ ظاہر'' سے مراد یہی ہے کہ تمہیں وہ عمل ظاہر میں ایسا دکھائی دے رہا ہو کہ سنت کے خلاف ہے؛ لیکن حقیقت میں وہ خلافِ سنت نہ ہو؛ کیوں کہ جو عمل حقیقت میں بھی خلاف سنت ہو، اس کی وجہ سے پیر کو چھوڑنا ہرگز محرومی اور گم راہی قرار نہیں دیا جاسکتا:۔

خلاف پیمبر کسے راہ گزید
کہ ہر گز بہ منزل نہ خواہد رسید

''جو شخص (حقیقت میں) پیغمبر کے خلاف چلے گا، وہ ہرگز منزل پر نہ پہنچ سکے گا''۔

سو مولانا محمد قاسمؒ کی عبارت میں بھی ''بہ ظاہر'' کا وہی مطلب لیجیے، جو یہاں مولانا احمد رضا خان کی عبارت میں لیا جارہا ہے۔ اس ''بہ ظاہر'' کے ساتھ مفتی احمد یار صاحب کا ''بہ ظاہر'' بھی ملا لیجیے اور اس کی روشنی میں ''تحذیر الناس'' کے ''بہ ظاہر'' کو سمجھنے کی کوشش کیجیے:

''اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ'' وغیرہ وہ آیات جو بہ ظاہر شانِ مصطفوی کے خلاف ہیں، متشابہات ہیں'' (۲)۔

کیا کوئی آیت حقیقت میں شانِ مصطفوی کے خلاف ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کے ہاں یہاں ''بہ ظاہر'' حقیقت کے مقابلے میں ہے۔ اس طرح مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی عبارت کا بھی اگر یہ مطلب لے لیا جائے کہ بسا اوقات ولی کا کوئی عمل مقدار میں پیغمبر کے عمل سے بھی بڑا دکھائی دیتا ہے، گو یہ صرف ظاہر میں ہوتا ہے، حقیقت میں کوئی ولی کسی پیغمبر سے عمل میں بھی نہیں بڑھ سکتا۔ تو اس میں کیا حرج تھا؟ مگر افسوس کہ بریلویوں نے اپنے اعتراض میں لفظ ''بہ ظاہر'' کو ہی یک سر اڑا دیا، تاکہ اعتراض پڑھنے والا خود کسی نتیجے پر نہ پہنچ جائے (۳)۔

---

(۱) ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت، حصۂ چہارم، ص: ۵۱۔
(۲) جاء الحق، ص: ۱۷۸۔
(۳) (مضمون ماخوذ از): مطالعۂ بریلویت، ج: ۱، ص: ۳۰۰ تا ۳۳۲۔

تحذیر الناس کی وجہِ تصنیف

جناب پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم

زیرِ نظر مضمون نہایت اہم اور معلوماتی ہے۔ پروفیسر صاحب مرحوم نے خوب کھل کر تحریر فرمایا ہے۔ بریلوی علما کا کہنا ہے کہ: پروفیسر صاحبؒ بریلوی تھے۔ اس مضمون کو پڑھ کر اندازہ کیجیے کہ کیا تھے۔ (نعمان)

مولانا محمد احسنؒ بریلی میں علوم اسلامی کی گراں قدر خدمات انجام دے رہے تھے۔ مولانا کے مطبع صدیقی سے اسلامی و تبلیغی لٹریچر خصوصاً حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم وافکار کی خوب نشر واشاعت ہو رہی تھی۔ مولانا بریلی کالج کے علاوہ طلبہ کو گھر پر بھی درس دیتے تھے، تصنیف وتالیف کا سلسلہ قائم تھا۔ مدرسہ مصباح التھذیب- بریلی کے ذریعہ اسلامی علوم وفنون کی تعلیم جاری تھی۔ مولانا محمد احسنؒ کی یہ مذہبی وعلمی خدمات بعض مسائل میں اختلاف کی وجہ سے بعض علما کو ناگوار ہوئیں، جن میں مولوی نقی علی خان بریلوی[1] خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

صورت یہ ہوئی کہ ۱۲۸۸ھ/ ۱۸۷۱ء میں شیخو پور ضلع بدایوں میں مسئلہ ''امکان وامتناع نظیر'' پر مولانا عبدالقادر بدایونی (المتوفی ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء) اور شمس العلماء امیر احمد سہسوانی کے درمیان ایک مناظرہ منعقد ہوا۔ مولوی محمد نذیر سہسوانی (المتوفی ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۱ء) نے ہر دو فریق کے مفصل حالات وتحریرات پر مشتمل ایک کتاب ''مناظرۂ احمدیہ'' کے نام سے طبع کرادی۔ تحریرات مناظرہ میں اثر ابن عباسؓ:

''اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ سَبْعَ أَرْضِيْنَ، فِي كُلِّ أَرْضٍ آدَمُ كَآدَمِكُمْ، وَنُوْحٌ كَنُوْحِكُمْ، وَاِبْرَاهِيْمُ كَاِبْرَاهِيْمِكُمْ، وَعِيْسَى كَعِيْسَاكُمْ، وَنَبِيٌّ كَنَبِيِّكُمْ''.

بھی زیر بحث آیا۔ مرتب رسالہ مولوی محمد نذیر سہسوانی نے آخر کتاب میں ایک جملہ یہ بھی لکھ دیا:

---

(۱) مولوی نقی علی خان، ابن مولوی رضا علی خان بھڑیچ ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۰ء میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء میں شاہ آل رسول مارہروی سے بیعت ہوئے۔ یہ عمر کا آخری زمانہ تھا۔ ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء میں انتقال ہوا۔ مولوی نقی علی خان کی تالیفات میں ''سرور القلوب فی ذکر المحبوب'' اور ''جواہر البیان فی اسرار الارکان'' مشہور ہیں۔ (تذکرہ علمائے ہند ص: ۵۳۰)۔

''مولوی محمد احسن صدیقی نانوتوی بھی اسی (صحت اثر ابن عباسؓ) کے معتقد ہیں، اور اسی مضمون پر ان کی مہر ثبت ہے، اور اسی کے اور علمائے دین قائل اور معتقد ہیں''(۱)۔

صحت اثر ابن عباسؓ کے متعلق مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے ایک فتوی مرتب کیا تھا، جس پر مفتی سعد اللہ مراد آبادیؒ کی تصدیق تھی۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے اس فتوے پر مولانا محمد احسنؒ سے بھی تصدیق وتصویب کے لیے مہر کرائی تھی، اسی کا حوالہ محمد نذیر سہسوانی نے مندرجۂ بالا اقتباس میں دیا ہے۔

محمد نذیر سہسوانی کے نقل کردہ اقتباس پر مولانا محمد احسنؒ کی تکفیر کی گئی۔ رجب ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء میں مدرسۂ مصباح التہذیب ختم ہو گیا۔ مخالفت کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا؛ بلکہ نماز عید الفطر (شوال ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء) کے موقع پر مولوی نقی علی خان نے عیدگاہ میں مولانا محمد احسنؒ کے نماز پڑھانے کو بھی پسند نہیں کیا۔ اگر چہ مولانا محمد احسنؒ ایک مدت سے عیدین کی امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مولانا محمد احسنؒ نے اس صورت حال کو دیکھ کر درج ذیل تحریر لکھنی ضروری سمجھی:

''اگر سید احمد شاہ صاحب نماز عیدگاہ میں پڑھا دیں گے، تو کسی طرح کا نزاع اور تکرار پیش نہ ہوگا، نہ ہماری طرف سے نہ ہمارے دوستوں کی طرف سے۔ اور در صورت نہ ہونے یا انکار کرنے سید صاحب کے قاضی غلام حمزہ صاحب کا امام ہونا مناسب ہے۔ اس پر بھی کچھ تکرار نہ ہوگی۔ اگر انہوں نے قبول نہ کیا، تو ہم کو کچھ بحث نہیں کسی کی امامت سے۔ ہماری طرف سے نزاع نہ ہوگی''(۲)۔

مگر صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی، تو پھر مولانا محمد احسنؒ نے مولوی نقی علی خان کو عیدگاہ سے یہ پیغام بھجوایا کہ:

''میں نماز پڑھنے کو آیا ہوں پڑھانا نہیں چاہتا، آپ تشریف لائیے، جسے چاہیے امام کیجیے، میں اس کا اقتدا کرلوں گا''(۳)۔

مگر عیدگاہ میں نماز مولانا محمد احسنؒ ہی نے پڑھائی۔ دوسرے لوگوں نے مولوی نقی علی خان کے اقتدا میں حسین باغ (بریلی) میں نماز عید ادا کی۔ نماز عید کے بعد مولوی نقی علی خان نے اثرِ ابن عباسؓ کی صحت تسلیم کرنے کی وجہ سے مولانا محمد احسنؒ کی تکفیر کی۔ مولانا محمد احسنؒ نے آخر میں مولوی نقی علی خان کے ایک ساتھی رحمت حسین کو یہ لکھا:

---

(۱) مناظرۂ احمدیہ، ص:۴۷۔

(۲) تنبیہ الجہال، ص:۱۷۔ (۳) ایضاً ص:۱۶۔

''جناب مخدوم ومکرم بندہ دام مجد ہم۔

پس از سلام مسنون التماس یہ ہے کہ: واقع میں جواب مرسلہ مولوی نقی علی خان صاحب میری تحریر کے مطابق ہے۔ میں نے یہ جواب اس جواب کا خلاصہ لکھا تھا، جو مولوی عبدالحی فرنگی محلی نے لکھا تھا، اور اس پر تصدیق مفتی سعد اللہ صاحب کی بھی ہے، اور مطبع علوی علی بخش خاں (لکھنو) میں چھپا ہے، اور زبانی سامنے شاہ نظام حسین صاحب کے میں نے یہ اقرار کیا کہ مجھ کو اس تحریر پر اصرار نہیں۔ جس وقت علما کے اقوال کتب مستندہ سے آئیں، غلطی ثابت ہوگی، میں فوراً اس کو مان لوں گا؛ مگر مولوی صاحب براہِ مسافر نوازی کوئی غلطی تو ثابت نہیں کی اور نہ مجھ کو اس کی اطلاع دی؛ بلکہ اول ہی کفر کا حکم شائع فرمایا اور تمام بریلی میں لوگ اس طرح کہتے پھرے۔ خیر میں نے خدا کے حوالے کیا۔ اگر اس تحریر سے میں عند اللہ کافر ہوں، تو توبہ کرتا ہوں، خدا تعالیٰ قبول کرے۔ زیادہ نیاز - عاصی محمد احسن عفی عنہ''(۱)۔

مولوی نقی علی خان اس تحریر سے بھی مطمئن نہ ہوئے، ان کی رائے میں اثر ابن عباسؓ کی صحت قبول کرنے کے بعد مولانا محمد احسنؒ منکر خاتم النبیین ٹھہرتے تھے؛ اس لیے مولوی نقی علی خان نے رام پور سے ایک فتویٰ منگوایا، جس کی رو سے مولانا محمد احسنؒ کی تکفیر مشتہر کی گئی (۲)، اس کے بعد مولانا محمد احسنؒ نے اپنی صفائی بہ اشتہار ذیل پیش کی:

''عید الفطر کے روز سے چرچا ہو رہا تھا کہ مولوی نقی علی خان صاحب نے ایک استفتا رام پور سے منگوایا ہے، جس کی رو سے میری تکفیر مشتہر کی۔ وہ استفتا میری نظر سے بالتفصیل نہیں گزرا۔ بعد تشریف آوری مولوی محمد یعقوب علی خاں صاحب کے اس کی نقل میں نے مفصل دیکھی اور اس عقیدے والے کی تکفیر پر میں بھی علما کے ساتھ متفق ہوں، یعنی جو شخص خاتم النبیین سوائے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی دوسرے کو جانے اور آپ کی نبوت کو مخصوص کسی طبقے کے ساتھ مانے وہ شخص میرے نزدیک بھی خارج از دائرہ اسلام اور کافر ہے۔ لہٰذا برنظر دور کرنے مظنۂ عوام کے یہ اشتہار دیتا ہوں کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا نہ کوئی نبی خاتم النبیین ہوا نہ ہوگا۔ پس خلاف اس عقیدے کے غیر صحیح اور غلط تصور کیا جائے۔ المشتہر محمد احسن صدیقی''(۳)۔

مولانا محمد احسنؒ نے مندرجۂ ذیل استفتا اثر ابن عباسؓ کے متعلق مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کو بھیجا(۴):

(۱) تنبیہ الجہال، ص:۱۵۔ (۲) اس فتوے کے لیے دیکھیے: تنبیہ الجہال، ص:۹-۲۵/(ایوب)۔ (۳) ایضاً، ص:۲۳-۲۲۔
(۴) مجموعۃ الفتاوی از مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ، ج:۱، ص:۴۵-۱۴۱/(مطبع یوسفی لکھنو، ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء)

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس باب میں کہ: زید نے بہ تتبع ایک عالم کے، جس کی تصدیق ایک مفتی مسلمین نے بھی کی تھی، دربارۂ قولِ ابن عباس رضی اللہ عنہما جو درمنثور وغیرہ میں ہے:

"اِنَّ اللّٰـهَ خَلَقَ سَبْعَ أَرْضِيْنَ، فِي كُلِّ أَرْضٍ آدَمُ كَآدَمِكُمْ، وَنُوحٌ كَنُوحِكُمْ، وَإِبْرَاهِيْمُ كَإِبْرَاهِيْمِكُمْ، وَعِيْسَى كَعِيْسَاكُمْ، وَنَبِيٌّ كَنَبِيِّكُمْ"(۱).

کے یہ عبارت تحریر کی کہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ: حدیثِ مذکور صحیح اور معتبر ہے، اور زمین کے طبقات جدا جدا ہیں اور ہر طبقہ میں مخلوقِ الٰہی ہے۔ اور حدیثِ مذکور سے ہر طبقہ میں انبیاء علیہم السلام کا ہونا معلوم ہوتا ہے؛ لیکن اگر چہ ایک ایک خاتم کا ہونا طبقاتِ باقیہ میں ثابت ہوتا ہے؛ مگر اس کا مثل ہونا ہمارے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ثابت نہیں۔

اور نہ یہ میرا عقیدہ ہے کہ: وہ خاتم مماثل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوں؛ اس لیے کہ اولادِ آدم جس کا ذکر "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ" (۲) میں ہے، اور سب مخلوقات سے افضل ہے، وہ اسی طبقہ کے آدم کی اولاد ہے بالاجماع۔ اور ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب اولادِ آدم سے افضل ہیں، تو بلاشبہ آپ تمام مخلوقات سے افضل ہوے۔ پس دوسرے طبقات کے خاتم جو مخلوقات میں داخل ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مماثل کسی طرح نہیں ہوسکتے۔ انتہی۔

اور باوجود اس تحریر کے زید یہ کہتا ہے کہ: شرع سے اگر اس کے خلاف ثابت ہوگا، تو میں اسی کو مان لوں گا، میرا اصرار اس تحریر پر نہیں۔

پس علمائے شرع سے استفسار یہ ہے کہ: الفاظِ حدیث ان معنوں کو محتمل ہیں، یا نہیں، اور زید بوجہ اس تحریر کے کافر، یا فاسق، یا خارج اہلِ سنت و جماعت سے ہوگا، یا نہیں؟ بَيِّنُوْا تُوْجَرُوْا.

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس کے جواب میں ایک مکمل رسالہ "تحذیر الناس" تحریر فرمایا۔ "تحذیر الناس" کے آخر میں مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کا جواب بھی شامل ہے اور اس پر مفتی محمد نعیمؒ کی تصویب ہے۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ (وفات ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء) نے اس موضوع پر **"زجر الناس علی انکار أثر ابن عباسؓ"**، **"الآیات البینات علی وجود الأنبیاء فی الطبقات"**، **"دافع الوسواس فی أثر ابن عباسؓ"**، تین مستقل رسالے لکھے ہیں (۳)۔ آخر الذکر رسالہ ہمارے پیش نظر ہے۔

---

(۱) حاکم نیشاپوری، محمد بن عبداللہ، مستدرک علی الصحیحین، تحقیق: مصطفیٰ عبدالقادر عطا، (لبنان: دار الکتب العلمیہ، بیروت، ط.۱، ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۰ء)، ج:۲، ص: ۵۳۵، رقم: ۳۸۲۲۔

(۲) سورۃ الاسراء، آیت: ۷۰۔

(۳) مقدمہ عمدۃ الرعایہ فی حل شرح الوقایہ، از مولانا عبدالحی فرنگی محلی، ص: ۳۲-۲۹، (مطبع یوسفی لکھنؤ ۱۹۲۲ء)

یہ رسالہ مولانا عبدالحیؒ نے کشف الالتباس فی اثر ابن عباسؓ کے رد میں لکھا ہے (۱)۔ اس موضوع پر مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے مجموعۃ الفتاویٰ جلد اول میں تین فتوے بھی شامل ہیں، جن پر مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے علاوہ دوسرے علما: مفتی محمد سعد اللہ، محمد لطف اللہ، محمد نعیم، محمد ابراہیم ابن مولوی علی محمد، مولوی محمد عبداللہ حسینی، ابوالخیر محمد معین الدین، مولوی امیر احمد سہسوانی، مولوی محمد حسین حفیظ اللہ، شریف حسین، محمد عبدالعلی، محمد عبدالعزیز شہاب الدین غزنوی، عبدالغفور لاہوری اور محمد عبدالغفار ٹونکی کی تصدیق وتصویب موجود ہیں (۲)۔ اس مسئلے کی تائید میں ایک رسالہ ''نصر المؤمنین فی ردقول الجاہلین'' بھی لکھا گیا؛ مگر اس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی (۳)۔

اثر ابن عباسؓ کی بحث اور مناظرۂ احمدیہ اور تحذیر الناس کے جواب میں کئی رسالے لکھے گئے۔ ہمارے مطالعے وعلم میں درج ذیل رسالے آئے ہیں:

۱- تحقیقاتِ محمدیہ حل اوہام نجدیہ:

(۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) مولوی فضل مجید بدایونی (المتوفی ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء)، (تلمیذ مولانا عبدالقادر بدایونی) نے مناظرۂ احمدیہ کے جواب میں یہ رسالہ لکھا ہے۔ یہ رسالہ مطبع الٰہی آگرہ میں چھپا ہے۔

۲- الکلام الاحسن:

مولانا محمد احسن نانوتویؒ کے رد میں مولوی ہدایت علی بریلوی کا رسالہ ہے۔

۳- تنبیہ الجہال بالہام الباسط المتعال:

۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء مولانا مفتی حافظ بخش بدایونی (۴) (تلمیذ مولانا عبدالقادر بدایونی) کے نام سے مطبع

---

(۱) دافع الوسواس فی اثر ابن عباس، از مولانا عبدالحی، ص:۲، (مطبع علوی لکھنو ۱۹۲۲ء)

(۲) مجموعۃ الفتاوی، از مولانا عبدالحی فرنگی محلی، ج:۱، ص:۹۹/۱۰۷، ۱۱۲/۱۱۱، ۱۴۱/۱۴۵۔

(۳) تنبیہ الجہال، ص:۶۱۔

(۴) مولانا حافظ بخش ولد شیخ خدا بخش ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں قصبہ آنولہ ضلع بریلی میں پیدا ہوئے۔ حفظ قرآن اور ابتدائی تعلیم کی تحصیل اپنے نانا قاری حافظ امام بخش سے کی۔ ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں مدرسۂ قادریہ بدایوں پہنچے۔ ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغت حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا فضل رسول بدایونی، مولانا عبدالقادر بدایونی اور مولوی نور احمد بدایونی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء میں مدرسۂ محمدیہ بدایوں میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ بدایوں کے مفتی اور نائب قاضی رہے۔ جمادی الآخر ۱۳۳۹ھ/ مارچ ۱۹۲۱ء میں انتقال ہوا۔ درگاہ قادری بدایوں میں دفن ہوئے۔ آپ کے نامور فرزند مولانا قدیر بخش بدایونی تھے، جو مدرسۂ تعلیم الاسلام جے پور میں صدر مدرس تھے۔ نہایت خلیق، نیک صفت اور فرشتہ خصال تھے۔ ۱۳/نومبر ۱۹۵۶ء کو حیدرآباد سندھ انتقال ہوا۔ مولانا مفتی حافظ بخش پر راقم کا ایک مفصل مقالہ ''العلم'' جنوری تا مارچ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ (ایوب)

بہارستان لکھنؤ میں چھپا ہے۔ اس رسالے میں بھی مناظرۂ احمدیہ اور تحذیر الناس کا رد کیا گیا ہے۔ مولوی نقی علی خان کی حمایت کی گئی ہے، اور مولانا محمد احسنؒ اور مولوی امیر حسن سہسوانیؒ کی مذمت کی گئی ہے۔

۴– قول الفصیح:

مولوی فصیح الدین بدایونی (تلمیذ مولانا عبدالقادر بدایونی) نے تحذیر الناس کے جواب میں یہ رسالہ مطبع ماہتابِ ہند، میرٹھ سے ۱۸۷۵ء میں شائع کیا۔ اس رسالے کا جواب مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے لکھا ہے۔ یہ قلمی رسالہ دستخطی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے۔ اس مخطوطے کا نمبر الف ۳۰۶ ہے[۱]۔

۵– افاداتِ صمدیہ:

مولوی عبدالصمد سہسوانی (المتوفی ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء) (تلمیذ مولانا عبدالقادر بدایونی) نے مولوی امیر حسن سہسوانیؒ کے رد میں لکھا ہے۔ اس میں افاداتِ ترابیہ کا جواب دیا گیا ہے[۲]۔ بحث امتناع نظیر کی ہے۔

۶– رد رسالہ قانونِ شریعت:

مولوی عبدالصمد سہسوانی کے شاگرد مسمی الٰہی بخش، ساکن پھپوند ضلع اٹاوہ نے مولوی امیر حسن سہسوانیؒ کے رد میں یہ رسالہ لکھا ہے[۳]۔

۷– ابطال اغلاط قاسمیہ:

۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء مولوی عبید اللہ، امام جامع مسجد بمبئی (مرید مولانا فضل رسول بدایونی) کے ایما پر ایک شخص عبدالغفار نے تحذیر الناس کے رد میں یہ رسالہ ترتیب دیا ہے۔ مرتب رسالہ عبدالغفار کا یہ کہنا ہے کہ: مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولوی محمد شاہ پنجابی (وفات ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء) کے درمیان دہلی میں تحذیر الناس

(۱) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ کو ایک مرتبہ حضرت نانوتویؒ کے اس جواب کی ضرورت ہوئی، تو میرے جد امجد حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحبؒ کے ذریعے انجمن ترقی اردو سے قلمی نقل کرائی تھی، اور اس کی اجرت میرے جد امجدؒ کے ہاتھوں سے دلوائی تھی۔ اب یہ مخطوطہ نیشنل میوزم کراچی میں موجود ہے۔ انجمن کی ملکیت ہے؛ لیکن انجمن کا لیٹر لے کر مرتب زیر نظر نمبر میوزم گئے، تو وہاں کا انچارج بدعتی ملا تھا، اور شاید اب بھی ہے۔ اس نے زیارت تو کرادی؛ لیکن عکس دینے سے انکار کر دیا۔ بعد میں راقم کو اس کی کاپی حضرت مولانا اعجاز احمد سنگھانوی مدظلہم سے مل گئی۔ فجزاہ اللہ خیراً۔

میری ایک مرتبہ حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب مدظلہم سے ملتان میں اس کے متعلق بات ہوئی تھی، تو پتا چلا تھا کہ پنجاب کے کسی علاقے میں ایک مولانا (نام یاد نہیں رہا) نے اس پر کام کر لیا ہے، عن قریب منظر عام پر آجائے گی۔ اللہ کرے ہماری آنکھیں بھی اس سے استفادہ کرلیں۔ (شریفی، جولائی ۲۰۱۵ء)

(۲) اور (۳) طوالع الانوار، از مولوی انوار الحق بدایونی، ص: ۸۹، صبح صادق پریس سیتاپور ۱۲۹۷ھ۔

کے مضامین پر مناظرہ ہوا، دونوں صاحبوں کے اقوال سے ایک استفتا مرتب کر کے مولانا محمد قاسمؒ کے خلاف عبدالغفار نے علما سے دستخط کرائے۔ اس رسالے پر دوسرے حضرات کے ساتھ مولانا عبدالقادر بدایونی، مولوی محبّ احمد بدایونی (تلمیذ مولانا عبدالقادر بدایونی)، مولوی فصیح الدین (مولف قول الفصیح) مولوی عبید اللہ، امام جامع مسجد بمبئی وغیرہ کے دستخط ہیں۔

۸- فتاوائے بےنظیر درنفی آں حضرت بشیر ونذیر:

اس رسالے میں ان تمام علما کے فتوے یک جا شامل ہیں، جو صحت اثر ابن عباسؓ کے قائل نہ تھے۔ بدایوں اور بریلی کے علما خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ رسالہ مطبع اسدی میں چھپا ہے۔

۹- کشف الالتباس فی اثر ابن عباسؓ:

اس رسالے کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

۱۰- قسطاس فی موازنۃ اثر ابن عباسؓ:

مولانا شیخ محمد تھانویؒ کی اس موضوع پر قابل قدر تصنیف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے مولانا فضل حق خیر آبادی (المتوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) نے ''تقویۃ الایمان'' (مصنفہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی شہیدؒ ۱۸۳۱ء) کی ایک عبارت: ''اس شہنشاہ کی تو یہ شان..... کی برابر پیدا کر ڈالے''، پر امتناعِ نظیر اور امکانِ نظیر کی بحث چھیڑی، اور ایک مختصر سا رسالہ اس کے رد میں لکھا، پھر تو اس سلسلے نے اس قدر طول پکڑا کہ برصغیر پاک وہند کے علما نے اس مسئلے پر بہت سے رسالے لکھے اور مناظرے کیے۔ یہاں تک کہ بے غالب دہلوی سے بھی مولانا فضل حق نے اس سلسلے میں ایک مثنوی لکھوائی۔ تقریباً پون صدی تک اس مسئلے سے برصغیر پاک وہند کی فضا گونجتی رہی۔

یہاں اس امر کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اثر ابن عباسؓ کے مسئلے میں علمائے بریلی اور بدایوں نے مولانا محمد احسنؒ کی بڑی شد ومد سے مخالفت کی۔ بریلی میں اس محاذ کی قیادت مولوی نقی علی خان کر رہے تھے، اور بدایوں میں مولوی عبدالقادر بدایونی، ابن مولانا فضل رسول بدایونی سرخیل جماعت تھے۔ یہی بریلی اور دیوبند کی مخالفت کا نقطۂ آغاز تھا، جو بعد کو ایک بڑی وسیع خلیج کی شکل اختیار کر گیا(۱)۔

---

(۱) مولانا محمد احسن نانوتویؒ، ص: ۸۴ تا ۹۴۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پر مرزائیوں کا بہتان وافترا

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ

زیرِ نظر یادگار مقالہ حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب مدظلہم (عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت) کی محنتوں کا ثمر ہے؛ ورنہ اس تک رسائی ناممکن تھی۔ (نعمان)

بندۂ ناچیز محمد ادریس کاندھلوی، کَانَ اللّٰہُ لَہٗ وَ کَانَ ھُوَ لِلّٰہِ. آمِیْن ! اہل اسلام کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ: مرزائیوں کو اپنی گمراہی اور غلط عقائد کے ثابت کرنے کے لیے کتاب اور سنت اور اقوال صحابہؓ وتابعینؒ اور ائمۂ دینؒ اور فقہاؒ اور محدثینؒ اور مفسرینؒ اور متکلمین کے کلام میں تو کہیں تل رکھنے کی گنجائش نہیں ملتی؛ اس لیے یہ گروہ حضراتِ اولیاؒ اور عارفینؒ کے ناتمام اقوال قطع وبرید کر کے عوام کے سامنے پیش کرتا ہے، تاکہ عوام ان حضراتِ اولیاؒ کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکیں۔ حال آں کہ ان بزرگوں کا صریح عقیدہ جو عین قرآن وحدیث کے مطابق ہوتا ہے، وہ ان کی کتابوں میں مذکور ہوتا ہے، اس کو یہ لوگ نقل نہیں کرتے؛ البتہ بزرگوں کے ان مبہم اور مجمل کلام کو نقل کر دیتے ہیں کہ جو ان بزرگوں سے ایک خاص حالت سکر (۱) میں نکلا ہے، جو بہ اتفاقِ علما حجت نہیں۔

جیسا کہ منصورؒ نے ایک خاص بےخودی کی حالت میں ''انا الحق'' کہہ دیا؛ مگر جب اس حالت سے افاقہ ہوا، تو تائب ہوئے۔ تو کیا کوئی عاقل منصورؒ کے ''انا الحق'' کہنے سے یہ استدلال کر سکتا ہے کہ ظلی وبروزی الوہیت بندے کو بھی مل سکتی ہے، اور لا الہ الا اللہ کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کوئی مستقل خدا نہیں ہوسکتا؛ البتہ ظلی اور بروزی خدا ہوسکتا ہے؟ حاشا وکلاّ ! یہ صریح کفر اور ارتداد ہے۔

(۱) سکر کہتے ہیں: واردِ غیبی کے ظاہری اور باطنی احکام میں امتیاز کا اٹھ جانا۔ (التکشف: ص۲۸۱) (نعمان)

اسی طرح ''لا نبی بعدی'' میں یہ تاویل کرنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی مستقل نبی نہیں ہوسکتا؛ بلکہ ظلی اور بروزی نبی ہوسکتا ہے، یہ بھی صریح کفر اور ارتداد ہے۔

اسی سلسلے میں آج کل مرزائی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کا نام نامی لے رہے ہیں کہ معاذ اللہ! مولانا محمد قاسم صاحبؒ بھی خاتم الانبیاء کے بعد نئے نبی کا آنا جائز رکھتے ہیں۔ یہ مولاناؒ پر صریح بہتان اور افترا ہے۔ اس بارے میں حضرت مولاناؒ کا ''تحذیر الناس'' کے نام سے ایک مختصر رسالہ ہے، جو عجیب وغریب حقائق ومعارف اور نہایت دقیق اور عمیق علوم پر مشتمل ہے۔ ناظرین تو قصورِ فہم کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہوئے اور زائغین اور ملحدین نے لوگوں کو گم راہ کرنے کے لیے اس رسالے کی ناتمام عبارتیں، ما قبل اور ما بعد سے حذف کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیں، جس سے عوام اور سادہ لوح تردد اور تحیر میں پڑ گئے؛ اس لیے بہ تقاضائے اصلاح یہ ضروری سمجھا کہ مولانا محمد قاسمؒ کے کلام کا خلاصہ سلیس عبارت میں پیش کر دیا جائے، تاکہ لوگ غلط فہمی سے محفوظ ہو جائیں۔ فَأَقُوْلُ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقِ وَبِیَدِہٖ اِزْمَۃُ التَّحْقِیْقِ وَھُوَ الْھَادِيْ اِلٰی سَوَاءِ الطَّرِیْقِ.

خاتمیت کی قسمیں:

خاتمیت ایک جنس ہے، جس کی دو قسمیں ہیں: ایک زمانی اور دوسری رتبی۔

خاتمیت زمانیہ کے معنی یہ ہیں کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے اخیر زمانے میں تمام انبیا علیہم السلام کے بعد مبعوث ہوئے، اور اب آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔

اور خاتمیت رتبیہ کے معنے یہ ہیں کہ: نبوت ورسالت کے تمام کمالات اور مراتب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر ختم ہیں، اور نبوت چوں کہ کمالاتِ علمیہ میں سے ہے؛ اس لیے خاتم النبیین کے معنے یہ ہوں گے کہ جو علم کسی بشر کے لیے ممکن ہے، وہ آپ پر ختم ہوگیا، اور حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم دونوں اعتبار سے خاتم النبیین ہیں۔ زمانے کے اعتبار سے بھی آپ خاتم ہیں، اور مراتبِ نبوت اور کمالاتِ رسالت کے اعتبار سے بھی خاتم ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت فقط زمانی نہیں؛ بلکہ زمانی اور رتبی دونوں قسم کی خاتمیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے؛ اس لیے کمالِ مدح جب ہی ہوگی کہ جب دونوں قسم کی خاتمیت ثابت ہو۔

مولانا محمد قاسمؒ صاحب فرماتے ہیں کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت زمانیہ قرآن اور حدیث متواتر اور اجماعِ امت سے ثابت ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت زمانیہ کا منکر ایسا ہی کافر ہے، جیسا کہ

رکعاتِ نماز کا منکر کافر ہے۔ چناں چہ ''تحذیر الناس'' کے صفحہ ۱۰ پر تحریر فرماتے ہیں:

''سو اگر اطلاق اور عموم ہے، تب تو خاتمیت ظاہر ہے؛ ورنہ تسلیم لزوم خاتمیت زمانی بہ دلالت التزامی ضرور ثابت ہے، اور ادھر تصریحاتِ نبوی مثل:

''أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسَى؛ إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ''. أَوْكَمَا قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ''.

جو بہ ظاہر بہ طرزِ مذکور اسی لفظ خاتم النبیین سے ماخوذ ہے۔ اس باب میں کافی ہے؛ کیوں کہ یہ مضمون درجۂ تواتر کو پہنچ چکا ہے۔ پھر اس پر اجماع بھی منعقد ہوگیا۔ گو الفاظ مذکور بہ سند متواتر منقول نہ ہوں۔ سو یہ عدم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی یہاں ایسا ہی ہوگا، جیسا کہ تواتر اعداد رکعات فرائض وتر وغیرہ۔ باوجودے کہ الفاظ احادیث مشعر تعداد رکعات متواتر نہیں۔ جیسا کہ اس کا منکر کافر ہے۔ ایسا ہی اس کا منکر بھی کافر ہوگا''۔

اس عبارت میں اس امر کی صاف تصریح موجود ہے کہ خاتمیت زمانیہ کا منکر ایسا ہی کافر ہے، جیسا کہ تعداد رکعات کا منکر کافر ہے۔

مولانا مرحومؒ اس خاتمیت زمانیہ کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک اور معنی کر کے خاتمیت ثابت فرماتے ہیں، جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام اوّلین اور آخرین سے افضل واعلم ہونا ثابت ہوجائے۔ وہ یہ کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کمالاتِ نبوت کے منتہی اور خاتم ہیں، اور علوم اوّلین وآخرین کے معدن اور منبع ہیں۔ جس طرح تمام روشنیوں کا سلسلہ آفتاب پر ختم ہوتا ہے، اسی طرح تمام علوم اور کمالات کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوتا ہے۔

معاذ اللہ! مولانا مرحوم خاتمیت زمانیہ کے منکر نہیں؛ بلکہ خاتمیت زمانیہ کے منکر کو کافر سمجھتے ہیں؛ لیکن اس خاتمیت زمانیہ کی فضیلت کے علاوہ خاتمیت رتبیہ کی فضیلت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اوّلین اور آخرین پر فضیلت اور سیادت ثابت ہو، اور خاتمیت زمانیہ اور رتبیہ میں فرق یہ ہے کہ خاتمیت زمانیہ کے اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کا آنا شرعاً محال اور ناممکن ہے، اور خاتمیت رتبیہ کے اعتبار سے بہ فرضِ محال اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی مبعوث ہو، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت رتبیہ میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ بہرصورت آپ کمالات نبوت کے منتہی اور خاتم ہیں۔ آفتاب اگر تمام ستاروں سے پہلے طلوع کرے یا درمیان میں طلوع کرے، آفتاب کے منبع نور ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اسی طرح بالفرض اگر حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم پر

نورتمام انبیا علیہم السلام سے پہلے مبعوث ہوتے، یا درمیان میں مبعوث ہوتے، تو آپ کے منبع کمالات ہونے میں کوئی فرق نہ آتا، اور یہ فرض بھی محض احتمال عقلی کے درجے میں ہے؛ ورنہ جس طرح خاتمیت زمانیہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی کا آنا محال ہے۔ اسی طرح خاتمیت رتبیہ میں بھی آپ کے بعد نبی کا آنا محال ہے؛ اس لیے کہ اگر انبیائے متاخرین کا دین- دین محمدی کے مخالف ہوا، تو اعلیٰ کا ادنا سے منسوخ ہونا لازم آئے گا، جو حق تعالیٰ شانہ کے اس قول:

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا"(۱).

کے خلاف ہے۔ نیز جب علم ممکن للبشر آپ پر ختم ہو چکا، تو آپ کے بعد کسی نبی کا مبعوث ہونا بالکل عبث اور بے کار ہوگا۔ حاصل یہ نکلا کہ خاتمیت رتبیہ کے لیے خاتمیت زمانیہ بھی لازم ہے۔

مولانا مرحوم کے نزدیک اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی مبعوث ہونا شرعاً جائز ہوتا، تو لفظ ''بالفرض'' استعمال نہ فرماتے۔ مولاناؒ کا یہ فرمانا کہ: ''بالفرض اگر آپ کے بعد کوئی نبی'' الخ، یہ لفظ بالفرض خود اس کے محال ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ بات محال ہے، کسی طرح ممکن نہیں؛ لیکن اگر بہ فرض محال تھوڑی دیر کے لیے اس محال کو بھی تسلیم کر لیا جائے، تب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت رتبیہ اور آپ کی افضلیت اور سیادت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ ایسا ہے، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ:

''لَوْ كَانَ بَعْدِيْ نَبِيٌّ، لَكَانَ عُمَرُ''.

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا''۔

تو ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ نہیں کہ آپ کے بعد نبی کا آنا ممکن ہے؛ بلکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا۔ بہ فرض محال اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا۔ اس ارشاد سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت اور حضرت عمرؓ کی فضیلت ثابت کرنا مقصود ہے۔

اس کو اس طرح سمجھو کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اگر ایک چاند نہیں؛ بلکہ ہزار چاند ہوں، تب بھی ان سب کا نور آفتاب ہی سے مستفاد ہوگا، تو اس کا یہ مطلب نہیں: حقیقتاً ہزاروں چاند ہیں؛ بلکہ مقصود آفتاب کی فضیلت ثابت کرنا ہے کہ آفتاب تمام انوار اور شعاعوں کا ایسا خاتم اور منتہا ہے کہ اگر بالفرض ہزار چاند بھی ہوں، تو ان کا نور بھی اسی سے مستفاد ہوگا۔

(۱) سورۂ بقرہ:۱۰۶۔

اس ''بالفرض ہزار چاند'' کہنے سے آفتاب کی فضیلت دوبالا ہوجائے گی کہ آفتاب فقط اسی موجودہ قمر سے افضل نہیں؛ بلکہ اگر جنس قمر کے اور بھی ہزاروں افراد فرض کر لیے جائیں، تب بھی آفتاب ان سب سے افضل اور بہتر ہوگا۔ اسی طرح نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام افرادِ نبوت پر فضیلت اور برتری بتلانا مقصود ہے۔ خواہ وہ افراد ذہنی ہوں یا خارجی، محقق ہوں یا مقدر، ممکن ہوں یا محال، اور یہ کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سلسلۂ نبوت کے علی الاطلاق خاتم ہیں زماناً بھی اور رتبتاً بھی۔

مولاناؒ نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی کا آنا شرعاً جائز ہے، بلکہ یہی فرماتے ہیں کہ جو شخص اس امر کو جائز سمجھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی کا آنا شرعاً ممکن الوقوع ہے وہ کافر ہے اور قطعاً دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

چناں چہ مولانا محمد قاسمؒ مناظرۂ عجیبہ کے صفحہ ۳۹؍ پر لکھتے ہیں:

''خاتمیت زمانیہ اپنا دین وایمان ہے۔ ناحق کی تہمت کا البتہ کوئی علاج نہیں''۔

پھر اسی کتاب کے صفحہ ۱۰۳؍ پر لکھتے ہیں:

''امتناع بالغیر میں کسے کلام ہے؟ اپنا دین وایمان ہے کہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نبی ہونے کا احتمال نہیں، جو اس میں تامل کرے، اس کو کافر سمجھتا ہوں''۔

ناظرین باتمکین! مولانا محمد قاسمؒ کے ان عبارات اور تصریحات کے بعد خود انصاف کریں کہ کیا مولانا محمد قاسمؒ خاتمیت زمانی کے منکر ہیں؟ حاشا وکلا! وہ تو خاتمیتِ زمانیہ کے منکر کو کافر سمجھتے ہیں۔ اس خاتمیت زمانیہ کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک اور خاتمیت، یعنی خاتمیت رتبیہ ثابت کرتے ہیں۔ تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت وسیادت خوب واضح اور نمایاں ہوجائے [1]۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ، خَاتَمِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ، وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِيْنَ، وَعَلَيْنَا مَعَهُمْ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

---

(۱) (مضمون ماخوذ از): احتساب قادیانیت، ج، ص: ۱۳۸ تا ۱۴۳۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

اور

مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

مناظر اہل سنت حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ ✿

وجہِ تحریر:

اب سے ایک سال پہلے [1] میں پاکستان گیا تھا، اس وقت وہاں مختلف صحبتوں میں یہ بات سننے میں آئی تھی کہ دیوبند کے علمی اور دینی سلسلے سے تلمذ اور عقیدت کی نسبت رکھنے والے یہاں کے حضرات علما میں ایک نیا اختلاف ''مسئلۂ حیات النبی'' کے بارے میں پیدا ہوگیا ہے؛ لیکن جن لوگوں سے میں نے اس بارے وہاں کچھ سنا، وہ یا تو اصل حقیقت سے واقف نہ تھے، یا اپنے علم وفہم کی خاص سطح کی وجہ سے نقطۂ اختلاف کو صحیح طور پر سمجھے ہوئے نہ تھے؛ اس لیے ان کے بیانوں سے میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ اس اختلاف کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اور جن حضرات اہل علم کا اس نزاع کے فریق کے طور پر نام لیا جاتا تھا، اتفاق سے ان میں سے کسی سے بھی اس سفر میں ملاقات کی نوبت نہیں آئی؛ اس لیے اپنے ان بزرگوں اور دوستوں سے حسن ظن کی بنا پر میرا یہی خیال رہا کہ یہ اختلاف غالباً نزاعِ لفظی کے قبیل سے ہوگا۔

پھر پاکستان سے میری واپسی کے بعد مختلف اوقات میں اس سلسلے میں میرے پاس کچھ خطوط بھی آتے رہے، اور ان سے معلوم ہوتا رہا کہ یہ کش مکش برابر بڑھ رہی ہے، اور ایک نئے تفرقے کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔

✿ صاحب ''معارف الحدیث'')

(۱) یعنی ۱۹۵۷ء کے دسمبر کے مہینے میں، اور جب حضرت نعمانیؒ پاکستان میں تھے، تو دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کا ۵؍دسمبر ۱۹۵۷ء کو وصال ہوگیا تھا۔ حضرت نعمانیؒ نے پاکستان سے حضرت شیخ الاسلامؒ کے متعلق چند واقعات لکھ کر لکھنو روانہ کیے تھے، اور وہ ''الفرقان'' میں چھپے تھے۔ (نعمان)

اس سلسلے کے بعض خطوط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی کتاب ''آبِ حیات'' کا حوالہ دے کر جماعتِ دیوبند کا مسلک یہ بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر موت طبعی وارد ہی نہیں ہوئی؛ بلکہ آپ جس حیات کے ساتھ اس دنیا میں رونق افروز تھے، اسی حیات کے ساتھ قبر مبارک میں منتقل کردیے گئے۔ ان میں سے بعض خطوط میں یہ بھی تھا کہ بعض دوسرے اہل علم اس مسئلے کی وجہ سے علمائے دیوبند پر سخت طعن وتشنیع کررہے ہیں، اور مجھ سے اصرار کیا گیا تھا کہ اس بارے میں جو کچھ میں صحیح سمجھتا ہوں، اس کو ''الفرقان'' میں لکھوں۔

پھر گزشتہ مہینے (اکتوبر ۱۹۵۸ء میں) رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی پاکستان سے تشریف لائے، تو انہوں نے بھی بتلایا کہ: یہ اختلاف ونزاع وہاں ایک اچھا خاصا فتنہ بنتا جارہا ہے، اور اس کے اور بڑھنے کا خطرہ ہے، اور اسی بنا پر انہوں نے مجھے مشورہ دیا؛ بلکہ اصرار سے فرمایا کہ: اس بارے میں کچھ لکھنا ضروری ہے۔ الغرض یہی باتیں ان سطور کے لکھنے کی محرک ہوئی ہیں۔

دینی اور تاریخی حقائق:

میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، اس کی حیثیت ہرگز کسی فیصلے اور محاکے کی نہیں ہے۔ مجھے تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ واقعہ میں اصل نقطۂ اختلاف کیا ہے؟ بہر حال! جو کچھ اس مسئلے میں میں سمجھے ہوئے ہوں اور جو کچھ میرے نزدیک حق ہے اور ہمارے اکابر کا مسلک ہے، وہ میں عرض کرتا ہوں۔ پہلے چند مسلمہ دینی اور تاریخی حقیقتیں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

۱- سب جانتے اور مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تریسٹھ سال (چالیس سال نبوت سے پہلے اور تیئیس سال نبوت کے بعد) عالم ناسوت میں قیام فرما کر ہجرت سے ٹھیک دس سال بعد ربیع الاوّل کے مہینے میں ''كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ''، اور ''كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ'' کے عام قانون کے مطابق داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اور رفیق اعلیٰ سے واصل ہوگئے۔ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وبارک وسلم)

۲- بہت سے صحابۂ کرامؓ پر اس صدمے کا ایسا اثر پڑا کہ ہوش وحواس بجا نہ رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حال تو اس وقت یہ ہوگیا کہ قسم کھا کھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے انکار کرتے تھے، اور بعض روایات میں ہے کہ اس وقت اس معاملے میں ان کی شدت کا یہ عالم تھا کہ کہتے تھے کہ جو کوئی کہے گا کہ حضور کی وفات ہوگئی، میں تلوار سے اس کا سر قلم کردوں گا۔

۳- جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی قیام گاہ ''سُنح'' سے تشریف لائے، (جہاں حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کی اجازت سے کچھ دیر پہلے چلے گئے تھے) اور آپ نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ لوگوں کے سامنے اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں، تو اپنے کو سنبھال کے اور سب لوگوں کو جمع کر کے مسجدِ نبوی میں خطبہ دیا، جس میں پوری صدیقی شان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا واشگاف اعلان کرتے ہوئے آپ نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا:

"مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا؛ فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ، وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ اللّٰهَ؛ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ".

"تم میں سے جو کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبادت کرتا تھا، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تو رحلت کر گئے، اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا، تو بے شک اللہ تعالیٰ زندہ ہے، اسے کبھی موت نہیں آئے گی"۔

اور اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی یہ آیت بھی تلاوت فرمائی:

"وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰىٓ أَعْقَابِكُمْ، وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَّسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ"(۱)۔

"اور محمد تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے، یا وہ دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو جائیں، تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی الٹے پاؤں پھرے گا، تو وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، اور شکر کرنے والے بندوں کو اللہ تعالیٰ یقیناً اچھا بدلہ دے گا"۔

اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے متعلق قرآن مجید کی چند اور آیتیں بھی تلاوت فرمائیں۔

بہرحال! آپ کے اس خطبے کے بعد صحابۂ کرامؓ اس مسئلے میں یک سو ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی غلطی محسوس کر لی اور اگلے دن مجمعِ عام میں اس کا اعلان بھی کر دیا۔

۴- پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال ہی کی بنیاد پر خلافت و امامت کا مسئلہ اٹھا اور آخر کار سقیفۂ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آپ کا خلیفہ منتخب کیا گیا اور بیعت ہوئی۔

۵- پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے پہنے ہوئے کپڑوں ہی میں غسل دیا گیا، پھر کفن پہنایا گیا۔

(۱) سورۂ آل عمران: ۱۴۴۔

٦- پھر صحابۂ کرامؓ نے ایک خاص طریقے اور ترتیب سے آپ کی نماز جنازہ پڑھی، یعنی اس طرح کہ چند چند صحابۂ کرامؓ (بعض روایات کے مطابق دس دس) کی جماعتیں حجرۂ مبارک میں داخل ہوتی تھیں اور بغیر کسی کو امام بنائے نماز جنازہ پڑھ کر باہر آجاتی تھیں۔ اسی طرح تمام صحابۂ کرامؓ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھی، (اور ابن سعد وغیرہ کی ایک رویات کے مطابق حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کسی کو امام نہ بنانے کی وجہ یہ بتائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے زندگی میں امام تھے، اسی طرح بعد وفات بھی امام ہیں:

"هُوَ اِمَامُنَا حَيًّا وَّمَيِّتًا".

بہر حال! یہ مسلّم ہے کہ آپ کی نماز جنازہ صحابۂ کرامؓ نے بغیر کسی امام کے پڑھی۔

٧- آپ کا وصال دوشنبہ (پیر) کے دن چاشت کے وقت ہوا تھا۔ اس دن، اس کے بعد کی رات اور سہ شنبہ (منگل) کا پورا دن جنازہ اسی طرح حجرۂ شریف میں رکھا رہا، اور لوگوں کی ٹولیاں باری باری نماز جنازہ ادا کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ شب چہارشنبہ میں آپ کو اسی حجرۂ مقدسہ میں دفن کر دیا گیا۔

یہ سب وہ مسلم دینی اور تاریخی حقائق وواقعات ہیں، جو حدیث وسیر کی کتابوں میں عام طور سے مذکور ہیں۔ اسی لیے میں نے کسی کتاب کا حوالہ دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کسی بات سے بھی کسی صحیح العقیدہ صاحب علم کو انکار یا اختلاف نہ ہوگا۔

٨- اسی طرح کسی صاحب علم پر یہ بھی مخفی نہیں ہوسکتا کہ قرآن مجید میں ان بندگانِ خدا کو جو راہِ حق میں قتل کیے گئے، اور دشمنانِ حق نے بہ ظاہر جن کو موت کے گھاٹ اتار دیا "احیاء" یعنی زندہ کہا گیا ہے، اور فرمایا گیا ہے کہ "وہ اپنے رب کے پاس شاداں وفرحاں ہیں، اور ان کو وہاں انواع واقسام کا رزق اور طرح طرح کی نعمتیں مل رہی ہیں"۔

٩- اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حضراتِ انبیا علیہم السلام بہر حال! ان سے افضل ہیں اور بدرجہا افضل ہیں، یقیناً ان کا انجام اور مقام ان شہدائے کرام سے خوش تر اور بلند ہی ہونا چاہیے، اور اسی لیے اس دنیا سے جانے کے بعد ان کی حیات شہدا کی حیات سے اعلیٰ اور اقویٰ ہی ہونی چاہیے(١)۔

---

(١) حافظ ابن القیمؒ نے "کتاب الروح" میں قرطبیؒ کے حوالے سے ان کے شیخ احمد ابن عمروؒ کا ایک قول نقل کیا ہے، جس کی دو تین سطریں یہ ہیں:

"اِنَّ الشُّهَدَاءَ بَعْدَ قَتْلِهِمْ وَمَوْتِهِمْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ مُسْتَبْشِرِيْنَ، وَهٰذِهِ صِفَةُ الْأَحْيَاءِ فِي الدُّنْيَا وَإِذَا كَانَ هٰذَا فِي الشُّهَدَاءِ، كَانَ الْأَنْبِيَاءُ بِذَالِكَ أَحَقُّ وَأَوْلٰى". (مَنْظُوْر النُّعْمَانِيْ)

۱۰- اور نصِّ قرآنی کے اسی ''اشارے'' اور اسی ''اقتضا'' کی وضاحت ان احادیث سے ہوتی ہے، جو کتبِ حدیث میں انبیاعلیہم السلام کی حیات کے بارے میں روایت کی گئی ہیں۔ جہاں تک اس ناچیز کو علم ہے، ان حدیثوں کو سب سے پہلے امام بیہقیؒ نے ایک مستقل رسالے میں جمع کیا ہے، پھر اس رسالے کے قریب قریب پورے مواد کو ساتویں اور آٹھویں صدی کے جلیل القدر محدث وفقیہ شیخ تقی الدین سبکیؒ نے اپنی کتاب ''شفاء السقام'' میں نقل کر دیا ہے، اور متاخرین حفاظِ حدیث میں سے علامہ سیوطیؒ نے بھی اس مسئلے پر مستقل رسالہ لکھا ہے، جس میں اس موضوع سے متعلق حسب عادت ہر طرح کی روایات کو جمع کر دیا ہے۔ ''زرقانی شرح مواہب'' میں بھی یہ حدیثیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ان سب احادیث اور روایات سے مجموعی طور پر یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح اس دنیا سے جانے کے بعد شہدا کو ایک خاص طرح کی حیات حاصل ہو جاتی ہے، جس میں وہ دوسرے مؤمنین سے ممتاز ہیں اور جس کی بنا پر قرآن مجید میں ان کو ''احیاء'' کہا گیا ہے، اسی طرح حضرات انبیاعلیہم السلام کو ایک خاص الخاص حیات اس دنیا سے منتقل ہونے کے بعد حاصل ہو جاتی ہے، اور وہ تمام انبیاعلیہم السلام کو اور خاص کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے(۱)۔

(۱) علامہ ابن القیمؒ نے قرطبیؒ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ: ان کے شیخ احمد ابن عمرؒ حیات انبیا کے سلسلے کی ان حدیثوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے تھے کہ:

''یَحْصُلُ مِنْ جُمْلَتِهِ الْقَطْعُ بِأَنَّ مَوْتَ الْأَنْبِيَاءِ إِنَّمَا هُوَ رَاجِعٌ إِلَى أَنْ غُيِّبُوْا عَنَّا بِحَيْثُ لَا نُدْرِكُهُمْ.''
(کتاب الروح، ص: ۵۴)

اس سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ مسئلے میں اس طرح خیال کرنے والوں میں صرف زرقانیؒ، ابن حجرؒ، سیوطیؒ اور شیخ عبدالحق دہلویؒ جیسے حضرات ہی نہیں ہیں؛ بلکہ اس فہرست میں ان سے بہت پہلے ابوعبداللہ قرطبیؒ اور شیخ احمد ابن عمرؒ کے نام بھی اس فہرست میں ہیں؛ لیکن ان حضرات کی ایسی عبارتوں کا یہ مطلب قرار دینا کہ انبیاعلیہم السلام پر موت وارد ہی نہیں ہوئی اور ان کو اپنی قبروں میں بعینہٖ دنیا والی ناسوتی حیات حاصل ہے، ایسا سمجھنے والوں کی خوش فہمی کے علاوہ ان بزرگوں پر تہمت بھی ہے۔ اسی طرح ہمارے بعض بزرگوں کی تحریروں میں مثلاً: ''التصدیقات'' میں انبیاعلیہم السلام کی قبر والی حالت کو جو 'حیاتِ دنیویہ'' کہا گیا ہے، تو اس کا بھی ہرگز یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ وہ حیات دنیا کی سی ہے، یعنی مع الجسد ہے۔ صرف برزخی روحانی نہیں ہے، جو تمام مؤمنین کو بھی حاصل ہے، جن کے اجسام مٹی ہو چکے ہیں۔ ''التصدیقات'' کے اردو ترجمے ہی میں غور کرنے سے یہ مطلب خود واضح ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان بزرگوں کی ایسی عبارتوں کا یہ مطلب بیان کرنا اور ان کا یہ مسلک بتانا کہ انبیاعلیہم السلام پر موت وارد ہی نہیں ہوئی اور قبروں میں وہ بعینہٖ دنیا والی ناسوتی حیات کے ساتھ موجود ہیں، صریحاً ان پر یہ الزام لگانا ہے کہ اس مسئلے میں ان کی رائے قرآن وحدیث کے صریح نصوص و بینات اور اجماع صحابہؓ اور اجماع امت کے خلاف ہے۔ میں نہیں یقین کرتا کہ ہمارے علما میں سے کسی نے ایسی لغویات کہی ہوں۔ سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ! (منظور)

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا، (جس سے غالباً کسی صاحب علم کو بھی اختلاف نہ ہوگا) اس سے لازمی نتیجے کے طور پر دو باتیں ثابت ہو جاتی ہیں:

ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ناسوتی کا جو سلسلہ پیدائش سے لے کر تریسٹھ سال کی عمر شریف تک جاری رہا تھا، وہ تو وفات کے دن ختم ہو گیا، اور "كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ" کے قانونِ عام کے مطابق آپ پر وہ کیفیت وارد ہوئی، اور آپ اس منزل سے گزرے، جس کی تعبیر موت کے لفظ سے کی جاتی ہے۔ آپ کی اس رحلت کو صحابۂ کرامؓ نے موت ہی کہا اور موت ہی سمجھا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ کو (کسی وقتی غلط فہمی یا غلبۂ حال کی وجہ سے) اس کے ماننے میں ابتداً جو تامل اور تردد تھا، وہ بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خطبے کے بعد ختم ہو گیا، اور آخر الامر تمام صحابۂ کرامؓ کا اس پر اجماع ہو گیا کہ آپ کی ناسوتی حیات کا خاتمہ ہو چکا اور آپ پر موت وارد ہو چکی، اور قرآن حکیم کی بات: "اِنَّكَ مَيِّتٌ وَاِنَّهُمْ مَيِّتُوْنَ" پوری ہو گئی، اور پھر اسی بنا پر آپ کو آخری غسل دیا گیا، موت کے بعد والا لباس، یعنی کفن پہنایا گیا، قبر میں دفن کیا گیا، (حال آں کہ اگر کسی آدمی میں ناسوتی حیات کا شائبہ؛ بلکہ شبہ بھی ہو، اور اس کی موت کا پورا یقین نہ ہو چکا ہو، تو اس کو دفن کر دینا شدید ترین شقاوت اور قطعاً حرام ہے، اور کسی پیغمبر کے ساتھ شقاوت وظلم کا یہ معاملہ کرنا تو صرف حرام ہی نہیں؛ بلکہ سخت ترین اور خبیث ترین کفر ہے)۔

اور دوسری بات مذکورہ بالا دینی اور تاریخی حقائق وواقعات سے یہ معلوم ہوئی کہ صحابۂ کرامؓ نے آپ کی وفات کو بالکل دوسرے آدمیوں کی سی موت نہیں سمجھا؛ بلکہ اس کی نوعیت عام انسانوں سے کچھ مختلف سمجھی؛ اسی لیے آپ کو آخری غسل پہنے ہوئے کپڑوں میں دیا گیا۔ کرتا تک جسم اطہر سے نہیں اتارا گیا۔ نماز جنازہ بھی عام اموات مسلمین کی طرح نہیں پڑھی گئی؛ بلکہ دوسرے طریقے سے پڑھی گئی؛ (بلکہ بعض روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ: معروف نماز جنازہ کے بہ جائے، صرف صلاۃ وسلام عرض کیا گیا، اور آپ کے احسانات کے اعتراف کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے آپ کے لیے بس دعا کی گئی)، اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ مُردوں کے دفن کرنے کے بارے میں تاخیر نہ کرنے کا شریعت کا جو عام تاکیدی حکم ہے، اس کے بالکل برخلاف قریباً پورے دو دن گزر جانے کے بعد دفن کیا گیا، اور اس غیر معمولی تاخیر میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا، اور کوئی اندیشہ نہیں محسوس کیا گیا، اور کسی ایک صحابی نے بھی اس معاملے میں جلدی کرنے کا تقاضا نہیں کیا۔ پھر آپ کی ایک خاص ہدایت کے مطابق آپ کی زندگی کے عزیز مسکن، یعنی حضرت صدیقہؓ کے اسی حجرے ہی کو آپ کا مدفن اور آپ کی دائمی آرام گاہ بنا دیا گیا اور آپ اسی میں دفن کیے گئے۔

اسی طرح آپ کی ایک ہدایت کے مطابق آپ کی املاک میں ترکہ اور وراثت کا عام قانون جاری نہیں کیا؛ بلکہ آپ کی حیاتِ طیبہ میں ان کا جو مصرف اور نظام تھا، وہی یہ دستور قائم رکھا گیا، اور وہ خلافت کی تولیت میں رہیں۔

اسی طرح آپ کی ازواج مطہراتؓ کا یہ حق سمجھا گیا کہ وہ اپنے مسکونہ حجروں کو تازیست اپنے استعمال میں رکھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے املاک سے اپنا نفقہ تا حیات حاصل کرتی رہیں، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کو یہ دونوں حق حاصل تھے۔ حال آں کہ کسی مسلمان کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ بیوی کے یہ حقوق صرف عدت کی مختصر مدت تک رہتے ہیں۔

ان سب استثنائی اور اختصاصی احکام و معاملات سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی نوعیت دوسرے تمام لوگوں کی موت سے بہت کچھ مختلف ہے، اور میں نہیں سمجھتا کہ اتنی بات سے ہمارے حلقے کے کسی صاحب علم کو اختلاف ہوگا۔

اسی طرح بعض احادیث سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، نیز دیگر انبیا علیہم السلام کو اپنے مدفنوں میں ایک خاص قسم کی حیات حاصل ہے، (جو اس عالم کے مناسب ہے اور بعض حیثیات سے دنیا والی ناسوتی[1] حیات سے بھی اعلیٰ واقویٰ ہے) غالباً اس سے بھی کسی صاحب علم کو اختلاف نہ ہوگا۔ ہاں! اس کے آگے موت و حیات کی نوعیت کی تعیین اور تفصیلات میں کچھ اختلاف ہوسکتا ہے، اور اس کی گنجائش بھی ہے، اور ایسے اختلافات سے خود اہل سنت میں؛ بلکہ اہل سنت کے ایک ایک حلقے میں بھی ہمیشہ رہے ہیں، ان کو اہمیت دینا اور ان باتوں کا باعث تفرقہ بننا بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔

آبِ حیات کی اہمیت:

اس کے بعد چند کلمات میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے ''آب حیات'' کے مضمون کے متعلق عرض کرتا ہوں۔

جن حضرات نے حضرت نانوتویؒ کی تصنیفات اور مکاتیب کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ آپ کی

(۱) اس تحریر میں ''حیات ناسوتی'' سے ہر جگہ میری مراد: وہ حیات ہے، جس کے لوازم اور خصائص اس متغیر مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں، اور دنیا اسی کا سلسلہ ختم ہوجانے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست وہ استفادہ کوئی نہیں کرسکتا، جو آپ کی اس ناسوتی حیات میں ہر شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر کرسکتا ہے۔ (منظور)

اکثر تحریریں اردو زبان میں ہونے کے باوجود مضامین کے لحاظ سے اتنی مشکل اور ادق ہیں کہ آج کل کے ہمارے اصحابِ درس علما میں بھی شاذ و نادر ہی ایسے نکلیں گے، جو ان کو پوری طرح سمجھ سکیں، اور اس ناچیز کے خیال میں آپ کی تصنیفات میں سب سے مشکل اور دقیق ترین یہی ''آبِ حیات'' ہے۔

درس نظامی کے جملہ فنون میں سب سے مشکل منطق، فلسفہ اور کلام سمجھے جاتے ہیں، اور ان فنون کی درسی کتابوں میں سب سے مشکل ہمارے درسی حلقوں میں قاضی، حمد اللہ، صدرا اور خیالی کو سمجھا جاتا ہے۔ اس عاجز نے یہ کتابیں پڑھی بھی ہیں اور ان میں جو مشکل ترین ہیں، وہ مدرسی کے زمانے میں پڑھائی بھی ہیں۔ میں خود اپنا تجربہ عرض کرتا ہوں کہ: ان میں سے کسی کتاب کے سمجھنے میں مجھے اتنی مشکل پیش نہیں آئی، جتنی کہ ''آبِ حیات'' کے سمجھنے میں پیش آئی تھی۔ میں نے ''آبِ حیات'' کا مطالعہ پہلی دفعہ اپنی عرفی طالب علمی کے آخری دور میں اس وقت کیا تھا، جب کہ منطق و فلسفے اور کلام کی سب درسی کتابیں میں پڑھ چکا تھا، اور ان فنون کے وہ مباحث مجھے خوب مستحضر تھے، جن کے استحضار کے بغیر ''آبِ حیات'' کو نہیں سمجھا جا سکتا؛ لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت بھی میرا احساس یہی تھا کہ میں نے ساری عمر میں جو کتابیں دیکھی یا پڑھی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشکل اور صعب الفہم یہی کتاب ہے۔ اپنے اس ذاتی تجربے کی بنا پر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ہمارے حلقے کے علما میں بھی ''آبِ حیات'' کو پوری طرح سمجھنے والے ہند و پاک کے طول و عرض میں اب گنتی کے چند ہی ہوں گے(۱)، اور بغیر کسی تکلف اور انکسار کے عرض کرتا ہوں کہ:

(۱) مجھے اپنی اس رائے پر مزید اطمینان اپنے مکرم و محترم مولانا قاری محمد طیب صاحب، زِید مجدہم سے ابھی حال میں یہ سن کر ہوا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ، سابق مہتمم دار العلوم دیوبند نے اپنے اخیر دورِ حیات میں ایک دن ان سے فرمایا کہ: میرا جی چاہتا ہے کہ میں تم کو آبِ حیات پڑھا دوں؛ لیکن مجھے اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہوگا؛ اس لیے تم اس کا ایک نسخہ لا کر میرے سرہانے رکھ دو، میں رات کو مطالعہ کر لیا کروں گا۔ قاری صاحب کا بیان ہے کہ: میں نے نسخہ لا کر رکھ دیا؛ لیکن پھر یا تو مطالعہ کا وقت نہیں مل سکا، یا کوئی اور وجہ پیش آ گئی کہ اس پڑھنے پڑھانے کی نوبت نہ آ سکی۔ یہاں تک کہ حضرت مولانا مرحوم کا وقت موعود آ گیا اور یہ کام رہ ہی گیا۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آبِ حیات کس قسم کی کتاب ہے کہ مولانا محمد طیب صاحب جیسے ذکی عالم کو بھی اس کے پڑھنے کی ضرورت تھی، اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم جیسے راسخ العلم اس کے پڑھانے کے لیے پہلے مطالعہ کر لینا ضروری سمجھتے تھے۔ پھر جب کل ۷/نومبر (۱۹۵۸ء) کو اس ناچیز نے اپنی یہ تحریر سہارن پور میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہم العالی کو سنائی، تو دو واقعے حضرت ممدوح نے بھی اس کی تائید میں سنائے:

ایک یہ کہ: حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا جب وصال ہوا، تو حضرت شیخ الہندؒ نے منطق و فلسفے کی کتابیں پڑھانی چھوڑ دیں، حال آں کہ پہلے پڑھایا کرتے تھے، جب بہت اصرار کیا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ: ان کتابوں کو ہم صرف اس لیے پڑھایا کرتے تھے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی باتیں سمجھنے میں ان سے مدد ملتی تھی، اب جب وہی نہیں رہے، تو کیوں ہم خواہ مخواہ ان کتابوں پر مغز ماریں؟

دوسرا واقعہ اسی سلسلے کا یہ سنایا کہ: حضرت شیخ الہندؒ کے تدریسی دور میں بار ہا یہ طے ہوا، اور اس کا منصوبہ بنا کہ حضرتؒ کے خاص تلامذہ حضرت مدنیؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ وغیرہ (جب کہ ان حضرات کے پڑھانے کا زمانہ تھا) حضرت نانوتویؒ کی تصانیف حضرت شیخ الہندؒ سے سبقاً سبقاً پڑھیں؛ لیکن اس کی نوبت غالباً نہیں آئی۔

بہر حال! جن حضرات نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشکل تصانیف ''آبِ حیات'' وغیرہ خود نہیں دیکھی، وہ ان واقعات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کی کتابیں ہیں، اور اردو خواں عوام تو عوام، آج کل علما میں بھی کتنے ہیں، جو ان کو سمجھ سکتے ہیں؟۔ (منظور)

اب میں بھی ان میں سے نہیں ہوں؛ کیوں کہ اس کے سمجھنے کے لیے منطق وفلسفہ اور کلام کے جو مباحث مستحضر ہونے چاہئیں، وہ اب مجھے مستحضر نہیں رہے ہیں۔

تاہم چوں کہ ایک دفعہ اس کو سمجھ کر مطالعہ کیا تھا؛ اس لیے اس کا حاصل ومدعا اور مرکزی مضمون الحمدللہ! اب تک ذہن میں ہے۔ پھر ان سطروں کے لکھنے سے پہلے بھی میں نے اس پوری کتاب کا ایک سرسری مطالعہ حال ہی میں کیا ہے، اور میں علی وجہ البصیرت یہ کہنے کا اپنے کو حق دار سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات وممات کے بارے میں اس میں کوئی بات بھی جمہور امت اور اہل سنت کے ان تمام دینی اور تاریخی مسلمات اور معتقدات کے خلاف نہیں ہے، جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے؛ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور حیات بعد الممات کی خاص نوعیت کی تحقیق اور تعیین میں حضرت نانوتویؒ نے اپنے خاص طرز پر ایک نہایت دقیق وعمیق کلام کیا ہے، (اور اسی کے ساتھ دجال کی حیات وممات کی خاص نوعیت کے بارے میں بھی اسی طرز پر کچھ کلام کیا ہے)، اور بلاشبہ یہ تحقیق اتنی دقیق ہے کہ عوام کے علاوہ اوساط کے فہم سے بھی بالاتر ہے۔ پس اس کو عوامی مسئلہ بنانا از قبیل اتباع متشابہات اور غریب عوام کو فتنے میں ڈالنا ہے۔ وہ بے چارے اصل حقیقت کو تو سمجھ نہ سکیں گے، پھر یا تو کچھ کا کچھ سمجھ کے اندھی عقیدت میں اسی کو اپنا عقیدہ بنا کے گم راہ ہوں گے، یا حضرت نانوتویؒ پر گم راہی اور بد اعتقادی کے فتوے لگائیں گے۔ ہمارے علمائے کرام کو لِلّٰہ سوچنا چاہیے کہ اس سارے ضلال وفساد کا ذمے دار عند اللہ کون ہوگا؟

دیوبندیت کیا ہے؟

آخر میں چند کلمات ''دیوبندی مسلک ومشرب'' کے بارے میں بھی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

ظاہر ہے کہ ہمارے اکابر واساتذہ حضرات علمائے دیوبند کا کوئی الگ اعتقادی یا فقہی مکتب فکر نہیں ہے۔ عقائد میں ہم اہل سنت وجماعت کے طریقے پر اور فقہ میں حنفی ہیں؛ البتہ احناف اہل سنت میں ہمارے اکابر کا ایک خاص رنگ ہے، بس اسی کی تعبیر ''دیوبندیت'' سے کی جاتی ہے، اور وہ رنگ مندرجۂ ذیل خصوصیات کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے:

۱- فقہ حنفی پر اطمینان اور اس کے مطابق فتوے اور عمل کے ساتھ حدیث وسنت سے خاص تعلق وشغف، نیز دوسرے ائمۂ مجتہدین اور اسی طرح حضرات محدثین کا ادب واحترام اور دل میں ان سب کی عظمت ومحبت۔

۲- اس فقہی اور علمی خصوصیت کے ساتھ حضرات صوفیائے کرام کی ''نسبت'' کی طلب وتحصیل، یا کم از کم دل میں ان کی عظمت ومحبت۔

۳- اس سب کے ساتھ اتباعِ سنت اور شرک و بدعت سے نفرت اور اس معاملے میں ایک خاص صلابت وحمیت۔

۴- اور پھر اس سب کے ساتھ اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ اور اس راہ میں مر مٹنے کا شوق۔

پس ''دیوبندیت'' دراصل اس خاص رنگ کا عنوان ہے، جو ان عناصرِ اربعہ کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے اس سلسلے کے اکابر واساطین مثلاً: حضرت نانوتوی وحضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہما اور ان کے خواص تلامذہ اور مسترشدین ان چیزوں کی جامعیت ہی میں ممتاز تھے؛ ورنہ یہ خصوصیات جدا جدا دوسرے حلقوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

میں یہ بھی عرض کردوں کہ: ''دیوبندیت'' کی یہ تحقیق اور اس کا یہ تجزیہ ایک صحبت میں اس عاجز نے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم سے سنا تھا، اس کے بعد سے جب اور جتنا اس پر غور کیا، اتنا ہی اس کو صحیح اور واقع کے مطابق پایا(۱)۔

بہر حال! طریقِ اہل سنت اور فقہ حنفی سے وابستگی کے بعد یہ ہے، وہ خاص رنگ یا مشرب، جس کا عنوان ''دیوبندیت'' ہے۔ پس جو ہم میں سے جتنا اس رنگ میں کامل یا ناقص ہے، اتنا ہی وہ ''دیوبندیت'' میں کامل یا ناقص ہے(۲)۔

---

(۱) یہاں ایک بات سمجھنے کی ہے۔ حضرت نعمانیؒ نے یہ بات حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے سمجھی، جو ایک ''عظیم دیوبندی'' تھے، اور جس زمانے میں سمجھی یہ وہ دور تھا، جب حضرت سندھی علیہ الرحمہ جلاوطنی کی زندگی گزار کر واپس ہندوستان تشریف لے آئے تھے۔ حضرت سندھیؒ کے متعلق ہماری جماعت کے بعض اہل علم غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ ایک لکھاری نے تو حضرت نعمانیؒ کو حضرت سندھیؒ کا مخالف اور دشمن ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کے حربے استعمال کر کے اپنے اعمال برباد کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

(۲) ماخوذ از): ماہ نامہ الفرقان لکھنو، ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ/ اکتوبر ۱۹۵۸ء/ص: ۲۷/تا ۳۷۔

حضرت مولانا نانوتویؒ کی ''آبِ حیات''

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ

ذیل کا مکتوب حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دار العلوم دیوبند نے جناب احسان الحق صاحب قریشی، پرنسپل گورنمنٹ کمرشل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ سیالکوٹ کے نام (قریشی صاحب کے ایک خط کے جواب میں) لکھا تھا۔ قریشی صاحب نے اپنے خط میں حضرت حکیم الاسلامؒ سے استفسار کیا تھا کہ: آیا کتاب ''آب حیات'' مصنفہ حضرت نانوتویؒ عام علما کی دسترس سے باہر ہے؟ جیسا کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ مدیر ''الفرقان'' لکھنؤ نے اپنے مضمون میں رائے ظاہر کی ہے، (حضرت نعمانیؒ کا یہ مضمون گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے)، حضرت قاری صاحبؒ کا یہ مکتوب پر از معلومات ہے۔ اسے پڑھیے اور اپنے ذہن اور عقیدے کو درست کیجیے۔

حضرت المحترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون نیاز مقرون!

گرامی نامہ باعث شرف ہوا۔ میں اسی وقت گجرات، بمبئی، مدراس، مالا بار، بنگلور کے طویل سفر کے لیے تیار تھا، وقت نہ تھا کہ دیوبند سے عریضہ ارسال کرسکوں؛ اس لیے یہ گرامی نامہ سفر میں ساتھ رکھ لیا کہ راستے میں جواب عرض کرسکوں گا۔ سفر میں بھی مصروفیت کار بڑھتی رہی۔ آج میل وشارم میں قدرے فرصت ملی، تو قلم لے کر بیٹھا اور جو کچھ ذہن نارسا میں آیا، اسے صفحۂ قرطاس پر اتارا، جس کے پیش کرنے کی جرأت کرر ہا ہوں۔ تاخیر جواب کی معافی چاہتا ہوں۔

''آبِ حیات'' کے سلسلے میں ''الفرقان'' کے مضمون کا اقتباس پہلی ہی دفعہ نظر سے گزرا۔ واقعے کی حد تک بات صحیح ہے؛ لیکن لوگوں کا اسے مسئلۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نفی یا معنوی تحریف کے لیے آڑ بنانا غلط ہے۔ ''الفرقان'' کے اقتباس کا حاصل یہ ہے کہ ''آب حیات'' مشکل اور دقیق کتاب ہے؛ لیکن جو کتاب مشکل ہو، اس کا مضمون نا قابل قبول، یا قابل انکار بھی ہوا کرے، بالکل انوکھی منطق ہے۔ صوفیا اور

عرفائے اسلام کی دقیق المضامین کتابیں، جو ان کی اصطلاحی تعبیرات میں لکھی گئی ہیں، یا معقولات کی بہت سی دقیق التعبیر کتابیں، جو درسوں میں پڑھائی جاتی ہیں، اس اصول پر قابل انکار ہی نہیں؛ بلکہ غلط اور مہمل ٹھہر جائیں گی۔ خود حضرت نانوتویؒ کی دوسری محققانہ کتابیں مثل ''تقریر دل پذیر''، ''انتصار الاسلام''، ''حدیث العلماء''، ''عصمت انبیا''، ''قبلہ نما'' وغیرہ، جو توحید و رسالت، معصومیت انبیا، مبدا و معاد اور نبوّات کے حقائق پر مشتمل ہیں، کیا ان کے مسائل توحید و رسالت وغیرہ کا انکار، یا ان میں تأمل اس وجہ سے فائز ہو جائے گا کہ ان کتابوں کی تعبیر دقیق اور خالص علمی اور عرفانی ہے؟ جو عوام الناس یا عوام علما کی دسترس سے باہر ہے؟

بہر حال! مسئلۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار، یا اضمحلال کے جواز کے لیے ''آبِ حیات'' کے دقت وغموض کو پیش کیا جانا، یا اسے حیلہ بنانا بہت ہی عجیب سی بات ہے، جو فہم سے بالاتر ہے۔ پھر اگر عقیدۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد ہی ''آب حیات'' پر ہوتی، تب بھی اس کی دقت تعبیر کے حیلے سے کہنے سننے کی کچھ گنجائش ہوتی؛ لیکن کون نہیں جانتا کہ اس مسئلے کی بنیاد ''آبِ حیات'' نہیں؛ بلکہ کتاب وسنت کی نصوص اور امت کا اجماع ہے۔ ''آب حیات'' لکھی جاتی، یا نہ لکھی جاتی، مجھ جیسا نالائق اسے درساً درساً پڑھے بغیر سمجھ سکتا یا نہ سمجھ سکتا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ اس پر قابو پا سکتے یا نہ پا سکتے، مسئلۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ حق اور واجب القبول تھا۔ خود حضرت نانوتوی قدس سرہٗ بھی تو آخر ''آبِ حیات'' لکھنے سے پیش تر یہی عقیدہ رکھتے تھے، جو انہوں نے اپنے مشائخ سے ورثے میں پایا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ عیہ وسلم برزخ میں حیاتِ جسمانی دنیوی کے ساتھ زندہ ہیں، اس کے اثبات کے لیے انہوں نے ''آب حیات'' جیسی قیمتی کتاب لکھی۔ نہ یہ کہ ''آبِ حیات'' لکھنے کے دوران میں اتفاق سے یہ عقیدہ سخن گسترانہ انداز سے ذہن میں منضبط ہو گیا اور حضرتؒ نے اسے بہ طور ایک علمی نظریے کے قبول کر کے عقیدہ بنالیا۔

بہر حال! ''آبِ حیات'' عقیدۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد نہیں، اور نہ ہی کسی بڑے سے بڑے عالم کا کلام کسی دینی عقیدے کی بنیاد بن سکتا ہے؛ بلکہ ''آبِ حیات'' اس ثابت بالکتاب والسنۃ عقیدے کے عقلی وعرفانی دلائل اور متعلقہ حقائق ومعارف کا مجموعہ ہے، جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے برزخ میں حیاتِ جسمانی دنیوی کے ساتھ زندہ ہونے کے مختلف پہلو واشگاف کیے گئے، اور کتاب وسنت کے اس نقلی دعوے کو عقلی اور حسی نداز کے دلائل وشواہد سے نمایاں کیا گیا ہے۔

یہ کہنا کہ ''آبِ حیات'' میں حضرت اقدسؒ نے موتِ نبوی کا انکار کر دیا ہے، افترا اور فتنہ پردازی ہے۔ حضرتؒ نے صراحت کے ساتھ ''اِنَّکَ مَیِّتٌ وَاِنَّھُمْ مَیِّتُوْنَ'' کے تحت موتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا اثبات کرتے ہوئے حیاتِ نبوی پر روشنی ڈالی ہے۔ حضرت اقدس معاذ اللہ! نہ موتِ نبوی کے منکر ہیں، جو قطعی ہے، نہ حیات بعد الموت کے منکر ہیں، جو منصوص ہے؛ بلکہ بلا کسی شائبۂ تفرد کے اس بارے میں پوری امت کے ساتھ ہیں کہ آپ پر موت بھی طاری ہوئی، اور موت کے بعد برزخ میں آپ کو حیات بھی عطا ہوئی، جو جسمانی اور دنیوی تھی۔ حضرتؒ کا جو کچھ بھی کلام ہے، وہ اس موت اور حیات بعد الموت کی کیفیت میں ہے کہ اس کے طاری ہونے کی نوعیت کیا تھی؟ جو فنِ حقائق کا مسئلہ ہے، نہ کہ فنِ عقائد کا۔ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح آپ کی ناسوتی حیات عام انسانوں جیسی حیات نہ تھی، اسی طرح آپ کی اور تمام انبیا علیہم السلام کی موت اور حیات بعد الموت بھی عام انسانوں کی موت اور حیات بعد الموت کی طرح نہیں۔

آپ پر موت طاری ہونے سے زوالِ حیات، یا انقطاعِ حیات کلیتاً نہیں ہوا؛ بلکہ حیات سمٹ گئی اور آثارِ حیات حسی طور پر منقطع ہو گئے۔ برزخ میں وہی سمٹی ہوئی حیات بہ دستورِ سابق پھر بدن مبارک میں پھیلا دی گئی۔ اس دعوے کا تعلق نہ درحقیقت موت کے طریان سے ہے، نہ بعد الموت حیات کے سریان سے، جو عقیدہ ہے؛ بلکہ ان دونوں کی کیفیت اور صورتِ تکوّن سے ہے؛ اس لیے اسے تفرد کہنا تحکم ہے۔ تفرد بہ مقابلہ عقیدہ ہوتا ہے، مسلمہ عقیدہ کو مان کر اس کی باطنی حقیقت بیان کرنے سے نہیں ہوتا۔ بالخصوص جب کہ اس خاص کیفیتِ ممات وحیات کے بارے میں سلف کے ارشادات بھی موجود ہیں، تو بیانِ کیفیت میں بھی تفرد نہیں رہتا۔

ہاں تفرد اگر ہے، تو طریقِ استدلال اور دلائل و براہین کی ندرت میں ہے، نہ کہ دعوے میں۔ نیز ان دلائل میں اگر انکار ہے، تو موتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یا حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں؛ بلکہ اس خاص کیفیت کی موت اور خاص انداز کی حیات بعد الموت کا غیر انبیا سے انکار ہے۔

اب اگر اس موت وحیات کی مذکورہ کتاب مخصوص کیفیت اور اندرونی حقیقت کا انکار اربابِ سطح کرنے لگیں، تو یہ انکار ایسا ہی ہوگا، جیسا کہ ایک نابینا کسی بینا کے مشاہدات کا انکار محض اس لیے کرنے لگے کہ یہ حقائق اسے نظر نہیں آتیں، تو جیسے یہ انکار درخورِ التفات نہ ہوگا۔ ایسے ہی یہ طرزِ عمل بھی لائقِ توجہ نہیں ہوسکتا کہ اسبابِ ظواہر ان حقائق کو اسی پیانے سے ناپنے لگیں، جس سے مدلولاتِ ظاہری کو ناپا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس طرح نصوص کے مدلولاتِ ظاہری کا پیانہ نصوص کے ظواہر ہوتے ہیں، ایسے ہی ان

کے مدلولاتِ خفیہ کا پیمانہ بواطنِ نصوص ہوتے ہیں:

''لِكُلِّ آيَـةٍ مِّنْهَا ظَهَرٌ وَّبَطَنٌ، وَ لِكُلِّ حَدٍّ مُطَّلَعٌ''.

اور ساتھ ہی: وَلِكُلِّ فَنٍّ رِجَـالٌ.

باطنی حقائق کے اثبات کو ظاہری مدلولات کا انکار سمجھ جانا اسی کا فعل ہوسکتا ہے، جسے نہ ظواہر نصوص پر پورا عبور حاصل ہو، اور نہ ہی وہ نصوص کے ظہر وبطن کے مابین رابطے سے واقف ہو، درحالے کہ نصوص کے ظواہر بلا شبہ اپنے بواطن سے مربوط اور وابستہ ہوتے ہیں، اور اس ارتباط کا انکشاف خود ایک مستقل علم ہے، جو راسخین فی العلم ہی کا حصہ ہے؛ اس لیے ان بواطن کا انکار درحقیقت ظواہر سے بھی کما حقہ عدم واقفیت یا فن حقائق سے عدم مناسبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرزِ عمل کا شکار کتاب ''آبِ حیات'' بھی ہوئی ہے؛ ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ''آبِ حیات'' کے دقیق ہونے کو مسئلۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار ونفی سے کیا تعلق ہے؟

دار العلوم دیوبند میں حضرت نانوتویؒ کی تصانیف کو درساً درساً پڑھانے کا سلسلہ حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ نے شروع فرمایا تھا، اور عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس سے پہلے دار العلوم کے مخصوص اکابر واساتذہ حضرتؒ کے مضامینِ حکمت کو دروس میں بہ ذیلِ نصوص کتاب وسنت بیان کرنے کے عادی رہے ہیں۔ حضرت اقدس مولانا شیخ الہند، میرے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہم اللہ خصوصیت سے کلامی مسائل کی تشریح حضرت اقدسؒ ہی کی تصانیف کی روشنی میں فرماتے تھے، جس سے طلبہ کو ان علوم سے بلا درس وتدریس کافی مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔ موجودہ اساتذہ میں حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب مدظلہ، صدر المدرسین دار العلوم اور حضرت مولانا رسول خان صاحب سابق مدرس دار العلوم کو حکمتِ قاسمیہ پر کافی عبور ہے، اور دروس میں ان کے یہاں موقع بہ موقع یہ حکم واسرارِ قاسمیہ بیانات میں آتے رہتے ہیں۔ مولانا شبیر احمد صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ:

''اسلام کے مقابلے میں فلسفہ سو برس تک کتنے ہی رنگ وروپ بدل بدل کر آئے؛ لیکن حکمتِ قاسمیہ کی روشنی میں اس کا انداز فوراً پہچانا جائے گا اور اس کی قلعی کھلے بغیر نہ رہے گی''۔

اس لیے حضرتؒ کی کتب باوجود دقیق المدرک ہونے کے یہاں کے طلبہ میں بدیہیاتِ اولیہ کا درجہ رکھتی تھیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے متعذر الحصول یا ناممکن الادراک ہونے کا پروپیگنڈا کن مصالح پر مبنی ہے؟ لوگ قاضی، حمد اللہ، صدرا، شمس بازغہ تو سمجھ لیں، اور ''آبِ حیات'' اور ''قبلہ نما'' سامنے آئے، تو

اس کے متعذر الحصول ہونے کا عذر کر کے کھڑے ہو جائیں، تو سوائے اس کے کہ یا اسے فن حقائق سے عدم مناسبت، یا ''اَلنَّاسُ أَعْدَاءُ مَا جَهِلُوْا'' پر محمول کیا جائے اور کیا کہا جائے؟

اس تفصیل کے بعد جناب کے سوالات کا جواب درج ذیل ہے:

۱- میں نے ''آبِ حیات'' درساً درساً نہیں پڑھی، جتنا بن پڑا خود ہی اس کا مطالعہ کیا ہے، نہ وہ نا قابل فہم وادراک ہے، اور نہ ہی اس کے علوم ملائکہ کے لیے ہیں؛ بلکہ انسانوں ہی کے لیے ہیں؛ مگر ذی استعداد انسانوں کے لیے، جنہیں علوم دینیہ کے ساتھ معقول وفلسفہ اور ہیئت وریاضی میں کافی دست گاہ ہو۔ ''آبِ حیات'' میں مشکل حصہ دلائل کا ہے، مسائل کا نہیں۔ دعویٰ یا مسئلہ اس میں وہی ہے، جو شرعی ہے، یعنی انبیا علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم برزخ میں جسمانی اور دنیوی حیات کے ساتھ زندہ ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں اور رزق پاتے ہیں، اور یہ کہ آپ کی موت اور حیات بعد الموت عام موتوں اور حیاتوں کی طرح نہیں، اور نہ ہی موت طاری ہونے اور حیات بعد الموت آنے کی کیفیت ہی عام انسانوں جیسی ہے۔ اسی لیے اس حیات کے اثرات عالم دنیا تک بھی پہنچے ہوئے ہیں کہ نہ ان کی بیویاں بیوہ اور قابل نکاح ہوتی ہیں اور نہ ان کے اموال میں میراث بٹتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس دعوے یا اس شرعی مسئلے میں کوئی اشکال نہیں، اشکال اگر ہے، تو دلائل اور ان کی محققانہ تعبیر میں ہے؛ لیکن عوام کے لیے نہ کہ اہل علم اور اہل ذوق کے لیے، اور کچھ بھی ہو میرے یا کسی کے اسے درساً درساً نہ پڑھنے سے یا کتاب کے مشکل ہونے سے اس کھلے ہوئے شرعی مسئلے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے کہ اس اشکال کی آڑ میں مسئلے کی نفی یا انکار کیا جائے؟ یا حضرتؒ کو اس عقیدے کے کسی بھی پہلو میں جمہور سلف وخلف سے الگ یا متفرد کہا جائے؟

۲- ''الفرقان'' میں ذکر کردہ واقعہ بالکل صحیح ہے؛ لیکن آخر میں اجمال کر دیا گیا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ نے مجھے ''آبِ حیات'' پڑھانے سے یہ کہہ کر معذرت فرمائی تھی کہ یہ کتاب بہت عالی اور دقیق مضامین پر مشتمل ہے، اور میں اہتمام کے جھگڑوں میں مبتلا رہ کر چوں کہ ہمہ تن اس کتاب کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا؛ اس لیے اس کا پڑھانا میرے لیے مشکل ہے۔ یہ کتاب ایسی نہیں ہے کہ میں ذیلی اور ضمنی طور پر محض سرسری مطالعہ سے اسے حل کر کے اس پر قابو پا سکوں۔

بہر حال! اس واقعہ سے کتاب کے ناممکن الفہم ہونے، یا اس میں بیان شدہ مسئلۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشکوک یا مشتبہ ہونے پر استدلال کیا جانا قطعاً بے معنی ہے۔ حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہٗ اور

دیوبند کے تمام اکابر وعلما کا مسلک اس بارے میں صاف رہا ہے اور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عالم برزخ میں حیات جسمانی دنیوی کے ساتھ زندہ ہیں، اور یہ ناکارہ خدام اکابر بھی ان ہی اکابر ممدوحین کے اس مسلک کا پابند اور من وعن متبع ہے۔ والسلام

محمد طیب غفرلہ

مدیر دارالعلوم دیوبند

۱۸؍شعبان ۱۳۸۰ھ/ (۵؍فروری ۱۹۶۱ء)

ازمیل وشام (مدراس)(۱)

(۱) (مضمون ماخوذ از): ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند، مئی ۱۹۶۱ء، ص: ۱۵؍تا ۱۸۔

نبی علیہ السلام کے لیے تکوینی اختیار
اور
حضرت نانوتویؒ کی آبِ حیات

مفسر قرآن حضرت مولانا سید اخلاق حسین قاسمیؒ

مسلمانوں کی ایک جماعت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں عطائی تکوینی اختیار کا عقیدہ رکھتی ہے، اور وہ تکوینی دائرے کو تشریعی دائرے پر قیاس کر کے اس طرح کا عقیدہ قائم کرتی ہے:

قرآنِ کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ تو فرمایا ہے کہ: آپ حکمِ الٰہی کے تحت دنیا کے لیے مطاع ومقتدا بنا کر بھیجے گئے ہیں:

''وَمَا أَرْسَلْنَاکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ''(۱)۔

''اور ہم نے رسول کو اس لیے بھیجا کہ حکمِ الٰہی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے''۔

لیکن کہیں اس بات کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا کہ خدا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اجازت اور اپنے اختیار سے عالمِ کون ومکان کا مالک ومختار بنا کر بھیجا ہے۔ قرآنِ حکیم خدا کا اصولی اور کلی قانون ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس قانونِ الٰہی کی جزئیات اور عملی صورتیں واضح کرنے والے ہیں۔

یہ شرح وبیان بھی ہدایتِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر صادر نہیں ہوتا تھا؛ بلکہ ہدایتِ الٰہی کے تحت صادر ہوتا تھا۔ فرق یہ تھا کہ قرآن کے اصولی احکام وحی جلی کی صورت میں نازل ہوتے تھے، اور ان اصولوں کی تشریح وحی خفی کے مطابق صادر ہوتی تھی۔

جزئیات کی تشریح وبیان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شریعت ساز کہا جا سکتا ہے، اور یہ تشریعی اختیار کی ایک صورت ہے- مجازی صورت۔ حقیقت میں شریعت ساز خدا ہی کی ذات قرار پاتی ہے۔

---

(۱) سورۂ نساء: ۶۴۔

حقیقی شریعت سازی کے لحاظ سے قرآن کریم نے یہ واضح کر دیا:

''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى؛ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى''(۱).

''نبی علیہ السلام اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے، وہ وحی الٰہی کے مطابق کہتے ہیں''۔

''وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ''(۲).

''اور اگر وہ ہماری طرف کوئی بات غلط طور پر منسوب کر دیتے، تو ہم انہیں سختی سے پکڑ لیتے اور ان کی شہ رگ کاٹ ڈال دیتے''۔

تشریع کے دائرے میں یہ پابندِ وحی اختیار بھی آپ کو اس لیے عطا کیا گیا تھا کہ آپ کا منصب شہادتِ حق (قولی اور عملی تشریح) تھا، تکوینی معاملات سے نبی و رسول کا کوئی تعلق نہیں ہوتا؛ اس لیے تکوینیات میں نبی و رسول کے لیے کسی نوع کے اختیار کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے کہا:

''اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ''(۳).

''حکم و اختیار صرف اللہ کے لیے ہے''۔

''وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖ اَحَدًا''(۴).

''اور اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے اختیار میں شریک نہیں کرتا''۔

مشرکین عرب کے لبیک سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرکینِ عرب اپنے بتوں اور باطل معبودوں کے لیے عطائی ملک و اختیار کا عقیدہ رکھتے تھے، مستقل بالذات اختیار کا عقیدہ نہیں۔

''لبیک لا شریک لک لبیک الا شریکا ھو لک''.

''تیرا کوئی شریک نہیں، سوائے اس شریک کے، جسے تو نے خود شریک بنالیا''۔

''اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ'' کا یہ عقیدہ اس وقت لوگوں کی نظروں میں ان کی کم علمی کی وجہ سے مشتبہ اور مشکوک ہو جاتا ہے، جب وہ خدا کے خاص بندوں (حضرات انبیا علیہم السلام) میں معجزانہ قوتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ حضراتِ انبیا و اولیا سے غیر معمولی واقعات کا صادر ہونا ان لوگوں کو شبہے میں ڈال دیتا ہے، اور وہ یہ

(۱) سورۂ نجم: ۴۔

(۲) سورۂ الحاقۃ: ۴۴/۴۶۔

(۳) سورۂ الانعام: ۵۷۔

(۴) سورۂ الکہف: ۲۶۔

سمجھنے لگتے ہیں کہ خدا کے ان خاص بندوں کے اندر خدائی طاقت اور تکوینی اختیارات موجود ہیں، اور یہ تصور کھلا شرک اور کفر ہے۔

اسلام اور ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ سو برس پہلے اس گمراہی میں عیسائی قوم اس طرح گرفتار ہوئی کہ انجیل کے مصنفین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو اس انداز سے بیان کیا، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اندر مُردوں کو زندہ کرنے اور بیماروں کو صحت مند کرنے کی ذاتی قوت وذاتی تصرف موجود تھا۔

موجودہ انجیلیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوسو برس بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے شاگردوں نے ترتیب دیں۔ ان شاگردوں نے اپنے استادوں (حواریینِ مسیح علیہ السلام) سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات پر جو کچھ سنا، اسے اپنے عقیدت مندانہ انداز میں نقل کر دیا، اور عقیدت کے غلو وتشدد نے خدائی معجزہ دکھانے والے پیغمبر کو معجزہ پیدا کرنے والے خدا کے روپ ورنگ میں پیش کر دیا۔

ظاہر ہے کہ جس ہستی میں مردوں کو زندہ کرنے اور مٹی کے پرندوں کو اصلی پرندہ بنا کر اڑانے اور کل کا کھایا پیا بتانے کی قوت ہو، اس کے لیے خدائی کا عقیدہ قائم کرنا عقل کے خلاف نہیں؛ لیکن کسی معجزہ دکھانے والے نبی ورسول نے یہ کہہ کر معجزہ نہیں دکھایا کہ میرے اندر یہ حیرت انگیز تصرف واختیار موجود ہے؛ بلکہ ہر ہر قدم پر اس حقیقت کا اظہار کر دیا کہ معجزہ یا کرامت نمودار کرنے کی قوت خدائے واحد کے اندر ہے۔

پیغمبروں کے ذریعے خدائے قدیر غیر معمولی واقعات ظاہر کر کے ان کی صداقت پر دلیل دکھانا چاہتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے آخری کلام مقدس (قرآن کریم) کی لفظی اور معنوی تنزیل وتحفظ کو اپنے ہاتھ میں رکھا اور تمام نبیوں کے معجزات کے وقوع کو واضح طور پر اپنی طرف منسوب کیا۔

اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں تو اتنی احتیاط کی گئی کہ جب مخالفین کی طرف سے فرمائشی معجزات ونشانات کا مطالبا کیا گیا، تو آپ سے جواب دلوایا گیا کہ: معجزہ اور نشان میرے ہاتھ میں نہیں، خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے، میں تو صرف حق کا داعی اور مبلغ ہوں:

”وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْبُوْعًا، أَوْ تَکُوْنَ لَکَ جَنَّۃٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّعِنَبٍ، فَتُفَجِّرَ الْاَنْھَارَ خِلٰلَھَا تَفْجِیْرًا، أَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا کِسَفًا أَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰہِ وَالْمَلٰئِکَۃِ قَبِیْلاً أَوْ یَکُوْنَ لَکَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقٰی فِي السَّمَاءِ، وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا کِتَابًا نَّقْرَؤُہٗ، قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ، ھَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلاً“(۱).

(۱) سورۂ بنی اسرائیل: ۹۰ تا ۹۳۔

''اور منکرین نے کہا: ہم اے نبی! تم پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے، جب تک ہمارے لیے زمین میں ایک چشمہ جاری نہ کردو، یا تمہارے پاس ایک کھجوروں اور انگوروں کا باغ نہ ہو، اور اس باغ میں تم پانی کی نہریں جاری نہ کردو، یا جیسا کہ تم کہتے ہو، آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گراؤ، یا خدا اور فرشتوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے لاکر کھڑا نہ کردو، یا تمہارے پاس سونے کا ایک محل نہ ہو، یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ، اور اس چڑھنے کا ہم یقین نہیں کریں گے، جب تک تم آسمان سے ایک کتاب ساتھ نہ لاؤ، جسے ہم پڑھ سکیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں خدا کی طرف سے کہا: سبحان اللہ (بڑا تعجب ہے) میں کون ہوں؟ صرف خدا کا ایک رسول جو انسان ہے''۔

قرآنِ کریم نے حیرت انگیز اور دنیا کو عاجز کردینے والے واقعات کو آیاتِ الٰہی، یعنی نشانیوں سے تعبیر کیا ہے، جو رسولوں کی صداقت کے لیے ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں کے حق میں اتمامِ حجت کے طور پر ظاہر کی جاتی ہیں:

''قُلْ اِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللّٰهِ''[1].

''کہہ دو! نشانیاں اللہ کے قبضے میں ہیں''۔

قرآنِ کریم نے سابق قوموں کی گمراہی کے تجربے کی روشنی میں معجزات کے بارے میں جس قدر احتیاطی اسلوب و انداز اختیار کیا، افسوس کہ آخری امت کے ایک طبقے (مدعیانِ محبت) نے اس سے کوئی سبق نہ لیا اور اسی راہ سے گمراہی میں مبتلا ہوگیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو عیسائی قوم کے حوالے سے عقیدت و محبت کے غلو اور مبالغے سے دور رہنے کی سخت تاکید کی تھی اور فرمایا تھا:

''لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰى الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ''.

''مسلمانو! میری تعریف میں اس طرح مبالغہ آرائی نہ کرنا، جس طرح نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں کی''۔

لیکن اسی کے ساتھ آپ نے ایک پیشین گوئی بھی فرمائی تھی کہ:

''لَتَرْكَبُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ''[2].

---

(۱) سورۂ انعام: ۱۰۹۔

(۲) مشکاۃ، ص: ۴۶۵، بہ حوالۂ ترمذی۔

''تم مسلمان ضرور (شرک کے کاموں میں) اگلوں کی پیروی کروگے''۔

مشرکینِ عرب ایک درخت (ذات انواط) کی پرستش کرتے تھے، اور اس پر تلواریں لٹکا کر اس کا طواف کرتے تھے۔ بعض مسلمانوں نے ایک سفر میں اس درخت کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہمارے لیے بھی آپ ایسا ہی درخت مقرر کردیں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ طور پیشین گوئی یہ فرمایا تھا۔

چناں چہ یہ طبقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو آپ کی ذاتی قوت قرار دے کر آپ کو تکوینی اختیارات میں شریک ہونے کے عقیدے کی تبلیغ کررہا ہے۔

پاکستان کے ایک اہل حدیث عالم نے ''نبوت کی عجمی تعبیر'' کے نام سے ایک ''تحقیقی کتاب'' لکھی ہے، جس کا موضوع یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تکوینی اختیار کے تصور کی تخلیق میں دیوبندی اور بریلوی علما دونوں شریک ہیں، اور اس تصور کی اساس شیخ ابن عربیؒ کے وحدۃ الوجودی عقیدے پر قائم ہے؛ لیکن مصنف محقق نے اس کی نسبت پورے دیوبندی حلقے کی طرف کرکے انصاف کا خون کیا ہے؛ کیوں کہ اس تصور کا ماخذ دیوبندی اکابر کی کتابوں میں صرف مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی مشہور کتاب ''آبِ حیات'' نظر آتی ہے، اور بریلوی علما کی کتابوں میں مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کی کتاب ''سلطنۃ المصطفیٰ فی ملکوت کل الوریٰ'' بنیادی کتاب ہے، جس میں خان صاحب نے تمام کائنات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ فرمان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

دونوں کتابوں میں فرق صرف تعبیر و توجیہہ کا ہے۔ مولانا نانوتویؒ نے علمی اور منطقی استدلال سے کام لیا ہے، اور خان صاحب کے ہاں عوامی اسلوب ہے۔

مثلاً ''آبِ حیات'' میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے درجۂ دوم کی ملکیت کا تصور ہے، اور خان صاحب اسے عطائی ملکیت واختیار کہتے ہیں۔

قرینِ قیاس ہے کہ مولانا بریلوی کے سامنے مولانا نانوتوی کی ''آبِ حیات'' رہی ہو؛ کیوں کہ خان صاحب کی عمر مولانا نانوتویؒ کی وفات کے وقت پچیس سال کی تھی۔

مولانا نانوتویؒ کی ولادت ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء، اور وفات بہ عمر انچاس سال ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء، اور مولانا بریلوی کی ولادت ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء، اور وفات بہ عمر اڑسٹھ سال ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء رہے۔

خان صاحب نے ''سلطنت المصطفیٰ'' کتاب ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں لکھی، جب آپ کی عمر پچیس

سال تھی۔ مولانا بریلوی کے عوامی اور عامیانہ اسلوب کی ایک مثال یہ دو شعر ہیں، جو خان صاحب کے مجموعۂ کلام سے نقل کیے جاتے ہیں:

ان کی نبوت، ان کی ابوت ہے، سب کو عام
ام البشر عروس انہیں کے پسر کی ہے
ظاہر میں میرے پھول، باطن میں میرے نخل
اس گل کی یاد میں یہ صدا ابو البشر کی ہے[1]

آبِ حیات کے استدلال کے لیے مولانا نانوتویؒ نے حسبِ ذیل آیت کو اساس بنایا ہے:

''اَلنَّبِيُّ أَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ''[2].

اس کا ترجمہ دیوبندی مسلک کے مشہور راہ نما مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حسبِ ذیل کیا ہے:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم مومنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں''۔

اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''نفسِ انسانی اگر برا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ مومن کا بدخواہ ہوگا، اور اگر اچھا ہے، تب بھی وہ زندگی کی بعض مصلحتوں سے بے خبر رہتا ہے، اور نبی کو خدا تعالیٰ نے انسانی فلاح وخیر کا ضروری علم عطا فرمایا ہے؛ اس لیے نبی ہر حال میں امت کے خیر خواہ اور ہمدرد ہیں''[3]۔

مفسرین میں ابن جریر طبریؒ (وفات: ۳۱۰ھ/ ۹۲۲ء)، امام فخر الدین رازیؒ (وفات: ۶۰۶ھ/ ۱۲۱۰ء)، علامہ ابن کثیرؒ (وفات: ۷۷۴ھ/ ۱۳۷۳ء)، اور صاحبِ روح المعانی (وفات: ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء) اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ سب نے آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے، اور لفظ اولیٰ کو اسی مفہوم میں بیان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے حق میں ان سے زیادہ مہربان ہیں۔ آپ کی اطاعت اپنی خواہشِ نفس اور اپنے آبا و اجداد کی حکم برداری سے مقدم ہے۔

قاضی صاحبؒ نے متقدمین مفسرین کی عبارتوں کا ان الفاظ میں حاصل نکالا ہے:

''أَوْلٰى فِي نُفُوْذِ الْحُكْمِ عَلَيْهِمْ وَوُجُوْبِ طَاعَتِهِ عَلَيْهِمْ، فَلَا يَجُوْزُ إِطَاعَةُ الْآبَاءِ وَالْأُمَّهَاتِ بِمَعْنَى حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ''[4].

---

(۱) حدائق بخشش۔
(۲) سورۂ الاحزاب: ۶۔
(۳) بیان القرآن، ج: ۹، ص: ۳۷۔
(۴) مظہری، ج: ۷، ص: ۲۰۸۔

بعض قرائتوں میں ''وَهُوَ أَبٌ لَّهُمْ''(نبی ان کے باپ ہیں) بھی آیا ہے، اس لیے امام مجاہدؒ نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''كُلُّ نَبِيٍّ أَبُ الْأُمَّةِ'' ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے؛ کیوں کہ وہ امت کا مربی اور مشفق معلم ہوتا ہے۔ حقیقی باپ جسمانی حیات کا کفیل ہوتا ہے، اور نبی کی تربیت سے ابدی حیات حاصل ہوتی ہے۔ پس روحانی باپ ہونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت نہیں؛ البتہ امہات المؤمنینؓ کا امت کی ماں ہونا خصوصیات میں سے ہے۔ دوسرے انبیا کی ازواج مطہرات کا یہ درجہ نہیں[1]۔

ابن جریر طبریؒ نے ابن زیدؒ کا ایک قول نقل کیا ہے، جس میں نبی اور امت کے باہمی تعلق کو آقا و غلام کے تعلق سے تشبیہ دی گئی ہے؛ لیکن وہ آقائی اور غلامی احکامِ شریعت کے نفاذ و اجرا کے معاملے میں ہے، نہ کہ جسمانی آقائی اور غلامی کے مفہوم میں:

''اَلنَّبِيُّ أَوْلٰى كَمَا أَنْتَ أَوْلٰى بِعَبْدِكَ مَا قُضِيَ فِيْهِمْ مِنْ أَمْرٍ جَازَ كَمَا كُلَّمَا قَضَيْتَ عَلٰى عَبْدِكَ جَازَ''[2]۔

علامہ ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تشریح میں آیت:

''فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ؛ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ''[3]۔

نقل کی ہے، اور یہ بتایا ہے کہ نبی کے حکم سے مراد تشریعی حکم ہے، تکوینی حکم کا یہاں کوئی مفہوم موجود نہیں ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی یہ مرفوع حدیث نقل کی ہے:

''مَا مِنْ مُؤْمِنٍ اِلَّا وَأَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، اِقْرَأُوْا اِنْ شِئْتُمْ: اَلنَّبِيُّ أَوْلٰى .....الخ.

''دنیا و آخرت میں ہر مومن کے ساتھ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں میرا تعلق زیادہ ہے۔ اگر کوئی مسلمان ترکہ چھوڑ کر مرے، تو اس ترکے کے وارث اس کے حق دار ہوں گے، اور اگر کوئی مسلمان قرض دار مرے، یا بچے چھوڑ کر مرے، تو ان کی کفالت میں کروں گا اور اس کا قرض میں ادا کروں گا''۔

---

(۱) روح المعانی، ج:۷، ص:۱۰۷۔

(۲) ابن جریر، ج:۲۱، ص:۷۰۔

(۳) سورۂ نساء:۶۵۔

ابن کثیرؒ نے آیت مذکورہ کے چند پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس میں ایک بحث یہ ہے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمان مردوں اور عورتوں کا باپ کہنا صحیح ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسے درست نہیں سمجھتی تھیں، اور امام شافعیؒ کا صحیح قول بھی یہی ہے''۔

ایک حدیث میں آپ نے اپنے لیے والد کا لفظ استعمال کیا ہے؛ لیکن وہ معلم اور مربی کے مفہوم میں ہے۔فرمایا:

''اِنَّمَا أَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ، أُعَلِّمُکُمْ .... الخ.

''میں تمہارے لیے باپ کی مانند ہوں، تمہیں پیشاب پائے خانہ کرنے کا طریقہ بھی سکھاتا ہوں، جس طرح ماں باپ بچوں کو سکھاتے ہیں''۔

حقیقی باپ کے لفظ کی نفی قرآن کریم نے خود کی ہے۔فرمایا:

''مَا کَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ''.

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں''۔

اردو فارسی کے تمام مترجمین نے ''اولیٰ'' کا یہی مفہوم بیان کیا ہے:

شاہ ولی اللہؒ: ''سزاوارتر''۔

شاہ عبدالقادرؒ: ''لگاؤ''۔

شاہ رفیع الدینؒ: ''شفقت''۔

مولانا مودودی: ''مقدم''۔

ڈپٹی نذیر احمدؒ: ''زیادہ حق رکھتے ہیں''۔

''اَوْلٰی'': ولایت کے ایک معنیٰ 'حکومت وتسلط' کے بھی ہیں، جس طرح قرب اور دوستی کے ہیں؛ لیکن کسی مترجم ومفسر نے اس آیت میں اولیٰ کو حاکمیت وحکومت کے مفہوم میں نہیں لیا۔

مولانا نانوتویؒ نے ''آبِ حیات'' میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت درجۂ دوم اور ذاتی حیات کے فلسفے کی بنیاد ''اولیٰ'' کے اسی لغوی مفہوم پر رکھی ہے، اور پھر مولانا احمد رضا خان صاحب نے ''آبِ حیات'' کی تاویل کی روشنی میں اس آیت کا ترجمہ کیا ہے:

''یہ نبی مسلمانوں کا ان کی جان سے زیادہ مالک ہے''(۱)۔

(۱) کنز الایمان، ص: ۴۹۷۔

تصرّف کا لفظ شاہ ولی اللہؒ نے تشریحی طور پر اس طرح بڑھایا ہے:

''پیغمبر سزاوارتر است بہ تصرف در امورِ مسلمین از ذات ہائے ایشاں''۔

ترجمہ از فارسی: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے معاملات میں تصرف کرنے کا حق خود ان سے زیادہ رکھتے ہیں''۔

پھر اس مفہوم کو ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اس طرح واضح کرتے ہیں:

''نبی نائب ہے اللہ کا، اپنی جان و مال میں تصرف نہیں چلتا، جتنا نبی کا چلتا ہے''۔

''اپنی جان دہکتی آگ میں ڈالنا روا نہیں، اور اگر نبی حکم دے، تو فرض ہو جائے''۔

تصرف سے مراد ان حضرات کی تشریعی تصرّف ہے، جو بہ طور نائبِ خدا کے، خدا کے حکم و ہدایت کے مطابق امت کے دینی معاملات میں جاری ہوتا ہے۔

قرآن وحدیث کے واضح نصوص اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہیں کہ: رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت خداوندی سے بے نیاز ہو کر تشریعی امور میں دخل دینے کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔

محدثین وفقہا نے وضاحت کی ہے کہ جو ہدایات رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی جاری فرمائیں، جن کا ثبوت و ماخذ کتاب اللہ میں واضح نہیں، وہ ہدایات ''وحی خفی'' سے تعلق رکھتی ہیں، انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ہدایات اور ذاتی احکام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی لیے حقیقی مفہوم میں شریعت ساز صرف خدا تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔

شاہ ولی اللہؒ نے کتاب وسنت کے باہمی تعلق پر ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ حاصل یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریعی تصرّف بھی نائبِ خدا کے طور پر ہے، جو رسالت کا حقیقی مفہوم ہے۔ اس میں تکوینی تصرّف کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خاص کلامی اجتہاد کی تشریح کے بعد اس حقیقت کو صاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ یہ تصورات جس دلیل پر مبنی ہیں، وہ ایک باریک ولطیف شئ ہے؛ اس لیے عام ذہن کی گرفت میں نہیں آ سکتی۔ لکھتے ہیں:

> ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل ایمان کے اموال ونفوس میں تصرّف کا حق معلوم ہوتا ہے؛ لیکن چوں کہ واسطہ اور وسیلہ کا تعلق ایک لطیف اور مخفی شئ ہے، جو اہلِ بصیرت کے سوا کسی پر واضح نہیں؛ بلکہ قرآن واحادیث کے اشارات سے بھی بہ دشواری سمجھ میں آتا ہے؛ اس لیے خدا تعالیٰ نے قانونِ شریعت کے عام قاعدے کے مطابق آپ کے لیے نکاح ومہر اور عدل

ومساوات کا فریضہ عائد کیا ہے۔

اگر ملکیت کے اس حق کا لحاظ کیا جاتا، تو عام خواتین آپ کے لیے مثل باندیوں کے حلال ہوتیں؛ لیکن اس سے کم فہم لوگوں کو شہوت پرستی کی تہمت لگانے کا موقع مل جاتا ہے''(۱)۔

یہی وجہ ہے کہ علمائے دیوبند نے مولانا نانوتویؒ کے ان اجتہادی اور استنباطی تصورات کو عوام میں شہرت دینے سے گریز کیا، اور عوام میں ان ہی عقائد کی تبلیغ وتشہیر کی جو عقیدۂ توحید کے مطابق تھے۔

آبِ حیات کے تصورات:

ذیل میں ''آبِ حیات'' کے تصورات کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے، یہ حضرت نانوتویؒ کے تفردات ہیں، جنہیں جماعتِ دیوبند کی طرف سے تسلیم کرنے کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے۔

مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند (نبیرۂ مولانا محمد قاسم صاحبؒ) کی بعض تحریروں میں ان تصورات کی جھلک نظر آتی ہے، اور ان کی حیثیت بھی مولانا کے ذاتی تصورات کی ہے۔

مولانا نانوتویؒ نے ''آبِ حیات'' میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا حاصل یہ ہے:

''اَلنَّبِيُّ أَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ''(۲).

حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کے روحانی باپ ہیں۔ روحانی باپ کا درجہ جسمانی باپ سے زیادہ ہے۔ اہلِ ایمان کی ارواح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک سے تخلیق کی گئی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ذاتی ہے۔ دوسرے مومنین کی حیات عرضی ہے۔ آپ کی حیات قابلِ زوال نہیں؛ البتہ موت کے وقت یہ حیات مستور (پردے میں) ہوگئی، اور اہل ایمان کی حیات زائل ہوجاتی ہے۔

جیسے سورج گہن میں سورج کی روشنی حجاب (پردے) میں ہوجاتی ہے، زائل نہیں ہوتی، بہ خلاف چاند گہن کے، اس کی روشنی زائل ہوجاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی مثال جیسے چراغ پر سر پوش ڈھانپ دیا جائے، اور مومنین کی مثال جیسے چراغ کو بجھا دیا جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کے درمیان اتحاد واشتراک اور مثلیت کا تصور غلط ہے۔ اگرچہ شکل وصورت واحکام جسمانی مثلاً کھانے، پینے وغیرہ میں مماثل کہا جائے۔

---

(۱) آبِ حیات، ص: ۲۰۷۔

(۲) سورۂ الاحزاب: ۶۔

''قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ''.

جس طرح آفتاب اور اس کی شعاعوں میں مثلیت ذاتی نہیں؛ بلکہ آسمان وزمین کا فرق ہے، لاکھوں عکس بھی مثل آفتاب نہیں ہو سکتے، اگر چہ صورت اور رنگ میں نور آفتاب اور اصلی آفتاب میں مشابہت ہے؛ لیکن برابری کا خیال باطل ہے۔

ازواجِ مطہرات ؓ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ''مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ'' سے زیادہ تھا۔ مالک کی ملک عارضی ہوتی ہے، آزاد کرنے یا فروخت کرنے سے زائل ہو جاتی ہے؛ مگر امتیوں پر آپ کا جو حق ہے، وہ کبھی زائل نہیں ہوتا؛ کیوں کہ ارواحِ مؤمنین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح سے پیدا کی گئی ہیں۔

حقیقی مالک تو خدا ہے؛ لیکن دوسرے درجے میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت کو سمجھیے؛ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم کے لیے وسیلہ اور واسطہ فی العروض ہیں۔ جیسے ہاتھ اور قلم۔ اصل میں حرکت ہاتھ کو لاحق ہوتی ہے، قلم کی حرکت ہاتھ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پس ہر کمال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم واسطہ ہیں، خاص کر ارواحِ مؤمنین کے لیے۔

آخرت میں آپ کو مقام وسیلہ کا دیا جانا اسی طرف اشارہ ہے۔ وَ الْعَاقِلُ يَكْفِيْهِ الْاِشَارَةُ.

عجب نہیں کہ یہ روایت صحیح ہو؟:

''لَوْ لَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ''.

''اگر اے نبی! تم نہ ہوتے، تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا''۔

مضمون تو اس کا صحیح ہے؛ اس لیے مؤمنین کی ارواح کی قدر و قیمت اور فضیلت ایک حیثیت سے عرشِ اعظم سے بھی زیادہ ہے۔

مولانا حسین احمد صاحب مدنی ؒ کے نزدیک حضور علیہ السلام کی حیات ''حیاتِ برزخی'' ہے، جو حیاتِ جسمانی سے زیادہ قوی التاثیر ہے؛ لیکن حضرت نانوتوی ؒ کے فلسفے کے مطابق وہ حیات حقیقی ہے، یعنی جسم روحانی کے تعلق کے ساتھ حیات ہے۔

دیوبند کے مشہور محدث مولانا انور شاہ صاحب ؒ کے نزدیک حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کی روحانی توجہات امت کی طرف مبذول ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ یہ امت بہ حیثیت مجموعی ہدایت پر قائم ہے۔

---

(۱) آبِ حیات، ص: ۲۲۴۔

ماہر القادری صاحبؒ نے اسی مفہوم کو اس شعر میں بیان کیا ہے: ؎

کبھی کا کاروانِ کیف و مستی لٹ چکا ہوتا
یہاں سب سو رہے ہیں ایک تو بیدار ہے ساقی

شہدائے فی سبیل اللہ کی حیات کے بارے میں شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ یہ حیات بھی حیاتی اثرات واعمال کے مفہوم میں ہے، جس کی طرف قرآن کریم نے ''یُرْزَقُوْنَ'' (وہ رزق دیے جاتے ہیں) سے اشارہ کیا ہے۔

اوپر علامہ ابن کثیرؒ کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ حرمتِ نکاح کا تعلق مقام نبوت کی عظمت وحرمت سے ہے، جو جمہور کا مسلک ہے، اور ''آبِ حیات'' کے فلسفے کے مطابق اس حرمت کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ حقیقی سے ہے۔

ہمارے اکابرِ دیوبند مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ: آپ پر محبت نبوی کا غلبہ تھا، اسی محبت کا اثر تھا کہ آپ تواضع ومسکنت کا پیکر نظر آتے تھے۔ آپ کے شیخ حضرت امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ آپ کو نصیحت کرتے تھے کہ: مولانا قاسم صاحب! علم کے وقار کا خیال رکھو، یعنی اتنی تواضع اختیار نہ کرو کہ علم کی توہین ہونے لگے۔

مولانا نانوتوی رحمہ اللہ کا لباس ایک کھدر کا موٹا تہبند، ایک کھادی کی نیم آستین۔ نہ چغا، نہ عبا اور عصا کے تکلفات۔

آپ کے مقابلے میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (جو آپ کے ساتھی اور پیر بھائی بھی تھے) کی شان دوسری تھی۔ آپ پر اتباعِ سنت کا رنگ غالب تھا۔ آپ قرآن وحدیث کے واضح نصوص کی پیروی کو ضروری سمجھتے تھے، جس میں محدثانہ اور فقیہانہ احتیاط ہے، اور عام مسلمانوں کے لیے یہی راہ-نجات کی راہ ہے۔

حضرت حاجی صاحبؒ کے ''ہفت مسئلے'' سے آپ نے اتفاق نہیں کیا، اور جب حاجی صاحبؒ سے کہا گیا کہ: مولانا گنگوہیؒ کو ''ہفت مسئلے'' سے اتفاق نہیں ہے، تو آپ نے فرمایا: ''وہ بڑے عالم ہیں''۔

مولانا نانوتویؒ نے ''آبِ حیات'' میں آپ کے لیے رونقِ طریقت اور زیبِ شریعت کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جماعتِ دیوبند کا مسلک جن اکابر کے افکار پر قائم ہے، مولانا گنگوہیؒ ان میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ عاشقِ رسول کے طور پر مشہور ہیں۔

جماعت دیوبند کے عظیم فقیہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ سے کسی نے ایک سوال میں مختلف مصالح کے تحت بدعی افکار واعمال کی ترویج پر فتویٰ طلب کیا، مفتی صاحبؒ نے احتیاط کی بنا پر تفصیل میں جانے کے بجائے اختصار کے طور پر یہ لکھا:

''آہ! یہ سوال بہت پیچیدہ اور تفصیل طلب ہے، میں سر دست اس کے جواب میں صرف ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے:

مے پندار سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز بر پئے مصطفےٰ

صلی اللہ علیہ وسلم تسلیماً کثیراً　محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی''(۱)

جماعتِ دیوبند میں حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ علم حدیث وفقہ اور عملی تقویٰ اور احتیاط، دانش مندی میں اپنی مثال آپ سمجھے جاتے تھے (۲)۔

(۱) کفایت المفتی، ج:۱،ص:۱۲۹۔

(۲) بصائر القرآن، حصۂ دوم،ص:۲۸۴/۲۹۶۔

حضرت نانوتویؒ کے ایک مضمون سے قادیانی وکیل کا استدلال اور اس کا جواب

افادات: محدثِ کبیر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

مرتبہ:

حضرت مولانا احمد رضا بجنوریؒ (داماد حضرت شاہ صاحبؒ)

قادیانی مختار نے کہا: ''تحذیر الناس'' میں مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے بھی خاتم النبیین کے بعد نبی کا آنا تجویز کیا ہے۔ اس پر فرمایا:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے الہامی مضمون میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر بہت قوی دلائل و براہین قائم کیے ہیں، اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر ماثور کی گراں قدر علمی توجیہات بیان فرمائی ہیں۔

اس رسالے میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے جا بجا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین زمانی ہونا اور اس کا اجماعی عقیدہ ہونا اور مضمونِ ختمِ نبوت کا بہ درجہ تواتر منقول ہونا اور اس کے منکر کا کافر ہونا بھی ثابت فرمایا ہے۔ پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے جج صاحب کو ''تحذیر الناس'' کے صفحہ ۱۰ ر کی عبارت پڑھ کر سنائی۔

اور فرمایا کہ: حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''مناظرۂ عجیبہ'' جو اسی موضوع پر ہے، نیز ''آبِ حیات''، ''قاسم العلوم'' وغیرہ دیکھی جائیں۔

حضرت مولانا مرحوم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک دو نہیں؛ بلکہ تین قسم کی خاتمیت ثابت فرمائی ہے:

۱- بالذات: یعنی مرتبہ حضور کا خاتمیت ذاتی کا ہے؛ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصفِ نبوت کے ساتھ موصوف بالذات ہیں، اور دوسرے سب انبیائے کرام علیہم السلام موصوف بالعرض، اور آپ کے

واسطے سے، جیسا کہ عالم اسباب میں موصوف بالنور بالذات آفتاب ہے، اور اس کے ذریعے سے تمام کواکب، قمر وغیرہ اور دیگر اشیائے ارضیہ متصف بالنور ہوتی ہیں۔

یہی حال وصفِ نبوت کا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی وجہ سے سب سے پہلے نبوت ملی ہے، اور آیتِ میثاق:

''وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَةٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ''(۱).

سے واضح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ اس کے رسول ہیں، نبی الانبیاء بھی ہیں۔ تمام انبیا کی جماعت کو ایک طرف رکھا گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف، اور سب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور مدد کرنے کا عہد و پیمان لیا گیا، اور آیت میں ''ثُمَّ جَآءَکُمْ'' فرما کر یہ بھی تصریح کر دی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ ظہور سب سے آخر میں ہوگا۔

لیلۃ المعراج میں انبیا علیہم السلام کا صف بندی کر کے امام کا منتظر رہنا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امامت کرنا بھی اس امر کی صراحت کرتا ہے، نیز:

''وَاسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رُّسُلِنَا'' (الآیہ)

میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔

الاتقان میں ہے: ابن حبیب، عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: یہ آیت لیلۃ المعراج میں نازل ہوئی، پھر انبیائے بنی اسرائیل کے آخری نبی اولوالعزم کا خاتم النبیین علی الاطلاق کے دین کی نصرت کے لیے تشریف لانا، اور شریعتِ محمدیہ پر عمل فرمانا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہونے کا عملی مظاہرہ ہے، اور اس سے فضیلتِ محمدیہ کو واشگاف کر دینا مقصود ہے۔ واضح ہو کہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام اسلام کا عقیدۂ اجماعی اور متواتر عقیدہ ہے۔

۲- خاتمیت زمانی: یعنی آپ کا زمانۂ نبوت اس عالم مشاہدے میں انبیا علیہم السلام کے آخر میں ہے، آپ کے بعد کسی کو نبوت تفویض نہ ہوگی۔ ساتویں جلد روح المعانی میں حضرت ابی ابن کعبؓ سے مرفوعاً مروی ہے:

''بُدِئَ بِیَ الْخَلْقُ وَکُنْتُ آخِرُھُمْ فِی الْبَعْثِ''.

(۱) سورۂ آل عمران: ۸۱۔

''مجھ سے پیدائشِ مخلوق کی ابتدا کی گئی؛ لیکن میری بعثت سب سے آخر میں ہوگی''۔

اورحضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً مروی ہے:

''كُنتُ أَوَّلَ النَّبِيِّيْنَ فِي الْخَلْقِ وَآخِرَهُمْ فِي الْبَعْثِ''.

''میری پیدائش تمام انبیا سے پہلے ہوئی، اور بعثت سب کے بعد ہوگی''۔

حضرت نانوتویؒ نے تیسری خاتمیت مکانیہ ثابت فرمائی ہے:

''یعنی وہ زمین جس میں نبی کریم جلوہ افروز ہوئے، وہ تمام زمینوں میں بالاتر اور آخری ہے، اوراس کے اوپر کوئی زمین نہیں''۔

اس کو بہ دلائل ثابت فرمایا ہے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید حضرت مولانا نانوتویؒ کی نظر میں

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ

اس زمانے میں یہ بھی دیکھا جارہا ہے کہ یزید کو اہل سنت میں شامل کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ اسے بے قصور باور کرایا جارہا ہے۔ کچھ تو اپنے حلقے کے وہ لوگ بھی ہیں، جو نبی زادے بھی ہیں؛ لیکن ظلم یہ ہے کہ وہ یزیدی حلقے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ یہ تحریر اس سلسلے میں روشنی کا ایک مینار ثابت ہوگی۔ یہ تحریر دراصل ایک مکتوب کی صورت میں ہے۔ (نعمان)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جناب نے (جنہیں مکتوب لکھا گیا ہے وہ مراد ہیں) ان امور میں، جن کو میں نے در بارۂ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کے نام زد کرنے کے لیے کہا تھا، بہ خوبی غور نہیں فرمایا، جو اشکال آپ نے ظاہر فرمائے ہیں، وہ اسی بنا پر ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ''قاسم العلوم''، نمبر ۴ر صفحہ: ۱۳۱ر میں تحریر فرماتے ہیں:

''تا وقتے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ یزید پلید را ولی عہد خود کردند فاسق معلن نہ بود، اگر چیزے کردہ باشد، در پردہ کردہ باشد کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ را از اں خبر نہ بود۔ علاوہ بریں حسنِ تدبیر در جہاد آں چہ کہ از و مشہور است در بیت ام ملحان رضی اللہ عنہا کہ حضرت رسول رب العالمین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ اجمعین یک بار دو بار خفتند و بے دار شدند، ہر بار خندیدند و در وجہ خندہ فرمودند کہ جماعتے از امتیان خود را دیدہ ام کہ در دریا جہاد می کنند و در شانِ اوشان فرمودہ اند:

''مُلُوْکٌ عَلَی الْأَسِرَةِ أَوْ مِثْلُ الْمُلُوْکِ عَلَی الْأَسِرَةِ''.

مصداقِ خواب ثانی ہمیں یزید و ہم راہ یانش بر آمدند۔ چناں چہ بر تاریخ داناں وحدیث خواناں پوشیدہ نیست، غایت مافی الباب! بہ سبب خرابی ہائے پنہانی کہ داشت ہم چو منافقان کہ در بیعۃ الرضوان شریک بودند، بہ وجہ نفاق رضوان اللہ نصیب اوشاں نشد، یزید ہم از فضائل ایں

بشارت محروم ماند، و ایں طرف مذہب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ در بارۂ خلافت آں بود کہ ہر کرا سلیقۂ انتظام مملکت زائد از دیگراں باشد، گو افضل از و باشد، افضل است از دیگراں نظر بریں او را افضل از دیگراں دانستند، و اگر افضل نہ دانستند، پس بیش ازیں نیست کہ ترک افضل کردند۔ چناں چہ در مقدمات سابقہ واضح شدہ کہ استخلاف افضل افضل است، نہ واجب؛ لیکن ایں قدر گناہ نہ تواں گفت کہ بہ سبّ وشتم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پیش آئیم، و ایں طرف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ را از اجلۂ صحابہ می شماریم کہ بہ نسبت ترکِ افضل و اَولیٰ ہم دریں چنیں امور معذرت نمائیم، ہاں پس از انتقال او شاں یزید پائے خود از شکم بر آوردہ دل بہ کام دست بہ جام سپرد، اعلان نمود ترک صلاۃ داد، بہ حکم بعض مقدماتِ سابقہ قابل عزل گردید، و ایں قسم تحول احوال گفتہ آمدہ ام کہ ممکن است محال نیست؛ مگر دریں وقت رائے اہل الرائے و تدبیر مختلف افتاد کسے را کہ اندیشۂ فتنہ و فساد غالب افتاد، ناچار دست بہ بیعتش بہ کشادہ و احتراز عن المعصیۃ شرط اتباع معروف درمیان نہاد، و آں را کہ بہ وعدۂ یک جماعت کثیرہ مثلاً: امید غلبہ ورجا شوکت بہ نظر آمد، حسبۃً للہ برخاست و تہیہ کارزار ساخت، پس ہر چہ حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما و امثال او شاں کردند بجا کردندن، آں چہ حضرت سید الشہدا نمودند عین حق وصواب نمودند، بنا ایں اختلاف بر اختلاف امید است نہ بر اختلاف در جواز اصل فعل و عدم جواز آں؛ مگر انجام کار بہ وجۂ نقض عہد کوفیاں تدبیر حضرت سید الشہدا رضی اللہ عنہ بر نشانہ بہ نشست و روز عاشورہ قیامت قبل از قیامت در میدان کربلا بر کاست۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

بر ہمیں کار نہ فقط حضرت سید الشہدا رضی اللہ عنہ را پیش آمد در جہاں ایں چنیں اکثر پیش می آید، واقعۂ احد وحنین شنیدہ باشی۔ پس چناں کہ شہیدانِ احد وحنین بذروہ شہادت رسیدہ اند و از اں برہمی کار خللے در فضائل او شاں را نیافت، ہم چنیں شہیدانِ کربلا را باید شناخت۔

و ایں وقتے است کہ مجرد استخلاف امیر معاویہؓ یا بیعت مردم یا تسلط او خلافتش را عام و شامل شمارند و اگر بہ ایں قدر کہ بہ وقوع آمد فقط بہ انعقاد و مطلق خلافت او قائل شویم، و عموم و شمول خلافتش را تسلیم نہ کنیم، و گوئیم کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ و اتباع او شاں از ربقۂ طاعت او ہنوز خارج بودند حالت عزل ہیچ نیست و او شاں را در خروج بر محذور ے نے۔

و ایں فرق انعقاد مطلق عموم انعقاد ہر چند امروز کم فہمان نہ فہمند؛ مگر بہ تتبع معاملات سابقین واضح است کہ بیعت ہر کس را از اہل حل وعقد فقط موجب اطاعت در حق او و در حق خدم او می

شمر دندور نہ حاجت بیعت حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ واہتمام بہ داں بر دست حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ چہ بود وہم چنیں یزید بعد بیعت اہل شوم و دیگر اہل حل وعقد خواست گار بیعت از حضرت حسین وعبدالرحمٰن ابن ابی بکر و دیگر رضوان اللہ علیہم نہ شدے، چوں ایک قدر دانستہ شد دیگر معلوم باد کہ مدار کار بر نیت است بہ شہادت "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" وحسنِ نیت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ قابل آں نیست کہ در آں تر دد کردہ آید۔

اندریں صورت در شہادت حضرت امام ہمام رضی اللہ عنہ چہ تر دد نہ یزید در حق اوشاں خلیفہ بود، نہ خروج بر و ممنوع واگر خلیفہ بودتا ہم خروج ممنوع نہ بود واگر خروج ممنوع بود عزل ممنوع نہ بود وبالجملہ وجوہِ ممانعت مفقود وموجبات جہاد موجود در حسن نیت کلام نیست باز اگر اوشاں شہید نہ شوند دیگر خدام خواہد بود، واز یں ہم درگذر شتیم اگر موجبات جہاد نہ بودند اوشاں، نیز از قصد جہاد باز آمدہ می خواستند کہ براہ خود روند لشکریاں یزید پلید نہ گذاشتند ومحاصرہ کردہ ظلماً شہید ساختند "مَنْ قُتِلَ دُوْنَ عِرْضِہٖ وَمَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ".

باقی ماندہ اوشاں مخالفتِ اجماع کردند جوابش ایں ست کہ اول اجماع مسلم نیست اگر باشد عدم مخالفت باشد، بہ ایں ہمہ اجماع بر عدم جواز خروج بر ساق است ومعنی آں ہر چہ ہست عرض کردہ شد از اجماع بر عدم جواز خروج بر نفس فسق لازم نمی آید کہ خصوصیات زائدہ مراتب ایں کلی مشکک، نیز موجبِ خروج نہ تواں شد بہ ایں ہمہ اجماع غیر مسلم وقتے کہ حضراتِ حسنین رضوان اللہ علیہما وعبداللہ ابن الزبیرؓ واہل مدینہ کارے کردہ باشند مخالفت آں را مجمع علیہ چگونہ تواں گفت واگر بالفرض اجماع را تسلیم کنیم آں اجماع اگر منعقد گردیدہ۔ بعد حضراتِ امام حسین رضی اللہ عنہ منعقد گردید مخالفت ایں اجماع حضرت امام رضی اللہ عنہ را چہ مضر۔ غایۃ ما فی الباب امام ہمام رضی اللہ عنہ وزبان خود در یک مسئلہ مختلف فیہ خطا کردند محذور فیہ۔ چناں چہ عرض کردہ باشد اکنوں وقت آں ست کہ عبارت نووی رحمہ اللہ تعالیٰ دریں بارہ نقل کردہ شود تا تفصیل اجمال وتصدیق ایں مقال بہ دست آید۔

"أجمع أهل السنة أن لا ينعزل السلطان بالفسق، وأما الوجه المذكور في كتب الفقه لبعض أصحابنا أنه ينعزل وحكى المعتزلة أيضا فغلط من قائله مخالف الاجماع، قال العلماء: وسبب عدم العزالة وتحريم الخروج عليه ما يترتب على ذلك من الفتن وإراقة الدما وفساد ذات البين، فتكون

المفسدة في عزله أكثر منها في بقائه، قال القاضي عياض ــ رحمه الله ــ أجمع العلماء على أن الامامة لا تنعقد لكافر وعلى أنه لو طرأ عليه الكفر انعزل، قال: وكذا لو ترک اقامة الصلاة والدعا اليها، قال وكذالک عند جمهورهم البدعة، قال بعض البصريين: تنعقد له وتستدام له؛ لأنه متأول. قال القاضي: فلو طرأ عليه كفر و تغيير للشرع أو بدعة، خرج عن حكم الولاية وسقطت طاعته، ووجب على المسلمين القيام عليه وخلعه ونصب امام عادل ان أمكنهم ذلک؛ فان لم يقع ذلک الا لطائفة وجبت عليهم القيام بخلع الكافر ولا يجب في المبتدع الا اذا ظنوا القدرة عليه؛ فان تحققوا العجز لم يجب القيام وليهاجر المسلم من أرضه الى غيرها ويفر بدينه، قال ولا ينعقد لفاسق ابتدأ فلو طرأ على الخليفة فسق، قال بعضهم: يجب خلعه الا أن يترتب عليه فتنة وحرب، قال جماهير أهل السنة من الفقها والمحدثين والمتكلمين: لا ينعزل بالفسق والظلم وتعطيل الحقوق ولا يخلع ولا يجوز الخروج عليه بذلک؛ بل يجب وعظه وتخويفه للأحاديث الواردة في ذلک، قال القاضي وقد ادعى أبوبكر من مجاهد في هذا الاجماع، وقد رد عليه بعضهم هذا لقيام الحسين وابن الزبير وأهل المدينة علي بني أمية وبقيام جماعة عظيمة من التابعين والصدر الأول على الحجاج مع ابن الأشعث وتأول هذا القائل قوله: أن لا تنازع الأمر أهله في أئمة العدل وحجة الجمهور أن قيامهم على الحجاج ليس بمجرد الفسق؛ بل لا غير من الشرع وظاهر من الكفر، قال القاضي وقيل: ان هذا الخلاف كان أولا، ثم حصل الاجماع على منع الخروج عليهم. والله أعلم! انتهى بلفظه".

پس از مطالعہ ایں عبارت تصدیق اکثر مقدمات مذکورہ حاصل می شود، بالجملہ بر اصول اہل سنت حال یزید بہ نسبت سابق متبدل شد، نزدبعض کافر شد ونزدبعض کفر او محقق نہ گشت، اسلام سابق مخلوط بہ فسق لاحق شد، اگر حضرت امام کافرش پنداشتند درخروج برو چہ خطا کردند امام احمد رحمۃ اللہ علیہ را ہمیں خاطر پسند خاطر افتاد؛ مگر چناں کہ ممکن است کہ کفر کسے نزد یکے محقق شود ونزد دیگراں نہ شود، ہم چنیں خروج برو درحق ایں وآں مختلف خواہد بود، اتفاق در تکفیر وتفسیق وتعدیل

وتجر تح کسے ازضروریات دینی یا از بدیہیاتِ عقلی نیست کہ حاجت معذرت افتد۔

ودرصورتِ فسق آں چہ پیش کردہ ام یا دخواہد بود تا ہم ہیچ صعوبتے بر اصول اہل سنت نیست چہ یزید اندریں صورت یا فاسق معلن بود تارک صلاۃ وغیرہ یا مبتداع بود چہ از روسائے نواصب است بہ ایں ہمہ خلافتش غیر مسلم ،نظر بریں وجوہ بہ یادملفوظات سابقہ درخروج بروہیچ قباحتے نے بہ ایں ہمہ خروج بریں چنیں کساں تا حال نزد ہمہ جائز واگر نزد ہمہ جائز نیست ،نزدِ بعض جائز چناں چہ از مشاہدہ عبارت نووی رحمۃ اللہ علیہ واضح است ،ودرمسائل مختلفہ خلاف یکے مرد دیگراں راموجب تفسیق اوشان آں راو بطلان اعمال اوعنداللہ نمی تواں شد چناں چہ دانستہ شد۔

وگر فرض کنیم بر عدم جواز خروج چنیں کساں اجماع است، اجماع حادث است، اجماع قدیم نیست ،تابراصول اہل سنت در شہادت امام ہمام رضی اللہ عنہ تردد راہ یابد، زیادہ از زیادہ اگر کسے گوید ایں بہ گوید کہ: حضرت امام رضی اللہ عنہ خطا کردند؛ لیکن چہ حرج "اَلْمُجْتَهِدُ يُخْطِئُ وَيُصِيْبُ" بنائے ثواب بر نیت خطائے اجتہادی دریں بارہ مزاحم حال نمی شود۔ چناں چہ در اصول اہل سنت مصرح است وہم واضح است چہ اگر بہ ظن غروب روزہ افطار کردہ تا نماز مغرب بہ خواند ہنوز آفتاب غروب نہ شدہ بود، ایں کس را تا آخر عمر بر خطائے خود اطلاع نہ شد، ہرگز عاقلے تجویز نمی تواں کرد کہ از ثواب محروم ماند؛ ورنہ تکلیف مالا یطاق لازم خواہد آمد۔ ومحال: "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا".

آرے برطبق اصول شیعہ شہادت حضرت امام الشہد اءؓ در کنار دین وایمان شان ہم از دست می رود نعوذ باللہ منہا!، اگر باور نہ باشد بنگر کہ درکافی کلینی روایات دریں باب "کہ ہر کرا تقیہ نیست ودین ایماں نہ دارد" وارد شدہ اند مع سند نقل می کنم۔

۱ – عَنْ اِبْنِ عُمَرَ عَنْ هَاشِمِ بْنِ سَالِمٍ عَنْ اِبْنِ أَبِي عُمَرَ الْأَعْجَمِيِّ قَالَ: قَالَ أَبُوْ عَبْدِاللهِ: يَا أَبَا عُمَرَ! اِنَّ تِسْعَةَ أَعْشَارِ الدِّيْنِ فِي التَّقِيَّةِ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا تَقِيَّةَ لَهُ وَالتَّقِيَّةُ فِي كُلِّ شَيْئٍ وَفِي الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ.

۲ – عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيىَ عَنْ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عُمَرَ بْنِ خَلَّادٍ، قَالَ: سَأَلْتُ أَبَا الْحَسَنِ عَنِ الْقِيَامِ لِلْوُلَاةِ، فَقَالَ أَبُوْ جَعْفَرٍ التَّقِيَّةُ: دِيْنِي وَدِيْنُ آبَائِي وَلَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا تَقِيَّةَ لَهُ".

ازیں دوروایت مثل آفتاب روشن می برآید کہ ہر کہ تقیہ نہ کند بے دین وبے ایمان است،

اکنوں از حضراتِ شیعہ التماس است کہ اگر ہمیں تقیہ است، حسن خاتمہ حضرت امام الشہد اءمعلوم چہ جائے کہ شہادت وظاہر است کہ دریں روایت ہیچ گونہ گنجائش تاویل یا تخصیص نیست، اگر تاویل فرمایند، یا تخصیص بعددے وشخصے نمایند، مسموع نہ خواہد بود، اکنوں ازیں چارہ نیست کہ مذہب اہل سنت اختیار کنند واگر از اتباع حق عار وانکار است لاجرم از ائمہ دوازدہ گانہ یازدہ باقی خواہند اند اندریں صورت نکار راحق واصرار بر مذہب باطل لاجرم خواہد آمد۔

چہ حضرت امامؓ را دریں ضیق ناچاری کہ مقابل سی ہزار فوج جرار چند معدود بودند وآں ہم یکے بعد دیگرے شربت شہادت چسیدند تقیہ لازم بود، اگر در اول امر امید بود در آخر وقت کہ ہیچ کس نماند تقیہ لازم افتادہ بود:۔

من آں چہ شرط بلاغ است با تومی گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

وجواب دیگر ان شا اللہ تعالیٰ! بہ شرط فرصت عن قریب بہ نظر سامی خواہد گزشت لَا تَقْنَطُوْا ۔ ایں دو روایت کہ نقل کردہ شد اگر احتمال دروغ باشد مطابق نمایند، اگر نزد شما کافی کلینی موجود نہ باشد نسخہ مطبوعہ طہران نادما موجود است ملاحظہ نمایند۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهُ، وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلاً وَارْزُقْنَا اِجْتِنَابَهُ، وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ"[1].

ترجمہ از فارسی: "جس وقت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو اپنا ولی عہد کیا تھا، اس کا فسق ظاہر نہ تھا۔ اگر کچھ کیا ہوگا تو در پردہ، جس کی خبر امیر معاویہ کو نہ تھی۔ اس کے علاوہ جہاد میں ان سے حسنِ تدبیر کا مشاہدہ ہونا؛ چناں چہ ام ملحان رضی اللہ عنہا کے گھر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دو مرتبہ سونا اور جاگنا اور ہر مرتبہ ہنسنا مشہور بات ہے۔ آپ نے ہنسنے کی وجہ بیان فرمائی کہ: میں نے اپنی امت کی ایک جماعت کو دیکھا ہے کہ وہ دریا میں جہاد کر رہی ہے، جن کے متعلق کہا گیا ہے: "مُلُوْكٌ عَلَى الْأَسِرَّةِ أَوْ مِثْلُ الْمُلُوْكِ عَلَى الْأَسِرَّةِ". اس دوسرے خواب کا مصداق یزید اور اس کے ساتھی ہی نکلے۔ جیسا کہ تاریخ جاننے والوں اور احادیث کے پڑھنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔

(۱) قاسم العلوم نمبر ۱۴، ص: ۱۷۔

نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح بیعۃ الرضوان میں منافقین شریک ہوئے اور نفاق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی سے محروم ہوگئے، یزید بھی اپنی اندرونی خرابیوں کی وجہ سے اس بشارت کی فضیلت سے محروم ہوگیا، اور ادھر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا مذہب خلافت کے بارے میں یہ تھا کہ جو شخص بادشاہت کرنے کا سلیقہ دوسروں سے زیادہ رکھتا ہو، اگر چہ اس سے بہتر لوگ موجود ہوں؛ مگر ترجیح اسی کو ہوگی۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے یزید کو دوسروں سے بہتر جانا، یا اگر بہتر نہیں سمجھا، تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ افضل کو ترک کردیا، جیسا کہ مقدماتِ سابقہ سے واضح ہو چکا ہے کہ استخلاف افضل صرف افضل ہے، نہ کہ واجب، جس کو گناہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ سبّ وشتم کے ساتھ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے پیش آیا جائے۔ ہاں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اہم اجلۂ صحابہ میں شمار نہ کریں گے؛ بلکہ اولیٰ اور افضل کو چھوڑ دینے کی وجہ سے اس طرح کے امور میں ان کو معذور سمجھیں گے؛ البتہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد یزید نے ہاتھ پیر پھیلائے اور دل و جان سے برائی میں لگ گیا۔ برائی کا اعلان شروع کردیا، نماز چھوڑ دی، پس بعض مقدماتِ گزشتہ کی بناپر عزل کردینے کے لائق ہوگیا۔ حالات میں اس طرح کا الٹ پھیر جیسا کہ میں نے کہا ہے، ممکن ہے، محال نہیں ہے۔ شاید اس وقت اربابِ حل وعقد کی رائیں اور تدبیریں مختلف ہوگئیں، کسی پر فتنہ وفساد کا غلبہ ہوگیا، مجبوراً بیعت قبول کرلی اور گناہ سے بچنے کے لیے اتباع معروف کو بہ طور شرط مدنظر رکھا، اور جس کو ایک جماعت کثیرہ کے دعووں پر کام یابی اور دبدبے کی امید دکھائی دی، خدا کے بھروسے پر تیار ہوگیا اور لڑنے کا فیصلہ کرلیا؛ لہٰذا جو کچھ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اور آپ کی طرح دوسرں نے کیا، ٹھیک کیا۔ اور اسی طرح سید الشہداءؓ نے جو کچھ کیا، بالکل ٹھیک اور درست کیا۔ اس اختلاف کی بنیاد امیدوں کے اختلاف پر ہے، نہ کہ اصل فعل کے جائز وناجائز کی بنا پر اختلاف ہوا ہے؛ مگر اہل کوفہ کی غداری کی وجہ سے حضرت امام حسینؓ کی تدبیر کارگر نہ ہوئی، اور عاشورا کے دن میدان کربلا کے اندر قیامت سے پہلے ایک قیامت قائم ہوگئی۔ اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

اس طرح کے کاموں میں ایسی باتیں فقط سید الشہداءؓ ہی کو پیش نہیں آئی ہیں؛ بلکہ جہادوں میں اکثر آیا کرتی ہیں۔ مثلاً: واقعۂ احد وحنین کو سنا ہی گیا ہے، پس جس طرح شہدائے احد اور حنین شہادت کے مرتبے پر پہنچے، اور ان ہر دو واقعات کے کچھ کمزوری ہوجانے کی وجہ سے ان کے فضائل میں خلل نہیں پڑتا، اسی طرح شہدائے کربلا کو بھی جاننا چاہیے۔

اور یہ اس وقت ہے کہ صرف استخلافِ امیر معاویہؓ، یا لوگوں کا بیعت کرلینا، یا ان کا تسلط ہوجانا وغیرہ کی وجہ سے ان کی خلافت عام اور سب کو شامل شمار کریں، اور اگر اسی کو مان لیں کہ جو ہوا، تو صرف ان کی خلافت کے مطلقاً منعقد ہونے کے ہم قائل ہوں گے، اور ان کی خلافت کے عموم وشمول کے قائل نہ ہوں گے، اور ہم صاف کہہ دیں گے کہ: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما اور آپ کے اتباع و انصار امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اطاعت کی ذمے داری سے ہنوز خارج تھے۔ معزولی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور ایسی حالت میں ان لوگوں کے خروج میں ان پر کوئی گرفت بھی نہیں ہے۔

اگر چہ ناسمجھ لوگ انعقادِ مطلق اور عمومِ انعقاد کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ پس گزشتہ واقعات کے تتبع سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اربابِ حل وعقد میں سے ہر ایک کا بیعت کرلینا صرف اس کے حق میں اور اس کے ماتحتوں کے حق میں اطاعت کا سبب شمار کرتے ہیں؛ ورنہ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دست مبارک پر حضرت علیؓ کے بیعت کرلینے کے اہتمام کی کیا ضرورت تھی؟ اسی طرح یزید بھی اہل شام اور اربابِ حل وعقد کے بیعت کرلینے کے بعد حضرت حسینؓ وعبدالرحمٰن ابن ابی بکرؓ اور دیگر بزرگوں کا خواست گار نہ ہوتا۔ جب اتنی بات معلوم ہوچکی، تو جاننا چاہیے کہ ہر کام کا دارومدار نیت پر ہے؛ کیوں کہ حدیث میں ہے: "اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ"، اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حسن نیت اس کی مقتضی نہیں کہ اس میں تردد وتذبذب کو راہ دی جائے۔

موجودہ صورت میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت میں کیا شبہ ہے؟ یزید نہ تو خلیفہ تھا اور نہ یزید پر خروج کرنا ناجائز تھا، اور اگر خلیفہ تھا بھی، تو بھی اس پر خروج ممنوع نہ تھا، اور اگر مان ہی لیا جائے کہ خروج کرنا امام رضی اللہ عنہ کا جائز نہ تھا، تو عزل ممنوع نہ تھا۔

خلاصہ یہ کہ ممانعت کے اسباب مفقود اور اسباب جہاد موجود، تو پھر حسنِ نیت میں کیا کلام کیا جاسکتا ہے؟ پھر اگر یہ حضرات شہید نہ ہوں گے، تو دوسرا کون شہید ہوگا؟ اور ہم اس کو بھی چھوڑتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ: اگر اسباب جہاد نہ بھی تھے، تو آپ نے جہاد کے ارادے سے باز آکر چلے جانے کا راستہ مانگا؛ مگر یزید پلید کے لشکریوں نے جانے نہ دیا اور گھیر کر مظلوم شہید کردیا۔ حدیث میں ہے:

'جو شخص اپنے مال اور آبرو کی حفاظت میں قتل کردیا گیا، وہ بھی شہید ہے'۔

باقی رہ گئی یہ بات کہ امام حسینؓ نے اجماع کی مخالفت کی؟

سو اس کا جواب یہ ہے کہ: اولاً تو اجماع ہی تسلیم نہیں ہے، اگر ہوا بھی، تو اس بات پر کہ مخالفت نہیں ہوئی۔ بہ ایں ہمہ فاسق پر نہ خروج کرنے کے عدم جواز پر اجماع ہوا، اور اس کا مطلب جو کچھ ہے، پہلے عرض کیا گیا۔ عدم جواز پر اجماع کی وجہ سے نفس فسق پر خروج کرنا لازم نہیں آتا ہے؛ کیوں کہ اس کلی مشکک کے مراتب کے خصوصیات زائد بھی موجب خروج نہیں ہوسکتیں۔ پس اجماع غیر مسلم جس وقت کہ حضراتِ حسنینؓ وعبداللہ ابن زبیرؓ اور اہل مدینہ نے فیصلہ کرلیا تھا، اس کی مخالفت کو متفق علیہ کیوں کر کہا جاسکتا ہے؟ اور اگر بالفرض اجماع کو مان ہی لیا جائے، تو وہ اجماع حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بعد منعقد ہوا ہے؛ لہٰذا اس اجماع کی مخالفت حضرت امام حسینؓ کو کچھ مضر نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام موصوفؓ اپنے زمانے میں ایک اختلافی مسئلے میں غلطی کر گئے، جس میں کوئی شرعی باز پرس نہیں، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ اب ہم امام نوویؒ کی عبارت درج کردینا ضروری سمجھتے ہیں، تاکہ اس اجمال کی تفصیل اور گزشتہ باتوں کی تصدیق ہوجائے:

'اہل سنت کا اجماع ہو چکا ہے کہ: بہ وجہ فسق کے خلیفہ معزول نہیں ہوگا؛ لیکن ہمارے بعض اصحاب شوافع کی فقہی کتابوں میں ہے کہ معزول ہوگا، اور معتزلہ سے بھی اس کی حکایت کی گئی ہے، سو یہ غلط ہے، اور مخالف ہے اجماع کے۔ علما نے فرمایا ہے کہ: سلطان کے معزول نہ کرنے اور اس پر خروج نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنے سے خون ریزی اور فتنہ فساد باہمی بڑھ جائے گا، اور معزولی کا مفسدہ اس کے باقی رہنے سے زیادہ ہوجائے گا۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ: علما کا اجماع اس بات پر ہو چکا ہے کہ کافر کی امامت منعقد نہیں ہوتی ہے، اور اگر امام پر کفر طاری ہوجائے، تو معزول کردیا جائے گا، اور کہا ایسا ہی اگر نماز قائم کرنا اور اس کی طرف بلانا چھوڑے، تو بھی معزول ہوگا۔ فرمایا: اس طرح جمہور کے نزدیک بدعت کا پایا جانا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ: بعض بصریین قائل ہیں کہ بدعتی کی امامت منعقد ہوگی اور باقی رہے گی؛ کیوں کہ وہ تاویل کرتا ہے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں: اگر کفر اس پر طاری ہوا، اور شریعت کے اندر تغییر یا بدعت شروع کردیا، تو خلافت وولایت کے حکم سے نکل گیا، اور اس کی اطاعت جاتی رہی؛ لہٰذا مسلمانوں پر اس کے خلاف اٹھنا اس کو علاحدہ کرنا اور دوسرے عادل امام کو مقرر کرنا واجب ہوجاتا ہے، بہ شرطے کہ اس کی قدرت ہو۔ پس اگر ایسا کچھ ہی لوگ کرسکیں، تو کافر کو علاحدہ

کرنے کے لیے تو اٹھنا واجب ہو جاتا ہے، اور بدعتی پر واجب نہیں ہوتا ہے؛ مگر اس صورت میں کہ بدعتی کے علاحدہ کرنے پر لوگوں کو امکانی طاقت ہو، اور مجبوری متحقق ہو جائے، تو ایسے وقت میں اٹھنا نہیں چاہیے؛ بلکہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسری جگہ ہجرت کر جائیں اور اپنے دین کی طرف بھاگیں۔ فرمایا: اور فاسق کی امامت شروع شروع میں منعقد نہ ہوگی، ہاں! اگر خلیفہ فاسق ہو گیا، تو بعض اس کے عزل کو واجب کہتے ہیں، بہ شرطے کہ فتنہ وفساد اور جنگ وجدال نہ ہو۔

جمہور اہل سنت میں سے فقہائے محدثین اور متکلمین نے کہا ہے کہ: خلیفہ کی معزولی بہ وجہِ فسق، ظلم اور لوگوں کے حقوق کو چھوڑ دینے کی بنا پر نہ ہوگی، اور نہ اس کو علاحدہ کیا جائے گا، اور نہ اس پر اٹھنا جائز ہوگا؛ بلکہ اس کو سمجھانا اور ڈرانا ضروری ہوگا۔ ان حدیثوں کی بنا پر جو اس بارے میں موجود ہیں، قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ: اس مسئلے پر ابو بکر ابن مجاہد نے اجماع کا دعویٰ کیا ہے، اور لوگوں نے امام حسینؓ، ابن زبیرؓ اور اہل مدینہ کا بنی امیہ پر خروج کرنا اور تابعین کی ایک بڑی جماعت اور صدر اول کا حجاج پر ابن الاشعث کے ساتھ اٹھنے کو پیش کر کے ان کا رد کیا ہے، اور قائلین نے ان کے قول: ''لَانُنَازِعُ الْأَمْرَ أَهْلَهُ'' کی تاویل یہ کی ہے کہ: اس سے مراد امام عادل، نہ کہ اور حجاج پر خروج کی۔

دلیل جمہور کی یہ ہے کہ محض اس کے فاسق ہونے کی بنا پر نہیں ہے؛ بلکہ اس نے شریعت میں تغیر اور اظہار کفر کیا۔ قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: کہا گیا ہے کہ یہ اختلاف پہلے تھا، بعد کو ایسے لوگوں پر اٹھنا منع ہو گیا۔ واللہ اعلم!

علامہ نوویؒ کی اس عبارت کے مطالعے کے بعد مقدماتِ گزشتہ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ پس اہل سنت کے اصول پر یزید کی سابق حالت بدل گئی۔ بعض کے نزدیک کافر ہو گیا اور بعض لوگوں کے نزدیک اس کا کفر ثابت نہیں ہوا؛ بلکہ سابق اسلام فسق کے ساتھ مخلوط ہوگا۔ اگر امام موصوفؓ نے یزید کو کافر سمجھا، تو اس پر خروج کرنے میں کیا غلطی فرمائی؟ امام احمدؒ کو یہ بات پسند آئی، جیسا کہ یہ بات ممکن ہے کہ کسی کا کافر ہونا ایک شخص کے نزدیک ثابت ہو، اور دوسروں کے نزدیک ثابت نہ ہو، ایسا ہی اس پر خروج کرنے میں اختلاف ہو جائے گا اور تکفیر تفسیق، تعدیل اور جرح وغیرہ پر کسی کا اتفاق کرنا ضروریات دینی یا بدیہیات عقلی میں سے نہیں ہے، کہ عذر ومعذرت کی ضرورت پیش آئے۔

اور فسق کی صورت میں جو کچھ کہ میں نے پیش کیا ہے، وہ تو یاد ہی ہوگا، پھر بھی اہل سنت کے اصول پر کوئی دشواری نہیں ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں یزید یا تو کھلم کھلا فاسق تھا، یعنی تارک نماز وغیرہ یا پھر بدعتی تھا، یعنی بہت بڑا ناصبی تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس کی خلافت عام طور پر غیر مسلم تھی۔ ان وجوہِ مذکورہ کی بنا پر اس کے خلاف خروج کرنے میں کوئی قباحت نہیں رہ جاتی ہے۔ پس ایسے لوگوں کے خلاف اٹھنا اس وقت تمام لوگوں کے لیے جائز ہے، اور اگر تمام کے نزدیک جائز نہیں ہے، تو بعض کے نزدیک جائز، جیسا کہ علامہ نوویؒ کی عبارت سے سمجھا جاتا ہے، اور مسائل مختلف فیہ میں ایک کا خلاف دوسروں کے حق میں فسق وفجور کا سبب یا ان کی اعمال کا خدا کے نزدیک رائے گاں ہوجانا نہیں کہا جاسکتا، جیسا کہ سمجھا جاتا ہے۔

اور اگر مان بھی لیا جائے کہ ایسے لوگوں پر خروج کرنے کی عدم جواز پر اجماع ہو چکا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ: یہ اجماع حادث ہے، قدیم نہیں ہے کہ اہل سنت کے اصول پر حضرت امام حسینؓ کی شہادت میں شبہ وتردد کو دخل ہو۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی کچھ کہہ سکتا ہے، تو یہ کہ امام موصوفؓ نے غلطی کی؛ لیکن کوئی مضائقہ نہیں، جب کہ مشہور ہے کہ مجتہد کبھی چوک جاتا ہے اور کبھی نہیں؛ لہٰذا اجتہادی غلطی کی وجہ سے ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ جیسا کہ اہل سنت کے اصول میں طے ہو چکا ہے؛ کیوں کہ اگر کوئی آفتاب کے غروب کو سمجھ کر روزہ افطار کر لے، تاکہ نماز مغرب ادا کرے اور ابھی آفتاب ڈوبا نہیں تھا، اور اس آدمی کو زندگی بھر اپنی غلطی کا علم نہیں ہوا، کوئی عقل مند یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ غریب ثواب سے محروم ہوگیا؛ ورنہ پھر تکلیف مالا یطاق لازم آئے گی، جو محال ہے: "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا".

البتہ امامیہ کے اصول پر حضرت امام حسین کی شہادت دین وایمان سے بھی خارج ہوجاتی ہے۔ معاذ اللہ منہا! اگر کسی کو یقین نہ ہو، تو اس کو چاہیے کہ 'کافی کلینی' کے اندر اس باب میں جو روایات ہیں، ان کو دیکھے، لکھا ہے کہ جس نے تقیہ نہیں کیا، اس میں نہ تو دین ہے اور نہ ایمان، جس کو مع سند کے ہم نقل کرتے ہیں:

۱- ابن عمر روایت کرتے ہیں ہاشم ابن سالم سے، اور وہ روایت کرتے ہیں ابن ابوعمر اعجمی سے کہ کہا: فرمایا ابوعبداللہ نے: اے ابوعمر! دین کے دس میں سے نو حصے تقیہ میں ہے۔ اس کا دین نہیں جو تقیہ نہیں کرتا، اور تقیہ تو ہر چیز میں ہے اور مسح الخفین میں بھی۔

۲-محمد ابن یحییٰ روایت کرتے ہیں احمد ابن محمد ابن عمر ابن خلاد سے کہ میں نے حضرت علی

رضی اللہ عنہ سے بادشاہ وحاکم کے خلاف اٹھنے کے متعلق سوال کیا، ابوجعفر نے جواباً فرمایا کہ: تقیہ میرا اور میرے آباواجداد کا دین ہے، اس کا ایمان نہیں جو تقیہ نہیں کرتا۔

ان دونوں روایتوں سے آفتاب کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جو شخص تقیہ نہیں کرتا، وہ نہ صرف بے دین؛ بلکہ بے ایمان بھی ہے۔ ایسی صورت میں حضرات شیعہ سے گزارش ہے کہ اگر یہی تقیہ ہے، تو پھر حضرت امام الشہداءؓ کے حسنِ خاتمہ ہی یقینی نہیں، پھر شہادت تو دوسری بات ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان روایات میں نہ تو تاویل کی اور نہ تخصیص کی کوئی گنجائش ہے۔ اگر تاویل تخصیص کریں بھی، تو کون قبول کرے گا؟ سوائے اس کے چارہ کار نہیں کہ اہل سنت کا مذہب اختیار کریں، اور اگر حق مذہب وطریقے کے اتباع میں شرم محسوس ہوتی ہے، اور انکار ہی کرتے ہیں، تو ناچار پھر دوازدہ امام یا زادہ باقی رہ جاتے ہیں۔ اس صورت میں حق کا انکار اور باطل مذہب پر ضد کرنا لازم آتا ہے؛ کیوں کہ حضرت امامؓ اس مجبوری و لاچاری میں کہ تیس ہزار فوج کے مقابلے میں صرف چند گنتی کے لوگوں کا ہونا اور پھر یکے بعد دیگرے شربت شہادت کو نوش فرمانا، اس حالت میں تقیہ کرنا ضروری تھا۔ مانا کہ ابتداً امید تھی؛ لیکن جب کہ آخر میں کوئی نہیں رہ گیا تھا، تقیہ کرنا ضروری ہو گیا تھا''۔

میں نے یہ عبارت بہ تمامہا آپ کے سامنے پیش کردی ہے۔ یہ رسالہ اسی شبہ کے متعلق لکھا گیا ہے، جس کو آپ نے پیش فرمایا ہے۔ صفحہ ۱۳ تک تمہیدات ہیں، جن میں بہت سی مفید باتیں آ گئی ہیں؛ مگر تطویل کے خوف سے اصل مقصد عرض کردیا گیا۔

مورخین کا یہ قول کہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یزید کے فسق و فجور کا علم تھا اور وہ معلن بالفسق تھا، اور باوجود اس کے انہوں نے استخلاف کی کوششیں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی وفات سے ہی شروع کردی تھیں، یقیناً شانِ صحابیت ہی نہیں؛ بلکہ شانِ عدالت کے بھی خلاف ہے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ "(۱).

''اور تم ہو بہتر امتوں سے جو بھیجی گئی ہے عالم میں، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے، اور ایمان لاتے ہو اللہ پر''۔

---

(۱) سورۂ آل عمران: ۱۱۰۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ"[۱].

''اوراسی طرح کیا ہم نے تم کوامت معتدل تاکہ ہوتم گواہ لوگوں پر''۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ، تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللهِ وَرِضْوَانًا، سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُوْدِ"[۲].

''محمد رسول اللہ کا اور جولوگ اس کے ساتھ ہیں، زورآور ہیں کافروں پر، نرم دل ہیں آپس میں، تو دیکھے ان کو رکوع میں اور سجدے میں، ڈھونڈتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی خوشی، پہچان ان کی ان کے منہ پر ہے سجدے کے اثر سے''۔

وَاعْلَمُوْآ أَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللهِ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ؛ وَلٰكِنَّ اللهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِي قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ، أُوْلٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ، فَضْلًا مِّنَ اللهِ وَنِعْمَةً، وَّاللهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ[۳].

''اور جان لو کہ تم میں رسول ہے اللہ کا، اگر وہ تمہاری بات مان لیا کرے بہت کاموں میں، تو تم پر مشکل پڑے، پر اللہ نے محبت ڈال دی تمہارے دلوں میں ایمان کی اور اچھا دکھایا اس کو تمہارے دلوں میں، اور نفرت ڈال دی تمہارے دل میں کفر اور گناہ اور نافرمانی کی۔ وہ لوگ ہی ہیں نیک راہ پر اللہ کے فضل سے اور احسان سے، اور اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکمت والا ہے''۔

يَوْمَ لَا يُخْزِي اللهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ، نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ، يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ[۴].

''جس دن کہ اللہ ذلیل نہ کرے گا نبی کو اور ان لوگوں کو جو یقین لاتے ہیں اس کے ساتھ، ان کی روشنی دوڑتی ہے ان کے آگے اور ان کے داہنے، کہتے ہیں کہ اے رب ہمارے! پوری کردے ہم کو ہماری روشنی اور معاف کر ہم کو، بے شک تو سب کچھ کر سکتا ہے''۔

ان آیات کو اور ان کے مثل دیگر آیات کو جو کہ قطعی طور پر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اعلیٰ درجے کی صفات کمالیہ پر شہادت دیتی ہیں، اور جن کے مصداق اول یہی حضرات ہیں، ان ہی کے ساتھ ساتھ ان اخبار احادیث صحیحہ کو بھی لیجیے، جو کہ عامہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کی شان میں وارد ہیں، مثلاً:

---

(۱) سورۂ بقرہ: ۱۴۳۔ (۲) سورۂ فتح: ۲۹۔

(۳) سورۂ حجرات: ۷/۸۔ (۴) سورۂ تحریم: ۸۔

"أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِأَيِّهِمْ اِقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ".

"میرے صحابہ مثل ستاروں کے ہیں، ان میں سے جن کی تم اقتدا کروگے ہدایت پاؤگے"۔

"خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ".

"سب سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر جو اس سے متصل، پھر جو اس سے متصل ہے"۔

فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا، مَا بَلَغَ مُدَّ صَحَابِيٍّ وَلَا نَصِيْفَهُ. (أو كما قال عليه الصلاة والسلام)

"اگر کوئی تم میں پہاڑ احد کے برابر سونا خرچ کرے، تو میرے صحابی کے مد کے ثواب اور نہ اس کے آدھے ثواب کے برابر پہنچے"۔

اَللّٰهَ اَللّٰهَ! فِي أَصْحَابِيْ مَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّي أَحَبَّهُمْ، وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِي أَبْغَضَهُمْ.

"ڈرو اللہ سے، ڈرو اللہ سے میرے اصحاب کے بارے میں، پس جو دوست رکھتا ہے ان کو، میری دوستی کی وجہ سے دوست رکھتا ہے ان کو، اور جو شخص کہ دشمنی رکھتا ہے پس بہ سبب دشمنی میرے کے دشمن رکھتا ہے"۔

ان روایات کے ہم معنی بہت احادیث صحیحہ ہیں، جو کہ عام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے اعلیٰ مناقب پر دلالت کرتی ہیں۔ پھر اس کے ساتھ اجماعِ امت کو لیجیے، جو کہ بتلاتا ہے کہ جس شخص نے ایمان کے ساتھ ایک لحظہ کے لیے بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کر لی، اور ایمان پر اس کی وفات ہوئی، وہ بعد کے تمام اولیا و اتقیا و ائمہ وغیرہ سے افضل ہے۔

ان امور مذکورۂ بالا کو دیکھتے ہوئے اگر مورخین کی یہ بات کہ فاسق یزید اور معلن بالفسق کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے نامزد بالخلافہ کیا مانی جائے؟ تو ان تمام نصوص کی تذلیل تو ہین ہی نہیں؛ بلکہ انکار لازم آئے گا۔ ایسی صورت میں تو معاذ اللہ! حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ انتہائی فسق اور معصیت میں مبتلا ہوئے، اور اسی بنا پر ان کی وفات ہوئی؛ بلکہ درجۂ کفر تک (والعیاذ باللہ) نوبت آتی ہے؛ (کیوں کہ استخلاف بالمعصیہ صاف ٹپکتا ہے)۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيْهِ اللّٰهُ رَعِيَّةً، فَلَمْ يَحُطْهَا بِنَصِيْحَةٍ، لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ"(۱).

---

(۱) بخاری شریف۔

''کوئی بندہ ایسا نہیں ہوگا کہ اگر اس کو اللہ تعالیٰ نے کسی رعیت کا راعی اور حاکم بنایا، اور اس نے ان کی نگہبانی اور حفاظت ان کی خیر خواہی کے ساتھ نہ کی، تو اس کو جنت کی خوش بو بھی نہ ملے گی''۔

''مَا مِنْ وَالٍ يَلِي رَعِيَّةَ الْمُسْلِمِيْنَ، فَيَمُوْتُ وَهُوَ غَاشٍ لَّهُمْ إِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ''(۱).

''کوئی شخص مسلمان رعایا کا والی یا حکم بنایا گیا، اور اس حالت میں مرا کہ وہ ان کے حقوق میں خیانت کرنے والا ظالم تھا، تو جنت اس پر حرام ہوگی''۔

''أَلَا! كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَالْإِمَامُ رَاعٍ، وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهِ''(۲).

''خبر دار ہو جاؤ! تم سب کے سب راعی اور والی ہو، اور تم سب کے سب مسئول ہو، اپنی رعیت سے۔ امام جو کہ لوگوں پر مقرر کیا گیا ہے، راعی ہے، اور اپنی رعیت سے مسئول ہے''۔

''مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا''. (الحديث)

''جس نے ہم کو دھوکا دیا، وہ ہم میں سے نہیں''۔

یہ مورخین کی روایتیں تو عموماً بے سر و پا ہوتی ہیں، نہ راویوں کا پتہ ہوتا ہے، نہ ان کی توثیق و تخریج کی خبر ہوتی ہے، نہ اتصال وانقطاع سے بحث ہوتی ہے۔ اور اگر بعض متقدمین نے سند کا التزام بھی کیا ہے، تو عموماً ان میں ہر غث وثمین سے اور ارسال اور انقطاع کے ساتھ لیا گیا ہے۔ (خواہ ابن اثیر ہوں، یا ابن قتیبہ ابن ابی الحدید ہوں، یا ابن سعد)۔

ان اخبار کو مستفاض ومتواتر قرار دینا بالکل غلط ہے، اور بے موقع ہے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق ان قطعی اور متواتر نصوص اور دلائل عقلیہ ونقلیہ کی موجودگی میں اگر روایاتِ صحیحہ احادیث کی بھی موجود ہوتیں، تو مردود یا مسؤل قرار دی جاتیں، چہ جائے کہ روایاتِ اصول۔ اب آپ اصول تنقید کو پیش نظر رکھ کر کوئی رائے قائم کیجیے۔

---

(۱) بخاری شریف۔

(۲) ایضاً: اس حدیث میں جو حاکم کو راعی کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر حاکم پر اپنے محکوم اور رعایا کی خبر گیری اور خیر خواہی اس طرح لازم کی گئی ہے، جس طرح جانور چرانے والوں پر جانوروں کے مالک کی طرف سے لازم کی جاتی ہے۔ اگر چرواہا جانوروں کی خیر خواہی اور خدمات مفیدہ کے انجام دینے میں کوتاہی کرتا ہے، تو مالک کے سامنے جواب دہ قرار دیا جاتا ہے؛ اس لیے لفظ راعی سے بلیغ کوئی اور لفظ مکمل نہ تھا، جس سے تعبیر فرمایا گیا۔ (مولانا نجم الدین اصلاحیؒ)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مورخین میں سے ان لوگوں کا قول کہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ حیات میں یزید معلن بالفسق تھا اور ان کو اس کی خبر تھی، اور پھر انہوں نے اس کو نامزد کیا، بالکل غلط ہے۔ ہاں ہوسکتا ہے کہ وہ اس وقت میں خفیہ طور پر فسق و فجور میں مبتلا ہو؛ مگر ان کو اس کے فسق و فجور کی اطلاع نہ ہو۔ ان کی وفات کے بعد وہ کھیل کھیلا اور جو کچھ نہ ہونا چاہیے تھا کر بیٹھا۔

اب اس کی نامزدگی کی خبر ممکن ہے کہ صحیح ہو، انہوں نے رومیوں اور عیسائی ممالک پر جہاد میں اس کی متعدد دفعہ جدوجہد اور کامیابیاں اور حسن تدبیر و انتظام کو مشاہدہ کر کے اپنی رائے کی بنا پر خلافت کے لیے قریشیت اور حریت عقل و بلوغ کے ساتھ لازم ترین شرط لیاقت، انتظام مملکت اور حسن تدبیر ہے، اور یہ اس میں پائی جاتی ہے، یا بدرجۂ کمال موجود ہے، جو کہ اوروں میں نہیں ہے، اور اگر ہے، تو اس درجے پر نہیں ہے کہ اس کی نامزدگی کردی ہو، (جیسا کہ بعض مورخین کا قول ہے)، یا یہ جدوجہد دوسرے اراکین خاندان بنی امیہ کی طرف سے کی گئی ہو، اور یزید بھی اس میں کوشاں رہا ہو؛ مگر عام لوگوں نے اس کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت کردیا ہو؛ کیوں کہ انہوں نے روکا نہیں، (جیسا کہ بعض مورخین کا خیال ہے)، یا یہ کہ نامزدگی ان کی طرف سے حقیقتاً یا حکماً کسی طرح نہیں ہوئی، ان کی وفات کے بعد اہل شام میں سے اہل حل وعقد نے اس کو جانشین اور خلیفہ بنادیا اور بیعت کر لی، جیسا کہ بعض دوسرے مورخوں کا قول ہے، یا یہ کہ وہ خود بالتغلب خلیفہ بن بیٹھا (بعض مورخ اس کے بھی قائل ہیں)۔

بہر حال! ان وجوہ کی بنا پر اس کی خلافت منعقد ہوگئی۔ آپ اس کو تسلیم فرماتے ہیں کہ نامزدگی، یا اہل حل وعقد کا بیعت کرنا؛ یہ تینوں امور انعقاد خلافت کے طرق میں سے ہے۔ اگرچہ تیسرا امر بالضرورۃ والمجبوریہ ہے۔ آپ کا یہ ارشاد کہ خلیفۂ عادل جس میں کل شروط امامت پائے جائیں، کسی دوسرے جامع شروط خلافت کو اپنا جانشین کر جائے اور وصیت کر جائے کہ فلاں شخص میرے بعد خلیفہ ہو، اس میں شروط سے اگر شروط خلافت مطلقہ مراد ہیں، جو کہ عقل، بلوغ، اسلام، قریشیہ سے عبارت ہے، تو یہ تو موجود ہی ہیں، اور یہی امور کتب کلام وفقہ میں مذکور ہیں۔ اور اگر شروط سے مراد شروط خلافت کاملہ ہیں، جن میں صلاح وتقویٰ، علم وغیرہ بھی معتبر ہیں، تو اس کی سند کیا ہے؟ کتب مذہب میں اس کو انعقاد خلافت کے لیے ضروری قرار نہیں دیا گیا ہے، اور اگر ایسا ضروری ہوگا تو چاہیے کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خلافت بھی صحیح نہ ہو؟ حال آں کہ بالاجماع ان کو نہ صرف خلیفہ؛ بلکہ خلیفۂ راشد بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کو نامزد کرنے والا سلیمان ابن عبدالملک کا حال معلوم ہے۔

بہر حال! وجوہِ مذکورہ بالا سے انعقاد مطلق ہو گیا؛ مگر عموم انعقاد میں جس سے ہر ایک پر اتباع لازم آ جائے اور مخالفت کرنا ممنوع ہو جائے، وہ نہیں ہوا تھا۔ انعقاد مطلق اور عموم انعقاد میں فرق ہے۔ عموم انعقاد جب متحقق ہوگا، جب کہ تمام اربابِ حل وعقد متفق ہو جائیں، بعض کی بیعت کافی نہ ہوگی، اور یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت بہت سے حضرات نے اگر چہ کر لی تھی، تاہم حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی بیعت کی کوشش کی گئی، اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد انہوں نے اس کو انجام دیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ یزید کوشاں تھا کہ حضرت امام حسین، حضرت عبداللہ ابن زبیر، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہ حضرات بیعت کر لیں، حال آں کہ یہ حضرات ملتجی بالحرم ہو گئے تھے۔ کسی نے جنگ کا ارادہ نہیں کیا تھا اور نہ بیعت کی تھی۔ ان حضرات کا اس زمانے میں اہل حل وعقد میں سے ہونا بدیہی امر ہے۔

اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ وجوہ عموم انعقاد ہی ہیں، اور انعقاد مطلق اور عموم انعقاد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تو پھر یزید کا بعد از ظہور فسق و فجور وہ حال ہی نہیں رہتا، جو ابتدا میں تھا، یعنی اس کے اعمال شنیعہ درجۂ کفر کو اگر پہنچ گئے تھے، جیسے کہ امام احمدؒ اور ایک جماعت کی رائے ہے، تب تو وہ یقیناً معزول عن الخلافت ہو ہی گیا تھا۔ اب امام حسین رضی اللہ عنہ کا ارادۂ جنگ خروج ہی نہیں شمار ہو سکتا، اور اگر اس کی حرکات ناشایستہ درجۂ کفر کو پہنچی تھیں، (جیسا کہ جمہور کا قول ہے) اول تو یہ مسئلہ مختلف فیہا ہے، ممکن ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی رائے یہی ہو، جو کہ حضرت امام احمدؒ اور ان کے موافقین کی ہے۔

علاوہ ازیں فاسق ہونے کے بعد خلیفہ معزول ہو جاتا ہے، یا نہیں؟ یہ مسئلہ اس وقت تک مجمع علیہ نہیں ہوتا تھا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے متبعین کی رائے یہ تھی کہ وہ معزول ہو گیا اور اس بنا پر اصلاحِ امت کی غرض سے انہوں نے جہاد کا ارادہ فرمایا۔

پھر باوجود اس کے خلع کا مسئلہ تو آج بھی متفق علیہ ہے، یعنی اگر خلیفہ نے ارتکابِ فسق کیا، تو اصحاب قدرت پر اس کا عزل کر دینا اور کسی عادل متقی کو خلیفہ کرنا لازم ہو جاتا ہے، بہ شرطے کہ اس کے عزل اور خلع سے مفاسد مصالح سے زائد نہ ہوں۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ان کے اتباع کی رائے میں مفاسد زیادہ نظر آئے، وہ اپنی بیعت پر قائم رہے، اور اہل مدینہ نے عموماً بعد از بیعت اور واپسی وفد از شام ایسا محسوس نہیں کیا اور سبھوں نے خلع کیا، جس کی بنا پر وہ قیامت خیز "واقعۂ حرہ" نمودار ہوا، جس سے مدینۂ منورہ اور مسجد نبوی اور حرم محترم کی انتہائی بے حرمتی اور تذلیل ہوئی۔ کیا مقتولینِ حرہ کو شہید نہیں کہا جائے گا؟

پھر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اہل کوفہ کے مواعید پر مطمئن ہوئے، بالخصوص حضرت مسلم و عقیل رحمۃ

اللہ علیہما کے خطوط کے بعد، جن میں پورا اطمینان اہل کوفہ کی طرف سے دلایا گیا تھا؛ اس لیے ان کا ارادۂ جہاد یقیناً صحیح تھا اور وہ خلع کرنے اور خروج کرنے میں کسی طرح باغی نہیں قرار دیے جاسکتے۔ ان کو صاف نظر آرہا تھا کہ ان حالات میں مفاسد کا قلع قمع ہوجائے گا اور خلل بہت کم ہوگا۔ اپنی ظفرمندی کے لیے متیقن تھے۔

پھر آپ اس کو بھی پس انداز نہ فرمائیں کہ اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ: میدانِ کربلا میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوگیا کہ اہل کوفہ نے غدر کیا اور مسلم وعقیل رحمۃ اللہ علیہما شہید کردیے گئے، اور یزید کی فوج یہاں آپہنچی ہے، تو کہلا بھیجا کہ: میں کوفہ نہیں جاتا اور نہ تم سے لڑنا چاہتا ہوں، مجھ کو مکۂ معظّمہ واپس جانے دو۔ دشمن اس پر راضی نہ ہوا، اور اصرار کیا کہ اس کے ہاتھ پر یزید کے لیے بیعت کریں۔

آپ نے فرمایا کہ: اگر مکۂ معظّمہ واپس نہیں جانے دیتے، تو مجھ کو چھوڑ دو، کہیں دوسری طرف چلا جاؤں گا۔ وہ اس پر راضی نہ ہوا۔

تو آپ نے فرمایا کہ: اچھا مجھ کو یزید کے پاس لے چلو، میں خود اس سے گفتگو کرلوں گا۔ وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا، اور جنگ یا بیعت پر مصر رہا۔

یہ تاریخی واقعہ بتلاتا ہے کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ ہر طرح مجبور ومظلوم قتل کیے گئے ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی شہادت میں کلام کیا جائے، تو تعجب خیز نہیں تو کیا ہے؟ چناں چہ یہ بھی تصریح آپ کتب تاریخ میں پائیں گے کہ یزید کو جب کہ اس کو اطلاع ہوئی کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ ان تینوں امور کو پیش فرمارہے تھے؛ مگر اس کے عامل نے کسی کو قبول نہیں کیا، تو بہت برہم ہوا، اور سرزنش کی۔ واللہ اعلم!

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں غور فرمائیں، مجھ کو قوی امید ہے کہ آپ کے جملہ شبہات کا ازالہ ہوجائے گا، اور مزید تفصیل کے لیے اگر خواہش ہو، تو ''قاسم العلوم'' کا یہ نمبر منگا کر دیکھ لیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کے متعلق بھی جناب نے غور نہیں فرمایا۔ غرض یہ تھی کہ غلط فہمی اور خطائے اجتہادی سے انبیا علیہم السلام بھی باوجود معصیت از ذنوب معصوم نہیں ہیں، اور ان سے بھی اس غلط فہمی سے بڑے سے بڑا امر سرزد ہوسکتا ہے، اور اس پر مواخذہ نہیں ہوتا۔ حال آں کہ حسب قاعدہ: ''حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ''، ان سے چھوٹے چھوٹے اعمال پر بھی مواخذہ ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام پر مواخذہ بیٹے کے متعلق دعا کرنے پر، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر خوف ثلٰثہ کذبات کے متعلق طاری ہونا وغیرہ اسی قسم سے ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام قتل قبطی پر تو خائف ہیں؛ مگر حضرت ہارون علیہ السلام رمی الواح کے متعلق خوف کا تذکرہ تک بھی نہیں فرمارہے، کہ ان حضرات کی خطائے اجتہادی کا یہ حال ہے کہ سرزد بھی ہوتی ہے اور مواخذہ بھی نہیں ہوتا، تو غیر معصوم سے سرزد ہونا کیوں ممنوع ہوگا؟ اور اس پر گرفت کیوں ہوگی؟ بلکہ حسب ارشاد:

"اَلْمُجْتَهِدُ اِذَا أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ، وَاِذَا أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ".

ممکن ہے کہ اس کو اجر ملے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ غیر معصوم ہیں، اگر ان سے دربارۂ استحقاقِ خلافت اور شروط خلافت غلطی اجتہادی ہوجائے، اور وہ یزید کو مستحق خلافت سمجھ کر نامزد فرمادیں، یا یہ کہ خلافت میں قرشیت اسلام، حریت، بلوغ اور حسن تدبیر انتظام ہی کو شرط سمجھیں، تقویٰ اور دیانت ضروری قرار نہ دیں، تو کیا اس پر گرفت سے بچ نہیں سکتے؟(۱)۔

رہا حسن نیت کا سوال، تو جب کہ ہم کو عام مؤمنین کے ساتھ حسن ظن کا حکم ہے، تو ایک صحابی جس کے لیے دعوات نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والتحیۃ بھی موجود ہیں؛ کیوں نہ عمل میں لایا جائے؟ اگر آپ "مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا" پر عمل کرنے کی ہدایت فرماتے ہیں، تو دوسرا کہہ سکتا ہے کہ "لَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا" کا خطاب بھی تو موجود ہے۔ بہر حال! فکر وغور سے امور معروضہ میں کام لیجیے، جلدی مت فرمائیے(۲)۔

---

(۱) امام العصرؒ کا یہ والا نامہ اپنی جگہ پر اہم تحقیق اور ایک زبردست تاریخی انکشاف ہے، اور اتنا صاف اور واضح ہے کہ تلخیص کی چنداں ضرورت نہیں ہے؛ البتہ مذہب امامیہ کے بعض اصولی مذاہب کا نام آ گیا ہے؛ اس لیے اس کو صاف کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے:

۱- تقیہ ہے، جس پر آیت سورۂ آل عمران "اِلَّا أَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُ تُقَاةً" سے استدلال کیا جاتا ہے، حال آں کہ بہ قول صاحب "بیان القرآن" آیت ہذا میں خوف ضرر کے وقت دوستی کے اظہار اور عداوت کے اخفا کا ذکر ہے، اور تقیہ متعارفۃ میں کفر کا اظہار اور ایمان کا خفا ہوتا ہے۔ یعنی جس چیز کا حکم دیا اس سے کسی حادث کی وجہ سے کہ اپنے علم سابق کی بنا پر پلٹ جانا بدأ ہے۔ علامہ ابوجعفر نحاس نے اپنی کتاب "الناسخ والمنسوخ" میں نسخ اور بدأ کے فرق پر بحث فرمائی ہے، طول کے خیال سے ہم بداء کی تعریف پر اکتفا کر رہے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"وَأَمَّا الْبَدَأُ فَهُوَ تَرْكُ مَا عُزِمَ عَلَيْهِ".

مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کا ارادہ کیا اس کو چھوڑ دینا گویا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ بھی وہم اور غلطی میں پڑ گیا یا پڑ جاتا ہے۔

۳- امامیہ کا تیسرا بنیادی مسئلہ ایمان بالرجعت کا ہے۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ بادلوں کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں، چناں چہ جب وہ آسمان سے پکاریں گے، تو ہم ان کی اولاد کے ساتھ خروج کریں گے۔ (شرح مسلم) (اصلاحی)

(۲) (مضمون ماخوذ از): مکتوبات شیخ الاسلامؒ، ج:۱، مکتوب نمبر:۸۹۔

سفرِ آخرت

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں

حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ✽

اے برادرانِ اسلام! امتِ خیرِ انام، مشائخِ دین، اعیانِ ملت، عارفانِ وقت، علمائے عصر، حکمائے روز گار، اصحابِ تفسیر وحدیث، اہل فقہ وخیر کثیر، اربابِ قلم، شہ سوارانِ خطابت، اصحابِ زہد وتقویٰ، صاحبانِ جود وسخا!! بتادو دنیا سے کون چل بسا۔

اے شریعت وطریقت اور حقیقت کے علم بردارو! بتادو دنیا سے کون رخصت ہوگیا۔ کیا تم جانتے ہو کس سخی کی وفات کا سانحہ پیش آیا؟ کون سا دریا خشک ہوگیا؟ کس سورج کو گرہن لگا؟ کون سا شجر سایہ دار سوکھ گیا؟ خدا کی قسم! مولانا قاسمؒ کی رحلت سے دین کی رونق، ایمان ویقین کی روشنی اور حق وصداقت کی چمک جاتی رہی۔ جس وقت کہ وہ زندگی کے سانس پورے کرکے واصل بہ حق ہوگئے اور جوان نے ان سے بے وفائی کرکے احباب کو سوگوار کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

اگر ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ پیش نظر نہ ہوتا، تو ان کی موت میرے لیے جان لیوا ہوتی۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے، گویا مولانا مرحوم ہی کا مرثیہ کہتے ہوئے اس نے (درج ذیل) شعر کہے ہیں، ترجمہ:

اس شخص کی زبان میں تیری ثنا خواں ہے، جس کے ساتھ تو نے کوئی احسان نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تو بہ ذاتِ خود مستحق ستائش ہے۔

۱- مرحوم کے کارناموں نے ان کی زندگی کو بحال کردیا ہے، گویا وہ اپنے اس ذکر خیر کی بہ دولت زندہ ہیں۔

۲- لوگ ان کے ماتم میں یک زبان ہیں۔ یہ گھر میں گریہ وزاری اور آہ وفغاں بپا ہے۔

۳- اس چار پانچ گز زمین پہ تعجب ہے، جس کے اندر ایک عظیم اور بلند پہاڑ چھپ گیا ہے۔

✽والد گرامی: شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ کے مرثیہ کا اردو ترجمہ)

میں نے بھی مولانا مرحوم کے مرثیہ میں سابقہ اشعار کے وزن پر کچھ شعر کہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں مرحوم کے فیوض و برکات سے بہرہ مند کرے:

يَا قَاسِمَ الْخَيْرِ! مَنْ لِلْعِلْمِ وَالدِّيْنِ
إِذَا ارْتَحَلْتَ وَإِرْشَادٍ وَتَلْقِيْنِ

''اے قاسم الخیرات بتائیے! تمہاری رحلت کے بعد علم و دین کی اشاعت اور ارشاد و تلقین کا فریضہ کون انجام دے گا''؟

يَا قَاسِمَ الْخَيْرِ! مَنْ لِلطَّارِقِيْنَ وَمَنْ
لِلضَّارِعِيْنَ مَكْرُوْبٍ وَّمَحْزُوْنٍ

''اے قاسم الخیرات بتائیے! مہمانوں، کم زوروں، غم زدہ اور ستم رسیدہ لوگوں کی خبر گیری کون کرے گا''؟

يَا قَاسِمَ الْخَيْرِ! إِسْمَعْ مَنْ لِكُرُبَتِنَا
يَا قَاصِمَ الضَّيْرِ! قُلْ مَنْ لِلْمَسَاكِيْنِ

''اے قاسم الخیرات! سنیے تو سہی! مصیبتوں میں ہمارے کام کون آئے گا؟ اے ظلم و جور کو مٹانے والے! بے کسوں پر رحم کون کھائے گا''؟

مَنْ لِلْمَدَارِسِ مَنْ لِلْوَعْظِ مَنْ لِهُدیً
مَنْ لِلنُّكَاتِ تَوْضِيْحٍ وَتَبْيِيْنِ
مَنْ لِلشَّرِيْعَةِ أَوْ مَنْ لِلطَّرِيْقَةِ أَوْ
مَنْ لِلْحَقِيْقَةِ إِذَا رَسِيْتَ فِي الطِّيْنِ

''آپ کے قبر میں جانے کے بعد اب مدارس کی دیکھ بھال، وعظ، تلقین اور لوگوں کی رہنمائی کے لیے کون ہے؟ کوئی ہے جو نکات بیان کرے گا اور مشکل مباحث کو حل کرے گا؟ کون شریعت وطریقت اور حقیقت کے احکام واسرار سمجھائے گا؟

رَحَلْتَ عَنَّا وَلَمْ يُوْجَدْ عَدِيْلُكَ فِي
الْعُلُوْمِ وَالْفَضْلِ مِنْ عَرَبٍ إِلَى الصِّيْنِ

''آپ ہم سے اس حال میں رخصت ہوئے کہ عرب سے چین تک کوئی علم وفضل میں آپ کا ہم پلہ نہ تھا''۔

يَا عَيْنَ جُودِيْ بِدَمْعٍ غَيْرِ مُنْقَطِعٍ
عَلَى الَّذِيْ جَلَّ مِنْ مَدْحٍ وَّ تَابِيْنِ

''اے چشمِ من! تو پیہم آنسوؤں کو اس ذات پر برسا جو تعریف اور مرثیے سے بالاتر ہے''۔

كَهْفُ الْوَرٰى حُجَّةُ الْإِسْلَامِ مُرْشِدُهُ
نَجْمُ الْهِدَايَةِ رَجْمٌ لِّلشَّيَاطِيْنِ

''جو مرجع خلائق، اسلام کی برہان، اس کا مبلغ، رشد و ہدایت کا مینارہ ہے، جو شیطان کے لیے شہاب ثاقب ہے''۔

بَحْرُ الْعُلُوْمِ إِمَامُ الْكَوْنِ أَكْرَمَهُ
مُبَارَكُ الْإِسْمِ وَالزَّيْتُوْنِ وَالتِّيْنِ

''تین اور زیتون کی قسم! وہ علوم کے بحرِ بےکراں، کائنات کے پیش وا اور بابرکت نام والے تھے''۔

لَقَدْ مَضٰى صَاحِبِيْ مَنْ فِيْ مُصِيْبَتِهِ
بَرِئْتُ مِنْ ذِكْرِ إِسْلَاءٍ وَّتَسْكِيْنِ

''میرا رفیق چلتا بنا، وہ رفیق کہ جس کے صدمے میں مَیں لوگوں کی تعزیت اور تسلی سے بری الذمہ ہوں (یعنی میں خود مستحق تعزیت ہوں)''۔

مَنْ لِيْ بِصَدْرٍ عَنِ الْأَحْزَانِ مُنْقَطِعُ
مَنْ بِقَلْبٍ بِصَبْرٍ غَيْرِ مَقْرُوْنٍ

''مجھے بتائیے! کون ایسا شخص ہے، جس کا سینہ غموں سے خالی ہو، اور کون ہے، جس کا دل (غموں کی وجہ سے) صبر کا سہارا نہ لیے ہوئے ہو''۔

إِلَيْكَ صَبْرِيْ فَشَيْءٌ لَيْسَ يَشْغُلُنِيْ
عَنِ الْخَلِيْلِ إِلَّا يَا سَلْوَتِيْ بَيْنِيْ

''اے میرے صبر! مجھے تیری ضرورت نہیں؛ اس لیے کہ (دنیا میں) ایسی کوئی چیز نہیں جو مجھے میرے دوست سے غافل کردے، اور اے سامان تسلی! تو بھی اپنا کام کر چلتا بن''۔

وَكَيْفَ مَا سَتَرُوْهُ وَالتُّرَابُ وَلَا
يَكُوْنُ لِلشَّمْسِ مِنْ سَتْرٍ وَّتَدْفِيْنِ

''میرے ممدوح کو لوگوں نے کیسے زمین میں چھپا دیا؟ جب کہ سورج کو نہ چھپایا جاسکتا ہے، نہ دفن کیا جاسکتا ہے''۔

وَهُوَ الْبَیِّنُ اِنِّي لَاحِقٌ بِکُمْ
اِذَا ارْتَحَلْتُمْ وَاِنْ أُحْيَ اِلَی حِیْنٍ

''آپ کے جدا ہونے کے بعد آپ کی جدائی کے احساس کو میرے اس تصور نے قابل تحمل بنا دیا ہے کہ مجھے بھی کچھ روز زندہ رہ کر آپ سے آ ملنا ہے''۔

سَقَی الْاِلٰهُ ضَرِیْحاً أَنْتَ سَاکِنُهُ
وَیَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ یُّمْدِدُ بِتَأْمِیْنٍ

''اللہ تعالیٰ اس قبر کو سیراب کرے، جس میں آپ آرام فرما ہیں، اور جو ہماری اس دعا پر آمین کہے، اس پر بھی اللہ رحم فرمائے''۔''آمین!''۔

(۱) سوانح قاسمی، ج:۳، ص:۱۷۱-۱۶۹۔

حضرت نانوتوی کی وفات پر چند ہدایات

کرامت نامے: اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ مرقدہٗ

ذیل میں اعلیٰ حضرتؒ کے دو مکتوب گرامی درج کیے جا رہے ہیں جو حضرت نانوتویؒ کے انتقال پر حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ کو تعزیت کے لیے لکھا تھا۔ دوسرا گرامی نامہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ (مہتمم مدرسہ) کو لکھا تھا۔ ان میں چند ہدایات بھی ہیں جو مشعلِ راہ ہیں۔ (نعمان)

(۱)

تم میں جو بڑے اور مدرسے کے سرپرست تھے، راہیٔ دارِ بقا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

اب تم سب کو چاہیے کہ جان و دل سے مدرسے کی بہبودی اور بھلائی میں کوشش اور سعی کرو، کہ جس سے نعمائے دارین حاصل ہوں۔ خصوصاً تم کو بہت کوشش چاہیے کہ تم کو سب صاحب اپنا بڑا سمجھتے ہیں۔ تم کو مناسب ہے کہ سب سے جس جس کام پر معین ہیں، اس سے بہ خوبی کام لو، اور چند ایک باتیں اپنی ذات پر لازم واجب جانو:

- مدرسے کے تمام اوقات میں مدرسے کے کام کے سوا کچھ کام نہ کریں، یعنی چھ گھنٹے ہر روز برابر کام کیا کریں۔
- مدرسے میں صحاحِ ستہ سال بھر میں اسی طرح ختم ہوا کریں، جیسے حضرت مولانا احمد علی مرحوم کے (یہاں) ہوتی تھی۔
- جملہ اہلِ مدرسہ کی دل داری اور دل جوئی کا خیال رکھیں اور سب سے بہ اخلاق پیش آئیں، غصہ اور خفگی کو بے موقع راہ نہ دیں۔

❁ اگر کسی روز اپنی ذاتی غرض سے کام نہ کرسکیں، تو مدرسے سے تنخواہ نہ لیں، جیسے مولوی مظہر صاحب کرتے ہیں۔

❁ مدرسے سے قرض لینا جائز نہ رکھیں کہ درست نہیں، اپنے خرچ میں کوتاہی کریں۔

❁ غرض ہر امر میں موافق اللہ ورسول کے حکم کرتے رہو۔ ایسا نہ کرنا کہ اللہ ورسول کے سامنے شرمندگی ہو۔

یہ جو باتیں لکھی ہیں، حاجت لکھنے کی نہ تھی کہ تم سب جانتے ہو، مگر فقیر بھی ثواب میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ اگر تم سب ان امور کی رعایت رکھوگے، مجھ کو بھی ثواب ہوگا، اور فقیر کو تم سے یہی توقع ہے کہ مدرسے کے ان سب امور کو بہ خوبی بجالاؤگے اور بھلائی اور فلاح دارین کی حاصل کروگے۔

(۲)

ایک اور گرامی نامے میں شاہ رفیع الدین صاحبؒ مہتمم مدرسۂ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند کو لکھا:

عزیزمن! جو تم میں بڑے سرپرست مدرسے کے تھے، وہ جنت الفردوس کو سدھارے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تم سب صاحب بہ دل مدرسے کی بہبودی میں مصروف ہو، مگر فقیر بھی تم کو لکھ کے داخل ثواب ہوتا ہے۔

عزیزمن! تم کو کہ مدرسے کے مہتمم ہو، چند امور کا لحاظ چاہیے:

❁ اگر کسی کے ساتھ بےوجہ رعایت اور مروت کروگے، تو کل کو جواب دینا ہوگا۔

❁ مدرسے کا مال بیت المال ہے، اس سے قرض دام اور پیشگی تنخواہ مت دیا کرو، تم کو اس میں تصرف نہیں پہنچتا۔

❁ تیسرے: یوں تو سارے مدرس اس مدرسے کے فقیر کے عزیز اور پیارے ہیں؛ مگر عزیزم مولوی محمد یعقوب صاحب سے چند وجوہ سے زیادہ واسطہ ہے؛ لہٰذا اگر وہ مدرسے کے کسی کام میں کوتاہی کیا کریں، تو ان سے کام لیا کرو۔ ان شاء اللہ! وہ اس سے ناراض نہ ہوں گے؛ کیوں کہ دانا ہیں۔

❁ چوتھے: عزیزم مرحوم کے جو شاگرد اور مرید ہیں اور دوست ہیں، سب مدرسے کی طرف توجہ رکھیں، کہ عزیزم رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی عمدہ یادگار یہی مدرسہ ہے، اس سے غفلت نہ کریں۔

❁ پانچویں: عزیزم مرحوم کی اولاد کے ساتھ آپ صاحب رعایت اور مروت رکھیں، خصوصاً علم اور تربیت امور غیر میں بہت لحاظ رکھیں۔ فقیر چاہتا تھا کہ برخورداری احمد کو، یعنی فرزند عزیزم مرحوم کو اپنے پاس

بلا کر رکھوں اور یہاں مدرسے میں مولانا مولوی رحمت اللہ کی خدمت میں تحصیل علم کرے، اور جب تک فقیر جیے، اس سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھے؛ مگر اس کی والدہ شاید جدائی کو گوارہ نہ رکھیں، فقیر کو اس کی خاطر منظور ہے۔ اس واسطے اس امر میں سکوت کیا۔ بہر حال! دعا پر اکتفا کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو سب برائیوں اور تکلیفوں سے محفوظ رکھے اور علم نافع وعمل صالح نصیب کرے۔ آمین!

بہ خدمت جمیع عزیزاں ودوستاں سلام ودعا قبول باد۔

اور مضمون بالا کو واحد تصور فرمائیں۔ مکرر ہے کہ ہمیشہ مدرسے کی اطلاع کرتے رہیں، تا کہ ہر ایک کا حال معلوم ہوتا رہے[1]۔

(۱) (ماخوذ از): تحقیق معاملات دیوبند، ص: ۳۴/۳۵۔

قطعۂ تاریخِ وفات

قبلۂ اربابِ دین، کعبۂ اصحابِ یقین، حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ، بانی وسرپرست مدرسۂ اسلامیہ دیوبند، کہ بہ تاریخ ۴؍جمادی الاولیٰ، یوم پنج شنبہ، وقت صلاۃِ ظہر ۱۲۹۷ھ؍کو دارِ آخرت کی طرف رحلت فرمائی(۱)۔

وہ غم ہے قاسمِ بزمِ ہدا کی رحلت کا		کہ جرعہ نوش الم جس سے ہر درونہ ہے
یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزمِ عرفاں کا		مثالِ خمِ فلک جام واژگونہ ہے
کچھ اک زمیں ہی نہیں زرد رنگ اس غم سے		لباسِ چرخ بھی ماتم میں نیل گونہ ہے
ہے حامیانِ شریعت کو گر غم بے حد		تو سالکانِ طریقت کو اس سے دونہ ہے
کہاں ہے مدرسۂ دیں کا حامی بر حق		کہ ملک علم وعمل اُس بغیر سونہ ہے
نہ پوچھ حالِ دلِ زارِ تشنگانِ علوم		کہ ان کی زیست ترے ہجر میں چہ گونہ ہے
کیا ہے شعلۂ ہجراں نے گر جگر کو کباب		تو آتشِ غم فرقت نے دل کو بھونا ہے
مگر مزار مقدس سے تیرے اے خوش خو		ترے فدائیوں کو صبر ایک گونہ ہے
سرِ الم سے لکھی فضلؔ نے سنینِ وفات		وفاتِ سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے
		۱۲۹۷ھ(۲)

(۱) از نتائج طبع حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی۔

(۲) (ماخوذ از): سوانح قاسمی، ج:۳ ؍ص:۱۵۳۔

مرثیہ حضرت نانوتویؒ

مشتمل بر کیفیتِ اجرائے دار العلوم دیوبند

جانشینِ حجۃ الاسلامؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ

یہ مرثیہ حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ نے جلسہ منعقدہ ۲۰؍صفر المظفر ۱۳۲۴ھ/ ۱۵؍اپریل ۱۹۰۶ء میں سنا کر حضارِ مجلس کو مضطرو بے قرار بنا دیا تھا۔

ہیں مِنن اور محن دونوں جہاں میں تَوْأَمْ	حکمتِ حق کا ہے دونوں میں نرالا عالم
رحمت وفضلِ خدا جب ہے غضب پر سابق	کیوں نہ پھر قہر کو اس کے کہیں لطف وکرم
اس کی آغوشِ غضب میں ہیں ہزاروں رحمت	اس کے ہر لطف میں ہیں سیکڑوں الطاف وکرم
فضل سے اس کے کسی وقت نہ ہونا مایوس	خواہ پیش آئے مسرت تجھے اور خواہ الم
رحمتِ حق کی ہے تمہید سمجھ او ناداں	پیش دنیا میں جو کچھ آتا ہے اندوہ والم
انقلاباتِ جہاں واعظِ رب ہیں سُن	ہر تغیر سے صدا آتی فَافْهَمْ فَافْهَمْ
لِلّٰهِ الْحَمْدُ میری جان اور اِنَّا لِلّٰهِ	مرغِ ایمان کی ہیں بازوئیں دو مستحکم
دور اندیش وہی ہے کہ مصائب کے عوض	ہو کے خوش مرضیٔ مولیٰ کی کرے بیعِ سلم
جزر ومد بحرِ حوادث کا بہ چشم حق بیں	طرۂ شاہد تقریر کا ہے پیچ وخم
گردشِ دہر دکھاتی ہے ہمیں آنکھوں سے	كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ کا نقشہ ہر دم
کل کی ہے بات کہ تھی جہل کی گھن گھور گھٹا	جس طرف آنکھ اٹھاتے تھے محیطِ عالم
آبِ حیواں کی طرح علم ہوا تھا مخفی	ظلمتِ جہل سے مخلوق تھی اَعمیٰ واَصم
رحمتِ حق ہوئی حامی تو یکایک اٹھے	چند مردانِ خدا باندھ کے صف ٹھوک کے خم
یوسفِ علم شریعت کے خریدار بنے	جمع کر کے سرِ اخلاص سے معدود دِرم
سلسلہ ڈالا فقیرانہ بہ نام ایزد	کُوردہ (دیوبند) میں کہ جہاں بیٹھے ہیں اربابِ ہمم

شوق کہتا تھا بڑھو، ضعف کہے تھا ٹھہرو	ناتوانوں کا تھا کیا کہیے عجب ضیق میں دم
اتنے میں دیکھتے بس کیا ہیں کہ اک مردِ خدا (نانوتویؒ)	آرہا تیز روی سے ہے لیے ساتھ علم
بے نیازی وتوکل رخِ روشن سے نمود	قطع منزل کے لیے دونوں قدم تیغ دو دم
کس بلا کی تھی نظر پڑتے ہی جس کی فی الفور	پڑ گئی جان میں جان آ ہی گیا دَم میں دم
ناتوانوں کو ملا اس کی حمایت سے یہ زور	زینۂ بامِ ترقی پہ بڑھا سب کا قدم
تھی نرالی ہی کچھ اس مردِ صفا کی سج دھج	تھے عجائب کچھ اس شیرِ خدا کے دَم خَم
گاڑ کر اس نے علم ایک ندا کی ایسی	یک بہ یک چونک پڑے اہل مَدَر اہلِ خِیَم
اس کی آواز تھی یا بانگِ خلیل الٰہی	کہہ کے لبیک چلے اہل عرب اہلِ عجم
عقل وانصاف کا جس سر میں ذرا بھی تھا اثر	ذوق علمی کا تھا جس سینے میں تھوڑا سا بھی دَم
دین کا ذرہ بھی تھا قلب میں جس کے مُوْدَع	خیر کا شمّہ بھی تھا جس کے مقدر میں رقم
باندھ کر چُست کمر کہتے ہوئے نَحْنُ مَعَکْ	جس جگہ اس یَمِّ رحمت کا پڑا نقشِ قدم
اس مربیِ دل وجاں کی مسیحائی سے	علمِ دیں زندہ ہوا جہل نے لی راہِ عدم
ابر علم وعمل وفضل کا بادل برسا	جس جگہ اس یَمِّ رحمت کا پڑا نقشِ قدم
جہل کے جب سبھی کہنے لگے اِخْسَا اِخْسَا	چل دیا پاؤں دبے چپکے سے با بکتِ وژم
علم کو لا کے ثریا سے ثری پر رکھا	آنکھوں سے دیکھ لیا عَلَّمَ مَا لَمْ یَعْلَمْ
دولتِ علم سے سیراب کیا عالم کو	قاسمِ علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اس کا علم
اس کی آواز تھی بے شک قُم عیسیٰ کی صدا	جس کے صدقے سے لیا علم نے دوبارہ جنم
طائر علم شریعت کے لیے یہ دِیبَنْ	برکتِ حضرتِ قاسم سے ہے مامون حرم
سلسلے علم کے اَمصار وقریٰ تک جاری	اس کی ہمت سے ہوئے بل بے ترا فیض اَعم
جملہ اعیان واکابر تھے جلو میں اس کی	اس کی شوکت کو پہنچتی تھی کہاں شوکتِ جم
یک بہ یک حکمتِ باری نے جو پلٹی کھائی	چل دیے چھوڑ کے یہاں سب کو سوئے باغِ ارم
لوٹتے آگ پہ تھے حضرتِ یعقوب ورفیع	خوں آنکھوں سے بہاتے تھے رشید عالم
دیکھ کر حضرتِ امدادؒ کی زاری کو ملک	پر سمیٹے ہوئے کہتے تھے الٰہی اِرْحَم
اہلِ علم واہلِ ورع خاص وعوام عالم	سب نے تقسیم کیا پر نہ ہوا کم یہ غم
فرقِ درجات کا قصہ تو جدا ہے؛ لیکن	عام تھا عالمِ اجسام میں اس کا ماتم

متزلزل ہوئے سب مدرسے کے رکنِ رکین
ہل گئے ہائے غضب سلسلۂ خیر کے تھم

علم آتا تھا نظر ایک یتیم بے بس
اہلِ علم آہ تھے مایوس بہ چشمِ پُر نم

قاسمِ علم چلے علم بھی لو ساتھ چلا
کس کو تھامو گے کہو پکڑو گے کس کس کے قدم

ایک کا کرنا سفر دوسرے کا عزم سفر
جانِ عالم کے لیے دونوں تھے سوہانِ الم

ہوگیا سب کو یقین باندھ لیا سب نے خیال
سلسلہ علم کا ہوگیا بس درہم برہم

اسی مایوسی ومجبوری وحیرانی میں
مجتمع ہو کے اکابر نے بہ چشمِ پر نم

حضرت مرشدِ عالم (مہاجر مکیؒ) سے تمنا یہ کی
آپ اب اپنے تصرف میں لیں یہ کار اہم

غایتِ خلق سے فرمایا: نکما ہوں میں
باقی ہر حال میں ہوں ساتھ تمہارے منضم

چند کلمے کہے نرمی سے تسلی آمیز
ہوگئے زخم رسیدوں کے جگر کو مرہم

ہائے وہ نیچی نظر! ہائے شیریں الفاظ!
کس غضب کے تھے کہ دور ہوئی تلخی سم

آپ کی پاک توجہ سے ہوا سب کو سکون
علم کے اکھڑے ہوئے جم گئے واللہ قدم

کام اس مدرسے کا فضل وکرم سے اس کے
الغرض رو بہ ترقی ہی رہا ہر ہر دم

مذہبی جتنے سلاسل تھے، رہے سب جاری
کام کوئی نہ رکا، سہل تھا وہ یا مہتم

بعد چندے ہوا نیرنگئ قدرت کا ظہور
یعنی یعقوب ورفیع ہر دو وزیرِ اعظم

ہو کے مشتاق تھا پہنچے یکے بعد دگر
خدمتِ قاسمِ خیرات میں شاد وخرم

دست وپا بھی لو چلے، سر تو تھا پہلے ہی گیا
قلب بس باقی رہا، یعنی رشیدِ عالم

وہ بھی مجروح ستم دیدۂ ہجر احباب
جرعہ نوش ستم ودُرد کش ساغر غم

اسی اندوہ غم ویاس میں سبحان اللہ!
رحمتِ حق ہوئی مبذول بہ حال عالم

بھردیا قلبِ مقدس میں تمام عالم کا
درد وغم خیر وصلاح خوب ملا کر باہم

خاص کر ترکۂ قاسم کی محبت واللہ!
بے طرح اس دل اقدس میں ہوئی مستحکم

سب کی الفت پہ تھی اس کی ہی محبت غالب
سب غموں پر جو تھا ممتاز یہی تھا وہ غم

پھر تو کیا تھا! دی خدا نے وہ ترقی اس کو
دیکھ لیں آپ کہیں اپنی زباں سے کیا ہم

پوچھتے کیا ہو دماغوں کا ہمارے احوال
ہم غریبوں کا زمیں پر نہیں پڑتا تھا قدم

نہ رُکا پر نہ رکا پر نہ رُکا پر نہ رُکا
اس کا جو حکم تھا، تھا سیفِ قضائے مبرم

نہ چلا کوئی فساد ایسا کہ پاؤں نہ کٹے
فتنے نے سر نہ اٹھایا کہ ہوا ہو نہ قلم

کلفتیں جھیلیں سبھی، پر نہ ہوا چیں بہ جبیں	دقتیں دیکھیں، ٹلا اپنی جگہ سے نہ قدم
دشمن ودوست کے چہرے میں تفاوت ہے عیاں	سرسوں پھولی تھی وہاں اس نے ملا تھا عندم
سب مریضوں کے لیے ایک وہی تھا آنار	سیکڑوں زہر تھے، تریاق تھا بس اس کا دم
قاسم وحضرت امداد کو مرنے نہ دیا	بلکہ زندہ ہی رکھا سب کو علی وجہِ اتم
مُردوں کو زندہ کیا، زندوں کو مرنے نہ دیا	اس مسیحائی کو دیکھیں ذری ابن مریم
ہائے غم! ہائے ستم! ہائے غضب! ہائے الم!	آج اس سے بھی ہوا دیکھ لو خالی عالم
آگے کہنے کی ہے کچھ بات، نہ سننے کی تاب	لب تلک آتا ہے؛ لیکن یہ مقولہ پیہم
رحم بر بے کسیم ہیچ نہ کردی رفتی	ایکہ کفش کف پائے تو بود تاج سرم
آج تو قاسم وامداد سبھی مرتے ہیں	اس کا کیا ذکر ہے، برباد ہوئے تم یا ہم
منتظر بیٹھے ہیں اب ہم پہ گزرتا کیا ہے	قہر کا خوف ہے، پر ساتھ ہے امید کرم
تورحیم وملک بار ہے سَلِّمْ سَلِّمْ	ہم جہول اورزیاں کار ہیں اِرْحَمْ اِرْحَمْ
اے اسیرانِ غمِ قاسمِ خیر وبرکات	دے فقیرانِ سیر کوئی رشید جانم
پیروی کرتے رہو، سعی کو ہاتھوں سے نہ دو	بدلے یا درمے یا قدمے یا بہ قلم
بے نمک ہیں مرے اشعار؛ مگر تلخ نہیں	خالی از درد نہیں، گرچہ ہیں لشتم پشتم (١)

(١)(ماخوذ از):سوانح قاسمی، ج:٣،ص:٥٧-١٥٤۔

ادبیات:

مرثیہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندی قدس اللہ سرہٗ

مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم نے اس مرثیہ کی اشاعت کے وقت جو نوٹ لکھا تھا وہ یہ ہے:
''ہم سے پہلے جو لوگ عالمِ آخرت کا سفر کر جاتے ہیں، ان سے ہماری جدائی کی مدت اگرچہ غیر معین ہے؛ لیکن بہرحال عارضی ہے کہ اس دنیائے جنان و جاوداں میں ہم سب کو ایک دن زندگی کے ایک نئے تصور اور زمان و مکان کے قیود سے آزاد ہو کر باہم اکٹھا ہو جانا ہے:
وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ، وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ[1].
لیکن ایک محبت کرنے والے کے لوحِ دل پر یہ عارضی جدائی بھی کیسا داغِ حسرت ڈال جاتی ہے، اس کا اندازہ ذیل کے مرثیہ سے ہو سکتا ہے، جو حضرت شیخ الہندؒ جیسے باکمال شاگرد نے اپنے استاذ حضرت مولانا نانوتویؒ کی وفات پر کہا ہے''۔ (مرتب)

ہر چشم مثلِ ابر ہے کیوں اشک بار حیف		ہر سینہ مثلِ لالہ ہے کیوں داغ دار حیف
کس کی لگی ہے یہ نظرِ بد جہاں کو		دم میں ہوئی خزاں سے مبدل بہار حیف
ہے کیا سبب جہاں میں آتا نظر نہیں		جز آہ درد ناک ودم شعلہ بار حیف
زیبِ جبین ماہِ مبین کیوں ہے داغِ غم		زخمی جگر ہے کیوں گہر آب دار حیف
مسکن پذیر دل میں ہے کیوں رنج و یاس و آہ		سب خواہشوں نے دل سے کیا کیوں فرار حیف
یہ کس کی تیغِ غم نے کیا قتل عام آج		جاتا ہے شورِ نالہ جو گردوں سے پار حیف
ہر ایک کی زباں پہ ہے جاری دعائے مرگ		آتا نظر ہے ہر کوئی زار ونزار حیف

(۱) سورۂ روم کی آیت: ۶۴/ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور یہ دنیا کی زندگی تو نرا کھیل تماشا ہے، اور بے شک جو پچھلا گھر ہے، حقیقت میں وہی زندگی ہے۔ کاش وہ اس بات کو جانتے''۔

دشنہ کا کب گلو کو بھلا اشتیاق تھا
صبر و سکوں سے آتا تھا کب ہم کو عار حیف

کل تو آرزو تھی ہمیں عمرِ خضر کی
ہر دم اجل کا آج ہے کیوں انتظار حیف

یہ کون اٹھ گیا ہے کہ جی بیٹھا جائے ہے
یہ کون چھپ گیا کہ ہے حشر آشکار حیف

خورشیدِ علم آج ہوا کون سا غروب
عالم تمام کیوں نظر آتا ہے تار حیف

یہ کون چل بسا ہے کہ جس کے فراق میں
آتا زباں پر ہے میری بار بار حیف

آنکھوں میں جوشِ اشک ہے، سینے میں درد ہے
دل میں غم والم ہے زباں پر ہزار حیف

سر ٹکڑے ٹکڑے سینہ ہوا چاک چاک ہائے
دل پارہ پارہ جامہ ہوا تار تار حیف

مونس الم رفیق فغاں غم گسارِ غم
ہم درد وہم نفس اُف یار غار حیف

ہر بات جس کی مایۂ صبر شکیب تھی
عالم ہے اس کے ہجر میں اب بے قرار حیف

جو باعثِ نشاط دلِ ناصبور تھا
روتے ہیں ان کے ہجر میں اب زار زار حیف

جب باعثِ حیات ہی ہو موجبِ ممات
اللہ کیا کرے دل امیدوار حیف

ہاں اے اجل! خدا کے لیے چشمِ التفات
بے روئے یار زیست ہے اب ہم کو بار حیف

کیسی خوشی کہاں کی ہنسی کیا نشاط وعیش
وردِ زباں اب تو ہے لیل ونہار حیف

زیرِ زمیں ہی چل کے رہو ہم دمو کہ ہاں
کچھ لطف زندگی نہیں بے روئے یار حیف

اس مایۂ حیات کی فرقت میں یا نصیب
ہو پائے دار ہستی نا پائے دار حیف

اوروں کی زندگانی پہ ہو خاک دست رس
اپنی موت پر بھی نہیں اختیار حیف

پھولا نہیں سماتا ہوں کہتا ہے جب کوئی
کیا اعتبار ہستیٔ بے اعتبار حیف

بن جائے اپنے واسطے خضر رہِ عدم
ملتا نہیں ہے ایسا کوئی دست دار حیف

کیوں کر کہوں نہ موت سے بد تر حیات کو
غم جی میں، درد سینے میں، دل میں غبار حیف

جتنی تھیں خواہشیں، ہوئی یاس سے بد دل
شاخِ امید لائی تو کیا لائی بار حیف

وہ دیوبند رشک ارم جس کا تھا لقب
کہتا ہے عالم آج اسے دشت خار حیف

عالم سے ظلِّ رحمتِ حق جب کہ اٹھ گیا
رہ رہ کے کیوں نہ آئے مجھے بار بار حیف

”تقریرِ دل پذیر“ ہو جس کی غذائے روح
وہ تتمۂ اجل ستم روزگار حیف

کشاف دین وکتم عدم وائے بخت بد		شمس الہدیٰ وپردہ نشین غبار حیف
بادِ خزاں وگلشنِ دین اے زمانہ آہ!		برق فنا وخرمن صبر وقرار حیف
عیسیٰ دم اور صر صر مرگ اے فلک دریغ		گنج علوم وہبی وکنج مزار حیف
موسائے وقت وسحر اجل وا مصیبتا		خضرِ زمان وگوشہ نشین حصار حیف
یوسف لقا وچاہ لحد ہم دم الحذر		دیو قضا واصف دوران شکار حیف
کشتیٔ نوح وصدمہ طوفان الاماں		طغیانی حوادث وکوہ وقار حیف
جور سپہر وتکیہ گہ بے کساں فغاں		الطاف مرگ وعالمِ شب زندہ دار حیف
تحت الثریٰ وچشمۂ آب بقا غضب		سنگ مصایب وشجر بار دار حیف
وقف سموم ہو گل شاداب ہائے ہائے		پامال خارہ ہو دُرِ شاہ وار حیف
گو دم نہیں پہ نکلے ہے دل سے یہی صدا		پژمردہ آہ ہو گل خنداں ہزار حیف
جائیں عدم میں یوں کرم وفضل وجود آہ		عالم ہو اور حسرت وماتم ہزار حیف
فقر وہنر کمال وسخا جود واتقا		دستِ قضا سے بے سروپا ہوں ہزار حیف
مل جائیں فضل وعلم وعمل اب زمین میں		پیوندِ خاک زہد وسخا ہوں ہزار حیف[1]

---

(۱) (ماخوذ از): ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند، ربیع الاوّل ۱۳۷۳ھ/نومبر ۱۹۵۳ء، ص: ۴۷/۴۸۔

نوادرات

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

اے کجا رفت آں مدار ابتدا	آں محمدؐ قاسم مولائے ما
آیتے بودہ ز آیاتِ خدا	منبع جود وسخا، کانِ عطا
بود در اخلاص نیکو بے سہیم	سابق الاقران بالخلق العظیم
منبع علم لدنی بود آں	وقت تقریرش بدے گوہر فشاں
حامیٔ اسلام ودینِ احمدی	رد کنِ جملہ ہنود پادری
مرشد موصل برائے طالباں	ہادیٔ کامل برائے گم رہاں
داشت صرف علم دین ہمت بلند	مدرسہ کردہ بنا در دیوبند
مہتمم جملہ مدرس بے نظیر	فیض شاں لامع چو خورشید منیر[1]

---

(۱) مثنوی زیر و بم، ص: ۳۲۔

قاسم العلومؒ کے چند اہم افادات

بہ روایت حضرت مولانا عبدالغنی صاحب حافظ پھلاودیؒ ✿

یہ افادات مولانا عبدالغنی صاحب رحمہ اللہ نے ۱۷؍ ذی قعدہ ۱۳۴۲ھ؍ (۲۰؍ جون ۱۹۲۴ء) کو اپنی ایک مجلس میں بیان کیے تھے اور اسی وقت قلم بند کر لیے گئے تھے، اسی تحریر سے نقل کیے جا رہے ہیں۔

(۱)

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے حضرت مولوی محمد یعقوب صاحب اور جناب مولوی سید احمد حسن صاحب امروہی و جناب مولوی سید احمد صاحب دہلوی رحمہم اللہ تعالیٰ کو مخاطب فرما کر ان جملہ حضرات سے یہ استفسار فرمایا کہ: جناب باری تعالیٰ نے جو قرآن شریف کے اندر ارشاد فرمایا ہے کہ:

"فَتَبَارَکَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ".

تو اس جملے احسن الخالقین کے لفظ "احسن" کی صفت کو تو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، اور لفظ خالقین کے اندر جمع متکلم کو ارشاد فرمایا ہے، تو اس سے صاف طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خالق سوائے خدا کے کوئی اور بھی ہوسکتا ہے؛ ورنہ صیغۂ جمع متکلم فرمانے کے کیا معنی ہیں؟ تو اس کا کیا جواب ہے، اور مفسرین نے جو خالقین کی تفسیر مصورین کے ساتھ بیان کی ہے، تو اس کو میں پسند نہیں کرتا، اگرچہ یہ معنی ہو سکتے ہیں؛ لیکن ان میں طوالت ہے، اور تاویل کی ضرورت ہی نہیں؛ بلکہ لفظ اپنے ہی اصلی معنی میں ہے اور کسی تاویل کی ضرورت بھی نہ ہو، ایسے معنی بیان کیے جائیں؟

چناں چہ بہ جواب اس کے حضرت مولانا سید احمد حسن صاحبؒ نے حضرت قاسمؒ کے اصول وکلیات کی بنا پر یہ تفسیر بیان فرمائی کہ: چوں کہ صفات دو قسم کی ہوتی ہیں: ایک تو موصوف بالذات ہوتا ہے، دوسرا موصوف بالعرض؛ لہٰذا اصلی تو موصوف بالذات خالق خدا ہی ہے؛ لیکن موصوف بالعرض بہ وصف خالق اور بھی مخلوق میں سے ہوسکتا ہے، اور اسی وجہ سے لفظ "احسن" اختیار فرمایا ہے کہ جو خدا کے خالق ہونے کی

✿ تلمیذ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

بہ وصف احسن ثابت کرتا ہے، اور موصوف بالعرض بہ وصف خالقیت کسی مخلوق کے لیے بھی یہی ہوتا ہے۔ یہ تفسیر اپنے اصلی معنی میں ہی ہے، کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔ چناں چہ اس کا ثبوت اور مثال ہم کو اس آیت شریف سے کہ جو سورۂ یوسف کے اندر ہے کہ ''ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ'' سے پورے طور سے ملتا ہے، کہ وہاں بھی یہی صفت علیم ہونے کی خدا کی ہے کہ جو موصوف بالذات ہے، اور ذی علم کی صفت بشر کے اندر ممکن ہے کہ جو موصوف بالعرض ہے۔

اب رہی یہ بات کہ خالقین کی تفسیر مصورین کے ساتھ کیوں کر ہوسکتی ہے؟ تو اس کی صورت یہ ہے کہ جب کہ کائنات کا وجود حقیقت ممکن ہے کہ جو نہ محض وجود ہے، نہ محض عدم ہے؛ بلکہ دونوں سے مرکب ہے، اور وہ تیسری سے ہے کہ جیسے نور اور سائے کے درمیان میں ایک خط انتزاعی پیدا ہو جاتا ہے کہ جس کو نہ محض وجود کہہ سکتے ہیں، نہ محض عدم کہہ سکتے ہیں؛ بلکہ ایک تیسری شئ ہے کہ جس کو حقیقت ممکن کہہ سکتے ہیں۔ پس جب کہ یہ صفت انتزاعی مخلوق کی ثابت ہوگئی، تو مخلوق کے اندر جو صفت ہوگی، وہ بالعرض ہوگی، بالذات نہیں ہوسکتی (۱)؛ لہٰذا صفت خالقیت بھی بالعرض ہی مخلوق کے اندر ممکن ہوگی، اس صورت میں کوئی خلجان باقی نہیں رہتا۔

(۲)

۱- سورۂ بقرہ کے شروع آیت شریف میں جناب باری تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''آلٓمٓ ذٰلِکَ الْکِتَابُ لاَ رَیْبَ فِیْہِ''.

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ: ''اس کتاب کے اندر 'کچھ' شک نہیں ہے''۔

اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ الفاظ عربیہ کے اندر کوئی لفظ یا حرف ایسا نہیں ہے کہ جس کا ترجمہ ''کچھ'' ہوتا ہو، تو پھر یہ لفظ ترجمے کے اندر جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی وغیرہ نے فرمایا ہے، یہ زائد لفظ کہاں سے پیدا ہو گیا ہے؟ اگر لفظ زائد ہے، تو ترجمۂ مذکور کو غلط تسلیم کرنا پڑے گا،

---

(۱) یہ مضمون جس کتاب سے لیا گیا ہے، اس میں یہ جملے اس طرح تھے: ''مخلوق کے اندر جو صفت ہوگی، وہ بالعرض نہیں ہوسکتی''۔ اس پر مولانا نور الحسن راشد مدظلہٗ کو حضرت مولانا سید اخلاق حسین قاسمیؒ نے متوجہ کیا تھا۔ مولانا راشد نے کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں تصحیح کا عندیہ دیا تھا؛ لیکن شاید اس کا دوسرا ایڈیشن نہ چھپ سکا۔ پاکستانی ایڈیشن دو مرتبہ چھپ چکا ہے؛ لیکن اس میں یہ غلطی پہلے ایڈیشن کے مطابق موجود ہے۔ ہم نے اس میں یہ درست کر دیا ہے۔ (نعمان)

حال آں کہ ترجمہ صحیح اور مسلمہ ہے۔

تو جواب اس کا یہ ہے کہ علم صرف ونحو کے اندر یہ قاعدہ کلیہ مقرر ہو چکا ہے کہ عبارت عربی کے اندر جب کہ نکرہ تحت النفی واقع ہوتا ہے، تو جب کہ لا نافیہ کلی ہوا، تو ریب کا لفظ اس کے تحت میں ہوا، تو ''کچھ'' لفظ اس میں سے خود پیدا ہو گیا کہ فصاحت وبلاغت اعلیٰ درجے کی رکھتا ہے کہ جس کو ماہرانِ علم عربی خوب جان سکتے ہیں۔

(۳)

۲- دوسری جگہ جناب باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ''.

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ: ''جنت کے اندر جس شئ کے لیے تمہارے دل کی خواہش ہوگی، وہی چیز تم کو ملے گی''۔

تو اس پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ: اگر فرض کیجیے کہ کسی کی خواہش ہوئی کہ ہم کو جنت کے اندر شراب دنیوی، یا کوئی دیگر چیز مثلاً ملے، تو یہ کیوں کر ممکن ہے؟ لہٰذا اس شبہ کا جواب بھی اسی آیت کے الفاظ ہی کے اندر موجود ہے، وہ یہ ہے کہ لفظ ''فِيهَا'' کا لفظ یہ بتلاتا ہے کہ جو چیزیں جنت کے اندر پائی جاتی ہیں اور موجود ہیں، ان ہی چیزوں میں سے جس چیز کی تم کو خواہش ہوگی، تو وہ تم کو مل جائے گی۔ یہ اشیائے جنت کے لیے ہی ارشاد ہے، دنیوی چیزوں کے لیے نہیں ہے۔

(۴)

تیسری آیت شریفہ کے اندر جناب باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُؤُسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ.

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

''اے ایمان والو! جب اٹھو تم طرف نماز کے لیے، تو وضو کر لو تم، یعنی دھولو اپنے منہ کو اور دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک اور مسح کرو تم اپنے سر کا اور دھولو اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک''۔

تو ترجمہ آیت شریفہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب اٹھو تم نماز کے لیے تو وضو کر لو، اس ترتیب کے ساتھ جو

کہ بیان کی گئی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ نماز کے لیے اٹھنے کے وقت حکم وضو کرنے کا دیتے ہیں اور نماز کے لیے جب کھڑے ہوتے ہیں، جب تکبیر شروع ہو جاتی ہے، تو اس وقت وضو کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ حال آں کہ وضو بہت دیر پہلے ہی کی جاتی ہے، اور تکبیر کے وقت وضو کا ہونا دشوار ہے کہ عرصہ نہایت قلیل ہوتا ہے۔ تو یہ شبہ قوی ہوتا ہے؛ لہٰذا اسی بنا پر مفسرین کو بڑی دشواری اس کے معنی میں آئی ہے کہ جس کا ترجمہ صاحبِ جلالین نے ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے کہ تو یہ ظاہر ہے کہ ان معانی سے کس قدر تکلف کلام کے اندر پیدا ہوتا ہے، اور یہ کلام بہ طور طول ہی ہوتا ہے، اور صاحبِ جلالین نے تفسیر کے اندر تاویل کے بعد معانی بیان کیے ہیں کہ طول کلام پر مبنی ہیں، نہیں! بلکہ معنیٰ ایسے ہونے چاہئیں کہ اس تاویل کی بھی ضرورت باقی نہ رہے اور کلام بھی اپنے ہی معنی میں رہے۔

اس کی صورت یہ ہے کہ ہر فعل کے لیے بہ اعتبار اس کی ابتدا اور اس کی انتہا کے دو طرف مقرر ہیں، یعنی آغاز اور انجام! چناں چہ 'اِلَی الصَّلٰوۃِ' کے لفظ سے یہ ظاہر ہے، تو انتساب نسبت کسی فعل کے لیے جب ہی ثابت ہوگا، جب درمیان میں ہوتا، اس کا ثابت ہو جائے گا۔

"وَ اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ" کے معنی یہ ہوں گے کہ: جب تم اپنے مکان سے اٹھو نماز کی طرف، تو اوّل وضو کر لو، اور اپنے مکان سے ہی وضو کر کے نماز کے لیے چلو، تو یہ معانی درست ہو جائیں گے اور کوئی تکلف معانی میں باقی نہ رہے گا، اور اس وجہ سے اپنے مکان سے وضو کر کے جانا مستحب قرار پایا ہے؛ ورنہ کوئی وجہ مستحب ہونے وضو کی اپنے مکان پر کرنے کی نہیں ہے۔

اب وہ اعتراض بھی باقی نہیں رہتا ہے، اور معانی بھی بلا کسی تاویل کے اصولی معنی میں باقی رہتے ہیں۔ چناں چہ باری تعالیٰ شانہٗ نے "فَاغْسِلُوْا" کا لفظ اختیار فرمایا ہے، "وَغْسِلُوْا" ارشاد نہیں فرمایا، تا کہ اس مضمون کی طرف اشارہ ہو جائے [1]۔

(۱) قاسم العلوم والخیرات، ص:۸۱-۷۷۔

حضرت مولانا نانوتویؒ کے چند افادات

بہ روایت امیر شاہ خاں خورجویؒ

مرتب:

حضرت مولانا سید نورالحسن راشد کاندھلوی

(الف): امیر شاہ خاں صاحبؒ نے شیخ الہندؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے فرمایا:

''مشاہیر امت میں تین قسم کے افراد گذرے ہیں:

(۱) بعض ایسے ہیں کہ حقائقِ شرعیہ میں ان کا ذہن طول وعرض میں چلتا ہے۔ جیسے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کہ ہر مسئلے میں پھیلتے زیادہ ہیں اور ترتیب وتفصیل وتہذیب مواد میں زیادہ مستعد ہیں۔

(۲) بعض ایسے ہیں کہ جن کا ذہن عُلو کی طرف زیادہ چلتا ہے۔ جیسے شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ حقائق میں اس قدر بلند پرواز ہیں کہ اصحابِ ذوق کو بھی ان کے مدرک تک پہنچنا مشکل ہوجاتا ہے۔

(۳) اور بعض ایسے ہیں کہ جن کا ذہن عمق کی طرف زیادہ دوڑتا ہے۔ جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہ ہر مسئلے کی تہہ اور اصلیت کا سراغ لگا لیتے ہیں، اور ایسی اصل قائم فرما دیتے ہیں کہ سیکڑوں تفریعات اس سے ممکن ہو جاتی ہیں''۔

(ب): امیر شاہ خاںؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت مولانا نانوتویؒ نے فرمایا:

''قبول عام کی دو صورتیں ہیں: ایک وہ قبول جو خواص سے شروع ہو کر عوام تک پہنچے، اور دوسرا وہ جو عوام سے شروع ہو، اور اس کا اثر خواص تک بھی پہنچ جائے۔ پہلا قبول علامت مقبولیت ہے، نہ کہ دوسرا''[۱]۔

(ج): حضرت مولانا نانوتویؒ کا افادہ مولانا گیلانیؒ نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت مولانا نانوتویؒ فرماتے تھے:

''اجتماعی مدرسوں کا نقصان یہ ہے کہ ان سے علم کی کیفیت روز بہ روز گھٹنے لگی ہے''[۲]۔

---

(۱) ارواحِ ثلاثہ، ص: ۲۶۶۔ (۲) سوانح قاسمی، ج: ۱، ص: ۴۲۱۔

حضرت الاستاذؒ کے ساتھ بیتے ہوئے چند لمحات

حضرت مولانا منصور علی خاں رحمۃ اللہ علیہ

مذہبِ منصور کے حصۂ دوم کا مقالہ جسے صاحبِ ''مذہب منصور'' حضرت مولانا منصور علی خاں تلمیذِ خاص حضرت نانوتویؒ نے قلم بند فرما کر اپنی کتاب ''مذہب منصور'' کا جزو بنایا، یہ کتاب فن طب میں ہے، اور یہ حصہ حضرت نانوتویؒ کی سوانح سے متعلق ہے۔ (حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ)

ہندوستان میں اکثر مقامات پر مدارس دینی جناب مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی رائے اور مشورے سے جاری ہیں، خصوصاً مدرسۂ دیوبند میں اکثر طلبہ علمِ دین کی تحصیل کر کے اشاعت اسلام میں سعی کیا کرتے ہیں۔ اول مولانا مرحوم نے اس مدرسے کو چندے سے قائم کیا تھا، اور اب بھی بفضلہٖ تعالیٰ خوب ترقی کر رہا ہے۔ مولانا مرحوم کے رگ و ریشے میں علم وتقویٰ سرایت کر گیا تھا؛ بلکہ ان کا ذہن بھی علم کے رگ و ریشے میں جاری تھا۔ تمام احکام شرعی کو معقولات کر دیا۔ ان کا مقولہ تھا کہ: ''تمام احکام الٰہی و رسالت پناہی عقلی ہیں؛ مگر ہر عقل کو وہاں تک رسائی نہیں''۔ اور فی الواقع وہ جب کسی مسئلے کو دلائل عقلی سے ثابت کرتے تھے، تو اہل علم بھی حیران رہ جاتے تھے۔

ظاہر میں کوئی حکم اگرچہ خلاف قیاس معلوم ہوتا، تو مولانا کی تقریر سے بالکل عقل کے مطابق معلوم ہوتا تھا۔ اصول فلسفہ کو جو شرع شریف کے خلاف ہیں، جب دلائل عقلیہ سے رد کرنا شروع کرتے تھے، تو ایسا یقین ہوتا تھا کہ ارسطو وافلاطون ان کے مقابلے میں طفل مکتب تھے۔ بارہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے [۱]۔ ریاضت کر کے سلوک کو طے کیا تھا؛ لیکن علم ان کا خداداد وہبی تھا۔ مشکلاتِ تصوف کو ایسا حل کرتے تھے کہ سننے والے کا جی چاہتا تھا کہ صوفی بن جائے۔ احکام شرعیہ میں اگر کوئی شخص اعتراض کرتا، تو ایسی معقول تقریر فرماتے کہ معترضین کو اطمینان نصیب ہو جاتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ: ''مجھ کو اعتراض کا جواب دینے میں تامل نہیں ہوتا؛ بلکہ جواب میں اس قدر دلائل عقلی پیش نظر آتے ہیں کہ ان کو انتخاب کرنے میں ذرا تامل کرنا پڑتا ہے''۔

(۱) مضمون نگار سے یہاں تسامح ہوا ہے، حضرت نانوتویؒ کی فراغت تقریباً: ۱۲۶۵ھ/مطابق ۱۸۴۹ء میں ہوئی ہے، اور اس وقت آپ کی عمر سترہ سے اٹھارہ سال کے درمیان تھی؛ کیوں کہ ۱۲۶۰ھ/مطابق ۱۸۴۴ء میں آپ کا دہلی جانا یقینی ہے، اور تعلیم کا دورانیہ حسب بیانِ سوانح نگاراں چار سے پانچ سال ہے۔ (دیکھیے: مناظر احسن گیلانی، **سوانح قاسمی**، ج۱، ص: ۲۳۰-۲۲۹؛ اسیر ادروی، **مولانا قاسم نانوتوی-حیات اور کارنامے**، ص: ۵۰)۔

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اس قدر محبت اور اعتقاد رکھتے تھے کہ مدعیوں میں اس قدر نہیں پایا جاتا؛ بلکہ جملہ سادات کی نہایت تعظیم وتوقیر کیا کرتے تھے۔ نانوتہ ضلع سہارن پور ان ہی کی وجہ سے مشہور ہو گیا۔ ان کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد ہاشم صاحب مرحوم حضرت محمد ابن ابوبکر رضی اللہ عنہما کی اولاد میں سے تھے۔ دہلی میں جناب مولوی مملوک العلی صاحبؒ سے جو ان کے ہم جد تھے، تحصیل علوم کیے تھے۔ ۱۲۹۷ھ/ کی جمادی الثانیہ (مئی ۱۸۸۰ء) میں بہ مقام دیو بند انتقال فرمایا۔ تاریخی نام خورشید حسین تھا۔ ۱۲۹۴ھ/ (۱۸۷۷ء) میں اخیر حج اپنے والد ماجد کی طرف سے کیا تھا۔ میں بھی مولانا صاحبؒ کے ہمراہ علی گڑھ سے بیت اللہ شریف گیا تھا۔ جدہ میں پہنچ کر چند روز قیام کرنا پڑا، سواری نہیں ملی، اس وقت یہ شعر زبان فیض ترجمان پر جاری تھا: ؎

مانگا کریں گے ہم بھی دعا ہجر یار کی
آخر تو ضد ہوئی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

حرم مکہ کا ادب واحترام:

مکہ شریف جب قریب آیا، غسل فرمایا اور قریب صبح صادق کے وہاں داخل ہوئے۔ جناب حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ بہ طور استقبال تشریف لائے تھے۔ انہوں نے اپنے مکان میں جو دو منزلہ تھا، ٹھہرایا[1]۔ دروازے کے اوپر کے مکان پر مولانا صاحبؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے قیام کیا۔ مکان بہت وسیع تھا، سب ہمراہی اس میں جا بہ جا ٹھہر گئے۔ جب حضرت حاجی صاحبؒ تشریف لاتے، دونوں بزرگ کھڑے ہو کر تعظیم دیا کرتے تھے، اور نہایت مؤدب دوزانو ہو کر ان کے روبہ رو بیٹھ جایا کرتے۔ دونوں صاحبان میں کبھی کبھی خوش طبعی اور مذاق ہوا کرتا تھا، اتفاق سے مولانا صاحبؒ اس درجے میں موجود نہ تھے، صرف میں مولانا رشید احمد صاحبؒ کے پاس بیٹھا تھا، اور ان کا رخ دیوار کی جانب تھا، اس کمرے کے دروازے پر کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی، اور نیچے دروازے پر فقیروں نے ڈھول بجا کر سوال کرنا شروع کیا، مولانا رشید احمد صاحبؒ سمجھے کہ مولانا مرحوم تشریف لائے ہیں، خوش طبعی سے فرمایا کہ: اپنے یاروں کو بھی ہمراہ لائے ہیں؟ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ: سائل ہیں۔ مولانا رشید احمد صاحبؒ تعظیم کے واسطے کھڑے ہو گئے اور حضرت حاجی صاحبؒ کے روبہ رو مؤدب بیٹھ گئے۔ میں نے یہ واقعہ مولانا مرحوم سے عرض کیا، تو مسکرانے لگے۔

---

(۱) یہ مکان راقم الحروف تنویر احمد شریفی نے دیکھا ہے۔ حارۃ الباب میں "مسجد خالد ابن الولیدؓ" سے ذرا پہلے دائیں ہاتھ پر پہاڑ کی جانب تھا۔ اب یہ مکان اور حارۃ الباب توسیع حرم (۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء) میں آ گیا۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو عجیب قوتِ علمیہ عطا کی تھی۔ تمام نظریات ان کے نزدیک بدیہیات تھے؛ مگر جب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ وحدۃ الوجود میں کچھ تقریر فرماتے، تو خاموش ہو کر سنا کرتے تھے۔ جناب مولوی محمد مظہر صاحبؒ اس تقریر پر کچھ شبہات پیش کرتے، اور ان کا جواب بھی حضرت حاجی صاحبؒ نہایت متانت اور آسان طریقے سے ادا کرتے؛ مگر مولانا مرحوم کبھی کوئی شبہ بھی بیان نہ کرتے۔ اسی طرح مولانا رشید احمد صاحبؒ بھی خاموش بیٹھے سنا کرتے، اور کچھ چوں و چرا نہ کرتے۔ مولانا مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ: بعض آدمی حضرت حاجی صاحبؒ کا تقویٰ دیکھ کر معتقد ہوئے اور بعض عبادت اور ریاضت دیکھ کر، اور بعض کرامات دیکھ کر معتقد ہو گئے۔ میں صرف حضرت حاجی صاحبؒ کی قوتِ علمیہ کا معتقد ہوں۔

جب منزل بہ منزل مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا، جہاں سے روضۂ پاک صاحبِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم نظر آتا، تو فوراً جناب مولانا مرحوم نے اپنی نعلین اتار کر بغل میں دبالیں اور پابرہنہ چلنا شروع کیا۔ میں نے ان کی دیکھا دیکھی اپنی جوتیاں اتار کر ننگے پاؤں ہمراہ مولانا مرحوم کے چلنا شروع کیا، اس قدر پتھریاں پیر میں چبھنے لگیں کہ متحمل نہ ہو سکا۔ آخر پھر جوتا پہن کر چلنے لگا؛ مگر مولانا مرحوم مدینۂ منورہ تک کئی میل آخر شب تاریک میں اسی طرح چل کر پابرہنہ پہنچ گئے۔ مجھ کو سخت تعجب تھا کہ ننگے پیر کیوں کر آدمی ان خاردار پتھریوں میں چل سکتا ہے؟ حال آں کہ مولانا مرحوم از فرق تا قدم نہایت نازک و نرم تھے؛ مگر قوتِ عشق کے نزدیک سنگ و گل برابر ہیں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مولانا مرحوم کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر محبت اور عشق تھا؛ حتی کہ اسم گرامی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا سن کر لرزہ بدن پر پڑ جاتا تھا اور چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا، اور ایک عجیب حالت نمایاں ہو جاتی تھی، جو معرض وجود میں نہیں آ سکتی۔

مدینہ شریف میں جناب شاہ عبد الغنی صاحبؒ کے مکان پر قیام کیا، جو مولانا مرحوم کے استاد حدیث تھے۔ سوائے ابوداود کے صحیحین اور سنن ثلاثہ ان سے پڑھے تھے، اور ابوداؤد جو باقی تھی، ان کو اپنی شہرت کے زمانے میں بغل میں دبا کر جناب مولوی احمد علی صاحب محدث سہارن پوریؒ کی خدمت میں جا کر پڑھ لیا اور ایسے نکات حدیث وقت درس کے بیان کیے۔ مولانا احمد علی صاحب مرحوم مجمع عام میں طلبہ فارغ التحصیل کے روبہ رو ان توجیہاتِ مولانا مرحوم کو بیان فرما کر مولانا صاحبؒ کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔

توجیہ حدیث:

چناں چہ ان میں سے ایک توجیہہ بیان کرتا ہوں، وہ اس شبہ کا جواب ہے، جو حدیث شریف میں آیا

ہے کہ لفظ "غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ" اس وقت نازل ہوا، جب کہ عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے شکایت کی کہ اس آیت میں جہاد کے واسطے حکم ہے، میں اندھا کس طرح جہاد کر سکتا ہوں؟ اس پر شبہ یہ وارد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ایسی شکایت ہوگی، پس پہلے ہی آیت سابق کے ہمراہ یہ لفظ کیوں نہیں فرمایا؟

مولانا مرحوم نے اس شبہ کا جواب یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے "لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ" فرمایا ہے، "اَلْمَقْعدُوْنَ" نہیں فرمایا۔ عذر والے "مَقْعَدُوْنَ" میں داخل ہیں، اور بلا عذر بیٹھنے والے "قَاعِدِيْنَ" کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی بیان فرمادیا، جب نہ سمجھے، تو یہ لفظ بڑھانے کی اجازت دے دی گئی۔ کیا عمدہ توجیہہ ہے۔

بے خوفی اور توکل:

واپسی کے وقت جدہ میں کشتیوں پر سوار ہو کر سب قافلہ جہاز پر سوار ہونے کو جاتا تھا، اس قدر تیز وتند ہوا چلنے لگی کہ کشتیاں قریب غرق ہونے کو جھک جاتی تھیں، ہر ایک کا رنگ زرد ہو جاتا تھا؛ مگر مولانا مرحوم اپنے حال پر رہے، اور مولانا رشید احمد صاحبؒ جب کشتی قریب ڈوبنے کے ہو جاتی مسکراتے تھے، باقی سب بدحواس ہو گئے تھے۔ غرض صحیح وسالم جا کر جہاز پر سوار ہو گئے۔ ہاں! خوب یاد آیا، سوار ہونے سے قبل دو دن سمندر کے کنارے پر بہ طور سیر کے یہ کاتب حروف پھرتا تھا کہ ناگاہ جناب ظفر احمد عرف شیر شاہ ساکن رام پور ضلع سہارن پور مرید با اخلاص حضرت حاجی صاحبؒ موصوف کو کنارے سمندر پر پھرتا ہوا دیکھا، پہلی ملاقات تھی، بڑے تپاک سے بغل گیر ہوئے اور فوراً بیس روپیہ جیب میں سے نکال کر مجھ کو عنایت کرنے لگے کہ ان کو لے لو، تمہارے پاس خرچ نہ ہوگا اور فی الواقع بہ جز پانچ روپیہ کے میرے پاس کچھ باقی نہ تھا۔ میں نے نہیں لیے اور ان سے دریافت کیا کہ آپ یہاں کیسے پہنچے؟ فرمایا کہ: بمبئی میں وقت پر جہاز نہ ملا، اب ایک جہاز آتا تھا، اس نے مجھے بٹھالیا؛ اس لیے دیر ہوگئی، اب مدینہ شریف میں رہوں گا، سال آئندہ میں حج کرلوں گا۔

شاہ جی شیر شاہ صاحب ریاست رام پور میں صاحب خدمت تھے، تمام شہر کی گلی کوچے میں پہرہ دیتے، جو بیمار یا محتاج پاتے، اس کی غم خواری اور خدمت کرتے، جہاں شب ہوئی، وہیں لیٹ جاتے، بالکل متوکل بھوکے پیاسے خدمتِ خلق میں مشغول رہا کرتے۔ اگر کسی نے کھانے کے واسطے اصرار کیا کھا لیتے؛ ورنہ کچھ پروانہ کرتے، اور جب تک بیمار اچھا نہ ہو جاتا، اس کی دوا دارو و تیمارداری بڑی خوشی سے کرتے تھے، جب وہ اچھا ہو جاتا، تب دوسری جگہ چلے جاتے۔ احکام شروع کے بے حد پابند تھے۔ ایک دن زمانۂ

طالب علمی میں جامع مسجد کے اندر عصر کی نماز صحن مسجد میں یہ کاتب الحروف پڑھتا تھا، یکا یک بہت زور سے پانی برسنے لگا، مجھ کو فکر ہوئی کہ روبہ رو میرے تین کتابیں رکھی ہیں، خراب ہو جائیں گی، اس وقت کوئی آدمی مسجد میں نہ تھا، ناگاہ سیڑھیوں پر دھم دھم کی آواز سنی، جیسے کوئی دوڑا ہوا چلا آتا ہے، اور فوراً وہ تین کتابیں اٹھا کر مسجد کے اندر لے گیا۔ جب میں نماز سے فارغ ہوا دیکھتا کیا ہوں کہ وہ شخص شیر شاہ صاحب ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ اس وقت کیسے پہنچ گئے؟ فرمایا کہ: مسجد میں آتا تھا، تمہاری کتابیں دیکھ کر اٹھا لایا، حال آں کہ وہ وقت ایسا نہ تھا کہ مسجد میں آنے کی ضرورت ہو۔

ایک دن آدھی رات کے وقت میری آنکھ کھل گئی، ایک مسجد میں چار پائی پر سو رہا تھا۔ طبیعت میں بے اختیار پلاؤ کی طرف رغبت ہوئی، حال آں کہ کبھی ایسی عادت نہ تھی، اس وقت مجھ کو تعجب ہوا کہ بھلا اس وقت ایسی شئ کا بہم پہنچنا دشوار ہے، اسی خیال میں آنکھ کھل گئی۔ ایک شخص کو دیکھا کہ پیر پکڑ کر جگاتا ہے، غور کیا تو شیر شاہ صاحب ہیں، فرمایا: ذرا اٹھ کر یہ پلاؤ گرم ہے، کھالو۔ میری دعوت تھی، تمہارے واسطے صاحب خانہ سے مانگ کر لایا ہوں۔ مجھ کو زیادہ تعجب ہوا، اور ان کے فرمانے سے حسبِ خواہش نفس کے کھالیا؛ لیکن کئی دن تک حیرت طاری رہی۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو تقویٰ، زہد، معرفت، تصوف، سخاوت، شجاعت، حسن اخلاق اور ذہن سلیم ایسا عنایت فرمایا تھا کہ جس کی کچھ انتہا نہیں معلوم ہوتی تھی۔ واپسی میں جہاز کے اندر ایسے بیمار ہو گئے کہ اٹھنے بیٹھنے کی بالکل طاقت نہ رہی۔ بمبئی سے ریل میں اٹاوہ تک لیٹے ہوئے تشریف لائے، میری رانوں پر قدم مبارک رکھ لیا کرتے تھے، اٹاوہ سے مجھ کو وطن جانے کی اجازت فرمائی، اور چار روپیہ اپنے پاس سے عنایت کیے اور پانچ روپیہ مکہ شریف میں مسجد ابراہیم علیہ السلام کی حد میں مجھ کو لے جا کر عطا فرمائے تھے۔

وطن واپسی:

میں جب وطن آیا چند روز قیام کر کے نانوتہ پہنچا، اس وقت مولانا صاحبؒ کو اچھا تن درست پایا؛ بلکہ مجھ کو ملا جلال اول سے آخر تک پڑھایا؛ لیکن پہلی سی قوت نہ تھی۔ اس وقت مولانا صاحبؒ کی خدمت میں تحصیل علم کے واسطے مولوی محی الدین احمد خاں صاحب مراد آبادیؒ اور مولوی عبد العلی میرٹھیؒ اور مولوی رحیم اللہ بجنوریؒ حاضر تھے۔ میں ان کے اسباق کی بھی سماعت کرتا تھا؛ لیکن ان کے فضل وکمال کو کہاں پہنچتا، اور ان سے پہلے جناب مولانا مرحوم کی خدمتِ بابرکت میں مولوی احمد حسن صاحب امروہیؒ اور مولوی محمود حسن صاحب دیوبندیؒ اور مولوی فخر الدین گنگوہیؒ وغیرہ میرٹھ میں فارغ التحصیل ہو چکے تھے، اور کبھی کبھی نانوتہ

میں بھی مولانا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

مولانا صاحبؒ اور مولانا رشید احمد صاحبؒ میں نہایت محبت اور اتحاد تھا۔ کبھی گنگوہ کو کبھی رام پور ضلع سہارن پور میں جناب حکیم ضیاء الدین خلیفہ مجاز حافظ ضامن صاحبؒ اپنے پیر بھائی کے ساتھ جناب حاجی صاحبؒ کے ملنے کے لیے تشریف لے جاتے۔ ایک بار میں بھی ہم رکاب تھا۔ واپسی میں جب نانوتہ ایک میل رہا، مولانا صاحبؒ کا حجام نانوتہ سے آتا ہوا ملا، دریافت فرمایا، تو عرض کیا کہ: میں آپ ہی کے پاس جا رہا تھا۔ فرمایا کہ کیوں؟ عرض کیا کہ تھانہ دار نانوتہ نے ایک عورت کے بھگانے کا جرم مجھ پر لگا کر چالان کا حکم دیا ہے، میں بالکل بے قصور ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے بچائیے۔ جس وقت مسجد نانوتہ میں پہنچے، تو بیٹھتے ہی مجھ سے فرمایا کہ: منشی محمد یٰسین کو بلا لاؤ، میں ان کو بلا لایا، ان سے عجیب شانِ جلالی سے فرمایا کہ: اس غریب کو تھانہ دار نے بے قصور پکڑا ہے، تم اس سے کہہ دو کہ یہ ہمارا آدمی ہے، اس کو چھوڑ دو؛ ورنہ تم بھی نہ بچو گے۔ اگر اس کے ہاتھ میں ہتھ کڑی ڈالو گے، تو تمہاری ہاتھ میں بھی ہتھ کڑی پڑے گی۔ انہوں نے تھانہ دار کے پاس جا کر مولانا صاحبؒ کا ارشاد ہو بہ ہو کہلایا، اس نے کہا: اب کیا ہو سکتا ہے، روز نامچے میں اس کا نام لکھ دیا ہے۔ جب انہوں نے مولانا صاحبؒ سے تھانے دار کا یہ جواب کہا، تو فرمایا کہ پھر جا کر کہہ دو کہ اس کا نام روز نامچے سے نکال دو۔ منشی صاحب نے تھانے دار سے جا کر یہی کہہ دیا۔ اس نے کہا کہ لکھا ہوا نام کاٹنا بڑا جرم ہے، چلو میں بھی تمہارے ساتھ ہی مولانا صاحب کے پاس چلتا ہوں، وہ حاضر ہو کر مولانا صاحبؒ سے عرض کرنے لگا کہ: حضرت! نام نکالنا بڑا جرم ہے، اگر نام اس کا نکالا، تو نوکری میری جاتی رہے گی۔ فرمایا کہ: اس کا نام کاٹ دو، تمہاری نوکری ہرگز نہیں جائے گی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ مولانا صاحبؒ فرماتے ہیں، ایسا ہی ہوگا۔ جس نے وہ حالت دیکھی ہے، اس کے یقین میں ذرا شک نہیں؛ چناں چہ اس حجام کو چھوڑ دیا گیا اور تھانے دار بھی قائم رہا۔

قربانی کی رقم کا غیبی انتظام:

عید الاضحیٰ میں مولانا صاحبؒ کا دستور تھا کہ سالم جانور کی قربانی کیا کرتے تھے۔ صبح کے وقت میں بھی حاضر تھا، منشی محمد یٰسین صاحب تشریف لائے اور عرض کیا کہ: گائے کی قیمت سات روپیہ ٹھہر گئی ہے۔ فرمایا کہ: اچھا! وہ اٹھ کر چلے گئے۔ ایک گھنٹے میں ایک مسافر آدمی جو غریب مسکین معلوم ہوتا تھا، آیا اور مصافحہ کر کے بیٹھ کر جیب میں سے کچھ روپیہ نکال کر مولانا صاحبؒ کی نذر کیے۔ مولانا صاحبؒ نے وہ روپیہ مجھے دیے کہ منشی یٰسین صاحب کو دے دو۔ میں نے دیکھا: تو سات ہی روپیہ تھے۔ حیران رہ گیا کہ خداوند! یہ کیا

اسرار اور راز و نیاز ہے؟

ایک دفعہ میں نے مولانا صاحبؒ سے بر سبیل تذکرہ شکایت کی کہ مجھ کو کبھی رونا نہیں آیا۔ اسی دوپہر کو جب سو کر اٹھا، تو اس قدر رویا کہ ہر چند چاہتا تھا کہ موقوف کر دوں؛ لیکن آنسو نہیں تھمتے تھے، اور کوئی رونے کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پھر بہت دیر سے خیال آیا کہ صبح میں نے مولانا صاحبؒ سے درخواست کی تھی، یہ اسی کا ثمرہ ہے۔

مولانا صاحبؒ کی عادت تھی کہ مسجد کے سہ دری میں بیٹھا کرتے تھے، اور وہیں مہمانوں کا قیام ہوتا تھا۔ اگر زیادہ مہمان آئے، تو اپنے ماموں کے مکان پر ٹھہرا دیا کرتے تھے۔ میں سب مہمانوں کا بستر بچھایا کرتا تھا۔ ایک دن چند مہمان کھانا کھانے کے واسطے ہاتھ دھونے کو اٹھے، میں اور دوسرے صاحب نے ان کے ہاتھ دھلوائے؛ مگر ایک بڑھا مسکین شکستہ حال رہ گیا، اس کے کسی نے ہاتھ نہ دھلوائے۔ آخر وہ خود ہی لوٹے کے واسطے جھکا ہی تھا کہ مولانا صاحب نے اس سہ دری سے جھپٹ کر اس قدر جلد وہ لوٹا اٹھایا کہ میں حیران رہ گیا، اور دونوں ہاتھوں میں نہایت ادب سے لوٹا پکڑ کر اس بڑھے کے ہاتھ دھلا دیے۔ اس وقت کی ندامت جس قدر مجھ کو ہوئی ہے، بیان نہیں کر سکتا۔

منگلور کی مدرسی کے واسطے مہتمم صاحبؒ نے مولانا صاحبؒ سے مشورہ لیا، تو فرمایا کہ: پوڑ سے منصور علی کو بلا لو، اس کو ضرورت ہے۔ جب خط طلبی کا پوڑ پہنچا، میں فوراً آ کر منگلور چلا گیا اور دو مہینے تک وہاں رہا، مدرسی کی۔ اتنے میں جناب مولانا صاحبؒ سے ہمراہیوں کے رڑکی کو مباحثہ سر پرستی کے تشریف لائے، اور تلمیذ رشید کو منگلور بھیجا کہ اس کو ملنے کے واسطے بلا لاؤ، میں یہ مژدہ سنتے ہی مولوی فخر الدین صاحبؒ کے ہمراہ چلا گیا۔ سڑک پر بہلی کو ٹھہرا کر فرمایا کہ: تم بھی ضرور رڑکی آ جانا۔ حسبِ ارشاد دو تین روز کے بعد میں بھی رڑکی پہنچا، تو چند روز مولانا صاحبؒ رڑکی میں قیام فرما کر منگلور میں میرے پاس دو دن ٹھہرے اور قاضی محمد اسماعیل وغیرہ نے مہمان نوازی کی خوب داد دی۔ وقت تشریف بری مولانا صاحبؒ کے میں بھی رخصت لے کر ہم رکاب ہو لیا اور دیوبند سے وطن واپس چلا گیا۔

حضرت نانوتویؒ کی وفات:

اِدھر مولانا صاحبؒ کا مزاج پھر ناساز ہوا، ڈاکٹر عبد الرحمٰن نے علاج کے لیے اپنے پاس مظفر نگر میں مولاناؒ کو رکھا اور بہت خدمت و تیمار داری کی۔ میں مراد آباد سے قدم بوسی اور عیادت کے واسطے گیا، تو قدرے افاقہ تھا؛ مگر اصل مرض ابھی باقی تھا۔ خفیف بخار رہتا تھا۔ چند روز کے بعد مولوی رفیع الدینؒ مہتمم

مدرسہ کے خطوط جابجا پہنچے کہ اب حالت مرض ترقی پر ہے، جلد چلے آؤ۔ بندہ بھی خط دیکھتے ہی دیوبند پہنچا۔ مولوی ذوالفقار علی مرحوم کے مکان پر بڑا مجمع تھا۔ طرح طرح سے علاج کیا گیا؛ مگر کارگر نہ ہوا۔ جمعرات کو قریب دوپہر کے سب کا مشورہ ہوا کہ مولانا صاحبؒ کو مکان پر لے جانا مناسب ہے۔ چار پائی کو تمام خدام آہستہ آہستہ اٹھائے ہوئے مکان پر لے گئے۔ دو بجے کے بعد پاس انفاس کی آواز اس زور سے آنے لگی کہ باہر دروازے کے بھی میں نے سنی۔ مولانا رشید احمد صاحبؒ قریب چار پائی کے تشریف رکھتے تھے کہ انتقال فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

مدرسے میں غسل دیا گیا۔ جنازے کو بعد عصر کی نماز کے اٹھایا گیا۔ سیکڑوں آدمی جنازے کو اٹھانا چاہتے تھے۔ حاجی محمد عابد صاحبؒ نے فرمایا کہ: اس قدر ہجوم جنازہ اٹھانے کو سب کے سب مت کرو، چار پائی ٹوٹ جائے گی۔ قریب مغرب کے باغ میں جا کر جنازے کو رکھا۔ بعد نماز مغرب کے جب شب جمعہ شروع ہوئی، دفن کیا گیا۔ بہت آدمی جنازے میں کمبل پوش فقرا موجود تھے، بعد دفن کے سب غائب ہو گئے۔ دوسرے دن سے مخلوق رخصت ہونے لگی، میں اور مولوی احمد حسن صاحبؒ اور مرزا محمد نبی بیگؒ اور حاجی محمد اکبرؒ مرادآباد چلے آئے۔

حضرت نانوتویؒ کے عقائد وخصائل:

مولانا مرحوم کی عادت تھی کہ قرض لینے کا اگر اتفاق ہوتا، تو اس کو جلد ادا کر دیتے، اور فرماتے تھے کہ: دوستوں کا قرض جلد ادا کر دینا چاہیے۔ جھوٹ اور فریب سے بہت نفرت کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص ادنیٰ شئ بھی پیش کرتا، تو اس کو بڑی خوشی سے لے کر خود بھی کھاتے اور حاضرین کو بھی کھلاتے۔ خوراک ان کی بہت قلیل تھی، کبھی غذا کو بہت رغبت اور حرص سے نہیں کھایا۔ نہایت چھوٹا لقمہ لیا کرتے تھے اور ہر لقمے پر بسم اللہ ضرور پڑھا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت دیکھ کر خوشی بہت کرتے، مگر بہ قدر نمک چشی کے اس میں سے لیا کرتے، باقی سب کو دیا کرتے۔ عمل ان کا سنی تھا۔ ہر سنت کے اتباع میں بہت خیال رکھتے تھے، اور کبھی کبھی خلافی مسائل پر بھی عمل کر لیتے تھے۔

اور حضرت امام اعظمؒ اور حضرت محی الدین ابن عربیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے کمالات اور حالات کے نہایت معتقد تھے اور بہت ہی تعریف کیا کرتے تھے، اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے علوم کو سب بزرگانِ دین کے علوم سے اعلیٰ اور افضل بتلاتے تھے۔ نماز با جماعت ادا کرتے اور تکبیر اولیٰ کو کبھی ترک نہ کرتے۔ اذان ہوتے ہی نماز کا اہتمام شروع کر دیتے۔ حافظِ قرآن شریف تھے۔ ہمیشہ تہجد میں قرآن شریف پڑھا

کرتے۔ جاہلوں کی نذر نیاز کا کھانا کبھی نہ کھاتے۔ بزرگوں کے مزار پر جایا کرتے اور دعا کر کے چلے آتے۔سماعِ اولیاء اللہ کے قائل تھے۔اگر اکیلے کسی مزار پر جاتے اور دوسرا شخص وہاں موجود نہ ہوتا،تو آواز سے عرض کرتے کہ: آپ میرے واسطے دعا کریں،اور ہمراہیوں کے ساتھ آہستہ دعا اور سورتیں پڑھ کر چلے آتے۔مولانا بہت دیر تک شاہ مکمل صاحبؒ کے مزار پر مرادآباد میں بیٹھے رہے۔مجھ سے بہ وجہ سہو وغلفت اپنے قدم کی حفاظت نہ ہوسکی اور میرا پاؤں مزار شریف سے لگا ہوا دیکھ کر کانپنے لگے۔تمام بدن لرزتا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ سے میرا پیر اٹھا کر فوراً علاحدہ کر دیا۔مجھ کو بڑی شرمندگی اور خجالت ہوئی اور توبہ کی۔

مولانا صاحبؒ کے مرادآباد تشریف لانے سے تین چار ماہ قبل صوفی نسیم خاں صاحب نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالا خانۂ دروازہ نواب شبیر علی خاں میں تشریف رکھتے ہیں اور بہت سے آدمی بیعت کے لیے آنے لگے۔اس وقت خاں صاحب نے شیرینی منگوا کر صوفی صاحبؒ کے ہاں کہلا بھیجا کہ یہ اسی خواب کی تعبیر ہے، جواب ظاہر ہوئی۔

خواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:

ایسے چند اشخاص نے خواب میں یہی مضمون دیکھے۔ایک صاحب نے دیکھا کہ: جامع مسجد مرادآباد میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفید چادر پر تشریف رکھتے ہیں اور ایک آدمی کی جگہ خالی ہے۔ یہ صاحب خواب میں خالی جگہ پر بیٹھنے لگے،تو فرمایا کہ: یہ جگہ مولانا محمد قاسم کی ہے، دوسری جگہ بیٹھ جاؤ۔

اور ایک صاحب نے دیکھا کہ: لڑھکتا، گھومتا ہوا میری طرف آتا ہے، قریب میرے آ گیا، میں نے اس کو ہاتھ لگا کر دیکھا، تو وہ بھی اسی خواب کی وجہ سے مولانا صاحب سے بیعت ہوئے۔

مولانا کی عادت تھی کہ جب کوئی جانا چاہے، کبھی اصرار سے نہ روکا۔ جب مولانا نے قصد بریلی کیا، تو حافظ عبدالعزیزؒ بھتیجے حضرت میاں جی نور محمدؒ کے فرمانے سے دو روز اور ٹھہر گئے۔ میں ایک دن پہلے حصار سے آیا، میں نے بھی عرض کیا کہ: حضرت! میں آپ کی وجہ سے جلد آیا ہوں، دو روز اور قیام فرمائیے۔فرمایا کہ: اگر میری وجہ سے آئے ہو، تو میرے ساتھ چلو، میں بھی بریلی کو چلا گیا۔

تذکرۂ حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ

ایک نایاب گوشہ

یادگارِ اسلاف حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی ٭

حضرت چشتی صاحب مدظلہم کا پچاس سال پہلے کا قلمی تبرک ہے، اس میں بہت ہی قیمتی معلومات ہیں، جو حضرت چشتی صاحب مدظلہم کے ذوق کمال مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مدظلہم کو عافیت کے ساتھ تا دیر قائم رکھے۔ آمین! (نعمان)

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ستودہ صفات میں فطرت کی طرف سے جو اوصاف وکمالات ودیعت کیے گئے تھے، انہوں نے خلقِ خدا کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ جو بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، اپنے مذاق کے مطابق اپنے حوصلے اور ظرف کے بہ قدر فائدہ اٹھاتا تھا، اور ان کی ذات قدسی صفات کا والہ وشیدا ہو جاتا تھا۔ ایسے ہی مستفیدین میں ایک بزرگ محمد حسین ابن محمد مسعود مرادآبادیؒ تھے۔ یہ سید امانت علی حسینی چشتیؒ (المتوفی ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء) کے مخلص مرید تھے۔

انہیں بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی اور ان کے حالات کی بڑی جستجو تھی۔ جب کبھی حضرت نانوتویؒ کا مرادآباد یا بریلی میں ورودمسعود ہوتا، یہ خدمت میں برابر حاضر رہتے اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ومعارف سے بہرہ مند ہوتے تھے۔

انہوں نے ۱۲۸۲ھ/ (۱۸۶۶ء) میں بزرگانِ دین کا ایک تذکرہ فارسی زبان میں لکھنا شروع کیا تھا، جو کم وبیش چار سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔ اس کا نام ''انوار العارفین'' ہے۔ یہ ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء میں مطبع نول کشور۔ لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اب نہیں ملتا ہے۔ یہ تذکرہ مختصر، جامع اور مفید ہے۔ اس میں موصوف نے چار مشہور خانوادوں کے بزرگوں کا حال قلم بند کیا ہے، اور ان بزرگوں کا حال بھی لکھا ہے، جن کو انہوں نے دیکھا تھا۔ اس کتاب میں چشتیہ صابریہ سلسلے کے بزرگوں کے تذکرے میں حضرت نانوتویؒ

٭ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی)

سے بعض بڑی اہم اور نہایت مفید معلومات نقل کی ہیں۔ چناں چہ شاہ عبدالرحیم چشتی افغانی سہارن پوریؒ (شہید ۱۲۴۶ھ/ ۳۱-۱۸۳۰ء) کے تذکرے میں رقم طراز ہیں:

''بیعتِ جہاد با جناب سید احمد صاحب کردند حضرت حاجی مولوی محمد قاسم صاحب در مجلسے با راقم نقل می فرمودند کہ چوں ہر دو ذات بابرکات بعد فراغ مراقبہ باہم می نشستند اثر ہمت قویہ ایشاں بر جناب سید احمد صاحب خندہ ہائے قہقہہ کہ خاص اثر نسبت چشتیہ است ظاہر می شد واثر توجہ جناب سید بر ایشاں غلبۂ سکر رومی دارد۔ رحمہ اللہ علیہم (۱) و ہم مولوی صاحب موصوف با راقم و با دو سہ از اہل علم نقل می فرمودند کہ عبداللہ خاں رئیس پنج لاسہ مرید عقیدت کیش شاہ رحم علی قدس سرہ برائے دردزہ قند سیاہ دم می کردند وقبل از تولد مولود کہ پسر خواہد آمد یا دختر خبر می دادند چوں کیفیت آں خبر از وے می پرسیدند، می گفتند کہ مرشد من مرا صورت دختر وپسر معائنہ می کنانند راقم وے را دیدہ بود مرد بزرگ وخوش اوقات بودند از ایں جا تصرف ارواح بزرگاں در عالم مثال ثابت می شد کہ صورت مثالیہ را معاینہ می کنانند''(۲)۔

ترجمہ از فارسی: ''شاہ عبدالرحیمؒ نے حضرت سید صاحبؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت جہاد کی۔ حضرت حاجی مولوی محمد قاسم صاحب نے راقم سے ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ: مراقبے سے فارغ ہونے کے بعد جب دونوں حضرات بیٹھے، تو ان کی نسبت قویہ کے اثر سے حضرت سید احمد صاحبؒ پر قہقہے کی صورت میں نسبت چشتیہ ظاہر ہوئی، اور حضرت سید صاحبؒ کی توجہ کے اثر سے ان پر غلبۂ سکر نمایاں ہوا تھا۔ رحمۃ اللہ علیہم! نیز مولوی صاحب موصوف نے راقم اور دو تین اہل علم سے بیان فرمایا تھا کہ: عبداللہ خاں رئیس پنج لاسہ جو شاہ رحم علی قدس سرہ کے عقیدت کیش مرید تھے، دردزہ کے سلسلے میں گڑ دم کرکے دیا کرتے تھے، اور ولادت سے پہلے ہی بتلا دیا کرتے تھے کہ لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی۔ ان سے جب اس پیشگی اطلاع دینے کی کیفیت دریافت کی جاتی، تو فرماتے کہ: میرے مرشد لڑکے یا لڑکی کی صورت میرے سامنے کر دیتے ہیں۔ راقم نے بھی موصوف کی زیارت کی ہے۔ وہ ایک خوش اوقات مرد بزرگ تھے۔ اس سے ارواح بزرگاں کا تصرف بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرات عالمِ مثال میں مثالی صورتیں دکھا سکتے ہیں''۔

---

(۱) مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنویؒ نے شاہ عبدالرحیم ولایتیؒ کا تذکرہ 'نزھۃ الخواطر'، ج:۶ ص:۲۰۶ پر میں ''انوار العارفین'' کے حوالے سے نقل کیا ہے؛ لیکن اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ (چشتی)

(۲) انوار العارفین: ۵۲۰۔

اور اسی طرح حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ناقل ہیں:

''حاجی مولوی محمد قاسم صاحب باراقم نقل فرمودند کہ شخصے گفت کہ: جبۂ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ درلہاری وجلال آباد است حاجی امداد اللہ صاحب راپوشیدہ بہ خواب دیدم، تعبیر آں پر ظاہر است کہ ایشاں بہ لباس شریعت وآدابِ طریقت آراستہ وپیراستہ اند وطالباں را بہ اتباع سنت وعلوم شریعت وآدابِ طریقت تعلیم وتلقین می فرمایند وخدمت خود از عالم سید روا ندارند واز کسر نفسی خود تعلیم ظاہری از مریداں نہ پسندند وبہ تعظیم باطن امر فرمایند''۔

ترجمہ از فارسی: ''حاجی مولوی محمد قاسم صاحب ایک شخص کا بیان راقم سے نقل فرماتے ہیں کہ: انہوں نے حاجی امداد اللہ صاحب کو خواب میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ جبہ پہنے ہوئے دیکھا، جولہاری اور جلال آباد میں موجود ہے، جس کی تعبیر ظاہر ہے کہ موصوف لباس شریعت اور آداب طریقت سے آراستہ پیراستہ ہیں اور سالکین کو سنت اور علوم شریعت اور آداب طریقت کے اتباع کی تعلیم وتلقین فرماتے ہیں، اور کسی عالم یا سید سے اپنی خدمت لینا پسند نہیں فرماتے، اور اپنی کسر نفسی کی وجہ سے مریدوں کو باقاعدہ ظاہری تعلیم دینا بھی پسند نہیں فرماتے؛ بلکہ انہیں باطنی تنظیم کا حکم فرمادیتے ہیں''۔

محمد حسین مرادآبادیؒ نے چشتیہ صابریہ سلسلے کے بزرگوں [1] میں حضرت نانوتویؒ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ یہ تذکرہ اگرچہ نہایت مختصر ہے؛ لیکن اس میں تذکرہ نگار نے حجۃ الاسلامؒ کی سیرت کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا، اور موصوف کی عادات واطوار، گفتار وکردار، علم وفضل، کمالات ظاہری وباطنی سب ہی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

اس مختصر تذکرے سے حضرت ممدوح کی زندگی کے بعض ایسے مخفی گوشے بھی سامنے آتے ہیں، جن کے ذکر سے حضرت نانوتویؒ کی ضخیم سوانح عمریاں بھی یک سر خالی ہیں، اور اس اعتبار سے ان کی سیرت پر یہ ایک نہایت جامع، بڑا البصیرت افروز اور بہت ہی حقیقت پسندانہ تبصرہ ہے، اور اس امر کا شاہد عدل ہے کہ جب حضرت نانوتویؒ کا کاروانِ عمر چونتیسویں منزل طے کررہا تھا، حضرتؒ موصوف کا شمار کبار علما ہی میں نہیں؛ بلکہ اس دور کے کبار اولیاء اللہ کے زمرے میں بھی ہونے لگا تھا۔ اس تذکرے میں حضرت نانوتویؒ کی

(۱) محمد حسین مرحوم نے چشتیہ صابریہ سلسلے کے سب ہی بزرگوں کا ''انوار العارفین'' میں تذکرہ کیا ہے؛ لیکن تعجب ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کا تذکرہ ان سے رہ گیا ہے۔ (چشتی)

سیرت کے جن پہلوؤں پر محمد حسین مراد آبادیؒ نے روشنی ڈالی ہے، وہ ایک غیر جانب دارانہ بیان ہونے کی وجہ سے خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ اس سے تذکرہ نگار کی فراست وبصیرت اور حق پسندی اور راست گفتاری پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

یہ تذکرہ اس لحاظ سے کہ حضرت نانوتویؒ کی حیات ہی میں چھپا تھا، خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ حضرت نانوتویؒ پر کام کا سلسلہ جاری ہے، بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔

ہمارے اس مضمون سے اب حضرت نانوتویؒ کی سوانح وسیرت کے ماخذوں میں دو اور قدیم تر ماخذوں کا اضافہ ہو جاتا ہے، اور یوں بنیادی ماخذوں کی تعداد دس (جب کہ ''سوانح قاسمی'' کے مقدمے میں حضرت قاری طیب صاحب زید مجدہم نے بیان کیا ہے) کے بجائے بارہ تک پہنچ جاتی ہے، جن میں اوّلیت کا شرف اسی مختصر سے تذکرے کو حاصل ہے۔

افسوس ہے کہ آج تک تذکرہ نگاروں کی نگاہ اس نادر تذکرے کی طرف نہیں گئی۔ اب پہلی مرتبہ اس تذکرے سے حضرت نانوتویؒ کے حالات نقل کر کے پیش کیے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ محمد حسین مراد آبادیؒ نے حضرت نانوتویؒ پر جو کچھ لکھا ہے، اس کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ موصوف لکھتے ہیں:

ذکرِ حضرت مولوی محمد قاسم صاحب:

''وے حضرت حاجیٔ خانۂ خدا و زائرِ روضۂ رسول اللہ اند، واز رؤسائے شیوخ صدیقی قصبۂ نانوتہ ہستند، عالم اند متقی و ربانی وحقانی وواقفِ اسرارِ شریعت وطریقت اند، وقول وفعل وے بے ریا و بے تصنع است، ومعرض از دنیا وارباب آں باوجود اہل وعیال آزادانہ ومجردانہ گزراں می کنند، و بہ قدر حاجت ضروری دنیوی کار برخود مقرر می نمایند، ولباس مولویانہ ومشایخانہ نمی دارند، و باتکلف آشنا نہ مقلد مذہب حنفیہ اند، ونیز مشربِ چشتیہ بہشتیہ واجازت تعلیم علم باطن بر چہار طرق از حضرت حاجی امداد اللہ سلمہ اللہ، وسندِ حدیث از شاہ عبدالغنی مجددیؒ می دارند، و مانند محققاں وعارفاں درمیان سخن حقائق ومعارف ودر اثبات وجودی کلام می گویند، و بر شہود توحید شہودی انکار ندارند، ودر اکثر اوقات در شغل تنزیہ وتشبیہہ خود را مشغول می دارند، وسماع غنا بے مزامیر اگر بہ طریق امور اتفاقیہ پیش می آید، انکار نہ دارند، واز ایشاں پرسیدم کہ در طریقہ حضرات جناب غلبہ چشتیت است، فرمودند بلے کہ آں از حضرت شاہ عبدالباری رسیدہ است وقتے مراد آباد بہ تکلیف خاں صاحب شیر علی تشریف آوردند، ونیز بر مکان خان صاحب موصوف فروکش شدند، روزے خاں صاحب با راقم نقل کردند کہ: قوال بے مزامیر غزلے گفت شنیدند وگرم شدند، چوں

نظر ایشاں بر بعضے ناواقفاں از حال واسرارِ عارفاں و بے خبر از دردِ عاشقاں کہ دریں جا حاضر بود افتاد، فرمودند کہ: تاثیر ہر کس اثرے دارد و من اہل آں نیستم، انتہی آرے اخوان زمان و مکان دراں شرط است و باقی مشروط آں در کتب قوم مرقوم است۔ سلمہ اللہ تعالیٰ!'' (صفحہ ۵۲۴)

ترجمہ از فارسی:

''حضرت موصوف مہاجر بیت اللہ اور زائر روضۂ رسول اللہ ہیں، اور قصبۂ نانوتہ کے صدیقی روسائے شیوخ میں سے ہیں۔ عالم متقی ربانی و حقانی ہیں اور واقف اسرار شریعت وطریقت ہیں۔ ان کا قول و عمل نمائش و تصنع سے پاک ہوتا ہے۔ وہ دنیا و اہل دنیا سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ عیال دار ہونے کے باوجود آزادانہ اور مجردانہ زندگی گزارتے ہیں اور ضرورت کے مطابق ہی دنیا کے کام کرتے ہیں، اور مولویانہ اور مشایخانہ لباس استعمال نہیں کرتے؛ بلکہ سادہ اور بے تکلف رہتے ہیں۔ حنفی مذہب کی تقلید کرتے ہیں اور چشتیہ بہشتیہ مشرب رکھتے ہیں، اور چاروں سلسلوں کی اجازت حاجی امداد اللہ سلمہ اللہ سے اور سند حدیث حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ سے رکھتے ہیں، اور محقق عارفین کی طرح حقائق و معارف بیان کرتے ہیں، اور توحید وجودی کے اثبات میں کلام کرتے ہیں اور توحید شہودی کے مشاہدے سے بھی منکر نہیں ہیں، اور اکثر تنزیہ وتشبیہ کے شغل میں خود کو مشغول رکھتے ہیں اور کہیں بلا مزامیر سماع کی اتفاقیہ نوبت پیش آ جائے، تو انکار نہیں فرماتے۔ میں نے موصوف سے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ: آپ حضرات میں چشتیت کا غلبہ رہتا ہے؟ فرمایا: ہاں! یہ حضرت شاہ عبدالباریؒ کا اثر ہے۔

ایک دفعہ شیر علی خاں صاحب کی عیادت کے سلسلے میں مرادآباد تشریف لے جانا ہوا، ایک روز کا واقعہ خاں صاحب راقم سے نقل فرماتے تھے کہ: ایک قوال نے بغیر مزامیر کے غزل چھیڑ دی، سن کر جوش میں آئے؛ لیکن جب بعض ایسے لوگوں پر نظر پڑی، جو اہل معرفت کے حال سے ناواقف اور عشاق کے درد سے بے خبر وہاں موجود تھے، تو فرمانے لگے: ہر شخص کی تاثیر میں ایک اثر ہوتا ہے؛ لیکن میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ اخوان زمان و مکان کا ہونا سماع میں شرط ہے، اور باقی شروط سماع صوفیا کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ سلمہ اللہ تعالیٰ!''۔

اسی طرح حضرت نانوتویؒ کے نیازمندوں میں سے ایک بزرگ حافظ عبدالرحمٰن حسرت جھنجھانویؒ بھی تھے، انہوں نے ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء میں جو حضرت نانوتویؒ کا سال وفات ہے، ایک کتاب فارسی میں ''سفینۂ رحمانی''، لکھی تھی، جو ۱۸۸۴ء میں مطبع نول کشور۔ لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی، اب نہیں ملتی ہے۔ اس کے سفینۂ

دومی میں ''دریشان سعادت مژدہ'' کا تذکرہ ہے۔اس باب میں ''مرگ یاراں'' کے زیرِعنوان سب سے پہلے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا تذکرہ کیا،جس میں ان کا اشہب قلم رکنے ہی کونہیں کہتا۔تذکرہ کیا ہے،رنگین نثر میں مرثیہ لکھا ہے،اور خوب لکھا ہے۔پڑھیے اور لطف لیجیے۔فرماتے ہیں:

''پانزدہم اپریل ۱۸۸۰ء، چہ روز قیامت وحشت بار امت کہ رونمود چہ ہنگامہ محشر سینہ فگار است کہ پیش آمد اعنی محبّ دل نواز، سرمایۂ اعزاز و امتیاز، امام الاتقیاء، سراج العلماء، سرتاج فضلائے زمان، درخشاں گوہر اکلیل دین وایمان مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم ومغفور ازیں سراب گاہ بہ جنت الماوی شتافتند، و دل ما راز نشتر اندوہ بہ شگافتند، درنقاب خفا آمدن دیدن چہرۂ نورانی حیات شان درحقیقت نور دیدن،صف زاہداں و عابداں وعلماوحکما است،وگزشتن از شان ازیں،وسواس گاہِ حزن آ گیں رفتن قافلۂ سعادت منداں وریاضت گرایاں تابان دل خورشید سیما است۔سبحان اللہ! چہ عالم باعمل ستودہ منش،گزیدہ طبع،عظیم الشان،ممدوح عالم وعالمیاں بود کہ درعلوم ظاہر بہ رشک قدمائے سلف وتازہ بہار گلستان تقدس و ہرگونہ معلومات خلف بود دل در پہلو ہم چو آفتاب روشن و درخشاں داشتند کہ انوار اسرار الٰہیہ وراز مخفیہ برآن تابان بود۔دررموز نہانی را بہ بلاغتے وفصاحتے بیان می فرمودند کہ عوام ہم بہ اندک تقریر چاشنی از فہمیدگی می چشیدند وبہرہ یاب ازغوامض کہنہ ودراز دقیقہ می شدند، آئینہ دلش نمونۂ قدرت نہ توانائی کبریائے بود کہ صور ہمہ اسرار باطنی ودراز علوی دراں جلوہ افزائے شہود بود۔وگنجینۂ سینہ پاکش خزینۂ جواہر زواہر نعمائے ایزدی ودفینۂ لاہوتی بے بہا ضیائے عطیۂ آسمانی بود۔ذات ملکی صفاتش سراپا نور اسلام کہ در پردہ صورت انسانی روشنی یافتہ،حیات تقدس سماتش شعشۂ دین وایمان بود کہ خورشید آسا برسر جہاں و جہانیاں تافتہ تابش فیض از زمین تا فلک الافلاک درخشید و بارش مکرمتش گل زار ورع واتقارا مطر دیاں گردانید از جوش دریائے علوم گونا گونش دشت پرخار جہل و نادانی مبدل بہ چمنستان سعادت وتقویٰ گردید واز خروش عمان حلم بوقلمونش وادی پا فگار سوئے خلقی وخبث باطنی از صفحۂ ہستی ناپدید گشتۂ چمنستان شاداب ہمیشہ بہار تہذیب وشائستگی وزندہ وروانی شدہ۔

از واپسیں یوم آں ہا حال دل تا چہ گویم کہ نتوانم گفت دواز ہائے الم سینہ خراش را در سلک گفت کسے، ہیچ نہ توانم سفت، گردہ زہد وتقویٰ وورع و ریاضت مانند ارادت کیشان راسخ الاعتقاد، حاشیہ نشیناں حلقہ مطاوعت او بود وگروہ سعادات کونی والٰہی وطہارات دینی ودنیوی وتزکیہ وتنزیہ خفی وجلی مانند خادمانِ جاں نثار ومریدان خوش اتقیاد بساط بوس بزم عقیدت او بود، از دیدن

روئے پاکش گلشن ایمان نضارت و سیرابی می یافت و از نور جبین مہبطش ضیائے آفتاب اسلامی تافت ہر کہ اورا دید بہ دل و جان احکام اسلام ورزید و کسوت تقویٰ وطیلسان صداقت پوشید یکے از میدان ارادت پناہ وعقیدت مندان صداقت دست گاہ اعمال صالحہ و کردار پسندیدہ است کہ برائے حصول شرف دارین و اقتباس انوار طیبات کونین بیعت صادقہ بر دست پاکش کردہ پیوستہ پابوس ملازمت می ماند وحضوری دائمی را اعزاز و مباہات خودمی پنداشت پیدا است کہ از پدرو کردن صف ہستی مولوی اقلیم علم وعمل وکشور زہد وتقویٰ بے فرمان فرمادیران شد و ہر یک از آں ہا فاتحہ رخصت خواندہ راہی لامکاں شد۔

یارب! چہ ملائکاں و ساکنان ملأ اعلیٰ راضرورت تعلیم ایمان و اسلام بود کہ برائے رہنمائی و ہدایت ایشاں ایں بحر معرفت نہ تواند۔

یارب! چہ منبر و وعظ فردوسیاں از ناصح بر ہنہ گوفر از بیان شیریں زبان خالی بود کہ ایں کانِ علم و ہنر را بر آں نشانند۔

یارب! چہ بالانشیناں وفرشتگان چرخ را آرزوئے شنیدن تقریر دل پذیر بود کہ ایں عالم پاک گوہر را از فرشیان جدا کردہ باعرشیاں ارتباط جاوید بخشیدند۔

یارب! چہ ملائکہ را دریائے عشق تحقیق غوامض عرفان بہ جوش آمدہ بود کہ بہ پاس خطر آں ہا ایں مہر سپہر فضل وکمال را از بزم دین ما بر داشتہ در حلقہ کروبیاں رسانیدند۔

آہ! ہزار آہ!! دنیا خوانیست مملو از طعام ہائے رنگارنگ اما زہر آلود وخوبی ست، شیریں وخوش نشہ تعبیرش مرگ حسرت آموز ریاضے است، خوش نما و پرفضا؛ لیکن از باد سموم فنا پژمردہ و باغیست روح پرور فرحت افزا؛ مگر از لطمہ خزاں افسردہ۔

نظم

نہ مردہ است قاسم جہاں مردہ شد	گل تازہ از باغ افسردہ شد
یکے شمع گل شد جہاں شد سیاہ	بہ ابر فنا رفت رخشندہ ماہ
فنا ہست ہر چیز موجود را	بقا ہست بس رب معبود را
خدا را بقا وہمہ را فنا	بہ جز او کسے را نہ باشد بقا
ہر آں کس کہ جاں زندہ دارد بہ تن	گل خوش نما ہست آں در چمن

ایں غم جگر سوز و حادثۂ سینہ دوز بر پردۂ زنگاری بہ روئے دلہائے ما کشیدہ کہ دراں گزر اندیشہ نیست و ایں تیر الم دل فگار از پہلو ہم بروں سوز گزشتہ کہ از درد او جز دلم کسے را خبرے نہ۔ افسوس بر افسوس ست کہ شمع جہاں افروز در تاریکی از بزم دین و اسلام بہ طرفۃ العین بہ مر ددر قسم بہبودی علم و فضل از جریدۂ کائنات بہ کزلک فنا بہ چشم زدن برو، از یں آتش اندوہ ہر تر و خشک کہ داشتم ہمہ را بسوختم و از خدنگ آہ دردناک سینۂ ہفت ورق افلاک را دوختم، و نافہ ہائے مشک مشام افروز ہر تمنا و آرزو را در مجمر یاس خاکستر کردم و بساط خودی و خودداری از ایوان اندرون خود در نوردیدم، و پردۂ نیلگوں بر چہرۂ عروس ہستی فروآندوختم، دل وائے ماتمی در میدان زندگی بلند افراختم۔ دریغ بر دریغ است کہ بزم یاران برخاست و مینائے خرمی و ساغر انبساط بر سنگ جفا بہ شکست و ردۂ غم گساراں از خود بستہ از بازار کون و فساد برفت و مارا تنہا بے یار و ہم راہ دریں دشت پر خار کہ نامش زندگی ست بہ گذاشت و نہال کوش ثمر عزم خود را در چمن فردوس بکاشت۔

یارب! بر ما و بر گذشتگان کہ از پیش ما در گذشتند رحم کن و خرمن معصیت را ز برق جہاں سوز آہ نیم شبی نیکو بہ سوز د چشم را آں سیلاب پر جوش دہ کہ ہمہ خس و خاشاک بزہ و عصیاں را فرا برد، و گرد ندامت و خجالت را از چہرۂ سیاہ ما بہ شوید: ؎

بیا	مرز	یارب	مر	ایں	بندہ را
تو	آمرز	گار	است	من	زشت کار

ترجمہ از فارسی:

''۱۵؍اپریل ۱۸۸۰ء؍ کا دن بھی کس قدر وحشت بار قیامت کا دن نکلا اور کیسا سینہ فگار ہنگامۂ محشر بپا ہوا، یعنی دل نواز دوست اور سرمایۂ اعزاز و افتخار، امام الاتقیاء، سرتاج فضلائے زمانہ، تاج دین و ایمان کا گوہر درخشاں مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم و مغفور اس سراب گاہِ دنیا سے جنت الماویٰ کی طرف روانہ ہوگئے اور ہمارے دلوں کو نشترِ غم سے زخمی کر گئے۔ آپ کی زندگی کے نورانی چہرے کا نقاب میں چھپ جانا حقیقت یہ ہے کہ زاہدوں، عابدوں عالموں اور حکیموں کی صفوں کا لپٹ جانا ہے۔ آپ کا اس غم آگیں وسوسہ گاہ سے گزر جانا دراصل سعادت مند مرتاض روشن ضمیر اور آفتاب سیما بزرگوں کے قافلے کا گزر جانا ہے۔

سبحان اللہ! کیسے عالم باعمل، پاکیزہ طینت، برگزیدہ طبیعت، بلند رتبہ، سارے جہاں کا ممدوح، علوم ظاہریہ میں متقدمین سلف کے لیے باعث رشک اور گلستان تقدس کی تازہ بہار اور

خلف کی ہر طرح کی معلومات کا حامل تھے۔ پہلو میں دل آفتاب کی طرح روشن اور درخشاں رکھتے تھے کہ اسرارِ الٰہیہ کے انوار اور مخفی راز آپ پر ہویدا تھے، اور راز ہائے نہانی فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس طرح بیان فرماتے تھے کہ: عوام بھی تھوڑی سی تقریر کی روشنی سے سمجھ کی روشنی کا مزہ پا لیتے تھے، اور پرانی گہری باتوں اور دقیق رازوں سے بہرہ یاب ہو جاتے تھے۔ آپ کا آئینہ دل اللہ کی قدرت و توانائی کا ایک نمونہ تھا کہ سارے اسرار باطنی اور راز علوی جس میں جلوہ گر رہتے تھے۔

اور آپ کا سینۂ پاک کا گنجینہ اللہ کی نعمتوں کے قیمتی جواہر کا خزانہ اور بیش قیمت موتیوں اور آسمانی روشن عطیے کا دفینہ تھا۔ فی الحقیقت آپ کی فرشتہ خصلت اور سراپا نور اسلام ذات انسانی صورت میں جلوہ گر ہوئی تھی۔ ان کی تقدس مآب زندگی دین و ایمان کے لیے ایک شعاع تھی، جو سورج کی طرح دنیا اور اہل دنیا پر روشن ہوئی تھی، اور ان کے فیض کی تابانی سے زمین سے لے کر فلک الافلاک چمک اٹھے اور ان کی بزرگی کی بارش نے زہد و تقوے کے باغ کو سیراب کر دیا ہے۔ آپ کے گوناگوں علوم کے دریاؤں کی روانی سے جہالت و نادانی کا دشت پر خار، سعادت و تقوے کے چمنستان میں تبدیل ہو گیا ہے، اور ان کے بوقلموں دریائے علم کے جوش سے بد خلقی اور خبث باطنی کی پر خار وادی صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو کر تہذیب و شائستگی کا سدا بہار شاداب بہار بن گئی ہے۔ ان کی وفات کے وقت سے حال دل کیا کہوں کیا ہے؟ کچھ کہا نہیں جاتا اور سینہ خراش غم کے دانوں کو کسی نہج سے بھی گفتگو کی کڑی میں پرویا نہیں جا سکتا۔ زہد و متقی، پرہیز گار اور مرتاض بزرگ بھی ارادت مندوں اور پختہ اعتقاد والوں کی طرح ان کے حلقۂ اطاعت میں کنارہ نشین رہتے تھے۔ دین و دنیا کی سعادت سے بہرہ مند ظاہری و باطنی طہارت سے آراستہ، تزکیہ و تنزیہ سے بہرہ مند جماعت جاں نثار خادم اور طاعت شعار مریدوں کی طرح ان کی بزم عقیدت کے زمیں بوس رہتی تھی۔ ان کے روئے پاک کے دیدار سے گلشن ایمان تر و تازہ ہوتا اور سیرابی حاصل کرتا تھا اور ان کے روشن جبیں کے نور سے آفتاب اسلام کی ضیا روشن ہو جاتی تھی۔ جس نے ان کو دیکھ لیا، اس نے دل و جان سے اسلامی احکام قبول کر لیے اور لباس تقوی اور صداقت پہن لیا، جو شرف دارین کے حصول اور دونوں جہاں کے انوار طیبہ سے منور ہونے کے لیے آپ کے دست پاک پر سچی بیعت کر کے ہمیشہ پابوس ملازمت رہتا ہے، اور دوامی حضور کو اپنے لیے اعزاز و افتخار سمجھتا ہے۔ وہ مخلص مریدوں اور صادق عقیدت مندوں میں سے

اعمال صالحہ اور پسندیدہ کردار کا حامل ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب موصوف کے صفحۂ ہستی سے اٹھ جانے کی وجہ سے علم وعمل کی ولایت اور زہدوتقوے کی سلطنت ویران رہ گئی ہے، اوران میں سے ہر ایک فاتحۂ رخصت پڑھ کر راہی لامکاں ہو گیا۔

یارب! کیا فرشتوں اور ملأ اعلیٰ کے باشندوں کو ایمان واسلام کی تعلیم کی ضرورت تھی کہ جن کی راہنمائی اور ہدایت کے لیے اس بحرِ معرفت کو وہاں بلایا گیا؟

یارب! کیا فرشتوں کا ممبر وعظ، صاف گو، واضح بیان، شیریں زبان ناصحین سے خالی ہو گیا تھا کہ علم وہنر کی اس کان کو اس پر لے جا کر بٹھلا دیا گیا ہے؟

یارب! کیا بالانشینوں اور آسمانی فرشتوں کو تقریر دل پذیر سننے کی آرزو تھی کہ اس پاک گوہر عالم کو فرشیوں سے الگ کر کے ہمیشہ کے لیے عرشیوں سے وابستہ کر دیا ہے؟

یارب! کیا فرشتوں کی معرفت کی باریکیوں کی تحقیق کا دریائے عشق جوش میں آ گیا تھا کہ ان کی خاطر اس آسمان فضل وکمال کے آفتاب کو دنیا کی بزم سے اٹھا کر فرشتوں کے حلقے میں پہنچا دیا؟

آہ! ہزار آہ! دنیا ایک دسترخواں ہے، جو رنگا رنگ؛ مگر زہر آلود کھانوں سے بھرا ہوا ہے، اور ایک شیریں اور پرنشہ خواب ہے، جن کی تعبیر حسرت آموز موت ہے، اور ایک خوش نما اور پر فضا باغ ہے؛ مگر فنا کی لو سے پژمردہ ہونے والا اور روح پرور اور فرحت افزا چمن ہے، جو خزاں کے اثر سے مرجھا گیا ہے۔

نظم کا ترجمہ: صرف قاسم نہیں مرا؛ بلکہ سارا جہاں مر گیا ہے۔ باغ کا ایک تازہ پھول مرجھا گیا ہے۔ ایک شمع کیا گل ہوئی کہ جہاں ہی سیاہ ہو گیا ہے۔ فنا کے بادلوں میں روشن چاند چھپ گیا ہے۔ ہر موجود چیز کے لیے فنا ہے۔ بس رب معبود کے لیے صرف بقا ہے۔ خدا باقی ہے، باقی سب فانی ہے، اس کے سوا کسی کے لیے بقا نہیں ہے۔ جو شخص زندہ جان بدن میں رکھتا ہے، وہ چمن کا ایک خوش نما پھول ہے۔

ترجمہ از فارسی:

اس جگر سوز غم اور سینہ دوز حادثے نے ہمارے دلوں پر ایسا پردۂ زنگاری کھینچ رکھا ہے، جس میں کسی اندیشے کا گزر نہیں ہے، اور اس دل فگار رنج کا تیر پہلو کے پار ہو گیا ہے، جس کی ٹیس کی خبر میرے دل کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ افسوس! افسوس کہ تاریکی میں جہاں کو روشن کرنے والی شمع

دین واسلام کی بزم سے پل بھر میں بجھ گئی، اور اور علم وفضل کی بہترین تحریر فنا کے قلم سے پلک جھپکنے میں صفحۂ کائنات سے محو کر دی گئی ہے۔ غم کی اس آگ نے جو خشک وتر میرے پاس تھا، سب پھونک دیا۔ آہ! دردناک کی سوزش سے ساتوں آسمان کے سینے کو میں نے سی دیا ہے۔ خودی اور ہر تمنا اور آرزو کے دماغ کو معطر کرنے والی مشک کی تھیلیوں کو یاس وناامیدی کی بھٹی میں جلا کر راکھ کر چکا ہوں، اور خودداری کی بساطِ دروں لپیٹ کر رکھ دی ہے۔ وجود کی دلہن نے رخسار سے نیل گونی پردہ اتار زندگی کے میدان میں ماتمی جھنڈا بلند کیے ہوئے ہوں۔ افسوس! صدافسوس کہ بزم یاراں برخاست ہوگئی اور مسرت کی مینا اور خوشی کا ساغر ظلم کے پتھر سے چکنا چور ہوگیا، اور جماعت غم گساراں اپنا سامان اٹھا کر اس دنیا سے رخصت ہوا، اور ہمیں اس دشت پر خار میں جس کا نام زندگی ہے، بے یار و مددگار چھوڑ گیا ہے، اور اپنے ارادے کے اچھے پھل دار درخت کو چمن فردوس میں جا کر بو دیا ہے۔

یارب! ہم پر اور ہمارے اسلاف پر رحم فرما، اور آہِ نیم شبی کی برق جہاں سوز سے خرمن معصیت کو پوری طرح پھونک دے، اور آنکھ کے چشمے میں وہ جوش سیلاب عطا فرما کہ گناہ و معصیت کے سارے خس وخاشاک کو بہا لے جائے، اور ندامت وشرمندگی کی گرد کو ہمارے سیاہ چہرے سے دھو دے:

”ندامت مدہ ایں سر افگندہ را“

حکیم عبدالرحمٰن حسرتؒ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ ”سفینۂ سومی“ جس کا عنوان ہے: ”حکایات مختلف فوائد خیز ندرت آمیز“ میں بھی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”شیر بیشۂ فضل وکمال بوئے دل آویز گل زار عشق ایز دذوالجلال:

شمعِ شبستانِ طریقت وشریعت، مہر سپہر حقیقت ومعرفت، عالم کامل، و در جود وسخا رشکِ حاتم جناب مولوی محمد قاسم صاحب، نور اللہ مرقدہ از گزیدۂ علمائے سنجیدہ، فضلا وقصبۂ نانوتہ بودہ است، ومنازلِ علوم گوناگوں، ونشیب وفراز رموزِ فنون بوقلموں، بہ قدوم ہمت ونیز دے خرتاب خداداد نیکو پے مودہ بود، و ارکانِ علوم ومخزنِ فنون باید گفت، آں چہ درتو صیف او منشی اندیشہ بر نگار وبجا است، وہر قدر کہ تعریفش سرایدہ آید زیبا است، بر اسرار تصوف وصفائے باطنی از فیض ورہنمائی حاجی امداد اللہ صاحب عبور وافر داشت، و در میدانِ ورع وتقویٰ لوائے انا لا غیری می

افراشت، تابش ذہن و ذکایش درخشاں تر از برق خاطف بود، وتقریر دل پذیرش، ہر گونہ مشکلات علمی وحکمی را کاشف، آں چہ در ہمہ عمر دیدہ وشنیدہ بود، ہمہ محفوظ کاطر بود سینہ، او را نمونۂ لوحِ محفوظ باید گفت دل آئی آب دار انداز و نصیحتش را در رشتہ جاں باید سفت، از بس شیریں کلام وعذب البیان بودہ وگرئے سبقت از ہمہ علمائے موجودہ زمان ربودہ، بہ تاریخ پنجم جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ/ یک ہزار و درصد وہفت ونہ ہجری ازیں کارگاہِ کن فیکون رخت ہستی برداشتہ راہی ملک جاوید شد زادگاہ نانوتہ وآرام گاہ واپسیں قصبۂ دیوبند است''۔

ترجمہ از فارسی:

''فضل وکمال کے شیر، عشق الٰہی کے گل زار کی بوئے دل آویز، طریقت شریعت کی رات کے لیے شمع، حقیقت ومعرفت کا آفتاب، عالم کامل، بخشش وسخاوت میں رشکِ حاتم جناب مولوی محمد قاسم صاحب، نور اللہ مرقدہ قصبۂ نانوتہ کے برگزیدہ علما اور سنجیدہ فضلا میں سے ہوئے ہیں۔ گونا گوں علوم کے منازل اور بوقلموں فنون کے نشیب وفراز کے رموز ان کی ہمت اور خدا داد طاقت کی بہ دولت طے ہو سکے تھے۔ ان کو معدنِ علوم اور خزانۂ فنون کہنا چاہیے۔ ان کی توصیف کا تب فکر جو کچھ لکھ سکے بجا ہے، اور جتنی بھی ان کی تعریف کی جا سکے درست ہے۔

حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے فیض ورہنمائی سے وہ تصوف اور صفائے باطن کے اسرار پر کامل عبور رکھتے تھے۔ میدانِ ورع وتقویٰ میں وہ بے مثال فرد تھے۔ ان کی ذکاوت وذہانت کی روشنی بجلی سے بھی زیادہ درخشاں اور ان کی تقریر دل پذیر، علم وحکمت کی ہر قسم کی مشکلات حل کر کے رکھ دیتی تھی۔ ساری عمر جو کچھ دیکھا سنا سب ان کو محفوظ تھا۔ ان کے سینے کو لوحِ محفوظ کا نمونہ کہنا چاہیے۔ ان کے وعظ ونصیحت کے آب دار موتیوں کو رشتۂ جانی میں پرونا چاہیے۔ وہ انتہائی شیریں کلام اور خوش بیان تھے۔ اپنے زمانے کے تمام ہم عصر علما سے گوئے سبقت لے گئے تھے۔ ۵/ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ/ کو وہ اس دنیا سے رختِ سفر باندھ کر راہی ملک بقا ہوئے۔ ان کا پیدائشی وطن نانوتہ اور دائمی خواب گاہ دیوبند ہے[1]۔

(۱) ماہ نامہ الرحیم- حیدر آباد، نومبر ۱۹۶۶ء/ ص: ۵۶-۴۳۹۔

متوسلین دارالعلوم دیوبند کے لیے ایک وصیت

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ

> حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ نے اپنی اس وصیت میں جو ہدایت فرمائی ہے، اسے مدنظر رکھ کر دیوبندی مکتبِ فکر کے ہر عالم کو سوچنا چاہیے کہ ہم نے کیا کیا؟ علوم قاسمی کی حفاظت کی؟ اسے سمجھا؟ اس وصیت کو بار بار پڑھیے۔ (نعمان)

بندہ محمود حمد وصلاۃ کے بعد طالبانِ معارف اور دل دادگانِ اسرارِ ملتِ حنفیہ کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ: ۱۸۷۶ء میں پادری نولس صاحب اور منشی پیارے لال صاحب، ساکن موضع چاندا پور، متعلقہ شاہ جہاں پور نے بہ اتفاق رائے جب ایک میلہ بہ نام ''خدا شناسی'' موضع چاندا پور میں مقرر کیا، اور اطراف وجوانب میں اس مضمون کے اشتہار بھجوائے کہ ہر مذہب کے علما آئیں اور اپنے اپنے مذہب کے دلائل سنائیں، تو اس وقت معدن الحقائق، مخزن الدقائق، مجمع المعارف، مظہر اللطائف، جامع الفیوض والبرکات، قاسم العلوم والخیرات، سیدی ومولائی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب، مَتَّعَنَا اللّٰہُ تَعَالٰی بِعُلُوْمِہٖ وَمَعَارِفِہٖ نے اہل اسلام کی طلب پر میلۂ مذکور کی شرکت کا ارادہ ایسے وقت مصمم فرمایا کہ تاریخ مباحثہ، یعنی ۷رمئی سر پر آ گئی تھی۔

چوں کہ یہ امر بالکل معلوم نہ تھا کہ تحقیقِ مذاہب اور بیانِ دلائل کی کیا صورت تجویز کی گئی ہے؟ اعتراضات وجوابات کی نوبت آئے گی، یا زبانی اپنے اپنے مذہب کی حقانیت بیان، یا بیاناتِ تحریری ہر کسی کو پیش کرنے پڑیں گے؟ تو اسی لیے وبہ نظرِ احتیاط حضرت مولانا قدس سرہ کے خیال مبارک میں آیا کہ ایک تحریر جو اصولِ اسلام اور فروعِ ضروریہ، بالخصوص جو اس مقام کے مناسب ہوں، سب کو شامل ہو، حسب قواعدِ عقلیہ منضبط ہونی چاہیے، جس کے تسلیم میں عاقل منصف کو کوئی دشواری نہ ہو، اور کسی قسم کے انکار کی گنجائش نہ ملے۔ چوں کہ وقت بہت تنگ تھا، اسی لیے نہایت عجلت کے ساتھ غالباً ایک روز کامل اور کسی قدر شب میں بیٹھ کر ایک تحریر فرمائی۔ جلسۂ مذکورہ میں تو مضامین مندرجہ تحریر مذکورہ کو زبانی ہی بیان فرمایا اور

در بارۂ حقانیت اسلام میں جو کچھ بھی فرمایا، وہ زبانی ہی فرمایا، اور اسی لیے تحریرِ مذکور کے سنانے کی حاجت اور نوبت ہی نہ آئی۔ چناں چہ مباحثۂ مذکور کی جملہ کیفیت بالتفصیل چند بار طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے۔

مگر جب اس مجمع سے بحمد اللہ! نصرتِ اسلام کا پھریرا اڑاتے ہوئے حضرت مولانا المعظم واپس تشریف لائے، تو بعض خدام نے عرض کیا کہ: تحریر جو جناب نے تیار فرمائی تھی، اگر مرحمت ہو جائے، تو اس کو مشتہر کر دینا نہایت ضروری اور مفید نظر آتا ہے۔ یہ عرض مقبول ہوئی اور تحریرِ مذکور متعدد مرتبہ طبع ہو کر اس وقت تک تسکین بخش قلوب اہلِ بصیرت اور نور افزائے دیدۂ اولی الابصار ہو چکی ہے، اور مولانا مولوی فخر الحسن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کے مضامین کے لحاظ سے اس کا نام ''حجۃ الاسلام'' تجویز فرما کر اول بار شائع فرمایا تھا، جس کی وجہ تسمیہ دریافت کرنے کی کم فہم کو بھی حاجت نہ ہوگی۔

اس کے بعد چند مرتبہ مختلف مطابع میں چھپ کر وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی۔ صاحبانِ مطابع اس عجالۂ مقبولہ اور نیز دیگر تصانیف حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اشاعت دیکھ کر صرف بہ غرض تجارت معمولی طور پر ان کو چھاپتے رہے، کسی اہتمام زائد کی حاجت ان کو محسوس نہ ہوئی۔ اسی لیے فقط کاغذ اور لکھائی اور چھپائی ہی میں کوتاہی نہیں ہوئی؛ بلکہ تصحیح عبارت میں بھی نمایاں خلل پیدا ہو گئے۔ اس حالت کو دیکھ کر کفش بردارانِ قاسمی اور دل دادگانِ اسرارِ علمی کو بے اختیار اس امر پر کمر بستہ ہونا پڑا کہ صحت، خوش خطی وغیرہ تمام امور کا اہتمام کر کے اس عجالۂ مقدسہ کو چھاپا جائے اور بہ غرض توضیح حاشیے پر ایسے نشانات کر دیے جائیں، جس سے تفصیل مطالب ہر کسی کو بے تکلف معلوم ہو جائے، اور جملہ تصانیف حضرت مولانا، نفع اللہ المسلمین بفیوضہ کو اسی کوشش اور اہتمام کے ساتھ چھاپ کر ان کی اشاعت میں سعی کی جائے۔ واللہ ولی التوفیق!

اس تحریر کی نسبت حضرت مولاناؒ کی زبان مبارک سے یہ بھی سنا گیا کہ: جو مضامین ''تقریر دل پذیر'' میں بیان کرنے کا ارادہ ہے، وہ سب اس تحریر میں آ گئے۔ اس قدر تفصیل سے نہ سہی، بالاجمال ہی سہی۔ ایسی حالت میں ''تقریر دل پذیر'' کے تمام نہ ہونے کا جو قلق شائقانِ اسرارِ علمیہ کو ہے، اس کے مکافات کی صورت بھی اس رسالے سے بہتر دوسری نہیں ہو سکتی۔

اب طالبانِ حقائق اور حامیانِ اسلام کی خدمت میں ہماری یہ درخواست ہے کہ: تائیدِ احکامِ اسلام اور مدافعتِ فلسفۂ قدیمہ وجدیدہ کے لیے جو تدبیریں کی جاتی ہیں، ان کو بجائے خود رکھ کر حضرت خاتم العلماء کے رسائل کے مطالعے میں بھی کچھ وقت ضرور صرف فرمائیں اور پورے غور سے کام لیں اور انصاف سے دیکھیں کہ ضروریات موجودہ زمانۂ حال کے لیے وہ سب تدابیر سے فائق اور مختصر اور مفید تر ہیں یا نہیں؟

اہل فہم خود اس کا تجربہ کچھ تو کرلیں۔ میرا کچھ عرض کرنا اس وقت غالباً دعویٰ بلا دلیل سمجھ کر غیر معتبر ہوگا؛ اس لیے زیادہ عرض کرنے سے معذور ہوں۔ اہل فہم وعلم خود موازنہ اور تجربہ فرمانے میں کوشش کرکے فیصلہ کرلیں۔

باقی خدام مدرسۂ عالیہ دیوبند نے تو یہ تہیہ بہ نام خدا کرلیا ہے کہ تالیفاتِ موصوفہ مع بعض تالیفات حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ وغیرہ تصحیح اور کسی قدر توضیح وتسہیل کے ساتھ عمدہ چھاپ کر اور نصاب تعلیم میں داخل کرکے ان کی ترویج میں اگر حق تعالیٰ توفیق دے، تو جان توڑ کر ہر طرح کی سعی کی جائے، اور اللہ کا فضل حامی ہو، تو وہ نفع جو ان کے ذہن میں ہے، اوروں کو بھی اس کے جمال سے کامیاب کیا جائے۔

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ!

کیا فائدہ فکر بیش وکم ہوگا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا[1]

(۱) قاسم العلوم والخیرات، ص: ۶۰-۷۵۸۔

قاسمی اور قدوسی خاندان

اور فہرستِ تصنیفاتِ حضرت نانوتویؒ

مکتوب از: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
بہ نام: حضرت مولانا پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹیؒ

حضرت المحترم زید مجدکم!

سلام مسنون، نیاز مقرون، مزاج گرامی!

گرامی نامہ ۳؍رجب کا لکھا ہوا اواخرِ رجب میں پہنچ گیا تھا؛ لیکن یہی زمانہ میرے ایک طویل سفر کا تھا، واپسی شعبان میں ہوئی، تو مجلس شوریٰ کا ہنگامہ خیز اجلاس آ گیا، اجلاس سے ۲۶؍شعبان کو فراغت ہوئی اور پھر ایک سفر پیش آ گیا اور پھر ماہ مبارک کے مشاغل شروع ہو گئے۔ غرض تاخیرِ جواب کی یہ وجوہ پیش آئیں۔ زحمتِ انتظار کی معافی چاہتا ہوں۔ وجوہ ساری غیر اختیاری تھیں۔

''یادگارِ قاسم''(۱) کی طباعت کے مژدے سے روح تازہ ہے، خدا کرے کہ جلد ہی نور افزائے بصر وبصیرت بنے۔ اب سوالات کا نمبر وار جواب عرض ہے:

۱- میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دو شادیاں ہوئیں: ایک شادی حضرت نانوتویؒ کی حیات میں ہوئی، وہ دیوان محمد یاسین صاحبؒ کی صاحبزادی سے ہوئی، جن کا نام ''سکینہ'' تھا۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس لاولدی کو دیکھ کر متوسلانِ قاسمی، بالخصوص حضرت شیخ الہندؒ کے دلوں میں یہ تڑپ پیدا ہوئی کہ

(۱) پروفیسر صاحب علیہ الرحمہ کی تصنیف ''انوار قاسمی'' مراد ہے، جو حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کے حالات پر ایک نایاب کتاب ہے۔ پروفیسر صاحبؒ نے اس کا نام ''یادگارِ قاسم'' رکھا تھا؛ لیکن حضرت حکیم الاسلام کو یہ نام پسند نہیں آیا تھا؛ اس لیے پروفیسر صاحبؒ نے اس کو تبدیل کر کے ''انوار قاسمی'' رکھ دیا تھا۔ (نعمان)

قاسمی نسل چلے، تو دیو بند میں جناب حافظ عبدالکریم صاحبؒ کی صاحبزادی (میری والدہ ماجدہ) سے پیام دیا گیا۔ میری والدہ کا نام ''امۃ الرحیم'' تھا۔ حافظ عبدالکریم صاحبؒ فارسی کے اچھے ماہر اور اردو کے شاعر تھے، '' فروغ'' تخلص تھا۔ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ سے بیعت تھے۔ ان کی ایک مثنوی بہ نام ''مثنویٔ فروغ'' طبع شدہ ہے۔ میرے پاس بھی تھی، عرصے سے نظر نہیں پڑی، یا تو کتابوں میں رلی ہوئی ہے، یا کوئی لے گیا ہے۔ میرے والد صاحبؒ کی اولاد انہیں دوسری بیوی سے ہوئی ہے۔ مجھ سے پہلے میرے دو بھائی پیدا ہوئے، جو خورد سالی میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد میری پیدائش ۱۳۱۵ھ/(۱۸۹۷ء) میں ہوئی۔ میرے بعد ایک لڑکی ہوئی، 'فاطمہ' نام تھا، وہ خورد سالی میں گزر گئی۔ اس کے بعد مولوی طاہر مرحوم پیدا ہوئے اور ان کے بعد طیبہ مرحومہ۔

۲- مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ خاندان قدوسیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت قطب عالم شیخ عبدالقدوسؒ کی اولاد میں سے تھے۔ جہاں تک میرا علم ہے اور شاہ عزیز حسن صاحب گنگوہی سے تحقیق بھی کی، انہوں نے تدریس کا سلسلہ مستقلاً کہیں اختیار نہیں کیا۔ یوں ممکن ہے کہ عارضی طور پر کہیں کسی کو کچھ پڑھا دیا ہو۔ ان کے انتقال پر پچھتر سال گزر چکے ہیں[1]، جیسا کہ حاجی عزیز حسین صاحب گنگوہی سے معلوم ہوا۔ تاریخ انتقال معلوم نہیں ہو سکی۔

۳-مولانا عبدالعلی صاحبؒ کا سن وفات معلوم نہیں ہو سکا۔ اتنا محفوظ ہے کہ دو تین سال کے اندر اندر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، میرے والد ماجدؒ اور مولانا عبدالعلیؒ کی وفاتیں ہوئی ہیں۔ میرے والد کی وفات ۱۳۴۷ھ/(۱۹۲۹ء) میں ہوئی ہے؛ اس لیے ان بزرگوں کی وفاتیں کسی کی اس سے ایک سال قبل کسی کی ایک سال بعد ہے۔ اس سے زیادہ کچھ پتہ نہیں چلا۔ مولانا عبدالعلی صاحبؒ کا انتقال بہر حال! میرے والد صاحبؒ سے پہلے ہوا ہے، تو اندازہ ہے کہ سن وفات ۴۶-۱۳۴۵ھ/(۱۹۲۸ء) ہوگا۔ تبرکات اکابر کے سلسلے میں رائے بالکل صحیح ہے۔ ذاتی طور پر میرے پاس اپنے اکابر کے بعض تبرکات ہیں، (از قسم پارچہ)، وہ محفوظ ہیں۔ دار العلوم میں حضرت نانوتویؒ کے تحریر فرمودہ ''اصول ہشت گانہ'' حضرتؒ کے قلم کے لکھے ہوئے محفوظ ہیں، اور چیزیں اس سے زائد میسر نہیں ہوئیں، کہیں سے ملیں، تو یقیناً ان کی حفاظت کی جائے گی۔

---

(۱) زیرِ نظر نمبر کی اشاعت کے وقت تقریباً ایک سو بائیس سال۔ (نعمان ۲۰۱۵ء)

۴- ''قاسم العلوم''(۱) نادر ہو چکا ہے، لیکن آپ کے ارشاد پر میں اپنا ذاتی نسخہ بھیج رہا ہوں، آپ کام لے کر اسے واپس فرمادیں۔

۵- آپ کے کارڈ پر حضرت نانوتویؒ کی تصانیف کی تعداد تیئیس دی گئی ہے، لیکن حضرتؒ کی تصانیف کی مجموعی تعداد پچھتر ہے۔ اس کی فہرست ارسال ہے۔ ''قاسم العلوم'' کا ہر مکتوب ایک مستقل رسالہ ہے، جو خاص موضوع پر مشتمل ہے۔ اس موضوع کے مناسب اس رسالے کا نام تجویز کر دیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت کی تمام تصانیف تقریباً خطوط ہی ہیں، نام بعد کے لوگوں نے حسب موضوع تجویز کر دیئے ہیں۔ اسی طرح ان غیر طبع شدہ مکتوبات کے سلسلے میں بھی ہر مکتوب کا نام الگ الگ تجویز شدہ ہے، جو اس کے موضوع کے حسب حال ہے، جیسا کہ اس کا منسلکہ فہرست تصانیف سے واضح ہو جائے گا۔

میری ایک ذہنی بات یہ ہے کہ حضرتؒ کی تمام تصانیف کا جنسی اور عمومی نام ''قاسم العلوم'' رکھا جائے۔ اس کے تین سلسلے ہوں:

(۱) پہلا سلسلہ ان تصانیف کا جو مطبوعہ اور عموماً متداول ہیں۔ جیسے آپ نے بھی ان کے اسما لکھے ہیں۔

(۲) دوسرا سلسلہ قاسم العلوم کے رسائل کا ہو، یعنی یہ مکاتیب جو قاسم العلوم کے نام سے چار جلدوں میں شائع ہوئے ہیں، اور یہ ہم رشتہ ارسال ہیں۔

(۳) اور تیسرا سلسلہ قاسم العلوم یہ مکاتیب ہوں جو بجائے خود مستقل رسایل اور غیر مطبوعہ ہی نہیں؛ بلکہ مفقود ہیں۔ اس طرح ساری تصانیف ''قاسم العلوم'' کے تحت آ جائیں گی۔ بہر حال حضرتؒ کی تصنیفات کی فہرست ارسال ہے:

نمبر شمار	نام کتاب	نام علم
۱	اسرارِ قرآنی	تفسیر
۲	مصابیح التراویح	تفسیر
۳	الدلیل المحکم	تفسیر
۴	تحفۂ لحمیہ	تفسیر
۵	توثیق الکلام	تفسیر
۶	الحق الصریح	تفسیر

(۱) حضرت نانوتویؒ کے مکاتیب کا مجموعہ، جسے پروفیسر صاحبؒ نے دوبارہ مرتب کر کے شائع کر دیا تھا، وہ بھی نایاب ہے۔ (نعمان)

۷	حجۃ الاسلام	اسرار دین
۸	تقریر دل پذیر	اسرار دین
۹	قبلہ نما	کلام
۱۰	آبِ حیات	کلام
۱۱	تصفیۃ العقائد	کلام
۱۲	تحذیر الناس	کلام
۱۳	لطائفِ قاسمیہ	تصوف
۱۴	فیوض قاسمیہ (دس مکاتیب شایع شدہ ہیں)	تصوف
۱۵	مکتوبات قاسمیہ	تصوف
۱۶	جمال قاسمی	تصوف
۱۷	تحقیق السماع والغناء	تصوف
۱۸	انتباہ المؤمنین (ردِ شیعہ)	مناظرہ
۱۹	ہدیۃ الشیعہ	مناظرہ
۲۰	مباحثۂ شاہ جہاں پور (ردعیسائیت)	مناظرہ
۲۱	جواب ترکی بہ ترکی (ردآریہ)	مناظرہ
۲۲	انتصار الاسلام (ردآریہ)	مناظرہ
نمبر شمار	**نام کتاب**	**نام علم**
۲۳	مناظرۂ عجیبہ	تتمہ تحذیر الناس
۲۴	اجوبۂ اربعین	
۲۵	گفتگوئے مذہبی	واقعہ میلۂ خدا شناسی
۲۶	الخط المقسوم من قاسم العلوم	فلسفہ
۲۷	رسائل مشمولات قاسم العلوم (چہار جلد)	
۲۸	قصائد قاسمیہ	ادب
۲۹	میراث فدک (جلد اوّل)	حدیث

۳۰	حدیث العلماء (جلد اوّل)	حدیث
۳۱	ما اہل بہ لغیر اللہ (جلد دوم)	حدیث
۳۲	عصمت انبیا (جلد دوم)	کلام
۳۳	حدیث المکاتب (جلد دوم)	فقہ
۳۴	حجیت معجزہ (جلد سوم)	کلام
۳۵	سودمند (جلد سوم)	فقہ
۳۶	شہادت حسینؓ (جلد چہارم)	تاریخ
۳۷	اختلاف الامہ (جلد چہارم)	کلام
۳۸	معرفت الامام (جلد چہارم)	کلام
۳۹	حکم روافض وخوارج	
۴۰	ردالاکابر ارفع المکابر (کیفیت مباحثہ حامد حسن شمسی)	
۴۱	ردالشیعہ نمبر ا	
۴۲	ردالشیعہ نمبر ۲	
۴۳	وراثت انبیا	
۴۴	وجوب جمعہ	
۴۵	تصور شیخ۔ نمبر ا	
۴۶	کنہ بعض مسائل بہ اختصار	
۴۷	ایمان وکفر یزید	
۴۸	نذر بتاں	
۴۹	حکمۃ الجہر والسر فی الصلوٰۃ	
۵۰	معنی سنت وبدعت	
۵۱	الغیب للہ	
۵۲	تصور شیخ۔ نمبر ۳	
۵۳	صفات نفس	

۵۴	تنبیہ متعلق مسئلہ تقریر	
۵۵	مسئلہ ضاد وظا و معنی تقلید	
۵۶	اثبات بست (بیس) رکعت تراویح	
۵۷	معراج اور دیدارِ الٰہی (عروج معراج)	
۵۸	امکان نظیر	
۵۹	الدفاع عن تحذیر الناس	
۶۰	تفسیر	
۶۱	فضل العالم علی العابد	
۶۲	جواب بعض شبہات پادریان (حصۂ اول)	
۶۳	جواب بعض شبہات پادریان (حصۂ دوم)	
۶۴	احوال مباحثۂ رڑکی	
۶۵	تفسیر آیت وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ	
۶۶	تحقیق صفت وموصوف	
نمبر شمار	**نام کتاب**	**نام علم**
۶۷	وحدۃ الوجود	
۶۸	سماع موتی	
۶۹	خلاصہ وحدۃ الوجود	
۷۰	تلقین معمولات ووظایف	
۷۱	الارشاد علی الاسترشاد	
۷۲	اورُدُ المورُود (تعلیم وظائف)	
۷۳	مسئلۂ طلاق وتعلیم وظائف	
۷۴	لطائفِ ستہ	
۷۵	تعبیر خواب	

مکتوباتِ قاسمیہ:

یہ ضخیم مجموعہ سینتیس مکتوبات پر مشتمل ہے۔ یہ مکتوبات طبع نہیں ہوئے، اور افسوس کہ ان کا کچھ پتہ بھی نہیں چلا، صرف ایک مطبوعہ اشتہار سے جو نومبر ۱۸۹۰ء/مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۱۳ھ/کو من جانب قاضی محمد عبدالہادی ابن قاضی عبدالباری، مطبع مجتبائی سے شائع ہوا، ان مکتوبات اور ان کے مشتملات کا کچھ پتہ چلا ہے۔ اشتہار کے سرنامہ پر جلی حروف میں عنوان دیا گیا ہے: ''اعلان بہ طبع مکتوبات افضل علماء الاعلام''۔

اور نیچے کی عبارت میں وعدہ کیا گیا ہے کہ اگر دو سو خریداروں کی درخواستیں موصول ہو جائیں گی، تو یہ مکتوبات شائع کر دیے جائیں گے۔ آگے بہ عنوان ''مکتوباتِ طیبات'' ان مکتوبات کی فہرست درج ہے، اور مکتوب کا موضوع بحث مختصر الفاظ میں تعین کر کے لکھا گیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرتِ والاؒ کے مطبوعہ مکاتیب کی طرح اس مجموعے کا ہر مکتوب بھی ایک مستقل رسالہ اور مختلف علوم و معارف کا خزانہ ہے۔ احقر نے اشتہار کے متعین کردہ موضوع اور مضمون کا مرقومہ خلاصہ سامنے رکھ کر ہر مکتوب کا ایک نام یا مختصر عنوان متعین کر دیا ہے، کہ اگر ان مکاتیب کے علوم سامنے نہ آئے، تو کم از کم عنوان مکتوب ہی سامنے آ جائے، گو وہ اور زیادہ حسرت و تاسف کا باعث ہوگا، جب کہ عنوان دے کر اصل مضمون کی تو پیاس بھڑک اٹھے گی اور آبِ حیات تک پہنچنے کی کوئی صورت ہوگی نہیں، تاہم تاریخی حیثیت سے حضرتِ والاؒ کے علمی افادات کا ایک باب ضرور سامنے آ جائے گا۔ اس طرح حضرتِ والاؒ کے رسائل کی تعداد پچھتر ہو جاتی ہے[1]۔

(۱) علمائے دیوبند: ۲۱/۱/۷۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
کا
مقامِ دعوت وتجدید
یعنی سیاسی، معاشرتی، تجدیدی کارنامے

افادات: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ

ترجمانی:

مولانا سمیع الحق حقانی زیدمجدہ ✿

پچھلے دنوں [1] جب حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی، مہتمم دار العلوم دیوبند نے اپنے سفر پاکستان کے دوران اپنی خاص محبت اور تعلق کی بنا پر دار العلوم حقانیہ کو بھی اپنی تشریف آوری سے نوازا، اور دار العلوم کی فضائیں حضرت کی آمد کی وجہ سے پرنور مجالس اور محافل سے سراپا نور بن گئیں، تو اچانک دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ماہ نامہ الحق کے لیے مرکزِ اسلام کے مدیرِ شہیر اور حضرت حکیم الاسلام، مولانا نانوتویؒ کے علوم واسرار کے امین سے ایک انٹرویو ریکارڈ کیا جائے۔ اِدھر یہ خواہش، اُدھر حضرت کی مصروفیات، اِردگرد پروانوں کا ہجوم اور پھر حضرت کی علالت اور تھکاوٹِ سفر کے ساتھ ساتھ تازہ زکام اور نزلہ اس پر مستزاد؛ مگر خدا کی خاص دست گیری تھی کہ رات گیارہ بجے کے بعد اس مقصد کے لیے کچھ یک سوئی کا وقت نکل ہی آیا۔

✿ مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

(۱) یہ انٹرویو ۲۰/رجب ۱۳۸۸ھ/۱۳/اکتوبر ۱۹۶۸ء کو لیا گیا تھا۔ (نعمان)

حضرت سے پہلا سوال دار العلوم دیوبند کے مستقبل کے بارے میں تھا۔ بھارت سے مسلمانوں کی ثقافت، پرسنل لا اور ثقافتی مراکز کے متعلق جو خبریں آتی ہیں، وہ اگر چہ مبالغہ آمیز سہی؛ لیکن پریشان کن ضرور ہوتی ہیں۔ پھر مادرِ علمی دار العلوم دیو بند کا تو خیال آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں کہ عشق است و ہزار بدگمانی۔ جس شجرۂ طوبیٰ کے لیے حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ عبد العزیزؒ اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی، جس کی داغ بیل حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور فقیہ الاسلام مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے سراپا اخلاص و عمل بزرگوں نے رکھی، پھر جس کی آب یاری میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے اساطینِ امت نے اپنی زندگی تج دی۔ آج انوار و معارف قاسمیہ کے امین اور بانیٔ دار العلوم کے حفید رشید مولانا محمد طیب صاحب قاسمی سے پہلا سوال اسی دار العلوم دیو بند کے بارے میں تھا، جس کی تعمیر و تشکیل سے خود حضرت قاری صاحب مدظلہ کی پوری زندگی کی داستان وابستہ ہے۔ حضرت نے پورے اعتماد، مضبوط ایمان اور توکل سے بھر پور انداز میں جواب دیا:

> ''جی ہاں! اللہ بہتر کرے، بنیاد تو اس کی ایسی ہے کہ مستقبل روشن ہے، ان شاء اللہ! اور یہ اس لیے کہ بڑی بڑی گھاٹیاں آئیں، اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا، بڑے بڑے مخالف پیدا ہوئے؛ مگر اللہ کا فضل ہے، وہ بڑھتا ہی رہا''۔

اطمینان اور تسلی کے لیے یہی کچھ کافی تھا؛ مگر یکا یک دھیان مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر اوّل دار العلوم دیو بند کے ایک مکاشفے، یا پیش گوئی کی طرف گیا، جسے کہیں پڑھا یا سنا تھا، اور پھر جب یہ خیال آیا کہ دار العلوم دیو بند اپنی زندگی کے سو سال تو پورے کر چکا ہے، تو گویا دل و دماغ پر ایک بجلی سی کوند پڑی اور سائل نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب سے اس بارے میں پوچھا کہ: حضرت! کسی بزرگ غالبًا مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا ایک مقولہ سننے میں آیا ہے کہ: سو سال تک تو اس دار العلوم کا خدا محافظ ہے! اس کے بعد حق تعالیٰ کی شانِ بے نیازی کا جو فیصلہ ہو۔ حضرت نے اس کا جواب دیا، تو یکا یک فکر و اضطراب کی گھٹائیں اطمینان اور امید کی قندیلوں سے روشن ہو گئیں۔ حضرت نے فرمایا:

> ''نہیں، میں نے اتنا سنا ہے کہ یہ مدرسہ چلتا رہے گا، چلتا رہے گا، یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب ہو، اور یہ مدرسہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے''۔

اس پیش گوئی سے ہم تو بڑی امیدیں باندھے ہوئے ہیں۔ پھر حضرت نے خود فرمایا:

> ''یہ ایک عجیب بات ہے، اور اب تک تو پوری ہوتی آ رہی ہے''۔

حضرت قاری صاحب وضاحت فرما رہے تھے اور چشمِ تصور نے دہلی کے لال قلعے پر ہلالی پرچم لہراتا دیکھا۔ کانوں نے اس کی سرسراہٹ محسوس کی اور مسلمانوں کی عظمتوں کی امین سرزمین پر شوکتِ اسلام کے تصور ہی سے دل خوشی سے جھوم اٹھا؛ مگر کیا خبر کہ یہ سنہرا خواب بھی زندگی کی حسرتوں کی طرح شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے، یا نہیں؟ اس امید وبیم میں راقم الحروف نے اپنی بات دوسرے پیرائے میں دہرائی۔

حضرت! تجدیدِ دین کا زمانہ تو اشخاص وافراد کے لحاظ سے سو سال ہوتا ہے، تو یہ تو دین، علومِ دین کا ایک مجدد ادارہ ہے، تو اس کی عمر تو ہزاروں سال ہونی چاہیے؟ ابھی میں نے اپنی بات پوری نہیں کی کہ حضرت نے ایسا امید افزا اور ایمان پرور جواب دیا کہ دل ودماغ میں فکر واضطراب کے بجائے خدا کی رحمت اور وعدۂ حفاظتِ دین کے یقین کی شمع فروزاں ہوئی۔ حضرت نے فرمایا:

''میں نے اپنے بزرگوں مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اور دیگر حضرات سے کئی بار سنا ہے کہ: مجدد کے لیے شخص واحد کا ہونا ضروری نہیں؛ بلکہ جماعت بھی ہوسکتی ہے، اور ان حضرات نے فرمایا کہ: یہ جو حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ اور ان اکابر کی جماعت ہے، یہ سب مجدد ہیں، جنہوں نے سنت اور بدعت میں، معروف اور منکر میں تمیز پیدا کی''۔

اور اس کے بعد فرمایا:

''ان حضرات کی تجدید کا مظہرِ اَتم دار العلوم دیوبند ہے؛ لہٰذا اسی کو مجدد کہا جائے، اور مولانا حبیب الرحمٰن نے دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ: یہ جو عمل ہے تجدیدِ دین کا، اس کی نسبت اور قیام کا مرکز ہے دار العلوم، اور ہندوستان میں یہ دار العلوم قطب العالم کی حیثیت رکھتا ہے، جیسے چکی کے پاٹوں کے بیچ میں کِلّی ہوتی ہے، تو اس کے اِردگرد کے پاٹ گھومتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے نہ صرف دینی معاملات؛ بلکہ ملکی معاملات بھی اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اس کے اندر کچھ قوت اور مقناطیسی طاقت خدا نے رکھی ہے، اور تیسری بات جس سے ڈھارس بندھتی ہے، وہی مولانا یعقوب صاحبؒ کا مقولہ کہ: یہ دار العلوم چلتا رہے گا، یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب آجائے اور یہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں آجائے''۔

حضرت اپنی بات سمیٹ رہے تھے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ مجلس میں تشریف لائے اور حضرت کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ حضرت نے ان کی طرف متوجہ ہوکر انٹرویو نگاروں کے ستم کا شکوہ اس ظرافت آمیز انداز میں فرمایا کہ:

''ان لوگوں کا منشا یہ ہے کہ تم رات کو بھی جاگے ہو، دن کو بھی نہیں سونا چاہیے، آج بھی جاگنا

چاہیےاورکل کوآٹھ گھنٹے کا سفر ہے، جاگ کر چلے جانا، تاکہ مجاہدہ مکمل ہو جائے''۔

بزرگوں کی شفقت سے طبیعت میں جو گستاخی اور شوخی آ گئی ہے، اس کی بنا پر عرض کیا گیا کہ: حضرت! پورے سفر میں ہماری قدر شناس میزبان حکومت نے آپ کے تقریر و بیان پر پابندی(۱) لگا کر آپ کو بڑی راحت پہنچائی ہے۔ اب ہم کل سے اس کی کسر یہاں دارالعلوم حقانیہ میں نکالنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے جن کی طبیعت کو خدا نے شکوہ و شکایت کی بجائے صبر و تمکنت اور تحمل کی نعمت سے بڑی فراوانی سے نوازا ہے، ہماری اسلامی حکومت کے اس سراسر نامناسب اقدام پر احتجاج یا افسوس کی بجائے احسان مندی کے لہجے میں فرمانے لگے:

> جی ہاں! یہ تو واقعی یہاں کی حکومت کا میرے ساتھ نادانستہ احسان ہے، یا پھر میرے ضعیف بڑھاپے اور علالت پر خداوند کریم کا غیبی کرم؛ ورنہ تقریر پر پابندی نہ ہوتی اور جگہ جگہ دوستوں کے تقاضے پر مجھے بولنا پڑتا، تو شاید میری طبیعت اس کی متحمل نہ ہو سکتی، گو میں تو وہاں سے یہ ارادہ کر کے آ رہا تھا کہ تقریر و بیان سے حتی الوسع علالت کی وجہ سے پہلو تہی کروں گا''۔

عالم اسلام کے ایک جلیل القدر عالمِ دین اور مسلمانوں کے قابلِ فخر بزرگ کی اپنے ملک میں اس پذیرائی کا ذکر چھیڑ کر مجھے خود ندامت اور خفت محسوس ہونے لگی؛ مگر حضرت کی زبان سے ایسا تبصرہ سن کر اپنے اکابر کی شرافتِ نفس اور علوِ اخلاق کا ایک پہلو تو سامنے آ ہی گیا۔

اس کے بعد گویا اصل انٹرویو شروع ہوا، اور ایک پرزہ جس پر عجلت میں چند سوالات لکھے گئے تھے، حضرت کی طرف بڑھایا گیا۔ حضرت نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر گویا ہماری طفلانہ خواہش اور تنگیٔ داماں کو دیکھ کر مسکرانے لگے:

---

(۱) جس سفر کا ذکر ہے، اس دوران حکومت نے حضرت مدظلہ کی تقریر و تحریر پابندی لگا رکھی تھی۔ (سمیع)

غالباً اسی سفر میں کراچی میں فوج کے کسی شعبے میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر تھی، ماڑی پور کا بیس تھا، مجمع سرکاری زیادہ تھا اور عام لوگ بھی اس میں شامل تھے۔ روافض بھی اس میں تھے، جیسا کہ فوج میں کثرت سے ہیں۔ حضرت حکیم الاسلامؒ سے کسی نے اس مجمع میں سوال کیا، آپ نے اس کا جواب اپنی تقریر میں دینا شروع کیا۔ حضرات صحابہؓ کے مقام کا بیان دلائل کے ساتھ شروع کیا ہی تھا کہ ایک پرچی حضرت حکیم الاسلامؒ کے پاس پہنچی، حضرتؒ نے جملہ بھی پورا نہیں کیا تھا کہ فوراً ''وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ'' پڑھ کر تقریر ختم کر دی۔ اس کے بعد خطیب الامت حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ کو تقریر کی دعوت دی گئی۔ آپ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر بند کرانے پر احتجاج کیا؛ لیکن اپنی تقریر پوری فرمائی۔ شاید یہی سال ہو، جس میں حکومت پاکستان نے آپ کی تقریر و تحریر پر پابندی عائد کر کے ''خدمت'' انجام دی تھی۔ یہ یاد رہے کہ ہماری ''مہربان حکومت'' ہمیشہ مسلمانوں کے لیے تنگ نظر ثابت ہوئی ہے۔ (نعمان)

''ارے بھئی! یہ تو بڑے لمبے سوال ہیں، اس میں سے کسی ایک سوال کے ایک گوشے پر گفتگو کے لیے بھی یہ پوری رات ناکافی ہے''۔

مگر ایک سدابہار گلشن سے گزرنے والے کسی سراپا شوق کی نظر تو اپنی تنگ دامنی سے زیادہ انواع واقسام کی زیبائش اور رعنائی پر ہوتی ہے، اس کے دامانِ نگاہ میں تو پورا چمن ہی سمیٹ لینے کی چیز ہے کہ پھول ہے، تو یہی اور سرسبز وشاداب گوشہ ہے، تو بس یہی۔

سب سے پہلا سوال حجۃ الاسلام (مولانا) محمد قاسم نانوتویؒ کے بارے میں تھا، جن کے سر پر خدا نے ظلمت کدۂ ہند میں حفاظتِ دین کا سہرا باندھا اور جن کی مومنانہ بصیرت، مجاہدانہ جدوجہد، حکیمانہ علوم اور جدید علم کلام کی وجہ سے خداوندِ کریم نے دورِ غلامی میں اسلام اور اسلامیانِ ہند کے علوم وتہذیب کو محفوظ رکھا۔ بلاشبہ اس امام کبیر کی نظیر قرونِ اُولیٰ ہی میں مل سکتی ہے۔ علم میں، عمل میں، جہاد میں اور ریاضت میں، تدبر اور سیاست میں، تصوف اور سلوک میں حضرت حجۃ الاسلامؒ یکتائے روزگار تھے۔ ایک نقاد عالم نے بالکل صحیح کہا کہ: حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی ذاتِ ستودہ صفات انیسویں صدی کے نصف آخر میں بے شبہ آیۃٌ من آیاتِ اللّٰہ تھی۔ آپ کے علمی، اخلاقی اور روحانی کارنامے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے رازی کا فلسفہ، شعرانی کا علم الکلام، غزالی کا سوز وگداز، ابن تیمیہ کا صولتِ بیان، ولی اللہ کی حکمت ودانش، احمد سرہندی کی غیرت وحمیتِ اسلامی اور ٹیپو کی شجاعت؛ یہ سب چیزیں کس فیاضی سے ایک شخص میں جمع کردی تھیں، اور بہ قول حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ: ہمارے اکابر تو وہ ہیں کہ اگر ان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرادیا جائے اور بتلایا نہ جائے، تو دیکھنے والے رازی اور غزالی ہی سمجھیں گے''۔ اور آج حضرت قاری صاحب سے اسی امام دعوت وعزیمت پر کچھ روشنی ڈالنے کے لیے کہا گیا تھا اور حجۃ الاسلامؒ کے پوتے فرمارہے تھے:

''حضرت نانوتویؒ نے زندگی میں جو کام انجام دیے، وہ تو بہت زیادہ ہیں؛ لیکن بنیادی طور پر تین بڑے بڑے کام انجام دیے:

(۱) سب سے پہلا کام ''دارالعلوم'' دیوبند کا قیام ہے۔ یہ کام اتنا عظیم کام ہے کہ پوری دنیا پر اس نے اثر ڈالا ہے۔

(۲) دوسرا کام یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ خلافتِ اسلامیہ کی تائید میں ہمہ وقت منہمک رہے۔ سلطان عبدالحمید صاحبؒ خلیفہ تھے، گو وہ (خلافتِ عثمانیہ) نام کی رہ گئی تھی؛ مگر حضرتؒ چاہتے تھے کہ وہ نام ہی قائم رہے۔ اس سے تمام ممالک اسلامیہ میں ایک مرکزیت قائم رہے

گی؛ اس لیے حضرتؒ نے خود بھی سلطان کی حمایت میں قصیدے لکھے، مولانا محمد یعقوبؒ اور مولانا ذوالفقار علیؒ سارے بزرگ رطب اللسان رہے، اور جب بھی ترکوں سے کسی کی جنگ ہوئی، یہ حضرات ترکوں کی حمایت میں کھڑے ہوگئے۔ کہیں چندہ جمع کر رہے ہیں، کہیں رائے عامہ پیدا کر رہے ہیں۔ غرض ہمہ وقت مصروف رہتے، تو مقصد یہی تھا کہ خلافت کا نام قائم رہے، تاکہ تمام ممالک اسلامیہ میں کچھ نہ کچھ ارتباط تو قائم رہے۔

(۳) اور تیسری چیز یہ انجام دی کہ دیوبند اور نواحِ دیوبند میں نکاحِ بیوگان کو انتہا درجے کا عیب سمجھا جاتا تھا، اور یہ چیز ہندوؤں سے آئی تھی، اگر کسی نے نام بھی لیا، تو تلواریں نکل آتی تھیں۔ حضرتؒ نے لطیف پیرائے میں اس کی تحریک شروع کی۔ جب اندرونی طور پر خواص کو اپنا ہم خیال بنایا، تو اس کے بعد جلسۂ عام کیا۔ ہمارے یہاں دیوان دروازہ جو ہے، وہ نواب لطیف اللہ خاں مرحوم کا محل ہے، جو اورنگزیبؒ کے وزیر خارجہ تھے، اور دیوبند میں عثمانیوں کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ اس میں حضرتؒ نے وعظ فرمایا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ درمیان میں ایک شخص اٹھا اور کہا کہ: حضرت! مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ فراست سے سمجھ گئے کہ کیا کہنا ہے۔ جواب میں فرمایا کہ: ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں، ایک ضرورت پیش آگئی ہے۔ لوگوں نے سمجھا کہ استنجا وغیرہ کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔

حضرتؒ گھر میں گئے، حضرتؒ کی بڑی بہن بیوہ تھیں، پچانوے برس کی عمر میں۔ نہ نکاح کے قابل، نہ کچھ؛ مگر اعتراض کرنے والے کو اس کی کیا ضرورت ہے، وہ تو یہ کہتا ہے کہ: آپ دنیا کو نصیحت کرتے ہیں؛ مگر آپ کی بہن تو بیٹھی ہے۔ گھر میں گئے، تو بڑی بہن کے پیروں پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے گھبرا کر کہا کہ: بھائی! تم تو عالم ہو، یہ کیا کر رہے ہو؟ فرمایا: بہر حال! میں آپ کا چھوٹا بھائی ہوں، آج ایک سنتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) زندہ ہوتی ہے، اگر آپ ہمت کریں۔ آپ پر موقوف ہے۔ فرمایا: میں ناکارہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا احیا میری وجہ سے؟۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ آپ نکاح کر لیجیے۔ فرمایا کہ بھائی! تم میری حالت دیکھ رہے ہو؟ منہ میں دانت نہیں ہیں، کمر جھک گئی ہے، پچانوے برس میری عمر ہے۔ کہا: یہ سب میں جانتا ہوں۔ اعتراض کرنے والے اس چیز کو نہیں دیکھتے۔ تو فرمایا کہ: اگر سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری وجہ سے زندہ ہو سکے، میں تو جان قربان کرنے کو بھی تیار ہوں۔ تو ان کے دیور کی بیوی کا انتقال ہوا تھا اور اِن کے خاوند کا، وہاں پر چودہ پندرہ آدمی خاندان کے تھے، ان ہی کے سامنے

نکاح پڑھایا گیا، گواہ بنادیے گئے، اس میں کچھ دیر لگ گئی، پھر حضرت نانوتویؒ باہر آئے اور مجمع میں دوبارہ تقریر شروع کی۔ پھر وہی سائل کھڑا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے۔ فرمایا: کہیے! اس نے کہا کہ: آپ دنیا کو نصیحت کرر ہے ہیں اور آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہے، تو ہم پر کیا اثر ہوگا؟ فرمایا: کون کہتا ہے؟ ان کے نکاح کے تو شاید گواہ بھی یہاں موجود ہوں گے۔ دو تین آدمی درمیان میں کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہمارے سامنے نکاح ہوا ہے۔

اصلاحِ معاشرت اور رسومات مٹانے کے لیے حضرتؒ نے خود اپنے گھر سے قربانی پیش کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی مجلس میں ستّر اسّی نکاح پڑھائے گئے۔ پھر یہ سنت ایسی کھلی کہ ہزاروں بیواؤں کا نکاح ہوگیا۔

تو پہلی چیز تو دارالعلوم کے قیام پر زور دیا۔ اس کی روح فی الحقیقت یہ تھی کہ علومِ نبوت اگر عام ہوجائے اور ایمان سنبھل جائیں، تو پھر مسلمان سب کچھ کر سکتے ہیں، اور اگر ایمان ہی نہ رہا، تو پھر کچھ نہیں کر سکتے؛ اس لیے کہ جب شوکت اور حکومت جا چکی، تو کم از کم دین تو محفوظ رہ جائے، وہ رہ گیا، تو آگے سب کچھ ہوجائے گا۔

اس لیے سفر میں جہاں بھی گئے، تو مدارس قائم کرتے چلے گئے۔ مرادآباد میں مدرسۂ شاہی، امروہہ میں مدرسۂ ملیہ، ہرلی میں مدرسۂ اشاعت العلوم، انبیٹھہ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسے اور گلاؤٹھی میں مدرسۂ قاسمیہ قائم کیا، اور جتنے متوسل تھے، خطوط لکھتے رہے کہ جہاں ہو، مدرسہ قائم کرواؤ۔ یہ حضرتؒ کی ایک بڑی سیاست تھی، اور اس کا حاصل یہ تھا کہ قوم کو علم کے راستے سے تیار رکھنا کہ وہ مضبوطی سے قائم رہے، اور جب دین ہوگا، تو آئندہ ممکن ہے کہ ان میں شوکت اور قوت بھی آجائے۔

اِدھر معاشرت کو درست کیا۔ معاشرے کے سب سے بڑی خرابی نکاحِ بیوگان کی طرف توجہ دی۔ تیسری چیز یہ بھی کہ خلافت اسلامیہ کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔ ہر وقت اس کا دھیان۔ جس سے میں نے یہی سمجھا کہ حضرتؒ چاہتے تھے کہ اسلامی نظام کی کوئی نہ کوئی بود و نمود باقی رہے۔ اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے، تو کم سے کم کسی اسلامی حکومت سے تو مربوط رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی امیدوں کا مرکز بہت دنوں تک افغانستان رہا، اور برطانیہ کو یہ شکایت رہتی کہ یہ جماعت شورش کررہی ہے، اور افغانستان سے مل کر برطانوی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے؛ مگر ان حضرات کو اس کی کیا پرواہ تھی؟ افغانستان سے برابر اپنا ایک رابطہ قائم رکھا، اور یہی

وجہ ہوئی کہ جب امیر نادر خان کا انتقال ہوا، اور ظاہر شاہ تختِ سلطنت پر بیٹھ گئے، تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے مجھے نمائندہ بنا کر بھیجا کہ: امیر مرحوم کی تعزیت اور امیر موجود کی تہنیت کروں۔ میں افغانستان حاضر ہوا، اور میں نے یہ تحریر لکھ کر پیش کی کہ ہمارا مقصد کوئی مالیہ اور چندہ لینا نہیں؛ بلکہ ان روابط کو زندہ کرنا ہے، جو ہمارے اکابر کے تھے۔ جس پر صدرِ اعظم نے مجھے بلایا، امیر بڑی عنایت اور شفقت سے پیش آئے۔ جب میں قصرِ صدارت میں پہنچا، تو ہم لوگ بیٹھ گئے اور یہ خیال تھا کہ ملاقات کے لیے شاید کمرے میں بلایا جائے گا؛ لیکن یکا یک دیکھا کہ خود صدرِ اعظم وہیں آ رہے ہیں، ہم سب لوگ کھڑے ہوئے، آگے بڑھے، تو وہی افغانی طریقے پر معانقہ، دایاں بایاں مونڈھا چوم کر پوری محبت کا اظہار انہوں نے کیا۔ اس کے بعد فرمایا:

'بفرمائید، آپ آگے چلیں، میں نے کہا: نہ نہ خلافِ ادب است۔ فرمایا: نہیں نہیں، آپ کو آگے چلنا ہوگا اور میں اس کی وجہ بتاؤں گا۔ اب ہم اس شان سے چلے کہ میں آگے آگے، میرے پیچھے صدرِ اعظم صاحب، ان کے پیچھے سردار نعیم خان اور ان کے پیچھے مولانا محمد میاں صاحب (منصور انصاری)[1] اور ان کے پیچھے غازی صاحب۔ اس ترتیب سے ہم آگے بڑھے، تو وہ جو کرسی تھی، اس پر مجھے بٹھلایا اور خود دوسری کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئے، اور فرمایا کہ: اب میں وجہ بیان کرتا ہوں، اور وجہ مختصر یہ ہے کہ حکومتِ کابل کی خدمت ہمیں آپ بزرگوں کی دعاؤں سے ملی ہے، اور یہ اشارہ تھا اس طرف کہ امیر نادر خان صاحب کے چچا تایا سردار محمد یوسف خان اور سردار محمد آصف خان یہ دونوں بیعت تھے حضرت گنگوہیؒ سے، اور برطانیہ نے انہیں دہرادون میں نظر بند کر رکھا تھا۔ تو یہ حضرات شکار کے حیلے سے گنگوہ آ کر حضرتؒ کی خدمت میں حاضری دیتے تھے، اور حضرتؒ کوئی نصیحت فرما دیتے۔ آخری دفعہ جب ملاقات ہوئی، تو حضرتؒ نے فرمایا: کہ جاؤ! کابل کی حکومت تمہارے خاندان میں آئے گی اور عدل سے کام کرنا۔ انہیں حیرت ہوئی کہ کابل کی حکومت سے ہمارا کیا تعلق؟ امان اللہ کی حکومت تھی۔ یہ لوگ بنی عمام میں سے تھے، انہیں عہدے وزارتیں تو ملتی تھیں، مگر حکومت کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ سمجھے کہ حضرتؒ نے حوصلہ افزائی کے طور پر یہ کلمہ کہہ دیا ہے۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ بچہ سقہ کی حکومت آئی، امان اللہ خان معزول ہوئے؛ کیوں کہ اسی نے مظالم ڈھائے، تو قوم

---

(۱) حضرت منصور انصاریؒ حضرت نانوتویؒ کے نواسے تھے۔ جماعت شیخ الہندؒ کے رکن تھے اور تحریک کے زمانے میں افغانستان چلے گئے تھے، وہیں انتقال ہوا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ''نقشِ حیات''۔ (نعمان)

متوجہ ہوئی کہ امیر نادر خان کو فرانس سے بلایا جائے، وہ آئے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور پھر شہید ہو گئے۔ تو صدرِ اعظم کا اشارہ اسی طرف تھا۔ پھر صدرِ اعظم نے فرمایا کہ: ہمارے پاس کچھ تبرکات آپ کے بزرگوں کے محفوظ تھے۔ مولانا نانوتویؒ کی ایک ٹوپی تھی، جو میری والدہ کے پاس تھی اور ہمیں جب کوئی بیماری ہوتی، تو والدہ ہمیں وہ ٹوپی اُڑھاتی تھیں اور ہمیں شفا ہو جاتی تھی۔ آج ڈاکٹر رفقی بے (جو ترک ہیں) کو ہم چھ ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں؛ مگر اس کے نسخوں سے وہ شفا نہیں ہوتی، جو ان تبرکات کی وجہ سے ہوتی تھی، اور فرمانے لگے کہ: بچہ سقہ کے زمانے میں ہمارا گھر لوٹا گیا، لاکھوں روپے کا سامان چوری ہو گیا؛ لیکن ہمیں صدمہ ہوا، تو تبرکات کا، جس کا آج تک ہمارے اوپر اثر ہے۔ پھر صدرِ اعظم افغانستان نے فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو آگے بڑھا رہا ہوں۔

یہ تو تھے افغانستان سے روابط، اور سلطان عبدالحمید خاں ترکوں سے تعلق کا حال معلوم ہوا۔ جیسے ان حضرات کے ذہن کا اندازہ ہے کہ یوں چاہتے تھے کہ کسی طرح اسلامی حکومت بازیافت ہو جائے، مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو۔ شیخ الہندؒ کی بھی یہی تحریک تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ عالمِ اسلام متحد ہو کر ترک اور افغانستان سب مل کر ہندوستان پر حملہ آور ہوں۔ حضرتؒ کی یہ تحریک تھی اور وہ ہوئے بھی حملہ آور؛ مگر کچھ تو یہ ملک تیار نہ تھا، کچھ مجاہد نا تربیت یافتہ تھے۔ نتیجہ شکست کی صورت میں نکلا، اور یہ خواہش انہیں ورثے میں اپنے استاذ حضرت نانوتویؒ سے ملی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں تو گویا حضرتؒ جوشِ جہاد میں غرق تھے، اور بس یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جان دے دوں۔

الغرض حضرتؒ کی زندگی کے کارناموں میں ایک علمی کارنامہ تو دار العلوم ہے، جس کا فیض اطرافِ عالم میں پہنچا۔ دوسرا معاشرتی کارنامہ ہے اور تیسرا سیاسی اور اجتماعی کارنامہ کہ تہذیب و تعلیم ہی کے سلسلے میں حضرتؒ نے دار العلوم دیوبند میں محکمۂ قضا قائم کیا اور مولانا یعقوبؒ کو قاضی بنایا، تو ہزاروں مقدمات جو برس ہا برس سے الجھے ہوئے تھے، منٹوں میں طے ہوئے۔ لوگوں کا وقت اور مالیہ بچا۔ یہ سلسلہ جاری رہا؛ مگر انگریز نے آخر میں آ کر توڑ دیا۔ دیوبند میں ایک تھانے دار کو بھیجا، جو بڑا سخت قسم کا آدمی تھا؛ چناں چہ وہ آیا، رمضان شریف کا آخری عشرہ تھا، اس نے آ کر حضرت نانوتویؒ سے مصافحہ کیا اور بہت جرأت کے ساتھ کہا کہ: کیا آپ ہندوستان میں شرعِ محمدی کا جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا آپ نے محکمۂ قضا قائم کیا ہے؟ حضرتؒ نے بڑی نرمی سے کہا کہ: یہ تو ہم لوگ گورنمنٹ کی مدد کر رہے ہیں، جو لاکھوں روپے خرچ

کر کے مقدمات فیصل کرتی ہے، ہم نے منٹوں میں فیصل کر دیا؛ مگر اس نے کہا کہ: نہیں، آپ پورا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں رپورٹ کروں گا۔ اس پر حضرتؒ کو غصہ آیا اور کہا کہ کان پکڑ کر اسے نکال دو، طالب علموں نے دھکے دیکر اسے نکالا، اور حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ: جا، ہم تیری رپورٹ کریں گے، نکال دو اس شیطان کو یہاں سے۔ بہر حال! عید کا دن آیا۔ تھانے دار کے ہاتھ میں دودھ کے بالٹے بھرے تھے، کپڑے تیار، خوشیاں منائی جارہی تھیں کہ اچانک گورنمنٹ کا حکم پہنچا کہ اس کی رشوتوں کی انتہا ہوگئی ہے، اس کو فورطور پر برخاست کیا جائے اور بازار میں دکان دکان پر جہاں سے اس نے رشوت لی، پیروں میں رسی ڈال کر اسے پھرایا جائے۔ تو اس حالت میں اسے گھمایا گیا کہ یہ لاتے ہوئے کہتا جارہا تھا کہ: افسوس! میں نے رپورٹ نہیں کی؛ مگر مولوی جی نے میری رپورٹ کردی۔ تو اس کا خمیازہ جلد اس نے بھگت لیا۔ اس کی جگہ دوسرا آیا۔ اس کے بعد ان بزرگوں کی وفات ہوگئی، وہ محکمہ نہیں چلا۔

تو حضرتؒ کا چوتھا منصوبہ یہ تھا کہ اسلامی پرسنل لا اور مخصوص قانونِ شریعت کے مطابق طے ہو۔ اس کے تحت دارالعلوم دیوبند کے اکابر نے - جب لندن سے مسٹر مانڈے وزیر ہند آیا اور جارج کا زمانہ تھا -تو میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمدؒ) علما کا ایک وفد لے کر ان سے ملنے کے لیے گئے اور درخواست یہ کی کہ ہندوستان میں محکمۂ قضا قائم کردیا جائے، جس میں شریعتِ اسلام کی مخصوص چیزیں، نکاح، طلاق، عدت، میراث، اوقاف وغیرہ طے ہوں۔ خیر اس نے ظاہر میں تو کہا کہ اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا اور پارلیمنٹ میں بھی؛ لیکن یہ ایک وقتی بات تھی، نہ اس نے یہ پیش کیا، نہ ایسا ہوا؛ مگر ان بزرگوں کا جذبہ برابر یہی تھا کہ اسلامی اقتدار مسائل کے درجے میں سہی، قائم ہو جائے۔

تحفظ خلافت اور روابطِ اسلامیہ کے سلسلے میں حضرت نانوتویؒ نے ایک کام یہ کیا کہ لوگوں کو بہت زیادہ حج کے لیے مائل کرتے تھے، اور فرمایا کہ: اوّل تو عبادت ہے اور عبادت بھی اجتماعی، وہاں جاکر مکہ والوں سے بھی سابقہ پڑے گا، وہاں اسلامی حکومت دیکھیں گے، تو ان کے قلوب پر اثر پڑے گا، تو شوکتِ اسلام کے جذبات لے کر آئیں گے۔ تو علم و معاشرت سیاست اور خلافت یہ چند چیزیں ایسی ہیں، جو حضرتؒ کی تمام خدمات کی محور ہیں''۔

رات آدھی گزر چکی تھی؛ مگر شرکائے مجلس ذکر قاسمی میں ایسے محو کہ گویا آپ حسین خواب دیکھ رہے ہوں اور زمانہ پیچھے کی طرف پلٹ گیا ہو کہ یکا یک حضرت قاری صاحب نے بساط لپیٹنی چاہی۔ سننے والے چونک

پڑے اور حضرت کے ضعف و نقاہت کے باوجود ان کی توجہ حضرت نانوتویؒ کی ایک مخصوص شان علمی کمالات کی طرف مبذول کرنا چاہی کہ ابھی ذکرِ محبوب کچھ دیر اور چلتا ہے کہ اصحابِ غرض کو تو اپنی مطلب برآری سے ہی کام ہوتا ہے؛ ورنہ عقل اور ادب دونوں حضرت کو تکلیف دینے سے روک رہے تھے، مگر دل بہ ضد تھا کہ ۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دو!!

حضرت نانوتویؒ کی علمی شان تجدید کا ذکر آیا، تو حضرت قاری صاحب گویا یک دم تازہ دم ہوئے اور فرط ونشاط میں محو ہو کر فرمانے لگے کہ:

''علوم و معارف میں بھی حضرتؒ کا بالکل مجددانہ انداز ہے۔ حضرتؒ کی جو تصانیف ہیں، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی نگاہ بہت تھی تصانیف پر، اور یہ جملہ فرمایا کرتے تھے کہ: سو برس تک فلسفہ کتنے ہی روپ بدل کر آئے؛ لیکن حضرتؒ کی حکمت اس کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہوگی۔ سو برس تک کوئی اسلام کا مقابلہ اور اسلام پر حملہ حجت سے نہیں کرسکتا، اتنی حجتیں جمع فرما دیں۔ تو گویا ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال دی، جس سے اسلامی حقائق اور دقائق پورے واضح ہوتے ہیں، اور مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ: میں اپنی نظر کے لحاظ سے کہتا ہوں کہ سلف میں بھی بہت کم لوگ ملیں گے، جنہوں نے اس قسم کی حکمت جمع کی ہو۔ یہ حضرتؒ ہی کا حصہ ہے، اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ: حضرتؒ کی ہر چیز بیچ کی نہ تھی؛ بلکہ آخری کنارے پر لگی ہوئی تھی۔

علم کے بارے میں ایک بات مجھے اور یاد آئی کہ مولانا یعقوب صاحبؒ کشف و کرامت بزرگوں میں سے تھے، اور ان کے ہاں اخفا تھا ہی نہیں، جو واردات ہوتی، صبح طالب علموں کے سامنے پیش کر دیتے کہ یہ رات کو کشف ہوا، یہ الہام ہوا۔ یہ عادت تھی۔ تو ایک دن فرمایا کہ: بھئی! آج صبح کی نماز پڑھنے کھڑا ہوا، تو بال بال بچ گیا۔ میرے مرنے میں کسر نہیں تھی۔ طلبہ نے عرض کیا کہ: کیا پیش آیا؟ فرمایا کہ: قرآن کریم کے علم کا ایک اتنا بڑا دریا میرے قلب کے اوپر گزرا، اور غنیمت یہ ہے کہ وہ گزرتے ہی نکل گیا؛ ورنہ میں تحمل نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے بعد خود فرمایا کہ: میں مراقب ہوا کہ یہ کیا چیز تھی، تو منکشف یہ ہوا کہ میرے بھائی حضرت نانوتوی میرٹھ میں میری طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی توجہ کا یہ اثر کہ علم کا ایک عظیم دریا میرے قلب میں گزرا، اور اس کے بعد خود فرمایا کہ: جس شخص کی توجہ کا اتنا اثر ہے کہ اتنا بڑا علم گزر جائے کہ برداشت نہ

کر سکے، تو وہ شخص اتنا بڑا علم کس طرح اٹھائے پھر رہا ہے؟

اس میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مولانا یعقوبؒ اور تمام اساتذۂ دار العلوم نے جن میں اساتذۂ ائمۂ فنون تھے، مولانا سعید احمد صاحبؒ امام معقولات سمجھے جاتے تھے، ان سب نے مل کر حضرت نانوتویؒ سے درخواست کی تفسیر کی کوئی کتاب پڑھا دیں، تا کہ قرآنی علوم ہم بھی سیکھیں۔ حال آں کہ یہ سب ائمۂ علوم تھے۔ مولانا یعقوب صاحبؒ تو صدر مدرس تھے، تو حضرتؒ نے منظور فرمایا۔ چھتہ کی مسجد میں حضرتؒ نے درس شروع کر دیا۔ 'الم' سے شروع فرمایا، تو حروفِ مقطعات پر کوئی دو ڈھائی گھنٹے تقریر فرمائی اور عجیب و غریب علوم و معارف ارشاد فرمائے، اور یہ عجیب بے نفسی کا دور تھا کہ یہ سارے اساتذہ سبق پڑھ کر باہم کہنے لگے: بغیر تکرار کے یہ علوم محفوظ نہ ہوں گے؛ لہٰذا تکرار کیا جائے۔ نودرہ میں بیٹھ کر تکرار شروع ہو گیا۔ مولانا یعقوبؒ نے تقریر شروع کی، بیچ میں ایک جگہ رکے، بات یاد نہیں رہی، کسی اور کو بھی یاد نہ آئی، تو کہا کہ: میں مولانا سے پوچھ کر یہ تقریر کروں گا، تو صبح کی نماز پڑھ کر حضرتؒ جب اپنے حجرے میں آ رہے تھے، تو مولانا یعقوبؒ نے عرض کیا کہ: حضرتؒ! تقریر کا فلاں حصہ یاد نہیں رہا، تو حضرتؒ نے کھڑے کھڑے یہ تقریر شروع کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ: نہ لفظ اس عالم کے تھے، نہ معنی اس عالم کے، ایک حرف بھی سمجھ میں نہ آیا، کیا فرما رہے ہیں۔ تو عرض کیا کہ: حضرت! ذرا نازل ہو کر فرمائیے کہ کچھ سمجھ جاؤں! اب دوبارہ تقریر شروع کی، تو الفاظ سب سمجھ میں آئے؛ مگر معانی نہیں، تو پھر عرض کیا کہ حضرت! کچھ اور نازل فرمائیے، ہم وہاں تک نہیں پہنچے۔ تو فرمایا کہ: مولانا! دوسرے وقت آئیے گا، تو اس وقت کہوں گا۔ تو علوم میں اس وقت عروج ہو گا کہ ادھر کہہ رہے ہیں اور ادھر سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تو علم کا یہ حال تھا اور عمل تو ظاہر ہے''۔

راقم (مولانا سمیع الحق) نے عرض کیا کہ: حضرت! ایسے علوم و معارف کی تسہیل اگر ہو جائے، تو اس میں بہت سے فتنوں کا علاج ہے۔ فرمایا:

''ہاں! ہم نے مجلس معارف القرآن سے اسے شروع کیا اور ایک آدھ رسالہ چھاپا بھی، تسہیل بھی کی؛ لیکن یہ سلسلہ چلا نہیں؛ اس لیے کہ علما کی توجہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ مغلق مضامین ہیں۔ میں نے کہا کہ: بھئی! حمد اللہ، ملا حسن اور قاضی سمجھ لو، تو ان علوم میں کیا دقت ہے؟ تو ارادہ نہیں سمجھنے کا''۔

عرض کیا کہ کاش! مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے سوانح قاسمی میں علوم قاسمی کا جو منصوبہ پیش کیا، اس

کے مطابق کام کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ حضرت قاری صاحب فرمانے لگے کہ:

''وہ منصوبہ میں نے ہی مولانا گیلانی مرحوم کے سامنے رکھا تھا، کہ آپ نے تین جلدوں میں سوانح لکھی؛ مگر اصل سوانح تو حضرتؒ کے علوم ہیں۔ آپ اس پر تبصرہ کریں؛ مگر افسوس! کہ اس کام سے پہلے مولانا گیلانیؒ کی وفات ہوگئی، پانچ ہی صفحات مقدمے کی شکل میں لکھ پائے تھے۔ الغرض بڑے عجیب وغریب علوم وحقائق ہیں(۱)۔

(۱) ماہ نامہ الرشید- لاہور کا دارالعلوم نمبر، ص: ۲۴-۷ ۲۱۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

دہلی کالج اور مدرسۂ دارالبقاء

حضرت مولانا مفتی حفیظ الرحمٰن واصفؒ ✿

زیرِ نظر مضمون ماہ نامہ معارف-اعظم گڑھ سے ماخوذ ہے۔ صاحبِ مضمون کے صاحبزادے ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی زید مجدہٗ کے بہ قول: اس کی اشاعت کے بعد والد محترم نے اس پر نظر ثالث فرمائی تھی اور اضافے بھی کیے تھے، ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اضافہ شدہ مضمون عنایت فرمادیں؛ لیکن نمبر کی اشاعت کے وقت تک نہ آسکا؛ اس لیے اس مضمون کو ہی لگا دیا گیا ہے۔ (نعمان)

جن دنوں مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم سوانح مولانا محمد قاسمؒ تصنیف فرما رہے تھے، موصوف نے چند سوالات حضرت والد ماجد مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجے، جن میں سے ایک اہم سوال یہ بھی تھا کہ ''مدرسۂ دارالبقاء'' جس میں حضرت نانوتویؒ کا قیام تھا، کون سا مدرسہ تھا اور کہاں تھا؟

کیا یہ وہی مدرسہ ہے، جس کے صدر مدرس مولانا مملوک العلی نانوتویؒ تھے؟

کیا اسی میں مولانا محمد قاسمؒ کا داخلہ ہوا تھا؟

امور مستفسرہ کے جواب کی خدمت والد نے احقر کے سپرد فرمائی۔ زیرِ نظر مقالہ جو مولانا موصوف کے مکتوب گرامی کے جواب میں لکھ کر بھیجا گیا تھا، بعد نظر ثانی پہلی مرتبہ شائع کیا جارہا ہے۔ اس مقالے کی تیاری میں مندرجۂ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

✿ جانشین وخلف الرشید مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ دہلویؒ)

''یادگارِ دہلی'': مصنفہ مولوی سید احمد ولی اللّٰہیؒ، مصنف فرہنگ آصفیہ۔ ''تاریخ آثار دہلی''، مصنفہ سید عبدالعزیز دہلویؒ۔ ''ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں'': شایع کردہ دار المصنفین اعظم گڑھ۔ ''مرحوم دہلی کالج'' از مولوی عبدالحقؒ۔ ''واقعات دار الحکومت دہلی'': از مولوی بشیر الدین احمدؒ۔ ''آثار الصنادید'': از سرسید احمد خاں دہلوی۔ ''طبقات الشعراء'': از مولوی کریم الدین پانی پتیؒ، مطبوعہ مطبع العلوم مدرسۂ دہلی ۱۸۴۷ء۔ ''تذکرہ علمائے ہند'': از مولانا رحمان علی، ممبر کونسل ریاست دیوان مطبوعہ نول کشور۔ ''حالات طیب مولانا محمد قاسمؒ'': از مولوی محمد یعقوب نانوتویؒ، مطبوعہ ۱۲۹۷ھ، در مطبع صادق الانوار بھاول پور۔ ''تذکرۂ رحمانیہ'': مولوی عبدالحلیم پانی پتیؒ۔ ''غدر کے چند علما'': از مفتی انتظام اللہ شہابیؒ۔ ''مزارات اولیائے دہلی'': از مولوی محمد عالم شاہ فریدیؒ۔ ''امیر الروایات''، ''ارواح ثلثہ''، ''تذکرۃ الرشید'': از مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ۔ ''حیات النذیر'': سید افتخار عالم مارہروی۔ ''ابجد العلوم'': از نواب صدیق حسن خاںؒ۔

مولانا محمد قاسمؒ ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) میں نانوتہ، ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دیوبند میں مولوی مہتاب علیؒ کے مکتب میں اور پھر سہارنپور میں مولوی محمد نوازؒ سے حاصل کی۔ اس زمانے میں دہلی شہر بڑے بڑے علما و فضلا کا مرکز تھا۔ خاندان ولی اللّٰہی کے تلامذہ اور منتسبین درس و تدریس اور ارشاد و ہدایت میں مصروف تھے۔ انہیں میں سے ایک عظیم الشان ہستی مولانا مملوک العلی نانوتویؒ کی تھی، جو مدرسۂ دہلی کے صدر مدرس تھے۔ ۱۲۵۸ھ/ (۱۸۴۲ء) میں مولانا موصوف نے رخصت لے کر حج کا ارادہ کیا۔ حج سے فارغ ہو کر برس دن کے بعد اپنے وطن نانوتہ تشریف لائے۔ اس وقت مولانا محمد قاسمؒ بھی وہیں تھے۔ دس گیارہ سال کی عمر تھی۔ مولانا مملوک العلیؒ نے ان سے فرمایا کہ: میں تم کو اپنے ساتھ دہلی لے جاؤں گا۔ انہوں نے بہ خوشی منظور کر لیا اور والدہ سے اجازت لے کر ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ (جنوری ۱۸۴۴ء) کے آخر میں وطن سے روانہ ہو کر دوسری محرم ۱۲۶۰ھ/ (۲۳/جنوری ۱۸۴۴ء) کو دہلی پہنچے۔ چوتھی محرم کو سبق شروع ہوئے۔ مولوی محمد قاسمؒ نے کافیہ شروع کی۔

مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ ابن مولانا مملوک العلیؒ لکھتے ہیں:

> ''والد مرحوم نے میرے ابواب کا سننا اور تعلیلات کا پوچھنا ان کے سپرد کیا تھا، اور ہر جمعہ کی رات کو کہ چھٹی ہوتی تھی، صیغوں اور ترکیبوں کا پوچھنا معمول تھا۔ یاد ہے کہ مولوی صاحبؒ سب میں عمدہ رہتے تھے۔ اسی زمانے میں ہمارے مکان کے قریب مولوی نوازش علی کی مسجد میں مجمع طالب علموں کا تھا۔ ان سے پوچھ پاچھ اور بحث شروع ہوئی۔ مولوی صاحبؒ کی جب باری آئی، سب پر غالب آئے، اور جب گفتگو ہوتی، اس میں مولوی صاحبؒ کو غلبہ ہوتا''۔

مولانا محمد قاسمؒ نے دہلی کالج میں داخل ہو کر بھی کچھ دنوں تعلیم پائی ہے، جس کے شعبۂ مشرقی کے صدر مدرس مولانا مملوک العلیؒ تھے۔ چند روز میں اقلیدس کے تمام مقالے دیکھ ڈالے۔ پھر منشی ذکاء اللہؒ (مصنف تاریخ ہندوستان) چند سوال کسی ماسٹر کے بھیجے ہوئے لائے، جو نہایت مشکل تھے۔ ان کے حل کر لینے پر مولوی صاحبؒ کی نہایت شہرت ہوئی؛ مگر امتحان سالانہ میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا۔ سب اہل مدرسہ بالخصوص پرنسپل کو بہت افسوس ہوا۔ پھر مطبع احمدی (دہلی) میں اجرت پر تصحیح کتب کا کام شروع کیا۔ اس وقت تمام درسی کتب آپ پوری کر چکے تھے۔ اس کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی معیت میں جو شروع ہی سے آپ کے ساتھی اور ہم سبق تھے، حضرت شاہ عبدالغنیؒ کی خدمت میں حدیث پڑھی اور اسی زمانے میں دونوں نے حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی(۱)۔

۱۱/ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ/(۷/اکتوبر ۱۸۵۱ء) کو مولانا مملوک العلیؒ نے وفات پائی۔ تیمارداری میں مولانا محمد قاسمؒ ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ آپ کے انتقال کے بعد مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اپنے مملوکہ مکان واقع کوچۂ چیلان میں منتقل ہو گئے۔ مولانا محمد قاسمؒ بھی اسی مکان میں منتقل ہو گئے۔ تقریباً ایک سال کے بعد مولوی محمد یعقوب صاحبؒ بہ سلسلۂ ملازمت اجمیر چلے گئے اور مولانا تنہا اس مکان میں رہے۔ کچھ دنوں کے بعد مطبع احمدی میں چلے گئے۔ پھر چند روز دار البقاء میں رہے۔ اسی زمانے میں مولانا احمد علی سہارن پوریؒ نے بخاری شریف کے آخری پانچ چھ پاروں کی تصحیح وتحشیہ کا کام آپ کے سپرد کیا۔

رحمان علی صاحب 'تذکرۂ علمائے ہند' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''بعد از فراغ علوم چندے بہ مدرسۂ دہلی تعلق گرفتہ و بعد ترکِ آں تعلق در مطبع احمدی بہ تصحیح کتب مقرر شد''۔

مطبع احمدی کوچۂ بلاقی بیگم میں (قریب جامع مسجد) واقع تھا۔ منشی امّو جان اس کے مالک تھے۔ ہنگامہ ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء کے بعد بہ وجہ شبہ الزام بغاوت روپوش رہے، اور ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) میں حج بیت اللہ کو روانہ ہوئے۔ واپسی پر عام معافی کا اعلان ہو چکا تھا۔ دہلی کا مطبع احمدی ختم ہو چکا تھا۔ منشی ممتاز علیؒ نے میرٹھ میں مطبع ہاشمی میں آپ کو بلالیا۔ منشی ممتاز علیؒ مطبع ہاشمی کے شرکا میں تھے۔

بیعت:

مولانا محمد یعقوبؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے فراغت تعلیم

---

(۱) حضرت گنگوہیؒ دہلی میں تعلیم کے لیے بعد میں آئے۔ حضرت نانوتویؒ پہلے سے موجود تھے۔ اسی طرح دونوں اکابر حضرت حاجی صاحبؒ سے الگ الگ وقتوں میں بیعت ہوئے۔ (نعمان)

کے بعد ہی حاجی صاحبؒ سے بیعت کی تھی؛ لیکن تذکرۂ علمائے ہند سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حاجی صاحبؒ سے ۱۲۷۷ھ/ (۱۸۶۱ء) میں مکۂ معظّمہ میں بیعت ہوئے؛ لیکن راقم الحروف کے خیال میں مولانا محمد یعقوبؒ کا بیان صحیح ہے۔ ''تذکرۃ الرشید'' سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۰ء) میں ہجرت فرمائی تھی۔ مولوی محمد قاسمؒ نے ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) میں دوسرا حج کیا۔ حج سے فارغ ہوکر واپس آئے، تو منشی ممتاز علیؒ بہ غرض عرب مکۂ معظّمہ میں ہی تھے۔ مولانا نے اس عرصے میں مولوی محمد ہاشم کے مطبع ہاشمی میں کام کیا۔ پھر منشی ممتاز علیؒ مکۂ معظّمہ میں ایک سال قیام کرکے واپس آئے (۱) اور اپنا مطبع مجتبائی دہلی میں قائم کیا اور مولانا کو بھی میرٹھ سے دہلی لے آئے۔ ۱۲۸۶ھ (۷۰-۱۸۶۹ء) میں یہ مطبع مجتبائی منشی صاحبؒ نے مولوی عبدالاحدؒ کے ہاتھ فروخت کردیا اور ہجرت کرکے مکۂ معظّمہ چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

مطبع مجتبائی بازار چوڑی والان میں واقع ہے، جو اس وقت مولوی عبدالاحدؒ کے لڑکوں کے قبضہ وتصرف میں ہے، اور مطبع مصطفائی جو بعد میں منشی ممتاز علیؒ کے صاحب زادوں نے قائم کیا، کھڑکی تفضّل حسین خاں میں متصل زنانہ وکٹوریہ ہسپتال واقع ہے، جو اس وقت منشی ممتاز علیؒ کے پوتوں کے تصرف میں ہے؛ مگر مطبع ختم ہو چکا ہے، صرف نام اور سائن بورڈ باقی رہ گیا ہے (۲)۔

(۱) منشی ممتاز علیؒ کی ہجرت وغیرہ کے بارے میں مورخین کے بیانات میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ مولانا امداد صابری نے اپنی تازہ تصنیف ''دہلی کی یادگار ہستیاں'' میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

''۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں مولوی محمد ہاشمؒ نے اندرکوٹ میرٹھ میں مطبع ہاشمی جاری کیا۔ بعد میں اس میں منشی ممتاز علیؒ نے شراکت کی۔ مولانا محمد قاسمؒ اس مطبع میں تصحیح کا کام کرتے تھے، پھر ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۷ء میں منشی صاحبؒ مطبع ہاشمی میں سے دو عدد دستی پریس دہلی لے آئے، اور محلّہ چوڑی والان میں اپنا مطبع مجتبائی قائم کیا۔ اس سے بھی مولانا کا تعلق رہا۔ پھر ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۶ء میں منشی صاحبؒ نے مطبع مجتبائی کو مولوی عبدالاحدؒ کے ہاتھ فروخت کردیا اور اپنی چار صاحبزادیوں کے ساتھ ہجرت کرکے مکۂ معظّمہ چلے گئے۔ 'اختر شہنشاہی' میں مطبع مجتبائی کا مقام اجرا دہلی لکھا ہے، میرٹھ نہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ مطبع میرٹھ ختم کرکے ہجرت فرما گئے؛ بلکہ انہوں نے دہلی کا مطبع مجتبائی فروخت کرکے ہجرت فرمائی۔ یہ بھی درست نہیں ہے کہ منشی صاحبؒ دوسرے سال ہندوستان واپس آگئے۔ وہ ہجرت کرنے کے بعد ہندوستان نہیں آئے۔ مکۂ معظّمہ ہی میں وفات پائی اور قبرستان جنت المعلاء میں آرام فرما ہیں''۔ (دہلی کی یادگار ہستیاں: ص ۴۰۱)

واضح ہو کہ منشی صاحبؒ موصوف کے ہجرت فرمانے کے بعد ان کے صاحبزادوں میں منشی مشتاق علی اور منشی عبدالغنی نے کھڑکی تفضّل حسین میں مطبع مصطفائی کے نام سے اپنا مطبع قائم کیا تھا۔ (واصف)

(۱) مولوی عبدالاحدؒ کے پوتے تقسیم ملک کے بعد کراچی آگئے تھے۔ ان کی دکان کتابوں کی تھی۔ ڈاؤمیڈیکل کالج (اب یونی ورسٹی) کے سامنے سول ہسپتال روڈ پر ان کی دکان پر بورڈ لگا ہوا تھا، جس پر ''پسرانِ مولوی عبدالاحد، مطبع مجتبائی'' لکھا ہوا تھا۔ اب یہ دکان ختم ہوگئی ہے۔ (نعمان)

منشی ممتاز علیؒ کے دو صاحبزادے تھے: بڑے منشی مشتاق علیؒ اور چھوٹے منشی عبدالغنی (۱)۔ یہ دونوں خطِ نسخ میں دہلی کے مایۂ ناز استاد تسلیم کیے جاتے تھے۔ ان کے سیکڑوں شاگرد ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں (۲)۔

مولانا مملوک علی نانوتویؒ، مولانا رشید الدین خاں دہلویؒ کے شاگرد ہیں، اور وہ شاگرد ہیں حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمہم اللہ کے، اور مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے حضرت شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ مہاجر (نواسۂ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ) سے اور انہوں نے حدیث حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے پڑھی۔

مولانا رشید الدین خان دہلویؒ مفتی صدر الدین خاں آزردہؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نانا رکن المدرسین مولوی منور الدینؒ اور مرزا غالب، حکیم مومن خاں دہلویؒ، نواب مولوی قطب الدین دہلویؒ، حکیم آغا خاں عیسیٰؒ، مولانا فضل حق خیر آبادیؒ، مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ وغیرہ، یہ تمام اہل کمال ایک ہی زمانے کے ہیں۔

مدرسۂ دہلی:

۱۸۲۵ء میں حکومت انگلشیہ نے مدرسۂ غازی الدین (بیرونِ اجمیری دروازہ) میں علوم مشرقی کا ایک دارالعلوم جاری کیا تھا، جس کے صدر مدرس مولانا رشید الدین خاں دہلویؒ مقرر کیے گئے تھے۔ سر سید احمد خاں، منشی ذکاء اللہ، مولوی ضیاء الدین اور ڈپٹی نذیر احمد اسی کالج کے فیض یافتہ ہیں۔ یہ کالج ۱۸۴۲ء تک مدرسۂ غازی الدین کی عمارت میں رہا، پھر ریزیڈنسی کی عمارت (متصل کشمیری دروازہ) میں منتقل ہو گیا۔ ریزیڈنسی کی یہ عمارت دراصل ۱۶۳۷ء میں داراشکوہ کا دارالمطالعہ تھا۔ ۱۶۳۹ء میں اس میں پنجاب کے مغل صوبے دار علی مردان خان کا قیام رہا، اور ۱۸۰۳ء میں اس میں ریزیڈنسی سر ڈیوڈ اختر لونی بارٹ ہی ۱۸۴۲ء سے ۱۸۷۷ء تک اسی میں گورنمنٹ کالج (یا دلی کالج) رہا۔ پھر ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۶ء تک مدرسہ ضلع، اور ۱۸۸۶ء سے ۱۹۰۴ء تک میونسپل بورڈ اسکول اس عمارت میں رہا۔ پھر گورنمنٹ ہائی اسکول، اور دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء) کے دوران گورنمنٹ ہائی اسکول کو ختم کر کے اسی عمارت میں پولی ٹیکنک اسکول قائم کیا گیا، جو اب بھی موجود ہے۔

---

(۲) راقم الحروف کو خطِ نسخ میں منشی عبدالغنی سے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے استاد خطاطی مولانا اشتیاق احمد صاحب بھی منشی محبوب علی میرٹھی کے واسطے سے منشی ممتاز علی کے سلسلے میں داخل ہیں۔

(۳) زیر نظر مجلّہ ''یادگار اکابر'' کے مدیر ایک واسطے سے منشی عبدالغنی علیہ الرحمہ کے خطاطی میں شاگرد ہیں۔ منشی عبدالغنیؒ اپنے والد منشی ممتاز علیؒ کے شاگرد تھے۔ منشی ممتاز علیؒ بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے۔ (نعمان)

یہ دلی کالج جب ۱۸۴۲ء میں مدرسۂ غازی الدین کی عمارت سے دارا شکوہ کی عمارت میں منتقل ہوا، تو مدرسۂ غازی الدین والی عمارت پرنسپل ہی کے سپرد رہی، جو بہ طور بورڈنگ ہاؤس اسی مدرسے کے طلبہ کے کام آتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اس میں پرنسپل نے بہ طور شاخ کے ایک مدرسۂ علوم مشرقی کھولا، اس کے بعد پرنسپل سے مدرسۂ غازی الدین کی عمارت گورنمنٹ نے لے لی، اور ''دار الشفائے یونانی'' کے نام سے ایک ہسپتال اس عمارت میں قائم کیا۔ پھر ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد اس عمارت پر پولیس کا قبضہ اور سکونت رہی۔ فروری ۱۸۹۰ء میں اینگلو عربک ہائی اسکول قائم ہوا، جو بعد میں عربک کالج بنا، اور انقلاب ستمبر ۱۹۴۷ء کے بعد اس کی منتظمہ کمیٹی نے اس کا نام ''دہلی کالج'' تجویز کیا۔

مولانا مملوک العلیؒ:

مرحوم دہلی کالج کے صدر مدرس مولوی رشید الدین خاں دہلویؒ کے انتقال کے بعد ان کے عزیز شاگرد مولانا مملوک العلی نانوتویؒ اس کے مدرس اول ہوئے۔ آپ کے تبحر علمی کے بارے میں تمام تذکرہ نویس رطب اللسان ہیں اور کئی کئی صفحے لکھے ہیں۔

مولوی کریم الدینؒ مصنف ''فرائد الدہر'' (طبقات الشعراء) لکھتے ہیں:

> ''سوائے درس دہی طلبۂ مدرسہ کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ تمام اوقاتِ گرامی ان کے تعلیم طلبہ میں نصف شب تک منقسم ہیں۔ حلیہ ان کا یہ ہے کہ ہنستی پیشانی، خندہ رو، سفید ریش، نورانی صورت، متواضع، حلیم، بردبار، مفکر، مدبر، دانش مند ہیں۔ باوجود کثرت علم و فضل کے کبھی وعظ عام نہیں کہا اور طالبین علم کے ہجوم اور کثرت درس و تدریس کی وجہ سے تصانیف، کتب کی طرف توجہ نہ ہوئی''۔

مولوی عبدالحق اپنی کتاب ''مرحوم دہلی کالج'' میں لکھتے ہیں:

> ''۱۸۴۷ء میں مولوی مملوک العلیؒ کی عمر تقریباً ساٹھ برس تھی۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ان سے پڑھا ہے''۔

مگر عام طور پر تذکروں میں جہاں ''مرحوم دہلی کالج'' کے دیگر فیض یافتوں کا ذکر آتا ہے، وہاں مولوی محمد قاسمؒ کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ ہے آپ نے پرائیویٹ طور پر مولانا مملوک العلیؒ سے گھر پر تعلیم پائی۔ پرائیویٹ درس و تدریس کا دستور اس زمانے میں بالعموم رائج تھا۔ چناں چہ مصنف ''فرائد الدہر'' کے بیان سے مولانا کا یہ معمول معلوم ہوتا ہے۔

مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کا بیان ہے:

''مولانا مملوک العلیؒ نے آپ کو مدرسے میں داخل کیا تھا، اور ٹیچروں سے کہا تھا کہ تم ان کے حال سے متعرض نہ ہونا۔ ریاضی اقلیدس وغیرہ میں خود پڑھالوں گا؛ مگر امتحان سالانہ میں شریک نہیں ہوئے؛ بلکہ ترک تعلق کر کے مطبع احمدی میں ملازمت کر لی اور پھر شاہ عبدالغنیؒ سے حدیث پڑھی''۔

مولوی رحمان علیؒ مصنف ''تذکرۂ علمائے ہند'' لکھتے ہیں:

''بعد فراغ از تحصیل علوم چندے بہ مدرسۂ انگریزی واقع دہلی تعلق گرفتہ وبعد ترک آں تعلق در مطبع احمدی بہ تصحیح کتب مقرر شد''۔

مرحوم دہلی کالج یا مدرسۂ دہلی یا مدرسۂ شاہ جہاں آباد؛ یہ تینوں نام اسی دار العلوم کے ہیں، جو مدرسۂ غازی الدین بیرونِ اجمیری دروازے میں ۱۸۲۵ء میں قائم ہوا تھا۔ جس کے شعبۂ علومِ مشرقی کے صدر مدرس مولوی رشید الدین خاں دہلویؒ مقرر ہوئے تھے، اور ان کے بعد مولوی مملوک العلیؒ اس کے صدر مدرس رہے، اور مؤلف ''حیاۃ النذیر'' کے بیان کے مطابق مولوی سید محمدؒ جو مدرس دوم تھے، مولوی مملوک العلیؒ کے انتقال کے بعد صدر مدرس قرار پائے۔

ڈپٹی نذیر احمدؒ نے ۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۴ء تک اسی دہلی کالج میں پڑھا اور مولوی سید محمدؒ سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا۔

یادگار دہلی اور آثار دہلی وغیرہ میں لکھا ہے:

''مہندیوں کے قبرستان میں مسجد افغانان کے اندر حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار قادری رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے، اور آپ کے پائیں مولانا مملوک العلی نانوتویؒ کا مزار ہے، جو استاد الکل تھے، اور شمس العلماء مولوی ضیاء الدینؒ اور شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمدؒ ان سے شرف تلمذ رکھتے تھے''۔

دار البقاء اور دار الشفاء:

اس دہلی کالج یا مدرسۂ دہلی کو مدرسۂ دار البقاء کہنا صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ مدرسۂ دار البقاء اور شفا خانہ دار الشفا؛ یہ دونوں عمارتیں جامع مسجد شاہ جہانی سے تعلق رکھتی تھیں۔ مولانا ابوالحسنات ندوی مصنف ''ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں'' کے بیان کے مطابق دار البقاء کا سنگ بنیاد ۱۰۶۰ھ (۱۶۵۰ء) میں رکھا گیا تھا۔ یہی جامع مسجد کا سالِ تعمیر ہے۔

داغ کے شاگرد رشید بے خود دہلوی نے راقم الحروف واصف سے اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ: دار البقاء

جامع مسجد کے جنوب مغربی گوشے پر تھا۔ اس گوشے پر اب چند نامعلوم حضرات کے مزارات اور ایک کنواں بہت بڑا اور پختہ شاہی زمانے کا ہے۔ دار الشفاء شمال مغربی گوشے پر تھا۔ یہ دونوں مرورِ زمانہ کی وجہ سے برباد ہو چکے تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ دہلویؒ (المتوفی: ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) نے زرِ خطیر خرچ کر کے ان دونوں کی مرمت کرائی۔ جو حجرے شاہی زمانے کے باقی تھے، ان کی حسب ضرورت درستی کرائی، اور بعض مجموعے شاہی طرز پر از سرِ نو بنوائے۔ درس گاہیں وغیرہ درست کرائیں اور ان دونوں اداروں کو جاری کر دیا۔ اسی وجہ سے یہ دونوں ادارے حضرت مفتی صدر الدین صاحبؒ کی طرف منسوب ہیں؛ لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ دونوں ختم ہو گئے اور عمارتیں گرا کر صاف میدان کر دیا گیا۔ جامع مسجد کے آس پاس گول سڑک نکالی گئی، چاروں گوشے کٹ کر الگ ہو گئے اور سرکاری ملکیت ہو گئے۔ عوام ان کو سنگھاڑے کہنے لگے۔ بعض لوگ سموسے بھی کہتے ہیں۔ یہ سموسے جتنے اب ہیں، اس سے بڑے تھے۔ تقریباً ۱۹۳۵ء میں سموسے کم کر کے سڑکیں چوڑی کی گئیں۔ ''یادگارِ دہلی'' کے مصنف نے تیسرے جنوب مشرقی گوشے پر ''دار الہدیٰ'' کی نشان دہی کی ہے، چوتھے گوشے کے بارے میں کسی مؤرخ نے کچھ نہیں لکھا۔

مفتی صدر الدین خاں آزردہؒ کی حویلی بازار مٹیا محل میں تھی، جو ''حویلی صدر الصدور'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ اسی حویلی کے اندر حضرت مفتی صاحبؒ کا انتقال ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں بہ عمر اکیاسی سال ہوا۔ ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں آپ کی ساری جائداد بہ الزام بغاوت ضبطی میں آ گئی تھی۔ بعد میں بہت تھوڑی سی جائداد واگزار ہوئی۔

مؤلف تذکرہ رحمانیہ نے لکھا ہے کہ: مفتی صدر الدین خاں آزردہؒ کی مولانا مملوک العلیؒ سے معاصرانہ چشمک تھی؛ مگر یہ غلط ہے؛ کیوں کہ مفتی صدر الدین خاں آزردہؒ مولانا رشید الدین خاںؒ کے معاصر اور ہم سبق تھے۔ بڑے فراخ دل، فراخ حوصلہ اور خلیق تھے۔ اس زمانے میں مدرسۂ دہلی کے انتظامی بورڈ کے ممبر اور مدرسے کے ممتحن بھی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب جامع مسجد واگزار ہوئی اور اس کا انتظامی بورڈ بنایا گیا، تو مفتی صاحبؒ بھی اس کے ممبر بنائے گئے۔ مولانا مملوک العلیؒ نے اپنے دونوں عزیز شاگردوں (مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا رشید احمدؒ) کو ان کا شاگرد بھی کرایا تھا۔ چناں چہ ''تذکرۃ الرشید'' میں مفصل طور پر مفتی صاحبؒ سے ان دونوں کے تلمذ کے واقعات مذکور ہیں۔

''آثار الصنادید'' اور ''واقعات دار الحکومت'' وغیرہ دیکھنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ دار البقاء اور دار الشفاء جامع مسجد کے ساتھ ہی قائم کیے گئے تھے، اور کچھ عرصے کے بعد سلطنت مغلیہ کی آئے دن کی خانہ

جنگیوں کی وجہ سے خستہ وخراب ہو گئے تھے۔ پھر مفتی صاحبؒ نے مرمت کرا کر دونوں اداروں کو از سرِ نو جاری کیا۔ دارالشفاء کے متعلق ۱۲۶۳ھ/(۱۸۴۷ء) میں سر سید احمد خاں نے لکھا ہے:

''شمالی دروازے کی طرف شاہ جہانی دارالشفاء ہے کہ سابق میں حکیم بیٹھتے تھے اور دوائی خانہ رہتا تھا۔ اب لوگ رہتے ہیں اور گھر بھی بن گئے ہیں''۔

مولانا محمد قاسمؒ کے متعلق جو مولانا محمد یعقوبؒ نے لکھا ہے کہ کچھ دنوں دارالبقاء میں رہے، وہ یہی دار البقاء تھا، جو جامع مسجد کے جنوب میں واقع تھا، اور غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے موجود تھا۔ مولانا مملوک العلیؒ کی وفات ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) میں ہوئی۔ اس وقت مولانا محمد قاسم تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے، اور مطبع احمدی میں ملازم تھے۔ کچھ دنوں آپ مولانا محمد یعقوبؒ کے مکان واقع کوچۂ چیلان بھی میں رہے، پھر جب وہ بہ سلسلۂ ملازمت اجمیر چلے گئے، تو کچھ دنوں ان کے مکان میں تنہا رہنے کے بعد آپ مطبع احمدی میں اور پھر دارالبقاء میں منتقل ہو گئے۔ یہ تعلیم وتعلم کا زمانہ نہیں تھا؛ بلکہ یہ قیام عارضی محض مسافرت کی بنا پر تھا۔ مولانا مملوک العلیؒ کا دارالبقاء سے کوئی تعلق ثابت نہیں۔ نیز دارالبقاء کی تعلیمی حالت کے متعلق کچھ سراغ نہیں ملا کہ کون کون حضرات اس کے مدرس تھے اور کیسی تعلیم تھی (۱)۔

یا الٰہی! آپ کے فضل وکرم اور ہمارے سرپرست: حضرت مولانا حسن الرحمٰن صاحب یوسفی مدظلہٗ اور حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مدظلہٗ کی دعاؤں کی بہ دولت یہ عظیم الشان کام پایۂ تکمیل تک پہنچا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ حق تو ادا نہ ہو سکا؛ لیکن آپ کی ذات سے امید ہے کہ آپ ہمارا حشر ان بزرگوں کے ساتھ فرمائیں گے؛ اس کے لیے ہم وسیلے کے طور پر یہ پیش کرتے ہیں۔

اے اللہ! ہماری مرادوں کو پورا فرما۔ آمین، بحق سید المرسلین ﷺ!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

---

(۱) ماہنامہ معارف- اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۷۵ء۔

اشاریہ

شخصیات

(الف):

(خ):

(د):

(م):

مقامات

(الف):

(ب):

(گ):

(ل):

(م):

(ن):

کتب ورسائل:

علمی وتعلیمی ادارے

(ع):

(ق):

(ک):

(م):

(ن):